شعر

علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اردو کا قدیم علمی و ادبی

ماہنامہ

شاعر

سالنامہ

۱۹۶۴ء

بمبئی

سال ۳۵ — شمارہ ۱

ادارہ

اعجاز صدیقی

مہندر ناتھ

زرِ سالانہ	زرِ ششماہی	ممالکِ غیر
سات روپیہ	چار روپیہ	۱۲ شلنگ

فی پرچہ — قیمت

ناشر

مکتبۂ قصر الادب

پوسٹ بکس نمبر [illegible] بمبئی

طیبّی دواخانہ یونانی (اندور) پرائیویٹ لمیٹڈ
کی مایۂ ناز ایجاد!
جسم کے تمام غدودوں کو تقویت دے کر بہ کثرت
خونِ صالح پیدا کرتا ہے۔ بدرجۂ اعلیٰ مقوّیِ اعصاب ہے
دل و دماغ اور خصوصاً قویٰ جسمانی کو طاقت دیتا ہے۔
KAMAL
KAMAL
طیبی
کمال
منشّی اور زہریلی دواؤں سے پاک ہے۔
۱۲ روز کے لئے ۱۰ روپے
مکمل کورس ۲۴ روز کے لئے ۲۰ روپے
ملنے کا پتہ
طیبّی دواخانہ یونانی (اندور) پرائیویٹ لمیٹڈ
۱۵، بوہرہ بازار، اندور سٹی (ایم۔ پی) فون ۶۳۳۴
سول اسٹاکسٹ:۔
طیبّی دواخانہ یونانی
فون ۳۲۴۸۸۳
محمد علی روڈ بمبئی
برانچ:۔
چوک بازار اجین
اور
مہارانی روڈ
اندور
چند شہرۂ آفاق خصوصی ادویات
شاہی
کمیِ خون، ضعفِ اعضائے رئیسہ شریفہ
کیلئے مردوں اور عورتوں اور بچوں کیلئے
بہترین دوا۔ مکمل کورس ۲۵/-
۱۲ روز کے لئے
ٹی ڈی ٹوتھ پاؤڈر
امراضِ دنداں کیلئے مشہور و مستند
منجن پائیوریا کی بہترین دوا اور عام
روزانہ استعمال کے لئے بہترین منجن
بڑی شیشی ۱/۳۷ چھوٹی شیشی -/۳۷
عرق ماء اللحم
کھوئی ہوئی قوت کی بحالی کیلئے نعمت غیر مترقبہ
بڑی بوتل قسم اعلیٰ ۱۲/۵۰
آدھی بوتل ۶/۳۷
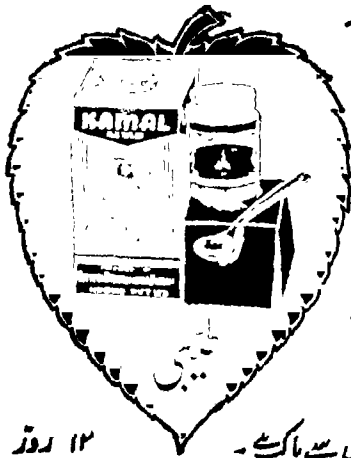
حفاظت کے پہرے دار
جاں باز جوان نہایت مستعدی اور ہشیاری
کے ساتھ ناہموار سرحدوں پر اپنے وطن
کی حفاظت اور آزادی کو برقرار رکھنے
کے لئے پہرہ دے رہے ہیں۔
ہندوستانی ریلیں محفوظ اور
تیز رفتار سلسلہ مواصلت کی
ضامن ہیں تاکہ قومی بچت اور
قومی دفاع برقرار رہ سکے۔
سینٹرل ریلوے

فہرست

جرعات — ادارہ ۱۰

۱۸۵۷ء سے پہلے کے شیکسپیئر کے اُردو ترجمے — ڈاکٹر عبدالعلیم نامی ۱۱
بوستانِ خیال کا دہلوی ترجمہ — ڈاکٹر گیان چند ۱۴
شاد عظیم آبادی — تاریخ کی روشنی میں — نقی احمد ارشاد ۱۷
ہندوستان کی جدید مصوری — حیدر پٹھان ۲۱

مولانا سیماب مرحوم — قیسی رامپوری ۳۹
مولانا تاجور نجیب آبادی کا خط — علامہ سیماب کے نام ۴۴
اسرار (رباعیات) — علامہ سیماب اکبرآبادی ۴۵
بابائے اردو مولوی عبدالحق کا خط — علامہ سیماب کے نام ۴۶
داستانے چند — ناز چاندپوری ۴۷

[illegible]

اعتراف محرومی	جمیل مظہری	۵۵
شعلہ بہ شعلہ	علی جواد زیدی	۵۶
دُرک	نصیر پرواز	۵۷
رنگ و بُو	متین سروش	۵۸
میرا درد	بشر نواز	۵۹
کلنگ	کرشن موہن	۶۰

افسانے

اہرمن کے پر کٹے	کوثر چاند پوری	۶۱
انصاف	ڈاکٹر ست پرکاش سنگر	۶۶
پرانا زخم	زکی انور	۶۸

طنز و مزاح

بی جمالو	احمد جمال پاشا	۷۵
اشرف المخلوقات	یوسف ناظم	۷۷
فرمانے سے پہلے	غلام احمد فرقت کاکوروی	۷۹

غزلیں

ماہر القادری — احسان دانش — منظر صدیقی

سراج الدین ظفر — خلیل الرحمٰن اعظمی — نثار اٹاوی

شفا گوالیاری — شفیق کوٹی — طرفہ قریشی

مظہر امام — فضیل جعفری — صاد [illegible]

عالم اختر مظفرنگری — عنوان چشتی — اکرم [illegible]

حسن کمال — خلش دہلوی

ڈرامے

نیا دن	اکرام جاوید	۹۹
اجنبی۔ سمندر۔ اور لڑکی	نور شاد	۱۰۷

ادارہ

جُرعات

ادب و شعر کی مقبولیت، اُس کے پھیلاؤ، قدر و قیمت اور معیار کا تعلق وقت اور حالات کے ساتھ ہے۔ اچھا پا ئدار ادب اُونچے اور متوسط طبقہ کی پذیرائی سے پیدا ہوتا اور آگے بڑھتا ہے۔ مُلک جس ہیجان و انتشار میں مُبتلا ہے، قوم جس نازک دَور سے گذر رہی ہے، معاشرے میں جو زلزلے آئے ہوئے ہیں، سماج سے جو عفونت پیدا ہو رہی ہے اور فرقہ پرستی کے جو بھُوت چاروں طرف تباہی مچائے ہوئے ہیں، اس صورت میں کوئی بھی ادیب شاعر پُر سکون ہو کر نہیں لکھ سکتا۔ کیا ایسے ہنگامی دَور میں جبکہ گرانی ہی نہیں گراں جانی بھی ہو، عام طور پر لوگ ادب سے دل بہلا سکتے ہیں، اُس کی گہرائیوں اور گیرائیوں تک پہنچ سکتے ہیں، بلند ذوقی اور فکر و نظر کا مظاہرہ کر سکتے ہیں!؟۔ ایک ناآسودہ قوم نہ بڑا ادب پیدا کر سکتی ہے اور نہ اُسے تقویت پہنچا سکتی ہے۔ اُردو زبان سکے اس استحصالی دَور میں کم از کم اُردو ادیب شاعر تو پُر سکون نہیں ہیں اور نہ ہمارے ادبی رسائل میں کسی قسم کا ابھار اور اُٹھان پیدا ہو رہا ہے۔

حالات کچھ بھی ہوں، بعض روایتوں کو نبھانا ہی پڑتا ہے۔ "شاعر" کی بھی یہ دیرینہ روایت رہی ہے کہ ہر سال ایک سالنامہ اور خاص نمبر پیش کیا جائے چنانچہ ۱۹۶۳ء کا سالنامہ حاضر ہے۔ یہ "شاعر" کی سب سے کم حجم خصوصی اشاعت ہے۔ "شاعر" نے تین تین سو صفحات کے نہایت شاندار نمبر پیش کئے ہیں اور کم از کم ڈیڑھ سو صفحات کے لیکن زیرِ نظر سالنامہ صرف ۱۴۴ صفحات کا ہے۔ اتنے کم صفحات میں زیادہ سے زیادہ مواد بہم پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسے بڑی حد تک عمومیت سے بچایا گیا ہے اور شروع سے آخر تک تنوّع کا خیال رکھا گیا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ پچھلی خصوصی اشاعتوں کی طرح "شاعر" کا یہ سالنامہ بھی اربابِ ذوق سے خراجِ تحسین وصول کریگا یہ خالصتاً علمی، ادبی، تحقیقی اور تاریخی مواد پر مشتمل ایک اشاعت ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں معتبر قلم کار شامل ہیں۔ ایک کوشش یہ بھی کی گئی ہے کہ سالنامہ کے تمام ابواب متوازن رہیں، نہ اس میں افسانوں کی بھرمار ہے اور نہ نظموں اور غزلوں کی۔ "ہندوستان کی جدید مصوّری" پر ایک جامع مضمون اور اُس سے متعلقہ تصاویر کی اشاعت کا فخر بھی "شاعر" ہی کو حاصل ہے۔ دو یادگار خط بھی شایع کئے جا رہے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ علّامہ اقبالؒ کا خط شادؔ عظیم آبادی کے نام اور حضرت شادؔ کی غیر مطبوعہ غزل سالنامہ میں شامل نہ ہو سکی۔ یہ دونوں چیزیں آئندہ اشاعت میں پیش کی جائیں گی۔

بعض دیر سے آئے ہوئے مضامینِ نظم و نثر بھی سالنامہ میں شائع نہ ہو سکے، وہ بھی آئندہ شمارہ ہی کی زینت بن سکیں گے۔
"شاعر" کا آئندہ شمارہ بہت اہم ہوگا اور انشاءاللہ وقت پر شائع ہوگا۔ سالنامہ کی اشاعت میں کسی قدر تاخیر واقع ہوگئی۔ خصوصی اشاعتوں کے کاموں میں کافی وقت لگتا ہے خصوصاً اچھے مضامین کی فراہمی اور اُن کا انتظار بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔

افسوس سیّد ظہیر الدین علوی رجسٹرار جامعۂ اُردو علیگڈھ کا ۱۲ر جنوری کو اچانک انتقال ہوگیا۔ آہ! ایک ایسی مخلص اور باعمل شخصیت ہم میں سے اُٹھ گئی جس کے ذوقِ عمل کا جواب پیدا ہونا ممکن نہیں۔ مرحوم نے خود کو جامعۂ اُردو کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اُنھوں نے اپنی انتھک کوششوں سے اُردو کے اس ادارہ کی بنیادوں کو مستحکم کیا، اسے پورے مُلک میں مقبول بنایا۔ جامعۂ اُردو کے ذریعہ، اُردو کا جتنا بڑا کام ہو رہا ہے، اُس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ اس نازک دَور میں ظہیر الدین علوی کی مرگِ ناگہاں ایک ایسا سانحۂ عظیم ہے جس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ اللہ اُن کی مغفرت کرے اور کسی طرح وہ خلا پُر ہو جائے جو اُن کی موت سے پیدا ہو گیا ہے۔

شاعر بمبئی

سیماب اکبر آبادی مرحوم

شاد عظیم آبادی مرحوم
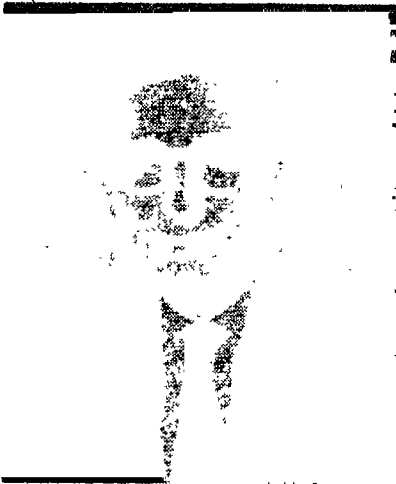
ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

ڈاکٹر گیان چند
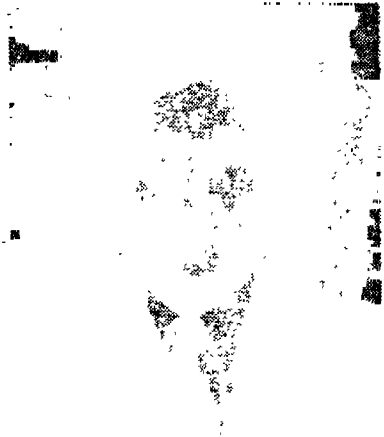
منظر صدیقی

خلیل الرحمان اعظمی
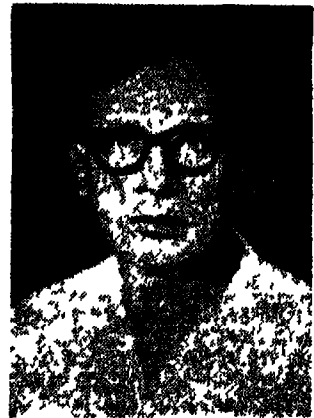
فرقت کاکوروی

یوسف ناظم
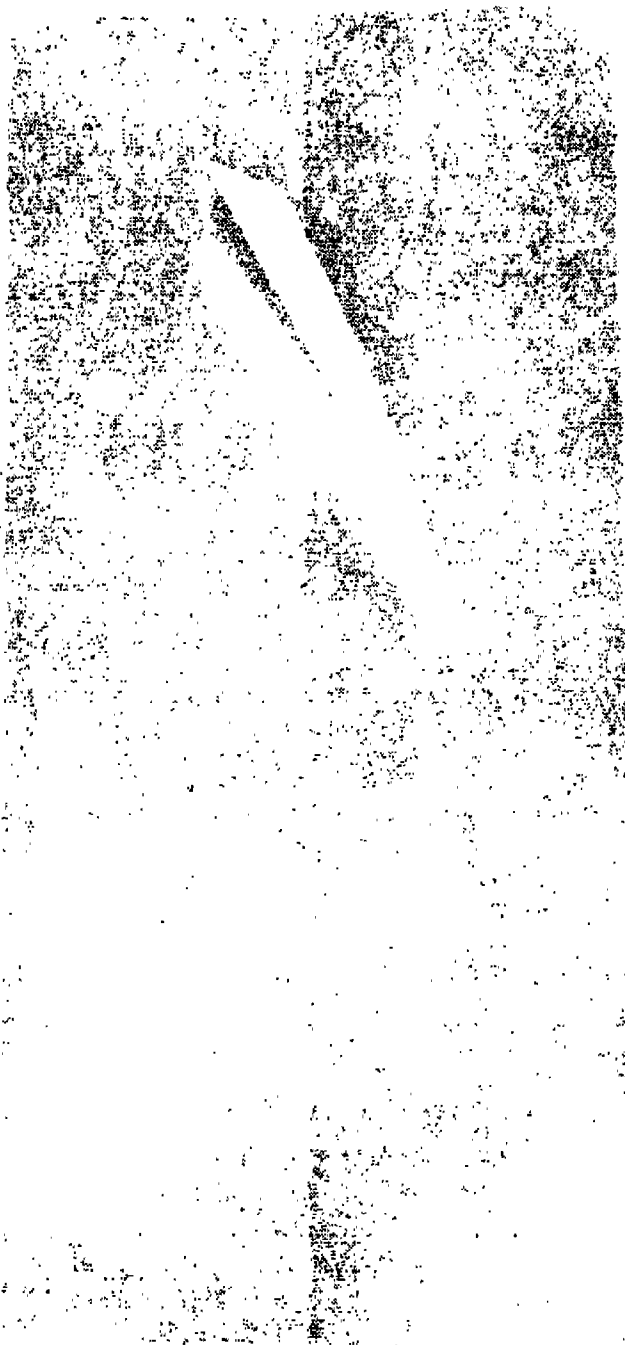
آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے
غالب

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیر
ا
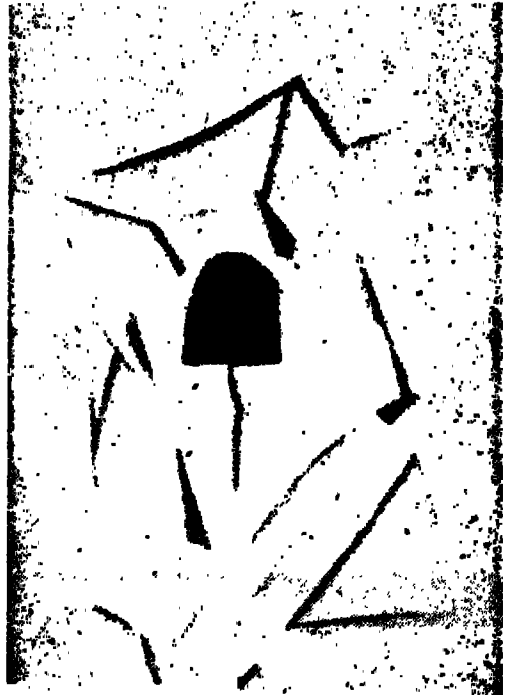
ہار آئی تھی گلشن میں تو کرتی بارشِ تسکیں
یہ کس نے کہہ دیا تھا شورش افزائے نمو ہو جا
سیماب

جہلِ خرد نے دن یہ دکا
گھٹ گئے انساں، بڑھ گئے
ج

ایک منزلہ مکان　　　　از ـ پرُدمناتنا

کھیت میں

از۔ ایم۔ ایچ۔ راتھوڈ

جامد زندگی — از۔ کے۔ ایچ۔ آرا

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی
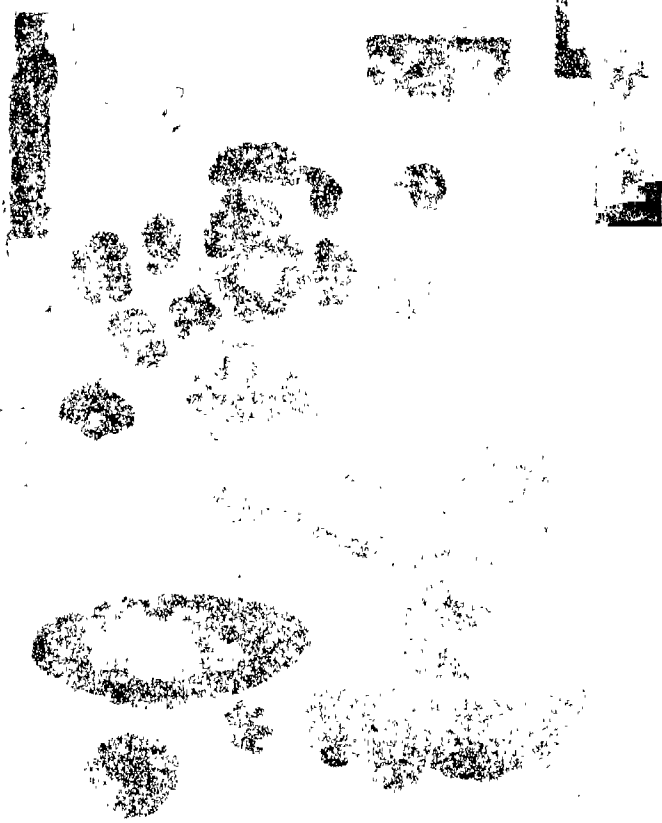
۱۸۰۰ء سے پہلے کے شیکسپیئر کے اُردو ترجمے

اپریل ۱۹۶۴ء میں شیکسپیئر کی چہار صد سالہ برسی" جملہ
متمدن ممالک میں منائی جائے گی۔ حکومت ہند کی جانب سے
بھی ساہتیہ اکیڈمی نے خصوصی تقریروں کا انتظام کیا ہے اور
ششماہی "انڈین لٹریچر" کا آئندہ شمارہ ہندوستانی زبانوں
پر شیکسپیئر کے اثرات کے لئے مخصوص ہوگا۔ اُردو ادب پر شیکسپیئر کا
کس قدر اثر ہے۔ اسکی ایک جھلک آپ کو اس مضمون میں نظر آئے گی۔
شیکسپیئر کے جملہ اُردو ترجموں کی تفصیلات کے لئے "انڈین لٹریچر"
اور "ناٹیا" کے خصوصی شیکسپیئر نمبر ملاحظہ فرمائیے

جس طرح شیکسپیئر کی عظمت مسلم ہے اسی طرح اُردو زبان کی بھی جو دنیا کی
تیسری بڑی اور زندہ زبان ہے۔ اُردو ایشیا کی بھی سب سے اہم زبان ہے
اور کل تک ہندوستان کی بھی لنگوا فرنیکا رہی ہے جس میں پرائمری سے پوسٹ
ڈاکٹریٹ تک تعلیم ہوتی تھی اُردو ایک پھلنے پھولنے والی زبان ہے۔ اور اس وقت
تک وہ سرسبز و شاداب رہیگی جب تک کہ اس کے مبلغین انتہائی خلوص اور
محققین انتہائی جذبۂ قربانی کے ساتھ اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہیں گے۔

ایسے ہی مخلص کام کرنے والوں میں اڈنبرا (اسکاٹ لینڈ) کا ایک شخص
جان گلکرائسٹ تھا جو جارج ہیرٹ ہاسپٹل سے طبی سند لینے کے بعد عام
انگریزوں کی طرح قسمت آزمائی کے لئے ہندوستان آیا لیکن بمبئی پہنچکر اسکو
اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ اُردو زبان کی شیرینی اور اس کی شاعری نے گلکرائسٹ
کے دل کو موہ لیا اور اس نے میڈیکل پریکٹس کی بجائے اُردو زبان سیکھنے کا
ارادہ کرلیا۔ چونکہ اُردو ۱۷۵۰ء سے بمبئی کے عوام کی زبان رہی ہے، اس لئے
اس نے بہت جلد بول چال کی زبان سیکھ لی لیکن جب اس کی تبدیلی کلکتہ
ہوگئی۔ جو اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کا دارالخلافہ تھا تو اس کو اپنے

کہتی ہے کہ وہ نت مجھے ڈبوئے رکھے گی، چھوڑا ہے "

"ناچیز جاہ وجلال اِس جہان کے! اب میرے تئیں نفرت ہے تم سے، کیونکہ میں (نے) اپنا دل منور پایا ہے، یعنی ہے وہ کیسا کم بخت غریب آدمی ہے جو آسرا رکھتا ہے بادشاہوں کے توجہات پر، جو حسن شیریں تبسم اور خوش منظر سلاطینوں کی ہم یہ خواہش تاکتے ہیں۔ اُن دونوں اور اپنی ذلت کے عرصے میں زیادہ حیا کدن اور تشویش ہے۔ عورتوں کے دل اور لڑائی کے میدان سے (زیادہ) غرض جب وہ بیکس اپنے درجے سے گرتا ہے تو ابلیس کی طرح گرتا (ہے) اور پھر ہرگز اوٹھنے (اٹھنے) کا نہیں "

"ہملٹ" کا ترجمہ پیش ہے:

"جینا، خواہ نہ جینا؛ سوال یہی ہے کہ بہتر ہے دِل میں برداشت کرنا قہر آلود قسمت کی فلاخن و تیر بلاں کو یا سن مکھ (سم مکھ) دست بہ شمشیر ہونا دریائے مصیبتوں کے دوست بہ شمشیر ہونا دریائے مصائب کے مقابلے میں اور تمام کرنا اون (ان) کو مرنا کیا؟ سونا ہے کچھ اور نہیں۔ یہ کہنا ایک نیند سے ہم حل میٹ (؟) کرتے (ہیں) درد دل اور ہزار صدمات فلکی جن کا متحمل ہر ایک متنفس ہے۔ یہ مراد ایک ہے جس کو یہ آرزو چاہا چاہئے۔ مرنا! درست، سونا ہے، شاید سپنا۔ دیکھنا فی الواقعہ سدّ راہ یہی ہے کہ جب ہم ملنا اس کشمکش دنیاوی سے نجات پائی۔ تب اس موت کی ... ن کیسے خواب نظر آویں گے۔ یہی تشویش ہم کو خوف ورجا میں رکھتی ہے۔ امتیاز یہی ہے جو اذیت کا اینہاں تک (یہاں تک) عمر دراز کرتی ہے۔ والّا کون سہتا زمانے کی کو تک (؟) و اہانت ظالم کے ظلم، مغرور کی حقارت، جگر سوزی عشق خام کی، قیدی عدالت کی، غرور عہدئے بادشاہی کا اور لات پیزار مبتذلوں کی، جو صابر قدر انگیز تا ہے۔ ہرگاہ وہ آپ اپنی مخلصی کر سکتا ہے۔ خالی ایک چھوری (چھری) سے۔ کون بوجھ اوٹھاتا، دکھ بھرنے اور لہو پانی کرنے کیلئے بیچ مکدر زندگی کے جو (تاکہ) بعد مرگ کسی چیز کی دہشت نہ ہوتی وہ ملک اَن دیکھا جس کی منزل سے کوئی مسافر پھرتا نہیں۔ یہی اختیار انسان کو گھبراتا ہے و (اور) ہم کو سہاتا ہے۔ وے (وہ) خرابیاں جو موجود ہیں پہلے اس کے کہ بھاگیں اوروں کی طرف کہ وہ نامعلوم ہیں یوں ہی غیرت ہم کو بزدلا بناتی ہے اور اسی طرح اصل رنگ استقلال کا پھیکا ہو جاتا ہے۔ فکر کے زیرِ عکس سے "

غرض یہ ہے کہ اُردو داں طبقہ ۱۷۹۰ء سے بہت پہلے شکسپیئر سے روشناس ہو چکا تھا کیونکہ انگلستان کی سفری ناٹک منڈلیاں جو بمبئی سے براہ راست یا مدراس قیام کرتی ہوئی کلکتہ پہنچتی تھیں اپنے دوران قیام ہند میں اسقدر اُردو الفاظ سیکھ لیتی تھیں کہ بلا جھجک۔ اور روانی کے وہ اپنے ڈراموں میں اُردو الفاظ استعمال کر سکتی تھیں اسکی متعدد مثالیں موجود ہیں یعنی اپنی کتاب "اُردو تھیٹر" جلد اوّل صفحہ ۲۰۰ تا صفحہ ۲۱۲ میں ایک لغماتی ڈرامہ "سفر بنگال" کا ترجمہ پیش کیا ہے جس میں مندرجہ ذیل الفاظ موتیوں کی طرح جڑے ہوئے نظر آتے ہیں مثلاً۔ خدمت گار۔ مشعلچی۔ حرامزادہ۔ سلام۔ علی بھرا۔ چھتری۔ پانی۔ حقہ۔ پنکھا۔ دربان۔ سرکار۔ برآمدہ۔ لال شربت۔ چھکڑی۔ جھوٹ۔ پینے کا پانی۔ بہادر۔ چوبدار۔ صاحب لوگ آتا ہے خبردار ہو جاؤ۔ جب ایک ہی انگریزی ڈرامہ میں اسقدر اُردو کے الفاظ شامل ہوں تو انگریزی کا اُردو پر اور اُردو کا انگریزی پر کسقدر اثر پڑا ہوگا۔ یہ ڈرامہ ۱۷۹۲ء سے پہلے کا لکھا ہوا ہے اور لندن سے ۱۸۰۲ء میں شائع ہوا تھا۔

برطانوی سفری ناٹک منڈلیوں کے ڈرامے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کے علاوہ سویل اور ملٹری کیڈٹس بھی جنکو کمپنی کی طرف سے خوراک اور رہائش کے علاوہ تین سو روپیہ ماہوار سلسلۂ تعلیم و جیب خرچ ملتے تھے اپنے شوق کے ساتھ دیکھتے تھے چونکہ درس و تدریس کا یہ سلسلہ ایک عرصہ سے جاری تھا اس لئے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ شاہ بمبئی

مستقبل پر کچھ بالنظر ثانی کرنی پڑی اور آخر میں اُس نے طے کیا کہ وہ طویل رخصت پر جائے گا [illegible] اُس نے سر جان میکفرسن سے جو وارن ہیسٹنگز کی جگہ منصرم گورنر جنرل تھا اُردو زبان اور اُس کی صرف و نحو حاصل کرنے کے لئے طویل رخصت کی اجازت چاہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین میں جان گلکرائسٹ سب سے پہلا شخص تھا جس نے ایک عوامی زبان کی طرف اسقدر دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اس لئے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے منظوری دیدی اور وہ کمربستہ ہوکر دہلی۔ لکھنؤ۔ بنارس۔ فیض آباد وغیرہ میں طویل قیام بغرض حصول زبان اُردو روانہ ہوگیا۔ کئی سال کی مسلسل محنت کے بعد بالآخر وہ اس قابل ہوگیا کہ شیکسپیئر جیسے عظیم المرتبت ڈراما نویس کے شہ پارے بھی اُردو میں منتقل کر سکے۔

خیالِ ناقص یہ ہے کہ جان گلکرائسٹ نے ۱۷۹۰ء اور ۱۷۹۲ء کے درمیان شاہ ہنری ششم اور "ہملٹ" کے ترجمے مکمل کر لئے ہوں گے۔ لیکن طباعتی دشواریوں کے باعث وہ انھیں ۱۷۹۶ء سے قبل شائع نہ کرا سکا اور وہ بھی انتخابات کی صورت میں۔

جان گلکرائسٹ نے اپنے یہ انتخابات "ہندوستانی زبان کے قواعد" میں شائع کئے ہیں۔ اور وہ اپنے "دیباچہ" میں لکھتا ہے۔

"یہ امر طالب علم کو غالباً گراں نہ گزرے گا کہ اُس کی زبان کے کسی شہ پارے کا ترجمہ نمونتاً ہندوستانی زبان میں پیش کیا جائے تاکہ اس کا بھی اندازہ ہو سکے کہ دونوں زبانوں کے محاورات اُن حسین خیالات کی ادائیگی میں کس حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہیں جن کو لافانی شیکسپیئر نے گارڈی نل وولزے اور شاہزادے ہملٹ کی زبان سے عالم خیال میں ادا کرائے تھے۔ میں نے ان دونوں مکالمات کا بول چال کی مہذب (ہندوستانی) زبان میں زیادہ سے زیادہ لغوی ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ سلاست کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کا وہ انداز بیان بھی قائم رہے جو ایسے مسائل کے بیان میں وہ اختیار کرتے ہیں۔ میں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ مشکل الفاظ جہاں تک ہو سکے استعمال نہ کروں جن (کا استعمال) فہم سے زیادہ منشی گری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس ترجمے کے گھٹیا پن اور اسکی بے نمکی سے ناظرین کو اس امر کا بھی بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ترجمے میں اصل کی روح اور اُس کے حسن کو برقرار رکھنا کس قدر دشوار ہو جاتا ہے۔ اس سے راز بھی آشکارا ہو جائے گا کہ ہندوستانی زبان میں حد درجہ لطافت و صلاحیت کے باوجود ترجموں میں کیوں بے لطفی محسوس ہوتی ہے۔"

اب یہاں شیکسپیئر کے ہر دو ترجموں کے اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔ شاہ ہنری ششم کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"خوشا اے عمدگی! لے اب تو ایک مدت خوش رہیو"

"یہی انسان کی حالت ہے جیوں درخت آج ملائم پاتوں کے سے سر سبز ہوا و (اور) گل مراد کے سُرخ غنچوں سے شگفتہ رو ہوا و (اور) رنگ برنگ ترقی کی، پھولوں پہ آیا، و (اور) تیسرے دن ایسا ایک جاڑا آتا ہے، ہائے کیسا سخت جاڑا! کہ جس وقت اوس (اس) نادان بےچارہ انسان نے یقین جانا کہ اب میری بندگی کا پھل پکتا ہے، تب وہ (سخت جاڑا) سُکھا تا ہے۔ اوس کو جڑ تک۔ (اور) وہ گرتا ہے میری طرح میں نے دریائے شان (SEA OF GLORY) میں کئی ایک موسم گرما کے جیسے چھوٹے شوخ [illegible] جو گھروں پر تیرتے ہیں اپنی تھا (تھاہ) کی حد سے بہوت (بہت) پرے آزمایا۔ آخر میرے [illegible] غرور کا [illegible]۔ مانجھ دار (منجھدار) میں چھوٹا و (اور) مجھ ضعیف اپیر مرد۔ خدمت رسیدہ کو خوشحو (؟) [illegible] شاہو بھیجی

ڈاکٹر گیان چند

بوستانِ خیال کا دہلوی ترجمہ

اردو میں بوستانِ خیال کی مقبولیت خواجہ امان (۱۸۱۲ء تا ۱۸۶۹ء) کے ترجمے کی بدولت ہے۔ بدرالدین خاں عرف خواجہ امان غالب کے بھتیجے تھے چنانچہ اُن کے ترجمے کی پہلی جلد پر غالب نے تقریظ لکھی ہے۔ امان الور کے مہاراجہ شو دان سنگھ کے ملازم تھے۔ ان کے کتب خانے میں فارسی بوستانِ خیال کا مکمل سیٹ تھا۔ مہاراجہ نے امان سے اردو ترجمے کی فرمائش کی۔ چونکہ فارسی کی پہلی دو جلدیں یعنی مہدی نامہ اور اسمٰعیل نامہ میں ہیرو کے اجداد کا تعارف تھا اس لئے انھیں غیر متعلق سمجھ کر امان نے نظر انداز کر دیا اور معز نامے سے ترجمے کی ابتدا کی۔ جلد ہفتم موسوم بہ صباح النہار کے دیباچے میں امان کے بیٹے خواجہ قمرالدین راقم لکھتے ہیں کہ خواجہ امان نے ۱۸۵۲ء میں بوستانِ خیال کے ترجمہ کا ارادہ کیا لیکن عملی جامہ ۱۸۵۹ء ہی میں پہنا سکے، جلد ہشتم مرأت الاضمار میں راقم اس سے ہٹ کر کہتے ہیں کہ امان نے ۱۸۴۳ء میں فارسی کی کل جلدیں جمع کیں لیکن ۱۸۶۵ء میں ترجمہ کا کام شروع کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ترجمے کی پہلی جلد حدائق الانضار کی تکمیل ۱۸۵۵ء میں ہوگئی۔ امان لکھتے ہیں کہ ابھی انھوں نے صرف ایک جلد ترجمہ کی تھی کہ الور میں ایک فتنۂ عظیم برپا ہوا۔ ۱۲۷۵ھ اور سب کے ساتھ یہ بھی نکالے گئے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مطابق راجپوتوں نے دلّی والوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی اور یہی وہ فتنۂ عظیم تھا جس کی لپیٹ میں خواجہ امان آگئے۔[1]

اردو ترجمے کی جلد اوّل اکمل المطابع دلی سے ۱۲۸۲ھ ۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی بقیہ جلدوں کی طباعت کے لئے امان نے دلی میں اپنا پریس مطبع بدر الدجیٰ قائم کیا۔ پہلی تین جلدیں مہاراجہ شو دان سنگھ والئ الور سے منسوب ہیں۔ چوتھی جلد حسب فرمائش والی پٹیالہ ترجمہ کی گئی۔ جلد پنجم نواب محمد اسمٰعیل خاں بہادر فرماں روائے جاوُرہ کے نام معنون ہے۔ اس کے بعد جلد ششم اور ہفتم کا ترجمہ مکمل کیا لیکن ابھی اس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی تھی کہ جلد ہفتم کے اردو مسودات چوری ہو گئے چنانچہ امان کی جلد ہفتم کے آخر میں اطلاع ہے کہ "ترجمۂ جلد ہفتم کسی قدر چوری ہو گیا تھا مالکِ ترجمہ نے بارِ دیگر ترجمہ کو کامل کیا۔"

امان دوسری بار ترجمہ کا کام کر رہے تھے کہ ۱۳ر اگست ۱۸۶۹ء کو یکا یک سینے میں درد اٹھا اور حد سے گزر کر ہی ختم ہوا یعنی امان بیٹے کو کچھ وصیت کئے بغیر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ ان کے انتقال پر میرٹھ کے حکیم مقرب حسین خاں غنی خواجہ قمرالدین راقم کے پاس آئے اور امان مرحوم سے اپنی دوستی جتا کر ترجمے کی جلد ششم و ہفتم کو اپنے مطبع دار العلوم میرٹھ میں چھاپنے کی خواہش ظاہر کی۔ راقم اُن کی بات مان گئے اور دونوں جلدوں کے مسودے اُن کے حوالے کر دیے۔ اب حکیم غنی نے فریب سے اشتہار کر دیا کہ میں نے چھٹی اور ساتویں جلد کا

---

[1] خواجہ امان مرحوم از فرحت اللہ بیگ۔ رسالہ اردو اپریل ۱۹۳۱ء

کے مسودے راقم سے پانسو روپے میں خرید لئے ہیں اور میں مترجم بوستانِ خیال ہوں۔ چھٹی جلد مصباح النہار ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء میں مطبع دار العلوم میرٹھ سے شائع ہوئی۔ اس کے سرورق پر لکھا ہے۔

ترجمۂ فرمودۂ امان و تکمیل نمودۂ حکیم مقرب حسین خاں غنی

راقم نے غنی پر مقدمہ دائر کر دیا کہ مسودوں کی تکمیل اور نظرِ ثانی میں نے کی ہے۔ غنی نے جواب دیا کہ راقم کو اس کی اہلیت نہیں۔ جلد ششم کا کچھ حصہ اور جلد ہفتم کلیتاً میری ہی ترتیب دی ہوئی ہے۔ راقم نے اپنی اہلیت کے ثبوت میں اپنی تصنیف سے کچھ کتابیں اور جلد ہشتم کا ترجمہ مرأت الاضمار پیش کیا۔ عدالت نے معاملہ پنچوں کے سپرد کر دیا جنھوں نے غنی کی چھاپی ہوئی چھٹی جلد مصباح النہار کی ۴۷ جلدیں راقم کو دلا دیں اور آئندہ راقم کو چھٹی اور ساتویں دونوں جلدوں کی اشاعت سے مانع کر دیا۔ مصباح النہار میں سے غنی نے راقم کا اصل دیباچہ نکال کر اپنا دیباچہ شامل کر دیا تھا۔ ان ۴۷ جلدوں میں راقم نے غنی کے پیش لفظ کو نکال کر اپنا نیا دیباچہ شامل کیا اور اس میں جعل اور مقدمہ کی پوری کیفیت درج کی۔ اس نسخے کے سرورق پر بھی مطبع دار العلوم میرٹھ ۱۲۹۸ھ درج ہے لیکن نیچے سید المطابع میرٹھ بھی چھپا ہے۔ راقم نے سرورق اور اپنا دیباچہ سید المطابع میں چھپوایا ہوگا۔ راقم کے دیباچے والی مصباح النہار اسٹیٹ لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ غنی نے اپنے دیباچے میں مقدمہ دائر ہونے کا ذکر کیا ہے۔

غنی نے ساتویں جلد کا ترجمہ اپنے طور پر کاشف الاسرار کے نام سے ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء میں شائع کر دیا۔ فرحت اللہ بیگ کے بقول اس کا کچھ حصہ امان کے گم شدہ مسودہ کا پتہ دیتا ہے اور بقیہ میں کمی اور بہت کمی یعنی اختصار ہے۔ اس کی تقریظ میں سجاد حسین ریحانی رئیس میرٹھ نے امان پر طنز کیا ہے کہ وہ بار بار اغلاط کی اصلاح کرتے رہے پھر بھی ترجمہ درست نہیں ہوا ان کے مقابلہ میں غنی قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔ دوسرا طنز یہ ہے کہ غنی نے بعض اہل مطابع کی طرح جوتے باندھنے کے کاغذ پر کتاب کو نہیں چھاپا جیسا کہ سابق میں دہلی میں چھاپا تھا۔" جہاں تک کاغذ کا سوال ہے دونوں جگہ کاغذ یکساں ہے۔ امان پر یہ الزام بھی غلط ہے کہ وہ بار بار مسودوں کو بناتے تھے کیونکہ اُن کے اعزّا کے پاس ان کے مسودے موجود ہیں ان میں کہیں ترمیم و تنسیخ نہیں۔

اسی سال یعنی ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء میں راقم نے امان کی ترجمہ شدہ جلد ہفتم موسومہ بہ ضیاء الانوار شائع کر دی۔ ترجمے کی تاریخ ۱۲۹۶ھ ہے۔ راقم نے اس پر نظرِ ثانی کی ہے اور جلد پنجم کی طرح اسے بھی نواب محمد اسمٰعیل خاں فرماں فرمائے جاوَرہ سے معنون کیا ہے۔ اس کے آخر میں امان لکھتے ہیں کہ" اب آخری جلد یعنی فارسی کی پندرھویں جلد کا ترجمہ کرنا باقی رہا ہے۔ دونوں جلد ہائے اوّل یعنی مہدی نامہ و اسمٰعیل نامہ کے ترجمہ کا بھی اس ترجمہ نگار نے وعدہ کیا ہے اس طرح عجب نہیں کہ حسب شمار اردو کی دس جلدیں ہوں [۱۱]

ضیاء الانوار کا یہ نسخہ اسٹیٹ لائبریری رام پور کے لوہارو کلکشن میں محفوظ ہے۔ راقم نے آٹھویں جلد کا ترجمہ مرأت الاضمار کے نام سے ۱۸۸۳ء میں مکمل کیا اور اسی سال مطبع جماعت تجارت متفقۂ اسلامیہ میرٹھ سے شائع کیا۔ یہ جلد بھی نواب جاورہ سے معنون ہے۔ ادھر حکیم غنی نے آٹھویں جلد کا ترجمہ خاتم الاسمار کے نام سے کر کے شائع کیا۔ برٹش میوزیم میں اس کا ۱۸۸۶ء کا ایڈیشن ہے۔ راز یزدانی [۱۲] نے مرأت الاضمار کا نام مرأت الاسمار اور خاتم الاسمار

---

۱۱ ایضاً - ۱۲ میر تقی کی بوستانِ خیال از راز یزدانی نگار اگست ۱۹۵۶ء
شاعر بمبئی

خاتم الاسمار لکھا ہے۔ انھوں نے مرات الاسمار کو نویں جلد سمجھا ہے۔ یہ سب غلط محض ہے۔

(دلی کے ترجمے کو ایک چارٹ کے ذریعہ یوں ظاہر کر سکتے ہیں)

نمبر شمار	نام	مترجم	تاریخ ترجمہ	تاریخ طبع	مطبع
۱	حدائق الانظار	خواجہ امان	۱۸۵۸ء / ۱۲۷۵ھ	۱۸۶۶ء / ۱۲۸۲ھ	اکمل المطابع دہلی
۲	ریاض الابصار	"	۱۲۸۳ھ	۱۸۶۷ء / ۱۲۸۴ھ	"
۳	شمس الانوار	"	۱۲۸۵ھ	۱۸۷۱ء / ۱۲۸۷ھ	مطبع بدر الدجی دہلی
۴	بدر الآثار	"	۱۸۷۴ء / ۱۲۹۱ھ	۱۸۷۴ء / ۱۲۹۱ھ	"
۵	نجم الاسرار	"	۱۸۷۵ء / ۱۲۹۲ھ	۱۸۷۹ء / ۱۲۹۶ھ	"
۶	مصباح النہار	"	۱۸۷۹ء / ۱۲۹۶ھ	۱۲۹۸ھ	مطبع دار العلوم میرٹھ
۷	ضیا الانوار	از خواجہ امان۔ نظر ثانی از راقم	۱۲۹۶ھ	۱۸۸۳ء / ۱۳۰۰ھ	میرٹھ کالونی مطبع
۸	مرات الاضمار	خواجہ راقم	۱۸۸۳ء	۱۸۸۳ء / ۱۳۰۰ھ	مطبع جماعت تجار میرٹھ
	حکیم مقرب حسین خاں عنی کی ترجمہ شدہ دو جلدوں کی تفصیل یہ ہے				
۷	کاشف الاسرار	مقرب حسین خاں عنی	۱۳۰۰ھ	۱۸۸۳ء / ۱۳۰۰ھ	مطبع دار العلوم میرٹھ
۸	خاتم الاسمار	"		۱۸۸۶ء	"

خواجہ امان نے ترجمہ بے کم و کاست کیا ہے یعنی اپنی طرف سے کوئی طول نہیں دیا لیکن زبان بڑی با محاورہ اور دلکش ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

القصہ جس وقت شہزادے نے ایک عالم شوق میں ورق تصویر دیکھا اس طرح کا تماشائے عجیب نظر آیا کہ ہوش بجا نہ رہے یعنی ایک جانب ورق میں تصویر صبح دلکشا کی تھی اور مقابل میں تصویر شاہزادے کی مگر پیشانی پر صبح دلکشا کی تصویر کے فقط لفظ صبح لکھا تھا اور شاہزادے کی تصویر پر فقط لفظ کاذب جس کے مرکب کرنے سے جملہ صبح کاذب حاصل ہوتا تھا۔ شاہزادے نے وہ ورق مع اپنے گریبان کے چاک کیا اور اس زور ایک نعرۂ مستانہ مارا جس کی آواز فلک ہفتم تک پہنچی۔ بعد ازاں سروپا برہنہ بہزاد کے مکان سے نکل کر کوچہ و بازار میں آوارہ ہوا اور اس وقت یہ شعر متفرق زبان پر جاری رہے

ارفع اور بہزاد مصور نے کہا حضور لباس نہیں یہ کیا وضع اختیار کی ہے شاہزادہ نے فرمایا۔

برتنم تشریف عریانی خوش است   خوب مے آمد نگاہ رو بمن

حدائق الانظار ص ۳۸۵

دیگر اس ورق تصویر پر یہ عبارت لکھی تھی کہ تصویر رانی مہانند رنبت جے پال سنگھ والی دار الملک چتوڑ گڑھ۔ ہرگاہ مدن سنگھ کے ہوش و حواس بجا ہوئے اس سوداگر کو خلوت میں بلایا اور پوچھا کہ یہ تصویر کس قدر مدت سے تیرے پاس ہے سوداگر نے کہا بالفعل میں نے خریدی تھی اور یہ ارادہ تھا کہ اس ورق کو اس کے مرقع تصاویر سے جدا نہ بیچوں گا مگر غلطی سے مرقع تصاویر میں چلی آئی خیر اب کچھ عذر نہیں کر سکتا اس واسطے کہ تمام شاعر بمبئی

(بقیہ صفحہ ۳۰ پر دیکھئے)

نقی احمد ارشاد

شادؔ عظیم آبادی ـــــ تاریخ کی روشنی میں

پس منظر ـ جس وقت شادؔ نے آنکھیں کھولیں، ملک کی سیاسی معاشی، تہذیبی، اقتصادی اور سماجی حالتیں تیزی سے بدل رہی تھیں۔ پٹھان اور مغل سلاطین کا قائم کیا ہوا جاگیردارانہ نظام دم توڑ چکا تھا اور اس کی جگہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوامی بندوبست نے لے لی تھی۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں نہ صرف جاگیرانہ نظام پورے آب و تاب سے قائم تھا۔ بلکہ بادشاہ نے اُمراء کی ریشہ دوانیوں سے نجات پانے کے لئے، موروثی صوبہ داری کو رواج دینا شروع کیا تھا۔ چنانچہ اودھ میں بعد انتقال بُرھان الملک سعادت علی خاں صوبہ داری کا عہدہ نہ صرف اُس کے نابالغ لڑکے کو سپرد کیا گیا بلکہ اُس کے مرجانے کے بعد سعادت علی خاں کے داماد صفدر جنگ کو یہ عہدہ دیا گیا۔ اسی طرح صوبہ آلہ باد میں، بعد قتل نواب امیر خاں انجام صوبہ داری کا عہدہ نہ صرف میرزا محسن (برادر بزرگ صفدر جنگ) کو دیا گیا بلکہ میرزا محسن کے مرجانے کے بعد یہ عہدہ میرزا محسن کے لڑکے محمد قلی خاں کو دیا گیا۔ محمد قلی خاں شاہ عالم کے ورود الہ باد تک الہ آباد کے صوبہ دار رہے۔

بہار و بنگال میں بعد انتقال مرشد قلی جعفر خاں، اس کے داماد شجاع الدّولہ کو صوبہ داری کا عہدہ سپرد کیا گیا۔ اس کے بعد مرشد قلی خاں کے نواسے سرفراز خاں کو یہ عہدہ دیا گیا۔

جاگیرانہ نظام میں مسلمان اور ہندو دونوں فارغ البال تھے۔ دفعتہً ۱۷۷۳ء میں ہوا بدل گئی۔ دوامی بندوبست حکومت کی جنگی کارروائیوں اور صیغۂ مال کو ترقی دینے کے لئے قائم کیا گیا۔ دوامی بندوبست کے بعد بہت سے خاندان تباہ حال ہوگئے۔ جن کے پاس پیسے تھے اُنھوں نے بذریعۂ بندوبست مواضعات حاصل کر لئے، امیر بن گئے اور جن کے پاس کمپنی کے لالچی حُکّام کو خوش کرنے کے لئے پیسے نہ تھے اور قدیم فرمانوں پر بھروسا کرتے تھے، وہ بدحال ہوگئے۔

ایک جان صرف یہ باقی تھی کہ شاہِ شطرنج ہی سہی، دہلی میں بادشاہ موجود تھا، اودھ میں نواب اودھ اور مرشد آباد میں برائے نام ہی سہی ناظم مرشد آباد موجود تھا۔ دکن میں، نظام حیدرآباد۔ اس سیاسی اور معاشی تبدیلی کے زمانے میں شادؔ نے آنکھیں کھولیں۔ بدحال ہوجانے پر بھی قدیم اُمراء کی عزّت و توقیر باقی تھی۔ کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا۔ بچی کھچی آمدنی بھی فارغ البالی سے زندگی بسر کرنے کے لئے کافی تھی۔ دوامی بندوبست انقلاب لایا مگر اس طرح بھی تھوڑی سی معاش حاصل کرنے کے لئے معاشی فکروں سے بے نیازی حاصل ہوجاتی تھی۔

انگریز ہندوستان کے مالک بن چکے تھے۔ اُن کے بے لکھے ہوئے دستور میں بادشاہت کو اہم مقام حاصل تھا۔

وہ عہد کوئین وکٹوریہ کا تھا۔ اور ملکہ دوسرے ملک کے بادشاہوں کی توقیر کرتی تھی۔ روس جرمنی اور یونان سب سے اُس نے بذریعہ شادی ناتا قائم کرلیا تھا۔ ہندوستان کی ملکۂ معظمہ ہوچکی تھی۔ اُس کے ماتحت کتنے ہی راجہ اور نواب تھے چنانچہ شہنشاہیت اور بادشاہت کے وقار کو قائم رکھنے کے لئے بہادر شاہ کو اسوقت تک دہلی کے تخت پر برقرار رکھا گیا جب تک اُنھوں نے دانستہ یا نادانستہ طور سے دوسری اُبھرتی ہوئی طاقتوں سے ساز باز نہیں کی۔

شادؔ کی پیدائش ۸ر جنوری ۱۸۴۶ء میں ہوئی بہادر شاہ ۱۸۵۸ء میں معزول کئے گئے۔ گویا بہادر شاہ کی معزولی کے وقت شادؔ کی عمر تیرہؔ یا چودّہ سال کی تھی۔ بہادر شاہ نام نہاد بادشاہ ہی سہی عوام تو یہی سمجھتے تھے کہ دہلی میں بادشاہ موجود ہے۔ اس تاریک عہد میں دہلی کے اُس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی لَو دور دور تک اندھیرے میں ٹٹولنے والوں کو گو روشنی نہیں پہنچا سکتی تھی، تاہم روشنی کا ایک سہارا بنی ہوئی تھی۔ قدیم امراء کا اُسوقت تک عوام کی نگاہوں میں وقار باقی تھا۔ جب تک وہ مغل بادشاہ کو دہلی کے تخت پر دیکھتے تھے۔

واجد علی شاہ ۱۸۵۶ء میں معزول کئے گئے۔ کلکتہ (مٹیا برج) میں لاکر رکھے گئے۔ ناعاقبت بین مصاحبوں کی وجہ سے مقروض ہوگئے۔ چونکہ ہندوستان کے نئے مالک خود بادشاہت کی عزّت و توقیر کرتے تھے، ایک معزول شدہ بادشاہ کو قرض کی دشواری اور بے آبروئی سے بچانے کے لئے نئے نئے قوانین وضع کئے گئے ـــ تاکہ کوئی عوامی عدالت بادشاہ کے خلاف مقدّمہ کی سماعت نہ کرسکے۔ مٹیا برج میں پہونچنے کے بعد ۱۸۸۷ء تک واجد علی شاہ زندہ رہے۔ اس طرح بہار و بنگال و اڑیسہ کی حکومت سے دست بردار ہوجانے کے بعد بھی نواب مرشد آباد کی عزّت و حُرمت تھی۔ نواب بہادر مرشد آباد کے خوانِ نعمت سے ہزاروں انسانوں کی پرورش ہو رہی تھی۔ اسی طرح واجد علی شاہ کے کلکتہ میں بیس ہزار سے زیادہ ملازمین و متوسّلین تھے۔

سلطنت حاصل کرنے کے بعد سیاسی اقتدار کے لئے انگریزوں نے جو کچھ بھی کیا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اردو زبان اور ادب کی ترقی میں بہت کچھ انگریزوں ہی کا ہاتھ ہے۔ ۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج کا زمانہ گلکرائسٹ کا عہد اُردو آفریں سمجھا جاتا ہے۔ یورپین مؤرخین نے اُردو کے تذکرے لکھے۔ اسپرنگر۔ گارسن۔ دی۔ تاسی۔ بیلی۔ وغیرہ وغیرہ کے نام محتاج تعارف نہیں۔ مُغل بادشاہوں کے سکّے جب ہٹائے جانے لگے اور اُن کی جگہ کمپنی اور کوئین اور ایڈورڈ جارج پنجم و ششم کے یکے بادیگرے سکّے پڑنے لگے تو اُن پر اُردو کے الفاظ فارسی کے رسم الخط میں ڈھالے گئے۔ عدالتوں میں آج سے تقریبًا پچاس سال پہلے تک اُردو میں فیصلے لکھے جاتے تھے۔ جب انگریزی نے جگہ لے لی تو بھی اُردو اور فارسی کے وثیقے داخل کئے جاتے تھے،

انگریز حکّام کے لئے اُردو اور فارسی کا جاننا ضروری تھا۔ چنانچہ اُس زمانہ کا شاید ہی کوئی انگریز ا[illegible] جو میر شیر علی افسوس کی باغِ اُردو اور آرائشِ محفل سے واقف نہو۔ حد یہ کہ شادؔ تک کے دو انگریز شاگرد تھے جو اُن سے فارسی اور اُردو میں درس لیتے تھے۔ ایک اُولڈہم صاحب کمشنر پٹنہ اور دوسرے۔ آر۔ ال۔ رَاس جو پٹنہ ہائی کورٹ کے جج ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں وہ ہندوستان سے واپس گئے۔ گری آرسن صاحب آئی سی۔ ایس مشہور مؤلف ڈکشنری جو ۱۸۸۱ء میں پٹنہ کے کلکٹر تھے، وہ بھی اپنے لغت کی تیاری میں شادؔ سے کافی مدد لیتے تھے گری آرسن صاحب کا تقریبًا آج سے دس بارہ سال پہلے ولایت میں انتقال ہوا ہے۔

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جب واجد علی شاہ مٹیا برج میں رہتے تھے تو اُن کا اثر عظیم آباد پر کیسے پڑا۔ اس کا ثبوت پٹنہ کا ایک دلچسپ اور سچّا واقعہ ہے۔

شاعر عجمی

چو مغزے میر صاحب "ودی ذوشک" سنسکرت کا لفظ ہے جس کے معنی درباری مسخرے کے ہیں۔ بعد کو اسی لفظ کی جگہ "بدھ راج" نے لے لی۔ ہندو راجاؤں کے درباروں میں جو مسخرے مقرر کئے جاتے تھے اُنھیں "بدھ راج" کہا جاتا تھا۔ ابتدائے سلطنت اور انتہائے سلطنت میں مسلمانوں نے اس کی تقلید نہیں کی، مگر جب حکومت پر زوال آنے لگا تو دربارِ مغلیہ اور نوابانِ اودھ کے درباروں میں "بھانڈوں" کے علاوہ "چپت خورے" مقرر کئے جانے لگے۔ جب نواب کی خواہش ہوئی ہاتھ گرمالیا۔ احمد شاہ ابن محمد شاہ کے زمانے میں خود بادشاہ کے رضاعی بھائی نواب اشرف علی خاں فغاں کو ظریف الملک کا خطاب ملا تھا اور ان کا کام صرف ہنسانا تھا۔ جب ۱۱۶۷ھ ہجری میں بعد زوال احمد شاہ وہ دہلی سے چل پڑے اور فیض آباد میں آ کے شجاع الدّولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ تو یہاں بھی اُن کا کام ہنسانا تھا۔ چنانچہ اُسی زمانہ کا ذکر مصحفی نے کیا ہے کہ ایک دن عالمِ اختلاط میں شجاع الدّولہ نے اُن کا ہاتھ گرم پیسے سے جلوا دیا۔ اسی گرم پیسہ کی جگہ مصنّف آبِ حیات نے یہ لکھ دیا ہے کہ شجاع الدّولہ نے فغاں کے کپڑے جلوا دئے۔ جس کی تصدیق کسی تذکرے سے نہیں ہوتی۔ انشا اور مصحفی کے واقعات بعد کے ہیں۔ اسی "آبِ حیات" میں لکھا ہے کہ ایک دن سید انشاؔ دسترخوان پر سعادت علی خاں ثانی کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ سر پر ٹوپی موجود نہ تھی۔ نواب نے چپت لگائی۔ انشاؔ نے فوراً جواب دیا کہ بزرگ ٹھیک کہتے تھے۔ ننگے سر کھانا کھانے سے شیطان چپت رسید کرتا ہے۔

بعد کو صوبہ دار، رئیسوں نے بھی "چپت خورے" بحال کرنے شروع کر دیے۔ چنانچہ پٹنہ میں نواب بہادر ولایت علی خاں مرحوم (شادؔ کے پھوپھی زاد بھائی) کے یہاں ایک بھی ایک میر صاحب چپت خورے تھے۔ اُن کا سر بہت بڑا ایبے ڈول اور چار مغز کا معلوم ہوتا تھا۔ وہ "چو مغزے میر صاحب" کہلاتے تھے۔ ایک دفعہ نواب بہادر نے بہت سے تحائف واجد علی شاہ کی خدمت میں بھیجے۔ ان تحائف میں "چو مغزے میر صاحب" بھی تھے۔ اِن کو لنگوٹ باندھ کے اور تمام بدن میں گوند سے مختلف جانوروں کے پر چپکوا کر ایک لوہے کے بڑے پنجڑے میں بند کر کے بھیجا گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب واجد علی شاہ مرحوم کو کلکتہ میں چڑیا خانہ آباد کرنے کی سوجھی تھی اور ملک کے گوشے گوشے سے قیمتی جانور حاصل کئے جا رہے تھے۔

پٹنہ والوں نے سوچا کہ سب سے قیمتی جانور میر صاحب ہیں۔ انسانوں میں انسان اور جانوروں میں جانور۔ جب یہ تحفہ جانِ عالم کے سامنے پیش ہوا اور معلوم ہوا کہ یہ میر صاحب ہیں، سیّد ہیں، تو اُن کا رنگ متغیّر ہو گیا۔ ایک خط وزیر السلطان ملکہ کی معرفت بھیجا اور در پردہ لعنت ملامت کی کہ آپ لوگ کیسے سادات ہیں ایک سیّد کی ایسی بے حُرمتی گوارا کرتے ہیں۔ ممکن ہے وہ خط نواب بہادر مغفور کے خاندان میں موجود ہو۔

صرف اسی واقعہ سے سمجھ لینا چاہیئے کہ واجد علی شاہ مرحوم کا کہاں کہاں اور کس کس جگہ اثر تھا۔ ۱۸۸۴ء میں شادؔ نے دوسرا عقد کلکتہ کے ایک ایرانی خاندان میں کیا۔ تو مٹیا بُرج ہی میں ٹھہرے تھے۔ اُس زمانے کی یادگار ایک رباعی ہے۔ ؎

میزانِ ہنر پر دوسی بھی کلکتہ میں
بالغ بھی ہیں مشتری بھی کلکتہ میں
تم اپنے جواہرات کھولوا ے شادؔ
مل جائیں گے جوہری بھی کلکتہ میں

دہلی کی تباہی کا اثر عظیم آباد پر۔ عہدِ فرّخ سیّر سے لے کر عہدِ عالمگیر ثانی تک اُمرا چاہے آپس میں سازشیں کرتے ہوں۔ چاہے جھگڑتے ہوں اور ایرانی اور تورانی پارٹیاں بنا بنا کے ریشہ دوانیاں کرتے ہوں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ حملۂ نادر شاہ ۱۷۳۹ء کے بعد سے دہلی اُجڑنے لگی چنانچہ اس حملے کے پہلے شکار نواب صمصام الدولہ خان دوراں خاں تھے۔ یہ نادر شاہ کی لڑائی میں مارے گئے۔ اِن کا گھر بار لوٹ لیا گیا۔ یہ وہی صمصام الدولہ ہیں جن کے یہاں سے ایک روپیہ روزینہ میر تقی میر کا مقرر تھا۔ اس واقعہ کے بعد صمصام الدولہ کے بھتیجے خواجہ باسط لکھنؤ چلے گئے جہاں اُن کے نام کا ٹیلہ اسوقت تک مشہور ہے۔ یہ وہی خواجہ باسط ہیں جن کے متعلق تاریخ محمدی کی عبارت نقل کی جاتی ہے (خواجہ باسط خلف الصدق خواجہ جعفر و خواجہ جعفر برادر صمصام الدولہ خانِ دوران خاں است کہ درجنگ نادر شاہ ایران با محمد شاہ ہندوستان طرفِ بادشاہ ہند بکار آمد و خواجہ باسط اجلہ مشائخ شاہجہان آباد نقش بندی بود و در لکھنؤ سفر آخرت پیمود۔ ۱۱۶۷ھ)

صمصام الدولہ کا اصلی نام مآثر الامرا کے مطابق خواجہ عاصم تھا۔ مآثر الامرا صفحہ ۸۱۹ مطبوعہ کلکتہ پریس اُردو گائیڈ مرتبہ عبد الرحیم مدرس مدرسہ عالیہ کی عبارت ہے "خواجہ باسط پسر خواجہ محمد جعفر است" اس لڑائی میں مآثر الامرا کے مطابق صمصام الدولہ کے تین لڑکے اور خواجہ جعفر معہ صمصام الدولہ میدان جنگ میں کام آئے تھے۔ صرف خواجہ عاشوری صمصام الدولہ کے ایک فرزند بچ رہے تھے۔ میر و میرزا کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ باسط کے متعلق رام بابو سکسینہ آنجہانی "ہسٹری آف اُردو لٹریچر" میں تحریر کرتے ہیں" ایک مشہور صاحب دل خواجہ باسط نے جو علاوہ کمالات عرفان و تصوف، فنِ نقد میں بھی کامل دست گاہ رکھتے تھے اس مشکل اور نازک مسئلہ میں یعنی میر اور میرزا کی شاعری کے فرق کا نہایت مختصر الفاظ میں فیصلہ کر دیا اور فرمایا کہ دونوں صاحب کمال ہیں، مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام آہ ہے اور میرزا کا کلام واہ ہے۔

خواجہ باسط کی اولادوں میں میر ضمیر مغفور مشہور مرثیہ گو ہوئے۔ خواجہ باسط کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی اور صمصام الدولہ کے حقیقی بھانجے پیر سید رستم علی عظیم آباد چلے آئے۔ اُن کا حال سیرۃ المتاخرین اور تاریخ مظفری میں اختصار سے درج ہے۔ یہ بھی نقش بندی تھے۔ پیر رستم علی کی اولادوں میں شاد عظیم آبادی تھے۔
(تذکرۃ الاسلاف)

جب نواب امیر خاں انجام ۱۷۴۶ء میں قتل کر دئیے گئے تو چونکہ میر شیر علی افسوس کے دادا سید غلام مصطفےٰ نواب صمصام الدولہ کے مصاحب خاص میں سے تھے۔ میر مظفر علی اپنے صاحب زادے میر شیر علی افسوس کو ساتھ لیکر پٹنہ چلے آئے اور اسی خاندان سے وابستہ ہو گئے (نگار معلومات نمبر ۱۹۵۸ء)

نادر شاہ کے حملے سے لیکر احمد شاہ کی معزولی تک یعنی ۱۱۶۷ ھجری تک دہلی کا عجب عالم رہا۔ مرہٹوں کی "مرہٹہ گردی" جاٹوں کی شورشیں، روہیلہ افغانوں کی بغاوت، ابدالیوں کے متواتر حملے حفظ آبرو اور امان کے لئے دہلی کے بہت سے خانوادے، دہلی سے اودھ کے پورب کی طرف روانہ ہو گئے۔ نہ صرف شاد کے اجداد دہلی سے عظیم آباد چلے آئے بلکہ ۱۱۶۷ ھجری میں بادشاہ کے دودھ بھائی نواب اشرف علی خاں فغاں نے بھی دہلی کو خیر آباد کہا اور فیض آباد چلے گئے۔ جب وہاں بھی ستائے گئے تو حسین قلی خاں عشقی مرحوم کے مطابق "فغاں بعد ۱۱۷۰ ھجری بہ شہر عظیم آباد رفتہ بہ راجہ شتاب رائے ناظم صوبہ بہار توسل جست" اس وقت شتاب رائے بھی یہاں کا نام نہاد ناظم تھا۔ شاد کے زمانے میں فغاں کی اولادیں عظیم آباد میں موجود تھیں اور ذی رتبہ تھیں، جیسا کہ خود اُن کی تصنیف نقش پائیدار جلد دوم سے معلوم ہوتا ہے۔

فغاں ہی کی طرح ۔ ضیاء الدین دہلوی، دہلی سے پہلے فیض آباد گئے اور آخر میں عظیم آباد میں سکونت اختیار

بلہ ذکر میر۔ میر تقی میر (حیات اور شاعری)۔ از خواجہ احمد فاروقی۔

یہیں پیوندِ خاک ہو گئے۔ عظیم آباد میں شتاب رائے کے بیٹے راجہ بہادر اُن کے شاگرد تھے ضیا کی تعریف میرحسن اور میرزا علی لطف دونوں نے اپنے اپنے تذکروں میں کی ہے۔ یہ وہی میر ضیا ہیں جن کا شاگرد میر حسن (جدِّ انیس) کا سا زباں داں تھا۔ میرزا علی لطف اِن کے بارے میں لکھتے ہیں "اکثر شعر در زمین سنگلاخ گفتن الفاظ نامانوس مقبول دلہا ساختن کار اوست"

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد نواب جعفر خاں راغب (شاد کے پرنانا) وارد عظیم آباد ہوتے ہیں۔ یہ نواب جعفر خاں راغب۔ نواب لطف اللہ خاں صادق کی اولادوں میں تھے جن کا ذکر مآثر الامراء صفحہ ۱۷۷ پر یوں درج ہے۔

"از شیخ زادہائے انصاری وطنش پانی پت است" لطف اللہ خاں صادق، شمس الدولہ بہادر تہوّر جنگ شش ہزاری اور وزیرِ بادشاہ تھے۔ مآثر الامراء میں تحریر ہے" در لقب او کہ لفظِ صادق افزود شدہ وجہ آں زبادِ عوام است۔ دلیر دل خاں برادرِ اوست کہ ہمراہِ امیر الامرائی بود و بہ منصب سہ ہزاری رسیدہ و برادرِ سوم او شیر افگن خاں است کہ فوجداری کرہ مضافِ الہ آباد سرفراز شدہ۔ از پسرانش عنایت خاں راسخ و شاکر خاں بقدر ترقی کردند"

عنایت خاں راسخ کے پوتے نواب جعفر خاں راغب تھے جو فارسی میں میرزا فاخر مکیں معاصر سودا کے شاگرد رشید تھے۔ بعد وُرودِ لکھنؤ میرزا فاخر مکیں نے جو جو خطوط راغب کے نام لکھے ہیں اُن کو خود راغب نے ترتیب دے کر "گلزار جعفری" کے نام سے موسوم کر دیا ہے۔ گلزار جعفری کی ایک نادر نقل قلمی راجہ شتاب رائے کے پوتے کنور حشمت سنگھ عرف ڈھولو راجہ کے حرُوف میں راقم آثم کے پاس موجود ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۸ء میں پٹنہ کالج کی نمائش میں بھی پیش کی گئی تھی جس کا ذکر پٹنہ کالج میگزین میں موجود ہے۔ راقم شعبۂ تاریخ کا اُس وقت طالب علم تھا۔

یہ وہی کرہ یا کٹرا مانک پُور ہے۔ جہاں شاد کے دادا تفضّل علی خاں عرف میرن صاحب مرحوم کمپنی کے عہد میں تحصیلدار تھے۔ اسی الہ آباد میں شاد کے والد عبّاس میرزا اور چچا سیّد محمد محسن (جدِّ خیال مرحوم) کی پیدائش ہوئی۔ ۱۲۴۸ ھجری میں سیّد تفضّل علی خاں معہ اپنے دونوں صاحب زادوں کے وارد عظیم آباد ہوئے (تذکرۃ الاسلاف صفحہ ۱۹

شاد کے نانا مہدی علی خاں اور پرنانا جعفر خاں راغب دونوں دہلی نژاد تھے۔ اور دہلی میں پیدا ہوئے شاد کی ماں عارفہ بیگم کی بھی پیدائش دہلی میں ہوئی تھی۔ شاد کا ننھیالی مکان ۱۸۹۷ء تک پانی پت میں قائم تھا۔ چنانچہ جب شاد پانی پت گئے تو یہ رباعی کہی ہے؂

حیراں ہوں کہاں بہار، پنجاب کہاں　　دیکھا وطنِ شریف شکرِ احساں
اے شاد کیا رشتۂ کہنہ مضبوط　　زندہ رہیں نواب نظیر احمد خاں

پانی پت کی یادگار سنگِ مرمر کا ایک تاریخی کتبہ تھا جو شاد کے مکان میں ۱۹۴۲ء تک ایک محراب میں آویزاں تھا۔ اس کا تاریخی مصرعہ تھا؂ رونقِ ہند شہرِ صادق آباد" افسوس کہ شاد کے ایک وارث کے ہاتھوں تاریخی پتھر تلف ہو گیا۔

خانوادۂ ہمشیرزادہ صمصام الدولہ خانوادۂ لطف اللہ خاں صادق، نواب اشرف علی خاں فغاں، میر ضیاء الدین ضیا، میر مظفر علی، میر شیر علی افسوس کے علاوہ جو امرائے دہلی یا فیض آباد وارد عظیم آباد ہوئے اُن میں مشہور شاعر بھی

میرزا میڈھو اور میرزا جنگلی ہیں۔ میرزا میڈھو اور میرزا جنگلی کے معرکے شاہ عالم ثانی کے عہد کی دہلی میں مشہور
ہیں۔ اور وقائع عالم شاہی مصنفہ کنور پریم کشور فراقی نبیرۂ راجہ جگل کشور ثروت دہلوی۔ عظیم آبادی
(شاگرد میر تقی میر) میں درج ہیں۔ امتیاز علی عرشی کی تشریح صفحہ ۱۷۹ سے نقل کی جاتی ہے۔
• میرزا جنگلی۔ ان کا پورا نام مع خطاب عضد الدولہ مبارز الملک میرزا شہامت علی خاں بہادر مصطفر جنگ
ہے۔ نواب آصف الدولہ کے انتقال پر ابراہیم بیگ افسر توپ خانہ اور عبدالرحمن خاں قندھاری کے بھروسے
پر منصب وزارت کی اُمید باندھ کر بہو بیگم صاحبہ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ میرا ساتھ دیں تو
سند مستحکم ہو جائے۔ مگر وہ راضی نہ ہوئیں۔ اور انھیں اس ارادے سے باز رہنا پڑا۔ (عماد ۱۶۶ - تواریخ
اودھ ۱۳۵)
نواب سعادت علی خاں برسر اقتدار آئے تو انھیں لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ یہاں سے نکل کر یہ میرزا نجف خاں کے
لشکر میں پہونچے۔ میرزا کے بعد افراسیاب خاں کے ساتھ رہے۔ اس کے مارے جانے کے بعد پٹیل (مادھوجی سندھیا)
کا ساتھ دیا۔ بعد ازاں لکھنؤ واپس آگئے اور کچھ دن گذار کر عظیم آباد پٹنہ کا رُخ کیا اور وہیں سپرد خاک ہوگئے۔"
میرزا میڈھو۔ نواب امین الدولہ معین الملک میرزا جلیل الدین خاں بہادر ناصر جنگ عرف میرزا میڈھو جن کا ذکر
فراقی کے یہاں صفحات ۸۴، ۸۵ پر آیا ہے، میرزا جنگلی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ یہ لکھنؤ سے لیکر عظیم آباد تک ہر جگہ
بھائی کے ساتھ ہی رہے۔"
شاد نے حیاتِ فریاد میں لکھا ہے کہ میرزا میڈھو کے مکانات محلّہ مغل پورہ میں تھے اور گلزار باغ اسٹیشن کے
قریب اُن کے باغات تھے۔ میرزا جنگلی ببوا گنج میں رہتے تھے۔
آمدم برسر مطلب۔ یہ واقعات شاد کی پیدائش کے پہلے کے ہیں مگر اوپر کی صراحت سے یہ تو واضح
ہوگیا کہ اُس وقت کا عظیم آباد آج کے ایسا عظیم آباد نہ تھا جب شاد نے آنکھیں کھولیں تو دہلی شہزادوں کو
دیکھا۔ نانا کو دیکھا۔ اپنی ننھیال پورب دروازے میں پیدا ہوئے۔ جب سن تمیز کو پہونچے تو اُن قدیم اُمراء
کی اولادوں کو دیکھا جن کے باپ دادا براہِ راست دہلی سے آئے تھے۔ اُن کے اتالیق میر سید محمد مرحوم
فیض آبادی مقرر کئے گئے۔ یہ میر سید محمد، میر حیدر علی دفتردار کے پوتے تھے اور میر انیس کے بچپن کے
دوست اور ساتھ کے کھیلے ہوئے تھے۔ فیض آباد میں میر حسن اور میر حیدر علی نے بہ یک احاطہ مکان
بنالئے تھے۔ میر حیدر علی، نواب امیر خاں انجام کے مصاحبینِ خاص میں سے تھے اور محاوروں کا
دفتر انھیں کے پاس رہتا تھا۔ اس لئے دفتردار کہلائے۔
جب میر انیس فیض آباد سے برداشتہ خاطر ہوکر لکھنؤ چلے گئے۔ تو میر سید محمد شاد کے نانا مہدی علی خاں خلفِ جعفر خاں
راغب کے ساتھ لکھنؤ سے عظیم آباد چلے آئے۔ اور یہیں پیوندِ خاک ہوگئے۔
شاد ایک جگہ اپنی فارسی کی ایک مثنوی ثمرۃ الفواد میں کہتے ہیں ؎

چو تعظیم بزرگاں ہست کیشم — در اُردو پیروِ آبائے خویشم
زباں دانانِ ایں شہرِ معظم — نہ پنداری کہ بودند از کسے کم
زبانِ مادری من ہماں است — نہ ماخوذ از کلامِ دیگراں است

ان اشعار سے تو صرف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ شاد نے صرف اپنے آباؤ اجداد کی زبان میں پیروی کی۔ زبان دانا

اہلِ شہر" سے مراد وہ مخصوص چند خانوادے ہیں جن کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں، نہ کہ پٹنہ کے عوام۔ عوام تو چاہے شاہجہاں آباد کے ہوں، اکبر آباد ہوں یا لکھنؤ اور فیض آباد کے، سب برابر ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاد اور اُن کے معاصرین بہار کی زبان میں اتنا فرق نہ ہوتا۔ ایک بات اور عرض کر دینی ہے کہ تعصب کی وجہ سے صرف دہلی اور لکھنؤ کو قدیم اُردو کا مرکز بتایا گیا ہے۔ اکبر آباد کو جہاں کے خود میر تقی میر اور میاں نظیر اکبر آبادی تھے کیوں فراموش کر دیا گیا۔ یا فیض آباد کو جہاں میر ضلیق، میر انیس اور آتش جیسے زبان دان پیدا ہوئے اور پرورش پائی۔ اسی طرح عظیم آباد۔ شاد کے حقیقی بھانجے اور چچازاد بھائی کے لڑکے نصیر حسین خیال نے نثر کی دو کتابیں چھوڑیں "مغل اور اُردو" اور "داستانِ عجم" اس ترقی یافتہ زمانے میں بہار سے کتنی عمدہ نظم و نثر کی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان کتابوں کو پڑھنے والے خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ بحیثیتِ زبان شاد و خیال کی کتابوں اور ان کتابوں میں کتنا فرق ہے۔ یہ وہی نصیر حسین خیال ہیں جن کے متعلق علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم فرما گئے ہیں ؎

تصویرِ خیال کھینچتی ہیں آنکھیں ..... صد کمال کھینچتی ہیں آنکھیں
ظاہر ہے ادیبِ مُلک کے خامے سے کیا بال کی کھال کھینچتی ہیں آنکھیں

ہندی کے برجستہ محاورے اور الفاظ جو شاد نے نظم کئے ہیں یا لکھے ہیں، اُن کے متعلق میں یہی کہوں گا کہ میر انیس اور نظیر اکبر آبادی سے زیادہ شاید ہی کسی نے اتنے ہندی کے الفاظ نظم کئے ہوں۔ شاد کی وہی زبان تھی جو میر انیس مرحوم کی تھی اور اس کا اعتراف خود میر انیس کے حقیقی چھوٹے بھائی میر نواب مونس مرحوم نے اپنے ایک خط میں کیا ہے" میں تو آپ کی طبعِ خداداد اور فصاحتِ کلام کا ہمیشہ سے قائل ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ آپ کا آفتابِ کمال ہندوستان میں چمکے گا"۔ میر انیس کے فرزند اور جانشین میر نفیس مرحوم کا خیال، پروفیسر اختر اورینوی کی زبان سے سُنیئے۔ میر نفیس لکھنوی کا قول ہے کہ شاد عظیم آبادی انیس کے پایہ کے مرثیہ نگار رئیس المتغزلین اور امامِ مرثیہ نگار شاد عظیم آبادی ناول نگاری کی اقلیم کا بھی تاجدار ہے"میرے خیال میں میر نفیس مرحوم کو لکھنوی لکھنا غلط ہے، بلکہ فیض آبادی۔ میر نفیس مرحوم، لکھنؤ اُس وقت اپنے والد کے ساتھ آئے جب اُن کا شباب رخصت ہو چکا تھا۔ خود نفیس نے کبھی بھی خود کو لکھنوی نہیں لکھا ہے اور نہ اُن کی زبان ہی لکھنؤ کی تھی۔

شاہ محمد آغا شاغل مرحوم برادر مادری میرزا داغ ایک خط میں تحریر کرتے ہیں" آپ کو یاد ہوگا کہ پہلی دفعہ جو میں نے مشاعرہ کنور صاحب میں آپ کا کلام سُنا تھا تو عرض کیا تھا کہ دہلی سے نکل کر ایسی عمدہ زبان میں نے نہیں سُنی" داغ کے داماد سائل دہلوی مرحوم کہتے ہیں ؎ "سائل آیا نہ کہو معتقدِ شاد آیا" سوال یہ رہ جاتا ہے کہ شاد کی زبان میر انیس کی زبان کیسے تھی؟ دہلی میں بھی صرف چند مخصوص خانوادے تھے جن کی زبان ٹکسالی مانی جاتی تھی۔ میر تقی میر نے اپنی زبان کو عوام کی زبان بتایا ہے اور کہا ہے کہ میری زبان وہی ہے جو دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بولی جاتی ہے۔ اُنہوں نے اپنی زبان کو خواص کی زبان نہیں کہا ہے۔ چنانچہ اس کا اثر خود اُن کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن کی جگہ قران، پلید کی جگہ پلیت، شتاب کی جگہ شتابی، ایری کی جگہ امرائی، خوانچہ کی جگہ کھانچہ۔ اس قسم کے الفاظ میر کے دیوان میں کثرت سے ملیں گے۔ مثال دینے کی ضرورت نہیں۔ میر کے معاصر نواب اشرف علی خاں فغاں کے کلام میں آپ کوئی ایسا لفظ نہیں دکھا سکیں گے۔ میں نے کم از کم دس بار فغاں کا دیوان پڑھا ہے۔ وجہ یہ ہے، بقول فغاں ؎

ہوں مقیم اُردوئے مُعلّیٰ کا تربیت یافتہ ہوں اُس جا کا

اردوئے معلّی کیا قلعۂ معلّی کہئے۔ نواب صمصام الدّولہ اُن کے بھتیجے خواجہ باسط اور بھانجے پیر رستم علی کا ذکر ہو چکا۔ صمصام الدّولہ کے ہم عہد اُمرائے دہلی ہیں۔ نواب اسحاق خاں شُستری (بہو بیگم مادر نواب آصف الدّولہ کے والد) محمد اسحاق خاں کے بیٹے نواب سالار جنگ جو صفدر جنگ کے ساتھ فیض آباد چلے گئے نواب صفدر جنگ جنھیں بعد صمصام الدّولہ عہدۂ وزارت عطا کیا گیا تھا اور یہ وہی صفدر جنگ ہیں جنہوں نے احمد شاہ ابدالی کو پہلی جنگ میں شکست فاش دی تھی (عماد۔ سیرۃ المتاخرین) صفدر جنگ کے بیٹے شجاع الدّولہ نواب امیر خاں انجام نواب لطف اللہ خاں صادق۔ یہ سب کے سب ایک مذہب اور ایک جماعت کے لوگ تھے اور تاریخ کی زبان میں انہیں ایرانی پارٹی کہا جاتا ہے (تاریخ سرکار۔ لیٹر مغل) اِن سبھوں میں بحیثیتِ زبان و فن اگر کسی کو فوقیت حاصل تھی تو وہ نواب امیر خاں انجام تھے۔ جو سات زبانوں کے ماہر ہونے کے علاوہ فن موسیقی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ غازہ کی ٹھمری نواب صاحب موصوف کی ایجاد کی ہوئی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ میر تقی میر جب اپنے خالو جان آرزو کے یہاں سے الگ کر دئے گئے تو نواب امیر خاں انجام کی ڈیوڑھی سے وابستہ ہو گئے میر شیر علی افسوس کے باپ دادا سب کے سب پہلے نواب صمصام الدّولہ کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ اور ان کے بعد نواب امیر خاں انجام کی مصاحبت اختیار کر لی تھی (تاریخِ داستانِ اردو مولفۂ حامد حسن قادری۔ نگار معلومات نمبر ۱۹۵۸ء)

محاورات کے دفتر کو بہو بیگم مادر آصف الدّولہ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مگر اس کی ابتدا نواب امیر خاں انجام نے دہلی میں کی تھی اور میر حیدر علی، معاصر میر ضاحک و میر حسن کے ذمّہ یہ دفتر رہتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ حیدر علی دفتردار کہلائے۔ ۱۷۴۵ء میں نادر شاہ کا حملہ ہوا صمصام الدّولہ قتل کئے گئے۔ ۱۷۴۶ء میں امیر خاں انجام قتل کئے گئے۔ اس کے چند سال بعد ہی میر حیدر علی دفتردار، میر ضاحک، میر حسن سب کے سب سالار جنگ۔ (آصف الدولہ کے ماموں) کے متوسلین درباریں کے فیض آباد چلے آئے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کی ابتدا شہادتِ نواب امیر خاں انجام سے ہوئی۔ مآثر الاُمراء کی عبارت ہے۔

"بست و سوم ذی الحجہ سنہ ۱۱۵۹ ہجری۔۔۔۔ حسب الطلب بہ دربار می رفت۔ چوں بہ دروازۂ دیوان خاص رسید یکے از نوکران نو ملازمش اورا بہ زخم جمدھر کشت۔ او بہ حاضر جوابی و مطایبہ گوئی متّصف بود و از لبِ مصاحبت بادشاہ بہ ہیچ و یک سُرخرو نمی آورد۔ در فنون بسیار مہارت داشت۔ شعر می گفت۔ و انجام تخلص می نمود۔ از وست

من از جمعیّتِ اسودگانِ خاک دانستم کہ غیر از خشت بہر خواب راحت نیست بالینے"

۱۷۴۵ء اور ۱۷۴۶ء میں صمصام الدّولہ اور نواب انجام کے مارے جانے کے بعد یہ قافلہ پراگندہ ہو کر دہلی سے نکل پڑا۔ صفدر جنگ اور سالار جنگ فیض آباد چلے گئے۔ کچھ تو متوسلین دربار فیض آباد چلے گئے اور کچھ عظیم آباد۔ جیسے میر مظفر علی، میر شیر علی افسوس، میر ضیاء الدین ضیا، اشرف علی خاں فغاں۔ کچھ پہلے دہلی سے نکل پڑے اور کچھ چند سال بعد۔ شاد کا جدّی اور مادری خاندان بھی انھیں خاندانوں میں تھا جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، اس پر میر سیّد محمد نبیرۂ میر حیدر علی دفتردار دہلوی کی صحبت۔ انیس اور شاد کی زبان میں کیونکر فرق ہوتا۔ بقول علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم: ہم عظیم آباد کو حضرتِ شاد مرحوم کی وجہ سے زیادہ پہچان سکے۔ علامہ شاد عظیم آبادی مرحوم کی نسبت نے اسے ہندوستان کے ادبی جغرافیہ میں بہت ممتاز جگہ دے دی ہے۔ (مقدمہ مثنوی مادرِ ہند)

صمصام الدّولہ و خواجہ عاصم (خود نقش بندی تھے۔ یہ خاندان اہل باطن میں سے تھا۔ زمانے کی انگت

دیکھکر بالخصوص عہد سید حسین علی بادشاہ گر میں خواجہ عاصم نے فقر و غنا کا لبادہ پھینک کر سیاست کو اپنا شعار بنالیا تھا۔ نادرشاہ کے حملے نے دولت و عمارت کو خاک میں ملادیا۔ خواجہ باسطاہی کی طرح اُن کے پھوپھی زاد بھائی پیر رستم علی (شاد کے مورثِ اعلیٰ) نے فقر و تصوّف کو اپنا شعار زندگی بنایا تھا۔ اِن کے مرید بھی تھے اور مثل نقش بندی فرقے کے پٹنہ میں زندگی گذار رہے تھے کہ شہید کردیئے گئے، چنانچہ ان کے نام سے ایک گلی پیر رستم علی کی گلی" پادری کی حویلی کے متصل اس وقت تک موجود ہے۔

آپ کلام شاد میں جو تصوّف کا بھرپور اثر دیکھتے ہیں یہ اُسی خون کی تاثیر ہے۔ بچّہ ماں باپ کی زبان بولتا ہے۔ شاد کی وہی زبان تھی جو انیس کے اجداد دہلی سے فیض آباد لے گئے اور شاد کے داد اور نانا دہلی سے عظیم آباد لائے۔ میرے بیان کی تصدیق خود شاد کے دیباچۂ مثنوی چشمۂ کوثر مطبوعہ ۱۳۰۲ ھجری سے ہوتی ہے۔ تحریر کرتے ہیں " کم سواد سیّد علی محمد شاد تخلصاً و حسینی الحسنی نسباً و عظیم آبادی موطناً و دہلی اصلاً کہ سلسلۂ انساب اتم و ابش عفر اللہ لہما۔۔۔۔۔"

دورِ شاعری دہلی سے نہ صرف محمد شاہی اردو عظیم آباد آئی بلکہ وہ کُل سماجی اور تہذیبی حالتیں جن کا سرچشمہ بادشاہِ دہلی محمد شاہ تھا۔ دہلی کے دیوان عام اور دیوان خاص میں بادشاہ کے بنائے ہوئے گانوں کے بول بے نظیر بائی اور اُدھم بائی (مادرِ احمد شاہ) کی زبان سے نکل کے گونجتے تھے ؎

چکنیاں مورا سنگ نہ چھانڈو رے

یہاں تک کہ آخری تاجدار دہلی بہادر شاہ ظفر مرحوم بھی اس فیض سے خالی نہ تھے۔ ایک ہولی ظفر کی ملاحظہ ہو[۵]

کیوں موں پہ رنگ کی ماری پچکاری	دیکھو کنورجی دوں گی میں گاری
بھاگ سکوں میں کیسے موں سے بھاگا نہیں جات	تمھاری دیکھوں او کوں جو سنگ آت

محمد شاہ کے ترانوں میں برج بھاشا کا اثر ہے اور ظفر کے ترانوں میں پنجابی کا۔ بہر کیف امیر خاں انجام کے فنِ موسیقی کا اگر نمونہ دیکھنا ہو تو میر شیر علی افسوس کے ہندی ترانوں کو ملاحظہ کیجئے۔ ایک ٹھمری دھن غانہ کی اردو فارسی میں ملاحظہ ہو ؎

بہ بیں سایۂ زُلف بماہِ رخت	کہیں مہر لقا ہے کہیں چندر گہن
شُد از تو شعاع جلوہ نما	شرمندہ ہوئی سورج کی کرن
فرمودہ بتاں واللہ عیاں	رسیا را دھے نے ہے شیام برن

بہ بیں سایۂ زلف شدہ شام و سحر

امروز بہم

دکھلائی نرالی آج پھبن

افسوس گُل و سُنبل ہوں خجل اور چمن میں اُلجھے سرو و سمن

میر شیر علی افسوس کا سالِ وفات ۱۸۰۹ء ہے۔ اور شاد کا سال ولادت ۱۸۴۶ء۔ اس ۳۷ سال کے عرصہ میں بلکہ اس کے بہت بعد تک عظیم آباد میں افسوس کے ترانے گونج رہے تھے۔ جن کے شواہد خود شاد اور سلطان خلف نواب بہادر ولایت علی خاں کے ہندی ترانوں میں ملتے ہیں، شاد کا یہ رنگ جابجا اُن کے اُردو کے کلام بالخصوص جوانی کے کلام میں زیادہ اُبھر جاتا ہے۔ یہ اثر شاد کے کلام پر ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۵ء تک رہا گرچہ اس وقت شاعر بمبئی

بھی اُن کی شاعری کا دامن ابتذال سے پاک رہا۔ دیکھئے "پنکھے" کی تعریف میں کتنی عمدہ برج بھاشا میں کہتے ہیں ؎

سکھی ؎ آپ ہلے اور مو کو ہلاوے ہلتے ہلتے لگ گئیں انکھیاں
سہیلی ؎ کہُ سکھی! ساجن!
سکھی ؎ نا سکھی! پنکھا!

اس قسم کی چیزیں محض چند مستند اساتذہ کے کلام کو چھوڑ کے آپ کو کہیں نہیں ملیں گی۔ مثلاً محمد شاہ رنگیلے، سراج الدین ظفر، واجد علی شاہ اختر، نظیر اکبرآبادی، میر شیر علی افسوس یا مرثیہ میں جیسے بعض بعض مصرعے میر انیس نظم کر گئے ہیں ؎ تو اپنی مانگ کو کھ سے ٹھنڈی رہے سدا ؎ صندل سے مانگ بچّوں سے گودی بھری رہے۔ وغیرہ وغیرہ یا میر مونس ؎ طرّہ وہی ہے سر پہ مہیسر چڑھے جو پھول۔ سنسکرت کے لفظ "مہیش" معنی شیو سے مہیسر بن گیا۔ یہاں اس مقدس پھول کی طرف اشارہ ہے جو شیو کے لنگ پر چڑھایا جاتا ہے۔

میں نے ۱۸۶۵ء اس لئے لکھدیا کہ اُن کا پہلا مجموعۂ کلام "نالۂ شاد" ایک عشقیہ مثنوی ۱۸۶۵ء میں مطبع بہار پریس محلہ قلعہ عظیم آباد سے پہلی بار شائع ہوئی۔ اس میں شاد نے ایک عشقیہ قصہ نظم کیا ہے۔ عاشق اپنی محبوبہ کے پاس جاتا ہے ؎

پھر نہ اک دم متحمل ہوا وہ — خانۂ یار میں داخل ہوا وہ
وہ بہارِ چمنستانِ مُراد — رشکِ رعنائیٔ سروِ آزاد
وہ شہ کشورِ اقلیم جفا — خسروِ سلطنتِ حسن و ادا
حور کی طرح بصد کرّ و فر — مسندِ ناز پہ تھی جلوہ گر
گرد و پیش اس کے کئی عاشقِ زار — کوئی دل ریش کوئی سینہ فگار
حالتِ نزع کسی پر طاری — خون آنکھوں سے کسی کے جاری
دردِ دل کوئی سُناتا تھا اُسے — زخمِ دل کوئی دکھاتا تھا اُسے
ناز پر کوئی تھا قرباں ہر بار — تمکنت پر کوئی ہوتا تھا نثار
کی تحیّر سے جو اُس سمت نگاہ — دیکھا اک شخص ہے با حالِ تباہ

یہ ایک سترہ اٹھارہ سال کے نوجوان کا کلام ہے۔ اُن کے ہندی مذاق کا اثر اُن کے اردو کے کلام سے اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں حقائق و معارف کے متعلق مضامین نظم کرتے ہیں، ایک دو شعر اُن کے فطری لگاؤ کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً یہ غزل جس کا مطلع ہے ؎ نہ بے تابی نہ بے خوابی کوئی تربت کے سونے میں "پڑے آرام سے چُپکے پڑے ہیں ایک کونے میں" اس غزل کے سب اشعار مطبوعہ ہیں، صرف ایک شعر غیر مطبوعہ جو دیوان جلد اوّل میں موجود ہے ؎

دکھائیں لاکھ جوبن بالیاں، کانوں کی جھُک جھُک کر — وہ رنگت چمپئی گالوں کی ہل جاتی ہے سونے میں

غالباً اس کو مبتذل سمجھ کے مرتبینِ کلام شاد "میخانۂ الہام" نے مطبوعہ مجموعوں میں نہ دیا۔ مگر در حقیقت اس سے عمدہ تصویر نہیں ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ لفظ "یوون" سنسکرت کا यौवन ہے معنی خوبصورتی جب اردو والوں نے ہندی کا دامن چھوڑ دیا تو ایک سے ایک رکیک خیال کے ساتھ اس لفظ کو اردو میں استعمال کیا ہے۔ امیر مینائی تو یہاں تک کہہ گئے ہیں ؎

آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن بھی دکھاؤ صاحب　　وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

شاد نے اس شعر میں اس لفظ کو حقیقی معنوں میں استعمال کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ دیکھو ہم یوں نظم کئے جاتے ہیں۔ پر محبوب کے لئے چمپئی رنگ اور اس کی تشبیہ سونے سے، اردو میں ایسے اشعار مشکل سے نظر آئیں گے۔

ایک لفظ ہندی کا "گونج" ہے، جس کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں۔ میر انیس نے نظم کیا ہے ؎ گونجے ادھر بھی شیر کہ رن بولنے لگا ۔ شاد نے "گونج" کو ردیف قرار دے کر اس لفظ کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کر دیا ہے ۔ افسوس اسوقت یہ غزل مل نہیں رہی ہے۔ تاہم حافظہ کی مدد سے دو شعر سنئے ؎

ابتدائے وصل میں کب تھی تمہیں اتنی تمیز　　یاد ہے کہتے تھے اکثر کھول دوبالے کی گونج

کیا اسے بالا کسی محبوب کا سمجھا ہے شاد　　غور کر کے دیکھتا ہے چاند کے ہالے کی گونج

یہ سب ابتدائی کلام ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب حقیقت سے مجاز پر اتر آتے ہیں، تو قیامت ڈھاتے ہیں۔ چنانچہ اس غزل کو ملاحظہ کیجئے جس کے سب اشعار میں تصوّف اور مختلف فلسفے نظم کئے گئے ہیں ؎

بدن میں جب تک ہے روح سالم تری محبّت نہاں رہے گی　　لگی کو کیونکر بجھاؤں گا میں، یہ آگ تا استخواں رہے گی

کہتے کہتے اسی غزل میں کہہ جاتے ہیں ؎

وہ چاند سا منھ، وہ کالی ناگن، زمانہ کہتا ہے جس کو گیسو　　جو چھیڑتا ہے تو سن لے ناصح لہے گی یاد اسکی ہاں لہے گی

بجز اس کے کوئی شعر اس غزل کا مجازی نہیں ہے ـــ ایسی عمدہ عمدہ تصویریں ان کے ابتدائی کلام میں بہت پائی جاتی ہیں ؎

کالی کالی آنکھیں ہیں اور گوری گوری رنگت ہے　　گھڑے ٹھڑے ابرو ہیں اور بھولی بھولی صورت ہے

سلطان میرزا مرحوم کا ذکر آ گیا۔ اُن کی "ایک" ہولی ملاحظہ ہو اور اس کے ہر ہر بول کی شرح شاد کی غزلوں کے اشعار میں ملاحظہ ہو ؎

سانول[1] بانکے، نینوا چھپائے[2] جات　　پگ دھرت تلو تلو بل کھائے[3] جات

سلطان پیا کے نین[4] جلم ہیں　　ترچھی[5] نجر مسکائے جات۔

[1] سانول ۔ (شاد) ؎ سانولا رنگ نمک ریز جراحاتِ جفا۔ اُف کہاں دھیان گیا ۔

[2] نینوا چھپائے جات ۔ شاد ؎ اُف اُف وہ ہتھیلی سے اُن کا شرما کے چھپانا آنکھوں کو
برچھی کا ادا کی چل جانا اور تیر نظر کا رہ جانا

ہمارے عہد میں ایک بہت بڑے شاعر نے اسی خیال کو اس طرح نظم کر دیا ہے
؎ ۔ معشوقۂ نوخیز کا وہ رہ رہ کر　　آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ملنا ہے ہے۔
وہاں شرما کے آنکھیں چھپانا ہے اور یہاں آنکھوں کا ہتھیلی سے ملنا ہے ۔ بہر کیف ؏

[3] بل کھائے جات ؎ اپنی ادا سے آپ جھجکنا، اپنی ہوا سے آپ کھٹکنا
چال میں لغزش منھ پہ ہوائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

[4] نین جلم ؎ آڑی نگاہیں جان کی دشمن، سانپ وہ گیسو زلفیں ناگن
تیر گئی سینے میں کٹاری، ہو چکا جینا اب نہ جئیں گے

[5] ترچھی نجر ؎ ترچھی نظر سے لے کے کام، پھیر کے منھ چلے گئے　　ہائے رے کم نگاہیاں، ہائے رے کج ادائیاں

شاد نے خود ہندی کے اوزان میں ہولی۔ ساون چیت اور ٹھمریاں کہی ہیں، جن کا بیان طوالت سے خالی نہیں، یہ رنگ شاد کی شاعری پر ۱۸۷۰ء تک چڑھا رہا۔ ۱۸۷۵ء میں انھوں نے تاریخ بہار لکھی۔ اسی تاریخ میں انھوں نے ایک مسدس "یادِ عظیم آباد" شائع کرایا، اب یہ فروغ ہستی میں شائع ہو چکا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں۔
"خود پسندی اور جہل مرکب میں عمر کو ضائع کیا کہ یکایک آنکھ جو کھلی اور غشاوۂ عصبیت جو دُور ہوا، اہلِ یورپ کے علوم و فنون کا دھیان آیا۔ اُن کی شائستگی پر توجہ کی۔ غرض جسقدر حالات زیادہ منکشف ہوتے چلے اتنا ہی اپنی جہالت کی ندامت بڑھتی گئی۔ اور سوچے تو یہ سوچے کہ بہت دن بے خبر سوتے رہے۔ وقت کو ضائع کیا۔ نہ علم آیا نہ فن۔ نہ شعر اس پایے تک پہونچے نہ سخن۔ بغرضکہ ایک عجیب و غریب تاریکی میں اپنے کو مبتلا پایا"
انھوں نے اسی وقت سے اپنا طرزِ کلام بدل دیا۔ چنانچہ اخلاقی اور قومی مثنویاں لکھیں۔ اب جو غزل کہتے ہیں۔ تو اُن میں یا تو فلسفہ یا تصوف کی باتیں ہیں یا قومی جذبے کو اُبھارتے ہیں ؎ عوض تدبیر غم کے جان کھونا ہم کو آتا ہے۔ جو شاعر ایسی غزلیں کہتا تھا ؎ سرد ہوا تاریک جہاں آ کے گھٹائیں کالی جائیں۔

فصل شباب اور موسم ایسا، ہائے یہ راتیں خالی جائیں

وہی اب کہنے لگا ؎ نہیں کیا ہوا جو بدل گئے بڑی حیرتوں کا مقام ہے ؎ جہاں ہے مکتب حیرت سبق ہے چُپ رہنا۔
شاد کا معیارِ شاعری اس ترقی پسند ادب کے زمانے میں، ہمارے سامنے ہر قسم کے مضامین پر نظمیں موجود ہیں۔ اور کہی جا رہی ہیں۔ غزلوں میں بھی بہت سی جدتیں کی جا رہی ہیں۔ یہ سب قابلِ ستائش ہیں، مگر جہاں تک رومانی شاعری کا سروکار ہے۔ گھوم پھر کے وہی مضمون۔ چنانچہ ایک مثال ملاحظہ ہو ؎

شکیل بدیوانی ؎ پایل کے غموں کا علم نہیں جھنکار کی باتیں کرتے ہیں۔
جمیل مظہری ؎ تمھاری تانوں میں گھنگھرو والے کسی کا شکوہ بھی سُن رہے ہیں
کسی سے فریاد کر رہا ہے تمھارے گھنگھرو کا دانہ دانہ

آج سے تقریبًا نوّے سال پہلے غزل میں شاد یہی مضمون یوں باندھ گئے ہیں ؎

دل مٹے دیتی ہے پازیب کے دانوں کی صدا کون پامال ہوا ہے جو یہ فریادی ہے

شاد کے معیارِ شاعری کو جانچنے کے لئے اُن کے ہم عہد شعراء کے کلام کو سامنے رکھ کے جانچنا چاہیئے۔ اِن کے ہم عہد شعراء میں داغ، امیر مینائی، جلال، حالی اور اکبر تھے فلسفیانہ تعمق اور نفسیاتی بصیرت کے شواہد جو کلامِ شاد ملتے ہیں۔ وہ کسی ایک کے کلام میں نہیں ملیں گے۔ اس کا اعتراف خود امیر مینائی مرحوم نے اپنے ایک خط مرقومہ ۵ رشوال ۱۳۰۷ ھجری میں یوں کیا ہے "متفرق احباب سے جو شعر آپ کا سُنا دل میں اُتر گیا۔ حق یوں ہے کہ فی زماننا آپ کے کلام میں جو بیان اور جیسی متانت ہے، کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ آگاہیٔ فن اور ماہریت، حقیقتِ سخن باوجود سلاستِ زبان و صفائیٔ بیان کے جیسی آپ کے اشعارِ متین سے ٹپکتی ہے، میرے نزدیک یہ کسی معاصر میں نہیں ہے"
جس وقت ڈاکٹر اقبال مرحوم کی نظروں سے یہ غزل گذری ؎ اے ازلی الوجود۔ اے ابدی البقا۔ اور اُن کی نظر اس شعر پر پڑی "تیری حقیقت تلک کس کی رسائی ہوئی۔ بازیٔ طفلانہ ہے مسئلۂ ارتقا"
تو کہہ اُٹھے کہ اتنا بڑا نباضِ فطرت شاعر نہیں پیدا ہوا۔ افسوس یہ ہے کہ اُن کا کلیات تو درکنار غزلوں کا مجموعہ بھی پورا اسوقت تک شائع نہیں ہوا اور جو غزلیں شائع ہوئی ہیں اُن کے بعض اچھے اشعار چھوٹ

گئے ہیں۔ داغ، امیر، حالی اور اکبر کی غزلوں کو غور سے دیکھ جائیے اور خود ہی فیصلہ کر لیجئے۔ علامہ نیاز فتحپوری کی تحریر ملاحظہ ہو۔ میری رائے میں اُن سے بہتر غزل گو نصف صدی میں کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔"

"شاد، ۱۸۵۰ء سے چھ سات سال قبل عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں رہے۔ یہ اپنے رنگِ تغزل کے لحاظ سے میر و سوز کے متبع تھے۔ بیان کی سادگی۔ نرم لب ولہجہ، سوز وگداز اور واقفیت جنہیں تغزل کی جان کہا جاتا ہے۔ ان کے یہاں اسقدر دلکش ومعتدل انداز میں پائی جاتی ہے کہ اُس عہد کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں ملتی۔ اِن کی شاعری کے شباب کا وہی زمانہ تھا جو امیر و داغ و جلال وغیرہ کا۔ لیکن جو سنجیدگی اور متانت ومعنویت اُن کے ہاں پائی جاتی ہے، وہ کسی کے ہاں نظر نہیں آتی۔" (نگار، اصنافِ سخن نمبر سالنامہ جنوری فروری ۱۹۵۷ء)

آخر میں شاد تصوّف اور حقانیت کو بیان کرتے کرتے کلامِ پاک کی آیتوں، احادیث رسولؐ کلام مرتضوی اور ارشاداتِ امام حسین علیہ السّلام کو غزلوں میں نظم کرنے لگے تھے۔ چنانچہ سورۂ مزّمل کی تفسیر ایک غزل کے چند اشعار میں ملاحظہ کیجئے۔ کلامِ باری ہے۔ " يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝ " (مطلب۔ اے میرے چادر لپیٹنے والے (اے رسول) نماز کے واسطے کھڑا ہو۔ پوری رات نہیں تھوڑی سی رات یا آدھی رات یا اس سے بھی کچھ کم) ؎

اپنے گدا کو خود وہ پکارے اٹھ مرے کالی کملی والے ۔۔۔ اُٹھ مرے عاشق میرے پیارے اُٹھ مرے کالی کملی والے

چاند کی رنگت زرد ہے پیارے صبح کے دیکھ آثار ہیں سالے ۔۔۔ ڈوب چلے دم بھر میں ستارے، اُٹھ مرے کالی کملی والے

رسول اکرمؐ کا ارشادِ مبارک ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ ۝ (جس نے اپنے نفس کو پہچانا اُس نے خدا کو پہچانا) اسی حدیث کو ایک شعر میں کس خوبی سے نظم کیا ہے ؎

نہ دے الزام اُس روئے نقاب آلود کو ناحق ۔۔۔ کبھی بھولے سے بھی تو نے حدیثِ من عرف دیکھا

امام حسین علیہ السّلام نے فوجِ شام کو مخاطب کر کے فرمایا تھا "موت عزت کے ساتھ بہتر ہے اُس زندگی سے جو ذلت کے ساتھ ہو" ؎

شاد نے اس مضمون کو بھی غزل کے مقطع میں پیش کیا ہے ؎

زندگی ہے دل کو پیاری، موت عزت کو پسند ۔۔۔ بیچ میں ان دو کے کیا اے شاد تو مشکل میں ہے

حالی اگر زندہ ہیں تو وہ مسدسِ حالی سے۔ اکبر اگر زندہ ہیں تو وہ اپنے ظریفانہ کلام سے۔ یہ چیزیں آپ شاید ہی کسی کے کلام میں پائیں گے اور اگر پائیں گے بھی تو نہیں کے برابر۔ یا اتفاقیہ طور سے۔

شاد کا اثر بعد کے شعراء پہ حسرت، جگر، فانی اور اصغر علی گڑھ والوں کے مطابق، اردو غزل کے چار ستون مانے جاتے ہیں۔ ان میں تین ناموں کا اور اضافہ ہوتا ہے۔ میرے خیال میں یہ نام کسی صورت سے نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ آرزو لکھنوی، سیماب اکبرآبادی اور یگانہ چنگیزی۔ حسرت نے نہ صرف کلامِ شاد کی عظمت کا اعتراف کیا ہے بلکہ اردوئے معلّی میں کلامِ شاد کو مختصر مجموعہ کی صورت سے شائع بھی کرا دیا ہے۔

شاد کا اثر بعد کے شعراء پہ کہاں تک پڑا یہ لاڈلے صاحب بیتاب استاد یگانہ کی زبان سے سُنئے ؎

شاعرانِ دورِ قدیم کے استادِ روحانی تھے شاد

صرف چند شعروں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ان غزل گو شعراء نے کہاں تک کلامِ شاد سے استفادہ کیا ہے ؎

شاد ؎ تعجب ہے وہ سمجھا قیس ولیلیٰ استعارہ ہے ۔۔۔ میں قصّہ کہہ رہا تھا یار سے اگلے زمانے کا

شاعر بمبئی

حسرت ؎ سناتے ہیں اُنھیں افسانۂ قیس ‏ بہانے ہیں یہ عرض مدعا کے

فانی ؎ کئی قلزم ہیں مرے اشک کے ہر قطرہ میں ‏ سوکھ جانے پہ بھی اب تک ہے یہ دریا باقی

جگر ؎ محبت میں ایک ایسا وقت بھی انساں پہ آتا ہے ‏ کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

شاد ؎ کان مشتاق ہیں آنکھوں کی طرح مدت سے ‏ دے دو آواز کہ اس پردے کے اندر ہم ہیں

جگر ؎ گوشِ مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ ‏ سُن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

شاد ؎ سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی ‏ نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

فانی ؎ نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم ‏ رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

(فانی کی بہت سی غزلیں شاد کی نکالی ہوئی زمینوں میں ہیں جن کا بیان طوالت سے خالی نہیں ہے)

شاد ؎ تجھ کو بے پردگیِ راز گوارا ہی نہیں ‏ کچھ سمجھ کر مجھے دیوانہ بنایا تو نے

آرزو ؎ اللہ اللہ حُسن کی یہ پردہ داری دیکھئے ‏ بھید جس نے کھولنا چاہا وہ دیوانہ بنا

شاد ؎ ہماری قبر پہ ہے بھیڑ خوش جمالوں کی ‏ یہ گُل کھلاتی ہے مٹی کمال والوں کی

آرزو ؎ جمع ہوئے ہیں کچھ حسیں گرد مرے مزار کے ‏ پھول کہاں سے کھل گئے دن تو نہ تھے بہار کے

یہ تو صرف مثالیں ہیں۔ ایسے ایسے سیکڑوں اشعار ملیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ اُردو غزلوں میں خیالات کی وسعت کم ہے اور گھوم پھر کے وہی باتیں زیادہ تر دہرائی جاتی ہیں مگر دیکھنا یہ ہے کہ اولیت کسے حاصل ہے۔

یاس یگانہ تو شاد ہی کے شاگرد تھے۔ اصغر مرحوم کے متعلق اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اُن کی ایک بہن (یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ حقیقی بہن یا رشتہ کی بہن) عظیم آباد میں سید علی ہاشم مرحوم (شاہ عطاءاللہ بُخاری کے حقیقی ماموں) سے بیاہی گئی تھیں اور جب اصغر مرحوم چشمہ کی تجارت کے سلسلے میں پٹنہ تشریف لاتے تھے تو سید علی ہاشم مرحوم ہی کے یہاں ٹھہرتے تھے یہ ۱۹۲۵ء اور اس کے بعد کی باتیں ہیں۔ میں بہت کم عمر تھا تاہم اصغر مرحوم کا ناک نقشہ سب کچھ یاد ہے۔ جس گھرانے میں اصغر ٹھہرتے تھے۔ اُس گھر کے کُل افراد تصوف کے دل دادہ تھے اور مہینوں اصغر مرحوم کا وہیں قیام رہتا تھا۔ خدا نے اگر موقع دیا تو بعد کو اس پر تفصیل سے لکھوں گا۔

(بقیہ "بوستانِ خیال کا دہلوی ترجمہ" صفحہ ۱۶)

مرقع کا سودا ہو گیا۔ کنور درجن سنگھ نے سوداگر کو قیمت کے علاوہ خلعتِ فاخرہ دیا اور نہایت اعزاز سے رخصت کیا۔ الغرض جب کنور درجن سنگھ کو اس امر کی صحت ہو گئی کہ یہ نازنین مہ جبین باایں حُسن و جمال موجود ہے آتشِ عشق و محبت زیادہ تر مشتعل ہوئی تاحدیکہ ہر روز حالت غیر ہوتی جاتی تھی۔ دس لحظہ میں رنگِ رخسار مثلِ زعفران زرد ہو گیا۔

(ضیاء الانوار۔ ص ۱۶۴)

حیدر پٹھان

ہندوستان کی جدید مصوّری

فنِ مُصوّری کے دائرے میں سب سے پہلے رابندر ناتھ ٹیگور نے روی ورما کی ٹیکنک سے ہٹ کر نئی راہ اختیار کی جو ہندوستان کی جدید مصوّری کی پہل ہے ۔ روی ورما کے ہندوستانی مواد اور مغربی ٹیکنک کی جگہ یہ پُر مغز اور جاذبِ نظر تخلیقات ہیں۔ ان کا اختصار اور پُرکاری اپنی جگہ مثالی ہے

رابندرناتھ کے لائے ہوئے انقلاب کے صحت مند نتائج نند لال بوس کے یہاں نمایاں ہیں۔ اُن کی تخلیقات میں مشرقی مزاج نہایت ہی لطیف پیرائے میں سمویا ہوا ہے ۔ رابندر ناتھ نے بیج بویا اور نند لال بوس اُس کی پھوٹی ہوئی کونپل ہیں۔

ہندوستان کا جدید فنِ مصوّری جس میں ندرت بھی ہے اور توانائی بھی رابندر ناتھ ٹیگور اور نندلال بوس کے ہاتھوں جنم لے کر اپنے قدم بڑھاتی رہی۔ اور اس کا ایک مضبوط قدم گگندر ناتھ ٹیگور کا فن بھی ہے جنھوں نے مغربی تحریکوں کی آمیزش سے ایسی تخلیقات پیش کیں جو ہندوستانی ذہن و مزاج کے لئے قابلِ قبول ثابت ہوئیں اِن کا زرین کارنامہ CUBISM اور IMPRESSIONISM کو ہندوستانی طریقے سے برتنا ہے یہ بات دشوار گذار بھی ہے اور کاوش طلب بھی، مگر اُنھوں نے اس معاملے میں فن کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ مغربی تحریکیں ہندوستانی جامہ پہن سکتی ہیں۔ جیسے آم کا درخت جس کے لئے ہزاروں میل دُور سے بادل برستے آتے ہیں مگر آم اپنی جڑیں ہندستان میں مضبوطی سے جمائے ہوئے ہے ۔ وہ ہندوستانی درخت کہلاتا ہے۔ اور اس کی شیرینی خالص ہندوستانی ہے ۔

ہیئت، مواد اور تکنک کے تجربات کا یہ سیلِ رواں رابندر ناتھ ٹیگور تک آتا ہے۔ جہاں اسلوب کی بے ساختگی وجدان کی پاکیزگی اور تعمق ذہنی نے تخلیقات کے وہ گُل کھلائے ہیں جو ہندوستانی بھی ہیں اور جدید بھی ۔ جہاں شاعر کا احساس نازک مرئی لبادہ پہنتا ہے جو حقائق کو خوابوں میں منتقل کرتا ہے ۔ جارج کٹ نے اِن روایات کو آگے بڑھایا۔ اِن کے یہاں ایک تجسّس ہے جو اوپری سطح سے ہٹ کر فنکارانہ سکون کے لئے داخلی گہرائیوں اور وادیوں کا راہی ہے، یہ فنکار پکاسو PECCSSO سے متاثر ہے اس کی کرشن اور نائیکاؤں کی رگ رگ میں زندگی پیوست ہے اور تاثرات ناقابلِ اعتبار نزاکت سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ آج بھی یہ فنکار انتہائی سرخوشی سے سرگرمِ عمل تھے ۔

اِن تجربات و مشاہدات نے ہندوستانی مُصوّروں کو اس بات سے آگاہ کر دیا ہے کہ جدید ہندوستانی

مصوری کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ پُرانی ڈگر پر چل کر سہل پسندی اور مفر کی راہ اختیار کرے ہندوستانی مصوروں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ عبدالرحمٰن چغتائی طرز کی سرو قد دوشیزائیں تخلیق کریں اور اپنے فن کے ہندوستانی ہونے کی سند مانگیں بلکہ جدید سانچے میں ہیئت اور مواد کے تجربے اور کارناموں کے لئے اگر فنکار میں سلیقہ و دسترس ہے تو بیحد گنجائش ہے۔

امرتا شیر گل نے اپنے فن کی تخلیق اسی سلیقے اور دسترس سے کی اور تمام گنجائشوں کا سلیقے سے فائدہ اُٹھایا۔ اس جواں سال فنکار کے پاس ایک پختہ فنکار کا عزم و یقین تھا۔ اس نے REVIVELIST تحریک اور POST IMPRESSIONISM خامیوں کو پرکھا اور ان دو متضاد مکتبہ ہائے اسالیب کی ملاوٹ سے ایک نئے سنگم کو جنم دیا جس میں دونوں مکتبۂ اسلوب کی بہترین فنی قدروں کو سمویا۔ اس طرح جو تخالیق امرتا نے پیش کیں، اُن میں جذبات، رنگ کاری اور نظر کا انوکھا پن ہے جس میں اس کی ہندوستانی فنکارانہ حِس نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس کی مصوری نے جلد ہی ہندوستانی مصوروں کو متاثر کیا۔ ہمیں امرتا شیر گل کے فنی لبادے میں اجنتا اور راجپوت مصوری کے محرکات کارفرما نظر آتے ہیں جن پر GANGUIN اور MANET کے نقوش ثبت ہیں۔ مجموعی حیثیت سے امرتا شیر گل کی تمام تخالیق ہندوستانی مزاج و سیرت سے کُلیتاً ہم آہنگ ہیں۔ اور اسی مقام سے ہندوستانی مصوری جدید ذوق و میلان کی صحیح راہ پر گامزن ہوتی ہے اور یہیں سے جہاں مصوری مادّی زندگی کے ذوق سے سرشار اپنے فن اور تفکر میں مادے سے تجریدی کیفیتوں کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے۔ فنکار کی دیدہ وری اور ہنر مندی اُس کو مادّیت سے حقائق اور تصوّرات کی طرف لے جاتی ہے جہاں فضائے معنوی یا فضائے تجرید کا ماحول ہے۔ امرتا شیر گل کی دو تصویریں STORY TELLER اور OTHER INDIA میرے اس خیال اور احساس کی بہترین نقیب ہیں۔ جہاں فنکار کا زمینی شوق اُسے زمین سے معلّق رکھتا ہے۔ او سرحدِ ادراک کے پرے بھی لے جاتا ہے۔ اس کے رنگ با تکلّف خوبصورتی، شفّاف ہم آہنگی اور صاف تراکیب مواد اور رنگوں کے تانے بانے کو موسیقی سے ملاتا ہے۔ جہاں شوخی و سنجیدگی گلے ملتے ہیں۔ جیسے صبح کے آخری تارے کے وقت رات اور دن گلے ملتے ہیں۔

ہندوستانی مصوری کے لئے یہی وہ مقام ہے جس کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی متاعِ مصوری سرحدِ ادراک کی نعمتوں سے بھی لبریز ہے۔ اور یہی وہ زمین ہے جہاں آنے والی نسلوں کو فنی جواہر کی کھوج میں کان کنی کرنی ہے۔

مگر دیدہ وری بھی تو سعادت مندی کی طرح ہے جو ہر ایک کی قسمت میں کہاں بعض نے راجپوت، مغل اور اجنتا کی طرز و روش پر اپنے فن کو ڈال دیا اور اسی دھارے پر چلتے رہے۔ بھگوان اور مذہبی روایات تصویر کشی کرتے رہے۔ انھیں یہ احساس نہ ہوا کہ راجپوت اجنتا اور مغل تصاویر کی اہمیت ان میں پیش کردہ بھگوانوں اور لوک کہانیوں سے نہیں ہے بلکہ اُس کی فنی لگن، تقدّس اور رنگوں کے غنائی عناصر سے ہے جو سادہ و پُرکار ہوتے ہوئے بھی احساس شدّت لئے ہوئے ہیں۔ اس دولتِ بے پایاں سے صرف المیلکر نے فائدہ اُٹھایا اور مغرب کے بجائے مشرقی اُفق پر اپنی نظر دوڑائی جیمنی رائے نے بھی خالصاً ہندوستانی ہونا چاہا اُنہوں نے بنیادی رنگ لے کر دیہی مصوری کو زبان و نظر دینا چاہی مگر اس بھنور میں وہ اس طرح پھنسے کہ وہیں کے ہو کے رہ گئے۔

اس ڈگر سے ہٹ کر بعض دوسرے ہندوستانی فنکار ہیں جنہوں نے اپنے فن کو جلا بخشنے کے لئے کاوش!

مجاہدے کئے۔ ان کاوشوں نے بہت سے جامد و مستقل عناصر کو ہندوستانی مصوری سے روشناس کرایا اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ ہوتا رہا۔ دریافت و ایجاد کے نئے نئے عناصر اپنے ساتھ مختلف ناموں سے لاتے رہے بہت سی چیزیں ترک ہوئیں اور بعض متروکات دوبارہ بروئے کار لائی گئیں۔ مگر ان کے نئے جنم نے ان کی صورت اور روپ کو بدل دیا۔ ایم۔ اے۔ ایف حسین۔ رضا سوز اور کرشن آرا اس گروہ کے سرکردہ رکن ہیں

حسین مرئی تاثرات کا عکاس نہیں تجریدی اور فکری رجحان اُن کے فن کے باقی رجحانات پر غالب ہے۔ اُنھوں نے اپنے ذہن کو کرید کرید کر فن پارے پیش کئے اور یہی وجہ ہے کہ حسین تخیلی منصوبوں اور تاثرات کا فنکار ہے۔ چاہے پھر وہ سکندر علی وجد کے خدوخال بنائے یا HORSE STUDY کا کوئی کینوس ترتیب دے۔ اُس کا لگاؤ، اُس کے ذہنی تاثرات سے ہے نہ کہ سکندر علی وجد یا گھوڑے گائے وغیرہ سے۔

اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ کیونکہ طرز کے اعتبار سے حسین EXPRESSIONISM ہیں اور وہ ذہن کے غیر مرئی افق کو رنگوں کا جامہ پہناتے ہیں۔ اُن کی امتیازی خصوصیت اُن کے رنگ ہیں جو ان کے خارجی اور ذہنی عناصر کا فنی اعتبار سے ربط قائم رکھتے ہیں جس سے فنکار کی خارجی اور داخلی دنیا کے وجود کا جغرافیہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ جس میں ڈرامائی عناصر کا فقدان نہیں۔ ان کا سفید اور خاکستر رنگ کا استعمال ان کے فن کو نئی نہج پر لا کھڑا کرتا ہے جہاں وسیع امکانات ہیں۔

رضا منظر کشی کرتے ہیں۔ مگر لکیروں، نوک پلک اور کونے اور موڑ کے کل پرزوں سے نہیں صرف رنگوں کے ذریعے۔ وہ رنگوں کی ہم آہنگی میں NECOLAS DE STEAL کے پیرو ہیں۔ ان کے یہاں قد و قامت اور ہیئت و مواد رنگ کی رونق اور آب و تاب کے مطیع نظر آتے ہیں۔ وہ رنگوں کی افزائش سے ایک تاثر پیدا کرتے ہیں، جو ایک احساس و تجربہ اور دونوں کے عناصر لئے ہوئے ہوتا ہے۔ یہاں فضا اور مادہ معدوم معلوم ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی رضا کا یہ کرشمہ ایک فنی منطق کا حامل ہے۔ گھر اور انسان کینوس پر اس طرح نظر آتے ہیں کہ ان کی نمود و نمائش پر شبہ ہوتا ہے مگر پھر بھی ایک احساس پیہم ہمیں یقین دلاتا ہے کہ ان گھروں میں انسان بستے ہیں اور جس فضا کی عکاسی کی گئی ہے وہاں انسانی تنفس کی حرارت بھی۔ VICTORIA TERMINUS اور SWISS LAND SEAP یہی تاثر پیدا کرتے ہیں۔ رضا کے یہاں رنگوں کی شگفتگی اور نرمی کی آنچ ہے۔ جو ایک خواب آور توازن کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ جہاں پاکیزگی اور استقامت بھرپور ہیں بے ہنگمی اور قنوطیت نام کو نہیں۔ کیونکہ رضا رنگوں کے سطحی صورت و احساس کی عکاسی میں انجماد پذیری سے کام نہیں لیتے مگر پوری تصویر کے مجموعی احساس کو داخلی جذبات کے کینوس پر اپنی انجماد پذیری سے منتقل کرتے ہیں۔ یہ ایسی ذہنی تخالیق ہیں جن کے اظہار و اسلوب پر کدوکاش اور جگر کاوی شرط ہے۔

آراکا نے چغتائی نما اور دیگر ہندوستانی مصوری میں جگہ پاتے انسانی جسموں کو جدید رنگ روغن اور حلیہ دیا اور ان کی افسردگی کو ہٹایا۔ ۱۹۴۰ تک ہندوستانی مصوری میں انسانی خدوخال کی نشو نما کا معاملہ بھول بھلیوں کی پُرپیچ راہوں میں کھو گیا تھا۔ آرا نے جدید فن کے تقاضوں سے اُس ہیئت کی مصوری کو روشناس کرایا... جہاں انسانی سڈول جسموں میں پوشیدہ نغمگی اور آہنگ نمایاں ہے LONGING اور RELAXING DREAM اس ضمن میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان تصاویر میں احساس کی انوکھی ہم آہنگی ہے جس میں بالیدگی و حُسن کی دُھن بلندیوں سے ہمکنار ہے۔

آرا کو کسی درسگاہ کا منھ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ اسی وجہ سے اُن کے فن میں زندگی کا سوز و ساز ہے۔
جس میں کسی دوسرے مکتبۂ اسلوب کی نہیں بلکہ اپنی ذہانت اور کد و کاوش کی گہری چھاپ ہے جہاں ریاضت کا
چراغ فروزاں ہے۔

رنگوں کے استعمال میں آرا کا ملکہ حیرتناک ہے۔ وہ قدِ آدم کینوس پر آبی رنگوں کا استعمال اس طور سے
کرتے ہیں کہ اُس کے روغنی ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ان کی اپنی تکنیک ہے۔ NARTAKI'S FEAR
LONGING اور بہت سی تصاویر اسی انداز سے بنائی گئی ہیں۔ آرا کینوس میں سفید رنگ کا استعمال نہیں کرتے مگر کینوس کی
سفیدی میں زبان رکھ دیتے ہیں، یہ فنّی دسترس شاید ہی کسی کے حصّہ میں آئی ہو۔ آرا نے NUDES کی تخالیق میں ماحول کو نظر انداز نہیں
کیا۔ اپنے خیال و احساس کو سماج تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ GHAT – NARTAKI'S FEAR
REEF – HUNTER تجریدی و غیر مرئی نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی اپنی داستان صد ہزار کہہ دیتی ہیں۔
NARTAKI'S FEAR میں جس طرح نرتکی کے ذہنی خوف کی گہرائی پیش کی گئی ہے اُس کی داد ایک کامل
افسانہ نویس ہی دے سکتا ہے۔ GHAT میں مذہب و جنس کی ملی جلی فرسودگی کو پیش کیا گیا ہے REEF
جنسی بے راہ روی پر ایک کاری ضرب ہے۔

آرا کا دوسرا کارنامہ STILL LIFE کی تخالیق ہیں۔ پھول پتّوں کی نزاکت رنگوں کی مدھرتا، اور حسن
پر روشنی کا جادو ہی آرا کی STILL LIFE تصاویر کے عناصر نہیں، اُن کے اس ضمن میں اضافے اعلیٰ فنّی حیثیت
کے حامل ہیں۔ رنگوں کی نغماتی قدروں کا استعمال اور اُسی کے ذریعے پھول پتّوں کو رنگ روپ ہی نہیں بخشا بلکہ
STILL LIFE کی ہر شئے کو کینوس پر انفرادیت عطا کی ہے۔

آرا نے بہت سی STILL LIFE تصاویر میں ماحول کی عکاسی بڑے لطیف پیرائے میں کی ہے اور
برش کے بجائے اپنی انگلیوں سے کام لے کر اُن میں زندگی پیدا کی ہے۔ STILL LIFE کی اشیاء، فاصلے
محلِ وقوع اور ظاہری تناسب، دریا۔ پہاڑ۔ سمندر وغیرہ کے پس منظر سے اُبھارے گئے ہیں۔ اس طرح
یہ کینوس ایک ہمہ گیری لئے ہوئے ہیں۔ حال ہی میں آرا نے جو نئے تجربے کئے ہیں اُن میں OLOUR TONE:
کے ضمن میں کئے گئے تجربے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ روپ آرٹ گیلری میں سُرخ و سیاہ رنگ کا کینوس بہت
خوبیوں کا حامل ہے۔

آرا کا جدید ترین کارنامہ اُن کا شعری آرٹ ہے جس کی نمائش پہلے تاج آرٹ گیلری اور پھر انجمن ترقی اردو بمبئی
کے زیرِ اہتمام ہوئی۔ جدید مصوّری نے کلاسیکل مصوّری اور مانی مصوّری سے سفر کا آغاز کیا۔ نئی تحریکیں ظہور
میں آئیں۔ بہت سے فنکار فنِ مصوّری کے بعض پہلوؤں کو مقدّم جان کر اُن کی نشو و نما میں محو ہو گئے۔ بعض
رنگوں، خطوط، ہیئت۔ ماحول اور تاثر کے زیرِ سایہ اپنے فن کی پرورش کرنی شروع کر دی اور اسی دائرہ
میں اپنے اظہار و اسلوب کی راہیں تلاش کرتے رہے۔ رنگوں کی انفرادیت کو اُبھارنے میں CURAT
OLOUR SENSE کا کارنامہ لکیروں اور خد و خال سے تاثر پیدا کرنے میں PAUL KLEE کا جتن
کے معنی و مطالب کو فن کا آلۂ کار بنانے میں PECCASSO کی گہر افشانیاں، جدّت و ندرت کا متلاشی
DALI ان تمام فنّی تحریکات میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

ہندوستانی مصوّر اور فن کار ان تمام تحریکوں پر اپنی نظر رکھتے رہے اور اُن کے اثرات قبول کرتے ر

توزا، سابا آوالا، گائیتونڈے، گجرال وغیرہ اس زمرے میں آتے ہیں۔

آرا نے اپنے سفرِ یورپ کے درمیان اِن فنکاروں کے شہ پاروں کو اپنے اصل رُوپ میں دیکھا۔ ان کے ناصر و تربیت کو سمجھا اور محسوس کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہر خط و خال کی لمبائی اور چوڑائی ہی نہیں مگر ہرائی بھی ہے۔

آرا اس گہرائی کو دیکھنا اور دکھانا چاہتے تھے۔ اس گہرائی کے معنی و مطالب اور شعوری اور غیر شعوری اثرات کو پیش کرنا چاہتے تھے۔

مگر خطوط کی گہرائی وہی مصوّر پیش کر سکتا ہے جس کا احساس کامراں ہو اور اپنے دامن کو دامنِ خونیں زیرِ رنگ سوس کرے۔ اور ایک سُرخرو فنکار کی طرح دیر پا اور مؤثر تخالیق پیش کر سکے، اِس امر کے لئے داخلی جذبات کے ٹی اور لطیف ترین عمل اور ردِّ عمل کا واضح اور پُر اثر اظہار ہونا لازمی ہے۔ اس عمل کے لئے پیغمبر معجزہ کام میں تا ہے۔ دیوتا۔ ناچ۔ مجنوں گریباں چاک کر کے، شاعر غزل گفتی کہ دُرسُفتی کے مصداق اپنے لہو اور آنسوؤں کی ڑیوں کو الفاظ کے موتیوں میں تبدیل کر کے، مصوّر اپنے رنگوں سے کینوس پر کھیل کر۔ مگر آرا نے اب رنگوں سے ینوس پر کھیلنے کے بجائے "ریزر بلیڈ" سے کینوس پر اپنی ذہنی جودت اور فکر کا اظہار کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے نالب کا زباں زدِ عام شعر

آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک　　کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

کو ایک قدِ آدم کینوس پر منتقل کیا۔ اس شعر میں غالب نے آہ کے دیر میں ہونے والے اثر کا خیال پیش کیا ہے اور زندگی اُس کے مقابل کتنی مختصر ہے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ ہماری آہوں کے اثر سے ہماری زندگی کتنی ماری ہے۔ اسی اثر کو آرا نے اپنے داخلی ردِّ عمل کے رُوپ میں پیش کیا... آہ کی حرکت کو بلیڈ کی خراش سے نمایاں کیا، دل سے نکلے ہوئے درد و جذبات کو لال رنگ سے ابھارا۔ اُسے گہرائی دینے کے لئے سرے پر تھوڑی سی جگہ چھوڑ دی اور پورا کا پورا کینوس جو ہماری زندگی کی علامت کا مظہر ہے خالی چھوڑ دیا گیا۔ سفید رنگ جذبات و احساسات کے فقدان کی علامت کے رُوپ میں بروئے کار لایا گیا۔۔ اور ہماری مختصر زندگی جو زلف کے سر ہونے تک" بھی باقی نہیں رہتی۔ آرا نے ایک سیاہ نکتہ سے عیاں کی۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبّت فاتحِ عالم　　جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں　　اقبال

ایک دوسرا کینوس ہے جس پر اقبال کے اس لافانی شعر کو منتقل کیا گیا ہے۔ ... محبّت کے دو رنگ دکھائے گئے ہیں، ایک اپنا خود کا عاشق کا رنگ جو عشق میں زیادہ اہمیت کا حامل نہیں۔ دوسرا محبوب کا رنگ جو شوخیانہ بھی ہو سکتا ہے اگر عشق مجازی ہے اور صوفیانہ بھی ہو سکتا ہے اگر عشق حقیقی ہے... اسی محبّت کی علامت کے اِرد گِرد بلیڈ کی خراش تراش سے انسانی جدوجہد کو عیاں کیا ہے۔ جو اسے زندگی کے کئی محاذوں پر کرنی پڑتی ہے۔ یقین کو بھالے کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ عمل کو تلوار کی شکل دی ہے جس کی نوک سُرخ بھی ہے اور محبّت کو فاتحِ عالم کی حیثیت سے پیش کرنے کے لئے دل کے ہاتھ میں لگام دے دی ہے،... یہ کینوس بہت سی معنوی خوبیوں کا حامل ہے۔

بہار آئی تھی گلشن میں تو کرتی بارشِ لشکیں　　یہ کس نے کہہ دیا تھا شورشِ افزائے نمو ہو جا　　سیماب

علامہ سیماب کے اس پُر معنی شعر کو جس طرح کینوس کا جامہ پہنایا ہے وہ کافی معنی رس بھی ہے اور حسین بھی

کینوس ہریالے رنگ کا استعمال کیا ہے۔ اُس پر بیل بوٹے اس طرح اُجاگر کئے گئے ہیں جیسے ہر طرف نمو کی افزائش ہو.... عقب میں رنگ برنگا کپڑا استعمال کیا گیا ہے جو COLOUR SCHEME کی گرامر میں متضاد ہیں۔ مساوی اور ہم آہنگ نہیں جس سے احساس شورش پیدا ہوتا ہے۔ پورے کینوس کے اردگرد سیاہ دھاگہ کس دیا گیا ہے جس سے نظر ٹھہر نہیں پاتی۔ اور کینوس کا ہرا رنگ جو امن وسکون، بہار و زندگی کا نقیب ہے ناظر کو شورش و ہنگامہ کا احساس دلاتا ہے۔ اس ذریعۂ اظہار کے قیود (صرف بلیڈ و کینوس) جو آرا نے اپنے اوپر عاید کئے ہیں اُس حدود و قیود میں یہ کینوس ایک اعلیٰ شاہکار کا درجہ رکھتا ہے مفہوم کی اس سے زیادہ پُر اثر عکاسی اور کیا ہو سکتی ہے۔

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگ گُل ۔ سے میرؔ
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے (میرؔ)

میرؔ کے اس شعر کو سُرخ کینوس کا جامہ پہنایا ہے۔ بلیڈ کے ذریعہ گُل بوٹے اس طرح اُبھارے ہیں کہ آتشِ گُل ہر طرف لگی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور بلبل جس کا مقام گُل کی آغوش ہی کہئیے اس کے اُڑنے کے حرکات کو بلیڈ سے اس طرح اُبھارا ہے جیسے گلشن سے دیوانہ وار اُڑ کر جا رہی ہو اور اپنی منقار سے پکارتی ہوئی۔ صاحب پرے پرے" بقول ظ۔ انصاری... اس کینوس نے میرؔ کے شعر کو نئی معنویت دی ہے۔ اسی طرح اُنھوں نے مندرجۂ ذیل اشعار اپنے اس جدید اسلوبِ ذریعۂ اظہار میں پیش کئے ہیں۔

وہ دل نہیں رہا ہے، نہ اب وہ دماغ ہے
جی تن میں اپنے بجھتا سا کوئی چراغ ہے
میر تقی میرؔ

مقدّس ہے زیادہ کون یارب
جبیں میری، کہ تیرا آستانہ
سکندر علی وجدؔ

سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
غالبؔ

خدا کا آستاں ہو، یا کسی محبوب کا دَر ہو
جہاں بھی سَر جُھکا دو آبرو باقی نہیں رہتی
دُوار کا داس شعلہؔ

پوچھا جو میں نے یار سے انجامِ سوزِ عشق
شوخی سے اک چراغ کو اُس نے بجھا دیا
نامعلوم

اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہُوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر غالبؔ

کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے غالبؔ

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا
چکبستؔ

آنسو تو بہت سے ہیں آنکھوں میں جگرؔ لیکن
بندھ جائے سو موتی ہے، رہ جائے سو دانہ ہے
جگرؔ

میں خوش ہوں آج مسجدِ ویراں کو دیکھ کر
میری طرح خدا کا بھی خانہ خراب ہے
نامعلوم

یہ جانتے ہیں کہ دل خاک ہو گیا جل کر
نہ آگ دیکھی، نہ اُٹھتے ہوئے دھواں دیکھا
ریاض خیرآبادی

یوں ساتھ لے چلا ہے جو تو حسرتوں کا بوجھ
کافی نہیں ہے سر پہ گناہوں کا بار کیا؟
چکبستؔ

اے چرخ کتنے خاک سے پیدا ہوئے حسیں
تو ایک آفتاب کو چمکا کے رہ گیا جلیل مانکپوری

زمانہ اس کے سوا اور کیا وفا کرتا
چمن اُجڑ گیا، کانٹے گلے کا ہار بنے یگانہ

عو بجیثی۔

یہ تمام اشعار قدیم و جدید شعراء کے فکر و فن کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان میں چھپے ہوئے احساسات ان کی معنویت اور ان کی جمالیاتی نزاکت کو آرا نے بڑے دل نشیں انداز میں ظاہر کیا ہے۔ ان میں فنِ مصوّری کے وہ تمام لوازمات جن کا پاس و لحاظ ہر فنکار کے لئے ضروری ہوتا ہے اور جو اپنے اندر فن کی لطافت آفرینی کا مادہ سموئے ہوئے ہیں۔ اُن کا استعمال بھرپور کیا ہے۔ COLOUR SENSE اور COLOUR PSYCHOLOGY کو بروئے کار لاکر الفاظ کو رنگوں کا جامہ پہنا دیا ہے۔ جواب پڑھنے کے بجائے دیکھے جا سکتے ہیں۔ رنگوں کی پنہاں موسیقی کو حسبِ ضرورت استعمال کر کے ایک تاثر اور ایک احساس پیدا کیا ہے۔ لکیروں اور خد و خال کے بجائے بلیڈ کی خراش تراش نے خد و خال کی گہرائی کو اُجاگر کر دیا ہے۔ یہ فنّی کارنامہ ہندوستانی فنِ مصوّری میں پہلا ہے۔ جہاں خد و خال کے معنی و گہرائی، رنگوں کی موسیقی ترتیب کی ہم آہنگی،۔ تناسب کا حسن سب یکجا کر دئے گئے ہیں۔

ہندوستانی فنِ مصوّری میں یہ تجربہ ایک نئی راہ کھولنے والا ہے، جس کے وسیع امکانات ہیں۔ دوسرے فنکار اسے اپنی دسترس کے مطابق استعمال کریں گے۔ اس اسلوب کو سنواریں گے اور جدید ملاوٹوں سے آراستہ کریں گے۔ ہمیں اب یہ دیکھنا ہے کہ آرا بلیڈ کے بجائے جب برش کا استعمال کریں گے، اُس وقت وہ اپنے اس اسلوب و ندرت سے کس حد تک شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے اس وقت اس ندرت سے سب کو چونکا دیا ہے۔۔۔ اور ہندوستانی فنِ مصوّری میں نیا اضافہ کیا ہے۔

ہندوستانی مصوّری جدید و قدیم اور کئی دیگر شعبوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔۔ جیمنی رائے۔ امرتا شیر گل۔ دُھرندر جیسے مُسلّم الثّبوت اساتذۂ فن اب کچھ دور کی بات معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت کے فنّی رجحانات میں ان کے اضافے جدید فنّ مصوّری کو آگے ضرور بڑھا چکے ہیں مگر فن کے دائرے میں جو ہیجانی تحریکات آج چل رہی ہیں اُن میں ان عناصر کی اہمیت اُبلتے پانی میں شکر کی سی ہے۔ کیونکہ آج کا ہندوستانی مصوّر اپنے فن کو ہندوستانی عناصر سے لبریز کرنے میں کوشاں نہیں بلکہ عالمی تقاضوں کی طرف اُس کی نظر ہے۔ اور اُن عناصر کو اپنی تخالیق میں سمونا چاہتا ہے، یہ ایک المیہ بھی ہے اور نیک فال بھی۔ این۔ ایس بندرے کے فن اور تخالیق کے متعلق خیالات میں حیرت انگیز تبدیلی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اکبر پدمسی کے فن میں کوئی ہندوستانیت نہیں ہے۔ اُن کے رنگو کا مزاج بھی ہندوستانی نہیں جیسا کہ بیندرا چاوڑا۔ بریندر ڈے۔ بدری ناراین اور ہرکشن لال، پرمنا تانا وغیرہ کے یہاں ہے۔ سایا والا کے مطابق ایک ہندوستانی فنکار کا مغربی تحریکات کی طرف رجوع ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں، کیونکہ جدید رجحانات و تحریکات مغرب کی دین ہیں۔ اور ہندوستانی مصوّری جیسی کوئی چیز آج کے فن کار پیش نہیں کر رہے ہیں۔ وہ یا تو ABSTRACTIONISTS ہیں یا EXPRESSIONIST CUBIST

مگر یہ نقطۂ نگاہ درست نہیں ہے۔ جہاں ہم آج زندگی کے دوسرے شعبوں میں ترقی کی راہیں تلاش کر رہے ہیں، اسی طرح ہمارے فن کار اور مصوّر بھی اپنی راہ تلاش کرنے میں کوشاں ہیں۔ ہمارے فنکاروں کے پاس لگن اور خلوص ہے، وہ فن و تخلیق کے نظریاتی بادل چھٹ جانے پر اپنی راہ پالیں گے، جیسے گوئٹے کا "فوق البشر"، اقبال کا "مردِ مومن" اور نٹشو کا "منگلو کوچوان" ہے اور جیسے کابل و قندھار کے انگور ضلع ناسک کے انگور سے مختلف ہیں۔ اسی طرح فنِ مصوّری میں بھی ہمارے فن کار اپنی انفرادیت کو نمایاں کرتے رہیں گے اور قومی تقاضوں کو پورا کرنے میں فن کے عالم گیر تقاضوں سے بے اعتنائی نہیں برتیں گے۔

قیسی رامپوری
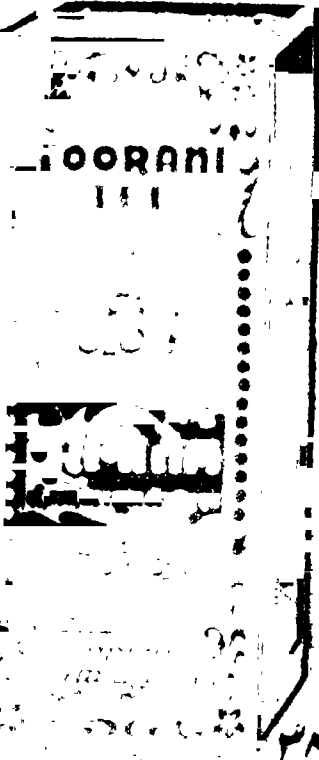
مولانا سیمابؔ مرحوم

(پانچ سال پہلے کا ایک مضمون)

وقت نے کوئی خاص عمر نہیں پائی ہے۔ کہیں وہ بچہ ہے کہیں جوان اور کہیں بوڑھا۔ ہر طرح جئے جا رہا ہے۔ اسے موت نہیں۔ بس رواں دواں ہے۔ آج سے پچیس سال پہلے کی باتیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے کل ہی گذری ہیں۔

غالباً ۱۹۳۱ء۔ ۳۲ء کا واقعہ ہے کہ مولانا سیماب مرحوم عرس کے زمانے میں اجمیر تشریف لائے تھے۔ میرا قیام بھی اجمیر میں تھا۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۴۴-۴۵ء تک اجمیر ہی میں رہا۔ اگر میں اجمیر شریف کو اپنا وطن کہوں تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ میں نے اپنی عمر گریزپا کے بہترین دن اسی شہر میں گزارے تھے۔

خیر تو مولانا اجمیر تشریف لائے مگر انھیں قیام کے لئے جو مکان ملا تھا وہ درگاہ شریف سے دور تھا۔ اس کی وجہ سے درگاہ کی حاضری میں مولانا کو کافی تکلیف ہوتی تھی۔ پھر ویسے بھی زمانۂ عرس میں شہر کے اندر اسقدر بھیڑ بھاڑ ہو جاتی تھی کہ راستہ چلنا دشوار ہو جاتا تھا۔

میں بھی نیاز حاصل کرنے مولانا کی خدمت میں پہنچا۔ اس وقت مرحوم مکان اور درگاہ شریف سے دوری کی شکایت کر رہے تھے۔ بعدِ تعارف میں نے عرض کیا کہ میرا غریب خانہ حاضر ہے۔ میرا مکان درگاہ بازار میں واقع تھا۔ وہاں سے درگاہ تک بمشکل پانچ منٹ کا راستہ ہوگا۔ میری درخواست پر تکلفاً مولانا نے تامّل کیا۔ بہرحال میرے اصرار پر آمادہ ہو گئے اور اسی روز میرے غریب خانے پر منتقل ہو گئے۔ میرا مکان کافی بڑا تھا۔ اس میں اوپر چار بڑے بڑے کمرے اور نیچے فراخ صحن کے بعد دو کمرے تھے۔ اتنے وسیع مکان کا کرایہ صرف گیارہ روپے تھا۔ آج یہ تمام باتیں مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہاں مکانات نہیں ہیں۔ بلکہ مکان نما جو یہ آرزو کدے نظر آتے ہیں وہ خانماں برباد لوگوں کے حسرت زدہ خواب ہیں۔ میں بھی آٹھ نو سال سے انہی خوابوں سے اپنا دل بہلا رہا ہوں۔

بیادِ سیمابؔ

تیرھویں برسی کے موقع پر

مولانا مکان کو دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئے اور مجھ سے مخاطب ہو کر کچھ اس قسم کا مصرع فرمایا۔ ع

رہیں شاد ہم کو مکاں دینے والے

ساغر بھی مولانا کے ساتھ تھے۔ یہ زمانہ اُن کی شاعری و ترنم کے انتہائی شباب کا تھا۔ اُس زمانے میں مولانا سیماب آگرے سے ماہنامہ "پیمانہ" نکال رہے تھے۔ اور پیمانہ اُسوقت اپنے عہد کا معیاری اور اعلیٰ ترین رسالہ تھا۔ اُس زمانے کے معیاری پرچے۔ شباب اُردو۔ مخزن، ہمایوں۔ نگار اور پیمانہ تھے۔ لکھنے والے چند ہی تھے۔ مگر اُن کا بڑا معیاری حلقہ بنا ہوا تھا۔ شعراء میں اقبال۔ سیماب۔ جوش۔ سائل۔ بیخود۔ فانی۔ آرزو۔ نوح۔ ناطق وغیرہ تھے اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو گاہ بگاہ تاہر بھی رسائل میں نظر آجاتے تھے۔ نثر نگاروں میں ل۔ احمد۔ ذوقی خلیقی دہلوی۔ نیاز۔ سلطان حیدر جوش۔ رشید احمد صدیقی۔ مجنوں گورکھپوری۔ رفیعی اجمیری وغیرہ قابل ذکر تھے۔ اور جس رسالے کو یہ حضرات نوازتے تھے اس کو چار چاند لگ جاتے تھے۔

میں اجمیر میں ملازمت بھی کر رہا تھا۔ اور دو احباب کی شرکت میں "کیف" نام کا ایک رسالہ بھی نکال رہا تھا۔ ہرچند یہ رسالہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۴ء تک زندہ رہا۔ لیکن اُس نے اپنا ایک معیار قائم کر لیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا سیماب کی اُسے خاص توجہ حاصل تھی۔ کیف کے علاوہ میں رسالہ سرِ وش لاہور کے ادارہ میں بھی شامل تھا۔ میں نے ہرچند مولانا مرحوم سے درخواست کی کہ "سروش" کے لئے بھی کچھ لکھا کریں مگر مولانا نے انکار فرمادیا۔ اُنہیں سروش پسند نہ تھا۔

میرے غریب خانے کے قیام کے دوران میں مولانا کی طبیعت خراب تھی۔ مگر ملاقات کے لئے آنے والے حضرات روزانہ آتے تھے۔ اس سے مولانا کو تکلیف ہوتی تھی مگر سب سے خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ ایک غضب یہ تھا کہ ساغر کے ترنم نے لوگوں کو مسحور کر رکھا تھا، یوں بھی ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ آخر مولانا کو تکلیف دینے والوں سے بچانے کے لئے میں نے نیچے کے کرایہ دار سے درخواست کی کہ مکان کا دروازہ ہر وقت بند رکھیں لیکن شام کو دفتر سے آکر کیا دیکھتا ہوں کہ کمرہ حاضرین سے بھرا ہوا ہے۔ مولانا گاؤ تکیئے سے لگے بیٹھے ہیں اور ساغر لہک لہک کر لوگوں کو ہلاکِ ترنم کر رہے ہیں۔ مولانا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا مطلب یہ تھا کہ تم تو ہمیں بند کر گئے تھے نا ــــ؟!!

میں دیکھتا تھا کہ ساغر رات رات بھر بعض اوقات مولانا کی خدمت کرتے رہتے تھے۔ تاکہ وہ جلد صحت یاب ہو جائیں۔ یوں تو مولانا مرحوم فریش نہ تھے، مگر زیادہ دیر تک بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ ساغر اُنھیں آرام سے لٹا دیتے، مولانا کی خدمت کر کے اُس زمانے میں ساغر نے حقِ تلمذ ادا کر دیا تھا۔

مولانا کے دورانِ قیام میں ایک عجیب لطیفہ ہوا۔ جو مجھے آج تک یاد ہے۔ عرس کا سلسلہ جاری تھا مولانا بعد مغرب درگاہ شریف فاتحہ خوانی کے لئے ضرور جایا کرتے تھے۔ میں اور ساغر بھی ساتھ ہوتے تھے۔ مگر ساغر قوالیوں کے اسقدر رسیا تھے کہ اِدھر اُدھر بھٹک جاتے، میں مولانا کے ساتھ رہتا۔ یہ عرس سردیوں کے زمانے میں آیا تھا۔ اجمیر میں کافی تیز سردی ہوتی ہے۔ چنانچہ مولانا چیسٹر پہنے درگاہ میں آئے۔ لیکن گنبد کے اندر ہجوم کی وجہ سے سخت گھٹن سی ہو جاتی تھی، اس لئے مولانا نے چیسٹر اُتار کر مجھے دیدیا اور خود اندر فاتحہ کے لئے چلے گئے۔

میں مولسری والے دروازے کے قریب گنبد کے باہر کھڑا تھا اُس طرف روشنی ذرا کم تھی۔ چند منٹ بعد کوئی صاحب میرے قریب آکر کھڑے ہوئے اور باہر سے فاتحہ پڑھنے لگے۔ وہ ہُو بہو ساغر نظامی تھے۔ میں انھیں ساغر سمجھا

سمجھا چنانچہ مولانا کا کوٹ اُن کے ہاتھ پر ڈال کر فاتحہ کے لئے جلدی سے گنبد میں داخل ہوگیا اِن بیچاروں نے بڑی حیرت سے مجھے دیکھا ہوگا۔

بھیڑ کی وجہ سے گنبد کے اندر پہنچنا اور پہنچ جانے کے بعد نکلنا کارِ دارد تھا۔ مجھے بھی باہر آنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ صرف ہوگئے ہونگے۔ آکر دیکھتا ہوں تو وہ صاحب غائب تھے۔ مولانا کے مل جانے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا بہرحال مطمئن تھا کہ ساغر نے کوٹ مولانا کو دے دیا ہوگا۔ اور انھیں لے کر مکان پر پہنچ گئے ہونگے چنانچہ میں یونہی اِدھر اُدھر درگاہ شریف میں پھرنے لگا۔ ناگہاں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک قوّالی کے حلقے میں ساغر کھڑے ہیں۔ میں لپک کر اُن کے پاس پہنچا اور جلدی سے دریافت کیا کہ آیا اُنھوں نے مولانا کو کوٹ دے دیا تھا۔ کیسا کوٹ؟ ساغر نے حیران ہوکر کہا۔ میں اُن کے چند رامنے پر چڑھ گیا بولا پندرہ بیس منٹ پہلے میں تمھارے ہاتھ پر مولانا کا کوٹ ڈال کر اندر گیا تھا؛ دیوانے ہوئے ہو۔ ساغر بڑی حیرانی سے کہنے لگے۔ اب تو میں چکرایا اور اُنھیں پورا واقعہ سنایا۔ وہ بھی پریشان ہوئے۔

آخر ہم منتشر ہوکر غلط ساغر کو تلاش کرنے لگے۔ مگر اُس جمّ غفیر میں اُس کا کہاں پتہ۔ کئی منٹ تک بیکار تلاش کرنے کے بعد میں بھاگا بھاگا اِس اُمید پر مکان پہنچا کہ ممکن ہے ساغر کو چیسٹر مل گیا ہو۔ مولانا لیٹے ہوئے کچھ پڑھ رہے تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ ساغر آگئے۔؟ اُنھوں نے نفی میں جواب دیا۔ میں اُلٹے پیر پھر بھاگا۔ مولانا مجھ سے کوئی سوال کر رہے تھے مگر میں ہوَا ہوگیا۔

میرے غائب ہونے کے تھوڑی دیر بعد ساغر بھی ہانپتے ہوئے مولانا کے پاس آئے اور میرے متعلق دریافت کیا۔ مولانا بولے کہ یہ تم دونوں کیا آنکھ مچولی سی کھیل رہے ہو۔ ابھی قیسی تمہارے متعلق دریافت کر رہے تھے۔ ساغر جواب دینے کے بجائے پھر بھاگ چھوٹے۔ میں آخر اُسی مقام پر پہنچا جہاں میں نے مولانا کا کوٹ غلط آدمی کو دیا تھا۔ اور ایک ایک شخص کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے بعد مولسری کے پاس والی بارہ دری کے قریب گیا۔ پریشانی میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ عقب سے کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ مُڑ کر دیکھتا ہوں تو آپ تھے۔ غلط ساغر۔ اُن کے ہاتھ پر مولانا کا کوٹ پڑا ہوا تھا۔

بہرحال مولانا کا کوٹ مل گیا۔ دوسرے روز میں نے مولانا کو تمام واقعہ سُنایا۔ خوب ہنسے۔

میں اُس زمانے میں "ٹامس ہارڈی کے مشہور ناول" جیوڈ دی ابسکیور" کا ترجمہ کر رہا تھا۔ یہ ناول شاید دنیا کی سب سے زیادہ ہولناک ٹریجڈی کا حامل ہے کیونکہ اِسکو لکھنے کے بعد پبلک کے خوف سے اسکا مصنّف کئی سال تک روپوش ہوگیا تھا۔ اردو میں نہ تو پہلے اور نہ آج کوئی اس قسم کی ٹریجڈی موجود ہے۔ رہی مثنوی زہرِ عشق تو وہ صرف ایک المیہ محبّت کی کہانی پیش کرتی ہے مگر ہارڈی کا یہ شاہکار انسان کی پوری زندگی کی ٹریجڈی ہے۔

یہ ترجمہ میں نے مولانا کو بھی سُنایا۔ بہت متاثر ہوئے۔ فرمائش کی کہ یہ ترجمہ بالاقساط ہمارے رسالے میں چھپے گا۔ میں خاموش ہوگیا کیونکہ میں اُسے اپنے رسائل کے لئے رکھنا چاہتا تھا۔ مگر مولانا کا حکم نہیں ٹال سکتا تھا۔ آخر چند صفحات نقل کر کے مولانا کو دے دئے۔ اس ترجمے کا عنوان میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا رکھوں۔ آخر مولانا سے اِستصواب کیا۔ قدرے غور کے بعد فرمایا کہ اس کا عنوان "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" رکھ دو۔ میں پھڑک اُٹھا۔ اُس زمانے میں یہ قاعدہ تھا کہ کسی فارسی کے بولتے ہوئے مصرع سے افسانوں کے عنوان قائم کئے جاتے تھے۔

آخر مولانا چند روز کے بعد آگرہ روانہ ہوگئے۔ کبھی کبھار خیریت کا خط آجاتا تھا۔ اس طرح دو تین سال بیت گئے۔ افسوس اُس عرصہ میں مولانا کو دو صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک تو ساغر سے تعلقات منقطع ہوگئے تھے

دوسرے اکبر حیدری ہے۔ ساغر مولانا سے علیحدہ ہو کر علی گڑھ چلے گئے اور وہاں سے اُنھوں نے "استقلال" نام کا ایک ماہنامہ جاری کیا۔ میں نے بھی اپنے ایک دو مضامین اس پرچے کے لئے لکھے تھے۔

اکبر حیدری بڑا گستاخ نکلا۔ حالانکہ اُس نے مولانا سے کافی فیض حاصل کیا تھا۔ اکبر حیدری دہلی میں کسی اخبار سے وابستہ تھے جس میں اُنھوں نے مولانا کے خلاف مضامین لکھنے شروع کئے۔ مولانا کی طرف سے بھی ان کے مُنھ توڑ جواب دیئے گئے۔ لیکن اکبر حیدری نے اپنا رویہ نہیں بدلا۔

ہاں یہ بھولا جاتا ہوں کہ مولانا میرا ترجمہ اجمیر ہی میں بھول گئے تھے۔ کہیں دو تین ماہ بعد اُنھیں یاد آیا۔ لکھا فوراً روانہ کردو لیکن مجھے مہلت مل گئی تھی۔ اُس ترجمے کی تین قسطیں میں اپنے رسالے سروش لاہور میں شائع کرچکا تھا۔ یہی عُذر میں نے مولانا سے کیا۔ خفا ہوگئے۔ بہرحال اکبر حیدری کی سرکشی کے موقع پر مولانا نے مجھے یاد فرمایا۔ فرمائش کی کہ "بغاوتِ اکبر" پر کچھ لکھو۔

آخر میں نے "قولِ فیصل" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اور اپنے رسالے میں چھپوایا۔ مولانا نے اُسے پسند تو کیا لیکن فرمانے لگے کہ "قولِ فیصل" لکھنے والے تم کون۔ یہ تو میرا کام تھا۔ بہرحال کچھ اور لکھو۔ افسوس عدیم الفرصتی کی وجہ سے میں تعمیل نہ کرسکا۔ شاید اس سے مولانا بدمزہ ہوگئے تھے۔

جوشؔ ملیح آبادی اشتراکی نظریۂ حیات کے مؤید تھے۔ اُنھوں نے اخلاقی اقدار پر مضمون لکھا تھا اور ان سب کو اضافی کہا تھا۔ اس پر مولانا نے اُن کی خبر لی۔ بات بڑھی۔ اس مرتبہ میں خواہ مخواہ کود پڑا تھا۔ میں نے جوشؔ صاحب کے خیالات کا ساتھ دیا لیکن ساتھ ہی مولانا سے بھی تمام تر اتفاق نہیں کیا تھا۔ اب تو مولانا مجھ سے خفا ہوگئے۔ اور خفا رہے۔ یہاں تک کے بہت عرصہ کے بعد اُن سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔

یہ ملاقات غالباً ۱۹۴۳ء یا ۱۹۴۴ء میں ہوئی تھی۔ معین زلفی کی شادی مولانا کی نواسی سے ہوئی ہے۔ لہٰذا میں بھی باراتی بنکر آگرہ گیا تھا اور سیدھا مولانا کی خدمت میں پہنچا۔ اس مرتبہ تقریباً سات آٹھ سال بعد ملاقات ہوئی۔ میں قریب میں جا بیٹھا۔ مخاطب نہیں ہوئے۔ کچھ ناراض سے معلوم ہوتے تھے۔ خاموشی سے سگریٹ پیتے رہے۔ آخر میں نے متوجہ کرنے کو کہا کہ سگریٹ تو میں بھی پیتا ہوں مسکرائے پھر فرمایا میں تم سے ناخوش ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ آپ کو ناخوش ہونا اچھی طرح نہیں آتا۔ اس پر ہنسنے لگے۔ شکایت کی کہ تم نے عرصہ سے شاعری کے کیوں پھر نہ لکھا۔ میں نے وعدہ کیا کہ آئندہ لکھا کروں گا۔

زلفی کی شادی کا ہنگامہ کئی روز تک رہا۔ مگر میرا جب تک آگرے میں قیام رہا تقریباً روزانہ مولانا سے ملاقات ہوتی رہی۔ کسے معلوم تھا کہ غیر منقسم ہند میں یہ میری مولانا سے آخری ملاقات ہے اور اس کے بعد لٹ لٹا کر دریا عبور کرنے کے بعد نہایت درماندہ حالت میں کراچی میں ملیں گے۔

بہرحال یہاں بھی میں متعدد بار مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بہت مضمحل اور ضعیف نظر آنے لگے تھے۔ رشک ایک تو ویسے بھی حساس ہوتا ہے پھر مولانا ابھی ابھی اپنا ایک ایسا عہدِ زریں ہند میں چھوڑ کر آرہے تھے کہ وہ اُن کی پرستش ہوتی تھی۔ اپنا پیدا کیا ہوا نام۔ عزت۔ شہرت۔ یہ سب کچھ وہ متاعِ عزیز ہیں کہ ان کے گم ہو پر ایک درویش صفت آدمی کو بھی بمشکل صبر آتا ہے۔

حقیقتاً مولانا رحلت تو ہندوستان چھوڑتے ہی فرما گئے تھے۔ یہاں تو اُن کا جسدِ خاکی آیا تھا۔ یہاں بڑا قابل آدمی آیا۔ مشاہیر نے ہجرت کی مگر یہاں آکر وہ ایسے گم ہوگئے بلکہ گم کر دیئے گئے جیسے وہ کبھی عظیم شخصیت

شاعر بمبئی

کے مالک ہی نہ تھے۔

میرا خیال ہے کہ مولانا کو بھی ایسی صدمہ نے گھلا ڈالا تھا۔ وہ اپنی عظمتِ رفتہ کے لئے بہت مغموم رہتے تھے۔ انہی صدموں نے انھیں بیمار ڈال دیا اور وہ اپنے پرستاروں کو آخر کار داغِ مفارقت دے گئے۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مولانا اپنے وقت کے بہت بڑے آدمی تھے۔ صرف شاعر۔ صحافی اور ادیب ہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ انسان کی حیثیت سے بھی۔ انھیں حساس و دردمند دل ملا تھا۔ اور مخلص روح۔ وہ اپنے شاگردوں ہی کے لئے کریم نہ تھے۔ بلکہ ہر شخص سے کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ بعض لوگ انھیں بیمہر و مغرور سمجھتے تھے، بیشک مولانا بجا طور پر مغرور تھے۔ وہ چھوٹی ٹھونسی کے افراد سے ملنا پسند نہیں فرماتے تھے۔

مولانا کے مزاج میں بے انتہا مروت تھی۔ صدہا لوگوں کو انھوں نے اپنے اشعار عطا فرمائے۔ احباب کے رسائل کو نظم یا نثر سے ہمیشہ نوازتے رہتے تھے۔ جو اُن سے محبت و خلوص سے ملتا تھا اُس کے دوست تھے اور جو منحرف ہوگیا وہ اُن کی نگاہ میں شاید ہمیشہ کے لئے مردود ہو جاتا تھا۔ یہ میرے ذاتی تاثرات ہیں۔

لیکن مولانا نے بڑا وسیع ظرف اور عفو پرور دل پایا تھا۔ اگر کسی سے خفا ہو جاتے تھے تو اُس کا ذکر تلخی سے کرنے کے عادی نہ تھے۔ اس کے علاوہ لوگوں کی معمولی برائیوں کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔

اگر اس شاعرِ اعظم نے کسی مہذب ملک میں جنم لیا ہوتا یا اس کا انتقال اپنے مشاہیر کو زندہ رکھنے والے دیس میں ہوتا تو اُس کی آخری آرام گاہ گورِ غریباں کے بجائے شاندار مقبرہ کی شکل میں ہوتی۔ اور اُس کا کلام و پیام ملک کے بچے بچے کو یاد ہوتا۔

Telegrams :—"MARKAZ" Lahore
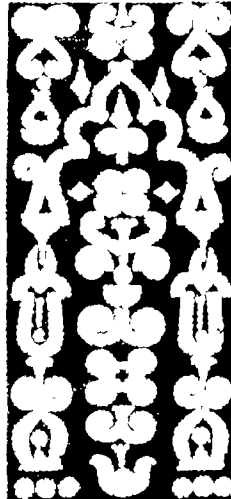
THE "SHAHKAR"

"URDU MARKAZ" LAHORE
A High Class Publishing House
Directed by:—
(1) Hon'ble Sir Abdul Qadir
(2) K.B. Sh. Nur Elahi I. E. S.
(3) Pt. Brij Mohan Kaifi Dahlvi
THE "SHAHKAR" LAHORE
India's Foremost Illustrated Literary & Educational Journal.
EDITOR:—I. K. TAJWAR.
THE "PREM" LAHORE
Children's Popular Weekly
EDITOR:—I. K. TAJWAR

شاہکار لاہور

No. ______ 25-11- 19

۷۸۶

محترم علامہ! سلام مسنون

کریمانہ ہمدردی کا سپاس گزار ہوں
میرے وار فضا نے نظر پر چھائے ہوئے ہیں
آہ کاملوں نے زندگی بے چین کر دی۔
جبر کرنے والے نے صبر بھی کرایا فریاں کو شعور ماتم
سے نا آشنا رکھا۔ اسی ضبط و صبر کا نتیجہ یہ ہے
کہ دل اختلاج معیشوں میں مبتلا ہو گیا ہے۔
شبہ! بس ایک اور خبر کے بھی ابھی منتظر رہیے!

خادم تاجور
نیازمند

مولانا تاجور نجیب آبادی کا خط۔ علامہ سیماب اکبر آبادی کے نام

علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اسرار

(چند غیر مطبوعہ رباعیاں)

تخیئل ہی کی شگوفہ کاری ہے یہاں
نیکی و بدی سب اختیاری ہے یہاں
جیسا جسے سمجھے گا، وہ ہے ویسا ہی
یعنی ہر چیز اعتباری ہے یہاں

وہ جوشِ تلاش و آرزو مجھ میں نہیں
وہ جذبۂ فکر و جستجو مجھ میں نہیں
ہر سمت سے آ رہی ہے آواز "انا"
معلوم ہوا کہ آج تُو مجھ میں نہیں

اخلاق بھی ایک مکرِ انسانی ہے
ایثار بھی اک فریبِ نفسانی ہے
تُو اپنی غرض سے کام رکھ دیوانے!
دُنیا اپنی غرض کی دیوانی ہے

کچھ صاحبِ ہوش، اور وہمی کچھ ہوں
آئے نہ سمجھ میں، چیز ایسی کچھ ہوں
کیونکر ہوگا یقین، ہونے کا ترے
جب تک مجھے وہم ہے کہ میں بھی کچھ ہوں

فانوس سے شمعِ انجمن چھپتی ہے؟
کب گرد میں سُورج کی کرن چھپتی ہے
سیماب ہُنر پوشیِ حاسد معلوم!
کانٹوں میں کہیں بوئے چمن چھپتی ہے!

شاعر کا وقارِ فکر ملحوظ رہا
جس نے اِسے سُن لیا وہ محظوظ رہا
ہر شخص بقدرِ ظرف و ہمّت سمجھا
شاعر کا خیال پھر بھی محفوظ رہا

بزمِ راحت، نہ رزمِ پُر ہول میں ہے
ہے حُسنِ سخن میں، نہ بُرے قول میں ہے
ہے فیصلۂ شجاع، برحق سیماب
انساں کا ضمیر، اُس کے ماحول میں ہے

ہر نغمہ بہ اندازِ طرب پہنچایا
بے منّت و غرض و بے طلب پہنچایا
صوفی نے جسے سینہ بہ سینہ رکھّا
شاعر نے وہ راز لب بہ لب پہنچایا

آب و گل و خشت کے سَرابوں سے گذر
ماحول کے ظاہری حجابوں سے گذر
ہر ذرّے میں اک صبح نظر آئے گی
اِس مادّی زندگی کے خوابوں سے گذر

ہم لوگ ہیں عرفان کی منزل والے
ہر طرح ہمیں سُنتے ہیں محفل والے
الفاظ کے لیتے ہیں مزے ظاہر بیں
مفہوم پہ رکھتے ہیں نظر دل والے

ن ث ن (۶۰۸۸)

انجمن ترقی اردو (ہند)

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

۱۹۸۸ ۱۸۸

۱۔ دریا گنج، دہلی

مورخہ ۱۹ ۔۔۔ ۲ ۔۔۔ ء

مکرم و معظم — تسلیم

مجھے کل ہی معلوم ہوا کہ آپ ریڈیو کے مشاعرے کی تقریب میں
دہلی تشریف لانے والے ہیں — اس کی بڑی مسرت ہوئی کہ آپ سے ملاقات کا
موقع ہے گا — لیکن افسوس ہے کہ آپ اس شب کو یہاں تک کھانا تناول
[illegible] — مشاعرے سے فارغ ہونے کے بعد سیدھے غائب ہو
گئے — یہاں تشریف نہ لائے — بہت محروم رہا۔

مخلص

عبدالحق

بابائے اردو مولوی عبدالحق کا خط۔ علامہ سیماب اکبرآبادی کے نام

راز چاندپوری

داستانے چند

(۲)

داستان سرائی سے پہلے —

میرے ایک مختصر مضمون "یادش بخیر" مطبوعہ شاعر (اپریل ۱۹۶۲ء) کے سلسلہ میں ۲۳ مارچ ۱۹۶۲ء کو برادرم اعجاز صدیقی نے مجھے لکھا تھا۔

"میرا خیال تھا کہ آپ کے مضمون میں کچھ ایسے واقعات ہوں گے جو قبلہ مرحوم کی زندگی اور اُن کے ابتدائی کارناموں پر روشنی ڈالیں گے، مگر آپ نے اُس کو بہار کے سفر تک محدود رکھا۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ اگر کسی دوسری فرصت میں آپ ان تمام واقعات کو قلمبند فرما دیں جو آپ کے علم میں ہوں تو اُن کے (مولانا سیماب) سوانح حیات مرتب کرنے میں کافی مدد ملے گی۔"

اُس وقت میں بسلسلہ ملازمت جبل پور میں مقیم تھا اور ملازمت کی پابندی و ذمہ داری کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کا وقت بہت کم ملتا تھا۔ پھر ۳ جنوری ۱۹۶۳ء کو اعجاز صاحب نے لکھا تھا اب بار ملازمت سے میں سبکدوش ہو چکا تھا۔

"اچھا ہوا کہ آپ نے علی گڑھ میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ میری تمنا ہے کہ آپ بقیہ زندگی ادبی کاموں میں صرف کریں.... اگر سال چھ ماہ میں قبلہ پر آپ کوئی کتاب لکھ دیں تو اچھا ہوگا۔ اُن کے خطوط بھی آپ کے پاس ہوں گے۔ ان کے ادبی خطوط ہی کا ایک مجموعہ مرتب فرما دیجئے۔"

میں نے فرصت کو غنیمت سمجھ کر اسی وقت سے ضروری مواد جمع کرنا اور یادداشتیں مرتب کرنا شروع کر دیا تھا[1] لیکن بوجوہ اُن کو کتابی صورت میں ترتیب نہ دے سکا تھا کہ "حدیث دلبراں" (سالنامۂ شاعر ۱۹۶۳ء) کے مطالعہ کے بعد یہ خیال ہوا کہ مولانا سیماب مرحوم کی ذات و صفات کے متعلق جو سرمایہ (مطبوعہ و قلمی) میرے پاس محفوظ ہے اُس کو جستہ جستہ

---

[*] اِس مضمون میں اُس آل انڈیا قومی مشاعرہ کا مختصر ذکر کیا گیا تھا جو انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ گیا (بہار) کے سلسلہ میں ۲۸ دسمبر ۱۹۲۲ء کو ہوا تھا۔ موجودہ داستان نگاری کے سلسلہ میں اُس مضمون کو ترمیم و اضافہ کے بعد دوبارہ شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کسی آئندہ صحبت میں اُس کو پیش کروں گا۔ — راز

[1] میں نے نہ صرف مولانا سیماب کے اہم خطوط ہی کو مرتب کیا بلکہ مولانا کے بعض معاصرین اور تلامذہ مثلاً ساغر، منظر، اعجاز وغیرہ کے خطوط کو بھی شامل کر لیا۔ یہ مجموعۂ خطوط مولانا سیماب کے سیرت نگار کے لئے بہت کچھ اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ مگر اِس کو شائع کرنے کی کوئی صورت ہنوز پیدا نہیں ہوئی ہے — راز

نذیرؔ شاعر گردوں، مگر "داستانے چند" (شاعر خاص نمبر ۱۹۶۳ء) پر اعجاز صاحب نے اپنے طویل نوٹ میں حیرتؔ تاریخی حقیقت" کو دہرایا ہے، اُس کے بعد اس سلسلہ کو آگے بڑھانا مناسب نہ معلوم ہوا اور میں نے اعجاز صاحب اس کی اطلاع دیدی۔ اُس کے جواب میں اُنھوں نے اپنے خط مورخہ ۹ راکتوبر ۱۹۶۳ء میں مجھے لکھا کہ :۔

" آپ اپنی داستانوں کا سلسلہ جاری رکھئے۔ اُن میں جو اشعار بھی آپ چاہیں پیش کریں۔ اس سلسلہ میں کوئی قید نہیں ہے، نہ مجھے کسی وقت بھی کوئی اختلاف ہوگا "

اس سے نیز مولانا میکشؔ اکبرآبادی، حضرت کاوشؔ ردمانی وغیرہ کے خطوط مطبوعہ "شاعر" اور حضرت کوثرؔ چاندپوری کے نجی خطوط سے داستان نگاری کی تائید ہوئی اور مجھے خامہ فرسائی کی جرأت۔

تمہید ذرا طویل ہوگئی، لیکن داستان سرائی کا پس منظر واضح کرنے کے لئے اس کی ضرورت تھی۔ اچھا اب آئیے اور ۔۔۔ ع

داستانِ عہدِ گُل را از نظیریؔ بشنوید

مولانا سیمابؔ کا اصلی میدانِ عمل تو شعر گوئی اور تصنیف و تالیف تھا، مگر حسبِ ضرورت اُنھوں نے متعدد مقامات پر ملازمت بھی کی، جس کا ذکر اُنھوں نے اپنے خود نوشت سوانح حیات " شعر الحیات" (کلیم عجم) میں بھی کیا۔ اُس زمانہ میں ضروریاتِ زندگی اس قدر گراں نہ تھیں، جس قدر موجودہ دَور میں ہیں اور وہ ساز و سامانِ عیش و نشاط جو آج کل ضروریاتِ زندگی کا جزوِ اعظم بن گیا ہے، اُس وقت عام نہ تھا، تاہم ملازمین کی تنخواہیں اتنی قلیل تھیں کہ سادگی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے بمشکل کافی ہوتی تھیں۔ اس لئے مولانا نے وقتی اور عارضی ملازمتوں کے ساتھ اپنے ادبی مشاغل کو بھی برابر جاری رکھا اور یہ اُن کی دُور بینی کی دلیل ہے۔

۱۹۱۸ء میں مولانا نے ایسٹ انڈیا ریلوے کے دفتر ٹونڈلہ (ضلع آگرہ) میں ملازمت کرلی۔ اُس وقت اس دفتر میں سید محمد احسن نقوی شہیدؔ شمس آبادی ہیڈ کلرک تھے۔ وہ سخنور بھی تھے اور سخن نواز بھی۔ حضرت شہیدؔ کے علاوہ ریلوے دفاتر اور اسکول میں چند اور ہندو مسلمان بھی ایسے تھے، جن کو اردو زبان اور شعر و سخن سے دلچسپی تھی۔ حکومت کی دفتری زبان بھی اُردو تھی اور عموماً ہر شخص بلا قیدِ مذہب و ملت اُردو داں بلکہ اکثر فارسی داں بھی ہوتا تھا اور اردو جاننے کے لئے تھوڑی بہت فارسی پڑھنا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اُس وقت ٹونڈلہ میں جو کچھ چہل پہل تھی وہ زیادہ تر ریلوے ملازمین کی وجہ سے تھی۔ ڈسٹرکٹ ٹریفک سپرنٹنڈینٹ کا دفتر، ڈسٹرکٹ لوکو سپرنٹنڈنٹ آفس ریلوے اسکول، ریلوے کلب، گرجا اور اسٹاف کوارٹرس کے علاوہ مختصر سی آبادی کا نام ٹونڈلہ تھا۔

مولانا سیمابؔ فطرتاً شعر و سخن کے دلدادہ تھے۔ بیس سال سے دادِ سخنوری دے رہے تھے، لازماً حضرت شہیدؔ اور دوسرے اہلِ ذوق کی رائے سے ایک مشاعرہ کی بنیاد رکھی گئی اور متعدد مشاعرے ہوئے۔ چونکہ مقامی شعرا کی تعداد کم تھی، اس لئے اکثر باہر کے شعراء کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ ان مشاعروں میں سے دو مشاعروں میں مولانا کی دعوت پر، میں بھی شریک ہوا تھا۔ اُن دو مشاعروں کی روداد اور غزلیات کتابچوں کی صورت میں شائع ہوئی تھیں (یہ دونوں کتابچے میرے پاس محفوظ ہیں) ۔ ان کو ارشادؔ نظامی اکبرآبادی (تلمیذ سیمابؔ) نے ابوالفخر حضرت سیمابؔ صدیقی الوارثی اکبرآبادی" کی نگرانی میں ترتیب دیا تھا اور بہ سرپرستی حضرت شہیدؔ (ہیڈ کلرک) مسٹر آر۔ جی بنسل (ہیڈ ماسٹر) اور بابو بھگوان پرشاد (ڈی۔ ایل۔ ایس آفس) شائع کیا تھا۔

(۱) پری خانہ ۔ یہ مارچ ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا تھا۔ پری خانہ کی رعایت سے سرورق

شاعر بمبئی

پر، جدول میں، پریوں اور دیوؤں کی دستی تصاویر ہیں اور پیشانی پر یہ شعر درج ہے ؎

ہر کلی کہتی ہے کھل کر تیر سے دیوانے سے — دیکھو، نکلی ہے پری سج کے پری خانے سے

اس کی تقریب مولانا سیماب نے لکھی تھی :۔

"ٹونڈلہ" جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں، ایک گانوں کی حیثیت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور اسی وجہ سے یہاں علم و عمل کی روشنی بھی نظر نہیں آتی۔ صرف ریلوے کے چند دفاتر کے قیام نے اس ویرانۂ گمنام کو کچھ عرصہ سے چمکا دیا ہے اور یہاں بھی شرفا اور تعلیم یافتہ اصحاب کی ایک جماعت مختصر آباد ہو گئی ہے......"

"گو فخر البلاد اکبر آباد کی ارضِ مقدس سے اس میدانِ وسیع کی زمینوں کو کچھ زیادہ بُعد نہیں ہے، تاہم آگرہ کی شاعری یا علمی صحبتوں کے اثر سے اسے نہ کچھ حصہ ملا نہ مل سکتا تھا۔ چند روز سے جو علمی صحبتیں یہاں نظر آ رہی ہیں، یہ صرف اُن اربابِ کمال کا فیض و تصرف ہے جو علم و فن کے آفتاب درخشاں ہیں...۔ یہ انھیں حضرات کی کوششوں اور محنتوں کا نتیجۂ کامیاب ہے کہ اِدھر تو انڈین ریلوے انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد قائم ہو رہی ہے، اُدھر علمی جلسے اور مشاعرے منعقد ہو رہے ہیں، صلائے عام کا آوازہ دُور دُور پہنچ رہا ہے۔ ہر مشاعرے میں دو چار پردیسی شاعر بھی آ ہی جاتے ہیں...."

"یہ ضرورت محسوس کرنے کے بعد کہ ٹونڈلہ میں ہنوز علمی ترقیوں کے لئے بہت کچھ کرنا ہے اور لوگوں کی توجہ کشی اس خصوص میں مقصود ہے، برادرم ارشاد احمد خاں نظامی اکبر آبادی کا یہ خیال حق بجانب ہے کہ اگر بصورتِ مشاعرہ یہ مجموعہ شائع کر دیا جائے تو اس طرح لوگوں، بچوں اور طالب علموں کا رجحان مذاق ادبی و علمی دُنیا کی طرف متوجہ ہو گا اور یہ رسالہ اس خیال کی پہلی قسط ہے ؎

کھلے گا راز میری کوششوں کا کچھ مہینوں میں — ابھی تو پہلی بسم اللہ ہوئی ہے ہم نشینوں میں"

ٹونڈلہ ۱۵ر مارچ ۱۹۱۹ء — سیماب صدیقی الوارثی اکبر آبادی

پری خانہ کا مصرعہ طرح تھا ؎

قیس جو لیلیٰ کا سودائی ہوا، دیوانہ تھا

اس میں مندرجۂ ذیل شعرا کی غزلیں حروفِ تہجی کے حساب سے شامل ہیں :۔

ارشاد اکبر آبادی، اعجاز اکبر آبادی[1]، الفت اکبر آبادی، اوصاف شمس آبادی، بھگوان پرشاد بھگوان، راحت بارہ، کنھیا لال پریم، راز چاند پوری، سیماب اکبر آبادی، شعلہ فیروز آبادی، شفا اکبر آبادی، شہید شمس آبادی، غفور اکبر آبادی، مصور دہلوی، واحد اکبر آبادی اور وحشی ٹونڈلوی۔

آخر میں "عطرِ سخن" کے عنوان کے تحت وہ اشعار ہیں جو اُس وقت کے لحاظ سے) اس زمین کے مخصوص قوافی میں نازک خیالی اور جذباتِ عالیہ کے قابلِ داد مرقع" سمجھے گئے تھے، مثلاً ؎

سارے مضموں تھے پریشاں زلفِ برہم کی طرح	باندھی تھی یہ غزل اور قافیہ دیوانہ تھا	اعجاز
تھا مناسب عشقِ معشوقِ حقیقی کا اُسے	قیس جو لیلیٰ کا سودائی ہوا، دیوانہ تھا	پریم

---

[1] یہ اعجاز صدیقی، مدیر "شاعر" نہیں ہیں۔ اعجاز میاں کا سالِ پیدائش ۱۹۱۱ء ہے اور اسی سال میں نے مولانا سیماب سے تلمذ حاصل کیا تھا۔ راز۔

سالنامہ ۱۹۲۳ء

مُستند[1] دیوانگی میری ہوئی بعدِ فنا — قبر پر آکر وہ بولے، یہ مرا دیوانہ تھا — سیماب
عشق میں تھے منزلِ اوّل میں ہم مجنوں کے ساتھ — منزلِ آخر میں ہم ہشیار، وہ دیوانہ تھا — شہید
قیس و لیلیٰ خوش رہے جب تک کہ ہم مکتب رہے — جب اُٹھے مکتب سے اک مجنوں، اک دیوانہ تھا — غفور

ڈھونڈتا پھرتا تھا شمعِ آرزو کی روشنی — میں شبِ فرقت اندھیری رات کا پروانہ تھا — سیماب
میری خاکستر سے پیدا تھا جہانِ آرزو — جو پتنگا دل کے شعلوں سے اُڑا، پروانہ تھا — ، ،

یاد[2] آتی ہے ہمیں دل کی بہت یادش بخیر! — ٹوٹا پھوٹا اک ہمارے پاس بھی پیمانہ تھا — سیماب

رات کا جانا، وداعِ شیشہ و پیمانہ تھا — صبح کا تارا نہ تھا، قفلِ درِ میخانہ تھا — سیماب

وقتِ رخصت جی میں آتا تھا بلائیں لیجئے — اُن کے رُونے میں بھی اک اندازِ معشوقانہ تھا — شہید

سُن چکے جب خوب وہ میری کہانی تو کہا — واہ جھوٹے، کس قدر جھوٹا ترا افسانہ تھا — اعجاز
بیکسی کی موت بھی ہوتی ہے شہرت کا سبب — دوست دشمن کی زبانوں پر مرا افسانہ تھا — راز
وہ شبابِ بیوفا اک ہمدمِ بیگانہ تھا — خواب تھا، دھوکا تھا، بوئے عطر تھا، افسانہ تھا — شفا

دشت[3] غربت میں یہی لے دیکے دو غمخوار تھے — شبنم آوارہ تھی، یا سبزۂ بیگانہ تھا — سیماب
بزمِ دشمن میں جو سُن لیں ہم نے اُن کی گالیاں — پاس اُن کا تھا، خیالِ محفلِ بیگانہ تھا — واحد

(۲) تماشائی - یہ اپریل ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا تھا۔ سرورق سادہ ہے اور پیشانی پر یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎

کن اداؤں سے مجھے وحشتِ دل لائی ہے — ایک عالم، مرے عالم کا تماشائی ہے

اس میں اُن شعراء کے علاوہ جن کی غزلیں "پری خانہ" کی زینت ہیں، مندرجۂ ذیل شعراء کا اضافہ ہے:-

اثر اکبر آبادی، کاظم شمس آبادی، سعید دہلوی اور ممتاز (علیگ)

اس کے آخر میں "عطرِ سخن" نہیں ہے، بلکہ "ماجرائے ٹونڈلہ" کے عنوان سے ٹونڈلہ کی فضا کا نقشہ کھینچا گیا ہے (از سیماب) اور "نمبر ٹیکر کی کہانی (از ایک نمبر ٹیکر) وغیرہ ہے۔

اِس مشاعرہ کا مصرعۂ طرح تھا - ؏

---

[1] - [2] یہ دونوں اشعار کلیمِ عجم میں نہیں ہیں، مگر "عطرِ سخن" کے ذیل میں پری خانہ میں موجود ہیں۔ جو غزل پری خانہ میں شائع ہوئی تھی اُس میں پندرہ [۱۵] اشعار ہیں، لیکن کلیمِ عجم میں نو [۹] اشعار شامل ہیں - اِن کا سالِ تصنیف مشاعرہ ٹونڈلہ ۱۹۱۸ء " فہرست میں لکھا ہوا ہے — راز

[3] کلیمِ عجم میں پہلا مصرع بعدِ ترمیم اس طرح ہے - ؏ (دشت غربت میں یہی تھے غم گسارِ زندگی) — راز

نشاط عمر"

کس کا سودائی ہے تو کس کا تماشائی ہے

ضیافتِ طبع کے لئے چند اشعار پیش کرتا ہوں ۔

چشمِ شبنم سے اُسی وقت گرے ہیں آنسو	باغ میں جب کبھی پھولوں کو ہنسی آئی ہے	ارشاد
آج پھر بہرِ عیادت شبِ غم آئی ہے	تیرا بیمار ہے اور عالمِ تنہائی ہے	اوصاف
زلف چہرہ پہ بکھر کر یہ نہیں آئی ہے	مطلعِ مہر پہ گھنگھور گھٹا چھائی ہے	بھگوان
ہند پر کیسی مصیبت کی گھٹا چھائی ہے	زر ہے، زور ہے، نہ طاقت نہ توانائی ہے	پریم
کچھ ہماری بھی خبر ہے تمہیں یارانِ وطن!	دشتِ غربت میں پڑے ہیں شبِ تنہائی ہے	راز
عشق کامل ہے فقط ہادیٔ راہِ مقصود	توشۂ راہ تحمّل ہے، شکیبائی ہے	رحمت
عرصۂ[52] حشر میں اندیشۂ رسوائی ہے	جستجو تیری بڑی بھیڑ میں لے آئی ہے	سیماب
کشش دل اُنھیں چلمن میں تو لے آئی ہے	آگے اب حوصلۂ چشمِ تماشائی ہے	״
اپنی[53] آنکھوں سے وہ اپنا ہی تماشائی ہے	آئینہ خانہ میں کیا انجمن آرائی ہے	״
میری اُمیّد! تجھے گلشنِ جنّت ہو نصیب	تو جوانی میں بہت کچھ مرے کام آئی ہے	״
نگہِ ناز سے ناسور ہوا ہے پیدا	آنکھ کی چوٹ کلیجے پہ اُبھر آئی ہے	״
پوچھئے[53] برقِ تمنّا کی تڑپ موسیٰ سے	طور پر جا کے یہی آگ لگا آئی ہے	״
دیکھئے خلد میں سیماب کی راحت طلبی	زانوئے حور پہ کیا چین سے نیند آئی ہے	״
آئینہ سامنے ہے، عالمِ تنہائی ہے	خود ہی وہ حسن ہے خود چشمِ تماشائی ہے	شہید
آپ باتوں کا مصوّر کی بُرا مان گئے	یہ نہ سمجھے کہ وہ دیوانہ ہے، سودائی ہے	مصوّر
میں تو برباد ہوں، آباد نہیں ہو سکتا	ہائے وہ جس نے ترے دل میں جگہ پائی ہے	ممتاز

مولانا سیماب کی ملازمت کا یہ سلسلہ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۳ء تک جاری رہا ۔ اُن کے مندرجۂ ذیل خطوط کے اقتباسات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ملازمت کی پابندی سے خوش نہ تھے اور کسی دوسرے ذریعۂ معاش کی فکر میں تھے ۔

ٹونڈلہ ۔ ۱۸ر جنوری ۱۹۲۳ء

عزیزی و محبّی! خط پہنچا ۔ میں نے ابھی استعفا نہیں دیا ہے، لیکن استعفا دینے کی صورتیں سوچ رہا ہوں ۔ اُنھیں میں سے ایک صورت یہ ہے جس کا خاکہ ہمرشتہ ہے ۔ اگر یہ اسکیم کامیاب[54] ہوگئی تو غالباً کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں آپ بھی ہوں گے ۔ یہ اعلان اسی سائز کے سفید کاغذ پر حاشیہ چھوڑ کر بطور خط

---

[51] اس غزل میں پندرہ اشعار ہیں جو "تماشائی" کی زینت ہیں، مگر کلیمِ عجم میں صرف پانچ اشعار انتخاب کئے گئے ہیں اس کا سالِ تصنیف "آگرہ ۔ ۱۹۱۲ء" لکھا ہوا ہے اور "بادۂ دوشین" کے تحت درج ہے ۔

[52]۔[53] یہ اشعار کلیمِ عجم میں نہیں ہیں ـــ راز

[54] مولانا "وارثی پریس" کے نام سے ایک پریس قائم کر کے اخبار اور ایک رسالہ شائع کرنا چاہتے تھے، مگر یہ اسکیم کامیاب نہیں ہوئی ۔ چند سال کے بعد "شاعر پریس" کے نام سے ایک پریس قائم کیا تھا لیکن پریس کا چلانا مولانا کے بس کی بات نہ تھی ۔ بعدۂ ریلوے ملازمت سے دست کش ہو کر پیمانہ (۱۹۲۳ء) ہفتہ وار تاج (۱۹۲۹ء) اور شاعر (۱۹۳۰ء) جاری کئے، مگر پریس کے قیام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا ـــ راز

پہنچے گا۔ آگرہ میں چھپواتا ہوں تو بات سب میں پھوٹی جاتی ہے۔ اس لئے آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ تکلیف تو ہوگی، مگر میں کیا کروں۔ میرے مقاصد میں جان ڈالنے والے صرف ایک آپ ہی ہیں..... اگر اعلان میں آپ کوئی ضروری لفظ گھٹانا بڑھانا چاہیں، تو اجازت ہے..... "

طالب جواب
سیماب اکبرآبادی

ٹونڈلہ - ۶ر اپریل ۱۹۲۳ء۔

رازؔ صاحب! میں کل دہلی اور میرٹھ سے واپس آیا۔ آپ کے خطوط دیکھے۔ ساحرؔ صاحب[1] کانپور کسی مشاعرہ میں جا رہے ہیں۔ جواب اُن کے حوالہ کرتا ہوں۔"

" ابھی میں نے استعفا نہیں دیا ہے۔ عقل کہتی ہے کہ بیکار ہوجانے سے پہلے کوئی کام سوچ لینا چاہیئے۔ پریس کا خوابِ پریشاں دیکھ رہا ہوں۔ دیکھئے کیا تعبیر نکلتی ہے۔ ابھی تو تقدیر میں "ڈسٹرکٹ ٹائٹ"[2] کی دورنگیاں دیکھنی لکھی ہیں۔ دیکھوں گا۔ گیا سے "تاج"[3] آگیا ہے۔ تصویر بہت خراب آئی ہے۔"

" ساغرؔ صاحب مستقلاً میرے پاس آگئے ہیں۔ اُن کا دیوان[4] علی گڑھ میں قدیر صاحب لکھ رہے ہیں۔ اپریل میں لکھائی اور مئی میں چھپائی ہوگی۔ آپ کی تاریخیں آپ کی یادگار رہیں گی۔ میں نے اپنا دیوان ساغرؔ صاحب کو مرتب کرنے کے لئے دے دیا ہے۔ ارادوں کی نیرنگیوں اور تدابیر کی ناکامیوں سے سخت پریشان ہوں..... "

آپ کا سچّا دعاگو
سیماب اکبرآبادی

ٹونڈلہ کے زمانۂ قیام میں ایک سال محرّم اور ہولی ایک ہی ماہ میں واقع ہوئے تھے۔ حضرتِ شہید امامیہ مذہب کے پیرو تھے اور عشرۂ محرّم میں مجالس عزا منعقد کرنا اُن کا مذہبی فریضہ تھا۔ اس موقع پر مولانا سیماب نے یہ جدّت کی تھی کہ "ہولی" ردیف رکھ کر ایک سلام کہا تھا، جو موقع کی مناسبت سے بہت کامیاب ہوا تھا۔ چند اشعار بطورِ یادگار حاضر ہیں ؎

سلامی! خوب کھیلی تیغِ شاہِ کربلا ہولی ... اُڑا یوں رنگ بن کر خوں، گویا تھی بپا ہولی
وفا اب کیا کہے گا کوئی، سب کہنے کی باتیں ہیں ... کہ جو شرطِ وفا تھی وہ تو کوفہ میں ادا ہولی
چراغاں شام میں تھا، کربلا میں خاک اُڑتی تھی ... سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ دیوالی ہے یا ہولی
ندا ہاتف کی آئی، شاہ نے جب ختم کی حجّت ... یہ ظالم بیوفا ہیں، بے وفاؤں سے وفا ہولی

لگے سیماب آگ اس تیرے طرزِ سوگواری کو
کہیں ایسی بھی لکھتا ہے کوئی مردِ خدا ہولی

---

[1] ضمیر عالم ساحرؔ اکبرآبادی، تلمیذ سیماب۔
[2] مولانا کا تبادلہ دفتر سے ٹونڈلہ جنکشن پر ٹکٹ کلکٹر کے عہدہ پر ہوگیا تھا۔
[3] آل انڈیا قومی مشاعرہ کی روداد، مولانا کا خطبۂ صدارت، تصویر وغیرہ اسی میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا مفصل حال آئندہ صحبت میں سناؤں گا۔
[4] نہ ساغرؔ صاحب کا دیوان (میکدہ) جو ۱۹۲۲ء میں مرتب ہوگیا تھا، شائع ہوا نہ مولانا کا دیوان مرتب ہوسکا۔ شاید یہ وہی دیوان ہوگا۔ جس کا کچھ حصہ حضرتِ ساغرؔ نے نقل کیا ہوگا اور جس کا ذکر "حدیثِ دلبراں" (سالنامۂ شاعر ۱۹۶۳ء) کے تحت کیا گیا تھا — رازؔ

اس کے بعد (مئی یا جون ۱۹۲۳ء میں مولانا نے ریلوے ملازمت سے مستعفی ہو کر مستقل طور پر آگرہ کو اپنا مستقر بنالیا اور اگست ۱۹۲۳ء سے پیمانہ جاری کیا - پہلے نمبر کا سرورق نقش ونگار سے مزیّن ہے - اس کا نامکمل لفظی خاکہ اس طرح کھینچا جا سکتا ہے۔ میلنو سواد اکبرآباد کا ایک ماہانہ صحیفۂ کیف

پیمانہ

داہنی جانب ساقیٔ رعنا مینا بدست وجام بکف استادہ ہے۔ اس کے مقابل " زیرِ نظر " تحریر ہے۔ " زیرِ نظر " کی بائیں طرف ایک پرندہ از قسیم حمام مائل پرواز ہے اور " زیرِ نظر " کے تحت " ساغر نظامی سیمابی علی گڑھی " لکھا ہوا ہے -
بعض زاہدانِ خشک نے اس منظر کیف و سرور کو للچائی ہوئی نظروں سے تو دیکھا، مگر اُن کی ثقاہت چیں بجبیں ہو گئی، اس لئے آیندہ نمبر سے سرورق کو سادہ بنادیا گیا[1] -

پیمانہ کے پہلے نمبر کی تقریب خود مولانا سیماب نے لکھی تھی :-

" میرے قیامِ آگرہ کا عزمِ مستقل معلوم کرنے کے بعد ساغر صاحب نے ایک رسالہ کے اجراء کی خواہش ظاہر کی اور پیمانہ اُسی خواہش کی ایک تصویرِ مخمور ہے .... ساغر صاحب کے ذمہ دار ہاتھ پیمانہ کو ہر اعتبار سے نظر کش اور دلفریب بنانے میں مصروف ہیں اور میں اُس کی ترقی اور کامیابی کا تمنائی ..... "
(۲۰ رجولائی ۱۹۲۳ء) -

پیمانہ کا پہلا نمبر شائع ہونے کے بعد مولانا سیماب مع ساغر صاحب " غربت کدۂ راز " پر کانپور تشریف لائے تھے - چونکہ پیمانہ " بادۂ جدّت وندرت " اور صہبائے ادبِ لطیف " سے معمور تھا اور اُس کا سالانہ چندہ بھی صرف ایک روپیہ چار آنے تھا، اس لئے مقامی طور پر بہت سے خریدار مہیّا ہو گئے تھے - بعد ازاں پیمانہ جو درجہ بدرجہ ترقی کی اور دُنیائے ادب میں اُس کو جو شہرت حاصل ہوئی، اُس کے نشیب و فراز کی داستان بہت طویل ہے اُس کو دُہرانا خوشگوار بھی ہو سکتا ہے اور ناخوشگوار بھی —— یہ داستان بھی قدرے طویل ہو گئی ہے اور اندیشہ ہے کہ کہیں میری آشفتہ بیانی سے آپ اُکتا نہ گئے ہوں، اس لئے پھر کبھی آپ کی سمع خراشی کی جرأت کروں گا — ؎

مے باقی و میگسار باقی

---

[1] کچھ اسی قسم کا حادثہ شاعر کے ابتدائی دور کے سرورق کے ساتھ بھی پیش آیا تھا — راز

HINDUSTANI DAWAKHANA

(A National Legacy Under Govt., Control)

P. B. No. 1022. Ballimaran. Delhi-6

PHONE No. 223666 GRAMS : MEDICINE'S

ایجنسی ہندوستانی دواخانہ ۳۹۳ پائیدھونی بمبئی نمبر ۳

جمیل مظہری

اعترافِ محرومی

کیا دیکھ سکے چشمِ خرد ہے عاری
معنی پہ ہے لفظوں کا لبادہ بھاری
اخلاق ہے کیا خدا کے بندوں سے فریب
دینداری ہے کیا خدا سے دُنیاداری

جلوہ تھا مگر نقاب سمجھا کئے ہم
اور آپ کو عکسِ آب سمجھا کئے ہم
پندارِ خرد نے ہم کو پیاسا رکھا
پانی تھا مگر سراب سمجھا کئے ہم

تھا دشت تو دشت کب چمن کے رہے ہم
مسجد کے رہے نہ انجمن کے رہے ہم
دونوں ہوئے رفتہ رفتہ ہم سے مایوس
یزداں کے ہوئے نہ اہرمن کے رہے ہم

کیا کہیئے جو اپنا حالِ مخدومی ہے
گردُوں کے مسافر نے زمیں چُومی ہے
یہ ذوقِ سخن میری بصیرت کا زوال
اک خندۂ اعترافِ محرومی ہے

نظمیں

علی جواد زیدی

شعلہ بہ شعلہ

خوشا وہ ہاتھ کہ سردی بھرے اندھیرے میں
نکالی سنگ کے سینے سے جس نے چنگاری
خوشا وہ لوگ جنہوں نے یہ آگ بجھنے نہ دی
کسی نے راکھ کی چادر سے ڈھانپ کر رکھا
کسی نے شعلہ بہ شعلہ اسے فروغ دیا
کسی نے اس کی پرستش میں آشتی پائی
یہ آگ جلتی رہی زندگی مچلتی رہی
رگوں میں گرم رہا اس سے خونِ انسانی
یہ آگ وہ ہے کہ لاکھوں کے ہاتھ جھلسائے
مگر اسی نے شبِ تار کو جمال دیا
خوشا وہ ذہن کہ جس نے ذرا سے شعلہ کو
اندھیرے گھر کے دئے کی چمک میں ڈھال دیا
دئے کی لَو سے لڑیں تیز آندھیاں سو بار
کہیں تو چمپئی آنچل ہی بن گیا دیوار
کہیں سُبک سی ہتھیلی بنی حسین حصار
کسی نے بند کئے روزنوں کے دروازے
کسی نے اوٹ کی خاطر بنا لئے فانوس
کہیں دروغ، کہیں محشرِ نفاق و جدال
کہیں پہ جہل و توہم، کہیں پہ استحصال
ہزار شکلوں میں دیکھا گیا اندھیروں کو
ہزار بار اندھیروں نے سازشیں کی ہیں
ہزار بار ہوئی ہے شکستِ فاش انہیں

بڑھا ہے لے کے دیا دستِ شوق میں کوئی
نہ خوفِ صرصر و طوفاں، نہ خوفِ دار و صلیب
یہ سامنے سے گزرتا جلوس صدیوں کا
کسی کے سر پہ چمکتا ہے تاج کانٹوں کا
کسی کے دستِ قوی میں ہے زہر کا پیالہ
کسی کے پائے مبارک میں آہنی زنجیر
کسی کے حلق پہ ہے زہر میں بجھی شمشیر
ہر ایک بار اندھیرے کو یہ گماں گزرا
کسی بھی شمع کی لَو اب نہ تھرتھرائے گی
مگر ہر ایک جگہ انتظامِ شمع بھی تھا
جدھر جدھر سے اندھیروں کا کارواں گزرا
وہ نیم برہنگی کا جلالِ شاہانہ
جو زندگی کو جلاتا رہا دئے کی طرح
کہ خود جلے تو جلے بزم جگمگاتی رہے
گدازِ قلب و نظر، شمع بھی ہے تیشہ بھی
پگھل پگھل گئے کہسار، گر پڑی دیوار
کھلا یہ کس میں تصادم ختم کے راستے تک
یہ اک نحیف مسافر جفا کی راہوں کا
تمام عمر نبرد آزما رہا غم سے
کوئی سوال لئے سینۂ شہادت میں
کسی جواب کا طالب ہے آج بھی ہم سے

شاعر بمبئی

نصیر پرواز

درک

ڈیدۂ یاس نوشتِ تقدیر
خواہشیں مرگِ تمنّا کا ضمیر
اور دُھندلی ہے وفا کی تحریر

وادیٔ شب میں بھٹک جاتی ہے
عکس کی طرح لرزتی آواز
ڈوب جاتے ہیں دھندلکوں کی طرح
کتنے دُھندلے ہیں غمِ زیست کے راز

سایۂ درد ہے تا حدِّ نظر
کوئی منزل نہ کوئی راہ گزر
گرد آلود ہے خوابوں کا نگر

زندگی رنگِ طرب بُوئے وفا
سایۂ زلف نگاہوں کی حیا
قربتِ شوق محبّت کی ادا

نقشِ پا چوم رہی ہے منزل
کتنا پختہ ہے بشر کا احساس
بچھ گئی کاہکشاں قدموں پر
حسنِ ادراک ہے جینے کی اساس

نورِ تابندگیٔ رخشندہ بہار
رقص کرتی ہوئی کرنوں کا نکھار
زیستِ انساں کی عظمت کا سنگھار

سوچ افکار، تصوّر ادراک
وہمِ احساس سرابِ ہستی
حال ماضی نہ کوئی مستقبل
وقت اک ویراں سی بوڑھی بستی

روز و شب رینگ رہا ہے کب سے
سوچ کی راہ میں انساں کا شعور
اپنے چھوڑے ہوئے قدموں کے نشاں
دیکھ کے چُپ ہے نگاہِ مخمور

راز تھا کل بھی وجودِ امکاں
زندگی آج بھی گمنام نشاں
نہ تبسّم کی کوئی انگڑائی
نہ کسی درد کی آہِ لرزاں

زندگی فکر کی مُبہم سی لکیر
ہے حقیقت، کبھی افسانہ ہے
اور انساں کے مقدّر میں فقط
سوچ کی گتھیاں سُلجھانا ہے

متین سروش

رنگ و بُو

تری نگاہ سے پیمانے رقص میں آئے
وہ التفات کہ سرچشمۂ حیات کہیں
متاعِ دیدہ و دل، ارزاں حسنِ گفتگو تیرا
چمن چمن میں گُلِ آرزو لہک اُٹھے

نثار نرگسِ رعنا، حسین خوابِ شباب
بلاکشانِ بہاراں، پئے طواف آئے
گذار قامتِ رنگیں، خیال کی تصویر
لبِ حیات پہ اک نغمۂ نشاط افروز

بہ اہتمام پذیرائی، لُطف کے انداز
یقیں کی جلوہ گری، گُل فشاں تبسّم میں
نفس نفس سے ترے دل کی آنچ آتی ہے
نظر نظر میں ترے جسم کا اُجالا ہے

فقط خلوص کا اظہار یوں نہیں ہوتا
فریبِ شوق و ہوس یوں کوئی نہیں دیتا
کچھ اور بات، تری شانِ دلربائی ہے
اَدا ادا سے پیامِ وفا سُنائی ہے

فروغِ بختِ رساں، گیسوؤں کے سائے میں
مگر یہ ہمتِ ذوقِ طلب کا حال ہے کیا
سُرودِ دیدۂ سے بھڑکے ہیں درد کے شعلے
مئے وصال میں تلخی ہے زہرِ ہجراں کی

عروسِ ذوقِ وفا آ قریب تر میرے
تجھے بھی جلوۂ ہستی سے آشنا کر دوں
غزل سرا لبِ رخسار کے بہت ہوں گے
حقیقتِ غم و مستی سے آشنا کر دوں

چراغِ اشکِ محبّت جو جل سکے تجھ کو
تمام کیف و کرمِ زندگی کا حاصل ہے

شاعر بمبئی

بشر نواز

میرا درد

درد تھمتا بھی نہیں حد سے گذرتا بھی نہیں
ہائے یہ نشہ تو چڑھتا بھی اُترتا بھی نہیں
زخم ناسور بھی بنتا نہیں، بھرتا بھی نہیں
کیسا طوفان ہے جو سر سے گذرتا بھی نہیں
دل ہے ویراں کسی اُجڑی ہوئی محفل کی طرح
در بدر پھرتا ہے آوارۂ منزل کی طرح

ذہنِ حق بیں کا اثر ہے کہ خرد کا جادو
پھول عقائد کے ہوئے خاک اُڑی ہر خوشبو
مٹ گئے تخیل ہی باقی ہے نہ خوابوں کے سبو
صبحِ رخسار بھی اور نہ شامِ گیسو
ایک منظر بھی نہیں آج اُجالے کے لئے
کانپتی ڈوبتی نظروں کے سہارے کے لئے

نہ تذبذب کا دھندلکا، نہ تیقن کی ضیا
نہ پسِ پردہ کوئی اور نہ کوئی جلوہ نما
نہ صدا دور کی، تے پاس کوئی نغمہ سرا
اب نگاہوں میں صنم ہے نہ کوئی عرش نشیں
سر جھکائیں تو سلامت کوئی چوکھٹ ہی نہیں

ذہن اور روح میں اک آنچ سی لہراتی ہے
سانس چلتی ہے تو شعلوں کی لپک آتی ہے
دھوپ ہی دھوپ ہے جس سمت نظر جاتی ہے
سر پہ سایہ ہے نہ قدموں میں گلستاں کوئی
زندگانی ہے کہ جلتا ہے بیاباں کوئی

آنکھیں روشن ہیں، پہ بے جان نگینوں کی طرح
نظریں ملتی ہیں تو ملتی ہیں مشینوں کی طرح
دل بھی جذبات سے عاری ہیں جبینوں کی طرح
آج ہیں زندگیاں بھٹکے سفینوں کی طرح
کوئی مجنوں نہیں اب نجد کے بازاروں میں
ہیر ملتی نہیں ڈھونڈے سے بھی بازاروں میں

جیت اقدار کی اس دور میں اک ہار ہوئی
محنتِ کوہکنی کوشش بے کار ہوئی
گوشِ شیریں پہ صدا تیشے کی بھی بار ہوئی
اب کہاں باقی کوئی قدر، نہ چاہت، نہ جفا
زندگانی سے طلب کرتی ہے سائنس اپنا صلہ

عقل کو ضد ہے کوئی راز نہ اب راز رہے
حسنِ در پردہ کا خود پردہ ہی غماز رہے
آدمی خود ہی جہاں سوز، جہاں ساز رہے

ہو مبارک یہ نیا ذوقِ جنوں عزمِ سفر
اب نہ ذروں پہ نہ تاروں پہ ٹھہرتی ہے نظر
چاند اک منزلِ نو، کاہکشاں راہگذر
لیکن اس دور میں کچھ دل کی بھی قیمت ہوتی
کاش ہر چیز نہ اس درجہ حقیقت ہوتی

شاعر بمبئی

کرشن موہن

کلجُگ

گھور کلجگ ہے کہ مائیں بد دعائیں دے رہی ہیں
اپنے بیٹے بیٹیوں کو
اور بیٹے بیٹیاں بھی
سرکش و آوارہ و باغی ہوئے ہیں۔
خوبصورت عورتوں پر فقرے بازی ہو رہی ہے۔
نسلِ آدم آدمیت کھو رہی ہے
بیویاں بھی تنگ آئی ہیں گھروں سے
اپنی خوشوقتی کی خاطر ہوٹلوں میں گھومتی ہیں۔
ناچتی ہیں، جھومتی ہیں
اب تو پہناوا دکھاوا بن گیا ہے
رُوپ اک رنگیں چھلاوا بن گیا ہے
تھوڑی سی تنخواہوں میں ہو کیونکر گزارا
کوئی سمجھائے خدارا
نسلِ نو کو
دَھن کا نشہ چڑھ گیا ہے
لوبھ لالچ بڑھ گیا ہے

بدمعاشی زندہ و تابندہ ہے اب
اور شرافت مر چکی ہے۔
وہ سبھی قدریں پرانی
ہوگئی ہیں اک کہانی.....
ہم بڑے بوڑھے کہ ہیں سَت جُگ کے انساں
ہم سمجھتے تھے کہ یہ کلجگ سنور کر
ایک دن کرِت جُگ بنے گا
آج لیکن دیکھتے ہیں، سوچتے ہیں یہ تو اک "مرجگ" بنا ہے

کوثر چاندپوری

اہرمن کے پر کٹے!

افسانہ

پروفیسر انصار جو بیک وقت فلسفی بھی تھا اور فنونِ لطیفہ کا شیدائی بھی، پورے ایک سال کے بعد اسپتال کی گھٹی ہوئی فضا سے نکل کر اپنے باغ کے فردوسی ماحول میں سانس لے کر ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے بیماری کے شیطان کو شکست دیکر صحت و تندرستی کے حسین و جمیل فرشتہ کا استقبال کر رہا ہو، اس کے ہونٹوں میں مسکراہٹیں کروٹ بدل رہی تھیں اور دل میں نہ جانے کب کی سوئی ہوئی مسرتیں بیدار ہوتی جا رہی تھیں، وہ ہرے بھرے درختوں کے درمیان کھڑا نہر میں دوڑتی ہوئی پتلی سی بے چین دھار کو غور سے دیکھ رہا تھا، اُسے پانی کی شوخ اور چنچل لہروں میں زندگی مچلتی محسوس ہو رہی تھی اور یہی زندگی باغ میں کھڑے سنتروں اور امردوں کی شاخوں اور اُن پر جھومتے ہوئے پھلوں میں چمکتی نظر آ رہی تھی وہ اسی نہر کا پانی پی کر جوان اور ثمر دار ہوئے تھے اور ایک برس کے اندر ہی اُن کی دوشیزگی بچپن کی حدود کو پھلانگنے لگی تھی، جب وہ مقامی ہسپتال کے پرائیوٹ وارڈ میں داخل ہوا تھا اس وقت یہی درخت جن پر اب جوانی کا نکھار تھا اور جن کی نازک شاخوں پر رسیلے پھل لگے ہوئے تھے، بیکھ پانی کی ان ننھی اور الھڑ بوندوں نے جو موجوں کی آغوش میں اٹھکھیلیاں کرتی نظر آ رہی تھیں تھوڑے ہی دنوں میں اُنھیں کیا سے کیا بنا دیا تھا، ــ پورے باغ پر خوبصورتی، شباب اور رعنائی کی ایسی فضا حاوی تھی جس کے اندر وہ خود جوان بنتا جا رہا تھا، اُسے بچپن میں پڑھا ہوا ایک شعر یاد آ گیا۔

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا   کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا

تین سو پینسٹھ (۳۶۵) دن کی مدت بظاہر بہت بڑی ہے مگر اتنے بڑے کام کے لئے اعداد و دور سے تعبیر کیا جائے گا، انصار جانتا تھا کہ اس نہر کو ایک بہت بڑے بندھ سے کاٹ کر لایا گیا ہے، اور سینکڑوں، ہزاروں باغوں میں زندگی بکھیرتی ہوئی یہ اس مقام تک پہونچی ہے، تین چار سال پہلے یہاں جنگل ہی جنگل تھا، دُور تک اُجاڑ، بنجر اور پتھریلی، بنجر زمینوں کا سلسلہ چلا گیا تھا لیکن مشینوں سے جنگل صاف کر دیا گیا، اور بنجر زمین کو عورت کی کوکھ کی مانند زرخیز بنا دیا، کس کو اُمید تھی کہ چھ سات بیگھہ کی یہ دھرتی جس کو بہت کم داموں میں خرید کر اُس نے اِن امردوں اور سنتروں کی قلمیں لگا دی تھیں جو ہر حیات کی دھاریں اُگلنے لگیگی، اور یہاں ایسے پھل پیدا ہونے لگیں گے جن کے رس میں دم توڑتے ہوئے انسانوں کو جِلانے کی طاقت ہو، نہر کی سطح پر بنتے اور پھوٹتے بلبلوں کو دیکھ کر وہ بالکل فلسفیانہ انداز سے سوچنے لگا ایک بلبلہ پھوٹتا ہے دوسرا فوراً تاجدارانہ غرور اور تمکنت کے ساتھ اُسکی جگہ حاصل کر لیتا ہے تعمیر اور تخریب، اور کون و فساد کا یہی ڈرامہ ہے جو ابتدائے آفرینش سے دنیا کے اسٹیج

کھیلا جا رہا ہے، ایک چیز مٹتی ہے اُس کی جگہ دوسری پیدا ہو جاتی ہے جو ہر اعتبار سے پہلی بہتر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس جلوہ گاہ ناز کی رونق کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہی جاتی ہے زندگی میں ارتقا ہوتا جاتا ہے اور دھیرے دھیرے ناچیز ذرّوں میں بھی سورج کی سی چمک آتی جاتی ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت جہاں لالہ و گل کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں کل وہاں خس و خاشاک کے سوا کچھ نہ تھا اور میرا یہ باغ، رسیلے اور جاں نواز پھلوں کا یہ سرچشمہ اس کی سب سے بڑی مثال ہے، ذرّہ کیونکر سورج بنتا ہے خس و خاشاک کس طرح رنگین پھولوں میں بدلتے ہیں اور پتھریلی، بنجر زمین کس ترکیب سے پھل دار درخت پیدا کرتی ہے یہ ایک بڑی دلچسپ کہانی ہے جو حقیقت کی روشنی میں اپنے نقطۂ عروج تک پہونچی ہے، اس کہانی میں ارتقا کا پورا فلسفہ سمٹا ہوا ہے، —— وہ نہ جانے کب تک اسی طرح سوچتا رہا کہ اچانک موٹر کا ہارن بج اُٹھا، اور ساری وادی انگڑائی لیتی ہوئی اس نے گھوم کر دیکھا، جیپ کچے راستے پر وصول کا پرچم لہراتی زندگی کے تازہ دم قافلہ کی مانند دوڑ رہی تھی، اُسے دیر سے ڈاک اور دوا کا انتظار تھا جیپ ہی سب چیزیں لئے آ رہی تھی،

نئے اور پرانے اخبار

دوستوں کے خطوط

اور کڑوی کسیلی دوائیں

اس کی توجہ نہر کی طرف سے ہٹ کر جیپ پر مرکوز ہو گئی جس نے ذرا سی دیر میں اس جنگلی وادی میں شہر کے ہنگامے بھر دئیے تھے وہ جیپ میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا،

اگلی سیٹ پر

ڈاکٹر آنند رام ایم۔ بی بی۔ ایس

پچھلی پر

منّے خاں ملازم

شاہو بھبی

اور اُس کے قریب

دو لڑکیاں

ایک صفیہ

دوسری شاہینہ

اُنھیں کچے سنترے چکنے اور امردوں پر لگے ہوئے پھلوں کو دیکھنے کا اتنا ہی اشتیاق تھا جتنا خود اُسے یکے بعد دیگرے ان دونوں کی پیدائش کے بعد ایک خوبصورت سے لڑکے کی ولادت کا رہ چکا تھا۔

جیپ باغ کے دروازے پر رُک گئی، مالی پھاٹک کھولنے کے لئے دوڑا۔ انصار کا بڑا لڑکا آفاق ڈرائیو کر رہا تھا وہ اسٹیرنگ چھوڑ کر زمین پر آ گیا اور دونوں ہی سے ہاتھ اُٹھا کر بلند آواز سے کہا۔

پاپا گڈ مارننگ!

انصار کے لبوں پر ایک ایسی مسکراہٹ پھیل گئی جس کا تجزیہ ممکن نہیں، اس مسکراہٹ میں خوشی تھی، فخر تھا، —— ماضی کی ویرانیاں تھیں، حال اور مستقبل کی انگنت اُمنگیں تھیں۔

ڈاکٹر آنند رام بلڈ پریشر دیکھنے کا آلہ بکس میں رکھے آفاق کے برابر آئے اور بے تکلّفانہ انداز میں چیخے۔

ہاؤ ڈیو ڈو، پروفیسر انصار؟ —— بہت اچھے نظر آ رہے ہیں آپ، باغ کی تازہ ہواؤں نے ہفتہ بھر کے اندر ہی آپ کی کایا پلٹ دی —— سائنس کا یہ کہنا جھوٹ نہیں کہ آکسیجن دنیا کی سب چیزوں سے زیادہ مقوی ہے

شکریہ! —— انصار نے ایک ہاتھ ڈاکٹر سے مصافحہ کرنے کے لئے بڑھا دیا اور دوسرا منّے خاں سے اخباروں کا پلندہ لینے کے لئے،

بڑا شوق ہے اخبار پڑھنے کا انصار صاحب؟۔

کیا پوچھتے ہیں ڈاکٹر صاحب، یہی تو میرا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ ہے، جو آپ لوگوں کی عنایت سے بالکل ہی چھوٹ گیا تھا ایسا لگتا ہے جیسے کبھی اخبارات پڑھے ہی نہ تھے

دنیا بالکل اجنبی سی لگتی ہے، سیکڑوں انقلابات آگئے، کائنات میں، دوستی دشمنی میں اور دشمنی دوستی میں بدل گئی، دوسری صورت تو خیر قدرتی ہے انسان دشمنی کی جڑیں کاٹنے ہی کے لئے تیشہ سنبھالے ہوئے ہے مگر دوستی کا دشمنی میں بدل جانا بہت بڑا حادثہ ہے، بالکل ویسا ہی حادثہ جیسا تریاق کا زہر بن جاتا، اور زندگی کا موت میں تبدیل ہوجانا، میں ان تمام تبدیلیوں سے بے خبر تھا آپ حضرات نے آنکھوں کے ساتھ کان بھی بند کر دئیے تھے، اب کچھ اوپر اوپر کی باتیں معلوم ہوتی جارہی ہیں، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے پودوں کی نشو ونما کی تفصیلی رپورٹ پیش کرنے کی جگہ ایک دم پھلوں کی قاشیں میرے سامنے رکھدی گئی ہیں، آپ جانتے ہیں میں کھوجی قسم کا آدمی ہوں ان قاشوں کو چوسنے سے زیادہ مجھے اس تحقیق میں لطف آتا ہے، کہ پودا نصیب ہونے کے بعد سے پھل لانے تک کن مراحل سے گذرا۔ اس میں پت جھڑ کب ہوا، شگوفے کب آئے اور پھل کب لگے، پرانے اخبار اسی لئے پڑھتا ہوں کہ موجودہ سیاست کی جڑوں تک پہونچ سکوں، اور ہر چیز کے آغاز کا اصل سبب معلوم ہوجائے، اور تو سب دور کی باتیں ہیں مگر چین کا معاملہ تو جیسے بالکل گھریلو قسم کا ہے ہند چین سرحد اس مقام سے آخر ہے کتنی دور، جہاں اسوقت ہم کھڑے ہیں، مشکل سے تیس چالیس کوس' میں نئے اور پرانے اخبارات پڑھکر گویا اپنے پڑوسی ملک کی حرص اور توسیع پسندی کے جذبہ پر ایک طرح کی ریسرچ کر رہا ہوں،

اب تک کیا نتیجہ نکالا آپ نے ــ؟ ڈاکٹر نے سوال کیا۔ ہندوستان تیزی سے ترقی کی شاہراہ پر دوڑ رہا تھا چین کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی اور وہ "نظر بد" کی طرح ہمارے ملک سے چمٹ گیا، ایک لمحہ کے لئے یزداں کے بازو شل ہو گئے، اور اہرمن نے پوری طاقت کے ساتھ اپنے پر کھول کر ہوا میں لہرا دئیے ــ امن کی زلفیں کٹ کر دور جا پڑیں۔ اہنسا کے فرشتہ کی جبیں خاکو بیتی پر بل پڑ گئے، اور وقت کے بہتے ہوئے لمحات تھم سے گئے۔

اس کا انجام؟ آنند رام نے کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

انجام ظاہر ہے، سچائی مرا نہیں کرتی، دنیا کے سارے راست باز مر جائیں پھر بھی سچائی زندہ رہے گی، اور جھوٹ کتنا ہی حسین کیوں نہ ہو سچائی کی جگہ نہیں لے سکتا، سانپ خزانے پر پہرہ دار بن کر بیٹھ سکتا ہے اس کا مالک نہیں بن سکتا، خیر و شر میں شروع ہی سے آویزش رہی ہے، اور اب تک کی تاریخ بتاتی ہے کہ فتح زیادہ تر شر ہی کی ہوئی ہے، سقراط، عیسیٰ، اور حسین اس کی کھلی مثالیں ہیں، مگر یہ مثالیں اسوقت کی ہیں جب دنیا بچپن تھا، اور آپ جانتے ہیں بچوں کی قوت مدافعت (امیونٹی) (IMMUNITY) زیادہ سخت مقابلہ نہیں کر سکتی اور بیماری آسانی سے ان کی رگوں میں نشیمن بنا لیتی ہے، گاندھی نے اس عہد کی دنیا کو جوان بنا دیا ہے، اس میں مدافعت کی زبردست طاقت موجود ہے، وہ بیماری کے زہر کو باہر پھینک دینے کا حوصلہ رکھتی ہے اب وہ شر کی جڑیں بالکل اکھاڑ ڈالے گی، اور خیر کو کبھی مغلوب نہ ہونے دیگی، یزداں کے بازو شل ضرور ہوگئے تھے مگر مفلوج یا بیکار نہیں ہوئے تھے، تندرستی کے خون نے ذرا سی تگ و دو کے بعد بیماری کو پرے دھکیل دیا اور اہرمن کے ہوا میں پھیلے ہوئے پر سمٹنے لگے ــــ میں وہاں تک پہونچ چکا ہوں جہاں سے چین نے پیچھے ہٹنا شروع کیا ہے، بڑا خون بہا اور بے شمار جانیں تلف ہوئیں، لیکن آخر کار یزدانی طاقت غالب آئی اور اس نے اہرمن کے پر نوچ ڈالے ــــ راون دم توڑ چکا ہے دیر صرف اتنی ہے کہ اس کی اپنی سیاہ کاری لنکا کو پھونک ڈالے،

خوب باتیں ہوتی ہیں انصار صاحب آپ کی ــــ کسقدر فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں آپ حالات اور واقعات کو!

اور سچ پوچھئے تو یہی ایک زاویۂ نظر ہے حالات کو نیک طور سے دیکھنے کا،

لیکن تازہ خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ اہرمن پھر پَر تول رہا ہے، وہ اندر ہی اندر زبردست تیاریاں کر چکا ہے، اور یزداں کے بازوؤں کو آپ نے نہیں دیکھا کہ وہ کتنے طاقتور ہو چکے ہیں، یاد رکھئے ڈاکٹر صاحب کہ دنیا کی عمر چاہے کتنی ہی کیوں نہ ہو جوان وہ ابھی ابھی ہوئی ہے بلکہ ابھی اچھی طرح اس پر شباب نہیں آیا یوں سمجھئے کہ کائنات کی مَسیں ہی بھیگی ہیں، وہ جوان ہوگی اور ضرور ہوگی، اور دنیا کا یہ شباب انسانیت کی ترقی کا وہ نقطہ ہوگا جہاں اہرمن کا سر یزداں کے پیروں پر ہوگا۔ پھلوں سے لدے ہوئے یہ سرسبز باغات، اور لہلہاتے ہوئے کھیت، اُن کے درمیان بل کھاتی ہوئی یہ نہریں، اس کی جوانی کا جمال بھی ہوں گی اور جلال بھی، یہ سب چیزیں دائمی ہونگی، اور حسن کا یہی دوام، خیر کی مکمل فتح ہوگی، اس کے بعد شر ہمیشہ کے لئے سرنگوں ہو جائے گا، تعمیری رجحان بڑھتا جائے گا۔ اور تخریب کے تصوّرات ملیامیٹ ہو جائیں گے،

آپ کی رائے میں کیا دنیا اسی منطقی انداز پہ چلتی رہے گی؟

بالکل! — میرا عقیدہ ہے کہ نظامِ کائنات بڑے شعور کے ساتھ منطقی ڈھرّے پر چل رہا ہے۔ اتنا بڑا کاروباریوں ہی اندھا دھند نہیں چلا کرتا اس میں بڑے دانشورانہ تیور ہوتے ہیں، اَب تعمیر بڑی فن کاری کے ساتھ تخریب کو دباتی جا رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان ایسا ملک جو عدمِ تشدّد پر عقیدہ رکھتا ہے اور امن کا پجاری ہے، جس نے آزادی کے پندرہ سال میں لڑائی کا تصوّر تک نہیں کیا، چین کے شدید اور اچانک حملہ کو بالکل اسی طرح سہ گیا جیسے میں بلڈ پریشر کے سمندر کو پار کر کے تندرستی کے ساحل پر آ کھڑا ہوا، اور اَب تو شاعو بمبئی

ہمارا ملک صرف مدافعت ہی کی نہیں بلکہ آگے بڑھنے کی سکت بھی رکھتا ہے، یہ نہ سمجھئے کہ اس میں یزدانی کردار باقی نہیں رہا، وہ اپنی جگہ قائم ہے، مگر آپ جانتے ہیں کہ باطل کی بڑھتی اور اُمڈتی ہوئی طاقتوں کو کچلنا بھی تو یزداں ہی کے فرائض میں داخل ہے، اور اسی کے لئے اُسے اپنی تمام تخلیقی صلاحیتوں سے کام لینا پڑا ہے، سو آپ دیکھ رہے ہیں کہ ملک میں ہتھیار بنانے کے کارخانے بھی کھل رہے ہیں مگر ان تیاریوں کو کشت و خون اور امن دشمنی کے لئے استعمال نہیں کیا جائے گا بلکہ انسانیت کے نکھار اور امن کا پرچار کرنے کے لئے کام میں لایا جائے گا۔ یزداں تو اس دنیا کی خوبصورتی، اس کی سُندرتا اور رعنائی کا شیدا ہے، وہ تباہی اور بربادی برداشت نہیں کر سکتا

لائیے میں ذرا آپ کے خون کا دباؤ بھی دیکھ لوں!

میں بالکل نارمل ہوں، ڈاکٹر — بلکہ ساری دنیا اعتدال کی جانب گامزن ہے، چین اپنی فوجوں کو سمیٹ کر وہیں پہونچ گیا ہے جہاں سے چلا تھا اور جن مقامات پر چین کی چینوٹیاں بھاری تعداد میں رینگ رہی ہیں، وہاں ہر وقت ہم اپنے فوجی اسپرے SPRAY سے ٹِک ٹوئنٹی TIK TWENTY چھڑک سکتے ہیں۔

میں اپنا فرض تو ضرور ادا کروں گا، ڈاکٹر نے کہا ضرور، ہم سب ہی کو اپنے اپنے فرائض کا دھیان ہونا چاہیئے اور ڈاکٹر تو یزداں کا ایسا نقیب ہے جو شر کی اندھیریوں میں بھی اپنا صُور پھونکتا ہے۔

ڈاکٹر آنند رام، انصار کا طبّی معائنہ کرنے کے بعد باغ میں چہل قدمی کرنے لگے، انصار نے اسی دوران میں اس باغ کی مختصر تاریخ انھیں بتائی اور اس کے سامنے بھاگتی ہوئی نہر کے متعلق کہا کہ یہ نہر جسے آپ کی طبّی زبان میں اے آرٹا (AORTA) یا نہر البدل کہنا چاہیئے ہمارے ماہرِ فن انجنیروں کی دانشوری کا
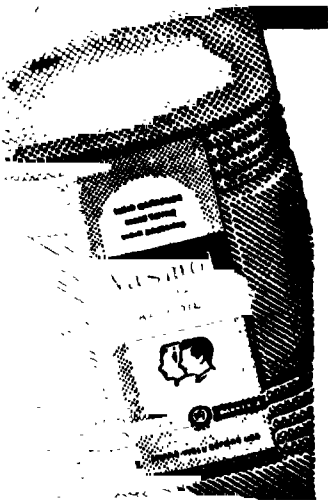
عکس جمیسل ہے جس طرح ایک پلاسٹک سرجن سوکھی اور بے کار رگوں کی جگہ مصنوعی رگیں فٹ کر کے خون کی رسد کے نظام کو بحال کر دیتا ہے اسی طرح انجینیروں نے ایک بڑے بند سے زندگی کا یہ سرچشمہ یہاں تک پہونچا کر زمین کو اتنا زرخیز بنا دیا ہے کہ اب مجھے بڑھتی ہوئی آبادی سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا اگر ترقی کے اس ماحول کو برقرار رکھنے کی سہولتیں حاصل رہیں اور عالم گیر امن کی فضا تیار ہو گئی تو یقین ہے کہ جلد ہی ملک میں اتنا اناج پیدا ہونے لگے گا کہ بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

بڑے اوپٹی مسٹ (OPTMIST) ہیں آپ، اور پے سی مسٹ (PESSIMIST) ہونے کی کوئی وجہ نہیں، ڈاکٹر صاحب

صفیہ اور شاہینہ جو اب تک سب سے الگ تھلگ دوڑتی پھر رہی تھیں ایک دم سے شور مچاتی آگئیں

پاپا ہم نے سنتروں سے پوری باسکٹ بھر لی اور اتنے سنترے کھائے اتنے کھائے کہ پیٹ حلق تک بھر گیا۔

اور میرا خیال ہے کہ آئندہ بیس سال میں ہندوستان کی ہر لڑکی اتنے ہی سنترے کھائے گی اور ہمارے باغ اسی طرح سرسبز رہیں گے، اور ہمیں کوئی یہ کہکر نہ ڈرائے گا۔

"شل ہوئے بازوئے یزداں، اہرمن کے پر کھلے"

آپ کا سالِ خریداری ختم ہو چکا ہے

اگر اس سیاہ حلقے میں سرخ نشان لگا ہوا تو

اس کے معنی یہ ہیں کہ اس شمارے کے ساتھ آپ کا سالِ خریداری ختم ہو چکا ہے۔ از راہِ کرم سات روپے زرِ سالانہ منی آڈر سے اپنی اولین فرصت میں روانہ فرما دیجئے۔ بصورتِ دیگر آئندہ شمارہ آپ کے نام بذریعہ وی پی بھیجا جائے گا جس کا وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہے۔ اگر تجدیدِ خریداری منظور نہ ہو تو ایک کارڈ کے ذریعے فوراً دفتر کو اطلاع دیدیجئے تاکہ وی پی نہ بھیجا جائے۔ منیجر

ست پرکاش سنگر

انصاف

آبادی سے دس میل دُور، آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع یہ مندر ایک عجیب نظارہ پیش کر رہا تھا۔ یہاں سے نیچے نگاہ ڈالنے پر ارد گرد کے بلند پہاڑ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں جیسے دکھائی دے رہے تھے۔ نیچے کے پہاڑی شہر چھوٹے قصبوں کی مانند لگ رہے تھے۔ سخت چڑھائی چڑھنے کے بعد تھکاوٹ کو دُور کرنے اور سستانے کے لئے میں مندر کے باہر ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔

"کم ہیر پلیز"

میرے کان میں آواز پڑی۔

میں نے گردن کو گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ یہاں انگریزی زبان میں اس طرح مجھ سے کون مخاطب ہو رہا ہے؟

"کم اِن سائڈ پلیز"

آواز مندر کے اندر سے آ رہی تھی۔ کوئی انگریزی کا پڑھا لکھا اندر بیٹھا ہوگا۔ میں اُٹھا۔ اور جوتا باہر اُتار کر، باہر پڑے مٹکے کے پانی سے ہاتھ دھو کر۔ مندر میں چلا گیا۔ اندر ایک سفید ریش سادھو بیٹھے تھے۔ اُن کی مونچھیں گھنی، داڑھی اور جٹائیں لمبی تھیں۔ چہرے سے جلال ٹپکتا تھا۔

"سِٹ ڈاؤن پلیز"

انھیں پرنام کر کے میں فرش پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھ گیا۔

"آپ تو انگریزی بھی خوب بول لیتے ہیں" میں نے کہا۔

"اس لئے کہ بھول نہ جاؤں۔ ویسے میں انگریزی کتابوں اور رسالوں سے اپنی نالج کو تازہ رکھتا ہوں"

"آپ کو رسائل یہاں مل جاتے ہیں"؟

"ہاں، بھگت لوگ بھیج ہی دیتے ہیں۔ وہ میری عادتوں سے واقف ہیں اور مجھے کتابیں اور میگزین بھیجتے رہتے ہیں"۔

"یہ تو اچھی بات ہے"۔ میں نے کہا۔

"یہ تو نہیں جانتا۔ ہاں اِن اخباروں اور رسالوں کو پڑھ کر طبیعت کو دکھ ہوتا ہے"۔

"وہ کیوں"؟ میں نے پوچھا۔

"حالات کو پڑھ کر" سوامی جی اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "میرا خیال تھا کہ آزادی کے بعد ہمارے دیش میں خوشحالی پھیلے گی سُکھ اور شانتی کا راج ہوگا۔ گاندھی جی کا رام راج کا سپنا پُورا ہوگا۔ لیکن ....."

"چُپ کیوں ہو گئے"؟

"اور کیا کروں؟ وہ آہ بھر کر بولے۔

"پندرہ سال کے قلیل عرصے میں امیدوں کا خوبصورت راج بھون مٹی میں مل جائے گا، ایسا کوئی سوچ سکتا تھا"۔

"لیکن سوامی جی! میں نے اُن کی نراشا دُور کرنے

دیہاتی سے کہا۔ ان پندرہ سالوں میں بھارت نے کتنی ترقی کی ہے، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ہم نے دریاؤں پر باندھ لگا کر، نہریں بنائیں، قدرت پر فتح حاصل کر کے، بجلی پیدا کی۔ ٹریکٹروں سے کھیتی شروع کی۔ اسکول اور کالج کھولے۔ کیا یہ سب معمولی باتیں ہیں؟"

" بیٹا! اس ترقی کی کیا نوعیت ہے؟ کیا دیش سے بیکاری مٹ گئی ہے؟ کیا نہروں نے بھوک دور کر دی ہے؟ بجلی کی روشنی سے لوگوں کے دل منور ہوئے ہیں؟ زیادہ اُپج بڑھنے سے اشیائے خوردنی ارزاں ہوئی ہیں؟ سکول اور کالج کھلنے سے لوگوں نے ایسی شکشا پراپت کی ہے جو اُنھیں انسان بنا سکے، اُن کے دل سے بھید بھاؤ مٹا سکے اور اُن کے دلوں میں دیش اور انسانیت کی سیوا کا جذبہ پیدا کر سکے؟ نہیں ہرگز نہیں، عام لوگ پہلے سے زیادہ غریب ہیں، امیر پہلے سے زیادہ امیر ہیں۔ سیاسی ردّ و بدل کے کارن شاید کل کے بھکاری راجے بھی بن بیٹھے ہیں لیکن میں پوچھتا ہوں کہ آج کے بھارت میں دل کے امیر کتنے لوگ ہیں؟ پیسہ رکھتے ہوئے بھی کتنے لوگ سکھی ہیں؟ کتنے لوگوں کے من میں آشا کی کرن پھوٹتی ہے؟ شانتی اور دھیرج کتنے لوگوں کی پراپتی ہے؟ پندرہ سالوں کی آزاد حکومت کے بعد مشعل لے کر بھی سچی آزادی کہیں ڈھونڈنے سے ملتی ہے؟ دنیا کو دکھانے کے لئے آزادی، جنتا، مساوات کے ڈھونگ تو درست ہیں لیکن خود کو دھوکے میں رکھنا گناہ ہے، پاپ ہے۔"

" آج کے زمانے میں پاپ اور گناہ کی تشریح بدل گئی ہے، سوامی جی۔"

" بنیادی قدروں کی تشریح کبھی نہیں بدلتی بیٹا! صداقت اور انصاف کی قدر و منزلت ہمیشہ ہی رہی ہے۔ لیکن آج دونوں کا فقدان ہو گیا ہے۔ دیش میں دھاندلی چل رہی ہے، زبردست کا بول بالا ہے۔"

" لا کب نہیں تھا؟ سوامی جی! زبردست پیدا ہی اسی لئے ہوئے ہیں کہ اُن کا بول بالا رہے۔ ہر زمانے میں ایسا رہا ہے۔ ہر زمانے میں ایسا رہے گا۔ تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے۔"

" تاریخ یہ بھی بتاتی ہے" سوامی جی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "کہ وہی حکومت کامیابی سے چل سکتی ہے جو انصاف پر مبنی ہو۔ جہاں انصاف ترازو پر تلتا ہو، جہاں حکومت رعایا کو بچوں کی طرح پالتی ہو۔"

" لیکن سوامی جی! " میں نے جواب دیا " آج کی رعایا اپنے کو بچے نہیں، باپ سمجھتی ہے۔ حکمران رعایا کے نوکر سمجھے جاتے ہیں۔"

" یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ بیٹا۔ حکمرانوں کا فرض ہے کہ رعایا کی نبض کو پہچان کر، اُن کے دُکھ درد کو دور کریں۔ انصاف کے ترازو کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ ایسے حاکم کا نام زندہ جاوید رہے گا۔ جیسے نوشیرواں، اشوک اور اکبر کا۔ مہاراجہ کیرتی پرتاپ کا۔"

" یہ کون تھے؟"

" اس علاقے کے راجا تھے۔"

" کیا مطلب؟"

" ریاستوں کے بھارت یونین میں ضم ہونے سے پیشتر یہ علاقہ ایک ریاست میں شامل تھا۔ اس راجیہ کی باگ ڈور مہاراجہ کیرتی پرتاپ کے ہاتھ میں تھی۔"

" مہاراج! بڑی مشکل سے ان ظالم راجاؤں کا زمانہ ختم ہوا ہے۔"

" کچھ راجے ظالم تھے، اس میں کوئی شک نہیں لیکن بہت سے راجے پرجا کو بچوں کی طرح پالتے تھے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں۔"

" مہاراج کیرتی پرتاپ کو آپ نے دیکھا تھا؟"

" اچھی طرح۔"

شاعر بمبئی

اُن کے زمانے کا کوئی واقعہ آپ کو یاد ہو گا؟"
"بہت واقعے ہیں لیکن آپ کو ایک ہی سُناتا ہوں۔
اس کے بعد سوامی جی نے قصہ سُنانا شروع کیا۔ "مہاراجہ کیسری پرتاپ دھرم کرم کے پکّے تھے۔ انصاف پروری کے لئے اُن کی شہرت نہ صرف اپنی ریاست میں، بلکہ گرد و نواح کے علاقوں میں بھی پھیلی ہوئی تھی۔ رعایا کی بہبودی ہی اُن کا دھرم تھا۔ پرجا کی خوشنودی ہی اُن کا ایمان تھا۔ وزیروں اور افسروں کے تقرر کے وقت بھی وہ مناسب لوگوں کو دھیان میں رکھتے، خصوصًا محکمۂ پولیس میں ایسے لوگوں کو بھرتی کرتے جو منصف مزاج ہوں اور اپنے کام میں ہشیار ہوں۔ انسپکٹر جنرل آف پولیس کی پوسٹ پر اُنھوں نے ایک ایسے شخص کو تعینات کیا جو اوصافِ حمیدہ کا حامل تھا۔ صبح اُٹھ کر پوجا پاٹھ کرتا، دان دیتا اور اپنے کام کو بخوبی نبھاتا تھا۔ مغل بادشاہوں کی پیروی کرتے ہوئے مہاراج نے اُسے تہوّر شعار کا خطاب عطا کیا تھا جو دراصل مغلوں کے زمانے میں تھانیدار کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ یہ شخص مہاراج کی اپنی بڑی اور چہیتی رانی کا بھائی تھا۔"

• مہاراج کے بعد، ریاست بھر میں شوپرتاپ ہی کی شہرت کا ڈنکا بجتا تھا۔ اُن کی جانفشانی کی وجہ سے ریاست بھر میں نہ کوئی ڈاکو تھا، نہ چور۔ اُنھوں نے ڈاکوؤں اور چوروں سے راجیہ کو پاک کر دیا تھا۔ بہتوں کو کڑی سزائیں دلوائیں۔ دوسروں کو ملک بدر کر دیا۔ بدمعاشوں کے گروہ ریاست چھوڑ کر چلے گئے یہی نہیں اُنھوں نے دھوکے اور بے ایمانی کرنے والے تاجروں اور دکانداروں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اور اُنھیں معمولی جرم کے لئے اتنی کڑی سزائیں دیں کہ وہ لوگ دہشت زدہ ہو گئے۔ بلیک مارکیٹ کے نام تک سے کوئی واقف نہ تھا۔ رشوت خوری کا انسداد ہو گیا۔ شوپرتاپ سنگھ کی خدمات کے صلے میں مہاراج نے اُنھیں ایک عالیشان جلسے میں خطاب اور خلعت سے سرفراز کیا۔"

• شوپرتاپ نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ لوگ اُنھیں دھرماتما تصوّر کرتے۔ کسی وقت بھی اپنی شکایت لے کر اُن کے پاس جا پہنچتے۔ اور شوپرتاپ فورًا اُن کی شکایت کو دُور کرنے کی کوشش کرتے۔"

"لیکن قدرت بھی عجیب شے ہے کسی شخص کو ہمیشہ ایک جیسی حالت میں نہیں رہنے دیتی۔ اُسے ہمیشہ تبدیلی بھاتی ہے۔ اور شاعر نے بھی تو کہا تھا کہ۔

"ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں" ۔

ایک دن بازار میں سے گُذرتے ہوئے شوپرتاپ کی نظر ایک عورت پر جا پڑی اور وہ اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ کوشش کے باوجود دل کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ شاید قدرت نے اُس کی شہرت کو مٹی میں ملانے کے لئے یہ سازش رچی تھی۔ قدرت آدمی کے ساتھ شروع ہی سے ایسا مذاق کرتی آئی ہے۔ عورت کو وہ ہمیشہ ایسے کاموں کے لئے استعمال کرتی ہے۔ ہر فتنہ اور فساد کی جڑ میں عورت ہے۔ آج کے زمانے میں ایسے خیالات رکھنے والا شخص دقیانوسی تو ضرور تصوّر کیا جائے گا، لیکن حقیقت کو کبھی نہیں جھٹلایا جا سکتا۔

وہ ایک سُنار کی بیوی تھی۔ شوپرتاپ نے سُنار کو گھر پر بُلا کر اُسے معقول رشوت دی اور اس کے عوض اُس کی بیوی سے تعلقات پیدا کر لئے۔ کچھ ماہ تک یہ بات صیغۂ راز میں رہی لیکن دھیرے دھیرے سنار برادری کے لوگوں پر یہ بھید کھُل گیا۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں سنار سبھا میں اِس بات پر وچار کیا گیا اور اُنھوں نے شوپرتاپ کی اِس حرکت کی مذمت کی۔

خراب دن آنے پر عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے شوپرتاپ کو اس بات کا پتہ چلا، تو اُس نے سُنار برادری کے برگزیدہ ارکان کو بُلا کر دھمکایا۔ اور جب اُنھوں نے ضد چھوڑنے سے انکار کر دیا تو اُنھیں سپاہیوں سے پٹوا دیا۔ بات شہر میں پھیل گئی۔ شوپرتاپ کی بدنامی ہونے

لگی ۔ فکر کی بات یہ تھی کہ جو نیک نامی اُس نے سخت محنت اور جانفشانی سے پیدا کی تھی ۔ وہ ایک دم مٹی میں ملنے لگی۔ اُس کی شہرت ایک حسینہ کے چنگل میں پھنس کر ڈھلنے لگی، پرائی عورت کی دوستی اُس کی تباہی کا کارن بننے لگی ۔

صبح اُٹھ کر، نہا دھو کر، مہاراج مندر کو جاتے تھے اور انھیں پیچھے سے آواز دینا بدشگونی سمجھی جاتی تھی ۔
ایک دن حسبِ معمول وہ مندر کے قریب پہنچے تو پیچھے سے اُن کے کان میں آواز پڑی ۔

" جے دیا !" (جے دیوا) !

کس کی شامت آئی ہے جو پیچھے سے آواز دی؟ کون ہے ؟ مہاراج نے پیچھے مڑ کر اور غصّے میں آ کر کہا ،

"میں ہوں آپ کا خادم حضور "

" سنار برادری کا سربراہ ۔

" کیا نام ہے ؟

" دھیرج رام ۔"

"کیا بات ہے ؟"

" سُنار برادری کی طرف سے فریاد لے کے آیا ہوں، حضور ہماری عزّت خطرے میں ہے ۔"

" اِس وقت کیوں آئے ہو ؟ "

"پولیس کی نظروں سے بچ کر آیا ہوں، مائی باپ "

" لیکن عزّت کا خطرہ کس سے ہے ؟

" پولیس کے افسرِ اعلیٰ ہی سے ؟

" کیا بکتے ہو ؟

" درست عرض کر رہا ہوں، حضور "

" کیا ؟ "

" کہ شوپرتاپ نے اپنی پوزیشن کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر ہماری برادری کے ایک فرد کی بیوی کے ساتھ ...

" خاموش رہو !" مہاراج نے گرج کر کہا ۔ یہ تھودشعار ہرگز ایسا نہیں کر سکتا "

" لیکن مہاراج ! اُنھوں نے ایسا کیا ہے "

" اگر یہ الزام جھوٹ ثابت ہوا تو جانتے ہو سزا کیا ہے ۔

" جانتا ہوں مہاراج ، سچائی کی خاطر پھانسی کے تختے سے نہیں ڈروں گا "

" ثبوت ہے ؟ "

" جی مہاراج "

" ابھی "

" جی مہاراج "

" ہم چلیں گے "

اُسی وقت سواری کا حکم ہوا ۔ پالکی منگوائی گئی دھیرج رام گزر برادروں کے ساتھ آگے آگے جا رہا تھا بے وقت مہاراج کی سواری دیکھ کر لوگ ششدر رہ گئے ۔ نگر میں بات ایکدم پھیل گئی ۔ لوگ اپنے اپنے کام چھوڑ کر باہر آ گئے اور پالکی کے پیچھے چلنے لگے ۔

ایک مکان کے پاس پہنچ کر دھیرج رام رُکا ۔
مہاراج نے پوچھا ۔

" ثبوت کہاں ہے ؟ "

"حضور یہیں "

مہاراج پالکی میں سے اُترے ۔ سامنے قفل پڑے ہوئے ایک مکان کو دیکھ کر سوالیہ نظریں دھیرج رام کی طرف اُٹھائیں ۔ اُس نے آگے بڑھ کر جیب سے چابی نکالی اور تالے کو کھولا ۔ مہاراج اپنی آنکھوں پر یقین نہ کر سکے ۔ اُن کے سامنے دروازے سے لگے ہوئے تھودشعار شوپرتاپ سنگھ کھڑے تھے ، اور دیوار سے لگی اور سہمی ہوئی سُنار کی بیوی تھی ۔
مہاراج کی نظریں آگ برسانے لگیں ۔

" تم یہاں کیا رہے ہو؟ "

" حضور ، مجرم ہوں ۔ جرم کی معافی چاہتا ہوں " شوپرتاپ اُن کے پاؤں پر گرتے ہوئے بولے ۔
مہاراج پیچھے کو سرک گئے ۔

" مجرم ہو کر جرم کی معافی چاہتے ہو؟ کیا مجبوری سے

ایسا سلوک کرتے ہو؟"

"حضور گنہگار ہوں"

"تم مجرم ہو اور گنہگار بھی" مہاراج بولے۔ جرم کی سزا تمھیں یہیں مل جائے گی۔ گناہ کے لئے کفارہ ادا کرنا پڑے گا"

اتنا کہہ کر مہاراج نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا اور اُس نے آگے بڑھ کر لیٹے ہوئے شوپرتاپ کی پیٹھ پر کوڑے برسانے شروع کر دئیے۔ کوڑا پڑتے ہی شوپرتاپ درد سے چلانے لگے۔ جب وہ کوڑوں کی مار برداشت نہ کر سکے تو اٹھ کھڑے ہوئے۔ مہاراج کے اشارہ کرنے پر سپاہیوں نے آگے بڑھ کر اُن کی مشکیں کس لیں۔ پھر کوڑوں کا حکم ہوا۔ کھڑے ہوئے شوپرتاپ کے منھ پر مہاراج نے گھونسے برسانے شروع کئے۔ کوڑوں کی مار سے شوپرتاپ کھڑے نہ رہ سکے۔ گر پڑے۔ کچھ دیر بعد بے ہوش ہو گئے۔

مہاراج کے حکم سے نالی کا گندہ پانی شوپرتاپ کے منھ میں ڈالا گیا۔ اُس کے ہوش میں آتے ہی پھر کوڑوں کی بارش شروع ہو گئی۔ کچھ دیر بعد اُس کے جسم کے چیتھڑے ہوا میں اُڑنے لگے۔

"مت رکو" مہاراج نے باآواز بلند حکم صادر فرمایا۔ کوڑے برستے رہے۔

بوڑھے وزیر سے نہ رہا گیا۔ آگے بڑھ کر اُس نے جے دیا، پکارا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" مہاراج نے پوچھا۔

"اگر جان بخشی ہو تو عرض کرنے کی جرأت کروں۔

"اجازت ہے"

"مہاراج! سزا جرم سے تجاوز کر چکی ہے۔

"ہم خود قانون ہیں"

"قانون مہاراج سے بلند ہے۔

"مہامنتری! ہوش میں نہیں ہو؟"

"پوری طرح ہوش میں ہوں، مہاراج۔

کوڑے بند کرو" مہاراج نے حکم صادر فرمایا

شوپرتاپ بے ہوش اوندھا پڑا تھا۔ اُس شریر کے پرخچے ہوا میں اُڑ کر اِدھر اُدھر بکھر پڑے تھے منھ سے خون کی دھارا بہہ رہی تھی۔

مہاراج کی آواز پھر سُنائی دی۔

"اس کے جرم کی سزا اسے مل گئی۔ اسے ریاست بدر کیا جاتا ہے تاکہ گنگا کے کنارے جا کر اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر سکے۔

شوپرتاپ کو ہسپتال بھجوایا گیا۔ علاج پورا ہونے پر اُسے ریاست سے باہر جانے کا حکم صادر کیا گیا۔

"بڑی سخت سزا دی" میں نے کہا، "کیا مہارانی نے اپنے بھائی کے لئے بھی کوشش نہیں کی؟"

"وہ جانتی تھیں کہ اگر بھائی کی جگہ اُن کا اپنا لڑکا ہوتا، تو بھی کوشش بیکار جاتی"

"لیکن سوامی جی! ہمارے آج کے حاکم ایسے فضول آدرش واد میں یقین نہیں رکھتے"

"اس لئے حکومت کے لئے لوگوں کے دلوں میں پہلے جیسا وشواش نہیں رہا۔ بلکہ اُن کے وشواس کی دیواریں متزلزل ہو رہی ہیں۔ انصاف ہی دھرم ہے۔ دھرم کا گھونٹنے سے حکومتوں کی جڑیں ہل جاتی ہیں"

"ہاں باواجی! شوپرتاپ کا کیا بنا؟"

"اُسے دیش چھوڑنا اور گنگا جی کے کنارے جا کر گناہ کا کفارہ ادا کرنا پڑا۔

"پھر وہ ریاست میں واپس گئے؟"

"مہاراج کی موت کے بعد اُن کے لڑکے نے اُنھیں لوٹنے کی اجازت دے دی"

"وہ ریاست میں گئے؟"

"گئے تو ضرور لیکن بدلے ہوئے انسان کے رُوپ میں"

"آج کل کہاں ہیں؟"

"آپ کے سامنے بیٹھے ہیں!"

زکی انور

پرانا زخم، نیا نشتر

چوٹ کوئی ایسی شدید نہیں تھی لیکن بوڑھے مارکونی کے نحیف جسم کے لئے بہت بھاری تھی چنانچہ وہ پورے گھنٹے تک بے ہوش پڑا رہا۔

اور دو گھنٹے تک بے ہوش پڑا رہنے کے بعد اس نے اپنی بے نور آنکھیں کھولیں اور اپنے بیڈ پر ادھر اُدھر کچھ ٹٹولنے لگا۔

پاس ہی بیٹھا شاہد نہایت ہی عقیدت مندانہ انداز میں بولا۔

"میں یہیں ہوں حضور.... یہیں آپ کے پاس.... کیا حکم ہے؟"

"تم کون ہو؟" بوڑھے مارکونی نے نہایت ہی نحیف آواز میں پوچھا۔ "میں کہاں ہوں؟"

"میں آپ کا غلام شاہد ہوں حضور" شاہد کا انداز اور بھی عقیدت مندانہ ہو گیا "شاہد" جسے حضور نے ترقی ‌کی دعا دی تھی اور دعوے کے ساتھ کہا تھا کہ بیس امیدواروں میں سے میں ہی ڈائرکٹر چنا جاؤں گا.... پرسوں ہی کی بات ہے آقائے محترم....."

مارکونی ہنس پڑا اور کچھ دیر تک ہنستے رہنے کے بعد اس نے ٹٹول کر شاہد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟"

"ہسپتال میں آقائے مکرم" شاہد کہنے لگا "حضور کو ایک کار سے دھکا لگ گیا تھا اور حضور بے ہوش ہو گئے تھے ‌نہیں کون لوگ حضور کو یہاں لے آئے۔ میں اگر موجود ہوتا تو اپنے غریب خانے پر لے جاتا جہاں حضور کو یقیناً کچھ زیادہ ‌آرام ملتا۔ لیکن مجھے تو دفتر میں اس حادثے کا پتہ چلا۔ وہیں سے میں بھاگا ہوا آ رہا ہوں لیکن اب آپ کو کچھ زیادہ تکلیف ‌برداشت نہیں کرنی ہوگی، حضور کو ہوش آ چکا ہے میں ڈاکٹر سے اجازت لے کر حضور کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا"

"میرے بچے" مارکونی پھر ہنسنے لگا "میں نے تمہیں پہچان لیا، بے شک تم وہی ہو جس نے مجھے ٹھرّے کی ایک بوتل ‌دی تھی اور اپنی ترقی کے بارے میں پوچھا تھا... تم وہی ہو نا؟"

"جی ہاں آقائے محترم" شاہد بولا۔ "وہی غلام شاہد جسے حضور نے کیا سے کیا بنا دیا۔ ورنہ دنیا میں میرا کون تھا حضور۔ ‌میرے پاس کسی ریاستی وزیر کے چپراسی تک کی سفارش نہیں تھی جبکہ میرے علاوہ باقی اُنیس امیدواروں میں کچھ ریاستی ‌وزیروں کے لوگ تھے، کچھ مرکزی وزیروں کی سفارش رکھتے تھے اور کچھ بڑے بڑے نیتاؤں کے آدمی تھے اور دو چار ایسے ‌بھی تھے جو اس عہدے کیلئے چار پانچ ہزار خرچ کرنے کو تیار تھے، لیکن حضور نے......

مارکونی اب کے کچھ زیادہ زور سے ہنسا اور شاید اپنی بات پوری کیے بغیر خاموش ہو گیا۔

"میرے بچے" مارکونی آہستہ آہستہ کہنے لگا "میں ویسے ہی کافی گنہ گار ہوں اور تمھارے ساتھ فریب کر کے میں اپنے سر ایک اور بھاری گناہ نہیں لینا چاہتا.... سچی بات تو یہ میرے بیٹے کہ تو نے مجھے تھرّے کی بوتل دلوادی اور میں نے دل سے خوش ہو کر تجھے دعائیں دیں۔ پھر تو نے اپنی ترقی کے بارے میں پوچھا اور میں نے محض تجھے خوش کرنے کے لئے کہہ دیا کہ بے شک تو ہی وہ خوش نصیب ہے جو ڈائرکٹر کا عہدہ پائے گا..... سوچو میرے بچے اگر تم ڈائرکٹر نہ چُنے جاتے تو کیا تم مجھے تلاش کر کے اپنی تھرّے کی بوتل واپس مانگتے؟ یا تم مجھے قتل کر دیتے؟...."

بڈھا مارکونی پھر ہنسنے لگا اور شاہد کی آنکھوں سے عقیدت ٹپک پڑی۔ اُس نے حد سے زیادہ احترام کے ساتھ، جیسے وہ کوئی مذہبی کتاب اُٹھا رہا ہو، آہستہ سے مارکونی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر چوم لیا۔ اور بڈھے مارکونی نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور ایک لخت جیسے چیخ اُٹھا۔

"پاگل مت بنو۔ اپنے آپ کو گنہ گار مت بناؤ، تم ایک ایسے آدمی سے عقیدت کا اظہار کر رہے ہو جس سے نفرت کرنے کے لئے تمھارے پاس اتنی نفرت بھی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ نادان لڑکے میں زمانے بھر کا بدکار ہوں، میں جواری ہوں، عیاش ہوں، اوباش ہوں، فریبی ہوں، شرابی ہوں.... سمجھے تم، میرے بچے..... دنیا کی کوئی بُرائی ایسی نہیں جو مجھ میں نہ ہو، یہاں تک میں چور، ڈاکو اور خونی بھی ہوں۔ لڑکیاں اور شراب میری زندگی رہی ہیں لیکن اب چونکہ مجھ میں لڑکیوں کو پی جانے کی صلاحیت نہیں، اس لئے صرف شراب پیتا ہوں.... پاگل مت بنو.... تم نے مجھے شراب پلائی تھی اسی لئے...!"

ایک نرس نے پاس آ کر مارکونی کو خاموش رہنے کی ہدایت کی اور وہ خاموش ہو گیا۔

لیکن شاہد نے آہستہ سے کہا۔

"حضور مجھے معلوم ہے، خدا رسیدہ بزرگ یہی سب کچھ کہہ کر اپنے آپ کو دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھتے ہیں لیکن میں نے اچھی طرح پہچان لیا ہے کہ آپ کون ہیں اور کیا ہیں؟"

اب کے مارکونی نہ ہنسا اور نہ چیخا البتہ اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور پھر اُس نے اپنے آنسو پی جانے کی کوشش کرتے ہوئے بہت ہی آہستہ سے کہا۔

"جاؤ ڈاکٹر سے پوچھو کہ کیا میں شراب پی سکتا ہوں۔ اگر وہ اجازت دے تو ایک بوتل لیتے آنا اور اگر منع کرے تو سچ مچ مجھے اس جہنم سے نکال لے جانے کی کوشش کرنا۔ میں شراب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

شاہد جلدی سے اُٹھ کر چلا گیا۔"

لیکن ڈاکٹر نے نہ تو مارکونی کو شراب پینے کی اجازت دی نہ ہی اُسے اُس وقت تک ہسپتال سے چھوڑنے پر رضامند ہوا جب تک اُس کا ایکسرے نہ ہو لے کیونکہ ڈاکٹر کو شک تھا کہ اُس کے پھیپھڑے پر چوٹ پہنچی تھی۔

لیکن واپس آ کر شاہد نے مارکونی کو تسلی دی کہ کچھ ہی دیر میں اُسے شراب بھی مل جائے گی اور شام تک ہسپتال سے واپس جانے کی اجازت بھی۔

اور یہ سب کچھ سن کر مارکونی ایک بار پھر بڑے زور سے ہنس پڑا۔ پھر اُس نے کہا۔

"میں سمجھ گیا۔ تم مجھے تسلی دے رہے ہو۔ مجھے نہ شراب پینے کی اجازت ملی ہے اور نہ ہسپتال سے واپس جانے کی۔

اور شاہد کی آنکھوں میں کچھ اس انداز سے عقیدت چمک اُٹھی کہ اُس نے کچھ عجیب والہانہ انداز میں مارکونی کے پاؤں چوم لئے۔

شاعر بمبئی

مارکونی نے جلدی سے اپنے پاؤں موڑ لئے اور حد سے زیادہ بے بسی سے بولا۔
"میرے بچے! تم مرنے کے بعد میری روح کو بھی چین سے رہنے نہیں دو گے، جو ہمیشہ تڑپتی رہے گی کہ میں نے ایک معصوم بچے کے ساتھ فریب کیا۔"
"حضور آپ غیب دان ہیں۔" شاہد نے مارکونی کی بات اَن سُنی کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے مجھے ڈاکٹر کے پاس تو فضول ہی بھیجا تھا!"
"احمق لڑکے۔" مارکونی پھر ہنس پڑا۔ "کیا تم جانتے نہیں کہ کسی سرکاری ہسپتال میں کسی بھی مریض کو شراب پینے کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے اور پھر یہ کون نہیں جانتا کہ کسی حادثے کے مریض کو کامل صحت یا باقاعدہ لکھا پڑھی کے بغیر ہسپتال سے جانے کی اجازت نہیں مل سکتی!"
"میں نے مانا حضور۔" شاہد مسکرایا۔ "لیکن اُس غیب دانی کے بارے میں حضور کیا تاویل پیش کریں گے جو آقائے محترم نے میری ترقی کے بارے میں کی تھی۔ میرے آقا! آپ کو معلوم ہے کہ ایک بہت بڑے جیوتشی نے، جو ملک کا سب سے بڑا جیوتشی ہے اور جس کا شمار دنیا کے بڑے جیوتشیوں میں ہوتا ہے۔ اُس نے کامل ایک ہفتے میں زائچہ بنا کر میرے بارے میں کیا کہا تھا؟"
"کیا کہا تھا؟" مارکونی مسکرایا۔
"میرے حضور!" شاہد کہنے لگا۔ "اُس کم بخت نے ڈنکے کی چوٹ اور پورے بھروسے کے ساتھ کہا تھا کہ میری جتنی بھی ترقی ہونی تھی، میرے ابا جان کی زندگی میں ہونی تھی۔ اور ابا جان کو مرے ہوئے دو سال سے اوپر ہو گئے، مطلب یہ کہ ڈائرکٹری کی جگہ مجھے نہیں مل سکتی تھی.... لیکن حضور کے دعوے نے دُنیا کے اُس عظیم جیوتشی کو شکست فاش دے دی۔ ..... شکست فاش!"
"مجھے اِن لغویات پر بھروسہ نہیں۔" مارکونی نے کہا۔ "اس لئے میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، ہاں میں تم سے صرف اس قدر درخواست کرتا ہوں کہ مجھ پر کرم کرو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اگر تمھیں میری باتوں پر بھروسہ نہیں کہ میں زمانے بھر کا گنہ گار ہوں تو تحقیق کر لو کہ مارکونی جان نام کا کوئی آدمی ایک خون کے جرم میں چودہ سال کی کاٹ چکا ہے یا نہیں۔ میرے بیٹے جیل میں بھی میں مار دھاڑ سے باز نہیں آیا تھا اور اسی میں میری آنکھیں چلی گئیں۔"
"حضور!" شاہد مسکرایا۔ "خدا رسیدہ بزرگوں نے اس سے بھی بھیانک اذیتیں برداشت کی ہیں۔ یہاں تک حضرت عیسیٰ کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔"
"خدا رسیدہ بزرگ۔" مارکونی نے جیسے بڑے کرب سے دہرایا۔ "میرے بچے کم سے کم یہ جان کر تو تو مجھ سے نفرت کر سکتا ہے کہ میں خدا کے وجود ہی کا سرے سے قائل نہیں۔ میں ہمیشہ یہی سوچتا رہا کہ اگر طرح طرح کی شراب کی بوتلوں سے میری الماری بھری پڑی ہے اور میرے ساتھ ہر روز کوئی نئی لڑکی ہوتی ہے تو بے شک میں ہی خدا ہوں ـــ"
"سبحان اللہ۔" آواز جیسے شاہد کے دل سے نکلی۔ "حضور میں منصور کے بارے میں بھی جانتا ہوں اور اُس کی انا الحق کی صدا کے بارے میں بھی۔ منصور بھی اسی حد تک خدا میں مدغم ہو گیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کہنے لگا تھا۔"
مارکونی ہنس پڑا لیکن وہ کچھ زیادہ دیر تک ہنستا نہ رہ سکا، جلد ہی اُس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی سمایا

شاعر بمبئی

گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس سنجیدگی پر بے پناہ حزن کا رنگ غالب آگیا اور پھر اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑنے کو لرزنے لگے جنہیں شاہد نے اپنے خوبصورت ریشمی رومال میں جذب کرلیا...

"میرے بچے!..." مارکونی نے کچھ کہنا چاہا لیکن ابھی وہ کچھ کہنے کے لئے سنبھل ہی رہا تھا کہ ایک نرس نے شاہد کے پاس آکر بتایا کہ مریضوں سے ملاقات کا وقت ختم ہوچکا ہے۔ اب پھر شام کے پانچ بجے وہ مارکونی سے مل سکے گا۔

شاہد بادلِ ناخواستہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ بڑی خاموشی سے وہ مارکونی کے بیڈ کے پائتانے پہنچا اور بڑے احترام سے جھک کر اُس نے ایک بار پھر اُس کے قدموں کو بوسے دئے اور بھاری بھاری قدم اٹھاتا ہوا وارڈ سے باہر نکل گیا۔

شام کے پانچ بجے شاہد مارکونی کے پاس آیا تو اُس کے ساتھ اُس کی ماں بھی تھی۔

شاہد اپنی ماں سے مارکونی کی کرامتیں بیان کرنے لگا اور وہ بالکل خاموش بیٹھی سب کچھ سُنتی رہی اور بڑے غور سے مارکونی کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

اور پھر شاہد کو یہ دیکھ کر حد سے زیادہ خوشی ہوئی کہ اُس کی ماں بھی مارکونی کے چہرے کے پُر جلال نُور سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

اُس کی ماں کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپکے پڑتے تھے!

اور تب شاہد دنیا کے اُس عظیم جیوتشی کی تضحیک کرنے لگا جس نے اُسے بتایا تھا کہ اُس کی جو بھی ترقی ہوئی تھی۔ اُس کے باپ کی زندگی میں ہوتی تھی۔ اور جس عظیم جیوتش کو اُس کے آقائے محترم نے شکست فاش دی تھی۔

شاہد اُس جیوتشی کے لئے کسی قدر بُرے الفاظ استعمال کرنے لگا۔

اور اُس کی ماں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اور پھر مارکونی کے بیڈ سے کچھ دُور جاکر اُس نے اشارے سے شاہد کو اپنے پاس بُلایا۔ اور جب شاہد اُس کے پاس پہنچا تو اُس کی ماں نے بہت ہی آہستہ آہستہ کہا۔

"بُری بات ہے بیٹے، اُس جیوتشی کو گالیاں نہ دو، وہ بہرحال انسان ہے اور انسان اس سے بھی زیادہ بڑی بڑی غلطیاں کرلیتا ہے---- اور سُنو انہیں گھر مت لانا کون جانے ہم لوگوں سے کوئی غلطی سرزد ہوجائے اور یہ ناراض ہوجائیں..... میں جارہی ہوں، میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی ہے"

شاہد حیران سا کھڑا تھا اور اُس کی ماں مزید کچھ کہے بغیر وارڈ سے باہر نکل چکی تھی۔

احمد جمال پاشا

بی جمالو

بی جمالو شیطان کی خالہ ہیں۔ بھانجے کو تو پورا شیطانی کارخانہ چلانا ہوتا ہے، مگر بی جمالو محض بھس میں چنگی ڈال دُور کھڑی تماشہ دیکھتی ہیں۔

پہلے دنیا بنائی گئی پھر اس پر شیطان کو نازل کیا گیا مگر اِن کے رشتہ ہی سے ظاہر ہے کہ یہ اس سے بھی پہلے سے موجود تھیں۔ کیا عجب کہ آدم و حوّا کو جنت سے نکلوانے میں بھی اِن کا ہاتھ رہا ہو۔ اُس جنتی بھس میں چنگی ڈال بی جمالو دور کھڑی لطف اندوز ہو رہی ہوں اور رضواں تو رضواں، شیطان کا ذہن کبھی اِن کی طرف نہ گیا ہو۔ اور اسی طرح سے اُس دن سے آج تک بی جمالو لوگوں کے صبر اور قیامت کے بورئیے سمیٹتی چلی آ رہی ہوں۔

بی جمالو کی نہ ذات ہے اور نہ پات لہٰذا یہ ذاتِ شریف ذات پات، عقیدہ، مذہب، رنگ اور نسلی امتیاز کے جھگڑوں سے بے نیاز ہو کر ہمیشہ نت نئے گل کھلاتی رہتی ہیں۔

بی جمالو انتہائی ملنسار اور خیر خواہ ہونے کی وجہ سے کسی کو دُکھ درد میں ہرگز نہیں دیکھ سکتیں، اِن کے اسی دلِ درد مند سے متاثر ہو کر شاعر نے کہا ہے۔

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

جس کے نتیجے میں انھیں دنیا زمانے کی ہر بات اور ہر گھر کی خیر خبر کی دن رات ٹوہ رہتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ادھر یہ کس کے دُکھ درد میں شامل ہوئیں اور اُس دُکھیا کی شامت آئی۔

بی جمالو اچھی طرح جانتی ہیں کہ ذرا سی چوک میں لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں اور وہ بے بھاؤ کے پڑتے ہیں کہ چاند گنجی ہو جاتی ہے اور یہ بھی جانتی ہیں کہ لگائی بجھائی کرنا آسان ہے مگر اُس کا نبھانا بہت مشکل ہے۔ ورنہ سِفلی کی طرح اِس کا بھی عمل الٹ سکتا ہے ایسے نازک موقعوں پر کبھی کبھا بھس میں چنگی ڈالنے کے بعد ہوا دینے پر شعلوں کا رُخ بی جمالو کی طرف بھ

جاتا ہے۔ مگر یہ اسکو اپنے دامن سے ہوا دیکر ایسا موڑ لیتی ہیں کہ پھر اُس رخ پر جو کچھ نہ حشر برپا ہو جائے
تھوڑا ہے۔ مگر پھر اِن کی بلا سے۔ اِن کی جانے جوتی۔

بی جمالو کا یہی کمال ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو آپس میں باآسانی لڑا دیتی ہیں جن کے بارے میں سوچا بھی
نہیں جا سکتا کہ کبھی یہ بھی آپس میں لڑ سکیں گے۔ بی جمالو ایسے تمام بھلے آدمیوں کی کمزوریوں اور خامیوں سے
اچھی طرح واقف ہوتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ کس کو اس دنیا میں کا ہے کا ہوکا اور کس بات کا غم ہے۔ شہرت اور
دولت سے کس نے مار کھائی ہے اور عظمت کا مارا ہوا کون ہے۔ کون اپنے حاسدوں سے ڈرتا ہے اور کون اپنے دشمنوں
سے خار کھاتا ہے۔ یہ کام بی جمالو اس ہوشیاری سے انجام دیتی ہیں کہ آخر میں بالکل صاف نکل آتی ہیں خواہ کتنے
ہی خرابے کیوں نہ ہو جائیں مگر اِن پر آنچ نہیں آنے پاتی۔

بی جمالو ہمیشہ ہمدردی کرنے جاتی ہیں اور اِن کی غمگساری کے نتیجہ میں ہمیشہ نیکی برباد ہوتی ہے اور گناہ لازم
آتا ہے۔ بات کا بتنگڑ بننے کی وجہ سے صاحبِ درد گھن چکر ہو کر تگنی کا ناچ ناچنے لگتا ہے۔ اس کے ساتھ بی جمالو
کی معصومیت کے ساتھ دُور کھڑی اس ماہیئی پے آب پر برابر صدقے اور قربان ہوتی رہتی ہیں۔

مگر ناکامی اِس صورت میں خود بقول اُن کے، اِن غریب کو کیا معلوم کہ جو کچھ اُنھوں نے محض اپنا سمجھ کر ہمدردی
اور محبت میں کہا تھا وہ زبانِ خلق سے نکلنے کے بعد نقارۂ خدا ثابت ہوا اور اتنی اچھی بات بھی اچھے دل بُرے
ہو سکتی ہے۔ مگر صاحب! یہ تو دنیا ہے، یہاں جتنے مُنھ اُتنی باتیں، ورنہ سچ پوچھئے تو اب بھی اصل واقعہ سے
اِن غریب کا دُور کا بھی تعلق نہیں۔

بی جمالو بہت سخت نقاد ہیں۔ یہ جوڑنے اور مقابلے کے فن کی ماہر ہیں، تنقید کرتے ہوئے ادھر اُنھوں
نے بڑی فنکاری کے ساتھ چٹکی لی اور صاحبِ چٹکی ہوا بسمل۔ کسی کی حمایت یا موافقت کے لئے ہمارے خیال
میں وہ اس قسم کی چٹکی سے شروعات کرتی ہیں مگر خود اِن کے ذاتی دشمنوں کا خیال ہے کہ اِن کی ہر بات کا آغاز
ہی منافقت سے ہوتا ہے۔ اور انجام تک پہونچتے پہونچتے انسان شیطان سے فرشتہ اور فرشتے سے شیطان
ہو کر مردودِ بارگاہ ہو جاتا ہے۔

بی جمالو اپنی عادت اور دل سے مجبور ہیں۔ لاکھ زبان بند رکھیں مگر آخر مُنھ کھُل ہی جاتا ہے اور کچھ نہ کچھ
اِدھر کی اُدھر ہو ہی جاتی ہے۔ اور اکثر نوبت مُنھ در مُنھ پوچھن پوچھول تک کی آ جاتی ہے جس سے وہ ہمیشہ
بہت گھبراتی اور کتراتی ہیں۔ جان نہ بچنے کی صورت میں اس کہنی ان کہنی کی صفائی یوں کرتی ہیں کہ۔

"کریں تو کیا کریں، آخر زبان پھسل ہی گئی، اب بھلا اس میں میرا کیا قصور، اچھا ہی بھی بُرائی پیدا کر دی، دنگے
فساد سے اتنا گھبراتے کے باوجود لڑائی جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ آخر میرے پاؤں تلے نے کاٹا تھا جو بولا کر خواہ مخواہ
میں اتنی بڑی فوجداری کھڑی کروا دیتی۔ بی بی میں باز آئی اس روز روز کی دانتا کل کل سے کہیں لاٹھی مارے سے پانی
جدا ہوتا ہے۔ میاں بیوی، بیٹا بیٹی، ماں باپ اور بھائی بھائی آپس میں پھر ایک میں نگوڑ ماری کہیں کی نہ رہی سنا بابا
آئندہ سے میری توبہ۔ بھلا صاحب آج سے کان ہوئے۔ اب قسم ہے جو بھی کسی کے بیچ میں پاؤں بھی ڈالوں"۔

غرض ایک تو خالہ اور پھر خالہ بھی شیطان کی، لہٰذا یہ اس فن کی موجد اور خاتم دونوں ہیں۔ اِن کے آگے کسی کا
پیش پاتا ممکن نہیں۔ ورنہ یوں جانور کون نہیں لڑا لیتا مگر آدمی کو انسان سے لڑا دینا خالہ جی کا گھر نہیں۔

یوں تو خواتین کے ہر رشتے، پیشے اور طبقے میں بی جمالو موجود ہیں۔ خانساماں، دھوبن، مالن، ماما۔ آیا۔

(بقیہ صفحہ ۸۳ پر دیکھئے)

یوسف ناظم

اشرف المخلوقات

آدمی کے اشرف المخلوقات ہونے کی صرف یہی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے عقل و فہم سے نوازا ہے بلکہ آدمی میں اس کے علاوہ اور بھی کئی باتیں ہیں جن کی وجہ سے یہ لقب اُسے سجتا ہے۔ آدمی کے اندر جھانک کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک سے ایک خوبی بھری پڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے معلّم الملکوت کو خوامخواہ حکم نہیں دیا تھا کہ اس عظیم مخلوق کو سجدہ کرے، یہ اور بات ہے کہ اُس نے اسے شخصی ہتک پر محمول کیا اور سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ انسان دنیا کی ساری مخلوقوں میں بلند و بالا ہے۔ اور وہ سب میں اپنا سر اونچا رکھ سکتا ہے حالانکہ اس کے سر پر سینگ ہیں نہ کلغی۔

سب سے پہلی بات جو انسان کی بزرگی اور بڑائی کے بارے میں کہی جا سکتی ہے وہ اس کی شرافت ہے۔ انسان طبعاً شریف واقع ہوا ہے۔ ڈیڑھ سال کی عمر میں گالیاں۔ پانچ سال کی عمر میں جھوٹ اور دس سال کی عمر میں چوری سیکھ لیتا ہے۔ طبعاً شریف ہونے میں انسان کے خلوص، اُس کی محبّت اور یگانگت کو بھی بڑا دخل ہے، ہابیل اور قابیل کی برادرانہ محبّت، کوروؤں اور پانڈوؤں کا لافانی عشق، راجہ امبھی کی مہماں نوازی، اورنگ زیب، مُراد اور دارا شکوہ کے خوشگوار تعلقات، یہ اور ایسی ہزاروں باتیں ہیں، جو انسان کی عظمت اور شرافت کو روشن بنائے ہوئے ہیں، دنیا آج بھی نیک بندوں سے خالی نہیں ہے۔ دلیری اور بہادری میں بھی انسان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کسی کی جیب کاٹ لینا۔ مکان لُوٹ لینا، فساد برپا کروا دینا۔ چھری مار دینا۔ اغوا کر لینا۔ مندر سے مورتی اُڑا لینا، مسجد میں گندگی ڈال دینا۔ انسان کے لئے روزمرّہ کے کام ہیں اور انسان اُنھیں ایسے مزے سے انجام دیتا ہے جیسے بچہ ٹافی کھاتا ہو، حالانکہ یوں دیکھئے تو ان میں سے ہر کام کے لئے گردہ بھی چاہیئے اور دِل بھی۔ آپ ہی بتلائیے اللہ میاں کی اور کونسی مخلوق ہے جو یہ کام کر سکتی ہے۔ بہادری میں انسان کا واقعی جواب نہیں۔ خون بہانے میں تو اسے کمال حاصل ہے۔ وہ دو پیسے کی چیز کے لئے دوسرے کا گلا گھونٹ دے اور خود کی پیشانی پر شکن نہ پڑے۔ اس دِل جمعی کے ساتھ وہ یہ کام کرتا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ دِل کی یہ قوت اور ہاتھ کی یہ صفائی اور کسے نصیب ہوئی ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں اگر انسان کے جسم میں پلاسٹک کا بھی دل لگا دیا جائے تو اس کی دلیری حسب حال برقرار رہے گی۔ اس بات پر ہمیں حیدرآباد کا سالار جنگ میوزم یاد آگیا جس میں نورجہاں کی ایک چھُری رکھی ہوئی ہے۔ جس سے وہ پھل کاٹا کرتی تھی۔ آپ ہی کہئیے پھل کاٹنے کی چھُری بھی کوئی میوزم میں رکھنے کی چیز ہے۔ میوزیم میں تو صرف وہ چھُری رکھی جانی چاہیئے جو کبھی کسی کے گلے پر پھیری گئی ہو یا کسی کے سینہ میں اُتار دی گئی ہو لیکن پھر ہم سوچتے ہیں کہ اتنی ساری چھُریاں رکھنے کے لئے جگہ کہاں سے آئے گی۔ میوزم میں صرف پھل کاٹنے کی چھُری رکھی جاتی ہے کیونکہ چھُری سے پھل کاٹنا ہی انوکھا کام ہے، ورنہ چھُری کا اصل کام تو گلے پر چلنا یا پیٹ

میں اُتر جاتا ہے۔

انسان کی ایک اور خوبی جس طرف ہم اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسان ہر بات کا ایک ریکارڈ قائم کر چھوڑتا ہے۔ ۵۴۴ گھنٹے سائیکل چلانا، جوتے پہن کر پیدل دنیا کے سفر پر نکل جانا۔ متواتر کئی راتیں پتے کھیلنا۔ زمین کے اندر زندہ بند ہو جاتا۔ اور پھر باہر نکل آنا۔ کوہ ہمالہ پر چڑھ بیٹھنا۔ ہزاروں مرتبہ جیل جانا۔ ہر شہر میں جا کر ایک شادی رچانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے کام انسانوں کے محبوب مشغلے ہیں۔ ایک آدھ آدمی کسی ایک کام لئے تیار ہو جاتا ہے اور ہزاروں آدمی اُس نیک کام میں دلچسپی لیتے ہیں۔ چندہ جمع کرتے ہیں۔ اُس کا جلوس نکالتے ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر لگا کر چیختے اور چلاتے ہیں۔ ہمیں شخصی طور پر ان تمام مشغلوں میں سے زیادہ دیر تک سائیکل چلانے والا تماشہ بہت پسند ہے ہم اسے کولھو کے بیل کا ارتقا سمجھتے ہیں۔ لیکن اوقات البتہ نادانی سے ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر سیکل سوار، ایک دائرہ میں گھومنے کے بجائے، ناک کی سیدھ میں کہیں نکل جائے اور اتنی دیر سائیکل پر بیٹھا رہے تو کتنا سکون ہو، لیکن اس کی متلاشی یہ دنیا بجلی کسی طرح بیٹھے۔ وہ جو آگ انسان کے خمیر میں ہے اسے پہاڑ پر بھی چڑھاتی ہے اور سائیکل پر بھی بٹھاتی ہے۔

انسان میں انسانی خصوصیات تو خیر ہوتی ہی ہیں لیکن اُن کے علاوہ اسے حیوانی خصوصیات پر بھی قدرت حاصل ہے۔ وہ منٹوں میں کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اچھے خاصے آدمی کے لئے طوطا چشم بن جانا معمولی بات ہے۔ اپنی طوطا چشمی کو زیادہ دل آویز بنانے کے لئے آدمی رنگین شیشوں کی عینک استعمال کرنے لگا ہے اور اب بالکل پتہ نہیں چلتا کہ آدمی کدھر دیکھ رہا ہے۔ مارِ آستین بن جانا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ اسی ڈر سے عورتوں نے آستین والا لباس پہنا چھوڑ دیا تاکہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

لبعض انسان تو حیوانی خصوصیات کو اپنا لینے کے اتنے ماہر ہوتے ہیں کہ انہی ناموں سے یاد کئے جانے لگتے ہیں مثلاً گرگِ جہاں دیدہ، ضیغمِ ملت، بلبلِ بنگال، شیرِ اسلام وغیرہ وغیرہ۔

لیکن انسان کے بارے میں آپ کو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ انسان بڑا اُرمان پرور اور عاشق مزاج ہوتا ہے۔ اگر کسی پر اس کا دل آجاتا ہے۔ تو پھر وہ اور کسی چیز کی پروا نہیں کرتا عشق کی خاطر وہ پہاڑوں میں نقب لگانے سے نہیں چوکتا۔ بَنوں کے چکّر کاٹنے سے نہیں گھبراتا۔ اور اس قدر محبّت کرتا ہے کہ جسم میں صرف پسلیاں ہی پسلیاں رہ جاتی ہیں۔ ایسے انسان جو زیادہ باشعور ہوتے ہیں مثنویاں اور غزلیں کہہ کر اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب کے لئے نمونۂ عبرت بن جاتے ہیں۔ مثنوی اور غزل کہنے سے جذبۂ عشق کو بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔ اور انسان آسانی سے اشرف المخلوقات بن سکتا ہے۔ اگر آپ کو کبھی فرصت ہوئی تو ہم بتائیں گے کہ آدمی کس طرح انسان بنتا ہے۔ کیسے اشرف المخلوقات بنتا ہے۔ اور پھر کیونکر فوق البشر کے درجہ پر پہنچتا ہے ــــ یہ اور بات ہے کہ آج دنیا کا ہر آدمی فوق البشر ہے۔ کیونکہ اب دنیا کا کوئی کام ایسا نہیں رہا جو اس نے انجام نہ دیا ہو۔

غلام احمد فرقت کاکوروی

فرمانے سے پہلے

میں ایک دن آوارہ صاحب کی خدمت میں آفس پہنچا تو وہ حسبِ دستورِ قدیم کسی مضمون کا مسوّدہ لکھنے، دنیا و مافیہا کی طرف سے پشت کئے اس طرح مصروف تھے کہ جیسے اپنے پچھلے گناہوں کے عفو کے لئے خضوع اور خشوع سے مصروفِ ریاضت ہیں۔ میں نے کہا "سلام علیکم" جواب ندارد میں نے دوبارہ باآوازِ بلند کہا "حضور! سلام علیکم" اس پر کچھ ایسا منھ بنایا جو میں نے عام انسان کو بناتے کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہے ہیں کہ آپ خود سلام علیکم۔ اس کے بعد جو نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو ذرا سنبھل کر بولے "اچھا آپ تشریف رکھئے میں آپ ہی کا کام کر رہا ہوں۔ میں نے کہا میرا کام؟ بولے جی ہاں" میرا فرمایا ہوا" صاف کر رہا ہوں مگر اس سلسلے میں میری ایک جدید آرڈیننس کی عبارت بھی سنتے جائیے کہ اس کتاب پر بھی مقدمہ آپ ہی کو لکھنا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کس جرم میں؟ بولے جرم ورم تو میں جانتا نہیں صرف اتنا جانتا ہوں کہ آپ جبریہ یہ چیز مجھ سے لکھوا رہے ہیں اور اسے کتابی شکل میں چھپوانے پر مُصر ہیں، لہٰذا میرا بھی جوابی حملہ برداشت کیجئے۔ جبر و قہر میں کوئی پلاؤ زردہ تھوڑا ہی بٹتا ہے۔ میں نے اقبالِ جرم کرتے ہوئے کہا "اچھا! تو اس مقدّمے کے سلسلے میں مجھے چند سوالات کر کے کچھ ضروری نقشہ بھی تو کرنا ہے" بولے گلے گلے پانی تک لیجئے" میں نے کہا اچھا! اب ذرا آپ اپنی میز کی اوپر والی دراز تو کھینچئے گا" دراز کی طرف لیجانے کے اِزار بند کی طرف ہاتھ لیجاتے ہوئے بولے "اگر اجازت ہو تو فارغ التحصیل ہو لوں" معلوم دراز کھولنے والے فقرے سے کس قسم کی ہیبت اُن پر طاری ہوئی کہ انھوں نے اِس کام کو مقدّم سمجھا۔ واپسی پر جب انھوں دراز کھولی) تو اُس میں سے کچھ ایسی عجیب الخلقت چیزیں برآمد ہوئیں جو میز تو کیا اچھے کھلے گھوڑوں پر بھی میسّر آئی ہیں۔ اِن میں پہلی تو کتھے چونے کی چنوتی سنا ایک چیز تھی جس میں چپراس ہائیی اور پگڑی کی وضع کی لمبی لمبی چپکیں تھیں نہ جانے کب سے اُس کے خانوں میں حبسِ دوام کی سزا بُھگت رہی تھیں۔ بہرحال وہ اِس صدی کی چیزیں معلوم نہ ہوتی تھیں کیونکہ ان کی بُناوٹ سَتو اسوا سو برس کے اندر جو کپڑے تیار ہوئے ہیں اُن سے مختلف تھی) اُس کے علاوہ ایک دوسری ڈبیا تھی جو اپنی جوانی میں خواہ پان کی ڈبیا کہلاتی ہو مگر اب زنگ اُسے اس درجہ کھا گیا تھا کہ اُس نے سُنکر پناہ مانگنی شروع کر دی تھی اور کئی مقامات چھوڑ کر اس طرح نکل بھاگا تھا کہ جگہ جگہ بڑے بڑے بھم بھاکے ہو گئے تھے جس کے سبب چند تار کے مڑے اور خمیدہ ٹکڑے، زنگ خوردہ آلپینیں اور کمر ٹوٹی باہر کی طرف پھاندی پڑ رہی ہیں (میں نے اُسے کھول کر دیکھا تو اُس میں سو سال قبل کی پروردہ بدبو اس طرح لق لقاتی نکلی کہ اگر میں ذرا منھ نہ ہٹا لوں تو کم از کم ناک تو سڑ کر ضرور گر جائے۔ میں نے اُسے کھول کر جب! شاعو عبیّ

جراثیم پر دو اخبارات نکال دیئے تو اندر کمر یا کٹی ہوئی کئی مرحوم نبوں کی بسریاں ملیں) اس ڈبیا میں بعض ایسی بے جوڑ اور متضاد چیزیں بھی تھیں جن کا سلسلۂ النسب ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھا مثلاً کچھ جوتے میں لگانے والی کیلیں۔ کچھ نبوں کے نچلے حصّے، کچھ سڑا ہوا مرہم، ایک آدھ ٹوٹی ہوئی سوئی اور کچھ ٹیپ کے کنارے جن کی ڈوری سڑ چکی تھی۔ میں نے پوچھا حضت! سب تو سب یہ کس مصرف میں آتی ہیں۔ بولے "داشتہ آید بکار" اگر پرانی عمارتوں کے ملبے کی حفاظت کے لئے محکمۂ آثار قدیمہ قائم ہو سکتا ہے تو کیا میری آباؤ اجداد کی استعمال شدہ چیزیں اس حق سے بھی گئی گذری ہوئیں کہ اُن کو دنیا میں محفوظ نہ رہنے دیا جائے۔ مگر ان میں سے بعض چیزوں پر نہ جانے کون سا مصالحہ استعمال کیا گیا تھا کہ اُسے دیکھ کر مصر کی ممّی کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ دوسری دراز بالکل خالی تھی اور اس میں صرف مختلف النسل اور مختلف البطن چوہوں کی مینگنیاں محفوظ تھیں ممکن ہے کہ دراز کے اندر کوئی چوہے پکڑنے کے لئے لگا ہو مگر وہ چیز اُنہوں نے دکھائی نہیں، بلکہ صرف یہ کہا کہ صاحب! چوہوں نے بڑا عاجز کر رکھا ہے، دو خطوں کے کنارے بالکل کاٹ کر ڈال دیے ہیں۔ ان خستہ حال مینگنیوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ تیسرے پنج سالہ منصوبے کے زرعی پروگرام میں آوارہ صاحب کو بھی کھاد کی فراہمی کے پیش نظر شریک کر لیا گیا ہے اور اسی سلسلے میں وہ اس قسم کی کھاد محفوظ کر رہے ہیں۔ ان مینگنیوں میں ہر سائز کی مینگنیاں مختلف وٹامن کی گولیوں کی طرح نہایت نظم و ضبط کے ساتھ حسب مراتب رکھی ہوئی تھیں مقصد یہ کہ بڑی کے بعد اُس سے چھوٹی، اس کے بعد اُس سے چھوٹی۔ آخر میں نہایت بچکانہ اور شیر خوار بچوں سے حاصل کی ہوئی مینگنیاں۔ اس ڈراز میں ایک دفتی کی ڈبیا بھی تھی جب اُسے کھول کر اُنھوں نے اُس کی روئی ہٹائی اُس میں سے ایک مچھلی نما کیڑا جسے غالباً مچھلی ہی کہتے ہیں، ایک طرف نکل کر جانے لگا۔ آوارہ صاحب اُسے پکڑ کر یہ کہتے ہوئے ڈبیا میں رکھ دیا کہ اِسے اس کی نسل محفوظ کرنے کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ اور عرصے سے اس کے نر کی تلاش ہے۔ اس کے بعد اُنھوں نے ڈبیا کا ازار بند کس دیا کیونکہ ڈبیا کا ڈھکنا ازجملہ کس بل کھو چکا تھا۔ لہٰذا اُسے ایک تاگے سے جس میں گئی گرہیں پڑی تھیں، باندھ دیا گیا تھا۔ اسی بغل میں، ڈاک سے آئے ہوئے کارڈوں اور لفافوں کے بنڈل ٹیوب کے کٹے ہوئے گیش میں جکڑے ہوئے تھے۔ زان میں سے بعض کے پنڈوں سے کافور کی بُو آنے لگی تھی۔ ان میں سے کچھ انگریزوں کے ہندوستان آنے سے قبل کے تھے اور کچھ بعد کے۔ "آوارہ" صاحب کو ان چوہوں نے سب سے زیادہ اذیت یہ پہنچائی تھی کہ وہ اُن کے دو تین کارڈوں کے کنارے کاٹ گئے تھے، لہٰذا وہ چوہوں کی پوری قوم کے دشمن ہو گئے تھے اور اس سلسلے میں اُنھوں نے بتایا کہ ایک چوہا اُن کے ہاتھوں اسی ڈراز میں جام شہادت بھی نوش کر چکا ہے چنانچہ جب اُس کے ستارے نحوست میں آئے اور وہ اس ڈراز میں بے وقت داخل ہوا تو اتفاق سے وقت اُس ڈراز کے انسپکشن کا تھا۔ اُسے دیکھ کر آوارہ صاحب کا خون ہی تو کھول گیا اور اُنھوں نے داؤ پیچ کے بعد، دھوبی پاٹے کا داؤں دیکر آخر چوہے کو ڈبار میں دے مارا۔ اور اُس کی دُم اپنی پوری گرفت میں لے کر اور پھر یا علیؑ کہہ کر جو اُسے دم سمیت گھما کر پُرانے قلعے کی طرف پھینکتے ہیں، تو خود آوارہ صاحب کا ہی بیان ہے کہ چوہا مع دُم کے پُرانے قلعے کی چھت پر "دُم توڑ رہا تھا" اور اُس کی دُم پر جو خول چڑھا تھا وہ صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ بہرحال آوارہ صاحب کے پاس جہاں شکار کے مارے جانوروں میں آئے لومڑیوں، لکڑ بھگّوں، سیاروں، شیروں، تیتروں اور مرغوں کی کھالیں محفوظ ہیں اُن کھالوں

اس کھال کا اضافہ جتنے عرصہ تک بھی دُنیا کے مردہ عجائب گھروں کو شرمائے کم ہے، میں سمجھتا ہوں کے دنیا کے بڑے سے بڑے شکاری کے پاس شاید ہی اس قسم اور اس مقام کی کھنچی ہوئی کھال ملے تو ملے۔ اس ڈرار کے خانے پر ایک ازار بند کا ٹکڑا ابھی لٹکا ہوا تھا، جو خدا جانے اندر کس چیز سے بندھا ہوا تھا کہ آوارہ صاحب ڈرار کا جتنا حصّہ باہر کھینچنا چاہتے تھے اُس کی معرفت کھنچ آتا تھا، میں نے اس کا مصرف پوچھا۔ تو بولے شروع ملازمت میں ایک دن جوانی کے زعم میں جو اکڑ کر بیٹھا، تو ازار بند ٹوٹ گیا، میں نے سوچا کہ اسے بیکار کیوں پھینکوں اُسے اس ڈرار کی کھینچا تانی کے کام میں لے آیا، چنانچہ آج بائیس۲۲ سال سے ماشاء اللہ اپنے پورے کس بل کے ساتھ بندھا ہے، میں نے کہا حضور! اسی کے لئے تو کہا گیا ہے کہ "بندھا مار رکھا تا ہے" مگر اُس کے پنڈے پر ہاتھ رکھکر ایسا معلوم ہوا کہ یہ سُتلی کی قسم کی کوئی چیز ہے، بولے اس کو سُتلی نہ سمجھ لیجئے گا یہ کسی زمانے میں ریشمی تھا، ممکن ہے کہ اس نے لٹکے لٹکے اب سُتلی کی شکل اختیار کرلی ہو، ورنہ اس کا ریشہ اور گودا، ریشم کے کیڑوں کی نسل سے مِلا ہوا ہے" اس کے بعد بولے کہ حضرت اس مقدمّہ کے سلسلے میں کسی مضمون کی ضرورت ہو، تو گھر تشریف لائیے میں نے عرض کیا کہ اس میز کو دیکھنے کے بعد اب جب آپ کے گھر جانے کا تصوّر کرتا ہوں تو بخدا بیوی بچے سامنے کھڑے رو رو کر یہ کہتے دکھائی دینے لگتے ہیں کہ للّٰلہ ان کے گھر نہ جائیے گا ورنہ وہاں سے واپسی نا ممکن ہے۔

بہرحال اس تمام تمہید کے بعد اور ان تمام خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کے بہت پڑھے لکھے لوگ کس طرح دنیا کی آرائش اور زیبائش سے دُور رہ کر اپنے آپ کو علم و ادب میں اس طرح بھُول جاتے ہیں کہ ان کو تصنّع اور بناوٹ سے کوئی لگاؤ نہیں رہتا، فرانس کے مشہور فلسفی "رُوسو" کی زندگی بھی کچھ اسی انداز کی تھی اور یہ حقیقت ہے کہ علم و ادب کے رسیا اُسی وقت جچتے ہیں۔ جب وہ دنیا کو بھُلا کر اور خود اپنی ذات کو بھول کر اپنی جملہ ذہانتوں کو علم و ادب کے لئے وقف کر دیتے ہیں، اُن کے پیشِ نظر سُقراط کا وہ فقرا ہوتا ہے کہ پہلے اپنے آپ کو پہچان اور اسی کی خاطر بعضوں کو جامِ شہادت پینا پڑتا ہے۔ اور بعض انا الحق کہکر پھانسی پر لٹک جاتے ہیں، آوارہ صاحب کی ذات اُن منفرد ہستیوں میں ہیں۔ ہے جو دنیا کے ہر نشیب و فراز سے گذرے ہیں، اُنھوں نے ہر نشیب فراز کا عمیق مطالعہ کیا ہے اور قوّتِ مشاہدہ تو اس غضب کی پائی ہے کہ جس چیز کو دیکھتے ہیں اور جس چیز کو بیان کرتے ہیں اُسے پڑھکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی وہی زندگی رہی ہے۔ کیا لکھنؤ کے بٹیر باز، کبوتر باز اور افیمی، مدکئے اور چرسئے اور کیا دلّی کے کارخندار اور نچلے طبقے کے لوگ۔ غرض کائیناتِ عالم کے ذرّے ذرّے کا مشاہدہ وہ اس طرح کرتے ہیں کہ کوئی چیز اُن کی نگاہوں کی زد سے بچ نہیں پاتی ہے۔

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں مجھ سے وہ چھُپ کے جائیں گے ایسے کہاں کے ہیں

اب جن خصوصیّات اور مشاہدات کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اُس کا اندازہ آپ اُن کے مجموعے میں سے ذیل کے اقتباسات سے کیجئے اور فیصلہ کیجئے کہ میں کس حد تک اُن کے بارے میں یہ ساری باتیں کہنے میں حق بجانب ہوں۔

"افیونی" ایک آقا، ایک غلام راستے میں چلے جا رہے ہیں کہ اچانک افیون کی جھونک میں آقا کی جو شہ رگ پھڑکی تو ایک مکان کی تعمیر کا خیال پیدا ہوا۔ دونوں سڑک پر بیٹھ گئے پہلے آقا نے اپنے مفروضہ مکان کا نقشہ بنایا اس کے بعد غلام کو اپنے مکان کی تعمیر کی فکر ہوئی اور اُس نے بھی آقا کے مکان کے متصل اپنے مفروضہ مکان کا نقشہ بنانا شروع کر دیا غلام کے پرنالے سے پانی گرنے پر دونوں میں جو بحث ہوتی ہے اُس کا مکالمہ آوارہ صاحب ہی کی زبان سے سُنئے۔

چھنن - ارے ہاں ٹھیک کہا جی - بس تو پھر آجاؤ - میرے نقشے پر - گرمی - برسات لڑکا بہو کو ٹھے پر سویا کریں گے - برساتی ڈلوا دونگا -

حکیم جی - وہاں کس رُخ ؟ برسات کا پانی کدھر بہے گا ؟

چھنن - ادھر اُتر کو - اور کدھر ؟

حکیم جی - یعنی میری چھت پر ؟

چھنن - ہمارے پرنالے گریں گے -

حکیم جی - یہ تو نہ ہوگا -

چھنن - اور کہیں گر نہیں سکتے -

حکیم جی - گریں نہ گریں ہماری بلا سے - میری چھت پر نہیں گر سکتے - قانون کھلا ہوا ہے -

چھنن - یہ قانون پھانون اپنے گھر میں بگھارئیے - چھنن کے پرنالے ہیں - اب تو بن چکے اور اُتر ہی کو گریں گے -

حکیم جی - میں نالش ٹھونک دونگا - تعمیر رکوا دوں گا - عدالت کو موقع دکھا دوں گا -

چھنن - ٹھیک ہے - مگر یہ سب بعد کی باتیں ہیں، پہلے یہ گھر بنے گا - اس میں برساتی بنے گی - برساتی کے پرنالے اُتر والی تمھاری چھت پر ہی گریں گے کر لیجئے کیا کرتے ہیں ؟

حکیم جی - میں تمھیں قید کرا دوں گا - یہ زمین ہی نہیں خریدنے دوں گا - اس کے خریدنے کا حق مجھ کو ہے -

چھنن - کر کے دیکھ لو نا - ہار جاؤں گا - اپیل کروں گا - وہاں بھی ہار جاؤں گا - بورڈ تک جاؤں گا - پرنالے تو حکیم جی، وہیں گریں گے جہاں چھنن کے منھ سے نکلا ہے "

حکیم جی " چھنن کے منھ سے نکلا تو جھک مارا چھنن نے -

چھنن - حکیم جی دیکھنا جامے سے باہر نہ ہونا - کہدیا ہے میں نے -

حکیم جی - نہیں تو ..... "

چھنن - بنا بنایا گھر بگاڑ دوں گا -

حکیم جی - تم بگاڑ دوگے وہ کیسے ؟

چھنن - ایسے - پاؤں سے زمین رگڑ کر - یہ لو اپنا گھر - اور دوسرا نشان رگڑ کے - یہ مٹا تو میرا گھر کہاں -

حکیم جی - او جاہل آدمی یہ کیا کیا -

چھنن - حکیم جی نہ جانے ہم تم کہاں تھے اُس وقت یہ زمین تو میونسپلٹی کی ہے "

آوارہ صاحب کی مزاح نگاری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ نہ تو اپنی تحریر میں مضحک الفاظ لاتے ہیں۔ اور نہ نئے نئے الفاظ مزاح پیدا کرنے کے لئے گڑھتے ہیں، بلکہ سیدھے سادے روز مرّہ کے واقعات کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا خود بخود گدگدی محسوس کرنے لگتا ہے - وہ مزاح نگاری میں گدگدانے کے قائل ہیں اب پڑھنے والے کے منھ سے خود بخود قہقہا بلند ہو جائے یہ دوسری بات ہے -

میں نہیں کہہ سکتا کہ اُنھوں نے نفسیات کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے یا نہیں مگر اُن کی تحریروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسانی نفسیات پر پورا عبور رکھتے ہیں اور جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو ہر کردار کی کیفیات اور جذبات اپنے اوپر اس طرح مسلّط کر لیتے ہیں کہ اُن کے قلم سے نکلے ہوئے کسی لفظ پر آورد کا شُبہ نہیں ہوتا - اُنھوں نے سماج کے

ہر گروہ اور ہر طبقے کا اتنے قریب سے مطالعہ کیا ہے کہ جس طبقے یا گروہ کا کردار ہوتا ہے اُسی کی اصطلاحات ا
زبان استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور یہیں سے وہ صحیح معنوں میں اپنے آوارہ ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں
چونکہ عربی اور فارسی اُنھوں نے مکاتب میں پڑھی ہے اس لئے ان دونوں زبانوں پر اُن کو پوری قدرت
اردو کے کلاسکی ادب پر بھی اُن کی گہری نگاہ ہے اور حافظہ اس بلا کا ہے کہ آپ کسی لفظ یا محاورہ کا استعمال اُن
پوچھ لیجئے۔ پھر دیکھئے کس طرح وہ اساتذہ کے کلام سے حوالے دینا شروع کر دیتے ہیں۔ اُن کی زبان اور ا
قلم سے نکلا ہوا ہر ہر فقرہ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا ایک نمونہ ہوتا ہے اور جملہ اصطلاحات اور محاورے اُن کے س
صف بستہ کھڑے نظر آتے ہیں۔

اُن کی جائے پیدائش سیتاپور ہے (اودھ) اور ننھیال مارہرہ (ایٹہ) میں لیکن اُن کی تحریروں سے اندازہ
ہے کہ وہ خالص لکھنوی ہیں۔ بلگرام کی سرزمین ہمیشہ سے ہندوستان میں مردم خیز رہی ہے اور چونکہ اس سرزمین
سے علم و ادب کے چاند اور ستارے پیدا ہو کر دنیائے ادب میں جگمگاتے رہے ہیں اس لئے آوارہ صاحب
اگر اس سرزمین میں نہ پیدا ہوتے تو اور کونسی سرزمین اُن کے پیدا ہونے کی مستحق ہو سکتی تھی۔ سید حسن بلگرا
صغیر بلگرامی اور قدر بلگرامی جیسی ہستیاں اسی سرزمین سے اُٹھ کر علم و ادب کی دنیا میں ایک تہلکہ مچا چکی ہیں
چونکہ یہ بلند پایہ ہستیاں آوارہ صاحب ہی کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اس لئے آوارہ صاحب کے دماغ
علم و ادب کے جتنے خزانے بھی دفن ہوں کم ہیں۔ میری دانست میں آوارہ صاحب کی ذات سرشار اور ہو
دور کی مزاح نگاری کے درمیان ایک کڑی ہے اور اُن کا رنگ چونکہ سرشار کے رنگ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے
اس لئے اُن کو اگر دورِ حاضر کا سرشار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا افسوس یہ ہے کہ اب ایسا صحبت یافتہ تجربہ
شوخ طبع، بذلہ سنج اور الفاظ اور زبان پر قدرت رکھنے والا کوئی نظر نہیں آتا جو آوارہ صاحب کے رنگ میں
لکھ کر اُن کے رنگ کو آگے بڑھائے۔ اور اس اعتبار سے اگر آوارہ صاحب یہ کہیں تو بیجا نہ ہوگا کہ

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ   سُن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ

بقیہ "بی جمالو" صفحہ ۷۶

اُستانی، مہترانی، دیورانی، جٹھانی، ساس بہو اور نند بھاوج کے روپ میں یہ آپ کو ہر جگہ مل جائیں گی۔ اِن
نجات ممکن نہیں۔ شیطان تو لاحول پڑھنے سے بھاگ جاتا ہے مگر یہ اور قریب آجاتی ہیں۔

یوں بھی بی جمالو کے بارے میں آپ کو واقفیت مجھ سے کم ہرگز نہ ہوگی۔ گھر میں دیکھئے، کیا نظر نہیں آتیں
معاف کیجئے گا کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ اپنے گھر کی بی جمالو آپ خود ہوں۔؟ اس کے بعد گھر کے باہر تشریف لے
جہاں آپ کے لئے نئے زمانے کے جامہ میں مرد عورت کی تفریق ممکن نہیں، جن پر آپ کو دور سے مردوں کا دھوکا
وہ قریب سے آپ کو ٹیڈی گرل نظر آئیں گی اور قریب آنے پر بہو بیٹیاں ٹیڈی بوائے نکلیں گی۔ ان خوا
حضرات کے بھیس میں آپ کو قدم قدم پر بی جمالو جلوہ گر نظر آئیں گی۔

بی جمالو کا کام دوستوں اور اپنوں کو لڑانا اور پھر اُس سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہونا ہے۔ اِ
اگر بی جمالو نہ ہوتیں تو پھر ہمارے دعوے کے مطابق آج دو ملاؤں میں مرغی حرام نہ ہوتی۔ ایک میان میں دو
رہا کرتیں۔ ایک ملک پر دو بادشاہوں کا راج ہوا کرتا۔ لوہے سے لوہا کٹا کرتا۔ شمشیروں شمشیروں بدلا
ایک سے دو بھلا سمجھا جاتا۔ ایک انار سو بیماروں کے لئے کافی ہوا کرتا اور سب سے بڑی بات یہ ہوتی کہ
دوستوں کے ایک جان دو قالب ہونے کی وجہ سے یاری زندگی کے ساتھ صحبت کے باقی رہنے کا لطف بھی سلامت
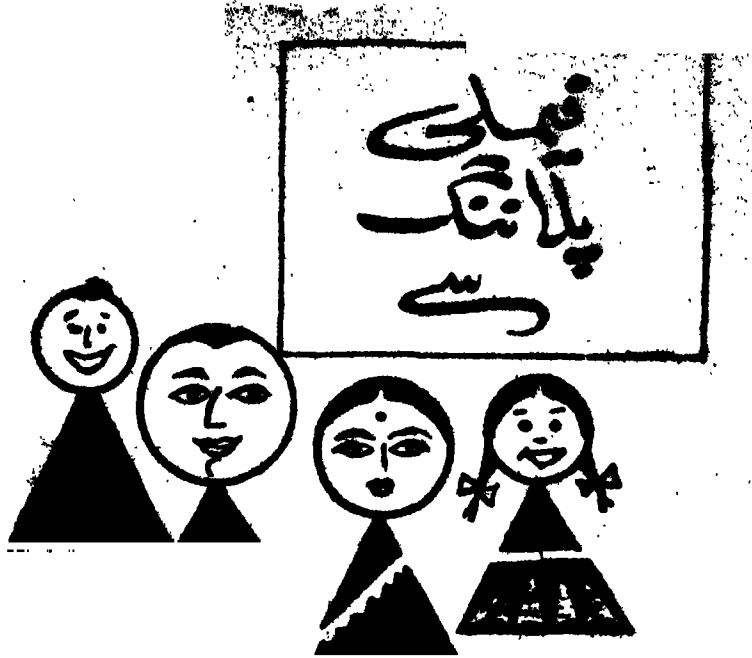
ہر ایک کے لئے بھرپور مواقع، زیادہ سہولتیں

اگر آپ چاہتے ہیں کہ

۱۔ آپ کے بچے تندرست و توانا ہوں
۲۔ انہیں مناسب خوراک و تعلیم حاصل ہو
۳۔ انہیں وہ سب سہولتیں میسر ہوں جو ہر بچے کا پیدائشی حق ہیں اور
۴۔ آپ کی ازدواجی زندگی خوش و خرم اور خوشگوار ہو

تو پھر قریبی فیملی پلاننگ سنٹر سے اپنے کنبے کو محدود بنانے کے سلسلے میں مشورہ حاصل کیجئے۔

غزلیں

ماہر القادری

اب تبسم کا ہے یہ رنگ دھواں ہو جیسے
آج نغمہ کا یہ عالم ہے فغاں ہو جیسے

قافلہ مہر و وفا کا یہ کہاں آپہونچا
زندگی راہ میں خود سنگِ گراں ہو جیسے

آدمی موت کے دھارے پہ جب آجاتا ہے
بلبلہ ٹوٹ کے بے نام و نشاں ہو جیسے

واعظِ شہر کی سج دھج پہ ہنسی آتی ہے
یہ بھی من جملۂ صاحب نظراں ہو جیسے

کچھ نہ کہنے پہ بھی سب کچھ ہے زمانہ پہ عیاں
خامشی حسن و محبت کی زباں ہو جیسے

آپ بیتی کو بھی اس طرح بیاں کرتا ہوں
میرا افسانہ حدیثِ دگراں ہو جیسے

دردِ دل سخت ہے جانکاہ مگر کیا کہئے
زندگانی کی یہی رُوحِ رواں ہو جیسے

دل غمِ ہجر سے مانوس ہے اتنا ماہرؔ
خواہشِ وصلِ محبت کا زیاں ہو جیسے

شاعر ممبئی

احسان دانش

غلط کہ غم مرے دل پر گراں گزرتے ہیں
کہ اس زمین پہ سات آسماں گزرتے ہیں

جو رہ گزر ہے وہ خالی کبھی نہیں رہتی
کبھی غبار، کبھی کارواں گزرتے ہیں

خبر نہیں کہ مری کشتِ دل سے کیوں آخر
نگاہ پھیر کے ابرِ رواں گزرتے ہیں

شروعِ عشق میں کچھ دن بہ فیضِ خوش فہمی
بڑے لطیف بڑے شادماں گزرتے ہیں

جہاں نظر کی رسائی نہ فکر کی پرواز
مری نگاہ سے وہ آستاں گزرتے ہیں

چمن میں ایسے نواگر بھی کم نہیں جن کو
قفس سے آکے نشیمن گراں گزرتے ہیں

خود آکے دیکھ مری بے قصور رسوائی
مُشاہدے سے یہ منظر کہاں گزرتے ہیں

جہاں کی ہر رہِ مشکل سے تیرے دیوانے
دلوں پہ زخم لئے نغمہ خواں گزرتے ہیں

تمہارے فکر سے خالی، تمہارے شہر سے دُور
جو دن گذرتے ہیں سب رائیگاں گزرتے ہیں

بساطِ گُل ہے میسّر جنھیں وہ کیا جانیں
جو حادثات سرِ گلستاں گزرتے ہیں

نظر ٹھہرتی نہیں جن کی تابناکی پر
اُن عارضوں پہ بھی اشکِ رواں گزرتے ہیں

کسے شعور کہ خاموش رہ روانِ طلب
نفس نفس میں لئے داستاں گزرتے ہیں

ہم اب وہاں ہیں کہ اُنکے خلوص پر بھی ہمیں
ہزار طرح کے وہم و گماں گزرتے ہیں۔

جو گلستاں میں نہیں ہیں اُنھیں یہ کیا معلوم
کس امتحاں سے یہاں آشیاں گزرتے ہیں

خدا بچائے غمِ روزگار سے دانش
کہ نازِ حسن بھی دل پر گراں گزرتے ہیں

منظر صدیقی

جو دِل جَلے ہیں اُنھیں کرکے کیفِ بار چلے — ہمارے ساتھ ذرا اَبرِ نوبہار چلے

بڑھا کے عشق کی دُنیا کا اعتبار چلے — ہمیں تھے جو تری محفل سے باوقار چلے

نہ کامیاب چلے اور نہ کامگار چلے — چلے وطن سے تو ہم صورتِ غُبار چلے

دیارِ عشق میں ناکام ہم رہے لیکن — یہی بہت ہے کہ عقبیٰ تری سنوار چلے

ہمارا خُون بھی ہے شہ رگِ گلُستاں میں — لُٹا کر اپنی جوانی کو جاں نثار چلے

سلام تجھ پہ ہزاروں زمینِ کوئے وطن — ہزار زخم لئے، دل پہ اشکبار چلے

بھلا سکے گی نہ تاریخِ عصراں کو کبھی — جو اپنی عُمر محبت یہیں گذار چلے

مُدام پیتے رہے زہرِ تلخیِ ایّام — دیارِ دوست سے ہنس ہنس کے ہوشیار چلے

تلاش ہے مری نظروں کو اُس خرابے کی — جہاں نہ کشمکشِ جبر و اختیار چلے

کچھ ایسے لوگ بھی محفل میں تیری پائے گئے — جو بیقرار ہی آئے تھے، بیقرار چلے

مجھے یقیں نہ دِلا اپنی دلنوازی کا — یہ وہ فریب نہیں ہے جو بار بار چلے

یہ ہے محال، ہمیں کر سکے نظر انداز — نئی رَوش پہ زمانہ ہزار بار چلے

عروجِ فکر بجا، ہم نے یہ بھی دیکھا ہے — نہ تھے جو اہل نظر وہ بھی کامگار چلے

ہمارا نقشِ قدم رہ گیا زمانے میں — رَہِ حیات کو کچھ اس طرح سنوار چلے

تمام عمر تلاشِ حبیب میں گذری — نہ کوئے یار ہی دیکھا نہ سوئے دار چلے

نہ لب پہ لائے کبھی شکوۂ کشاکشِ غم — چمن میں جب بھی چلے صورتِ بہار چلے

گذر گئی بہر عنوان زندگی منظر
یہ کیا بتائیں رہے خوش کہ سوگوار چلے

سراج الدین ظفر

صحرا کا ارادہ جو تری چاہ میں کرتا — رم آہوئے صحرائی مری راہ میں کرتا

ساغر کو دیا میں نے پئے جبرِ ازل پر — اب اور بھی کیا عالمِ اکراہ میں کرتا

ہوتا کبھی موسم جو خزاں کا مرے درپے — غرق اُس کو شگفتِ لبِ دلخواہ میں کرتا

دیتی مجھے اک لمحۂ فرصت جو تری زُلف — کیا کیا نہ میں اُس لمحہ کو تاہ میں کرتا

ہوتی جو کسی ماہِ دو ہفتہ سے ملاقات — میں تخلیہ دامانِ شبِ ماہ میں کرتا

کیا میکشی و عشقِ غزالاں کے سوا کچھ — اے عمر تری فرصتِ کوتاہ میں کرتا

دو گھونٹ مقرر ہوئے قسامِ ازل سے — مشکل تھا گزارا اسی تنخواہ میں کرتا

اسمائے بیاں یاد نہ تھے صبح کو ورنہ — شامل انھیں اورادِ سحرگاہ میں کرتا

ملتی جو خدائی بھی تو رکھنے کی نہ تھی چیز — تقسیم اسے یارانِ ہوا خواہ میں کرتا

شخصیتِ رندان کو سمجھتا جو کوئی شخص — احساس ہمالہ کا پرِ کاہ میں کرتا

کوئی بھی یہاں ظاہر و باطن میں نہیں ایک — کیا فرق یہاں ضیغم و روباہ میں کرتا

حائل کبھی ہوتا مرے رستے میں اگر زُہد — میں زُہد کو بھی فرش تری راہ میں کرتا

ہوتا نہ کوئی رام تو ہر شب عملِ حُب — ساعاتِ خوش مشتری و ماہ میں کرتا

وہ رند ہوں جو شئے تھی ابھی کتمِ عدم میں — اُس کا بھی تماشا دلِ آگاہ میں کرتا

وحشت میں جو آتا ترا اندازِ کرم یاد — میں رقص ترے شہر کی ہر راہ میں کرتا

ہاتھوں میں سُبو بھی تھا ظفرؔ افسرِ گُل بھی
کیا اور اضافہ تُزکِ جاہ میں کرتا

خلیل الرحمن اعظمی

تو بھی اب چھوڑ دے ساتھ اے غمِ دُنیا میرا
میری بستی میں نہیں کوئی شناسا میرا

شبِ غم پار لگا دے یہ سفینا میرا
صبح ہو گی تو اُتر جائے گا دریا میرا

مجھ کو معلوم نہیں نام ہے اب کیا میرا
ڈھونڈنے والے مجھے! چھوڑ دے پیچھا میرا

میں نے دیکھی نہیں برسوں سے خود اپنی صورت
میرے آئینے سے رُوٹھا ہے سراپا میرا

تو بھی خوابوں میں رہی، میں بھی دھندلکوں میں تجھے
زندگی! دیکھ کبھی غور سے چہرا میرا

گھر سے نکلا ہوں تو اب دُور کہیں جانے دے
رُوک اے گردشِ ایّام نہ رستا میرا

دو قدم دوڑ کے آوازِ جرس بیٹھ گئی
چل پڑا میں تو کہیں پاؤں نہ ٹھہرا میرا

میرے دامن میں رہی خاکِ غریب الوطنی
رہ گیا دیکھ کے مُنھ دامنِ صحرا میرا

اُن بہاروں سے مجھے زردیِ رُخسار ملی
جن بہاروں نے کبھی حال نہ پوچھا میرا

نثار اٹاوی

اک پاؤں دشت میں ہے مرا اک چمن میں ہے
شاید خرد کا رنگ بھی دیوانہ پن میں ہے

زنجیر پائے شوق میں گردن رسن میں ہے
دیوانگی کا لطف اسی بانکپن میں ہے

کہہ دو یہ زندگی سے ذرا اور انتظار
مصروفِ عشق خدمتِ دار و رسن میں ہے

میں ہوں شہید مجھکو شگفتِ چمن سے کیا
میری بہار خون سے ڈوبے کفن میں ہے

ڈرتے نہیں حوادثِ عالم سے گل پرست
بن جائیگی چراغ جو بجلی چمن میں ہے

کہتی ہے گل سے شبنمِ نم دیدہ کا مآل
وہ تھرتھری جو صبح کی پہلی کرن میں ہے

کم ہوگا زورِ وحشتِ دل کچھ یقیں نہیں
اس سال تو خزاں بھی نئے پیرہن میں ہے

کیا پوچھتا ہے مجھ سے مری زندگی کا حال
اے دوست زندگی تو تری انجمن میں ہے

خوشبوئے گل قفس سے یہ کہکر پلٹ گئی
جینے کا کچھ مزا ہے تو سیرِ چمن میں ہے

کشمیر، تاج، صبحِ بنارس، اودھ کی شام
جنت اگر کہیں ہے تو میرے وطن میں ہے

مرنے کے بعد بھی نہ جنوں سے ملی نجات
اب تک وہ چاک چاک گریباں کفن میں ہے

بادِ سموم چوس چکی ہر کلی کا خون
اب کیا سوائے رنگِ پریدہ چمن میں ہے

شفاف چاندنی کا یہ عالم، یہ شامِ ہجر
ماتم۔ کہ میری زندہ محبت کفن میں ہے

الطافِ دوستاں سے اماں تو ملی نثار
شکرِ خدا کہ سایۂ غربت وطن میں ہے

شفاؔ گوالیاری

قفس کی شام ہو یا صبح آشیانے کی
ہیں دونوں سُرخیاں یہ ایک ہی فسانے کی

ابھی نہ کیجئے تکلیف مُسکرانے کی
کہ سازگار نہیں ہے فضا زمانے کی

یہ دُور بین و دُروں بیں نگاہ جانتی ہے
قفس ہے بگڑی ہوئی شکل آشیانے کی

جو راہِ حق و صَداقت پہ ہیں زمانے میں
کبھی وہ ٹھوکریں کھاتے نہیں زمانے کی

میں اُنکے رنگِ تغافل کو یوں بدل ڈالوں
کہ انتہا سے کروں ابتدا فسانے کی

جبیں کے جذبِ پرستش سے بے نیاز ہو کیوں؟
ذرا خبر تو لو تم اپنے آستانے کی

نئی ہے راہ، نئی رہنمائیاں لیکن
لگی ہے تم پہ نظر آج بھی زمانے کی

لگاؤں دل سے نہ کیوں سُرخیٔ غم دل کو
کہ اس نے آبرو رکھ لی مرے فسانے کی

شفاؔ ستاروں پہ ذرّات چھا گئے جاکر
فضا نے آپ بدل دی فضا زمانے کی

شفیق کوٹی

میں اپنی ہمت و عزمِ سفر کو دیکھتا ہوں
کبھی قفس کو کبھی بال و پَر دیکھتا ہوں

کہیں پہ ہو نہ کسی اور ظلم کی تمہید
شریکِ دار میں اُس فتنہ گر کو دیکھتا ہوں

یہ کیا ہوا ہے کہ چھٹنے لگی ہے تاریکی
تم آ گئے ہو کہ نجمِ سحر کو دیکھتا ہوں

کسی کے نقشِ قدم کی تلاش ہے مجھ کو
بہ احتیاط میں ہر رہ گزر کو دیکھتا ہوں

کبھی ہے چاکِ گریباں کی سمت میری نظر
کبھی میں موسمِ دیوانہ گر کو دیکھتا ہوں

یہ اپنی اپنی نظر ہے، یہ اپنا اپنا مذاق
وہ دل کو اور میں اُن کی نظر کو دیکھتا ہوں

کبھی خزاں تو کبھی ہے بہار کا عالم
میں صبح و شام تری رہ گزر کو دیکھتا ہوں

کوئی تو راہ گزر میں نظر پڑے اپنا
بحدِ شوق ہر اہلِ نظر کو دیکھتا ہوں

میں اپنے آپ ہوں آئینہ دارِ حسن و جمال
تری نظر سے میں اپنی نظر کو دیکھتا ہوں

نظر بچا کے نگاہیں چرا چرا کے شفیق
وہ مجھ کو اور میں اُن کی نظر کو دیکھتا ہوں

طرفہ قریشی

دل میں اک خواہشِ ناکردہ فغاں آج بھی ہے
آدمی درخورِ آزارِ جہاں آج بھی ہے

دُور تک پھیلا ہوا غم کا دھُواں آج بھی ہے
سر اُٹھائے ہوئے شعلوں کی زباں آج بھی ہے

وہی اغمازِ توجہ ہے ، وہی غمزۂ و ناز
التفات اُن کا محبت پہ گراں آج بھی ہے

ہمتِ آہ کسے ، جراُتِ نالہ کیسی
ضبطِ غم گریۂ دل کا نگراں آج بھی ہے

عیشِ رفتہ کا تجسس ، گئے لمحوں کی تلاش
احتیاج و طلبِ امن و اماں آج بھی ہے

گرد آلود نہ ہو جائے مری جنسِ حیات
سامنے مسئلۂ سُود و زیاں آج بھی ہے

دیکھئے کانوں میں کب آتی ہے آوازِ خلوص
یوں تو ناقوس کی لے ، بانگِ اذاں آج بھی ہے

ہو کسی میں کہ نہ ہو پینے پلانے کا شعور
دَورِ مے ، انجمنِ بادہ کشاں آج بھی ہے

صُبح تنویر بہ لب ، شام سیاہی بہ نگاہ
وہی دو رنگیٔ تصویرِ جہاں آج بھی ہے

انقلاب آئے مگر بے اثر و بے انجام
زندگی خواب گراں ، خوابِ گراں آج بھی ہے

سرد پڑ جائے نہ جولانیٔ طبعِ طرفہ
گرم بازاریٔ آتش نفساں آج بھی ہے

منظر امام

خوابِ فردا ہی مجھے تم نے دکھایا ہوتا
آج کے کربِ مسلسل سے بچایا ہوتا

دستِ گستاخ کو ہم کوئی سزا دے لیتے
تم نے دامن کا تقدس تو بچایا ہوتا

اتنا بے کیف کبھی ہوتا نہ گلوں کا موسم
آپ نے جشنِ سلاسل ہی منایا ہوتا

آج ماضی کی کوئی بات بھی آتی نہیں یاد
اب یہ رُونا ہے کہ اُس کو نہ بھلایا ہوتا

جانے وہ کون تھا، کیوں آیا تھا، کیا کہتا تھا
آپ نے اُس کا تعارف تو کرایا ہوتا

داغ جتنے ہیں تصنّع کے، نظر آ جاتے
تم نے اخلاق کا چہرہ تو دکھایا ہوتا

فُضیل جعفری

یاد آتی ہے جب پیار کی کھوئی ہوئی منزل
چھُو جاتی ہے اک موجِ صدا رُوح کا ساحل

اب وادیٔ غربت ہے وطن اہلِ جنوں کا
ہم صاحبِ منزل ہیں نہ آوارۂ منزل

شاید کوئی زندانیٔ اُلفت تھا، فضا میں
رس گھول گیا نغمۂ آوازِ سلاسل

آوارہ ہواؤں کی طرح دردِ محبت
ہر لمحہ مرے ساتھ ہے، صحرا ہو کہ محفل

لُٹ جاتی متاعِ دل و جاں جعفری لیکن
کچھ لوگ شناسا تھے سرِ کوچۂ قاتل

صادق اندوری

ہم ہیں رازِ رسن و دار سمجھنے والے
عشق کا جذبۂ بیدار سمجھنے والے

نرمیٔ شبنمِ گل سے بھی سراسیمہ ہیں
پھول کی شاخ کو تلوار سمجھنے والے

بڑھ کے سورج پہ بھی رکھ دیتے ہیں اپنی کفِ شوق
شدّتِ گرمیٔ رخسار سمجھنے والے

منزلِ شوق کو خود پاس بُلا لیتے ہیں
نبضِ جذبات کی رفتار سمجھنے والے

دفن رکھ دل میں ہر اک راز نہ کھول اپنی زباں
ہیں یہاں سب در و دیوار سمجھنے والے

خاک ہوتی ہے فلک بس یہ سمجھ لیں ہرگز
ہم کو افتادہ و نادار سمجھنے والے

آپ ہیں اپنی جگہ جرم و خطا کی تصویر
بادہ خواروں کو گنہگار سمجھنے والے

اہلِ دانش تو نہ سمجھے مری باتیں صادق
کچھ مگر نکلے قدح خوار سمجھنے والے

علیم اختر مظفر نگری

ستم و جور کی اک کوششِ پیہم ہے وہی
حسن کے لطف و عنایات کا عالم ہے وہی

خلشِ دل ہے وہی، سلسلۂ غم ہے وہی
دوشِ نازک پہ خمِ گیسوئے برہم ہے وہی

انتقام اپنی محبت نے لئے ہیں کیا کیا
جو مرا حال تھا اب حُسن کا عالم ہے وہی

اک حسیں یاد سہی پیکرِ الطاف و کرم
زندگی حشرِ غم و دردِ مجسّم ہے وہی

ہائے یہ جذبِ محبت کہ خفا ہیں لیکن
التفاتِ نگہِ ناز کا عالم ہے وہی

یہ سُنا ہے کہ گلستاں میں بہار آئی ہے
خندۂ گل پہ مگر گریۂ شبنم ہے وہی

اُف یہ وارفتگیٔ شوق یہ کیفیتِ دل
تجھ سے مل کر بھی تری یاد کا عالم ہے وہی

اختر اب قافلۂ شوق، کہاں سے گزرے
منزلِ دل ہے وہی، رہگزرِ غم ہے وہی

عنوان چشتی

وہ اپنے ساتھ زمانے کو لے کے چلتے ہیں
جو زندگی کے نئے زاویے بدلتے ہیں

میں دے رہا ہوں بشارت نئے زمانے کی
مرے شعور میں لاکھوں چراغ جلتے ہیں

"صنم تراشیٔ ذوقِ نظر" کو کیا کہیے
کہ اب خیالوں میں کچھ مہ جبیں مچلتے ہیں

ترا خیال، تری یاد، تیرا غم اے دوست
مری شکستِ محبت پہ ہاتھ ملتے ہیں

غموں کی دھوپ سہی پھر بھی زلف کے سائے
رہِ طلب میں مرے ساتھ ساتھ چلتے ہیں

بجھا بجھا سا ہے کیوں آج شعلۂ احساس
ابھی تو دل میں غموں کے چراغ جلتے ہیں

کسی کا غم ہی ملا ہے مجھے خوشی تو نہیں
یہ لوگ کس لئے رہ رہ کے ہاتھ ملتے ہیں

انھیں کو کہیے حقیقت میں زندگی عنواں
وہ حادثے جو رخِ زندگی بدلتے ہیں

اکرم دھولیوی

(تلمیذِ سیماب)

بڑھتا جاتا ہے اندھیرا حسرتِ آلام کا
دل ہے اب سینے میں یا سورج قریبِ شام کا

خُم تو ہیں لبریزِ صہبا ایک مُدت سے مگر
میکدہ محتاج ہے ساقی فروغِ جام کا

اے فسردہ دل شبِ غم مختصر ہو یا نہ ہو
صبح تک دشوار ہے جلنا چراغِ شام کا

جس کو منزل کا سلام آتا رہے ہر موڑ پہ
اے جنوں کیا پُوچھنا اُس رہروِ خوش گام کا

گوشۂ زنداں سے صحنِ باغ کتنی دُور ہے
موسمِ گُل منتظر ہوں میں ترے پیغام کا

منہ لگا کر رازداں کو ہو گئے بدنام ہم
جو چھلک جاتا ہو وہ ساغر بھلا کس کام کا

گُل میں خوشبو لاکھ ہو اُڑ جانے والی چیز ہے
رنگ کیا دیکھیں گلستانِ خزاں انجام کا

ہو گیا گمراہ جس نے خود روی کی اختیار
شکر ہے سالک ہوں اکرم شاہراہِ عام کا

حسن کمال

اپنی بربادیوں کا رنج نہیں
تیری تنہائیوں کا کیا ہوگا

پھول، اور وہ بھی میرے دامن میں
آنکھ سے خون ٹپک رہا ہوگا

شہر کا شہر ہے اُداس اُداس
میرے بارے میں کچھ سنا ہوگا

آنسوؤں نے ہمیں تو پھونک دیا
تیرا دامن بھی جل گیا ہوگا

سر اُٹھائے چلے چلو یارو
کوئی تو خنجر آزما ہوگا

سنتے ہیں فصلِ گل کا شور بہت
کوئی دیوانہ ہنس پڑا ہوگا

ناز ہے اپنی بندگی پہ حسن
جس کو چاہیں وہی خدا ہوگا

خلش وردی

ساقیا دیکھ ذرا تشنہ لبوں کے تیور
مے کا کیا ذکر ہے محفوظ نہیں ہیں ساغر

کیوں یہ آلودہ ہوئے جاتے ہیں اربابِ ہنر
بے بصر سب ہیں یہاں کوئی نہیں اہلِ نظر

جگمگایا ہے چمن جھوم اُٹھے ہیں گلِ تر
ہم نے دیکھا ہے ترے ایک تبسم کا اثر

اے محبت ترے اِس روپ کو کیا کہتے ہیں
کیفیت روح پہ طاری نہ ادھر ہے نہ اُدھر

میں کسی شے کو بڑھاتا نہیں اُس کی حد سے
اس لئے لوگ سمجھتے ہیں مجھے تنگ نظر

وہ اندھیروں کے حصار سے گذر جاتے ہیں
جو سمجھتے ہیں کہ ہے شام کا پیغام سحر

میری منزل ہے کہاں خود مجھے معلوم نہ تھا
رہزنو تم نے تو احسان کیا ہے مجھ پر

پھر نئے عزم سے اُٹھا ہے کوئی دیوانہ
پھر چراغوں سے مزین ہے محبت کی ڈگر

میرے سینہ میں خلش سیکڑوں نشتر ٹوٹے
میں نے ہر وار زمانے کا لیا ہے دل پر

ندری سہاگ تیل اور سرمۂ نور نظر کا تحفہ

مرکزی وزیر صحت

ڈاکٹر سوشیلا نائر کی خدمت میں

نیشنل فارمیسی ہفتہ و نمائش کے موقعہ پر ۲۶ نومبر ۶۳ء کو

ایس اے بی بخشی کمپنی کلکتہ کی طرف سے

مرکزی وزیر صحت کی خدمت میں

سندری سہاگ تیل

اور سرمۂ نور نظر

کا نذرانہ پیش کیا گیا

اس نمائش میں ایس اے بی بخشی کمپنی کلکتہ نے یونانی ادویات کی
نمائش کیلئے اسٹال بھی لگایا تھا

عمدہ صحت اور دلفریب حسن حاصل کرنے و برقرار رکھنے کیلئے ایس اے بی بخشی کمپنی کلکتہ
کی معیاری ادویات و حسن افزا مصنوعات پر مکمل اعتماد کیجئے

اکرام جاوید
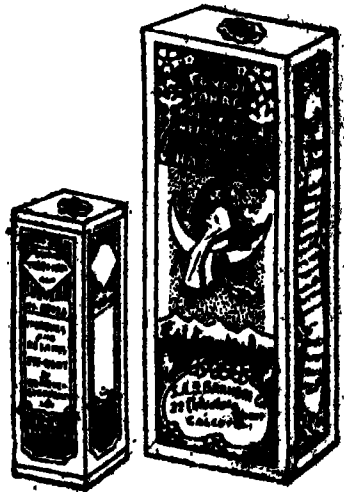
نیا دن

تیز و تند ہواؤں کی سنسناہٹ۔ پس منظر میں ایک بوڑھی کے کھانسنے کی آواز۔

ماں۔ (کھانستے ہوئے) بہو۔ دیکھ تو دروازے پر کون ہے (کھانسی) رمیش آیا ہوگا۔

کامنی۔ (دروازہ کھولتے ہوئے) یہاں تو کوئی نہیں ہے ماں جی۔

ماں۔ پھر ہوا کا کوئی جھونکا ہوگا۔ دروازہ بند کر دے بہو۔ رمیش ابھی تک نہیں آیا۔

کامنی۔ آج مہینے کا آخری دن ہے۔ وہ رات دیر گئے آئیں گے۔

(ہوا کا شور۔ کھانسی کی آواز)

ماں۔ آج چاند بھی دیر سے نکلے گا بہو۔ کل پونم کی رات تھی نا۔ (کھانسی) کتنی اندھیری رات ہے۔

کامنی۔ یہ رات تو ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ ہماری خوشیوں کا سورج ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا ہے۔

ماں۔ کھڑکی کے پٹ بھی بند کر دے بہو۔ جیسے زور کی ہوائیں چل رہی ہیں چراغ بھڑک رہا ہے چراغ بجھ جائے تو اندھیرے میں دم گھٹنے لگے گا۔

(کھانسی کی آواز)

کامنی۔ راشن کبھی کا ختم ہو چکا ہے ماں جی۔ راجہ اور لتا بڑے ہو گئے ہیں یہ تو کچھ نہیں کہتے لیکن ببلو اور منی بھوک کی تاب نہیں لا سکتے۔ روتے روتے ابھی ابھی اُن کی آنکھ لگی ہے۔

ماں۔ رمیش نوکر ہے۔ اچھی خاصی تنخواہ لاتا ہے پھر بھی گھر کا یہ حال ہے۔

کامنی۔ قرض سب سے بڑی بلا ہے ماں جی۔ قرضوں نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا گھر کی ایک ایک چیز بک گئی، گروی ہو گئی۔ زیور چلا گیا جہیز کی ساڑھیاں

تک چلی گئیں۔ پھر بھی قرضہ باقی ہے۔ تنخواہ ساری قرض میں چلی جاتی ہے۔ اور مہینہ گذارنے کے لئے پھر قرض لینا پڑتا ہے۔ قرض کا یہ چکر شاید زندگی بھر چلتا رہے گا ماں جی۔ سوچتے سوچتے میرا تو دَم گھٹنے لگتا ہے۔
(دکھاتے ہوئے) نراش نہ ہو بہو۔ دن بدلیں گے۔ خوشی کا زمانہ بھی آئے گا۔
۔ اپنے بھاگ ہی ایسے ہیں ماں جی۔ دُنیا کے سارے دکھ ہمارے حصّے میں آئے ہیں۔ اس گھر میں سُکھ کا سایہ تک نہیں پڑ سکا۔ خوشی یہاں کبھی نہیں آئے گی۔ کبھی نہیں۔

ہوا کے تیز و تُند جھکڑ۔ کہیں دُور رات کے بارہ بجتے ہیں۔

۔ اوہ۔ بارہ بج گئے۔ رمیش ابھی تک نہیں آیا۔
نی۔ وہ آجائیں گے ماں جی۔ آپ سو جائیے۔ آپ کی صحت پہلے ہی سے خراب ہے۔
۔ (بھرّائی ہوئی آواز میں) میرا کیا ہے بہو۔ میں نے تو دُنیا دیکھ لی۔ یہ تم لوگوں کے دن تھے۔ ہائے بیاہ کے وقت تو کتنی سُندر تھی، کتنی تندرست۔ اور اب کیا ہے۔ مفلسی کے تیزاب میں جھلسی ہوئی جوانی۔ نہ زیور پاس ہیں اور نہ پہننے کے لئے کوئی ڈھنگ کا کپڑا۔
نی۔ (کھوکھلی ہنسی) مجھے اپنا غم نہیں ہے ماں جی۔ فکر ہے تو بچّوں کی۔ راجہ دسویں کلاس میں پڑھ رہا ہے۔ اُس کی کتابیں اب تک خریدی نہیں گئیں۔ لتا کا اسکول جانا بند ہو گیا۔ جوان بیٹی کھانے پہننے اوڑھنے کو ترستی ہے۔ ان بچّوں کا آگے کیا ہوگا سوچ سوچ کر تو میں ہلکان ہوئی جاتی ہوں۔

(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

۔ (کھانستے ہوئے) کون۔ رمیش۔ دیکھ تو بہو۔
یش۔ (زور سے) کامنی۔ دروازہ کھولو۔
منی۔ ابھی آئی۔ (دروازہ کھلنے کی آواز)
یش۔ (پریشان آواز میں) سب سو گئے۔؟
نی۔

کامنی۔ ہوں۔ ماں جی جاگ رہی ہیں۔ آپ پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ چلئے کپڑے بدل کر کچھ کھا لیجئے۔
رمیش۔ اچھا۔ آج رات تم کچھ کھلاؤ گی۔
کامنی۔ آپ پہلے کپڑے تو بدل لیجئے۔
رمیش۔ تم تو کہہ رہی تھیں، ماں جی جاگ رہی ہیں لیکن وہ تو گہری نیند میں معلوم ہوتی ہیں۔
کامنی۔ شاید آنکھ لگ گئی ہے۔ اب تک جاگ رہی تھیں۔ کھانسی بہت ستا رہی ہے ماں جی کو۔
رمیش۔ ماں کے لئے دوا چاہئے کامنی۔ کل پہلی تاریخ ہے کل کسی طرح ماں کی دوا لے آؤں گا۔
کامنی۔ یہ تھوڑے سے چاول ہیں کھا لیجئے۔
رمیش۔ چاول۔
کامنی۔ پڑوسن سے آدھ سیر چاول بڑی مشکل سے مل سکے تھے۔ تھوڑا تھوڑا بچّوں نے کھایا ہے۔ یہ آپ کا حصّہ ہے۔
رمیش۔ اور تم۔؟ تم نہیں کھاؤ گی؟
کامنی۔ میں نے۔ میں نے کھا لیا ہے۔ آپ کھائیے نا۔
رمیش۔ کامنی کیوں جھوٹ بول رہی ہو۔ میں جانتا ہوں تم میرے کھانے کے بعد کھاتی ہو۔ آج بھی تم جھوٹ بول رہی ہو۔ (لہجہ بدل کر) ویسے ایک دوست نے میری بھی زبردستی دعوت کر ڈالی۔ دعوت کیا تھی تھوڑی بہت ہی تو مجھے بھوک نہیں ہے۔ آؤ۔ تم بھی کچھ کھا لو۔ یہ چاول بہت ہیں۔
کامنی۔ دو نوالے چاولوں کو آپ بہت کہتے ہیں۔ دیکھئے آپ کھا لیجئے۔
رمیش۔ نہیں کامنی۔ مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔
کامنی۔ اچھا ایسا کیجئے۔ آپ کھا لیجئے میں بعد میں کھا لوں گی۔ (برتنوں کی آواز۔ وقفہ)
رمیش۔ (چونک کر) ارے کامنی۔ (پچھتاتے ہوئے) کامنی میں نے تو سارے چاول صاف کر دیئے۔ تمہارے لئے کچھ نہیں چھوڑا۔
کامنی۔ کوئی بات نہیں۔ آپ نے کھا لیا میرا پیٹ بھر گیا۔

بیچ پانی پی لیجئے۔

یش۔ کامنی تم کتنی اچھی ہو۔ ایک میں ہوں میں نے آج تک تمھیں دکھ ہی دکھ دئے ہیں۔ میرے ساتھ رہکر تمھیں بھوکا بھی رہنا پڑتا ہے۔

منی۔ نہیں جی۔ میں دکھی کہاں ہوں۔ مگر آپ کی یہ پریشانیاں مجھ سے دیکھی نہیں جاتیں۔

یش۔ میری پریشانیاں ـــ! (غمگین ساز)

منی۔ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟

یش۔ ہوں۔ سوچ رہا ہوں۔ آسمان پر چاند نکل آیا ہے۔

منی۔ لیکن ہمارے گھر میں اندھیرا ہے چراغ کا تیل ختم ہو چکا ہے۔

یش۔ زندگی خود ایک لمبی اندھیری رات ہے پگلی۔ تاریکی زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ (لہجہ بدل کر) کل پہلی تاریخ ہے۔ سوچ رہا ہوں تمھارے لئے کم از کم ایک ساڑی ضرور خرید لاؤں۔ اور ماں کے لئے دوا۔

منی۔ میری ساڑی کی فکر مت کیجئے۔ پہلے راجہ کی فیس کا بندوبست کر دیجئے۔ لتا کے لئے ایک نئی فراک ضرور لے آئیے۔ ویسے بھولا اور منی کے کپڑے بھی پھٹ چکے ہیں۔

یش۔ لیکن کامنی۔

منی۔ اور پیسے بچ جائیں تو اپنے لئے کپڑے بنا لیجئے۔ کم از کم ایک قمیض اور دھوتی تو ہو۔ میرا کیا ہے گھر میں رہتی ہوں۔ آپ کو دفتر میں کام کرنا پڑتا ہے۔

یش۔ پیسے بچ جائیں تو (تلخی سے) آج کی رات اس مہینے کی آخری رات ہے۔ کل کا دن ایک نئے مہینے کا جنم دن ہوگا۔ کتنی عجیب بات ہے۔ مرنے والے مہینے کا غم کوئی نہیں کرتا۔ سب نئے مہینے کے جنم پہ خوشی مناتے ہیں۔ لیکن ہم۔ ہمارے لئے مرنے والا اور پیدا ہونے والا دونوں مہینے برابر ہیں۔ مسلسل غم ہماری قسمت ہے۔ کامنی۔

منی۔ بھگوان اگر کبھی مل سکتے تو میں ان سے پوچھتی کہ ایسا کیوں کیا۔ ہماری قسمت میں کیوں غم ہی غم ہو بھیجے۔

رکھ دیجئے۔

رمیش۔ (تلخی سے) بھگوان!

کامنی۔ (جلدی سے) پھر آپ سوچنے لگے۔ چھوڑئیے ان باتوں کو۔ زندگی کا کیا ہے کسی طرح گذر ہی جائے گی۔ چلئے سو جائیے۔ صبح آپ کو دفتر جانا ہے۔

رمیش۔ (اپنے آپ سے) کاش میں ہمیشہ کے لئے سو جاتا۔ (بلند) مجھے کیوں نہیں آتی۔ (بلند آواز سے)

کامنی۔ تم سو جاؤ۔ مجھے خرچ کا حساب جوڑنا ہے۔

کامنی۔ یہ کام آپ کل بھی کر سکتے ہیں۔ چلئے آرام کیجئے اٹھئے نا۔

رمیش۔ تم نہیں مانو گی۔ اچھا چلو۔ (ساز)

(ہلکی ہلکی اضطراب انگیز موسیقی)

رمیش۔ (بڑبڑاتے ہوئے) مکان کا کرایہ۔ سوداگر سنگھ کے قرض کی قسط۔ بنئے کا بقایا، لالہ رام پرشاد کا بیاج ساری تنخواہ تو ایسے ہی صاف ہو گئی۔ اب ماں کی دوا کہاں سے آئے گی۔ کامنی کے لئے ساڑی۔ بچوں کے لئے کپڑے۔ راجہ کے اسکول کی فیس۔ پان۔ سگریٹ والے چائے کا بل۔ اُف میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

دروازہ زور سے کھلتا ہے جیون سیٹی بجاتا ہوا آتا ہے۔

رمیش۔ (چونک کر) کون۔ اوہ جیون۔

جیون۔ ہاں رمیش بھیا۔ ہم جیسے ابھاگوں کے لئے تیرا یہ کمرہ ہی بہترین پناہ گاہ ہے۔ اس ماہ بھی اسی قیامت کا سامنا ہے۔ باہر قرضدار منتظر کھڑے ہیں۔ اور گھر میں۔

رمیش۔ اپنا بھی یہی حال ہے جیون (ٹھنڈی سانس بھر کر) آہ اپنی زندگی!

جیون۔ ہم تو کولہو کے بیل ہیں بھیا۔ مہینہ بھر محنت کرتے ہیں اور ختم ماہ پر غم کی فصل کاٹتے ہیں۔

رمیش۔ ہم صرف کولہو کے بیل ہوتے تو کوئی بات نہ تھی مگر ہم انسان ہیں (غم سے) انسان جیسے کولہو کے

یل کی طرح چارہ پانی بھی چین سے نہیں مل سکتا۔
جیون ۔ انجام کیا ہوگا بھیا۔ ہماری زندگی کا انجام۔
رمیش ۔ انجام۔ ہمارا آغاز بھی نامعلوم ہے اور انجام بھی نامعلوم ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ بے بسی اور مجبوری کا گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ اور اسی قاتل نہ ختم ہونے والے اندھیرے کا نام ہے زندگی۔ (پس منظر میں آنند کی گنگناہٹ ابھر آتی ہے)

کتنی لطیف، کتنی حسین ۔ کتنی مختصر
اک نوشگفتہ پھول کی نکہت ہے زندگی

جیون ۔ (دہراتے ہوئے) اک نوشگفتہ پھول کی نکہت ہے زندگی۔
رمیش ۔ (جھلاکر) ہونہہ۔ زندگی ۔ اس پاگل نے اس دو دھاری تلوار کی کاٹ دیکھی ہی کہاں ہے شیش محل کا یہ حسین شہزادہ زندگی کو کیا پہچانے۔
جیون ۔ یہ تم آنند کے بارے میں کہہ رہے ہو۔؟
رمیش ۔ ہاں ۔ آنند کے بارے میں جو سرتاپا فراڈ ہے۔ سوچو تو کس ٹھاٹھ سے زندگی کے حسن کے نغمے گاتا رہتا ہے۔
جیون ۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ آنند اس طرح خوش کیسے رہتا ہے۔ وہ بھی ہماری طرح ایک کلرک ہے۔ ہمارے ہی برابر کماتا ہے۔ اس کا بھی گھر بار ہے بیوی بچے ہیں۔
رمیش ۔ اسی لئے تو میں اسے مکمل فراڈ کہتا ہوں۔ دراصل وہ خوش اور مطمئن نہیں ہے پھر بھی خود کو دنیا کا مسرور ترین انسان ظاہر کرتا ہے۔ آنسوؤں پر قہقہوں کی نقاب ڈالنے کا فن اسے آتا ہے۔ ظاہر ہے ہم ایسا نہیں کر سکتے۔
جیون ۔ یہ بات نہیں ہے بھیا ۔۔۔ میں آنند کو بہت قریب سے جانتا ہوں۔ وہ واقعی بڑی مطمئن زندگی بسر کر رہا ہے۔ (حیرت سے) وہ بڑی عجیب باتیں کرتا ہے۔ کہتا ہے غم اور خوشی اصل میں کچھ نہیں ہیں صرف ہماری سوچ کا کھیل ہے جس سے ہم غمگین بھی ہوتے ہیں اور خوش بھی ۔ اس کا خیال ہے سلیقہ ہو تو آگ اور شعلوں میں بھی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ کانٹوں کے بستر پر بھی پھولوں کی سیج جیسی راحت محسوس کی جا سکتی ہے۔
رمیش ۔ وہ شاعر ہے نا۔ اس لئے باتیں بڑی خوبصورت کر لیتا ہے۔ صرف باتیں۔
جیون ۔ آنند کو ہم لوگوں سے بڑی دلچسپی ہے بھیا ۔ وہ ہماری پریشانیوں سے کافی متاثر معلوم ہوتا ہے۔
رمیش ۔ (تلخی سے) اسی لئے تو میں اس سے نفرت کرتا ہوں (تیز لہجے میں) اس نے میرے گھریلو معاملات میں مجرمانہ مداخلت کی ہے۔ میرے قرضداروں سے مل کر اس نے میرے قرض کی تفصیلات دریافت کیں۔ گھر پر پہنچ کر ماں جی اور کامنی سے ہمدردی جتا کر میری زندگی کے تاریک گوشوں سے واقف ہو گیا۔ اور یہ صرف اس لئے کہ مجھے دنیا کے آگے ذلیل کیا جا سکے آنند نے میری توہین کی ہے۔
(دروازہ زور سے کھلتا ہے)
مکاندار لالہ ۔ (داخل ہوتے ہوئے) کس نے توہین کر دی آپ کی۔؟
رمیش ۔ (گھبرا کر) اوہ لالہ جی آپ۔
جیون ۔۔۔ رمیش بھیا۔ بھاگو۔ سوداگر سنگھ بھی آ رہا ہے (بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز۔)
رمیش ۔ (بوکھلا کر) سوداگر سنگھ ۔ ارے جیون ۔ ذرا ٹھہر تو سہی۔
سوداگر سنگھ ۔ (داخل ہوتے ہوئے) کدھر جا رہے بابو جی۔ وہ تمہارا دوست جیون تو بھاگ گیا۔ اب تم بتاؤ تم کیا کہتے ہو۔
رمیش ۔ سوداگر سنگھ جی ۔ روپیہ تو جیون کے پاس ہے اور جیون تو بھاگ گیا۔
مکان دار ۔ ارے واہ ۔ یعنی آپ کی تنخواہ اور رہتی ہے جیون کے پاس۔
رمیش ۔ یقین کیجئے لالہ جی ہم دونوں اپنی اپنی تنخواہ کا حساب کر رہے تھے۔
مکاندار ۔ چھوڑو یہ بات ۔ دیدو چھ ماہ کا کرایہ۔

ایک سو بیس روپے۔
سوداگر سنگھ۔ اور اپنے قرض کی قسط پچیس روپے بھی۔
رمیش۔ لیکن سردار جی میرے پاس اس وقت تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔
سوداگر سنگھ۔ سچ کہتے ہو بابو جی۔
رمیش۔ بالکل۔
مکان دار۔ سردار جی۔ ان کی باتوں میں نہ آئیے۔ ذرا ان کی جیبوں کی تلاشی تو لے لو۔
رمیش۔ (پریشانی سے) نہیں۔ نہیں سردار جی۔ بھگوان کے لئے ایسا مت کیجئے۔
سوداگر سنگھ۔ (غصہ سے) سیدھی طرح سے ادھر آجاؤ بابو جی۔
رمیش۔ نہیں سردار جی نہیں۔ (کشمکش اور فرنیچر گرنے کی آواز)
سوداگر سنگھ۔ (ہانپتے ہوئے) یہ کیا ہے۔؟
مکاندار۔ دیکھ لیا نا سردار جی۔ پوری تنخواہ جیب میں ہے اور بابو جی فرماتے ہیں کہ جیون ۔۔۔۔
رمیش۔ لالہ مجھ پر رحم کرو۔ سردار جی میری بات تو سنو۔
سوداگر سنگھ۔ تم اب جھوٹ بھی بولنے لگے ہو بابو جی۔ بڑی شرم کی بات ہے۔
رمیش۔ سردار جی میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کیجئے سردار جی۔
سوداگر سنگھ۔ مجبوری کو سمجھنے بیٹھیں تو اپنا دھندا کیسے چل سکتا ہے۔ بابو جی۔ (نوٹوں کی سرسراہٹ) ہم اپنا روپیہ لے رہے ہیں۔
مکان دار۔ اور میں مکان کا کرایہ لے رہا ہوں۔ دیکھ لو۔ ایک سو بیس روپے ہیں۔ اور یہ باقی بچا پانچ کا نوٹ۔ رمیش بابو اسے رکھ لو۔
سوداگر سنگھ۔ اچھا بابو جی ہم چل دئے۔
مکان دار۔ میں بھی چل رہا ہوں سردار جی۔
غمگین موسیقی کے درمیان ڈراؤنی گونجدار آوازیں ابھرتی ہیں۔

کامنی کی آواز۔ میری ساڑی کی فکر نہ کیجئے۔ پہلے للتا کی فیس کا بندوبست کر دیجئے۔ للتا کے لئے ایک تنگ فراک ضرور لے آئیے۔ بھولا اور منی کے کپڑے بھی پھٹ چکے ہیں۔
ایک مردانی آواز۔ ماں کے لئے اب دوا کہاں سے آئے گی؟
دوسری آواز۔ (کرختگی سے) پانچ روپے میں سارا مہینہ کیسے گذارو گے رمیش بابو۔ بنئے کا قرض کیسے ادا کر سکو گے۔ اب اناج کہاں سے لاؤ گے۔
تیسری آواز۔ چائے، پان اور سگریٹ کا بل کون ادا کرے گا جی۔
چوتھی آواز۔ اب کس منہ سے گھر جاؤ گے رمیش بابو؟
پانچویں آواز۔ زندگی کا ہر دروازہ تم پر بند ہو چکا ہے رمیش بابو۔ اب زندہ رہنا ایک حماقت ہے۔
رمیش۔ (درد بھری آواز میں چیخ کر) اوہ بھگوان۔ اب کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ کہاں جاؤں۔
آواز موسیقی کی تیز لہروں میں ڈوب جاتی ہے۔ اور پس منظر سے آنند کی گنگناہٹ ابھرتی ہے۔ "اک تو شگفتہ پھول کی نکہت ہے زندگی!"
آنند۔ (داخل ہوتے ہوئے) رمیش بھیا۔ ارے تم یہاں ہو۔ میں کب سے تمھیں ڈھونڈ رہا تھا۔
رمیش۔ (وحشت سے) کون آنند۔ زخموں پر نمک چھڑکنے کے لئے تم آ ہی گئے آخر۔
آنند۔ (محبت سے) رمیش بھیا۔
رمیش۔ (تلخی سے) زہر کا کام جان لینا ہوتا ہے اور آگ کا کام جلانا۔ تم سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے آنند۔
آنند۔ (ملائمت سے) بھیا۔ کبھی کبھی زہر بھی امرت بن جاتا ہے۔ اور آگ ہمیشہ جلاتی ہی نہیں بلکہ روشنی بھی دیتی ہے۔
رمیش۔ (طنز سے) تو تم مجھے روشنی دینے آئے ہو یہاں؟
آنند۔ شاید میں ایسا کر سکوں گا۔
(بقیہ ۱۱۳ پر دیکھئے)

شاعر بمبئی

نور شاہ

اجنبی۔ سمندر۔ اور لڑکی

رات کا وقت۔ ہُو کا عالم۔ ویرانے کا ماحول
پراسرار اور سنسان۔ پس منظر میں اس قسم کی
آوازیں جن سے تحیر اور پُراسرارپن ظاہر ہو۔
(اتنے میں گرجے کا گھڑیال تین بجاتا ہے)

اجنبی۔ (اپنے آپ سے بے خودی کے عالم میں) گرجے کے گھڑیال نے رات کے تین بجا دئے۔ اور.... اور میرا سکون ہے کہ پھر بھی کوسوں دور..... کرسچین کالونی کے اس قبرستان میں کس درجہ خاموشی اور ابدی سکون ہے لیکن.... لیکن میرے سینے کے مدفن میں یہ کیسی خلش ہے۔ یہ کیسا طوفان ہے۔ کیسا شور و غل ہے۔ اُف میرا سینہ پھٹا جا رہا ہے۔ سر پھٹا جا رہا ہے... تم.... تم جاؤ یہاں سے۔ مجھے اب تنہا چھوڑ دو۔ مجھے.... مجھے ایسی اذیتیں دے کر نہ مارو۔ مجھ پر رحم کرو۔ یہ خلش میرا جگر کاٹ رہی ہے۔ اُف۔ ساحل سمندر کی اس پُرسکون بستی میں بھی شاید مجھے سکون کی ایک گھڑی میسّر نہیں ہوگی۔ اُف.... اُف ہاں ہاں جب تک.... جب تک تُو میرا پیچھا کرتی رہے گی۔ مجھے کہیں شانتی نہیں ملے گی۔ کہیں چین نہیں ملے گا۔ جاؤ۔ جاؤ۔ یہاں سے۔ (نہایت بے بسی سے) اُف جاؤ نا۔ نہیں جاتیں تو پھر مجھے بھی اپنے پاس ہی بلا لو نا۔ تاکہ میں سکون پا سکوں۔ سکون پا سکوں۔ سکون پا سکوں (آواز آہستہ آہستہ دور چلی جاتی ہے)

فادر البرٹ۔ بے چارا اجنبی! ۔ رات گئے اس پُرہول سناٹے میں، ویرانوں میں، قبرستانوں میں بھٹکتا پھر رہا ہے۔ کوئی عظیم صدمہ ہے اسے۔ کوئی گہرا راز ہے اس میں۔ مَیں اسے جاننے کی ضرور کوشش کروں گا۔ اس کی بے چین روح کے لئے سکون کی دعا کرونگا۔ یسوع مسیح اس کے گناہوں کو معاف کرے۔ اسے سکون بخشے۔ میں اب ضرور اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ اس سے باتیں کروں گا۔ بیچارا اجنبی۔ چلا گیا۔ چلا گیا۔ شاید پھر کہیں اور بھٹکنے کیلئے سکون کی تلاش میں۔ رات بیت چلی ہے۔ اب میں بھی گھر چلتا ہوں۔ کئی دنوں سے اس کے پیچھے ہوں۔ اب میں ضرور اس سے ملونگا۔ (جاتے جاتے بڑبڑاتا ہے۔) ہاں ضرور ملونگا۔ ضرور ملونگا۔ اس کا راز جاننے کی کوشش کرونگا۔ ضرور کوشش کروں گا۔

(CHANGE OVER)

پس منظر میں سمندری طوفان کی ہلکی ہلکی
آواز۔ اجنبی بھاری بھاری قدموں سے
ٹہلتے ہوئے خود سے مخاطب ہے۔

اجنبی۔ یہ طوفان۔ اس وسیع و عریض سمندر کے دل میں اُٹھ رہا ہے۔ یا میرے دل میں؟ میں اپنے دل کی آواز سُن رہا ہوں۔ اپنے دل کی آواز۔ اور یہ آواز مجھے مارے ڈالے جا رہی ہے۔ دل کی یہ آواز آخر ایک ساتھ بند کیوں نہیں ہو جاتی۔۔ اُف میرا دل جو سمندر کی طرح گہرا ہے۔ مگر.... مگر جو کبھی پرسکون نہیں ہوتا جس میں ہمیشہ تلاطم برپا رہتا ہے ۔۔ (ایک آہ) کتنے برس بیت گئے۔ اسی طرح تنہائی کے کتنے۔ سورج نکلے اور غروب ہو گئے۔ مگر ....مگر.. تیری یاد میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جب میں نے اپنی روح پر تیرے

سائے محسوس نہ کئے ہوں۔

(سمندری طوفان کی آواز اُبھر کر ڈوب جاتی ہے۔)

میرے دل کا یہ طوفان کسی دن مجھے ڈبو دے گا۔ پھر شاید سکون پا سکوں۔ وہ سکون جو مجھے ساحلِ سمندر کی کسی بھی بستی میں رہ کر آج تک نصیب نہ ہو سکا۔ یہاں بھی نہیں۔ کسقدر خاموش ہے یہ بستی۔ یہ چند مکان، یہ گھنے درختوں کے سائے۔ یہاں کون کون رہتا ہے۔ میں نہیں جانتا۔ ہر ایک سے منہ چھپائے پھر رہا ہوں۔ کہ کوئی میرے دیدۂ پُرنم کے قطروں کو نہ دیکھ سکے — آدھی آدھی رات گذر جانے کے بعد جب میرے دل کو یقین ہو جاتا ہے کہ ان مکانوں میں بسنے والے محوِ خواب ہونگے، میں باہر نکلتا ہوں۔ سینے میں یہ طوفان چھپائے۔ پھر بھی یہ طوفان —

(تیز ہواؤں کا شور۔ کھڑکیوں کے بار بار کھل کر بند ہونے کی آواز۔)

فادر البرٹ :۔ کون ہے؟

(اجنبی کے بھاگنے کی آواز)

فادر :۔ رُک جاؤ۔ میں کہتا ہوں رُک جاؤ اجنبی — اجنبی رُک جاؤ — اوہ چلا گیا — پاگل۔ جنونی۔ بے چارا۔

(نوکر آجاتا ہے)

جوَن ۔ کون تھا فادر۔ کدھر گیا؟

فادر :۔ کوئی نہیں، وہی اجنبی تھا۔ ہمارا اپڑوسی،

جوَن ۔ اوہ۔ اچھا۔ وہ اکثر رات گئے ہمارے باغ کے پاس ٹہلا کرتا ہے۔ عجیب آدمی ہے۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہتا ہے، جیسے کسی سے باتیں کر رہا ہو۔

فادر ۔ کسی سے! اُونہہ میں تو نہیں معلوم اجنبی کس سے باتیں کیا کرتا ہے۔

جوَن ۔ اُس کے ساتھ کوئی نہیں ہوتا۔ وہ بالکل اکیلا ہوتا ہے۔ میں نے تو کئی بار دیکھا ہے۔

فادر ۔ تم نہیں جان سکتے جوَن۔ اُس کے ساتھ [illegible] خیال ضرور ہوتا ہے۔ جس نے اُس کے سکون کو [illegible] کر دیا ہے۔ خیر چھوڑو۔ ہاں یہ بتاؤ تم کبھی اُس کے مکان پر گئے ہو؟

جوَن ۔ وہاں؟ — وہاں کون جائے۔

فادر ۔ کیوں؟ ۔

جوَن ۔ ارے آپ جانتے نہیں فادر؟ (راز داری کے [illegible]) وہ کیا کرتا ہے کہاں سے آیا ہے۔ ہماری کالونی میں کوئی نہیں جانتا۔

فادر ۔ ہُنھ۔ یہ تو ٹھیک ہے۔

جوَن ۔ اور پھر فادر آپ جانتے ہیں۔ دن میں کسی نے اُسے اپنے مکان سے کبھی باہر آتے نہیں دیکھا۔ وہ انسانوں کے سائے سے بھی بھڑکتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب سے کر سچین کالونی میں رہنے کے لئے آیا ہے آپ ہی کیا کالونی کے سارے لوگ اُسکے بارے میں سوچنے لگے ہیں۔ وہ چھپا چھپا کیوں رہتا ہے گھبرایا گھبرایا راتوں کو باہر جا کر کیا کرتا رہتا ہے۔ (راز [illegible] زیادہ راز داری سے) اور اب تو کالونی کے سارے لوگ اُس اجنبی سے ڈرنے لگے ہیں۔

فادر ۔ ہاں جوَن۔ تم سچ کہتے ہو۔ اس پُر اَسرار اجنبی کی وجہ سے اب ایک خاموش خاموش چھپا چھپا سا خوف ساری کالونی پر چھا گیا ہے۔ اور یہ پُر اسرار اجنبی ان سب چیزوں سے بے خبر کالونی کے ماحول سے بے حس اپنے چھوٹے سے مکان میں دُبکا [illegible] جانے کیا سوچتا رہتا ہے۔

جوَن ۔ ہاں فادر۔ گھر میں ایک وہ ہے اور ایک اُس کا نوکر۔ کسی سے ملتا نہیں۔ بات نہیں کرتا۔ اور [illegible] بھی بہرا اور گونگا ہے۔!

فادر ۔ بہرا اور گونگا۔؟

جوَن ۔ جی ہاں، بس شہر سے سامان لے آتا ہے پکاتا کھلاتا ہے۔ اور خدمت کرتا ہے۔ دونوں میں [illegible]

شاہد جمیل

نہیں ہوتی۔ دونوں ایک دوسرے کو جانے بغیر
ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ عجیب بات ہے۔!
رازداری۔ مکمل رازداری۔! اس اجنبی کی
شخصیت بے حد پُر اسرار ہے۔ کوئی نہیں جانتا۔
کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے۔ کیوں آیا ہے کیا کرتا ہے۔
کل رات بھی میں نے اُسے گرجے کے قبرستان میں بھٹکتے
دیکھا۔ میں کئی راتوں سے اُس کا پیچھا کرتا رہا ہوں
لیکن۔ کچھ بھی ہو میں کل سویرے اُس اجنبی سے
ضرور ملوں گا ضرور ملوں گا۔ اُس سے باتیں کرونگا۔
اُس کا حال جاننے کی کوشش کروں گا ۔۔۔ اچھا
عثمان۔ جاؤ اب تم سو جاؤ۔ کھڑکیاں اچھی طرح
بند کر جاؤ۔ لیکن سُنو۔ صبح ناشتہ جلد کرنا چاہتا ہوں
میں ایسے وقت اُس کے پاس جاؤں گا جب اُس کا
وہ بہرا اور گونگا نوکر موجود نہ ہو۔
ن۔ ہاں فادر۔ وہ صبح شہر جاتا ہے۔ آپ اُسی وقت
جائیے گا۔ ورنہ شاید آپ کو ملنے نہ دے۔
ادر۔ اچھا جاؤ۔ شب بخیر!
ثمان۔ شب بخیر۔
(طوفانی ہواؤں کا شور۔ ساز۔ جو
آہستہ آہستہ FADE OUT ہوجاتا ہے)
(دروازے پر دستک دینے کی آواز)
جنبی۔ (کھردری آواز میں) کون ۔۔۔ ؟
فادر۔ مَیں ہوں۔
اجنبی۔ (اور زیادہ کھردری آواز میں) کون مَیں۔؟
فادر۔ میں آپ کا ہمسایہ۔ پادری البرٹ۔ ذرا دروازہ
کھولئے۔
(چند لمحوں کی خاموشی۔ دروازے کی طرف آنے
کی آواز ۔۔ اور پھر دروازہ کھلنے کی آواز)
فادر۔ اوہ۔ صبح بخیر۔ میرا آنا آپ کو گراں تو نہیں گزرا۔؟
جنبی۔ (کچھ توقف کے بعد کھردری آواز میں) ہُنھ ۔۔۔
اوہ۔ صبح بخیر۔ بالکل نہیں۔ تشریف لائیے۔
فادر۔ شکریہ۔ (دونوں اندر چلتے ہیں)
فادر۔ اُف۔ کسقدر اندھیرا اور خاموشی ہے آپ کے
کمرے میں۔ ذرا کھڑکی کا یہ پردہ سرکائیے۔
(پردہ سرکانے کی آواز)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے
آپ خود بھی یہاں نہیں رہتے۔!
اجنبی۔ خاموشی!۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان
کے دل میں طوفان کا شور ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے
دل کی آواز سے گھبرا کر ایسے ہی خاموش اور تنہا
ماحول میں پناہ کی تلاش کرتا ہے۔!
فادر۔ اور آپ کو اس طوفان اور شور سے شاید پھر بھی
پناہ نہیں ملی ہے؟
اجنبی۔ (گڑبڑا کر) جی... جی... آپ۔
فادر۔ بیٹھے.... دل کے اس طوفان کی شدّت میں
ایک دوسرے سے کہنے۔ ایک دوسرے سے ملنے
جُلنے اور دُکھ سُکھ میں شریک ہونے سے کمی
آجاتی ہے۔! آپ چرچ کیوں نہیں آتے۔
اجنبی۔ (خاموشی).... فادر
فادر۔ کل اتوار ہے۔ آپ چرچ چلئے نا!
اجنبی۔ جی ۔۔۔ جی ۔۔۔
فادر۔ چرچ چلئے نا۔ آپ ہمیشہ اکیلے رہتے ہیں۔
آپ کی کسی سے جان پہچان ہے نہ اور کچھ اور
۔۔۔ اس چھوٹی سی بستی میں ہم سب ایک دوسرے
سے ملتے ہیں۔ ہم سب پیار اور محبت سے
رہتے ہیں۔ اتوار کو سب ہی لوگ چرچ آتے ہیں۔
آپ بھی آتے تو.....
اجنبی۔ میں.... میں ضرور آنے کی کوشش کرونگا فادر
ویسے یہ مندر، یہ مسجد، یہ گرجے مجھ جیسے آدمی کیلئے
نہیں ہیں۔
فادر۔ کیوں نہیں ہیں۔ مندر مسجد اور گرجے سبھوں کے لئے
کھلے رہتے ہیں۔ اور پھر آپ۔
اجنبی۔ (بات کاٹ کر۔ اور شاتے ہوئے) معاف کیجئے گا میں

خاموشی

آپ کو چائے بھی پیش نہ کر سکا۔ میرا نوکر شاید باہر
گیا ہوا ہے۔

[پا]دری۔ اوہ کوئی بات نہیں۔ میرے لئے آپ کی ملاقات ہی
مسرت بخش ہے۔ مجھے اُمید ہے آپ سے آئندہ ملاقات
چرچ میں ہوگی۔ جب انسان کے دل میں طوفان ہو تو
اُسے پناہ اور سکون اِن مندروں، مسجدوں اور گرجوں
ہی میں مل سکتا ہے۔ خداوند کے حضور میں سربسجود
ہوکر جب انسان اپنے دل سے پردہ اُٹھا دیتا ہے
تو رحمتِ تمام اُسے اپنی آغوش میں پناہ دے کر
اُن تمام غموں سے نجات دیتی ہے۔ یہ مندر۔ یہ مسجد
اور گرجے ہر انسان کے لئے ہیں۔ کیونکہ یہ خدا کے
گھر ہیں اور ہم سب اُس کے بندے ہیں۔

جنبی۔ معاف کیجئے گا میں آپ سے کچھ زیادہ ہی باتیں
کرنے لگا۔

پادری۔ میں آپ کی تنہائی میں مخل ہونے کی معافی چاہتا
ہوں۔ ضرور چرچ آئیے گا۔ خدا حافظ۔

جنبی۔ (پادری کے جانے کے بعد)

جنبی۔ (خود سے) چرچ آئیے گا۔ ہُنھ۔ لوگوں سے
جتنا دُور بھاگتا ہوں۔ اُتنا ہی گھیرتے ہیں۔ میں
چاہتا ہوں اپنی زندگی کے بے سکونی کے یہ آخری
دن۔ اِن دنوں کا ایک ایک لمحہ تیری یاد میں گزاروں
جب میرے پاس صرف تو ہو۔ اپنی تمام تر رعنائیوں
اور جمال سامانیوں کے ساتھ، تیری سیاہ گھنیری
زلفوں کے سائے میرے چہرے پر ہوں۔ تیری ایک
ایک ادا میرے آئینۂ دل میں اُترتی ہوئی ہو۔

(لمبے لمبے سُروں میں پس منظر میں دور سے
یہ شیر ٹیپ چھٹنے کی آواز آتی ہے)

جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں، تصوّرِ جاناں کئے ہوئے

(ایک دو بار یہ شعر مدھم سُروں میں سُنائی
دیتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ)

خدا علیم ...

(ہوجاتا ہے FADE OUT)

Change Over

(چرچ کا سین۔ پس منظر میں ہلکا ہلکا
مذہبی ساز بجتا سُنائی دیتا ہے۔)

فادر البرٹ۔ (بائبل سے سُناتا ہے) ۔۔ "اے خداوند
میں نے تیری دہائی دی ہے۔ میری طرف جلد آ۔
جب میں تجھ سے دعا کروں تو میری آواز سے کان لگا
میں اپنی آواز بلند کر کے خداوند سے فریاد کرتا ہوں،
میں اپنی ہی آواز سے خداوند سے منّت کرتا ہوں۔
میں اپنا دکھ اُس کے حضور میں بیان کرتا ہوں۔
جب مجھ میں میری جان نڈھال تھی تو میری راہ سے
واقف تھا...... "

"دہنی طرف نگاہ کر اور دیکھ مجھے کوئی نہیں پہچانتا
میرے لئے کہیں پناہ نہ رہی۔ کسی کو میری جان کی
فکر نہیں ۔۔ اے خداوند میں نے تجھ سے فریاد کی
میں نے کہا تو میری پناہ ہے "

" اے خداوند میری دعا سُن۔ میری التجا پہ کان
لگا۔ اپنی وفاداری اور صداقت میں مجھے جواب
دے۔ اور اپنے بندے کو عدالت میں نہ لا کیونکہ
تیری نظر میں کوئی راستباز نہیں ٹھہر سکتا "
اس لئے کہ دشمن نے میری جان کو ستایا ہے۔
اُس نے میری زندگی کو خاک میں ملا دیا۔ اور مجھے
اندھیری جگہوں میں اُن کی مانند بسایا ہے جن کو
مرے مدّت ہوگئی ہو "

" اسی سبب سے مجھ میں میری جان نڈھال ہے
اور میرا دل مجھ میں بیکل ہے ۔ میں گذشتہ
زمانوں کو یاد کرتا ہوں ۔ میں اپنے ہاتھ تیری
طرف پھیلاتا ہوں۔ میری جان خشک زمین کی
مانند تیری پیاسی ہے۔" اے خداوند جلد مجھے
جواب دے۔ میری روح گداز ہو چلی "

" اے خدا میری دعا پہ کان لگا۔ اور میری منّت

دے۔ میں تم سے بیقرار ہو کر کراہتا ہوں ۔۔ میرا
دل بجھ میں بے تاب ہے ۔۔ اور موت کا ہول مجھ پر
چھا گیا ہے ۔ خوف اور کپکپی مجھ پر طاری ہے۔
ہیبت نے مجھے دبالیا ہے ۔ پر میں تو خدا کو پکاروں
گا اور خداوند مجھے بچالے گا ۔

اس کے بعد لوگوں کے چرچ کے ہال سے
نکلنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

وقفہ

(مدھم ساز کی لے پر۔ دور ہال کے ایک
کونے سے کسی کے آہستہ آہستہ سسکیوں
کی آواز ابھرتی ہے)

فادر ۔ سب لوگ چلے گئے ۔ یہ سسکیوں کی آواز کہاں سے
آرہی ہے ۔۔ اوہ ۔۔ وہ اس کونے میں کون ابھی
تک ڈسک پر سر جھکائے بیٹھا ہے ۔ سسکیوں کی
آواز بھی وہیں سے آرہی ہے ۔ ہاں وہی رورہا ہے
ٹپ ۔ٹپ ۔ ٹپ ۔ ہال میں پادری کے
آہستہ آہستہ اس کے پاس کنے کی آواز

فادر ۔ (حیرت اور خوشی سے) اوہ ۔۔ اجنبی ۔ تم ... تم ؟
اجنبی ۔ (سسکیاں) .....

فادر ۔ تمہارا یہاں آنا مبارک ہو اجنبی دوست ۔ خداوند
نے تمہاری دعا سن لی ہو گی ۔ ضرور سن لی ہو گی ۔
وہ تمھیں ضرور سکون دے گا ۔ پناہ دے گا ۔

اجنبی ۔ (سسکیاں)

فادر ۔ اجنبی ۔ تمہارے دل میں جو کچھ بھی ہے ۔ اٹھو
اسے خداوند کے سامنے رکھو ۔ آسمانی باپ تمھارے
گناہوں کو معاف کرے گا ۔

اجنبی ۔ (چیخ کر) ۔ نہیں نہیں ۔ وہ تو مجھے معاف نہیں
کرے گی جس کا میں مجرم ہوں میں نے عہد
شکنی کی ہے ۔ محبت میں عہد شکنی کی ہے

فادر ۔ آسمانی باپ کے سامنے اپنے گناہوں کا اقرار

کر اجنبی ۔ پھر وہ بھی تجھے معاف کر دے گی ۔

اجنبی ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ فادر ۔ وہ مجھے کبھی معاف نہیں
کرے گی ۔ کبھی نہیں کرے گی ۔ کبھی نہیں کرے گی ۔
میں ... میں ۔ (بے ہوش ہو جاتا ہے)

فادر ۔ اوہ ۔ بے ہوش ہو گیا ۔ ارے کوئی ہے ۔ (ملی جلی
آوازیں) اسے میرے گھر اٹھائے چلو ۔

(Change Over)

ستار کا نہایت مدھم ساز ۔ انتشار آمیز

اجنبی ۔ (بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑاتا ہے)

اجنبی ۔ ۔ وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی ۔ میں اس کا
گنہگار ہوں ۔ وہ مجھے معاف نہیں کرے گی ۔ کبھی
نہیں ۔۔ میں اس کا قاتل ہوں ۔ میں نے اپنی محبت
کا خون اپنے ہاتھوں کر دیا ....

فادر ۔ اجنبی ۔ اجنبی ۔

اجنبی ۔ میں کہاں ہوں ؟

فادر ۔ گھبراؤ نہیں ۔ تم اپنے مکان پر ہو ۔ تمہیں آرام
کی ضرورت ہے ۔

اجنبی ۔ آرام کی ۔؟ ۔ مجھے کیا ہوا ۔ میں تو اچھا ہوں ۔!

فادر ۔ ہاں تم واقعی اچھے ہو ۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں
۔۔ تم ہم سب لوگوں کو غیر کیوں سمجھتے ہو ۔ ماضی
نے اگر تمہیں کچھ دکھ دئے ہیں ۔ تو انھیں بھول جانے
کی کوشش کرو ۔

اجنبی ۔ بھول جانے کی کوشش کروں ۔؟ کیسے بھول جاؤں ۔
کاش یہ میرے بس کی بات ہوتی ۔

فادر ۔ تم ہمیشہ تنہا ، اکیلے اور اداس رہتے ہو ۔ لوگوں
سے ملو ۔ ان کے دکھ سکھ شریک ہو ۔ شاید تم اپنے
ماضی بھولنے میں کامیاب ہو سکو ۔ !

اجنبی ۔ میرا ماضی ! ۔ آپ میرے ماضی کے بارے میں
کیا جانتے ہیں ۔

فادر ۔ ظاہر ہے بہت کم جانتا ہوں ۔ لیکن جتنا بھی جانتا
ہوں اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تمھیں تنہائی

کو نہیں، ساتھی کی ضرورت ہے۔ جوانی میں ہر ایک
سے غلطی سرزد ہوتی ہے کسی سے چھوٹی۔۔۔۔
کسی سے بڑی۔ لیکن۔۔۔ لیکن تم نے اس کا
قتل کیوں کیا؟۔

اجنبی۔ قتل؟۔ کس کا قتل؟

فادر۔ جس سے محبت کرتے تھے۔

اجنبی۔ میں نے قانون کی اصطلاح میں کسی کا قتل نہیں
کیا۔ ہاں ضمیر کی اصطلاح میں میں نے ضرور قتل
کیا ہے۔۔ میں نے۔۔۔ میں نے۔۔۔

فادر۔ کہو کہو۔ اجنبی کہو۔ شاید اس سے تمہارے دل
کو سکون ملے۔ تمہارے سینے میں سوچوں کا جو جوالا
مکھی اندر ہی اندر سلگ رہا ہے۔ وہ ٹھنڈا ہو جائے۔

اجنبی۔ (گہری سانس لے کر) آہ۔ تو سنئے مقدس باپ،
آج میں اپنے دل کے زخموں کو جنھیں میں چودہ
برس سے اندر ہی اندر سینک رہا تھا آپ کے سامنے
ہوا دے رہا ہوں۔

فادر۔ شاباش۔۔۔ میرے بیٹے شاباش حقیقت کے
اظہار سے آسمانی باپ تمہاری روح کو ضرور
دکھ اور غم سے آزاد کرے گا۔

اجنبی۔ سنو مقدس باپ۔ آج سے پندرہ سال پہلے
کی بات ہے۔ جب کہ میں اپنی زندگی کے صحرا
میں تنہا بھٹک رہا تھا۔ میرے دل کی بے نام
آرزوؤں کو کسی کے سہارے کی ضرورت تھی جب
۔۔۔۔ جب کہ اچانک وہ مجھے ملی تھی۔ ایسا ہی ساحل
سمندر تھا۔ (سمندر کی ہلکی لہروں کی آواز)۔ اور
پھر ان گنت لہروں کی طرح وہ ان گنت دن
آئے جو ہم دونوں نے ساتھ ساتھ گزارے۔
ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوب کر، ایک دوسرے
کے دل کی دھڑکنیں گن کر۔ ایک دن جب میں
سمندر سے نہا کر نکلا تو وہ موجود تھی۔

(ساز)

میں نے اس کو چاروں طرف تلاش
کیا، آخر ایک جگہ وہ مل گئی۔

(ساز)

اجنبی۔ آہ۔۔۔ میں تمہیں تلاش کرتے کرتے تھک گیا۔
اور تم یہاں بیٹھی ہو۔ (تعجب سے) ہیں۔ یہ کیا؟

لڑکی۔ یہ۔ یہ تم دیکھ نہیں رہے؟ گھر بنا رہی ہوں نا

اجنبی۔ گھر۔ ریت کا گھر۔ یہ ریت کے گھروندے بنانا یہ
بچوں کا کھیل۔ اس وقت تمہارے ہاتھوں کو دیکھ کر
میرے سامنے تمہارے بچپن کی تصویر آ گئی ہے۔
لگتا ہے ایک چھوٹی سی بچی اپنی ننھی ننھی انگلیوں
سے ریت میں گھروندے بنا رہی ہے اور جب وہ
گھر پہنچے گی تو کپڑے میلے ہونے پر خوب ڈانٹ
پڑے گی۔ اونہہ۔ چہرہ تو اٹھاؤ۔

(تیز ساز)

یہ کیا۔؟ تمہاری آنکھوں میں آنسو؟

لڑکی۔ آبدیدہ ہو کر۔ چھوٹے منہ سے ایک بڑی بات
کہی ہے تم نے۔

اجنبی۔ (ہنستے ہوئے) ارے پگلی۔ ادھر دیکھو، میں نے
یہ بات تمہارے ہنسانے کیلئے کہی تھی اور تم رونے
لگیں!۔ انھیں تم نے کیوں آنے دیا۔ تمہاری
پلکیں ان کا بوجھ سہار سکیں گی کیا؟ کیسی لڑکی
ہو تم۔ میں نے تو صرف تمہارے بچپن کی بات کی
تھی۔ بچپن جو اب بہت پیچھے رہ گیا ہے۔

لڑکی۔ کیا گھر بنانا بچوں کا کھیل ہوتا ہے؟۔ کیا
اس گھر کا تصور کرنے کا کوئی حق نہیں۔ جو
اپنا ہو جس کے بغیچے کی کیاریوں میں گلاب کے پھول
کھلاؤں جس کے دروازوں پر اپنے ہاتھ سے کاڑھے
ہوئے پردے لٹکاؤں۔

اجنبی۔ اور جس کے آنگن میں میرے اور تمہارے قدموں
کے نشان ہوں۔ کیوں؟

لڑکی۔ (مسکرا کر) ہوں!

شاعو بمبئی

[illegible] میں نے جب تمہارا یہ ہاتھ پہلی مرتبہ
[illegible] میں لیا تھا تو عہد کیا تھا کہ اسے نہ چھوڑوں
گا جب تک تم خود نہ چھوڑ دو۔

لڑکی۔ میں نے جب پہلی بار یہ ہاتھ تمہارے ہاتھوں
میں دیا تھا تو عہد کیا تھا اسے خود کبھی نہ چھڑاؤنگی
جب تک کہ تم نہ چھوڑ دو۔

اجنبی۔ میں چھوڑ سکتا ہوں بھلا۔؟

لڑکی۔ کیا خبر، یہ خیال ریت کے گھروندے کی طرح
نا پائیدار ہو۔

اجنبی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

لڑکی۔ سچ !؟

اجنبی۔ ہاں۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں ساری زندگی
محبت کی مقدس امانت سمجھ کر تمہاری حفاظت کرونگا
ساری زندگی تمہارے لئے زندہ رہوں گا۔ صرف
تمہارے لئے۔

لڑکی۔ اپنے لئے نہیں ؟

اجنبی۔ تمہارے بغیر میرے لئے رکھا ہی کیا ہے۔

لڑکی۔ میری زندگی بھی تو تمہارے بغیر نامکمل ہے۔
ان لہروں کو دیکھ رہے ہو ان میں سورج کی
کرنوں کا عکس۔ یہ کس طرح ایک دوسرے کے
وجود میں ایک ہو گئی ہیں۔ لیکن ابھی اندھیرا
ہو جائے گا تو یہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گی۔

اجنبی۔ کیا کہنا چاہتی ہو ؟

لڑکی۔ موت بھی تو تاریکی کا دوسرا نام ہے کسی دن
یہ ہمارے درمیان آجائے گی۔

اجنبی۔ ہش !۔ چپ رہو۔ ایسے برے شگون تمہارے
ہونٹوں پہ کیوں آتے ہیں۔

لڑکی۔ یہ شگون نہیں حقیقت ہے۔ زندگی کی شاخ
پر کھلنے والے تمام پھول ایک دن موت توڑ کر لے
جاتی ہے۔

اجنبی۔ تو یہ بھی حقیقت سمجھو، تمہاری خاطر بس ایک دن
[illegible] موت سے بھی لڑوں گا۔ میں اس اندھیرے کا سینہ
چیر کر رکھ دوں گا۔

اجنبی۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) کیا معلوم تھا وہ دن
اتنی جلد آجائے گا۔ وہ گھڑی اتنی قریب ہوگی
جب وہ میرے اس قول کا امتحان لے گی۔ میں سمجھ رہا
تھا کہ ہماری محبت کے شگوفے اس گھر کے آنگن
میں مسکراتے کو ہیں جس کے نقوش ایک دفعہ اس نے
ریت پر ابھارے تھے۔ اب ہماری منگنی ہو چکی تھی۔
اس کے چہرے سے حجاب کے باوجود سرخیاں پھوٹی
پڑتی تھیں اور انھیں سمیٹنے کے لئے مجھے اپنا دامن بھی
تنگ معلوم ہوتا تھا۔ اس شام ہم دونوں ساحل پر
آئے تھے۔ تاکہ اپنی کامران محبت کا جشن منا سکیں۔

ساحل سمندر پہ چہل پہل کی آواز۔ لہروں
کا مدھم شور (طربیہ موسیقی پس منظر میں)
(ہنسنے ہنسانے کے ساتھ)

لڑکی۔ دیکھو۔ یہ موجیں ساگر کی عمیق ترین گہرائیوں سے
ابھر ابھر کر اچھل اچھل کر ایک دوسرے سے گلے
مل رہی ہیں۔

اجنبی۔ ہاں۔ پھر کبھی نہ بچھڑنے کے لئے۔

لڑکی۔ آؤ ہم بھی ان لہروں میں کچھ دیر کے لئے اپنے آپ کو
چھپا دیں۔ ہماری خوشیاں ان کی خوشیوں میں مل کر
دوبالا ہو جائیں گی۔

اجنبی۔ ڈارلنگ، کیوں نہ ہم آج اپنی ہی خوشیوں کا
ساتھ دیں۔

لڑکی۔ نہیں آج میں بہت خوش ہوں۔ بہت خوش۔ میں
ان ہنستی ہوئی لہروں کے ساتھ ہنسونگی۔ ان سے
کھیلوں گی۔ ان سے پوچھونگی۔

اجنبی۔ پوچھوگی۔ کیا ؟

لڑکی۔ میں ان مچلتی لہروں سے پوچھونگی۔ یاد ہے

[illegible] دن جب ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا [illegible] کو یاد ہے
کیا جب ہم نے گھر بسانے کا تصور کیا تھا۔ یاد ہے تو
اس شام کی حسین یادوں کو بھی اپنے سینے میں محفوظ
کر لو جب اب ہم ایک ہو چکے ہیں کبھی نہ جدا ہونے کے لئے۔
اجنبی۔ مجھے کچھ حرارت سی ہے ڈارلنگ... میں....
لڑکی ۔۔ اوہ میں اپنی مسرتوں میں ان کا ساتھ بھی چاہتی
تھی ۔۔ آج کی رنگین پیار بھری شام کو۔ یادگار بنانا
چاہتی تھی (بجھ کر) ۔۔ لیکن تم ۔۔
اجنبی۔ اوہ ۔۔ ڈارلنگ ۔میری طبیعت کی طرف سے
اداس مت ہو۔ میں یہاں کنارے پہ بیٹھا تمھیں
دیکھتا رہوں گا۔ تمھارے قہقہوں کی خوشی بن کر ۔۔
میں دیکھوں گا یہ لہریں زیادہ شوخ ہیں یا تم ۔۔!
لڑکی۔ (آزردہ ہو کر) نہیں ۔
اجنبی ۔ نہیں ۔ میری خوشی بھی یہی ہے تم ان میں کھیلو۔
لیکن دیکھو زیادہ دُور نہ جانا ۔ اس سمندر میں
شارک مچھلیاں بھی ہیں ۔
لڑکی ۔ (خوش ہو کر) شارک! شارک میرا کیا بگاڑ سکتی ہے۔
میری منزل تم جو میرے ساتھ ہو۔
سمندر کی لہروں کی آواز ۔ چھپ چھپ کر کے
لڑکی کے ہنس ہنس کر نہانے کی آواز ۔
(کچھ دیر بعد ایک لمبی چیخ کی آواز سنائی دیتی ہے)
(المیہ ساز)

اجنبی ۔ (بھرّائی آواز) میں اُن حسین لمحات کی مسرتوں
میں کھویا ہوا تھا ۔ کہ میں نے یکا یک اُس کے چیخنے
کی آواز سُنی ۔ کسی شارک مچھلی نے اُسے اپنی گرفت
میں لے لیا تھا ۔ میں نے سطحِ سمندر پہ اُس کی سفید
سفید باہیں اپنی طرف پھیلی ہوئی دیکھیں میں نے
بے اختیار اسکی طرف بڑھنا چاہا ۔ لیکن ۔۔ آہ نہ تو
میرے مُنہ سے کوئی چیخ نکل سکی ۔ نہ میرے قدم اپنی
جگہ سے جنبش کر سکے ۔ میں نہیں جانتا وہ کونسی

قوت تھی جس نے میری ساری طاقت سلب
مجھے پتھر کی طرح بے حس کر دیا تھا ۔ اور د[illegible]
اس کا سُرخ سفید چہرہ ، اُسکی سیاہ زلفیں
سمندر کی وسعتوں میں ڈوب گئیں ۔ (اور زیا
بھرائی ہوئی آواز) ۔ میری محبت کا سورج میر
آنکھوں کے سامنے غروب ہو گیا ۔ دیکھتے دیکھ
پیار کے قہقہوں کی موت ہو گئی ۔
میرے چاروں طرف اندھیرا تھا نہیں معلو
میں کس طرح واپس آیا ۔ میں رات کے کسی حص
میں خود کو اپنے کمرے میں پایا ۔ میرے والدین
گھر کے لوگ میرے پاس تھے ۔ میں نے دیوان
کی طرح بھاگنا چاہا ۔ لیکن ... لیکن پھر میں کبھی
ساحل پر واپس جا سکا ۔ میرے والدین مجھے ا
شہر سے لے آئے ۔ زندگی کے کتنے سال میں نے
ادھر ادھر بھٹکتے گزار دئے ۔ آج اس واقع
بیتے پندرہ سال ہو چکے ہیں لیکن زندگی کے
طویل عرصے میں ایسا کوئی لمحہ نہیں آیا جب
مجھ سے دُور رہی ہو ۔ وہ میری موجودگی میں
میں ڈوب گئی ۔ اور میں اُسے بچا نہ سکا ۔ میں
موت کے مُنہ سے نہ چھین سکا ۔ میں اندھیرے
سینہ نہ چیر سکا ۔ اور تب سے ... تب سے میں
اندھیرے میں بھٹک رہا ہوں (سسکیاں سک
اُف میں اُس کا قاتل ہوں ۔ اُس کا قاتل
میں کیا کروں ۔ آہ کیا کروں ۔ (سسکیا
۔ سسکیاں ۔۔)
فلور ۔ (آبدیدہ ہو کر) صبر ۔ صبر کر میرے بچے
اجنبی ۔ (سسکیوں کے ساتھ) ۔ صبر ... صبر کر
اے کاش ایسا ہوتا ۔ آہ مقدس باپ ۔ آپ نہیں
میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اُس کے
موت سے لڑوں گا ۔ صرف اُس کے لئے زندہ
اور ... اور وہ میری نگاہوں کے سامنے سمند

بھٹک کے موت کی تاریکیوں میں گم ہو گئی۔ لیکن
میں کچھ نہ کر سکا (روکر) میں کچھ نہ کر سکا —
کچھ نہ کر سکا۔

فادر۔ تم نے اچھا کیا اجنبی۔ جذبات کے بجائے عقل
سے کام لے کر تم نے بُرا نہیں کیا۔

اجنبی۔ (سسکیوں کے ساتھ) — آہ فادر۔ آپ نے
محبت کی ہوتی تو جانتے کہ پیار میں عقل کے فیصلے
اکثر انسان کو کس طرح بے چین رکھا کرتے ہیں۔
کس طرح وہ اپنے ضمیر کی آواز پر تڑپا کرتا ہے۔
دل کے ہاتھوں کتنی سخت اذیتیں پاتا ہے۔

فادر۔ (پیار کے ساتھ) آپ اس وقت آرام کیجئے۔ میں
پھر آپ کے پاس آؤں گا۔ اگر کچھ حرج نہ ہو تو ہم
دونوں خالی وقت ایک ساتھ گزارا کریں؟

اجنبی۔ بہت بہت شکریہ۔ لیکن اس طرح آپ میری
زندگی کا رُخ بدلنے کی جو کوشش کر رہے ہیں۔
مجھے اُمید نہیں اس میں کامیاب ہو سکیں۔

فادر۔ کیا حرج ہے، بہرحال مجھے کوشش کرنے دیجئے۔

اجنبی۔ جیسی آپ کی مرضی۔

فادر۔ اچھا — خدا حافظ — !

اجنبی۔ خدا حافظ!

(CHANGE OVER)

ساحل سمندر چہل پہل۔ عورتوں، بچوں
اور مردوں کی ملی جلی آوازیں۔

فادر۔ آج تو ساحل پر کچھ زیادہ ہی چہل پہل نظر آ رہی ہے۔

ڈاکٹر۔ ہاں۔ فادر۔ آج تو کالونی کے تقریباً سبھی
لوگ یہاں نظر آ رہے ہیں۔

فادر۔ کاش اس سمندر میں خطرناک شارک نہ ہوتیں تو
آج ہم بھی نہا لیتے۔ کیوں ڈاکٹر شوزالی۔؟

ڈاکٹر۔ (قہقہہ لگا کر) مقدس باپ۔ بچے تو نہا رہے ہیں!
شارک تو عام طور پر کنارے سے دُور ہی رہتی ہیں۔
ہاں کبھی کوئی آگے نکل آئے تو دوسری بات ہے۔

سوبھی

فادر۔ ہاں۔ ڈاکٹر۔ دراصل اب ہم بوڑھے ہو گئے
ہیں۔ کسی زمانے میں ہم بھی اسی سمندر میں نہاتے
تھے۔ شارک ہماری طرف چلی آتی تو ہم فوراً
بھاگ جاتے تھے۔ وہ زمانہ ہی انوکھا تھا۔

ڈاکٹر۔ یہ سب بچپن کی یادیں ہیں۔

فادر۔ ڈاکٹر بچپن کی یہ یادیں کتنی حسین ہوا کرتی ہیں۔

ڈاکٹر۔ واقعی۔ میرا خیال ہے بڑھاپا اُن حسین یادوں
کے سہارے ہی گذر جاتا ہے۔ (دونوں ہنستے ہیں)

ڈاکٹر۔ ہاں۔ آج آپ کے ساتھ وہ اجنبی نہیں آیا —

فادر۔ آیا ہے — وہ دیکھئے اُدھر تنہا کھڑا سمندر کی
لہروں کو گھور رہا ہے۔

ڈاکٹر۔ مقدس باپ۔ آپ نے اُس کی زندگی کو بدلنے
کی سچی کوشش کی ہے۔

فادر۔ سب آسمانی باپ کی مہربانی ہے۔

ڈاکٹر۔ سچ۔ اب کم سے کم انسانوں سے تو نہیں بھاگتا

فادر۔ وقت ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے۔ ہاں خاص
طور سے دل کے زخموں کو۔

اچانک شور کی آواز بلند ہوتی ہے
لوگ چیخ رہے ہیں۔

ایک آواز۔ — مونا — مونا —

(اجنبی کی آواز اُبھرتی ہے)

اجنبی۔ مونا! — کون مونا —! — کیسی مونا —!!!

فادر۔ (بھاگتے ہوئے) کیا ہے —؟ — کیا ہوا لوگو۔

(میوزک)

ایک آواز۔ وہ — وہ دیکھئے مونا سمندر میں شارک
سے بچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ دیکھئے
— وہ — وہ چیخ رہی ہے۔

(چیخ پکار۔ سمندر کی لہروں اور مونا
کے چیخنے کی آوازیں۔)

ڈاکٹر۔ ارے دوڑو — کوئی ناؤ تو لے آؤ۔

نسوانی آواز۔ میری بچی مونا — مونا — ارے
میری مونا کو بچاؤ۔

اجنبی - مونا - ! (وقفہ) مونا ۔ میں مونا کو بچا لونگا۔
(دوڑتا ہے۔)
دوسری آواز - ارے یہ کون جا رہا ہے - ارے یہ موت کے منھ میں کود رہا ہے۔ پاگل ہے۔
ایک آواز - ارے روکو اسے - مت جانے دو اسے - مونا نہیں بچ سکتی - یہ بھی مارا جائے گا -
فادر - (چیخ کر) رُک جاؤ - اجنبی - عقل سے کام لو ابھی - کہاں جا رہے ہو -
(سمندری شور - لہروں کا تلاطم - میوزک)
ڈاکٹر - اوہ - کود گیا - چلا گیا - وہ لڑکی کے پاس پہنچ گیا -
فادر - آہ کتنا بہادر ہے - لڑکی کو بازوؤں میں اٹھا لیا ہے - وہ اُسے لے آ رہا ہے - انسان کی جان بچالی ہے - مرحبا -
ڈاکٹر - شاباش اجنبی شاباش -
نسوانی آواز - مونا زندہ بچالی گئی - آہ - میری مونا - خداوندا تیرا شکر ہے - میری مونا -
ایک آواز - (چیخ کر) - ارے دیکھو وہاں پانی سُرخ ہو رہا ہے - خون - خون - !!
دوسری آواز - خون -
(سکوت چھا جاتا ہے اجنبی کے کراہتے ہوئے کنارے پر آنے کی آواز اُبھرتی ہے - لوگ آہستہ آہستہ چہ مہ گوئیاں کرتے ہیں -)
ڈاکٹر - (حیرت سے چیخ کر) ارے اجنبی ! - اسکی دونوں ٹانگیں غائب ہیں - بالکل غائب - خون کا آبشار
فادر: - (درد کی بھری ہوئی آواز میں) - آہ یہ کیا اجنبی - یہ کیا کیا - ؟
(مدھم بھرائی آواز میں) - تم نے .... تم نے ایسا کیوں کیا اجنبی - بتاؤ تم نے ایسا کیوں کیا !
اجنبی - (دم توڑتے ہوئے اٹک اٹک کر) - مقدس باپ .... اُس .... اُس کا .. نام ... بھی .... تو مونا ہی تھا - ! - ( )
(حزن و ملال کی ماتمی موسیقی)
شاہد کیفی

(بقیہ ڈرامہ صفحہ ۱۰۳ کا بقیہ)
رمیش - آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو آنند - ؟
آنند - (پُرسکون لہجے میں) صرف یہی کہ آپ گھر چلے جائیے وقت کافی ہو چکا ہے -
رمیش - گھر - ؟
آنند - جی ہاں - گھر - اس لئے کہ آپ کا سارا قرض ادا ہو چکا ہے - ماں جی کی دوا - بھابی اور بچوں کے کپڑوں، راجہ کی فیس اور مہینہ بھر کے لئے اناج اور دوسری ضروریات کا انتظام ہو چکا ہے -
رمیش - (حیرت سے چیخ کر) کیا کہہ رہے ہو آنند - !
آنند - سچ کہہ رہا ہوں رمیش بھیا - اب آپ ہر فکر اور ہر قرض سے آزاد ہیں - (لہجہ بدل کر) بھیا - آپ بھول رہے تھے کہ اس دنیا میں آپ اکیلے نہیں ہیں - آپ کے دوست اور ساتھی بھی موجود ہیں - اور آپ کا اپنا غم سب کا مشترک غم ہے - مجھے اور دفتر کے دوسرے ساتھیوں کو اس کا احساس تھا - اس تمام عرصے میں ہم لوگوں نے مل کر روپیہ اکٹھا کیا - اور اب آپ قرض کی اُس خوفناک قید سے آزاد ہیں - ہم سب امداد باہمی کے اصولوں کو اپنا چکے ہیں - (ساز)
رمیش - آنند - (بھرائی ہوئی آواز میں) میں نے تمھیں ہر وقت غلط سمجھا - مجھے معاف کر دو میرے بھائی (ساز)
آنند - پُرانی باتوں کو بھول جائیے - رمیش بھیا - آج کا دن آپ کی زندگی کا ایک نیا دن ہے - ایک پُرجوش سپاہی کی طرح بڑھ کر زندگی کو اپنا لیجئے -
رمیش - میں اپنی زندگی کے اس یادگار دن کو ہمیشہ یاد رکھونگا -
آنند - اچھا اب چلئے - گھر میں سب ہماری راہ دیکھ رہے ہوں گے -
رمیش - چلو میں تمھارے ساتھ ہوں -
موسیقی کی لہریں تیز ہو کر اُبھر کر منظر پر چھا جاتی ہیں -

(فیڈ آؤٹ)
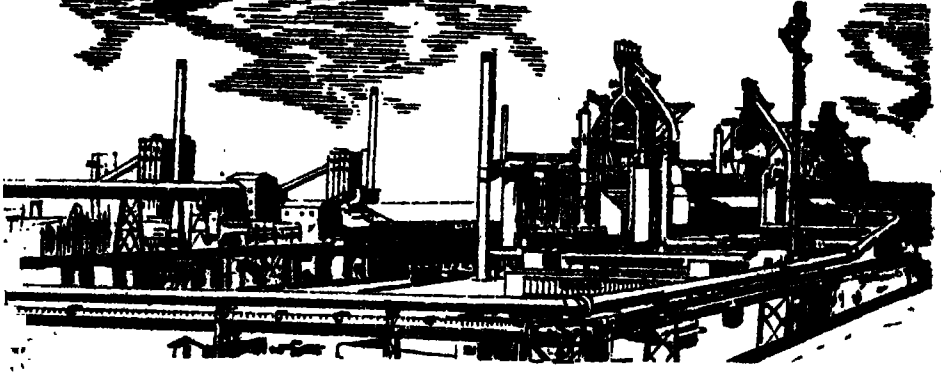
دِفاع اور ترقی کا کام ساتھ ساتھ چلتا ہے

ملک کے ترقیاتی منصوبے ملکی دفاع کا اہم جزو ہیں۔ ہنگامی حالات کے پیش نظر اب نئی ترجیحات مقرر کی گئی ہیں۔ انجینیری اور طبی عملے کی تربیت، برقی اسکیموں اور فولاد، مشین، مشینی اوزار، بجلی کا ساز و سامان، کوئلے کی کان کنی اور ریلوے جیسی بنیادی صنعتوں کے ترقیاتی پروگراموں پر تیزی سے عمل کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔

طاقت کی ٹھوس بنیاد پر ہی دفاع کی تیاری کا انحصار ہے۔ ہمارے مسئلے کا ایک یہی حل ہے۔

اس مہم کو کامیاب بنانے کے لئے جی جان سے ہاتھ بٹائیں۔ کروڑوں جیالوں کی بے غرض خدمت اور ان تھک کوشش کی بدولت ہی بھارت اپنی دفاعی طاقت کو بڑھا سکتا ہے۔

پلان کو کامیاب بنائیے

بھارت کے دِفاع کو مضبوط کیجئے

DA 63/370

پرنٹر، پبلشر اور مالک اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس، ۲۳۱ فورنزجی اسٹریٹ ٹھاکر دوار بمبئی نمبر ۲ میں چھپوا کر دفتر سے شائع کیا

"SHAIR" BOMBAY

JANUARY. 1964

Just 2 tablets

...الین کی صرف دو ٹکیاں گلے کی خراش کو دُور
...نے اور تسکین پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔ یہ سانس
...نالیوں کو صاف کرتی ہیں۔ کھانسی، زکام
...گلے کی خرابیوں کو دور کرتی ہیں اور خراش کو
پیدا ہونے سے روکتی ہیں۔

سُعالین

...کے سانس کو بھی خوش گوار بناتی ہے

ہمدرد

دہلی، کانپور، پٹنہ

GAYWAYS/I

چینی فوجیں آج بھی ہماری شمالی سرحد پر جمع ہیں۔ چوکس رہیں۔

آپ کا نظم و ضبط قوم کی قوت ہے

DA63/F

The "SHAIR" Bombay 8
(35 Years of Publication)
THE MOST POPULAR OLDEST LITERARY & CULTURAL URDU JOURNAL

چند لکھنے والے
ڈاکٹر ابو محمد سحر
ڈاکٹر سید محمد حسنین
انجم فاطمی
رضاء الجبّار
محمد عظیم فیروزآبادی
رفعت صدیقی
سرینواس لاہوٹی
نجم آفندی
احسان
سلام مچھلی
نازش پرتاپ
ارشد
شفیق

جاری شدہ
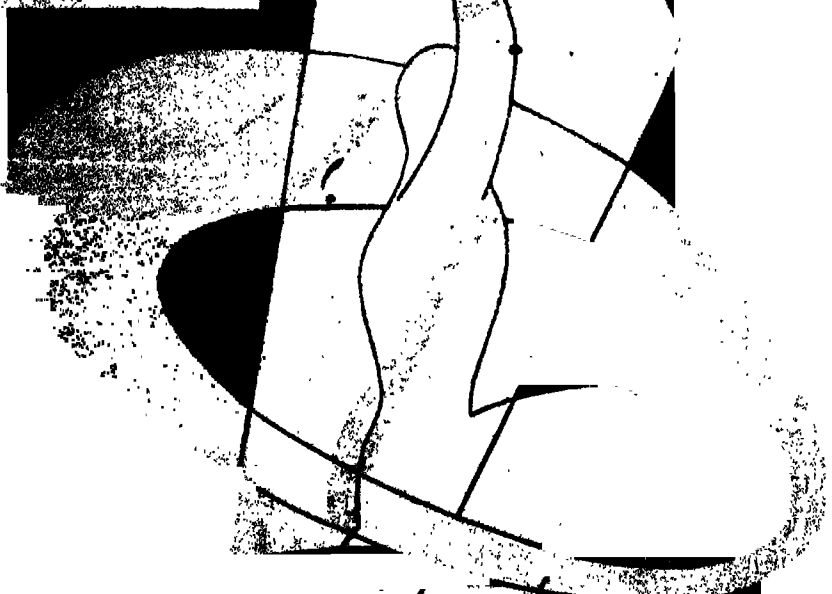
بانی ـ علامہ سیماب اکبر آبادی

اُردو کا قدیم علمی و ادبی ماہنامہ

شاعر
بمبئی

سال ـ ۳۵ ؛ شمارہ ۴ ـ ۵

اپریل مئی ـ ۶۴ء

ادارہ

اعجاز صدیقی

مہندر ناتھ

زرِ سالانہ	زرِ ششماہی	ممالکِ غیر سے	فی پرچہ
سات روپیہ	چار روپیہ	۱۶ شلنگ	۱۲ آنے (۷۵ نپ)

مکتبۂ قصرالادب

پوسٹ بکس ۴۵۳۶ بمبئی نمبر ۸
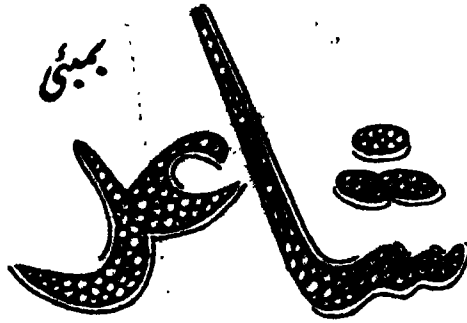
کھیت کی
پیداوار
میں اضافہ
ہونا چاہئیے
کسان کے بہتر معیار زندگی کیلئے
زرعی پیداوار میں اضافہ وقت
کی اہم ضرورت ہے اور حکومت
مہاراشٹر کسان کو ہر طرح کی
مدد فراہم کرکے زراعت کی
ترقی پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کر رہی ہے
توقع ہے کہ تیسرے پلان کے آخر تک
پیداوار کی سطح ۷۸ء۶۹ لاکھ ٹن ہو جائے گی
جبکہ اندازاً ریاست کو ضرورت ۹۲ء۹ لاکھ ٹن
کی ہوگی۔ اسطرح تیسرے پلان کے خاتمے کے بعد
بھی ریاست میں ۱۴ء۳ لاکھ ٹن اناج کی کمی ہوگی۔
اسلئے آنیوالے عرصے میں زیادہ کوششوں اور
جد وجہد کی ضرورت ہے تاکہ ریاست جلد
ہی اناج کی پیداوار میں خود کفیل ہو سکے
تجارتی فصلوں مثلاً گنے، روئی اور
بیجوں کی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے
اسی طرح سپلائی اور سروز کی تنظیموں جیسے
اچھے بیج، کھاد اور زرعی کریڈٹ کی تقسیم
کو وسعت دیگئی ہے تاکہ کسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات
سے نپٹا جا سکے۔
دی ڈائریکٹر آف پبلسٹی، حکومت مہاراشٹر
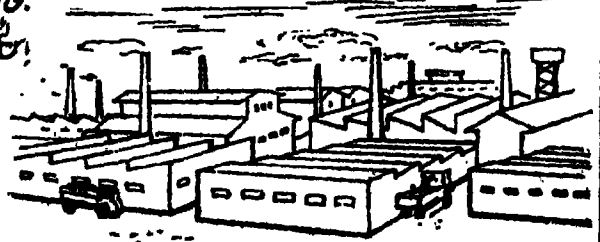
نڈھال طبیعت کو
ٹھنڈک پہنچائیے
مرطوب آب وہوا اور جھلستے ہوئے سورج
سے بچئے اور اپنے آپ کو خنک رکھنے
کے لئے افغان لیونڈر کے استعمال
سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔
یہ بہت ہی فرحت بخش، راحت آمیز
اور آپ کی جلد کو خوشنما چمک دیتا ہے
کمل سوپ، اور افغان ٹیلکم اور
افغان اسنو کو بھی نہ بھولئے
جو
موجودہ دور کی بنی سنوری
دوشیزہ کیلئے تین اہم
ضروریات ہیں
Afghan
افغان اسنو
افزائش حسن کے لئے
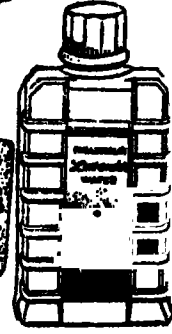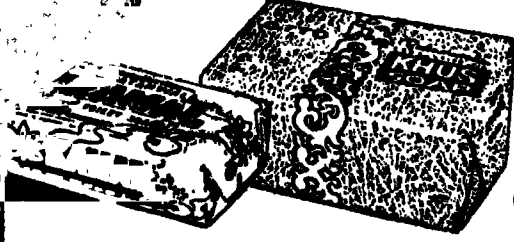
(۱)
سومنات کے مشہور مندر
دیہوت ساگر۔ دوارکا۔ پالیتانہ
پوربندر۔ گرنار۔ ڈاکور
امباجی
اور کئی دوسرے مقامات
(۲)
مسلمانوں کے مقابر
درگاہ میراں داتار۔ جمال شاہ داتار
شاہ عالم۔ سرخیز
اور
کئی دوسرے
(۳)
اُدواڈا ضلع سورت
میں پارسیوں کی مقدس
زیارت گاہ
دیگر تفصیلات کے لئے
ڈپٹی ڈائرکٹر آف انفارمیشن (ٹورزم) سیچیوالیہ۔ احمد آباد ۱۵
(فون نمبر ۲۳۷۸۸)
یا
اسسٹنٹ ڈائرکٹر آف انفارمیشن (ٹورزم) حکومت گجرات۔ دمن راج محل
اپالو بندر۔ بمبئی ۱
(فون نمبر ۲۷۷۶۳۲۵)
شاعر بمبئی

شاعر بمبئی

ترتیب

مکتوبات

مفتون کوٹوی — خاور ناگپوری — تمنا مظفرپوری
ضیا بیتی — نور الہدی — حبیب اللہ رازی
ہدی پرتاپگڑھی — عزیز اندوری — اشرف باقی

افکارِ تازہ

انسانیت کے نام پر	اعجاز صدیقی - مہندر ناتھ	۹
محفلِ اپنی . . . !	ادارہ	۸۲
نقد و نظر	ادارہ	۸۳
رفتار (علمی ادبی اور تہذیبی خبریں)	ادارہ	۸۹

مقالات

امیر مینائیؒ کی طویل عاشقانہ مثنوی	ڈاکٹر ابو محمد سحر	۱۰
اردو شاعری کے جدید میلانات	جمیل الرحمٰن زخمی	۱۷
ادب اور زبان	ڈاکٹر سید محمد حسین	۲۲
غالب کی عظمت	انجم فاطمی	۲۵
اقبال عطیہ کی نظر میں	سلطان احمد	۲۹
کلیم الدین احمد کی زبان اور اُن کا انداز بیان	محمد ابراہیم	۳۳

نظمیں

پھول زخمی ہیں . . . !	سلام مچھلی شہری	۳۶
اِشتباہ	نازش پرتاپگڑھی	۳۹
امرت	یوسف ناظم	۴۱
نوید	ارشد صدیقی	۴۲
تاج محل	عنوان چشتی	۴۳
وہ رات	خالد شفائی	۴۵
ماں	شمس فریدی	۴۷

افسانے

اونچی منڈیر	رضاء الجبار	۴۸
رخسار کے پھول	شہاب دائروی	۵۱
ولایتی مرغیاں	سرینواس لاہوٹی	۵۴
بہتے دھارے	تبسم شفائی	۵۸
زندہ تربت	رفعت صدیقی	۶۲

طنز و مزاح

میرے چچا	محمد عظیم فیروزآبادی	۶۶

ڈرامہ

محبت کا مطلب	ل۔م۔ شاہد	۷۱

غزلیں

نجم آفندی — احسان دانش — طرفہ قریشی — شفیق کوفی
مضطر کولوی — رونق دکنی — کفیل آذر — ندرت کانپوری
مظہر علی خاں مظہر — ساحل فرنگی — ڈاکٹر سحر اعظمی

اعجاز صدیقی

دیکھ کر چلو!

(چند تازہ تاثرات، مُسلسل غزل کے رُوپ میں)

لو دے اُٹھے ہیں سرو وسمن، دیکھ کر چلو
اہلِ چمن، ہوائے چمن دیکھ کر چلو

ساحل پر ایک شور ہے موجوں میں اضطراب
اے صاحبانِ گنگ وجمن، دیکھ کر چلو

اچھی نہیں ہیں آبلہ پائی کی زحمتیں
تپنے لگی ہے ارضِ وطن، دیکھ کر چلو

صیّاد خود ہی صید ہوں، ایسا نہ ہو کہیں
پھیلا ہوا ہے دامِ کہن، دیکھ کر چلو

راہوں میں سب ہیں، تم بھی ہو دشمن بھی دوست بھی
کس کی طرف ہے روئے سخن، دیکھ کر چلو

دھندلاؤ اس قدر تو نہ آنکھوں کی مشعلیں
کچھ کہہ رہا ہے دورِ فتن، دیکھ کر چلو

اوروں کی سمت دیکھ کے چلنا ہے گمرہی
اپنی طرف رجالِ وطن دیکھ کر چلو

چہروں کی برہمی کو ذرا آئینہ دکھاؤ
ماتھوں کی اپنے تازہ شکن دیکھ کر چلو

ہیں راہِ میکدہ میں مئے نو کی بارشیں
اے خوگرانِ جامِ کہن، دیکھ کر چلو

وابستگی تمہیں بھی کئی خرمنوں سے ہے
سینوں کی آگ، دل کی جلن دیکھ کر چلو

اعجاز کچھ تو وقت کی سمجھو نزاکتیں!
تم اور یہ بیانِ سخن، دیکھ کر چلو!

از (صبا، حیدرآباد)
شاعر بمبئی

محرکات —

انسانیت کے نام پر ۔۔۔۔

بے گناہوں کی روحیں چیخ رہی ہیں،
معصوموں کی دردناک آوازیں فضا میں گونج رہی ہیں،
مجبور دوشیزاؤں کی عصمت دُہائی دے رہی ہے،
بیواؤں اور یتیموں کی گریہ وزاری کی صدائیں مسلسل چلی آرہی ہیں۔
آگ — خون
قتل و غارت گری، لوٹ مار، غنڈہ گردی!
فرقہ پرستی کے بھوتوں نے ایک بار پھر سفاکی اور بہیمیت کا رقص شروع کر دیا اپنے دانتوں میں بے گناہ انسانوں کو جکڑ لیا،
اپنی شعلہ باریوں سے لہلہاتے کھیتوں اور مہکتے باغوں کو ویرانوں میں تبدیل کر دیا۔ اپنی بھنبوڑی ہوئی لاشوں سے کوچے پاٹ دئے۔
کوچہ و بازار بھر دئے۔ انسانوں کے تڑپنے اور دم توڑنے کا تماشا ہنس ہنس کر دیکھا گیا۔
رام اور رحیم کے جھوٹے نام لیوا، مذہب کی آڑ لیکر ایک بار پھر درندگی پر اُتر آئے۔
گوتم، کرشن، محمدؐ اور نانک سے رشتہ جوڑنے والے، ان بزرگوں کی تعلیمات بھول گئے۔
اور — ہنوز
اِس کھیل کا سلسلہ جاری ہے۔
کروڑوں عوام کے دل و دماغ پر خوف و ہراس طاری ہے۔
ہنوز — گلے سڑے سماج سے خطرناک جراثیم نکل کر صحت مند قدروں اور صالح عناصر کو اپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں۔
فضاؤں میں تھرتھراہٹ اور کپکپاہٹ باقی ہے۔
ہواؤں میں فرقہ پرستی کا زہر بھرا ہوا ہے بھڑکنے سلگ رہے ہیں، آتش فشاں اندر ہی اندر کھول رہے ہیں۔ کون جانے پھر کب یہ آگ
پھیل جائے۔ کھولتا ہوا لاوا چاروں طرف بہنے لگے؟
صرف — انسانیت کے نام پر،
خیر کے استحصال اور خیر کی سربلندی کے لئے،
ہم ہند و پاک کے ادیبوں کا سب سے بڑا، سب سے مقدس اور سب سے اہم فریضہ ہے کہ ناسمجھ عوام کے ذہنوں کو مزید گمراہیوں
سے بچائیں۔ ظلم و جور کے خلاف کھل کر آواز بلند کریں۔
اقتدار کی ہوس کا شکار عوام کیوں بنیں؟
سیاست کی چکی کے پاٹوں میں عوام کیوں پسیں؟
ہم قلمکار — وطن دشمنوں کو للکاریں۔ اخوت، محبت، ایکتا اور ہم آہنگی کے لئے ایکبار پھر اپنے قلموں کو حرکت دیں۔ فرقہ
پرستی کو ہوا دینے والے صحافیوں کا بائیکاٹ کریں۔ حق و صداقت کا ساتھ دیں۔
دونوں ملکوں کو "تاریخی تباہی و بدنامی" سے بچائیں۔
ایکبار پھر اپنی تخلیقات میں صلح و آشتی اور امن و سکون کے مقدس جذبات بھر دیں۔ انسانیت زندہ باد!
شاملین:
[signatures] — صدیقی — [signature]

ڈاکٹر ابو محمد سحر

امیر مینائی کی طویل عاشقانہ مثنوی

امیر مینائی کی زندگی میں اُنکی صرف دو مذہبی مثنویاں۔ نورِ تجلی اور ابرِ کرم شائع ہوئی تھیں لیکن انہوں نے کئی اور مثنویاں[1] لکھی تھیں جن میں ایک طویل عاشقانہ مثنوی بھی ہے۔ یہ مثنوی سحر البیان کی بحر میں ساڑھے تین ہزار سے زیادہ اشعار کی مثنوی ہے۔ ممتاز علی آہ نے اس کے بارے میں لکھا ہے۔

"ایک دن میں نے اِسکے چھپوا دینے کے لئے اصرار کیا۔ فرمایا نوجوانی میں کہی تھی۔ اِن دنوں عربی فارسی کے الفاظ زبان پر زیادہ چڑھے ہوئے تھے جو مثنوی کی زبان پر نہیں پھبتے۔ تمہیں کوئی وقت نکالو تو روزانہ کچھ اشعار اس کے سُن لیا کریں۔ ایسے الفاظ بدل جائیں تو پھر چھپوا دینے کا مضائقہ نہیں مگر اِس کام کی نوبت نہ آئی۔ چند روز بعد میں رامپور سے چلا آیا" [2]

اس مثنوی کا قلمی نسخہ جس کے کاتب امیر مینائی کے مُرید اور شاگرد مہدی علیخاں ہیں۔ اسرائیل احمد مینائی نبیرۂ امیر کے پاس کراچی میں موجود ہے۔ کریم الدین احمد نے ایک مختصر تعارف کے ساتھ اُسے "اُردو" کراچی بابت جولائی اکتوبر ۱۹۶۰ء میں شائع کرادیا ہے۔ اس مثنوی کے قلمی نسخے سے پتہ چلتا ہے کہ اسکی نظرثانی اور اصلاح کا کام امیر نے شروع کردیا تھا۔ لیکن یہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ اور مثنوی نامکمل رہ گئی۔ سببِ تالیف میں امیر نے جو اشعار کہے ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی نواب کلبِ علیخاں کے عہد میں لکھی گئی تھی۔ کریم الدین احمد نے ایک مصرعے

مرقع ہے یہ مثنوی دلپذیر

سے اس کا سالِ تصنیف ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مطبوعہ مثنوی میں اس مصرعے کا کہیں پتہ نہیں۔ آخری مصرع ضرور حسبِ ذیل ہے۔

مرقع ہے یہ مثنوی والسّلام

لیکن اس سے مذکورہ بالا سال برآمد نہیں ہوتا۔ سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ اس مصرعے یا مثنوی کے کسی اور مصرعے کے نزدیک یا دُور ایسا کوئی اشارہ موجود نہیں ہے جس کی روشنی میں تاریخ نکالنے کی کوشش کی جائے۔

ممتاز علی آہ نے اس مثنوی کے متعلق جو گفتگو قلمبند کی ہے وہ ۱۸۶۲ء کی ہے۔ کیونکہ اسی سال کے آخر میں وہ رامپور سے وطن چلے گئے تھے[3]۔ اُن کے بیان کے مطابق اس وقت امیر نے اس کو نوجوانی کی تصنیف بتایا تھا۔ امیر اکتیس بتیس سال کی عمر

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھیے راقم الحروف کا مضمون امیر مینائی کی مثنویاں مطبوعہ "قومی زبان" کراچی۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء

[2] امیر مینائی از ممتاز علی آہ ص ۲۹۳ و ص ۲۹۴

[3] ملاحظہ ہو مثنوی یادِ اسلام۔ از ممتاز علی آہ۔ مقدمہ از مُعجز سبزواری ص

شاعر بمبئی۔

پدا ہوئے تھے۔ نوجوانی کا زمانہ اس سے پہلے قرار پاتا ہے۔ جوانی کے زمانے میں البتہ زیادہ وسعت ہے۔ ممکن ہے امیر
نی کے بجائے جوانی کا لفظ استعمال کیا ہو یا کچھ اور کہا ہو۔ لیکن ممتاز علی آہ کے بیان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ
یں مثنوی کو کہے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ اس کی کم سے کم مدت پندرہ سال متعین کی جا سکتی ہے۔ مثنوی کے
لیف میں امیر نے امراء کے ساتھ اس کو نواب کلب علیخان کے عہد کی تصنیف بتایا ہے جس کی ابتدا ۱۲۸۱ھ مطابق
سے ہوتی ہے۔ انھوں نے اس کے لکھنے کا بیڑا اس عہد میں ایک بڑا اشعری کارنامہ سرانجام کرنے کے ارادے سے اٹھایا تھا۔

ہوا شکر منعم جو واجب مجھے تو سوجھی یہی رائے صائب مجھے
کہ ہو اس زمانے میں مجھ سے یہ کام رہے حشر تک جس سے مالک کا نام

وی کارنامۂ عشرت مصنفہ ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) کے سبب تالیف میں امیر نے یہ ظاہر کیا ہے کہ کارنامۂ عشرت سے پہلے انہوں
مثنوی کا نہیں لکھی۔ ممکن ہے مثنوی کبوترنامہ کو جو انہوں نے ۱۸۵۷ء سے پہلے واجد علی شاہ کے کبوتروں کی تعریف میں لکھی تھی
تر سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہو لیکن ساڑھے تین ہزار سے زائد کی مثنوی اگر انہوں نے کارنامۂ عشرت سے پہلے لکھی ہوتی تو اس سے
نہ کر سکتے تھے۔ ان تمام شواہد کی روشنی میں اس مثنوی کے زمانۂ تصنیف کے متعلق زیادہ سے زیادہ صرف اسقدر تخمین کی
ہے کہ یہ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان لکھی گئی اور بہت ممکن ہے۔ عام صورت میں بھی اسے سرانجام کرنے میں ایک سال
یادہ عرصہ لگا ہو۔

مثنوی عاشقانہ میں امیر نے ماہ پیکر و زہرہ جبیں کی داستانِ عشق نظم کی ہے۔ ممکن ہے انہوں نے جابجا ذاتی ترک و
سے کام لیا ہو لیکن بحیثیت مجموعی اس مثنوی کا قصہ مستعار ہے۔ امیر نے سبب تالیف میں اسکی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

ملا ایک افسانۂ دلنشیں ہے غارتِ فکر ہے جو نگیں
کہا دل نے ہو نظم اب مثنوی حقیقت میں ہوگی عجب مثنوی

اس مثنوی میں امیر نے حمد، نعت، مدح حاکم اور سبب تالیف نظم کرنے کے بعد داستان کی تمہید کے طور پر نیرنگئ عشق
ن کیا ہے۔ یہ روش بھی اردو کی عشقیہ مثنویوں میں پائی جاتی ہے۔ پہلے شعر میں جذبۂ عشق کی ہمہ گیری کا ذکر دیکھیے۔

محیطِ زمین و زماں عشق ہے زمیں عشق ہے آسماں عشق ہے

مثنوی کا قصہ بہت طویل ہے۔ امیر نے اس کے بعض اجزاء میں ترمیم و اضافہ بھی آئندہ پر اٹھا رکھا تھا[۱] اسلئے قصہ کے تمام
یت کو یہاں دہرانا غیر ضروری طوالت کا باعث ہے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ ماہ پیکر ملک اختر نگر کے بادشاہ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ زہرہ
شہر الفت آباد کے بادشاہ جہاں شاہ کی بیٹی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو خواب میں دیکھ کر عاشق ہو جاتے ہیں۔ اور ایک
ے کی تلاش میں تن تنہا نکل پڑتے ہیں۔ شہزادہ ماہ پیکر دشتِ غربت کی خاک چھانتے چھانتے ایک مرد فقیر شاہ
ن ضمیر کی خدمت میں پہنچتا ہے۔ وہاں شاہ صاحب کی ایک عقیدت مند اور کوہ قاف شمالی کی فرمانروا گلشن پری اس
فریفتہ ہو جاتی ہے۔ اس کی وزیر زادی گل رخ پری تاجر کا بھیس بدل کر دونوں میں ملاقات کی صورت نکالتی ہے۔
ن پری ماہ پیکر سے محبت کا اظہار کرتی ہے۔ اور وہ اپنی محبوبہ کی جستجو کا حال سناتا ہے۔ گلشن پری ماہ پیکر کو قاف شمالی
جاتی ہے۔ وہاں ماہ پیکر کے بیان کردہ سراپا کے مطابق ایک مصور سے اسکی محبوبہ کی تصویر تیار کراتی ہے اور اس کو ایک

۱۔ ملاحظہ ہو دیباچہ مرتبہ: امیر مینائی کی ایک غیر مطبوعہ عاشقانہ مثنوی۔ اردو، کراچی۔ جولائی، اکتوبر ۱۹۶۰ء

پری زاد کو دے کر محبوبہ کی تلاش پر مامور کرتی ہے۔ لیکن اس دوران میں اچانک ایک نامہ بر قافِ جنوبی سے گلشن پری کی
خالہ کی علالت کی خبر لاتا ہے اور وہ اُدھر روانہ ہو جاتی ہے۔
شہزادی زہرہ جبیں دریا کے راستے سے ایک کشتی پر مردانہ بھیس بدل کر محل سے فرار ہوئی تھی۔ طوفان میں بھنس
کے بعد بمشکل ایک دن اسکی کشتی دریا کے کنارے لگتی ہے۔ ایک فقیر تکیہ دار اس کو اپنا مہمان بناتا ہے لیکن وہ اُس کو بے ہوش
کر کے اس کے اسباب اتار کر بھاگ جاتا ہے۔ زہرہ جبیں جب ہوش میں آتی ہے تو تکیہ میں سے ایک مقتول عورت کی لاش
ملتی ہے۔ اچانک وہاں کوتوال آجاتا ہے اور زہرہ جبیں کو قاتل سمجھ کر قید کر لیتا ہے۔ قید خانے میں جب کوتوال کے لڑکے
کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرد نہیں عورت ہے تو زہرہ جبیں سے وصل کی خواہش کرتا ہے۔ زہرہ جبیں اس کو فریب دے ایک زا
مریم لقا کے پاس پہنچتی ہے اور اس کی مہمان ہوتی ہے۔
قافِ جنوبی میں گلشن پری کو شہزادے کی گمشدگی کی خبر ملتی ہے۔ وہ عجلت میں قریب کا ایک پُرخطر راستہ اخ
کرتی ہے۔ اس کی کشتی تباہ ہو جاتی ہے اور وہ تختہ پر بہتی ہوئی بے ہوشی کے عالم میں مریم لقا کے مسکن پر پہنچتی ہے۔ ماہ
جبین پری کا چہرہ جو مریم لقا کے پاس رہتی تھی اس کو مردہ سمجھ کر فریاد و ماتم کرنے لگتی ہے لیکن مریم لقا کی دعا اور تدبیر سے اس
ہوش آجاتا ہے۔ گلشن پری اور زہرہ جبیں میں ربط و اخلاص ہوتا ہے۔ گلشن پری زہرہ جبیں کی کنیزگی میں داخل ہو
اُس کو اپنی داستان سُناتی ہے اور زہرہ شہزادے کا حال سنکر بے قرار ہوتی ہے۔
اُدھر شہزادہ ماہ پیکر ایک ہرن کا تعاقب کرتے کرتے سمندر میں جا گرا تھا۔ حسن اتفاق سے وہ بھی ایک تختے پر بہتا
عالمِ بے ہوشی میں مقامِ مریم لقا تک جا پہنچتا ہے۔ مریم لقا اُسے بھی ہوش میں لاتی ہے اور ایک محل میں مہمان کرتی ہے۔ مر
کی تحریک پر ماہ پیکر اور زہرہ جبیں کی شادی ہوتی ہے۔ آرسی مصحف میں دونوں ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ شادی
بعد دونوں اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوتے ہیں۔ پہلے زہرہ جبیں کے ماں باپ سے ملاقات ہوتی ہے۔ ماہ پیکر کے باپ خاور
کو ایک حاکمِ سرکش سہراب شاہ نے محصور کر رکھا تھا۔ ماہ پیکر اس... کو شکست دے کر اپنے والدین سے ملاقات کرتا ہے
خاور شاہ تخت و تاج ماہ پیکر کو سونپ دیتا ہے اور اس طرح قصہ تمام ہوتا ہے۔
مثنوی عاشقانہ کے قصے میں مافوق الفطری عنصر کی آمیزش سے لے کر واقعات کی تشکیل و ترتیب تک وہ تمام باتی
موجود ہیں۔ جو پرانی داستانوں میں پائی جاتی ہیں۔ ضمنی طور پر اس میں نجومیوں کی پیشین گوئی، دختِ وزیر کی فراست، ہیرو
ہیروئن کا سراپا اور ہجر کی بے قراری وغیرہ بھی جن کے ذکر سے عشقیہ مثنویوں میں عموماً جان ڈالی گئی ہے موجود ہیں۔ الگ ا
بعض حصے بہت اچھے ہیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے اس مثنوی کے قصے میں دلچسپی کا عنصر کم ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ
کے مختلف اجزا میں بڑی یکسانیت ہے۔ ماہ پیکر، زہرہ جبیں اور گلشن پری کو جو واقعات پیش آتے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ
ایک سے ہیں بلکہ امیر نے اُن کو ایک ہی طرح بیان کیا ہے۔ ماہ جبیں و ماہ پیکر دونوں ایک ہی طرح عشق میں مبتلا ہوتے ہیں
ہی طرح بیقرارِ محبت اور آوارۂ دشت ہوتے ہیں۔ دونوں ایک ہی طرح فقرا تک پہنچتے ہیں۔ زہرہ جبیں اور گلشن پری
بیقراریِ عشق میں کوئی فرق نہیں نظر نہیں آتا۔ ماہ پیکر اور گلشن پری مقامِ مریم لقا تک ایک ہی طرح پہنچتے ہیں اور دونوں کے
پر ایک ہی طرح کی باتیں بھی ہوتی ہیں۔
اسی طرح کرداروں کی امتیازی خصوصیات پر بھی امیر نے نظر نہیں رکھی۔ گلشن پری ماہ پیکر کے عشق میں مبتلا
ماہ پیکر اس سے خلوص رکھتا تھا لیکن عاشق زہرہ جبیں کا تھا۔ مگر امیر گلشن پری کے قاف جنوبی کو جاتے ہوئے جو
دونوں کی رخصت کا حال لکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں۔ شاہ روشن

در خاتون مریم لقا میں سوائے مرد اور عورت کے کوئی فرق نہیں دکھائی دیتا۔ جو بُرج اور چبوترہ روشن منیر کے یہاں ہے وہی خاتون مریم لقا کے یہاں بھی ہے۔ امیر کے یہاں ہر باغ باغِ جنت اور ہر قصر قصرِ جناں ہے۔ اُنہوں نے گلشن پری کی وزیر زادی گل رُخ پری سے فہم و فراست سے کچھ کام لیا ہے۔ لیکن زہرہ جبیں کی وزیر زادی ابتدا میں زہرہ جبیں سے محض اس کے دل کا حال سُننے کی غمگسار ہوتی ہے کہیں سے نہ اس کا کردار اُبھرتا ہے۔ اور نہ قصے میں مدد ملتی ہے۔

قصہ نگاری کا ایک بڑا گُر یہ ہے کہ پڑھنے والے پر انجام سے پہلے انجام پُوری طرح آشکار نہ ہو۔ اس کے بغیر قصے سے قاری کی دلچسپی باقی نہیں رہ سکتی۔ امیر نے شہزادہ ماہ پیکر کے گرفتارِ عشق ہونے کے بعد قصے میں نجومیوں کو داخل کیا ہے۔ ان کی پیش گوئی ملاحظہ ہو۔

غرض سوچ کر زائچے کھینچ کر — ستاروں کی گردش پہ کر کے نظر
کہا شاہ سے سب نے بالاتفاق — کہ اس چاند کو ہوگا چندے محاق
مگر کوئی اس کو نہیں ہے گزند — پھرے گا سوئے خانہ ہو کر دو چند
ستارہ ہے گردش میں بس چند روز — رہے گا یہ غربت میں رونق فروز
مبارک ہے پر اُسکے حق میں وہ سیر — کہ انجام ہے ہر طرح سے بخیر

اس طرح آغاز میں انجام کی خبر دینے کے بعد اُنہوں نے کوئی طریقہ ایسا نہیں اختیار کیا جس سے تعویق کا عنصر پیدا ہو سکتا بلکہ وہ تو بار بار یہی خبر دیتے جاتے ہیں کہ انجام بخیر ہوگا۔ جب گلشن پری ماہ پیکر کو اپنے ہمراہ لیجانا چاہتی ہے اور ماہ پیکر شاہ روشن منیر سے اُس کا ذکر کرتا ہے تو شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

کہ اللہ حافظ ہے جاؤ ضرور — طریقِ ظفر ہے یہی راہِ دُور
مشقت نہ ضائع کبھی جائیگی — یہی راہ منزل پہ پہنچائے گی

ان کمزوریوں کی وجہ سے اس مثنوی میں قصہ پن اور اُس کی دلچسپی کو جگہ جگہ نقصان پہنچا ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ مثنوی عیوب سے خالی نہیں۔ عربی و فارسی کے ایسے الفاظ و تراکیب کی موجودگی کا احساس جو مثنوی کی زبان پر نہیں پھبتے امیر کو خود بھی تھا۔ چنانچہ مثنوی میں ان کی بہتات ہے۔

چمک برق میں تیر گی میغ میں — مسکم قصۂ گردن تیغ میں
وہ اسبابِ شاہی وہ مُلکِ وسیع — وہ دولت وہ حشمت وہ قدرِ رفیع

ع گیا اس پہ مردانہ بہر فتوح — ع توقع کہ شاید ہو مشکل فتوح
ع رُخص ہوا شاد رہنے لگا — ع عجب گردش چرخ گردندہ ہے
ع مفاتیح نار و جناں اس کے ساتھ — ع صحیمین دونوں لبِ رفشاں
ع معاند تھے جو پائے قابوئے وقت

مثنوی سحر البیان کا شعر ہے۔

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن — جوانی کی راتیں مُرادوں کے دن

اس کا چربہ مثنوی میں امیر نے کئی جگہ اُتارا ہے۔ زہرہ جبیں کے سراپا میں کہتے ہیں۔

عجب حسن بارہ برس کا وہ سن — غضب ابھی کونپل مرادوں کے دن

آگے چل کے گلشن پری کے لئے کہتے ہیں۔

جوانی کی آمد لڑکپن کا سن — قیامت کا جوبن مُرادوں کے دن

زہرہ جبیں ہی کے بیان میں ایک اور موقع پر یہ شعر ملتا ہے۔

یہ وحشت یہ غفلت یہ جوبن یہ سن — یہ آفت جوانی مرادوں کے دن

مثنوی سحر البیان میں بے نظیر کی سواری کے ذکر میں ایک شعر ہے۔

غرض اس طرح سے سواری چلی — کہے تو کہ بادِ بہاری چلی

امیر نے حمام سے شاہ روشن ضمیر کے پاس ماہ پیکر کے پہنچنے کے بیان میں اس شعر کو یوں اپنانے کی کوشش کی ہے۔

عجب تمکنت سے سواری چلی — کہے تو کہ بادِ بہاری چلی

مثنوی سحر البیان کا ایک اور مشہور شعر ہے۔

درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ — وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ

امیر پر اس کا اثر بھی پڑا ہے۔

عجب رنگ دکھیا عجب اس کا روپ — درختوں کا سایہ وہ روشن کہ دھوپ

اس کے علاوہ اس مثنوی میں کاواک بیانی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

چھپانے کوئی مہرِ روشن کو کیا — بھلا آرسی ہاتھ کنگن کو کیا
قضارا جگر گوشۂ کوتوال — کہ فرزند اس کا تھا وہ بدمآل

پہلے شعر کا دوسرا مصرع "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں "اس" کا اشارہ کوتوال کی طرف ہے لیکن پہلے مصرعے میں "جگر گوشۂ کوتوال" کی ترکیب کی وجہ سے اس کا الجھاؤ نمایاں ہے۔

اندازِ بیان کی سستی اور ہلکے پن، اور معنوی اغلاط سے بھی یہ مثنوی پاک نہیں ہے۔

جری ہو جری یا وفا کیوں نہ ہو — مرے شیر کہنا ہے کیا کیوں نہ ہو
ٹپکتا ہے جھوا چلو میکشو — یہ چاندی کے ہیں پھول لو میکشو
کیا عیش میں ایک ہفتہ بسر — بنارس کی تھی شام اودھ کی سحر

اس قسم کی مثالوں سے امیر کی استادی وکمال پر حرف نہیں آتا۔ ان سے زیادہ ان کمزوریوں کو کون سمجھ سکتا تھا۔ ان سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ امیر اس مثنوی کو ایک بار شروع سے آخر تک کہتے چلے گئے تھے۔ زبان وبیان کی صحت و فصاحت کا انہوں نے ہر جگہ لحاظ نہ رکھا تھا۔ سلسلۂ کلام کی مناسبت سے جہاں جو شعر ذہن میں آگیا تھا۔ اس کو آئندہ ترمیم واصلاح کے خیال سے بجنسہٖ لکھ لیا تھا لیکن اس کی نوبت نہ آئی۔ یہی وجہ ہے کہ امیر نے اپنی زندگی میں اس مثنوی کو شائع کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔

اس مثنوی میں کچھ خامیاں ایسی ہیں۔ جن کو امیر کو دور کرنے کا موقع نہ ملا اور کچھ ایسی ہیں جنہیں شاید وہ دور نہ کر سکتے تھے۔ مجموعی طور پر یہ ان کا ایک ادھورا اور ناقص کام ہے لیکن اس مثنوی میں جستہ جستہ مثنوی نگاری کے بعض اہم محاسن پائے جاتے ہیں۔ قصے کے کچھ ٹکڑوں کو انہوں نے بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ مثنوی میر حسن کے طرز پر اس مثنوی میں سراپا نگاری، جذبات نگاری، جشن اور باغ وغیرہ کے بیان کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ جابجا تسلسل وروانی، زبان کی صفائی، بول چال، محاورات، ضرب الامثال اور تشبیہات واستعارات کے قابلِ قدر نمونے بھی موجود ہیں۔

قصہ پن کے اعتبار سے اس مثنوی کا کامیاب ترین حصہ وہ ہے۔ جہاں گلشن پری کی وزیر زادی گل رخ پری کا ستارہ گر شاعر بنی

میں اپنی چالاکی سے شہزادہ ماہ پیکر کو رام کرتی ہے۔

دمِ صبح جس وقت شہبازِ مہر ہوا واردِ صید گاہِ سپہر!
بنی شکل تاجِ سرِ گل رخ پری رہی گھات میں بہرِ افسوں گری
لیا باز اک خوبصورت سا ساتھ کہ بازی کسی طرح آ جائے ہاتھ
ہوا شاہزادے کا جب واں گزر بندھی چت صید افگنی پر کمر
لیا یک کلنگ ایک آیا نظر ہوا ملتفت شاہزادہ اُدھر
اشارہ کیا اپنے شہباز کو کہ ہاں کھول دے بال پرواز کو
چھپی تھی جو گل رُخ پری آڑ میں وہیں اک طرف جھاڑ جھنکاڑ میں
یہ موقع جو دیکھا ہوئی شادماں اشارہ کیا باز سے اپنے ہاں
خبردار جانے نہ پائے شکار نہ شہباز کے ہاتھ آئے شکار
وہ چوکا یہ پہنچا سرِ صید پر کہ تھا باز شہباز سے تیز تر
خطا کر گیا شاہبازِ جری سبق لے گیا بازِ گل رُخ پری
غضب سے ہوا لال وہ مہر وش وہ غصہ وہ گرمی کہ آ جائے غش
نکالا وہ سب غصہ شہباز پر چھری پھیر دی نوچ کر اس کے پر

شہزادی زہرہ جبیں کے سراپا میں کہتے ہیں۔

یہ غارتگری میں دل آزار وہ گات جسے دل کے لینے کی معلوم گھات
وہ جوبن کے مد میں بہکتی ہوئی سراپا سے مستی ٹپکتی ہوئی

مثنوی میں جذبات نگاری کے موقعے جابجا آئے ہیں۔ ان میں شہزادہ اور شہزادی کے گم ہونے پر اُن کے والدین کا رنج و غم، شہزادہ شہزادی اور گلشن پری کی بیقراریٔ عشق اور دشتِ غربت میں عشاق کی حالتِ زار خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ زہرہ جبیں کی کشتیٔ طوفان و تلاطم میں پھنسی ہوئی ہے۔ اُس وقت اُس کی جذباتی اور نفسیاتی کیفیات کی ترجمانی ملاحظہ فرمائیے۔

یہ دریا ہے اب اور میں ناتواں خدا مجھ کو لے جائے چاہے جہاں
تلاطم سے ڈرتا تھا جب تو تنِ دل یہ روتی تھی ہوتا تھا دریا خجل
وہ مانوس صورت جو تھی دھیان میں توشتا تھا ڈر آن کی آن میں
مخاطب کبھی کر کے دلدار کو دل آرام کو خاطر آزار کو
یہ کہتی تھی اے میرے آرامِ جاں میں اب ڈھونڈھنے تجھ کو جاؤں کہاں
نہیں جان بچنے کی اُمید اب لبِ بام پہنچا ہے خورشید اب
اگر میرے مرنے کی پائے خبر نہ کرنا خدا کے لئے چشم تر
ملوں خاک میں میں تو پروا نہیں مگر رنج تیرا گوارا نہیں
نہیں کوئی صورت ملاقات کی شکایت کروں تجھ سے کس بات کی
نہ نام اپنا تو نے بتایا مجھے نہ اپنا ٹھکانا جتایا مجھے

شہزادہ ماہ پیکر کے عشق میں گلشن پری کی بیقراری کا بیان دیکھئے۔

عجب دل میں پیدا ہوا اضطراب — نہ آرام دن کو نہ راتوں کو خواب
حذر درد پنہاں کے اظہار سے — کبھی کی بھی باتیں تو دیوار سے
عجب نشۂ عشق کا جوش تھا — کہ ہر شغل خواب فراموش تھا

اس مثنوی کے آخری حصے میں سہراب شاہ اور ماہ پیکر کی معرکہ آرائی بیان کی گئی ہے اگرچہ قصے میں یہ ایک میدانہ معلوم ہوتی ہے لیکن رزمیہ نگاری کے حسن کی بدولت مثنوی کا یہ حصہ بجائے خود اہمیت کا مالک بن گیا ہے۔ اس حصے میں امیر نے فوجوں کی تیاری، جنگ کی حکمت عملی، ماہ پیکر اور سہراب شاہ کے مقابلے اور سہراب شاہ کے قتل کے بعد دونوں فوجوں میں گھمسان کے رن وغیرہ کے بیان میں جنگ کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ موخر الذکر کے چند متفرق اشعار دیکھئے۔

جو دیکھا یہ فوج مخالف کا زور — کیا سب نے برپا قیامت کا شور
گری اسپ وہ فوج اکبارگی — کہ تھی بندگی اور بیچارگی
ہوئے اسقدر دونوں لشکر بہم — کہ ایک اپنے بیگانے تھے یک قلم
ہوا لے زدوگیر چلنے لگی — قیامت کی شمشیر چلنے لگی
شکستہ ہوئی فوج سہراب شاہ — لگی بھاگنے ان میں اکثر سپاہ
فراری تھی میدان میں یوں رواں — ہوا جیسے صرصر سے برگ خزاں

تسلسل بیان، روانی اور زبان کی صفائی کا اندازہ بھی ان اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے۔ ماہ پیکر کو دیکھنے کے بعد شاہ روشن ضمیر سے گلشن پری کی گفتگو میں بول چال کا لطف دیکھئے۔

نئی بات علت سے خالی نہیں — وہ کیا ہے جو حضرت پہ حالی نہیں
یہ کیا بات ہے صاف تبلائیے — یہ کیا راز ہے کچھ تو فرمائیے

محاورہ اور ضرب المثل کا استعمال ملاحظہ ہو۔

سمجھتی ہوں نیرنگ دنیا کے میں — کہ گنتی ہوں پر اڑتی چڑیا کے میں
الٰہی یہ سہرا کہیں سر چڑھے — وہی پھول ہے جو مہیسر چڑھے

تشبیہات بھی ندرت، لطافت یا معنویت سے بھرپور ہیں۔ شہزادہ ماہ پیکر کے پہاڑ پر چڑھنے کے بیان میں کہتے ہیں۔

بلندی پہ چڑھنے لگا بے درنگ — چڑھے جس طرح سے ہوا پر پتنگ

زہرہ جبیں کے ترک وطن کے ذکر میں کہتے ہیں۔

چلی یوں وطن سے بحال سقیم — چمن چھوڑ کر جیسے گل کی شمیم

کوتوال کے لڑکے کے ساتھ زہرہ جبیں کی روانگی کی تشبیہ ملاحظہ ہو۔

چلا ساتھ لے کر اسے اسطرح — کہ زنبور پھولوں کا رس جسطرح

امیر نے اپنی مثنویوں میں صنعتوں کا التزام زیادہ نہیں کیا ہے۔ اس مثنوی میں بھی یہ عنصر بہت کم ہے تاہم ایسے شعر مل جاتے ہیں۔

عجب میری جاتی کی کرتی ہے چال — پھنسے مرغ زیرک نہ یہ کیا مجال
بندھے اس کے بازو پہ وہ نورتن — کہ اکبر کے اصغر ہوئے نورتن

(بقیہ صفحہ ۲۸ پر دیکھئے)

جمیل الرحمن زخمی

اُردو شاعری کے جدید میلانات

شعر و ادب میں کوئی میلان یا رجحان یکایک داخل نہیں ہوتا۔ میلان کی تعمیر اور اسکی تعیین روایتوں کے تسلسل سے متعلق ہے۔ روایتیں عرصے تک پرورش پاتی ہیں اور ان میں امتداد زمانہ کی وجہ سے ایک طرح کی کلاسیکیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اسکے مقابلے میں جب نسبتاً جدید تصوّرات عمومی طور پر آنے لگتے ہیں تو میلان کی تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ اُردو شاعری میں جو جدید میلانات نظر آتے ہیں وہ بھی دراصل ماضی کے روایتی سرچشموں سے متعلق ہیں۔ حال کی جڑیں ہمیشہ ماضی میں پیوست رہتی ہیں یوں تو اقبال نے کہا ہے کہ ؎

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک   دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

لیکن اسکے باوجود ہمیشہ کچھ نئی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو پُرانی چیزوں سے مختلف اور متاثر ہوتی ہیں۔ یہی صورتِ حال شعر و ادب کے ساتھ بھی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جدید کی تخلیق قدیم کے عناصر میں تغیّر و تبدّل کے بعد ہی ظہور پذیر ہوتی ہے۔

جب ہم اُردو شاعری کے رجحانات پر غور کرتے ہیں۔ تو ہمیں بھی کچھ ایسے عناصر ضرور ملتے ہیں جو اُسے جدید اور قدیم کے دو خانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اُردو شاعری ابتداء میں ایک نقالی سے شروع ہوئی۔ مگر ہمارے ابتدائی دور کے شعراء میں نقل کی اتنی اچھی صلاحیت ضرور تھی کہ انہوں نے نقل کو اصل کے قریب کر دیا۔ اُردو شاعری براہِ راست فارسی شاعری سے متاثر اور مستفید ہوتی رہی۔ یہ استفادہ کہیں کہیں بھونڈی شکل میں بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً دورِ اوّل کے کچھ شعراء نے صرف فارسی شعروں کا ترجمہ ہی پیش کرنے پر اکتفا کیا۔ اور وہ اپنے ترجموں کو اپنی تخلیق اور اپنی اُپج سمجھنے لگے۔ ترجمہ کا رجحان اُردو شاعری میں عرصے تک رہا۔ اور بڑے بڑے مستند شعراء نے بھی فارسی شعر کا بجنسہٖ ترجمہ پیش کر کے اُردو شاعری کو تقلید کی لعنت میں اسیر رکھا۔ مثلاً فارسی کا یہ شعر کہ ؎

عام حکم شراب می خواہم   محتسب را کباب می خواہم

کو میر جیسے عظیم المرتبت شاعر نے بھی تھوڑی سی تبدیلی کر کے اپنا شعر بنا لیا۔ میر کہتے ہیں ؎

عام حکم شراب کرتا ہوں   محتسب کو کباب کرتا ہوں

بہرکیف ترجمانی اثر اُردو شاعری پر طویل عرصے تک رہا۔ لیکن اسکے ساتھ ساتھ ہمارے شعراء اپنے دل و دماغ سے بھی کام لینے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمانی دور میں بھی ہمیں اُردو شاعری کا ایسا خزانہ مل جاتا ہے جس میں ہماری بہت سی چیزیں مایۂ ناز ہیں۔ اُردو شاعری اپنے ضلعوں میں مختلف روایاتی سرچشموں اور ان کے تدریجی ارتقاء کو لیکر آگے بڑھتی ہوئی جب دورِ جدید میں داخل ہوتی ہے۔ تو ہم اس میں بعض اہم جدید میلانات دیکھتے ہیں۔ یہ ایسے میلانات ہیں جو کم و بیش دنیا کی دوسری مہذب زبانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یعنی دورِ جدید میں آکر اُردو شاعری بعض آفاقی رجحانات میلانات سے متعارف ہوتی ہے۔ حقیقت پرستی، رومان طرازی، ہیئت پسندی، جدلیاتی ماہیت کا اظہار، اشتراکیت اور اشتمالیت جیسے نظریاتِ حیات کا تعارف، قومی وطنی اور سامراج دشمنی کے تصورات، سماجی معاشرتی اور اقتصادی میلانات کے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی ادبی تحریکات ہیں جو جدید اُردو شاعری میں اضافے کا سبب بنی ہیں۔

یوں تو ہر ارتقاء یافتہ زبان کی شاعری میں ایک پہلو قومی رجحانات کا ملتا ہے عرب کے دورِ جاہلیت کے شاعروں سے لیکر جدید اُردو شعراء فیض، ساحر، مخدوم محی الدین، سردار جعفری، اختر الایمان، راہی معصوم رضا، احسان دانش اور مجاز تک ہمیں قومی رجحانات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ لیکن دورِ جدید کی اُردو شاعری کا تجزیہ کرنے کے بعد ہمیں یہ نتیجہ ملتا ہے کہ اس دور میں ہمارے شعراء نے اس

جذبے کے اظہار میں بڑی شدت سے کام لیا ہے۔ قومی شاعری کی بھی بے شمار جہتیں ہیں۔ اپنی جائے پیدائش پر جان نثار کرنا، اپنے ہم وطنوں سے محبت، پریم اور آشتی قائم کرنا۔ اپنے ملک و وطن کے غلط عناصر سے برسرپیکار رہنا اور اپنے وطن کو سجا اور نکھار کر ایسں لائق بنا دینا کہ کنارِ آب رکنا باد اور گلگشتِ مصلّا بھی اُسکے آگے ہیچ ہو جائے ــــــ غرض کتنی ہی جہتیں ہیں جنہیں ہمارے شعرا نے نئے نئے انداز سے پیش کیا ہے۔

قومی شاعری کا احیا رحالی کی شاعری سے ہوتا ہے۔ حالی قوم و وطن کے تمام افراد میں یکجہتی اور اتفاق لانے کے خواہاں ہیں۔

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر ۔۔۔ نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو ۔۔۔ بودھ مذہب ہو یا کہ برہمو
جعفری ہوئے یا کہ ہو حنفی ۔۔۔ جین مت ہوئے یا ہو ویشنوی (مثنوی حبِ وطن)
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو ۔۔۔ سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد ۔۔۔ شہر ہیں اتفاق سے آزاد

حالی کے یہاں قومی یکجہتی کا جذبہ بڑے ہی شدومد کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ وہ جابجا اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ ملک کے افراد آپس میں ایک دوسرے کو بھائی بھائی نہیں سمجھتے۔ حالی کی شاعری قومی یکجہتی کے اعلان اور اپیل کی زندہ داستان ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

ایک ڈالی کے سب ہیں ثمر ۔۔۔ ہے کوئی ان میں خشک کوئی تر
سب کو ہے ایک اصل سے پیوند ۔۔۔ کوئی آزردہ ہے کوئی خرسند

شاد عظیم آبادی کے یہاں بھی ہمیں قومی رجحانات کا بڑا حسین اظہار ملتا ہے۔ ان کی مثنوی "مادرِ ہند" اس سلسلہ میں ایک اہم دستاویز ہے۔ ان کے مندرجۂ ذیل اشعار سے اُن کے حبِّ وطن کا اظہار ہوتا ہے۔ ہندوستان کی تعریف اور توصیف کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں ؎

عظمت میں کنشت سے فزوں تر ۔۔۔ خوبی میں بہشت سے فزوں تر
ہر گوشہ زمیں کا رشکِ گلشن ۔۔۔ جس نخل کو دیکھئے وہ چندن
بازار عدن وہاں کے رستے ۔۔۔ پانی کے عوض گہر برستے
جس پھول کو سونگھئے وہ خوشبو ۔۔۔ جس نخل کو دیکھئے وہ دلجو

چکبست کے کلام میں قومی رجحانات بڑے ہی صدیل انداز میں آتے ہیں۔ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے ہونیوالی جدوجہد میں اپنی شاعری کا سے بڑا کام لیا ہے۔ چکبست نے ہوم رول کی تحریک کو باضابطہ ایک موضوعِ سخن دیا اور اس سلسلے میں بہت سی چیزیں پیش کر دیں۔ ایک جگہ ہوم رول کی تحریک سے چکبست کی عقیدت اور اُن کے شدید جذبات و احساسات کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

پنہانے والے اگر بیڑیاں پنہائیں گے ۔۔۔ خوشی سے قید کے گوشے کو ہم سجائیں گے
جو سنتری درِ زنداں کے سو بھی جائیں گے ۔۔۔ یہ راگ گا کے انہیں نیند سے جگائیں گے

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے ۔۔۔ نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

چکبست کی نظمیں "کرشن کنہیا" "خاکِ ہند" "بال گنگا دھر تلک" "ہمارا وطن دل سے پیارا وطن" "سیرِ دہرہ دون" اور "کشمیر" اِن کی وطن پرستی کی زندہ تصویریں ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں کی شاعری کا بیشتر حصّہ وطن دوستی اور قوم نوازی کے لئے وقف رہا۔ "آزادی کا بگل" "دعوتِ عمل" "شعلۂ فانوسِ ہند" وغیرہ نظمیں اُن کے جذبے کی گرمی حرارت اور توانائی کو ظاہر کرتی ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

ذرّے میں گر تڑپ ہے تو اس خاکِ پاک سے ۔۔۔ سورج میں روشنی ہے تو اس آسماں سے ہے

اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ظفر علی خان ہندوستان کی محبت کو کتنی اہمیت دیتے تھے اسی طرح مولانا حسرت موہانی، علامہ اقبال، سیماب، جوش، حفیظ جالندھری، احسان دانش، علامہ جمیل مظہری اور فیض و ساحر کے یہاں بھی ہمیں قومی و وطنی شاعری مختلف جہتوں سے نظر آتی ہے۔

جدید ترین دور میں، شعرا نے وطن کی محبت، زمانے کے حادثات و الم، انقلاب کی تمنا نیز عشق و عاشقی کی داستانوں کو اسطرح ملا جلا کر پیش کیا ہے کہ قومی شاعری کا ایک نیا مزاج پیدا ہو گیا ہے۔ فیض، سردار جعفری، شعیب الرحمٰن وغیرہ شاعر بھی

ہے یہاں۔ یہ ایک مرحلہ کی [illegible] ہے۔

جدید رجحانات میں انقلاب کی تمنا بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ دراصل اُردو شاعری جدید دَور میں ایک ہیجانی دَور سے گزر رہی ہے۔ عالمی حادثات پے در پے تبدیلیوں اور کسی ایک مقرر و مستقل اور پُرسکون صورتِ حال کی تلاش نے اِس دَور کی شاعری میں انتشار طبیعت اور عدم استقلال کی کیفیت پیدا کر دی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دَور کے شعراء میں ہمیں مذہب سے گریز کے جذبات ملتے ہیں۔ اُردو شاعری نے اپنے ماضی میں مذہب کی پرورش و پرداخت اور اسکی ترقی و بقاء کے لئے جو کچھ کیا ہے اُسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن دَورِ جدید کی معاشی، اقتصادی، معاشرتی، تہذیبی بے اطمینانیوں نے ہمارے شعراء کو مذہب کی طرف سے بیگانہ ہی نہیں متنفر کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جوشؔ خدا کو گالی دے بیٹھے۔ مجازؔ کے یہاں مایوسی اور ناکامرانی سے پیدا ہونے والا عدم اعتماد پایا جاتا ہے۔ سردار جعفری اپنے مذہبی اور تہذیبی ورثے سے بیزار نظر آتے ہیں۔ غرض مجموعی اعتبار سے دَورِ جدید کے شعراء کے یہاں مذہب بیزاری کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ ن۔م۔ راشدؔ، جلیلؔ حشمی، یوسفؔ ظفرؔ، میراجیؔ، ساحرؔ، احسان دانشؔ، جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی، فیضؔ، اختر الایمان، خلیل الرحمٰن اعظمی، وغیرہ جدید شعراء میں سے ہم کسی کو بھی مذہب دوست شاعر نہیں کہہ سکتے۔

معاشی اور اقتصادی بدحالیوں اور عام بے اطمینانیوں نے ہمارے شعراء کو اشتراکیت اور اشتمالیت کے نظریاتِ حیات پیش کرنے پر مجبور کیا۔ جدید شاعری میں ہمیں کمیونزم اور سوشلزم کے نظریوں کا اجتماعی اور تشریحی بیان ملتا ہے۔ کہیں کہیں تو بالکل کھلے الفاظ میں ان نظریاتِ حیات کا خیر مقدم کیا گیا ہے۔ مگر ہمارے شعرا نے اِس سلسلہ میں زیادہ تر اشارے کنائے سے ———— ہمارے شعراء نے کچرے اور روئی کی بھی

کام لیا ہے۔ ————

اور بیروزگاری کا جو رونا رویا ہے اُسے ہم کلیتاً اشتراکی اور اشتمالی نظریات کی پیش کش پر محمول نہیں کر سکتے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں ایک عام بے اطمینانی کا اظہار سمجھنا چاہیے۔ فیضؔ کے یہاں یہ عام بے اطمینانی اور اسکے نتیجے میں انقلاب کی تمنا بڑے ہی گہرے انداز میں ملتی ہے۔ اُن کی نظمیں "چند روز اور مری جان" اور "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" اُن کے اِس خیال کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کرتی ہیں۔ اقتصادی مصیبتوں کی وجہ سے محبت کے جذبات سے گریز کی مثال ہمیں فیضؔ کے ان مصرعوں میں بڑی خوبی سے نظر آتی ہے ؎

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا — راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم — ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم — خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے — پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

لوٹ جاتی ہے اِدھر کو بھی نظر کیا کیجے

ساحرؔ نے اپنی نظم "کبھی کبھی" میں تقریباً انہیں جذبات و کیفیات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ ساحرؔ غموں کے شدائد سے محبت کا مفہوم بھی بھول جاتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

مگر یہ ہو نہ سکا اور اب یہ عالم ہے — کہ تو نہیں ترا غم تیری جستجو بھی نہیں
گذر رہی ہے کچھ اِس طرح زندگی جیسے — اِسے کسی کے سہارے کی آرزو بھی نہیں

محبت سے اجتناب کے پردے میں مایوسی و ناکامرانی کا یہ اظہار سردار جعفری کی نظم "انتظار نہ کر" میں بھی بڑے حُسن کے ساتھ کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

عذارِ نرم پہ رنگِ بہار رہنے دے
نگاہِ شوق میں برق و شرار رہنے دے
لبوں پہ خندۂ بے اختیار رہنے دے — متاعِ حُسن و جوانی کو سوگوار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

غرض اقتصادی بدحالیوں اور عالم انقلابات زمانہ کے ساتھ ساتھ عشق و عاشقی سے گریز کے جذبات نے بل ملا کر اردو شاعری کو ایک نئے مزاج ایک نئے تیور اور ایک نئی کیفیت سے روشناس اور متعارف کیا۔

پچھلے پچیس تیس برسوں سے اردو شاعری میں نفسی کیفیات کے تجزیے کا کام بڑے زور شور سے ہو رہا ہے اور اب تک اس سلسلے میں بیشمار چیزیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ساحر کی نظم "تاج محل" اور "ناکامی" اس ذمرے میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ نظم "ناکامی" کے مندرجۂ ذیل اشعار سے یہ اندازہ ہوگا کہ محبت کا جذبہ موجودہ عہد کی ناہمواریوں کے باوجود قطعی طور پر فنا نہیں کیا جا سکا ہے۔ لیکن جذبات محبت سے گریز اور معشوق کی طرف فطری لپک کی وجہ سے شاعر کے ذہن میں ایک کشاکش اور کھنچاؤ کی کیفیت اب تک قائم ہے، کہتے ہیں ؎

میں نے ہر چند غم عشق کو کھونا چاہا
غم الفت غم دنیا میں سمونا چاہا
وہی افسانے مری سمت رواں ہیں اب تک
وہی شعلے مرے سینے میں نہاں ہیں اب تک
وہی بے سود خلش ہے مرے سینے میں ہنوز
وہی بیکار تمنائیں جواں ہیں اب تک

ان اشعار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شعراء اپنے انقلاب آفریں نعروں کے باوجود اس دور میں بھی عشق کو فراموش نہیں کر سکے۔ اس ایک کھنچاؤ، ایک کشاکش اور ترک و انتخاب کی ایک الجھن ہے جو شاعر کے ذہن پر جاری و ساری رہتی ہے۔ نفسیاتی تجربے کے سلسلے میں ایک حصّہ ان شعراء کا ہے جنہوں نے جنسی کیفیتوں اور جنسی الجھنوں کا اظہار کیا۔ یہ اظہار کہیں کھلے لفظوں میں ملتا ہے۔ اور کہیں علاماتی انداز میں۔ اردو شاعری میں جنسیات نگاری کرتے ہوئے ہمارے شعراء نے علامات و اشارات سے جتنا کام لیا ہے۔ اتنا اور کسی شعبۂ نگارش میں نہیں لیا جا سکا ہے۔ میرا جی، یوسف ظفر اور ن م راشد علاماتی انداز میں جنسیات نگاری کرنے والوں کے سرخیل سمجھے جاتے ہیں۔ ان شعراء کی نظموں میں ہمیں موضوع، ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے تجدد اور ندرت ملتی ہے۔ مثلاً ن م راشد اپنی نظم "گناہ" میں جنسی خواہشوں کو مشخص کرتے ہوئے خالص علاماتی انداز میں کہتے ہیں۔

آج پھر آ ہی گیا ــــ
آج پھر روح پہ وہ چھا ہی گیا
دی مرے گھر پہ شکست آ کے مجھے
ہوش آیا تو میں دہلیز پہ افتادہ تھا
خاک آلودہ و افسردہ و غمگین و نزار
پارہ پارہ تھے مری روح کے تار
آج وہ آ ہی گیا ــــ

راشد کی نفسیاتی اور جنسی نظموں میں "انتقام"، "اجنبی عورت" "عہد وفا" "دریچے کے قریب" اور "رقص" کو بڑی اہمیت ہے۔ "عہدِ وفا" میں راشد نے بڑے ہی سادہ لیکن پُر اثر انداز میں اپنی محبت کی عظمت اور پائداری کا اظہار کیا ہے۔ "انتقام" رمز و ایما کا ایک دفتر ہے، اس میں انسان کی جنسی اور بہیمانہ کیفیتوں کا کھلا بے باکانہ اظہار ہے۔

شاعرہیں

اجنبی عورت" میں راشد نے نفسی کیفیتوں کا بڑا حسین کارادا اظہار کیا ہے۔ "رقص" میں انہوں نے ایک سماجی مسئلہ کو بہ انداز جمال پیش کیا ہے۔

میرا جی، ن۔م راشد کی بہ نسبت جنسی پیچیدگیوں میں زیادہ اسیر ہیں۔ ان کے یہاں جنس ایک معاملہ ہی نہیں مسئلہ بن جاتی ہے۔ ان کی نظموں میں جنسی جذبات کی قوت توانائی اور پامالی کے نشانات ملتے ہیں۔ "سرسراہٹ" "اجنبی" "انجان عورت کی رات کی" "اونچا مکان" اور "برقعہ" میرا جی کی ایسی نظمیں ہیں۔ جن میں علامتوں، تشبیہوں، اور کنایوں کے ذریعے پیچیدہ جنسی کیفیتوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ "لب جوئے بار" میرا جی کی بڑی ہی کامیاب نظم ہے۔ اس میں انہوں نے لذت کے کریہہ الاکتسابی عمل کو فنکاری عطا کر دی ہے۔ کہتے ہیں ؎

جل پری آئے کہاں سے وہ اسی بستر پر
میں نے دیکھا ابھی آسودہ ہوئی لیٹ گئی
لیکن افسوس کہ میں اب بھی کھڑا ہوں تنہا
ہاتھ آلودہ ہے نم دار ہے دھندلی ہے نظر
ہاتھ سے آنکھ کے آنسو تو نہیں پونچھے تھے

"اونچا مکان" میں بھی میرا جی نے ایک بڑے ہی قبیح عمل کو حسین انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ جنسی خواہشات کی تسکین کو محض لمحاتی انبساط و نشاط نہیں سمجھتے بلکہ اس عمل کو دنیا کی تعمیر اور تخلیق کا موجد قرار دیتے ہیں۔ اپنے اس خیال کو پیش کرنے کے لئے وہ "اونچا مکان" میں ایسی ترکیبیں اور ایسے ٹکڑے لائے ہیں جو ان کے ما فی الضمیر کو بڑے ہی رمزیہ انداز میں پیش کرتے ہیں مثلاً

بے شمار آنکھوں کو چہرے میں لگائے ہوئے استادہ ہے تعمیر کا ایک نقش عجیب
اے تمدن کے نقیب

تیری صورت ہے مہیب

اس میں تعمیر کے "ایک نقش عجیب" کی جو تعریف اور تشریح پیش کی گئی ہے اس کی مثال اردو شاعری میں اور کہیں نہیں مل سکتی۔ اپنی نظم "بُعد کی اڑان" "سرسراہٹ" اور "اغوا" میں میرا جی نے بڑی اچھی نفسی تحلیل کی ہے۔ خاص جنسی موضوعات سے ہٹ کر نفسیاتی تجزیہ و تحلیل کے سلسلے میں اختر الایمان۔ منیب الرحمٰن۔ خلیل الرحمٰن اعظمی۔ محبوب الرحمٰن فاروقی، خزاں اور شفیق فاطمہ شعریٰ کی تخلیقات بڑی گراں قدر ہیں۔ ان لوگوں نے جدید دور میں پیدا ہونے والے مختلف اور متضاد کیفیات کا بڑا حسین اظہار کیا ہے۔ ان کی نظموں میں بحیثیت مجموعی جذبے اور تخیل کی توانائی ملتی ہے۔ ان کی ذہن میں نا آسودگی اور تمنا پروری کے احساسات کے ساتھ سماجی حقائق کی اہمیت اور ان کے احترام کے عناصر بھی ملتے ہیں۔

جدید دور کی ذہنی پیچیدگیوں کے اظہار میں شفیق فاطمہ شعریٰ کی خدمات بڑی ہی گراں قدر ہیں۔ انہوں نے بقول ڈاکٹر اختر اورینوی "انفرادی اور اجتماعی خودی کو پہچان لیا ہے" شفیق فاطمہ شعریٰ کی نظموں میں ہمیں اجتماعی تصورات (Collectivism) کی بڑی ہی سچی مثال ملتی ہے۔

اگرچہ موجودہ دور میں نظر آنے والی شعری ہیئت اور تکنیک کی تبدیلیاں براہ راست میلانات و رجحانات شاعری میں اخذ نہیں ہوتیں، لیکن ہیئت کی تبدیلی بھی دراصل ایک آفاقی تحریک کے زیر اثر وجود میں آئی۔ اس لئے کبھی نہ کسی حیثیت سے میلانات کے سلسلہ میں اس کا ذکر آ ہی جاتا ہے۔ ہمارے شاعروں نے مغربی شعری ہیئتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہیئت جدید نظم معریٰ اور آزاد نظم اور سانیٹ وغیرہ کو اپنے دامن شاعری میں جگہ دے دی۔ تکنیک کی عام تبدیلیوں نے اردو شاعری کو دنیا شاعری بھی

(بقیہ صفحہ ۱۴۰ پر دیکھیے)

ڈاکٹر سید محمد حسنین

ادب اور زبان

زبان میں الفاظ کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ لغوی اور اصطلاحی۔ لغوی حیثیت میں لفظ کی عینی یا مفردی زندگی ہوتی ہے۔ اس میں لفظ کے معانی کا پتہ چلتا ہے۔ اصطلاحی حیثیت میں لفظ کی زندگی لغت سے نہیں کسی خاص علم سے علاقہ رکھتی ہے۔ یہ مقرر کردہ کسی کسی ایک عضوی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اصطلاحی لفظ مجرد ہوتا ہے۔ اور اس کا وجود اسی خاص علم میں اکائی جیسا ہوتا ہے۔

ادب و شاعری میں اس کے برخلاف الفاظ کی حیثیت محض لغوی نہیں ہوتی اور نہ یہ اصطلاحی وضع کے حامل ہوتے ہیں۔ ادب و شاعری میں ان کی حیثیت عضویاتی ہے۔ جو لغوی یا اصطلاحی زندگی سے زیادہ افضل اور زیادہ ارفع ہوتی ہے۔ الفاظ کی نوعیت یہاں مفردات کی نہیں مرکبات کی ہوتی ہے۔ لغوی لحاظ سے ان کی زندگی جامد اور محدود ہوتی ہے۔ ان میں جان تو رہتی ہے۔ مگر یہ نحیف اور نیم جان ہوتی ہے جیسے کسی بے زبان کی صدا، مبہم اور نارسا! ادب و شاعری میں الفاظ ایک دوسرے سے مخلوط ہوکر آپس میں ایک بطنی رشتہ قائم کر لیتے ہیں باہمی ربط و اتحاد سے انہیں معانی و کوائف کے گراں قدر خزانے نصیب ہو جاتے ہیں۔ فقروں اور جملوں یا مصرعوں اور شعروں میں یکجا و یکتا ہوکر الفاظ کی ساخت عضویاتی ہو جاتی ہے۔ الفاظ کی یہ عضویاتی ساخت یا اجتماعی تنظیم قلم کاری ہے۔ ایسی قلم کاری جس سے الفاظ کی بضاعت اور اُس کے رُتبہ و مقام میں اضافہ ہو جاتا ہے اور تحریر ادبی رنگ آمیزی کی مثال بن جاتی ہے۔

الفاظ خیالات کے اظہار کا ایک عمدہ وسیلہ ہیں ان سے ہمیں اپنے احساسات و جذبات کی ترجمانی میں مدد ملتی ہے۔ ہمارے پاس الفاظ کا جتنا بڑا اور جیسا ذخیرہ ہوتا ہے، اُسی قدر ہمیں اپنے خیالات و خواہشات کے اظہار میں سہولت ہوتی ہے۔ یہ ذخیرہ اگر محدود ہے، اگر یہ کم مایہ ہے، تو خیالات کی موثر و مکمل ترجمانی مشکل ہے۔ خیالات و جذبات کے اظہار پر قدرت اور قابو کا سوال دراصل الفاظ کے وافر ذخیرہ اور اُن کے مناسب استعمال پر منحصر ہے۔ ہر قسم کے خیالات اور ہر قسم کی بات کو جس کے اظہار کی ضرورت ہے، اپنی سمجھ بوجھ کے بموجب ہم الفاظ کا مناسب جامہ پہنا دیتے ہیں۔ دوسرے لوگ ان الفاظ کو سُن کر یا اُنہیں تحریری صورت میں دیکھ کر ہمارے خیالات یا باتوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ الفاظ کے استعمال کا یہ سیدھا سادا عام طریقہ ہے۔ جس سے ہم آئے دن اپنی معاشی اور سماجی زندگی میں مصرف لیتے ہیں۔ ادبی دنیا میں، مگر الفاظ کے استعمال کا یہ عامیانہ طریقہ نظر نہیں آتا۔ کم از کم یہاں الفاظ اتنا رسمی، ظاہری اور رکندانداز سے مصرف میں نہیں آتے۔ الفاظ وہی ہوتے ہیں پر یہ لغوی حد بندی میں اسیر نہیں ہوتے۔ یہ پُرفشاں اور درخشاں ہوتے ہیں۔ ادبی رنگ آمیزی سے ان کے رُتبہ اور بضاعت میں بیش قیمت تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ یہ ایسی تبدیلی ہوتی ہے کہ جس سے ان کے رنگ و آہنگ اور اجتماعی تنظیم میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

آپ جانتے ہیں ادیب و شاعر بھی ہم جیسا انسان ہوتا ہے۔ لیکن طبعی طور پر یہ ہم آپ سے مختلف ہوتا ہے۔ اُسکے احساسات، جذبات، اُسکے تاثرات اُس کے سوچنے، غور کرنے اور کہنے کا ڈھنگ جُداگانہ ہوتا ہے۔ اپنے تاثرات کی پیشکش میں بلاشبہ وہ بھی ہماری طرح الفاظ ہی کا سہارا لیتا ہے لیکن یہ سہارا اسے لغت نہیں اس کی طبع موزوں دیتی ہے۔ وہ طبع موزوں جو الفاظ کا باطن بھی دیکھ لیتی ہے۔ وہ طبع موزوں جو الفاظ کا جسدی پیکر [illegible] پہچانتی ہے۔ عام بول چال میں ہم لفظ کا صرف ظاہر دیکھتے ہیں۔ اور معنوی لحاظ سے اسے لغوی زندگی میں محدود دیکھتے ہیں۔ لفظ کے "جسدی پیکر" سے عام طور پر ہم ناآشنا ہوتے ہیں۔ ادیب و شاعر لیکن ناآشنا نہیں ہوتا۔ وہ اس "جسدی پیکر" کو دیکھتا ہے

شاعر بمبئی

اور بہت صاف دکھتا ہے۔ کلیم الدین احمد کہتے ہیں :-

"ہر لفظ کا ایک پیکر ہوتا ہے اُسے بولتے ہیں تو اس کی ساخت کو ہم منہ میں محسوس کرتے ہیں۔ سنتے ہیں، تو ایک خاص صوتی پیکر کا احساس ہوتا ہے۔ سوچتے ہیں تو آنکھوں کو اندرونی آنکھوں کو، اُس کا صوری پیکر نظر آتا ہے" (عملی تنقید)

الفاظ کا یہ پیکر عام ذہن میں موجود نہیں رہتا۔ لیکن ادیب و شاعر کی قوتِ لطیف اُسے اچھی طرح محسوس کر سکتی ہے۔ الفاظ کی ساخت الفاظ کے صوتی پیکر اور الفاظ کے صوری پیکر کو وہ مکمل طور پر محسوس کر لیتا ہے۔ اظہار تاثر میں وہ اُس "جدی پیکر" سے بھی خاطر خواہ مصرف لیتا ہے۔ وہ سرد و جامد الفاظ پھر رسمی الفاظ نہیں رہتے۔ یہ اُس کی قلم کاری سے روشن، پُرنور اور زندہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ایسے صاف و شفاف گویا حرارتِ آگہی سے اور جاذب نظر ہو جاتے ہیں کہ ان سے خیال و احساس کی لو نکلتی رہتی ہے۔ الفاظ کی اجتماعی تنظیم، اُن کی عضویاتی ساخت، جملوں یا شعروں کی ترتیب اور زیر و بم میں جیسے ادیب و شاعر کے وارداتِ قلب کی لہریں اُبھرتی اور پھیلتی نظر آنے لگتی ہیں۔

میں نے کہا کہ عام بول چال میں ہم لفظ کا صرف ظاہر دیکھتے ہیں۔ اور معنوی لحاظ سے اسے لغوی زندگی میں محدود پاتے ہیں۔ مثال کے طور پر لفظ "لب" کو دیکھئے، یہ ہمارے جسم کا ایک حصہ ہے۔ اور ایک ایسا اہم عضو ہے جو ہمارے کئی کاموں میں کام آتا ہے۔ "لب" کی اس لغوی حیثیت سے ہم اچھی طرح واقف ہیں۔ لیکن یہ واقفیت عامیانہ اور سطحی ہے، اگر ہم "لب" کو اس سے زیادہ اور اس سے آگے نہیں جانتے۔ "لب" کی یہ معنوی زندگی محدود ہے اگر ہم اسے محض لغوی طور پر دیکھتے ہیں۔ "لب" چہرے پر گوشت کے ان دو متحرک، پارچوں کو، اب ان اشعار میں دیکھئے، غور کیجئے، یہ سرد و جامد اور بے جان لفظ کتنا جاندار، کتنا گویا اور کس قدر ذی اثر ہو جاتا ہے۔

نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے	پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے	میر
یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں	واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں	غالب
تیرے لب نے نہ کی مسیحائی	ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا	میر
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب	گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا	غالب
لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری	زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری	اقبال
لب آشنائے نالۂ دردِ جگر نہ ہو	اے ضبط گھر کی بات ہے باہر خبر نہ ہو	

تو الفاظ ہمارے خیالات کے اظہار کا نہایت عمدہ وسیلہ ہیں۔ ادب و شاعری میں تاثرات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اور اس مقصد کے لئے ادیب و شاعر کے پاس الفاظ سے بہتر کوئی دوسرا وسیلہ نہیں۔ الفاظ، اپنے کام اور مطلب کے الفاظ، ہر فرد و بشر استعمال کرتا ہے۔ ادیب و شاعر بھی استعمال کرتا ہے۔ لیکن یہ اُنہیں ہمارے آپ کی طرح رسمی اور عامیانہ طور پر استعمال نہیں کرتا۔ اس کے طریقۂ استعمال میں فرق ہوتا ہے۔ اور بیّن فرق ہوتا ہے۔

شاخیں ہل رہی ہیں اور شاخیں انگڑائیاں لے رہی ہیں۔
غنچے کھل گئے اور غنچے مُسکرا پڑے۔

کے درمیان بڑا فرق ہے۔ بات ایک ہی ہے، مگر کہنے کا انداز جُدا ہے۔ الفاظ کی تبدیلی سے ان دونوں کے اثر میں جو تبدیلی واقع ہوتی ہے وہ نمایاں ہے۔ ادب و شاعری میں الفاظ کو ایک حیاتِ نو نصیب ہوتی ہے۔ ان کی گویائی اور پذیرائی میں بیش بہا تغیّر پیدا ہو جاتا ہے جو لغوی زندگی یا عام بول چال میں اُنہیں ہرگز میسّر نہیں ہوتا۔ ادبی زبان اور غیر ادبی زبان کے مابین یہی اساسی فرق ہے۔ غالب نے کہا ہے اور درست کہا ہے:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

اشعار تو اشعار ٹھہرے، ہمارے آپ کی روزمرہ بات چیت میں بھی الفاظ کو یہ رتبۂ عالی حاصل نہیں۔ ہماری باتوں میں مفہوم و مطلب شاعر بھی

چونکہ دل پذیری نہیں ہوتی۔ ہمارے الفاظ بامعنی ہوتے ہیں۔ خیال آفریں نہیں ہوتے۔ اِن میں وہ مسیحائی، وہ شعلہ فشانی اور وہ سحر انگیزی نہیں ہوتی جو "ادبیت" کی ضامن ہے۔ عام زبان چلتی پھرتی زبان ہوتی ہے۔ جو تحریری جامہ میں ملبوس ہو کر بھی حیاتِ دیر پا حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ کم حیات (SHORT LIVED) اور کم مایہ ہوتی ہے۔ جیسے سطحِ آب پر چلتے پھرتے بلبلے!

عام زبان اور ادبی زبان کے فرق کی ایک مثال دیکھئے۔ موضوع لکھنؤ کی عشقیہ شاعری ہے۔

(۱) "دبستانِ لکھنؤ کے شعراء عشق کے موضوع پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ یہ حسن کے اثرات قبول کرتے ہیں اور حسن و عشق کے مضامین قلمبند کرتے ہیں۔ لیکن اِن کی شاعری میں سطحیت ہوتی ہے۔ اِن کا کلام بازاری ہوتا ہے۔ اور اِن کی عشقیہ شاعری محض ہوس اور عیاشی کا نمونہ ہے۔"

یہی خیال اور تقریباً انہی الفاظ میں اب ایک ادیب کی زبانی سنئے جو الفاظ کے رتبہ و مقام سے ناواقف نہیں:

(ب) "...... لکھنؤ کے دبستان شاعری میں اتنا عشق نہیں جتنی عیاشی ہے جسن سے اتنا لگاؤ نہیں، جتنا حسینہ سے۔ اس عیاشی میں بھی جس کا اتنا دخل نہیں جتنا خرافات کا......" از:۔ رشید احمد صدیقی۔

عشق۔ عیاشی، حسن، حسینہ جیسے الفاظ یہاں رسمی نہیں۔ یہ لغوی حدود میں محدود نہیں۔ یہ خیال آفریں ہیں اور روشن ان کے معرفت سے اِن میں جو بات مفید، فکر خیز اور دل گیر بات پیدا کر دی گئی، وہ (الف) میں مفقود ہے (ب) کے مطالعہ سے نہ صرف کہنے والے کا مدعا سامنے آجاتا ہے بلکہ جامع اور بلیغ فقروں کی بہ نسبت منفرد اور خوبصورت عبارت ہمارے ذہن میں جگہ بنا لیتی ہے۔ آپ غور کریں (ب) کے الفاظ گویا بھی ہیں اور شعلہ فشاں بھی۔ یہ اتنے جیالے ہیں کہ ان سے سامعہ بھی لطف اندوز ہوتا ہے اور باصرہ بھی حظ اٹھاتا ہے۔ اس کے برخلاف (الف) میں لکھنؤ کی عشقیہ شاعری کے جس بازاری پن کی وضاحت کے لئے جو الفاظ اور جتنے الفاظ مستعمل ہوئے، یہ بے اثر، کُند اور مُردہ ہیں۔

(الف) میں شعرائے لکھنؤ کی اس "عیاشی" کی وضاحت کے لئے الفاظ نے چار مکمل چھوٹے بڑے جملوں کی وضع اختیار کی ہے۔ لیکن یہ جملے سرد اور بے کیف ہیں۔ ان جملوں میں الفاظ کی ترکیب میں اور اس پوری عبارت میں جیسے احساس کا فقدان ہے۔ اس کا کوئی لفظ مہمل نہیں۔ کوئی جملہ بے معنی نہیں۔ ہر جملے سے عشقیہ شاعری کی رکاکت ظاہر کی جاتی ہے ہر جملہ میں خیال کی تکرار ہے تاکہ "رکاکت" سامنے آجائے۔ لیکن یہ تکرار لاحاصل ہے اور بارِ گراں بھی۔

یہی حال شعری ادب کا ہے۔ شعر تاثرات کی نہایت پختہ و بلیغ صورت ہے۔ شعری طریقۂ اظہار نثری طریقۂ اظہار سے دشوار تر ہوتا ہے فنی لوازمات پر یہاں نثر سے زیادہ نگاہ رکھنی ہوتی ہے۔ صنفی حد بندیوں کے علاوہ شاعر کو بحر و وزن، آہنگ، تیور اور قافیہ ردیف کی سنگلاخ گھاٹیوں سے گذرنا پڑتا ہے ــــ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ شاعر کی ابتلا نثار سے کہیں زیادہ ہیجان خیز اور قرار شکن ہوتی ہے یاس سخت، صبر آزما ساعت میں الفاظ اوّلین توجہ کے محتاج ہوتے ہیں۔ جن کے استعمال میں اُسے بڑی احتیاط برتنی پڑتی ہے۔ ایک ایک لفظ پر جس سے شاعر صرف لیتا ہے، پانی کے تول کا وزن رکھتا ہے۔ شعری قالب میں ڈھل کر الفاظ کی ترکیب و ترتیب میں کیمیائی تبدیلی خود نما ہو جاتی ہے۔ شاعر، اچھے اور کامیاب شاعر، پر نہ صرف الفاظ کی باطنی زندگی عریاں ہوتی ہے بلکہ وہ الفاظ کے جسدی پیکر (BODY IMAGE) کی تاب و تب بھی اچھی طرح محسوس کرتا ہے۔ اس کی قلم کاری سے لفظ میں بہت سے رنگین و زرّیں معانی حرکت آتے ہیں۔ یہ معانی سورج کی کرنوں کی طرح پھیلتے ہیں۔ صرف پھیلتے ہی نہیں بلکہ ان سے مختلف رنگوں کا اشعاع بھی ہوتا ہے

الغرض ادب کی زبان عام زبان نہیں ہوتی۔ ادب میں الفاظ کو افضل و اعلیٰ رتبہ حاصل ہوتا ہے۔ الفاظ ادیب و شاعر کے عزیز ترین اور مخلص ترین رفیق ہیں۔ ایک باکمال ادیب یا شاعر اہلِ زبان بھی ہوتا ہے اور اہلِ قلم بھی۔ اُس کے پاس الفاظ کا وافر اور شاندار ذخیرہ ہوتا ہے اور اس ذخیرہ سے وہ بلا تکلف تصرف لینے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ ہر قسم کے افکار و تاثر کو الفاظ کے شیشے میں اتار دینے کی غیر معمولی استعداد اس کے آرٹ یا فن کی پہلی جھلک ہے۔

(بقیہ صفحہ ۶۰ پر دیکھیے)

انجم فاطمی

غالب کی عظمت

کہتے ہیں کہ جب چراغ بجھنے پر آتا ہے تو اسکی لَو اور تیز ہو جاتی ہے۔ اتنی تیز کہ اُسکے سامنے اصل چراغ کی روشنی بھی مدھم نظر آنے لگتی ہے چنانچہ جب مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہونے کو آیا۔ تو اُس نے غالب جیسا ذہین فنکار پیدا کیا، جس نے اپنی منفرد آواز سے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ دلی کے گلی کوچوں میں چرچے ہونے لگے کہ ایک ایسا بھی شاعر ہے جو نہ جانے کس دنیا کی باتیں کرتا ہے اور جو شاہ نصیر اور ذوق کی ڈگر سے الگ اپنی راہ بنا رہا ہے۔ اور یہ چرچے بڑھتے بڑھتے اعتراضات کی شکل اختیار کرنے لگے۔ اور غالب نے فکر و فن کا جو پیرہن تیار کیا تھا اُس پر انگلیاں اُٹھنے لگیں۔ لیکن غالب کہ اسکی پروا کرتا تھا اُس نے رہبری کے لئے بیدل کو پکارا اور جب اس سے تشنگی نہ ہوئی تو عرفی، نظیری اور صائب کی رہبری قبول کی۔ لیکن تھوڑی تھوڑی دور چل کر ان لوگوں کا بھی ساتھ چھوڑتا چلا گیا۔ اور شروع میں ذہن پر جو دھندلکا چھایا ہوا تھا وہ اب صاف ہونے لگا۔ اور اس دھندلکے سے کچھ تصویریں اُبھرنے لگیں۔ لیکن ان تصویروں کو دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت لوگوں میں کہاں تھی۔ چنانچہ شاعروں میں بیجا اعتراضات ہونے لگے۔ لیکن غالب اپنی دھن میں آگے ہی بڑھتا رہا۔

غالب کو اُسکی زندگی میں سب سے کم سمجھا گیا اور فکر و فن کی جو راہ اُس نے متعین کی تھی وہ اتنی دشوار گذار اور جدید تھی کہ اس پر چلنا ہر شخص کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ غالب کا عشق، اسکی شاعری اور اسکا فکری شعور ایسا نہیں تھا جسے اُس دور کا ہر شخص سنبھال سکتا۔ کیونکہ آبرو سے شیوۂ اہلِ نظر ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں۔ اور اسی لئے وہ خود کو عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ کہتا ہے جو حیاتِ انسانی کی نئی قدریں ترتیب دے رہا تھا اور انسانی مسائل کی تراش بندی میں بڑی تندہی سے حصّہ لے رہا تھا۔ غالب کی شاعری اور فن کو سمجھنے کے لئے ہمیں اسکے ماحول اور اسکے ذہن کو سمجھنا پڑیگا۔ اور تب ہی اسکے فنی شعور کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غالب کے ذہن کی تمام گتھیوں کو کھولنا آسان نہیں اور اگر اسکے پیرہنِ فکر و فن کی تمام تہیں کھول دی جائیں تو حیاتِ انسانی کی خود ساختہ عظمت ننگی ہو کر ہمارے سامنے آجائیگی۔ جسکی عریانی کی تاب لانا ممکن نہ ہوگا۔ جیسے جیسے حیات کے نئے تقاضے اُبھرنے لگیں گے، غالب کی عظمت کا اندازہ ہوتا چلا جائیگا۔ غالب کا ذہن دراصل اس دور کی پیداوار ہے جب نئی تہذیب اپنی تمام برق پاشیوں کے ساتھ پرانی تہذیب اور اقتدار کو فنا کرتی چلی جا رہی تھی۔ اور زندگی کے جدید تقاضے حیاتِ انسانی کا حل بنتے جا رہے تھے۔ اور پرانی تہذیب و اقدار اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ بڑی سُرعت کے ساتھ مائل بہ انحطاط تھی۔ یہ وہ تہذیب تھی جسنے غالب کے ذہن کی تربیت میں ایک اہم حصّہ لیا تھا، جسنے اسکی ذہنی ساخت کو ایک نئے سانچے میں ڈھالا تھا، جس سے غالب کی ہمدردی اور لگاؤ فطری ہے اور اسی ہمدردی اور لگاؤ نے اسکے یہاں ایک جھنجھلاہٹ کی کیفیت پیدا کر دی ہے جو اُسے نئی تہذیب اور نئے اقدار میں سکون کی تلاش پر مجبور کرتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ جدید تقاضے کا ساتھ دینے میں جھجک محسوس نہیں کرتا۔ اور اضطراب میں ہر تیز رو کے پیچھے دوڑتا ہے لیکن اُسے راہبر نہیں ملتا۔ کوئی ایسا فکر نہیں ملتا جو اسکی تشنگی کو سیراب کر سکے۔ جو اُسکے ذہن میں پڑی ہوئی تمام گتھیوں کو سلجھا سکے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ شدید قسم کی اندرونی کشمکش میں گرفتار رہتا ہے۔ غالب ایک ایسے دور اہے پر کھڑا ہے۔ جہاں دو تہذیبیں آپس میں بر سرِ پیکار ہیں۔ اور ایک تہذیب جو زیادہ

شاعو بنی

جاندار اور توانا ہے اس پرانی تہذیب کو فنا کرتی جا رہی ہے جس نے غالب کے ذہن کی تربیت کی۔ شہنشاہی اور جاگیردارانہ تہذیب جس نے علم و فن کی ترقی میں اہم رول ادا کیا تھا۔ پگھل رہی تھی۔ مغلیہ سلطنت کا سورج جس نے پانچسو سال تک ہندوستان کی فضا کو منور کیا۔ آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔ اور نئی تہذیب اپنی تمام جلوہ سامانیوں اور نیرنگیوں کے ساتھ ابھر رہی تھی۔ غالب نے اس ابھرنے اور ڈوبنے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس سے متاثر ہوا۔ وہ شاہ نصیر، ذوق اور مومن کی طرح محض وقتی سکون کو زندگی کا نصب العین نہیں سمجھتا۔ بلکہ اس کا احساس ذہن ان تبدیلیوں کا مطالعہ بڑے غور سے کر رہا تھا۔ جس نے اسکی شاعری میں ایک شعلہ نوائی کی کیفیت پیدا کر دی۔ وہ مومن کی طرح ایک نشاط انگیز اور رومان پرور ماحول میں نہیں رہتا تھا۔ اور نہ ماحول سے گریز کی علامت ہی اس میں پائی جاتی ہے۔ وہ زندگی میں جہد کا قائل تھا۔ لیکن مومن گریز ہی کو زندگی سمجھتے ہیں۔ اور اسی گریز نے مومن کو مسائل حیات سے کنارہ کش ہونے پر مجبور کیا۔ اور وہ اپنے خود ساختہ رومانی اور نشاط آگیں ماحول میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ مومن کے یہاں جہد حیات کا مادہ تھا ہی نہیں۔ اور نہ انہوں نے زندگی کے مسائل پر سنجیدگی سے سوچنے ہی کی زحمت گوارا کی۔ وہ تو محض عشق لڑا سکتے تھے، وہ عشق جو داغ کی بوالہوسی سے کچھ ہی بلند کہا جا سکتا ہے۔ مومن کا کارنامہ محض یہ ہے کہ انہوں نے سطحی رومانیت کو تغزل کے دائرے میں عمدگی سے پیش کیا اور بس۔

غالب نے زندگی کے مسائل کا جو مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے ہمیں اسکے فن میں اُسکی بڑی متحرک اور جاندار تصویریں ملتی ہیں۔ غالب کی عظمت یہ ہے کہ اُس نے مروّجہ طرز سے الگ ہو کر اپنے فکر و فن کی جو عمارت تعمیر کی ہے، اس نے شاعری کو ایک واضح تفکر اور بالغ نظری عطا کی۔ اُس نے نہ صرف اپنے عہد کے مسائل کو پیش کیا۔ بلکہ حیات کے بعض ایسے حقائق کی جانب بھی اشارہ کیا۔ جو مستقبل کی بہتر روایت بن سکتے تھے۔

غالب کی حیثیت اردو شاعری میں ایک باغی کی نظر آتی ہے، جس نے تمام فرسودہ روایات میں ایک انقلاب لانے کی کوشش کی اور زندگی کی نئی اور صحت مند قدریں بنائیں۔ اردو میں غالب پہلا شخص ہے جس نے طنز میں خدا کو مخاطب کیا۔ خدا اور اسکی بنائی ہوئی مخلوق اور جنّت و دوزخ، گناہ و ثواب، فرمانبرداری و اطاعت کا ایک نیا تصوّر پیش کیا ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

غالب کی بغاوت زندگی سے نبرد آزما ہونے کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ اور وہ جہد حیات میں بے خطر کود پڑنے کی [illegible] کرتا ہے۔ مومن کی طرح اپنی الگ دنیائے نشاط نہیں تعمیر کرتا۔ بلکہ زندگی کے سنگین حقائق سے ٹکرانے کا عزم رکھتا ہے ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد — ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں ہم سے

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں　　جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اِک آبلہ پا وادیٔ پُر خار میں آوے

پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم　　عرصہ ہوا ہے چاک گریباں کئے ہوئے

یہ چند نقوش ہیں جن سے غالب کے عزم اور تمکین عزم کا اندازہ ہوتا ہے اور جو اس دَور کے شعراء کے یہاں ناپید ہے۔ غالب کی روح جس آگ میں جل رہی تھی اس نے اسکی ذہنی ساخت ہی کو بدل کر رکھدیا۔ اور وہ زندگی کے تمام مسائل کی تحلیلِ نفسی کرنے لگا۔ غالب نے عشق کا جو تصور پیش کیا ہے۔ وہ روایتی نہیں ہے۔ وہ عشق کرتا ہے لیکن اپنی خودداری کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اِس عشق میں کہیں کہیں دھول دھپّے کی بھی نوبت آتی ہے لیکن کبھی کبھی۔ عام طور سے وہ عشق کا بڑا صحت مند تصور رکھتا ہے ؎

قید میں بھی ترے وحشی کو رہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریٔ زنجیر بھی تھا

عشق میں رنجِ گراں باریٔ زنجیر کا شکوہ شاید اردو شاعری میں پہلی مرتبہ غالب نے کیا جو روایتی ڈگر سے ہٹ کر حقیقت نگاری کی بے لاگ ترجمانی تھا جہاں مومن یہ فرماتے ہیں ؎

لے شبِ وصل غیر بھی کاٹی　　لے گا تو میرا امتحاں کب تک

وہاں غالب کا یہ کہنا کتنا بجا اور حقیقت سے قریب ہے ؎

کتنے سادہ ہیں یہ خوباں غالب　　ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

حقیقت نگاری کی اس سے عمدہ مثال نہیں مل سکتی اور یہیں غالب کی ذہانت اور عظمت کا معترف ہونا پڑتا ہے چند اشعار جو غالب کے حقیقت پسندانہ نظریہ کی عکاسی کرتے ہیں ملاحظہ ہوں ؎

عشق مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں!

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

زکوٰۃِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل　　کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا!
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے　　ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

غالب نے نہ صرف یہ کہ عشق و محبت کا ایک نیا تصور پیش کیا۔ بلکہ اس نے شعر و ادب میں ایک فطری میلان کی ابتدا کی یہ صحیح ہے کہ غالب نے باضابطہ کوئی فلسفۂ زندگی اس قسم کا نہیں پیش کیا۔ جیسا کہ مغربی مفکروں اور پھر اقبال نے پیش کیا۔ اور پھر غالب سے اِس چیز کی توقع ایک غلط سی بات ہے کیونکہ غالب بھی ایک شاعر ہے جس نے ایک فلسفیانہ ذہن پایا ہے۔ غالب کے اس فلسفیانہ شعور نے اُردو شاعری میں ایک فکری میلان کی ابتدا کی۔ غالب کا یہ کارنامہ عظیم ہے کہ اس نے اردو شاعری کو فکر اور فلسفیانہ شعور سے آشنا کیا اور جس نے بعد میں اقبال جیسا فلسفی شاعر پیدا کیا۔ اور بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی "اقبال نے غالب کے چیئے سے دیا جلایا" غالب کے علاوہ اُردو کا کوئی شاعر ہمیں ایسا نہیں ملتا جس نے اس قدر زیادہ شاعر بنایا

کرنے والی نسلوں کو متاثر کیا ہو اور جس کے شعور کی گرفت لوگوں کے ذہن پر اتنی شدید ہو۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ جن سے غالب کے فکری شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ؎

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

غالب اپنے اشعار کے ہر لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم کہا ہے اور یہ حقیقت ہے کیونکہ غالب نے جن تجربات، احساسات، اور موضوعات کو اپنی شاعری میں سمویا ہے وہ بڑے گراں مایہ ہیں جنکی تشریح کے لئے ایک دفتر چاہئے۔

غالب کی شاعری میں بڑا رچا ہوا فلسفیانہ شعور ملتا ہے۔ اور یہ شعور جذبہ کی تند آنچ پاکر اور نکھر جاتا ہے اور غالب کی شراب فن دو آتشہ و سہ آتشہ بن جاتی ہے۔ غالب کے فن میں ایک ٹھہراؤ، متانت، توازن، سنجیدگی اور وقار ہے۔ جس میں گہرے جمالیاتی شعور کی آمیزش ہے۔ یعنی فکر اور رومان کے باہم امتزاج نے انکی شاعری کو آفاقی اور ہمہ گیر بنا دیا ہے۔ غالب نے جو فکر و فن کا لازوال سرمایہ اردو شاعری کو عطا کیا ہے۔ وہ ہمیشہ آنیوالی نسلوں کی رہبری کرتا رہیگا۔ اپنے عہد کے سخن فہموں کیلئے غالب نے جو یہ کہا تھا وہ کسقدر صحیح ہے ؎

بیا ورید گر اینجا بود زباں دانے
غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد

(بقیہ امیر مینائی کی طویل عاشقانہ مثنوی صفحہ ۱۶)

غرض یہ کہ یہ مثنوی امیر کی ایک نامکمل تخلیق ہونے کے باوجود ادبی و معنوی محاسن سے عاری نہیں ہے۔ امیر نے جو پہلے پہل اس مثنوی کو سرانجام کرنے کا منصوبہ باندھا تھا اس کے لئے اس سے کہیں زیادہ محنت، جانکاہی، یکسوئی، تعمیری اور وقت صرف کرنے کی ضرورت تھی۔ جتنا وہ اس کے لئے صرف کر سکے۔ یہ مثنوی عاشقانہ ہے جیسا کہ اس نوع کی مثنویوں میں ہوتا ہے۔ کہیں جگہ جگہ بزمیہ مضامین کی آمیزش ہے۔ لیکن اس کا زیادہ تر زور حصہ جس کا امیر کے اصل موضوع سے کوئی خاص علاقہ نہیں رزم نگاری پر مشتمل ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ اگر امیر رزم کو بنیاد بنا کر کوئی مثنوی لکھتے تو شاید زیادہ کامیاب ہوتے۔ موجودہ صورت میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر انہیں اس مثنوی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا پورا موقع ملتا تو مثنوی سحر البیان کے رنگ میں اردو شاعری میں ایک اچھی مثنوی کا اضافہ ہو جاتا۔

سلطان احمد

اقبال عطیہ کی نظر میں

ڈاکٹر اقبال کا مطالعہ محققین ادب اردو کے نزدیک دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ مختلف حیثیتوں میں اب تک اقبال کی شاعری اور زندگی پر تحقیق اور تدوین کا کافی کام کیا جا چکا ہے۔ کلام اقبال کی ادبی افادیت اور گوناگوں قدروں پر اقبال کے مدّاحین اور تنقید نگار بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ شاید ہی زندگی کا کوئی پہلو ایسا رہا ہو جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو، مگر اقبال کے سوانح نگاروں میں جو حیثیت عطیہ بیگم کی ہے شاذ ہی کسی اور کی ہو۔ اِس مشرقی خاتون کو یہ شرف حاصل رہا ہے کہ انگلستان اور جرمنی میں دورانِ طالب علمی اقبال اور وہ ایک جان دو قالب بن کر زندگی گذارتے رہے۔ عطیہ نے قریب سے اقبال کی شخصیت کا مطالعہ کیا ہے۔ کیا بلحاظِ شاعر، مفکر و فلسفی، رفیق و غمگسار، حتیٰ کہ اقبال کی نفسیات تک عطیہ بیگم کے سامنے ایک کھلی ہوئی کتاب تھی، جس کی ہر سطر کے شانِ نزول سے وہ واقف تھیں۔ اقبال نے اپنے ایک مکتوب مورخہ ۹ر اپریل ۱۹۰۹ء میں اِس بات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں :-

"تم بخوبی جانتی ہو کہ میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاتا ہوں۔ چھپانا تو کجا میرے نزدیک ایسا سوچنا بھی گناہ کے مترادف ہے۔۔۔"

عطیہ کی ہمشیرہ سلطانہ رفیقہ بیگم نواب زنجیرہ سعید احمد خاں کو بیاہی گئی تھیں۔ آپ کے بھائی ڈاکٹر فیضی تھے۔ یورپ کے سفر میں موصوف عطیہ کے ساتھ تھے۔ ڈاکٹر فیضی نے صوفیانہ شاعری کے نمونے چھوڑے ہیں جن کی علمی اور ادبی افادیت بے مثال ہے۔ آپ کو جرمنی زبان پر کافی عبور تھا۔ ڈاکٹر فیضی کی تصانیف میں "ہندوستان میں تاریخ بنی اسرائیل" "دخترِ سندھ" "ہندوستانی مصوری اور سنگ تراشی کے تجریدی آرٹ کے نمونے" اور "صوفیانہ نظموں کا مجموعہ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ محترمہ فیضی یعنی عطیہ بیگم علی گھرانے کی چشم و چراغ تھیں۔ نوابی ماحول میں پلی ہوئی یہ خاتون مشرقی تمدن اور شائستگی کا نمونہ تھی۔ اقبال سے دید و شنید سے قبل آپ اپنی تصنیف "یورپ کا سفر نامہ" چھپوا چکی تھیں یہ سفر نامہ انگریزی انشاء پردازی کا بہتر نمونہ ہے۔ موصوفہ کو اِسی کی وجہ سے ہندوستان اور لندن میں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی۔ اقبال اسی سفر نامے کا شہرہ سن کر عطیہ سے ملنے کے شائق تھے اور یہ کام سیّد علی بلگرامی کی وساطت سے پورا ہوا۔ دونوں ایک دوسرے سے کیا ملے کہ تاحیاتِ حیات دوستی پائدار ہو گئی۔ عطیہ کی ڈائری 'DIARY' کے بکھرے اوراق اوائل عمر سے اقبال کی پُر وقار شخصیت کے فروغ تک کے جذباتی مدوجزر کے آئینہ دار ہیں۔ یہ مجموعۂ اوراق ایک کتابچہ کی صورت میں فروری ۱۹۴۷ء میں اکاڈمی آف اسلام کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ یہ ایک قومی سرمایہ ہے۔ مشرق کے ایک عظیم شاعر کی سرگذشتِ واقعی ہے۔ عطیہ نے واقعیت کی پردہ دری کی ہے فصاحتِ بیان سحر کاری اور انشاء پردازی کے اس چمن زار کو ہم دیکھتے ہیں تو انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ ہماری بساط ہی کیا ہے کہ ہم سخن ماروائے کلام کی خوشہ چینی کریں۔

"آں قدح بشکست و آں ساقی نماند"

اقبال کی شاعری فرشتوں کی زبان ہے۔ یہ ایک تاریخی اتفاق ہے کہ وہ اپنے شاعرانہ پرواز تخیل میں اپنے جذبات اور حیات کی تفہیم اور تفاہم کے لئے ایک نسوانی سہارے کی تلاش کرتے ہیں۔ عطیہ کی حیثیت رومانی شاعری — (POETRY OF ROMANTIC
شاعر بھی

(RE VI) کی انگریز خاتون ڈورو تھی (DOROTHY WORDSWORTH) کی تھی ۔ فرق اتنا ہے کہ ڈورو تھی ایک شاعر کے کردار میں نمایاں ہے
عطیہ انگریزی کی ایک اچھی انشاء پرداز ہے ۔ ڈورو تھی کا سحر آفریں حُسن اور شاعرانہ لطافت انگریزی شعراء کو (INSPIRATION)
یتے ہیں اور عطیہ کی ذہانت اور مشرقی تدبّر اقبالؔ جیسے شاعر کی راہبری کرتا ہے ۔

عطیہ نے اقبالؔ سے اپنی پہلی ملاقات کے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبالؔ لندن میں مِس بیک کی رہائش گاہ پر اُنہیں ملے تھے
بیک پہلے ہی اقبالؔ کی شخصیت اور ان کی ذہانت کا تذکرہ کر چکی تھیں اور یہ بھی ظاہر کر چکی تھیں کہ وہ کیمبرج سے لندن آکر اُن سے ملنے کے
تمند تھے ۔ کھانے کی میز پر اقبالؔ اور عطیہ کے درمیان بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا ۔ وہ لکھتی ہیں کہ اقبالؔ فارسی ، عربی اور سنسکرت ہر
رقی زبانں پر عبور رکھتے تھے ۔ اور اُس پر اُن کی فاضلانہ بذلہ سنجی اور حاضر جوابی سامعین کو متحیّر کئے ہوئے تھی ۔ باتوں باتوں میں
یسی بات کہدیتے تھے کہ مخاطب لاجواب ہو جاتا تھا ۔ اور مزید استفسار کی جرأت نہ ہوتی تھی ۔ اقبالؔ کا مذاق سطحی اور عامیانہ نہیں
لا گہرے غور و فکر اور زندگی کی قدروں کے سنجیدہ مشاہدے پر مبنی تھا ۔ وہ بلا کے ذہین ، ذکی الفہم اور خوش طبع تھے ۔ مگر بات چیت کے
ن اکثر و بیشتر وہ سنجیدہ تکلّم اختیار کر لیتے تھے ۔ عطیہ نے عند الملاقات لسان الغیب حافظ شیرازی اور بابا فغاں کے کلام پر تبادلۂ خیال
الن کے کتابچہ سے اس بات کا انکشاف ہوا کہ اقبالؔ موخر الذکر کے کلام سے کافی متاثر تھے ۔

اقبالؔ بالطبع آزاد اور زندہ دل تھے ۔ یہ آزادی اور زندہ دلی سوسائٹی کی روح رواں تھی ۔ محترمہ عطیہ لکھتی ہیں کہ ایک مرتبہ
ہنے اقبالؔ کی اپنی رہائش گاہ پر لندن میں دعوت کی ۔ مِس سلولیسٹرے ، السنہ اور فلسفے کی مشہور طالب علم مِس لیوی ، انگریزی
بقار مسٹر منڈل اور ہر میٹز ٹرودتھ بھی شامل تھے ۔ یہ صحبت نہایت دلچسپ اور طرب زا ثابت ہوئی ۔ اقبالؔ نے فی البدیہہ مزاحیہ
لکھے اور سنائے ۔ انگریزی خواتین نے کافی پسند کیا اور خوش طبعی کا ثبوت دیا ۔ عطیہ بیگم نے اُن نغموں کو لکھنا چاہا کیونکہ وہ موقع
اظ سے موزوں تھے ۔ مگر اقبالؔ نے کنایتہً اُنہیں یہ کہہ کر روک دیا کہ اس قسم کے نغمے تفننِ طبع کے لئے ہوتے ہیں اور اِن کی افادیت
ہی موقعوں کے لئے ہوتی ہے

عطیہ کے کتابچہ سے اقبالؔ اور پروفیسر آرنلڈ (PROFESSOR ARNOLD) کے تعلّقات پر جدید پیرائے میں روشنی پڑتی ہے ۔ آرنلڈ
مڈن اورینٹل کالج علی گڑھ اور ڈی ، اے ، وی کالج لاہور کی خدمات کے بارے میں تاریخِ ادبیات اُردو میں دفتر کے دفتر سیاہ مل جائیں گے
دستانی جرائد کے سیاق و سباق میں مغربی مفکّر اور فاضل پروفیسر آرنلڈ کی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے ۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ
کو اقبالؔ بنانے اور اُن کی شاعرانہ فطری صلاحیتوں کو اُبھارنے میں آرنلڈ کا ہاتھ تھا ۔ عطیہ کے دورانِ قیام لندن کے تحریری حالات سے
اور آرنلڈ کے تعلّقات اور روابط پر روشنی پڑتی ہے ۔ آرنلڈ حالانکہ استاد تھے مگر اپنے فلسفی اور شاعر شاگرد پر نازاں تھے ۔ زندگی
لجھے اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کے لئے وہ اقبالؔ کے روبرو معاملات رکھنے میں عار محسوس نہ کرتے تھے ۔ اس ضمن میں عطیہ کی تحریر کا
اس غور طلب ہے ۔

"پہلی جون ۱۹۰۸ء کو پروفیسر آرنلڈ کی طرف سے دی گئی پکنک میں شامل ہوئی ۔ دریا کے کنارے ایک درخت
کے نیچے ضیافت کا بندوبست کیا گیا ۔ لندن کے شہرۂ آفاق فلسفی اور بعض اسکالر اس نشست میں موجود تھے ۔ ابتدا میں
کسی خاص موضوع پر بات چیت نہ ہو کر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں ۔ بعد ازاں پروفیسر آرنلڈ نے موضوع بدلا
اور حیات اور ممات کے سنجیدہ پہلو پر گفتگو کا آغاز کیا ۔ حاضرین میں ہر ایک نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا
مسئلہ کسی طرح حل نہ ہوتا تھا ۔ میں نے دیکھا اقبالؔ اس تمام وقفے میں خاموش رہے ۔ جب کسی طرح مسئلہ سلجھتا نظر نہ آیا
تو آرنلڈ نے اقبالؔ کی طرف رُخ کیا اور اپنے خیالات کی وضاحت چاہی ۔ میرے تحیّر کی انتہا نہ رہی جب اُنہوں نے
یہ کہہ کر مسئلہ کو ختم کر دیا کہ " زندگی موت کی ابتدا ہے اور موت زندگی کی ابتدا ہے " اقبالؔ کے خیال سے سب نے اتفاق کیا "

ایک اور واقعے کے بارے میں وہ لکھتی ہیں کہ جرمنی میں کسی عربی قلمی مسوّدے کی یافت ہوئی۔ آرنلڈ کے خیال میں اُس مسوّدے کو پڑھنے (DECIPHER) کے لئے اقبالؔ سے بہتر کوئی دوسری شخصیت موزوں نہیں تھی۔ عطیہ بیگم نے حسبِ ذیل مکالمہ لکھا ہے۔

"آرنلڈ :۔ مجھے جرمنی میں ایک عربی مسوّدہ ملا ہے۔ اقبالؔ میں اُسے پڑھنے کے لئے تمہیں بھیج رہا ہوں کیونکہ اِس ذمہ داری کے لئے تم ہی سب سے زیادہ موزوں ہو۔

اقبالؔ :۔ میں تو ابھی طفلِ مکتب ہوں جناب۔

آرنلڈ :۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے بھی سبقت لے جاؤ گے۔

اقبالؔ :۔ اگر آپ کا یہی خیال ہے تو میں اپنے استاد کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں۔ اور اُن کے ہر حکم کو بجا لانے کے لئے تیار ہوں۔"

ڈاکٹر آرنلڈ اقبالؔ کی کافی قدر و منزلت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اقبالؔ نے جرمنی زبان میں عطیہ کو خط لکھا۔ عبارت انشاء پردازی کا اعلیٰ نمونہ معلوم ہوتی تھی۔ زبان سلیس اور متن کی عبارت ادبی اور علمی جواہر ریزوں پر مشتمل تھی۔ جناب آرنلڈ نے یہ مکتوب عطیہ سے مانگ لیا اور تاحیات اُسے اپنے پاس محفوظ رکھا۔ پروفیسر آرنلڈ کے پاس اِس قسم کے نوادر اور بھی ہونگے۔ بہتر تو یہ ہے کہ جناب آرنلڈ کے موروثی حقداروں سے اُنہیں خرید لیا جائے۔ اِس سے اقبالؔ کی زندگی کے اور گوشوں پر بھی روشنی پڑے گی اور مزید تحقیق اور ریسرچ کے امکانات پیدا ہونگے اور یہ قلمی مسوّدے مفید ثابت ہونگے۔

اقبالؔ نے عطیہ کے نام اپنے خطوط کے ساتھ کئی غزلیں اور نظمیں بھیجی ہیں۔ شاعرِ مشرق نے بقلم خود اُن کے پس منظر کی وضاحت کی ہے اور جا بجا اپنے نظریات کی تشریح کی ہے۔ بعض مرتبہ انسان اپنے افعال اور کردار کے ادراک سے محروم ہوتا ہے۔ اور بالذّات اپنے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا ہے۔ اقبالؔ اپنے مکتوب مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۹ء میں لکھتے ہیں :۔

اقبال بھی اقبالؔ سے آگاہ نہیں ہے — کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے۔

اقبالؔ خوددار اور باوضع تھے۔ وہ چاپلوسی اور دنیاوی حاجت کے لئے دوسروں کے سامنے دست درازی اصولاً غلط سمجھتے تھے۔ وہ عطیہ کو لکھتے ہیں کہ اگر شمالی ہند کے لوگ میرے خلاف ہیں اور عزت و احترام نہیں کرتے تو واضح رہے کہ میں اُن کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ دوسرے کے سہارے جینا بھی کیا کوئی جینا ہے۔

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار — شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

اِسی خط میں آگے چل کر مزید لکھتے ہیں کہ انگریزی شاعر بائرن۔ گیٹے (جرمنی) اور شیلی کے ہمعصروں نے اُن کی قدر و منزلت نہیں کی۔ میری شاعرانہ پرواز اُن سے کہیں کم ہے مگر مجھے اس بات پر فخر ہے کہ اس معنیٰ میں مجھے اُن کی صف میں شمار ہونے کا شرف حاصل ہے۔

قنوطیت اور یاس انگریزی شعراء کی زندگی کا لازمہ ہے اور یہی قنوطیت اور یاسیت دنیا کی بڑی بڑی تخلیقات کو جنم دے چکی ہے شاعر شیلی کی شاعرانہ زندگی اِسی مئے غم میں ڈوب کر ابھری ہے اور جان کیٹس کے نغموں کو ابدی شہرت بھی اِسی سے عطا ہوئی ہے۔

"I FALL ON THE THORNS OF LIFE : I BLEED. (SHEELY)

"....... WHERE BUT TO THINK IS TO BE FULL OF SORROW...." 'KEATS'

اقبالؔ بھی قنوطیت اور یاسیات میں ڈوب جاتے ہیں مگر ان کا یاسیات امید افزا (OPTIMISM) ہے اور اس میں وہ قوم کی تعمیر نو تشکیل کے خواب دیکھتے ہیں۔ وہ خارجی حالات سے متاثر ضرور ہوتے ہیں لیکن داخلی طور پر وہ فانی کی طرح یاسیات یا ہجوم غم یا تفکرِ دوراں کا شکار نہیں ہوتے۔ اقبالؔ کا یاسیات قابلِ دید ہے۔

نیا ستوده دل آویزے از زخمهٔ مطرب نیست — بجوی چنار خورے نالہ جر باب اندر

یا ؎ میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے۔

"نوائے غم" کے عنوان سے بھی ہوئی ایک نظم میں وہ وضاحت کرتے ہیں

؎ زندگانی ہے مری مثلِ ربابِ خاموش

اقبال کے تجریدی فکر کا بغور مطالعہ کیجئے ان کی باغیانہ فطرت کے شعلے جا بجا اُن کی شاعری میں بھڑکتے ہوئے نظر آئیں گے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ تقدیر کا نوشتہ لوحِ مقدّس پر مرقوم ہے۔ اسد اللہ خاں غالبؔ نے بھی اس کا شکوہ کیا ہے۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق　　آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

اقبال نے بھی طنز کیا ہے اور لکھا ہے کہ

از لوحِ خویشتن باز پرس قصۂ ہجر ما ہائے　　آخر جواب ناسزا از لبِ ما شنیدۂ

اقبال کے احتجاج میں جنون یا وحشت انگیزی مجنونانہ کیفیت لئے ہوئے نہیں ہے۔ بلکہ سنجیدہ غور و فکر اور مہذب لہجہ کی کارفرمائی ہے وہ فیض کی طرح یہ نہیں کہتے کہ اگر لوح و قلم چھن بھی جائے تو انہیں غم نہیں ہے کیونکہ خونِ دل میں وہ اپنی انگلیاں ڈبو کر لکھ لیں گے۔ فیض تعلی آزادی کے متمنی ہیں جو بادی النظر میں درست اور خرد کے نزدیک سادہ لوحی ہے۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے　　کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

سیاہی اور قلم کی آزادی کے باوجود بھی شعر مذکور میں لوح مفقود ہے۔ بلا شبہ اقبال نے بھی جا بجا پروردگار سے استفسارات کئے ہیں۔ اس سے اُن کا مقصد انسان کی حاکمیت کی پرزور تائید ہے۔ اقبال نے اپنے شعری سخن میں مکمل خود سپردگی اور مشیتِ ایزدی کی رضا جوئی کی تلقین کی ہے۔ عطیہ کے نام فرستادہ خطوط میں وہ باغیانہ اشعار لکھ جاتے ہیں۔ اور ذات باری تعالیٰ سے مخاطب ہوتے ہیں۔

"ہستیم ما گدائے تو یا تو گدائے ماہستی　　بہرِ نیاز سجدۂ در پسِ ما دویدۂ"

یا ــ بجز و اسلام یا دیر و کعبہ بجز مسندِ سر کچھ نہیں ہے

ہنگامۂ دیر یک طرف شورش کعبہ یک طرف　　از آفرینشِ جہاں دردِ سرے خریدۂ

اقبال اپنے اشعار میں سائنس کے اصول کا خصوصی التزام رکھتے ہیں یہ بات عام ہے کہ پانی بھاپ بن کر آسمان کی طرف اڑ جاتا ہے۔ شبنم کے قطرہ کو بھاپ میں تحلیل ہو جانے کو اقبال کس خوبصورتی سے ادا کرتے ہیں۔ مشرقی مزاجِ شاعری کے اعتبار سے ستم کی حالت میں فلک سے داد رسی ہوتی ہے اقبال کے کلام کے شعری محاسن کی خوبی اردو ادب میں شاذ ہے۔

اے شبنم از فضائے گل آخر ستم چہ دیدۂ　　دامن ز سبزہ چیدۂ تا بفلک رسیدۂ

عطیہ کو اقبال نے جو خطوط لکھے ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال غالب کی فارسی تراکیب اور لفظی بندش سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔

خندہ ہے ہر طلسمِ غنچہ تمہیدِ شکست　　تو تبسم سے میری کلیوں کو نامحرم سمجھ
درد کے پانی سے ہے سرسبزیٔ کشتِ سخن　　فطرتِ شاعر کے آئینے میں جو ہر غم سمجھ

علامہ اقبال کو علی گڑھ یونیورسٹی نے شعبۂ فلسفہ کی پروفیسری کی پیشکش کی لیکن اقبال اُسے ٹھکرا دیتے ہیں اور ازدواجی حالات کے پیش و پیش کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے۔ عطیہ نے اقبال کے انکار کی وجہ اُن کی ازدواجی زندگی کی تلخی کی طرف اشارہ کیا ہے بظاہر بات معمولی ہے لیکن اس کے نتائج دور رس ہیں۔ اس انکار سے ایک مسلم ادارہ علامہ کی عظیم خدمات سے محروم ہو گیا۔ عطیہ کے نام اقبال کے خطوط سے اس پہلو پر اقبال کی داخلی نفسیات پر روشنی پڑتی ہے۔ الغرض یہ خطوط اقبال کی داخلی اور خارجی نفسیات کا بہتر مطالعہ ہیں اگر تسلسل کی یہ کڑی نہ ہوتی تو اقبال کی زندگی کے کئی گوشے تاریک ہوتے اور ہر پہلو کے کئی پہلو ضعیف رہ جاتے۔ عطیہ بیگم نے یہ خطوط شائع فرما کر اور اپنے ریویو کے اضافے کر کے اردو ادب پر زبردست احسان کیا ہے۔ یہ کتابچہ نقدِ اقبال پر مستند تحقیق ہے۔

شاعر بمبئی

محمد ابراہیم

کلیم الدین احمد کی زبان اور انکا اندازِ بیان

بیان کا مسئلہ زبان کا مسئلہ ہے، حسنِ بیان اور اُسکے بعد انفرادیت کا مسئلہ ادب کا مسئلہ ہے۔ حسنِ بیان کے لئے وضاحت پہلی شرط ہے۔ اس وضاحت کے راستے میں جو چیز بھی حائل ہو وہ عیب ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ بیان میں ابہام یا اشکال الفاظ سے کم اور خیال سے زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ واضح خیال اپنے ساتھ واضح زبان لاتا ہے۔ گویا واضح خیال کا موزوں الفاظ میں اظہار اسلوب ہے یا آل احمد سرور کی زبان میں اسٹائل "معنی کی موزوں تفصیل ہے"۔

عہدِ حاضر میں ہمیں کئی ایسے صاحب نظر ملتے ہیں جنہوں نے عروسِ اُردو کو سنوارنے، نکھارنے اور حُسن و قبح میں فرق بتانے کا نمایاں کام انجام دیا ہے۔ اختر اورینوی، احتشام حسین، آل احمد سرور، احمد صدیق مجنوں، وقار عظیم، خواجہ احمد فاروقی، اور کلیم الدین احمد وغیرہم اچھی تنقیدی نگاہ اور فنی بصیرت سے ادب کے تاریک گوشوں کو منور کر رہے ہیں۔ ان حضرات کی تخلیقات ہمارے ادب کا قیمتی اثاثہ بلکہ روح ہیں۔

لیکن مذکورہ بالا ناقدین میں جس نام نے اُردو تنقید کی دُنیا میں ہلچل پیدا کی ہے وہ نام کلیم الدین احمد کا ہے یہ نام سب سے زیادہ چونکا دینے والا اور سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس نام نے اُردو تنقید نگاری کو نیا مزاج، نیا آہنگ اور نیا روپ عطا کیا۔ اس نام نے کسی کی تقلید نہیں کی بلکہ ماضی پرستی سے انحراف کیا اور روایت سے بغاوت کی۔

کلیم الدین احمد سے پہلے بھی اُردو نے کئی اچھے اور صاحب طرز ادیب پیدا کئے۔ ان میں آزاد، حالی اور شبلی کا نام نمایاں ہے۔ ان حضرات نے بھی محسوس کیا تھا کہ اگر ہمیں کچھ سیکھنا ہے، کچھ جاننا ہے اور اپنے ادب کو وسیع و ہمہ گیر بنانا ہے تو مغربی ادب کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ کلیم الدین احمد کا نام اِس جہت سے اور بھی اہم ہے۔ اُن کا مطالعہ مغربی ادب پر بڑا گہرا اور وسیع ہے۔ اور اُنہوں نے اُردو تنقید میں بھی مغربی نقادوں کے اصول کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اُردو ادب کو اُسی بلندی اور اس زینے پر دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ جس جگہ آج مغرب کا ادب پہنچ چکا ہے۔

اُنکی کتابوں کے مطالعہ کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ جس طرح ایف۔ آر۔ لیوس حقیقتوں کو بیان کرنے میں تلخ الفاظ سے کام لیتا ہے۔ اسی طرح کلیم الدین احمد بھی تلخی سے کام لیتے ہیں۔ وہ اِس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اگر کوئی نقاد اُردو ادب کی کم مائیگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ تو اِسکا مطلب مذاق اُڑانا مقصود نہیں بلکہ ادیبوں میں وہ ذہنی بیداری پیدا کرنا ہے جس سے ادب کو روشنی ملے۔ اور ادب اُردو کے تمام تاریک گوشے منور ہو جائیں۔ کلیم الدین احمد کے اِن جملوں میں بڑا خلوص اور بڑی محبت ہے — اور ایک نقاد کے لئے جس بات کی سب سے پہلے ضرورت ہوتی ہے۔ وہ جذبے کا خلوص ہے، ذہن کی غیر جانبداری اور دل کی کشادگی ہے۔ کلیم الدین احمد نے بڑی بے باکی اور صاف گوئی سے اُردو تنقید کی کمزوریوں اور خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ یہ کہتے ہوئے ذرا بھی نہ جھجکے کہ "غزل ایک نیم وحشی صنفِ شاعری ہے"۔

شاعر بمبئی

اور نہ یہ لکھتے وقت اُن کو ہچکچاہٹ ہوئی کہ "اُردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے' یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر" — اُن کی اس تیزی اور طراری نے اُن کو ترقی پسندوں سے گالیاں بھی سنوائیں اور اُن کے مندرجہ بالا قول پر احتشام حسین کا یہ طنزیہ جملہ کہ "پھر اس خیالی نقطہ پر ڈھائی سو صفحات کی کتاب لکھنا کیا معنی؟" بھی صادر ہوا — مگر وہ اپنے اصول اور اپنے نقطۂ نظر پر ہمیشہ قائم رہے۔ اُنہوں نے اس راہ کو کبھی نہیں چھوڑا جس پر وہ چل پڑے تھے۔

اُن کی کتابوں (فن داستان گوئی' اُردو شاعری پر ایک نظر' اُردو تنقید پر ایک نظر' سخنہائے گفتنی اور عملی تنقید) کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ

(۱) کلیم الدین احمد کی زبان' الفاظ' جملے اور تراکیب پر منفی اثرات غالب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہنر پر نہیں' عیب پر نگاہ رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "غزل ایک نیم وحشی صنف شاعری ہے"۔ اسی کو وہ یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ "غزل ایک نیم مہذب صنفِ سخن ہے"۔

(۲) کلیم الدین احمد اپنی بات کہنے میں قطعیت اور اسقدر انانیت کا اظہار کرتے ہیں جس سے اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔

(۳) کلیم الدین احمد کی زبان تجزیاتی اور سائنسی ہے' تشریحاتی یا تاثراتی نہیں۔ اس لئے اُنکی زبان میں متانت' سنجیدگی اور سکون کا احساس ہوتا ہے۔

(۴) کلیم الدین احمد الفاظ' جملے اور اور تراکیب کے استعمال میں بہت ہی کفایت شعار واقع ہوئے ہیں۔ وہ غزل کے متعلق یہ نہیں کہتے کہ "اردو شاعری کی آبرو ہے"۔ اور نہ سرور کی طرح غزل کو تاج محل بناتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "غزل اُردو کی محبوب صنفِ شاعری ہے لیکن اُردو میں شعر اور غزل جانچنے کے لئے اصول نہیں ملتے" (عملی تنقید) — یہی اندازان کا ہر جگہ ہے' ہمیشہ وہ کام کی بات کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انکی زبان احتشام حسین کی طرح نہ گنجلک ہے اور نہ آل احمد سرور کی طرح سرور بخش۔ لیکن تازگی اور شگفتگی کا احساس ہر جگہ ہوتا ہے۔

(۵) کلیم الدین احمد دوسرے نقادوں کی طرح اصلاح ساز نہیں ہیں' اُن کے ہاں نہ جمالیات وجدلیات کی بحث ہے اور نہ اشتراکیت واشتمالیت کا جھگڑا۔ وہ "مقدس سنجیدگی" اور "شیریں دیوانگی" سے بھی دُور رہتے ہیں۔ اسی لئے وہ میر کی شاعری کے رنگ کو "شبنمی" نہیں بتاتے۔

(۶) کلیم الدین احمد کے ہاں جانبدارانہ اور مخاصمانہ جذبہ نہیں ملتا۔ اُنکی زبان میں قطعیت' بے باکی' اور غیر جانبداری۔ وہ "دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی" کے اصول پر عمل کرتے ہیں۔ جس سے ایک قسم کی سختی' جبر اور بے دردی کا احساس ہوتا ہے — اور یہی وجہ ہے کہ ہم اُن کی ہمدردی اور اُن کے خلوص کی قدر نہیں کر پاتے۔

باایں ہمہ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ کلیم الدین احمد کی زبان ایک منصف ایک جج کی زبان ہے' وکیل کی نہیں — اور وہ اپنے خیال کی وضاحت کے لئے واضح' صاف اور ستھری زبان استعمال کرتے ہیں۔ جو تنقیدی زبان سے بہت قریب ہے۔

سلام مچھلی شہری — ایک منظوم خط

پھول زخمی ہیں۔۔۔!

— تم نے "شاعر" میں کئی بار لکھا ہے اعجاز
دورِ حاضر میں خیالات پریشاں کیوں ہیں
بزمِ گل پوش وہی، شمع وہی، ساز وہی
پھر بھی انساں کے نغمات پریشاں کیوں ہیں
کیسے اس صورتِ حاضر کا مداوا ہوگا
کون بیمار زمانے کا مسیحا ہوگا۔؟

دردِ جذبات کا دیرینہ شناسا ہوں میں
شعلۂ ہائے نگہ سرد کو چھو سکتا ہوں
یوں تو بربادِ مئے، جام ہوں لیکن اے دوست
میں تمہارے دلِ پُر درد کو چھو سکتا ہوں

— میں بھی ہنستے ہوئے پھولوں سے کہا کرتا ہوں
کیوں پریشان و فسردہ ہے تمہاری خوشبو
میں بھی یہ پوچھتا رہتا ہوں مہ و انجم سے
نورِ افلاک ہے کیوں مادرِ گیتی کا عدو
میں بھی نوخیز حسینوں سے کہا کرتا ہوں
سُونا سُونا سا ہے کیوں جلوۂ چشم و گیسو
میں بھی اس فکر میں غلطاں ہی رہا کرتا ہوں
کیا ہوئے وادیٔ تاتار کے دلکش آہو
میں بھی کچھ سوچ کے مسجد کی طرف تکتا ہوں
شیخ جی آتے ہیں میخانہ سے جب بے وضو
میں بھی جب دیکھتا ہوں برہمن و راہب کو
یہ خیال آتا ہے، کیوں خشک سا ہے ان کا لہو

میں بھی ہر صبح ہواؤں سے کہا کرتا ہوں
کیوں مرے گھر کے شگوفوں میں نہیں جوشِ نمو
دل میں برپا نئے طوفان کئے رہتے ہیں
یہ خیالات پریشان کئے رہتے ہیں

— میرے اس خط کا ہے موضوع بہت پیچیدہ
شاعری ہی سے یہاں بات نہیں بن سکتی
پھر بھی گیتوں ہی سے خورشید اُگانا ہوگا
صبحِ گلپوش اگر رات نہیں بن سکتی

— آؤ، یہ کہہ دیں کہ مغرورِ سیاست دانو!
ادب و شعر کی دنیا کو نہ برباد کرو
آؤ یہ کہہ دیں نئے دور کے دیوانوں سے
شہرِ جذبات کی لیلیٰ کو نہ برباد کرو
آؤ آواز دیں، تہذیب کے نعرہ بازو
دل کی پُر نور فضاؤں کو نہ برباد کرو
آؤ سائنس کے تخریبی عناصر سے کہیں
جلوۂ گلشنِ دنیا کو نہ برباد کرو
کسی وحشی، کسی صیاد کے پیچیدہ،
اپنے حالات اِن ہی افراد کے پروردہ

— آج پُر نور و ضیا بار منادر پُر شور
جنتِ ارض کے خاموش مناظر پُر شور
گیت تُلسی کے تو غالبؔ کی غزل گریہ کُناں
شالیمار اور حسیں تاج محل گریہ کناں

آج سنتور پریشاں ہے تو بنسی پرشور
آج جمنا ہے پریشان تو راوی پرشور
فکر و دانش کے چراغوں کے ہیں جلوے پرشور
آج ہیں وارث و اقبال کے نغمے پرشور
گردواروں میں فغاں، مسجد و مندر میں فغاں
وہ قیامت ہے کہ خاموش مقابر میں فغاں۔!

— کون بھیرے ہوئے جذبات کا ہے ذمّے دار
کون اس صورتِ حالات کا ہے ذمّے دار؟
یہ سوالات نہ اٹھیں تو فضا بہتر ہو
جو بھی ہو، اے مرے گیتوں کے خدا! بہتر ہو:
یہ حلیطِ گل یہ ہیں شبنم سے بھی نازک یہ گیت
میر و میرا کے حسیں غم سے بھی نازک یہ گیت
میں نے ہر دور میں انساں کے لئے لکھے ہیں
ایک عہدِ گہر افشاں کے لئے لکھے ہیں
عکس ان گیتوں میں ہیں پھولوں کے مہکتا دل کے
یہ نمائندہ ہیں بچّوں کے حسیں خوابوں کے
ان میں اُگتے ہوئے پودوں کی تمنّائیں ہیں
ان میں ہر ماں کی مچلتی ہوئی آشائیں ہیں
ان میں مسجد کی اذانوں کی صدا پنہاں ہے
ان میں پُرنور منادر کی فضا پنہاں ہے
یہ ہیں منسوب مقدّس تریں دیوتاؤں سے
میں نے یہ گیت لکھے ہیں بڑی آشاؤں سے
میری آشاؤں کو نسبت ہے نئی دنیا سے
اے خدا! مجھکو محبت ہے نئی دنیا سے

— شاعروں اور کلاکاروں کی آشائیں بھی
اُن کے گاتے ہوئے خواب اور تمنّائیں بھی
"عام جنتا" کی نمائندہ ہوا کرتی ہیں
ان کے جذبات کو گیتوں میں ادا کرتی ہیں

— سردار جعفری

شاعر ممبئی

میں بھی "جنتا" کا نمائندہ ہوں، یہ یاد رہے
اے خدا! جنّتِ گیتی مری آباد رہے

— پھول کی بات ہے پھولوں کی فضا بنتی ہے
آگ کی بات سے شعلوں کی فضا بنتی ہے
— آؤ، ہم نور ہیں تاروں کی چمک لے کے چلیں
جس طرف آگ ہو پھولوں کی مہک لے کے چلیں
لبِ گوتم کا ضیا بار تبسم لے کر
نکہتِ لالہ و گل، پرچمِ انجم لے کر
شدّتِ حسرتِ منزل کو بڑھاتے جائیں
ہم یونہی قافلۂ دل کو بڑھاتے جائیں۔!

— لوگ کہتے ہیں کہ رسوا سرِ بازار ہوں میں
جعفری کو یہ بڑا غم ہے کہ مے خوار ہوں میں
چند احباب یہ کہتے ہیں کہ بیمار ہوں میں
اور میں خود یہ سمجھتا ہوں کہ خوددار ہوں میں
اسی خودداریِ افکار کی سوگند اٹھا کر!
اپنے نازک تریں اشعار کی سوگند اٹھا کر
میں اگر چاہوں تو انگارہ بھی بن سکتا ہوں
ایک طوفان کا نظّارہ بھی بن سکتا ہوں
لیکن اٹھتا ہی نہیں آج کوئی ایسا سوال
میں نے دیکھا ہے شرربارِ خیالوں کا مآل
میں نے سوچا ہے، سمجھ میں بھی مری آیا ہے
آگ بھی دردِ دلِ گل ہی کا اِک سایہ ہے
قہر ہے پھولوں میں اک حشر بپا ہو جانا
"درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا"

— پھر بھی میرا یہ عقیدہ ہے یہ ایں نکہت و نور
گلشنِ معبدِ گیتی میں بہاراں ہوگی
بزمِ انجم سے حسیں، بزمِ ارم سے بہتر

آج کی جاگی ہوئی محفلِ انساں ہوگی
اور یہ کام کلاکار ہی کر سکتے ہیں!
معبدِ فکر کے معمار ہی کر سکتے ہیں!
ہم کو پھولوں کی ضرورت ہے شراروں کی نہیں
ہم کو نغموں کی ضرورت ہے پکاروں کی نہیں
آؤ تہذیب کو پہونچائیں سلامِ تہذیب
آؤ اعلان کریں ہم یہ بنامِ تہذیب
نور و نکہت کا یہ طوفان نہیں مر سکتا
شعلۂ جنگ میں انسان نہیں مر سکتا

— آؤ، ہم ساری زبانوں کے ادیبوں سے کہیں
عظمتِ فکر کے خاموش نقیبوں سے کہیں
امن و تہذیب کی ہے آج فضا خطرے میں
شاعری نالہ کناں ہے، کویتا خطرے میں
پوجا مندر میں پریشاں ہے، دعا خطرے میں
ایشور خطرے میں ہے آج، خدا خطرے میں
یہ تو ظاہر ہے کہ انسان نہیں مر سکتا
نور و نکہت کا یہ طوفان نہیں مر سکتا
پھر بھی خطرات سے بچ رہنے کی تدبیر کریں
نورِ افکار سے ہر ابر کو زنجیر کریں
رنگ و خوشبو کے تصور کو امر رکھنا ہے
ایک دل، ایک خیال، ایک نظر رکھنا ہے
دورِ یکجہتیِ افکار و خیالات ہے یہ
ہم سے ہو جائے تو پھر سب سے بڑی بات ہے یہ

— اب اجازت دو، تھکا ہارا ہوں، افسردہ ہوں
یعنی کچھ صورتِ حالات سے آزردہ ہوں

ابھی کچھ دیر میں بچوں کا خیال آئے گا
اپنے آنگن کے شگوفوں کا خیال آئے گا
اور میں چاند سے پوچھوں گا، یہ خاموش ہیں کیوں
جو بھی حالات ہیں وہ اتنے اعمل کوش ہیں کیوں
شاعری ایک سہارا ہے کئے جاتا ہوں
زندگانی یہ ہے ایمان، جئے جاتا ہوں

— تم کہو، ان دنوں موسم کی ہوا کیسی ہے
"بمبئی" کی مری محبوب فضا کیسی ہے
مرے احباب ملیں گر تو انہیں کہنا سلام
یہ بھی کہنا کہ ہوں کچھ اور خرابِ مے و جام
پھر بھی عقیدی ہوں، بہر حال جئے جاتا ہوں
اپنے انداز سے کچھ کام کئے جاتا ہوں

— ہاں مجھے یاد ہے موجِ سمنِ خلدِ نشاط[1]
کتنی رنگین تھی وہ انجمنِ خلدِ نشاط
اور کیا لکھوں کہ اب شام ہوئی جاتی ہے
روشنی دود و دسِ جام ہوئی جاتی ہے
تم ہمیشہ ہی رہے ہو مرے دل کو محبوب
خط کی تکنیک میں یہ نظم ہے تم سے منسوب
میں سمجھتا ہوں بہر حال کہ تم اچھے ہوگے
اپنے افکارِ تر و تازہ میں ڈوبے ہوگے
شعرا، یوں تو مجھے کہتے ہیں ننگِ خیام
لاج رکھنا
کہ ہوں اعجاز!
تمہارا ہی ——— سلام!!!

[1] ڈاکٹر ایس۔ایس نشاط (بمبئی)

نازش (پرتاپگڑھی)

انتباہ

(ہندوستان اور پاکستان کے فسادات سے متاثر ہوکر)

سنو گردش سکو ذہنیت بیمار کے لوگو! — ادھر کے رہنے والو اور سرحد پار کے لوگو!

خبر ہے مجھ کو گردِ تیرگی سے اَٹ چکے ہو تم — میں یہ بھی جانتا ہوں راستے سے ہٹ چکے ہو تم

دکھاؤں گا میں آئینہ تو آتش زیر پا ہو گے — مجھے احساس ہے تم میری باتوں سے خفا ہو گے

مگر میں ایک شاعر جس کو دنیا سے نہ ڈرنا ہے — کوئی خوش ہو کہ ناخوش مجھکو اپنا کام کرنا ہے

فروغِ عظمتِ کردار کا ساماں کر دینا — مرے ذمے ہے سچی بات کا اعلان کر دینا

قلم کے واسطوں سے آج اک پیغام دیتا ہوں
یہ پیغامِ صداقت میں تمہارے نام دیتا ہوں

ادھر کے رہنے والو اور سرحد پار کے لوگو — سنو گردش سکو تم اے غلط اطوار کے لوگو

تمہارے راستے پر مشعلِ ایماں جلاتا ہوں — میں تم کو آج دین اور دھرم کے معنی بتاتا ہوں

سنو لطف و محبت دھرم کا پیغام ہوتا ہے — فقط یارانِ رحمت مقصدِ اسلام ہوتا ہے

کرم بھائی پہ جو فرمائے اسکو رام کہتے ہیں — جو غیروں کو بھی اپنائے اسے اسلام کہتے ہیں

اہنسا داد کب ذی روح پر خنجر چلاتا ہے — مسلماں ذمیوں کو جان تک دے کر بچاتا ہے

فغاں ہے دولتِ اخلاقِ بہتر کھو گئی تم سے — خود انساں کی سرافرازی نگوں سر ہو گئی تم سے

تمہارے فعل پر نادم ہے کردارِ درخشندہ — تمہارے جرم پر اسلاف کی روحیں ہیں شرمندہ

ادھر گوتم کے مت سے اپنا رشتہ توڑ بیٹھے ہو — ادھر پیغمبرِ برحق کا رستہ چھوڑ بیٹھے ہو

ادھر حق کے اصولوں کو تماشہ کر دیا تم نے — ادھر دینِ خدا کو سخت رسوا کر دیا تم نے

گناہوں سے تمہارے چشم پوشی کر نہیں سکتا — مگر الزام بھی تنہا تمہیں پر دھر نہیں سکتا

شاعر بمبئی

جو قوم و ملک کے دشمن ہیں سازش جنکی فطرت ہے
تمہاری گمرہی اُن چند لوگوں کی بدولت ہے

بنام راستی حد درجہ بہکایا گیا تم کو
تعصب کے گھنے جنگل میں پہونچایا گیا تم کو

سمجھ کر منزل اپنی دشمنی کے تنگ ڈیروں میں
بھٹکتے پھر رہے ہو تم عداوت کے اندھیروں میں

چھُپی ہے منزلِ انسانیت کی رہگذر تم سے
تمہارے راستوں نے چھین لی ہے خود نظر سے

مسلسل ڈس رہے ہیں چند مارِ آستیں تم کو
قیامت ہے کہ احساسِ زیاں ہوتا نہیں تم کو

نہ سنبھلو گے تو مِٹ جاؤ گے بے کردار کے لوگو

اِدھر کے رہنے والو اور سرحد پار کے لوگو!

جو رہ جاؤ گے ہو کر دہر میں بدنام کیا ہو گا
تمہیں سوچو کہ اِس آغاز کا انجام کیا ہوگا

تمہیں کیا ہو گیا آخر جو اپنا بھُول بیٹھے ہو
بشر تو چیز کیا ہے' تم خدا کو بھُول بیٹھے ہو

یہ عالم ہے گوارائی کی عادت تک نہیں تم میں
محبت تو بڑی شے ہے مُروّت تک نہیں تم میں

بہت بدنام ہر رسمِ رواداری ہوئی تم سے
جبینِ عظمتِ آدم بالآخر جھک گئی تم سے

اڑی ہیں دھجیاں ہر لمحہ دامانِ اخوت کی
مسلسل تم سے رُسوائی ہوئی ہے آدمیت کی

خود اپنے بھائیوں کے رنج کا سامان بنتے ہو
تباہیٔ وطن کا اِک نیا عنوان بنتے ہو!

فساد و شر کے مخزن' ظلم کے انبار ٹھہرے ہو
پئے اِنسانیت اِک مستقل آزار ٹھہرے ہو

نتیجہ کیا نکالو گے تم اِس غفلت شعاری سے
ملے گا کیا تمہیں انسانیت کی شرمساری سے

کہاں ٹھہرو گے آخر تنگ اِس درجہ نظر کر کے
کہاں پہونچو گے تم نفرت کو اپنا ہمسفر کر کے

تمہارے عہدِ مستقبل پہ ظلمت بن کے چھائے گی
تمہاری ہر غلط کاری تمہیں نیچا دکھائیگی

تمہارا ہر غلط اقدام اِک دن رنگ لائے گا
مسلسل جرم تم دونوں کو لیکر ڈُوب جائیگا

تمہاری ذلت و رُسوائی کے سامان اُگلے گی
لہُو بوتے ہو جس دھرتی پہ وہ طوفان اُگلے گی

اِدھر کے رہنے والو اور سرحد پار کے لوگو!
سُنو گر سُن سکو ذہنیتِ بیمار کے لوگو!

شاعر بمبئی

یوسف ناظم

امرت

نہیں کہ ہم کو گوارا نہیں غمِ دَوراں
نہیں کہ ہم میں نہیں طاقتِ شکیبائی
مگر کبھی یہ تمنّا بھی دل میں ہوتی ہے
یہ روز و شب جو بڑے سخت ہیں، یہ بدلیں
مثالِ برگِ گُلِ تازہ" نرم ہو جائیں
جو گرد ان پہ جمی ہے، وہ گرد ڈھل جائے

طلوعِ نظمِ جہاں ہو کچھ اس طرح یارب
نگارِ صُبح کے چہرہ پہ ہو خلوص لکھا
سنہری دُھوپ میں رقصاں ہو رنگتِ یکجہتی
یگانگت سے منوّر ہو شام کا آنچل
جو جذب کرلے زمانہ کے درد کے آنسو
ردائے شب میں ہو آسودگی کی وہ ٹھنڈک
کہ آگ نفرت و عِصیاں کی سَرد ہو جائے
نہیں کہ حوصلۂ زیست اب نہیں باقی
مگر کبھی یہ تمنّا بھی جاگ پڑتی ہے
کہیں سے آئے وہ آواز جس میں خوشبو ہے
نسیمِ مہر و وفا کی، شمیمِ الفت کی
کوئی سنائے وہ نغمہ کہ دل دھڑک جائے
وہ گیت جس میں محبت کا لفظ آجائے
برائے نام سہی، پھر بھی ہم سمجھ لیں گے
کہ زندگی کی سیہ رات کے اجالے ہیں
علاوہ زہر کے کچھ اور بھی میسّر ہے

ارشد صدیقی

نوید

زندگی اسقدر سرگراں تو نہ تھی
آج مجھکو نہ جانے یہ کیا ہو گیا
ذہن و دِل جیسے مفلوج سے ہو گئے
میرا احساس جانے کہاں سو گیا

کوئی آہٹ نہیں کوئی نغمہ نہیں
آرزوؤں کی پلکیں بھی ویران ہیں
دُور تک بھی تصوّر کا سایہ نہیں
راہ خاموش ہے لمحے سنسان ہیں

خوابزاروں پہ اک دُھند سی چھا گئی
زخم ہنستے نہیں پھول کھلتے نہیں
کوئی بھی تو نہیں کسکو آواز دُوں
یادِ ماضی کے بھی ہونٹ ہلتے نہیں

بیٹھا جاتا ہے پہلو میں دل اسطرح
جیسے خاموش پانی میں پتھر کوئی
ریشہ ریشہ گھٹن لمحہ لمحہ اجل
زیست سہمی ہوئی رُوح ٹھٹھری ہوئی

ہر طرف بے حسی ہر طرف خامشی
ہر طرف موت ہی موت کی تیرگی
آج مجھکو نہ جانے یہ کیا ہو گیا
زندگی اسقدر سرگراں تو نہ تھی

مجھکو یہ تیرگی کھا نہ جائے کہیں
اپنی یادوں کی کوئی کرن بھیج دو

عنوان چشتی

تاج محل

یہ دلآویز فضا اور یہ دلکش منظر
جیسے آئینۂ فطرت میں سنورتا ہو کوئی
یہ حسیں نہر، یہ دریا، یہ چمن اور بہار
رنگ جیسے کسی تصویر میں بھرتا ہو کوئی

یہ مچلتے ہوئے لہراتے ہوئے فوّارے
کہکشاں ساز حسینوں کا تبسم جیسے
پس منظر میں یہ آکاش کا نیلا دریا
کسی دوشیزہ کا خاموش تکلم جیسے

خواب زاروں سے اُتر آئی ہیں جیسے پریاں
ہائے یہ سرو قد و سیم بر و زہرہ جبیں
کوئی عذرا، کوئی شیشا تو کوئی میری
وادیٔ تاج محل شہر بُتاں ہے کہ نہیں

بُت تراشی ہو کہ نقاشی و آئینہ گری
یا وہ رنگوں سے بنائی ہوئی تصویریں ہوں
ساز کی مدھ بھری آواز ہو یا پیار کی لے
شوخ غزلیں ہوں کہ سنجیدہ سی تحریریں ہوں
شاعر بھی

رقص میں یا کسی رقاصہ کی نیم انگڑائی
اور لہرائے ہوئے جسم کا ہر نقش جواں
تال کے ساتھ لچکتی ہوئی بل کھاتی ہوئی
مرمریں جسم کی لے ہو کہ وہ ابرو کی کماں

زندگی جھوم کے جب ساز اٹھا لیتی ہے
کیف ہی کیف برستا ہے غزل کی صورت
خونِ دل اسمیں تاثر کو بڑھا دیتا ہے
بولنے لگتا ہے فن تاج محل کی صورت
دستِ جمنا میں محبت کے کنول کی صورت

اک بہانہ ہوا ممتاز محل کا ارماں
ہند و ایران کے کلچر سے یہ تصویر بنی
کتنا بیدار نظر آتا ہے احساسِ جمال
خونِ دل خونِ تمنا سے یہ تحریر بنی

چاندنی رات کی بیساختہ انگڑائی پر
چھیڑ دی پچھلے پہر جیسے ستاروں نے غزل
فیصلہ تجھ پہ ہی رکھتا ہوں میں اے جانِ بہار

مرمریں خواب کی تعبیر ہے یا تاج محل

اے مری مونس و دمساز ذرا شوق سے دیکھ
اک شہنشاہ کے خوابوں کا جزیرہ ہے یہ
فن کی معراج ہے یہ پیار کی معراج کے ساتھ
حسنِ دل، حسنِ نظر، حسنِ تمنا ہے یہ
عشق کا بارگہِ حسن میں سجدہ ہے یہ

تاج اک جلوہ گہِ حسن و محبت ہی نہیں
اِس سے اِک عظمتِ تہذیب کرم باقی ہے
تیرے جلووں کی جواں سال بہاروں کی قسم
اِس سے صدیوں کی شرافت کا بھرم باقی ہے

سوہنی اور دمنتی ہیں ابھی تک شاہد
صنفِ نازک کے ہر انداز جواں کو پوجا
ہر رفیقہ کو یہاں تخت دیا تاج دیا
ہر جہانگیر نے اک نورجہاں کو پوجا

کیا حقیقت یہ نہیں ہے کہ وطن والوں نے
رام کو بعد میں، سیتا کو پکارا پہلے
چاند بی بی کی قسم اہلیا بائی کی قسم
کرشن کو بعد میں رادھا کو پکارا پہلے
اور ہر بیجو نے میرا کو پکارا پہلے

بات سے بات نکلتی ہے اِسے کیا کہیے
آج خطرے میں ہے محبوبۂ فردوسِ وطن
وہ اجنتا کی گپھائیں ہوں کہ نالندہ ہو
آج خطرے میں ہے ہر مرکزِ تہذیبِ کہن

قلعہ و تاج و اجنتا و گیا کی سوگند
بغض کی آگ سے ہے گنگ و جمن کو خطرہ
بھاکڑا ڈیم ہی محفوظ نہ لچھمن جھولا
قوم کو خطرہ ہے، اِس وقت وطن کو خطرہ

وہ مساجد کے ہوں مینار کہ مندر کا کلس
گردوارہ ہو، کلیسا ہو کہ آتش خانہ
آج خطرے میں ہے ایمان سے جاں تک ہر شے
یہ حقیقت ہی حقیقت ہے نہیں افسانہ
میری محبوبہ مجھے تو نہ سمجھ دیوانہ

قوم زندہ ہے تو فنکار نہیں مر سکتا
تاج باقی ہے تو پھر پیار نہیں مر سکتا

خالد شفائی

وہ رات

وہ رات کہ جس کے ماتھے پر مہتاب کا ٹیکہ رخشاں تھا
وہ رات کہ ہاتھوں میں جس کے بجتے تھے ستاروں کے کنگن
وہ رات کہ جس کے گیسو میں خنداں تھی چمکتی کاہکشاں
وہ رات کہ سج دھج میں اپنی لگتی تھی اِک البیلی سی دُلہن

★

وہ رات کہ جب جگمگ جگمگ نیلم کے جھروکے میں ہنسکر
چندا کے نگر کی شہزادی سیمیں آنچل لہراتی تھی
ہر وادی میں ہر گلشن میں، ہر کوہ و دشت و میداں میں
کرنوں کا ساز بجاتی تھی، نغموں کے پھول کھلاتی تھی

★

وہ رات کہ جب ارمان بھری روحیں ملتی تھیں چھپ چھپ کر
وہ رات کہ جب ماں کی ممتا لوری دے دے کر ہنستی تھی
وہ رات کہ شہرِ خلوت میں جب پیار کی سجتی تھی ڈولی
وہ رات کہ جب چاہت کو لئے جیون کی نگریا بستی تھی

★

وہ رات کہ جب بوڑھے دادا چوپال میں حقّے کے کش پر
بھولے بھالے اِنسانوں کا قصّوں سے جی بہلاتے تھے
وہ رات کہ جب کڑیل گبرو خاموش فضا میں بستی کی
گیتوں کی رسیلی تانوں پر بل کھا کھا کر اِٹھلاتے تھے

وہ رات کہ آنگن میں گھر کے ننھے منّے معصوم کنول
مسکاتے تھے تتلاتے تھے، ناز و انداز دکھاتے تھے!
وہ رات کہ جب اِس دھرتی پر امبر کی سنہری محفل سے
رحمت کے فرشتے نیندوں کی سوغاتیں لیکر آتے تھے

★

اُس رات کو ظلم پرستوں نے خاک و خوں میں نہلا ڈالے
اُس رات کی سندر پیشانی بھڑکے شعلوں میں جلتی ہے
ہر سمت ہے سیلِ بربادی، ہر سو ہے تباہی اور وحشت
اُس رات کے سندر دامن میں، فطرتِ ابلیس کی پلتی ہے

★

آباد نشیمن تھے جتنے وہ آج بنے ہیں ویرانے
تبدیل ہوئے ہیں کھنڈروں میں شہر خوباں، ہنستے قصبے
شیطانِ ہلاکت کے رقصاں، قریہ قریہ، بستی بستی
گلیوں گلیوں، کوچے کوچے ہر سمت تڑپتے ہیں لاشے

★

ملک و ملت کے محافظ بھی ہیں آج لٹیروں کی صف میں
امن و قانون کے رکھوالے جیون کے دیئے گل کرتے ہیں
کمزوروں اور نہتوں پر وہ ٹوٹتے ہیں بجلی کی طرح
مجبوروں اور لاچاروں پر بن کر طوفان، بپھرتے ہیں

★

تہذیب و تمدن لرزاں ہیں ظلم و سفاکی کے ہاتھوں
علم و دانش کی آنکھوں سے قطرے اشکوں کے ڈھلتے ہیں
روحیں ہند و پاکستاں کی بے چین ہیں اِس پاگل پن پر
دونوں ملکوں کے سینوں پر حسرت کے آرے چلتے ہیں

★

وہ رات جو راحت آگیں تھی ماں کے کومل آنچل کی طرح
وہ رات کہ سائے میں جس کے تھے امن و اخوت کے جلوے
اُس رات کے دامن میں خوف و دہشت کی آگ
اُس رات کی چھاؤں میں بغض و نفرت کی آگ

شاعر بمبئی

شمس فریدی

ماں...!

ماں! تری محبت کے ہم نے گیت گائے ہیں
آج بھی تری خاطر جاں نثار کرتے ہیں
کل بھی تیرے پرچم کو ہم سلام کرتے تھے
آج بھی عقیدت ہے تجھ سے پیار کرتے ہیں

۲

آج کیوں مگر ہم پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں
بغض اور عداوت کی رسم آج کیسی ہے
جو نثار ہو کر بھی تجھ پہ ناز کرتے تھے
کیوں انہیں سپوتوں کی روح آج زخمی ہے

۳

برچھیوں کے، بھالوں کے کیوں وہی نشانے ہیں
آج ان کی گردن پر تیغ کیوں چمکتی ہے
مائیں کیوں تڑپتی ہیں، بہنیں کیوں سسکتی ہیں
کیوں لہو کے دھاروں سے سرخ تیری دھرتی ہے

۴

بے گناہ بچوں کے نرم نرم جسموں کو
ظالموں کے ہاتھوں نے چیر چیر ڈالا ہے
بیٹیوں کی عصمت کو، بیویوں کی عظمت کو
وحشیوں نے آخر کیوں خاک میں ملایا ہے

۵

کیوں اصول گوتم کے درد سے سسکتے ہیں
کیوں اشوک کی آنکھیں آج بھیگی بھیگی ہیں
نغمہ ہائے ملت سے آگ کیوں نکلتی ہے
چشتی اور نانک کی روحیں کیوں تڑپتی ہیں؟

۶

تجھ سے پوچھنا ہے ماں! راہبر وہ کیسے ہیں
جس کی رہنمائی میں قتلِ عام ہوتا ہے
رہگذارِ بستی پر سانپ رقص کرتے ہیں
اور ان کی محفل میں رقصِ جام ہوتا ہے

رضاء الجبار

اُونچی مُنڈیر

دلفریب ہواؤں کے کارواں گزرتے ہیں، کوہساروں سے، بیابانوں سے، دریا کی رواں موجوں کو چھیڑتے ہوئے، سمندر کی ساکن لہروں کے ساتھ سرگوشیاں کرتے ہوئے، جھونپڑیوں اور مکانوں کے اُوپر سے۔

اور چمن میں سے ہو کر جب یہ گزرتے ہیں تو فضاؤں کو مہکا دیتے ہیں، پھولوں کی پتّیوں سے ہر رہ گذر کو بسا دیتے ہیں۔ یہ اِن کی ادا ہے۔ اِس بہت پرانی رسم کے وہ عادی ہیں۔

"لیکن بابا" ایک ننھّا چلّایا۔ "یہاں پھول کیوں نظر نہیں آتے یہ جگہ ہمیشہ خالی خالی رہتی ہے"

"کیونکہ یہاں اونچائی ہے بیٹا!" بابا نے اپنے ننھّے کو جواب دیا۔ "بلندی پر پھول آپ ہی آپ نہیں آسکتے، ہاتھوں سے لائے جاتے ہیں۔ پھولوں کے درخت یہاں سے دُور بھی تو ہیں"

"بابا آپ یہاں ٹھہریں، میں پھول لاؤں گا۔ اِس جگہ کو بھی پھولوں سے رچا ہوا دیکھیں گے"

بلندی کو پھولوں سے رچانے کی خواہش انسان کی گھُٹّی میں ہوتی ہے۔ ننھّا دوڑتا ہوا گیا۔ اپنے چھوٹے سے دامن میں اُس نے بہت سے پھول جمع کئے اور چمن کے درمیان بنی ہوئی اُس بڑی سی بدوضع اور نامکمل منڈیر پر اُس نے بکھیر دیئے۔ اِس معصوم انداز سے اُس کو بڑا سکون ملا۔

شہر کے اِس سجے سجائے گلشن میں اُس منڈیر کا وجود چاند کے چہرے پر پڑے ہوئے داغ کی طرح تھا۔ وہاں وہ منڈیر کیوں بنائی گئی ہے، اِسے کھود کر کیوں ہٹا نہیں دیا جاتا ـــ یہ سوال بہت سوں کے ذہن میں اُبھرا تھا، لیکن اِس سوال کا کوئی جواب، کوئی حل ایسا نہیں تھا، جسے دلیل کے ساتھ پیش کیا جاسکے۔ ہاں کچھ بے دلیل کی قیاس آرائیاں ضرور تھیں کچھ اندازے تھے۔ یہ بھی ضرور تھا کہ ہزار بدوضعی کے باوجود کم از کم اُس سے بیٹھنے کا کام لیا جاسکتا تھا۔ چمن کی سیر کرنے کے بعد تھکے ہوئے لوگ ذرا دم لینے کو وہاں اکثر بیٹھ جاتے تھے۔

واپس لوٹتے وقت اپنے بابا کا ہاتھ تھامتے ہوئے ننھّے نے سوال کیا۔ "بابا! یہ یہاں اتنی اونچی منڈیر کیوں ہے، اِسے ایسا کیوں چھوڑ دیا گیا ہے"

"معلوم نہیں بیٹا!" رہگزاروں پر سے گزرتے ہوئے بابا نے اپنے بچّے سے کہا۔ "عجیب سی بات ہے، میں جب چھوٹا تھا۔ تب بھی یہی سوال کرتا تھا۔ لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ ایک دن ہمارے شہر میں ایک بہت بڑا آدمی آئے گا۔ وہ بہت اچھا کام کرے گا۔ ہمارے سروں کو بلند تر کر دے گا۔ اور پھر یہاں اِس جگہ بیٹھ کر اپنے پرستاروں کو درشن دے گا۔ یہ اونچی جگہ اُسی کے لئے چھوڑ دی گئی ہے۔ تب ہی یہ مکمل کر دی جائے گی"

"وہ آدمی کب آئے گا بابا ــ؟"

"ہم لوگوں نے زندگی بھر اُس کی راہ دیکھی بیٹا لیکن اِس زمانے میں کوئی بڑا آدمی نہیں آیا۔ لیکن ان بڑے لوگوں کا اعتبار کیا وہ کبھی بھی اچانک آجاتے ہیں، چُپ چاپ حالات کے کندھوں پر سوار ہوئے، ہوا کے جھونکے کی طرح آئے اور گزر گئے۔ اُن کی عظمت کا نشان رہ جاتا ہے، جسے دیکھ کر لوگ یاد کرتے ہیں کوئی شخصیت بہت عظیم ہو گزری تھی"

بچّے نے پلٹ کر بڑی عقیدت سے اُس جگہ کو دیکھا اور پھر وہ

چمن سے باہر چلے گئے۔

بہت سے سال گزر گئے۔

شرد پورنیما کی رات تھی،

چاندنی سلگ سلگ کر برس رہی تھی۔ سنہری کرنوں کے تار پھولوں کی پتیوں پر گرے ہوئے شبنم کے موتیوں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ دلکشی اپنے جوبن پر تھی۔

منڈیر پر ایک دوسرے سے قریب بیٹھے ہوئے دو بدن تھے

ایک نوجوان جس کا ماتھا چاندنی میں بہت چمک رہا تھا۔

ایک حسین پیکر جس کی دراز زلفیں چاند کو سیاہ رات کا نمونہ بنا رہی تھیں۔

دونوں ماضی کی باتوں کو کُرید رہے تھے۔ جیسے یہ چاندنی میں کھیلنے کا ایک اچھا خاصا کھیل بن گیا ہو۔

"میں جب بھی اِس جگہ بیٹھتا ہوں نہ جانے کیوں مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں کسی کا انتظار کر رہا ہوں۔ پیچھے سے ہر آنے والے کے قدموں کی چاپ مجھے چونکا دیا کرتی ہے۔ اُف! میں نے کتنے برسوں یہاں انتظار کیا۔"

"اب بھی آپ یوں ہی محسوس کرتے ہیں ۔؟"

"ہاں ۔۔۔!"

"مجھے ستا رہے ہیں، چلئے ہٹایئے۔"

"نہیں ۔" دراز زلفوں والے پیکر کی آنکھوں میں گزرتے ہوئے ساتھی نوجوان بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا۔ "مجھے بابا بہت یاد آ رہے ہیں۔ ایک دن بچپن میں میں نے اُن سے سوال کیا تھا کہ چمن کے عین درمیان میں یہ نامکمل اونچی منڈیر کیوں ہے۔ اس منڈیر کی قسمت میں تکمیل کیوں نہیں۔"

"سوال دلچسپ ہے، پھر آپ کے بابا نے کیا بتایا تھا۔"

"اُنہوں نے بتایا تھا کہ ہمارے شہر میں ایک دن بہت بڑا آدمی آئے گا۔ لوگ یہاں اُس شخصیت کا خیر مقدم کریں گے۔ اِس اونچی جگہ بیٹھ کر وہ اپنے چاہنے والوں کو دیدار دے گا۔ یہاں اِس جگہ کھڑا ہو کر وہ لوگوں میں نئی رُوح پھونکے گا۔"

"کاش وہ آدمی ہمارے دَور میں آ جائے۔"

"یہی میری بھی خواہش ہے تاکہ ہم لوگ اس بلند انسان کا دیدار کر سکیں۔ بابا کو گزرے ہوئے کتنے برس ہو گئے لیکن اُن کی بات میرے دماغ میں یوں تازہ ہے جیسے یہ ابھی کل ہی کی بات ہو۔"

"آپ کے بابا بڑے نیک آدمی تھے۔ بہت سمجھدار تھے۔ شاید اُنہوں نے ان ہی لمحات کے لئے کہا تھا۔ دیکھیئے نا آپ یہاں بیٹھے ہیں اور مجھے دیدار مل رہا ہے۔ آپ بڑے آدمی ہو گئے۔"

"جی ہاں ۔۔۔!" نوجوان مسکرا کر بولا۔ "کسی کو بنانے کا انداز کوئی آپ ہی سے سیکھے۔"

لوگ تیزی سے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے جیسے بہت بے چین ہوں، کوئی بھیانک بات جیسے انہیں پریشان کئے دے رہی ہو۔

"کیا ہو گیا بھائی، آپ لوگ پریشان کیوں ہیں؟" نوجوان نے ایک آدمی سے پوچھا۔

"حملہ ہو گیا ہے بھیا! خبر آئی ہے کہ دشمن نے ہمارے ملک پر حملہ کر دیا ہے۔ ہم گھر گئے ہیں۔ مصیبت کی بات ہے نا؟"

"کیا کہہ رہے ہو ۔۔۔ مذاق ہے؟ یہ بھی کوئی مذاق ہے۔" نوجوان نے طیش میں کہا۔

"مذاق نہیں سچ کہہ رہا ہوں بھیا! یقین نہ ہو تو آپ ریڈیو پہ جا کر سُنئے وہ بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ اِسی رفتار سے بڑھیں تو ہمارے شہر میں آنے کے لئے بھی اُنہیں دیر نہیں لگے گی۔"

"ہُنہ! ہُنہ!! ہمارے مُلک پر حملہ کریں گے؟ ہمارے شہر تک آئیں گے؟ منہ کی کھائیں گے! سمجھے!"

طیش سے اُس نوجوان کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ جوش سے اُس نے مُٹھیاں بھینچ لیں اور بولا "ہمیں فوراً کچھ کرنا چاہیئے، ہم چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔"

"لیکن ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟"

"کیا کہہ رہے ہو؟ ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ آؤ چلیں

اُس نوجوان نے لوگوں کو بہادری کی داستانیں سنائیں۔ ملک کی آبرو کی باتیں کیں ۔ اُس کی زبان کی نوک پر ایک طوفان آ گیا جو رُکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ لوگوں کے جسموں میں خون بڑی تیزی سے گردش کرنے لگا۔

پھر ایک جماعت صف آرا ہو گئی

جیسے مائیں اپنا آشیرواد دینے آئیں

بہنوں نے پھول دیئے

بچے باباؤں سے لپٹ کر بولے

"بابا! ہمارے لئے کامیابی لانا"

بیویوں نے اپنے دامن سے آنسوؤں کو خشک کیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

"ملک کی آبرو کی بات ہے"

صف آرا جماعت اِسی نوجوان کی رہنمائی میں آگے بڑھی، اور آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ افق کے اُس جانب جہاں سے شائیں شائیں کی آوازیں آرہی تھیں، جہاں کی شفق پر لالی کے بجائے کالک کا گمان ہو چلا تھا۔

بہت زوروں کی لڑائی ہوئی ــــ دشمنوں کے دانت کھٹے ہوگئے وہ بھاگ گئے۔

مُلک میں جشن ہوا۔ شہر میں چراغاں ہوئے، لوگ گا رہے تھے، خوشی سے ناچ رہے تھے ـــــ دفعتاً کسی نے یاد کیا۔ "لیکن وہ نوجوان کہاں ہے جس کا ماتھا چاندنی میں بہت چمکا کرتا تھا۔ جس نے ہمیں [illegible] بنایا۔ ہمت دی"

"[illegible] دیکھا۔ چلو ڈھونڈیں گے"

ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ آدمی اُس نوجوان کے گھر آئے۔

بہت سے لوگ وہاں فکرمند انداز میں کھڑے تھے۔

"کیوں اِنہیں کیا ہوگیا ہے ـــ ؟"

"اُن کے جسم میں بہت سی گولیاں دھنس گئی ہیں۔ ڈاکٹر آپریشن کر رہے ہیں، زخموں پر مرہم رکھ رہے ہیں۔ ہم یہاں انتظار کرینگے"

مکان میں سے نکلتے ہوئے کچھ آدمی باہر آکر رونے لگے۔ "ہائے کتنا گبرو جوان تھا، پھر بھی زخموں کی تاب نہ لاسکا"

"دل کا کتنا اچھا تھا، ویسے لوگ اب نہیں پیدا ہوتے"

"نہیں، نہیں! بہادر نہیں مرا کرتے۔ تم لوگ جھوٹ کہہ رہے ہو۔ یہ دلیر جوان ہمیشہ زندہ رہے گا۔ جو آدمی دنیا کو روشنی دینے آیا ہے اس کا فانوس کبھی نہیں بجھتا۔ یہ ہمیں ہمت دیتا رہے گا"

لوگوں نے جلوس نکالا۔ سبھوں نے ملکر طے کیا کہ شہر میں ایسے دلیر اور دل والے سپوت کا مجسّمہ ہونا چاہیئے تاکہ ہر دور کے لوگ اُس سے روشنی پاسکیں۔ دوستی، خلوص اور ہمت کے اِس فوارے

شاعر بھئی

کو ابد تک رہنا چاہیئے۔

"ہاں، ہاں!!"

"ہم اِس مجسّمہ کو مشرق کی سمت لگائیں گے تاکہ ابھرنے والے چاند اور سورج بلندی پر جانے سے قبل اِس بلند شخصیت کے ماتھے کو چوم سکیں"

"ہاں ــ ہاں!"

"ہم اِسے شہر کے بڑے دروازے پر نصب کریں گے"

"نہیں بھائی دروازے کے نزدیک لگائی ہوئی چیزیں نو واردوں کے کام کی ہوتی ہیں۔ یہ ہم سب کو اپنا دوست سمجھنے والا ہمارا سردار تھا۔ یہ مجسّمہ شہر والوں کا سرمایہ ہوگا۔ یہ ہمارے درمیان ہی میں رہے"

یہ مجسّمہ کہاں لگے گا؟

یہ مجسّمہ کہاں لگے گا؟

چلو ہم اِسے شہر کے اُس بڑے چمن کے عین درمیان میں لگائیں، جہاں ایک اونچی سی نامکمل منڈیر ہے جس پر چڑھنے کے بعد لوگوں کو بلندی کا احساس ہوتا ہے، یہ مجسّمہ اُس منڈیر پر موزوں ہوگا۔ وہ منڈیر اِس مجسّمہ کے نصب ہونے پر مکمل ہو جائے گی۔ وہ بلندی اِسی کے لئے ہے۔

ہاں! یہ مجسّمہ اِسی منڈیر پر مناسب رہے گا۔

مجسّمہ منڈیر پر لگ گیا۔

عقیدت کے پھول لانے والوں کا تانتا بندھ گیا۔

وقت کا کچھوا رینگ رینگ کر جست لگانے والے خرگوش کو شکست دیتا رہا ــــ

بہت سے سال گزر گئے۔

ویسی ہی شرد پورنیما کی رات تھی۔

کچھ سائے باغ میں بڑھے۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ منڈیر کے پاس آئے۔ مجسمہ کے عین سامنے آکر ٹھہر گئے۔ سسکیوں کی آوازیں آئیں آنے والوں میں ایک نوجوان بھی تھا۔ جس نے تڑپ کر اپنی ماں کی طرف دیکھا اور بولا۔ "ماں! آپ کے آنسو؟ کیوں رو رہی ہو ماں ــ ؟"

"ساری کی ساری باتیں یاد آرہی ہیں جیسے کل ہی کی بات

(بقیہ صفحہ ۷۰ پر دیکھیے)

شہاب دائردی

رُخسار کا پھُول

پھُول کو پانے کی آرزو کون نہیں کرتا؟ ہر شخص اُس کی جاذبیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ راجستھان ہوٹل جب فیل ہونے کی منزل پر پہنچ گیا تو اُس کے دُور اندیش مالک نے پچاس سال کے تجربہ کار مینجر کو ہٹا کر اُس کی جگہ ایک سولہ سالہ خوبصورت عورت کو بٹھا دیا۔ بظاہر یہ تبدیلی کوئی نئی نہیں تھی، مگر اس کا نتیجہ بڑا شاندار نکلا۔ وہ بڑی شوخ انداز کی تھی۔ ہر خوش پوش آنے والے نوجوان اور بوڑھے سے اپنے ابرؤوں کو خم دے کر پوچھتی تھی ــــ

"کوئی خدمت ــــ؟"

اور آج ہی حسبِ عادت راجستھان ہوٹل کی نئی مینجر نے جب ایک نوجوان سے اپنا مخصوص سوال دُہرایا تو نوجوان نے مُسکرا کے پوچھا۔

"کیا خدمت کرسکتی ہیں آپ ــــ؟"

"شاندار کمرے کا انتظام کرنے کے ساتھ ساتھ لذیذ کھانے کا بندوبست کرسکتی ہوں ــــ" راجستھان کی مینجر شہناز مُسکرائی۔

"اور کچھ ــــ" نوجوان شہناز کو غور سے دیکھتا رہا۔

"ہاں، ہاں ــــ!" شہناز کہنے لگی۔ غسل کرنے کے لیے ٹھنڈا پانی گرم پانی، جھرنے کا پانی یا تالاب کا پانی جس سے بھی غسل کرنے کی آپ کو عادت ہو، مہیّا کرسکتی ہوں اور کرائے کا سُوٹ بھی ــــ"

"اور، اور ــــ؟" نوجوان ہنس پڑا۔

"اور، اور آپ جو بھی، مطلب یہ ہے ہر ممکن چیز کا انتظام کرسکتی ہوں۔"

"تھینک یُو، مینجر" نوجوان نے مُسکراتے ہوئے رومان انگیز انداز میں کہا ــــ "آپ اور اُس کھوسٹ مینجر میں کتنا فرق ہے جو آپ کی جگہ پر تھا۔ اُس سے تو باتیں کرنے میں مجھے کوفت ہوتی تھی اور میں تھک جاتا تھا مگر آپ......"

"ہاں تو فرمایئے کیا خدمت کروں ــ؟" شہناز نے پوچھا۔

"پہلی خدمت تو ایک ہوادار کمرے تک رہے گی۔" نوجوان پھر کہنے لگا۔ "اُس مینجر سے باتیں کرنے میں بور ہو جاتا تھا مگر آپ....."

"آپ بوائے کے ساتھ اُوپر جا کر اپنا کمرہ دیکھ لیں۔" اور نوجوان جو کچھ بھی کہنا چاہتا تھا نہیں کہہ سکا۔ وہ نہ کہہ سکا کہ آپ سے باتیں کرنے میں مجھے رَم پینے کا مزہ آتا ہے۔ اگر آپ کو میری باتوں کا یقین نہ آئے تو میری مخمور آنکھوں کو دیکھ لیجیے، ضرور آپ میری آنکھوں میں نشہ پائیں گی۔ اور یہ نشہ سچ مانیئے مجھے آپ سے باتیں کرنے میں حاصل ہوا ہے کیونکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آج میں پی کے نہیں آیا تھا۔ آپ......"

"یہ رہا آپ کا کمرہ صاحب ــ" راجستھان کا شاندار بوائے کمرے میں داخل ہو کر بولا اور نوجوان چونک کے اپنے خیالوں کے جال سے نکل آیا اور اُس نے جلدی سے کہا۔

"ٹھیک ہے ــ"

اور جب بوائے جانے لگا تو نوجوان نے اُس سے پوچھا۔

"تمہاری مینجر صاحبہ کہاں کی رہنے والی ہیں ــ؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں صاحب ــ" بوائے جو زندہ دل تھا ہنسا اور ایک ادا سے پھر اُس نے کہا۔ "اور کبھی میں نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی صاحب کیونکہ میں بہت کم کماتا ہوں، اور اتنی کم آمدنی پر یہ سب جاننا فضول ہے صاحب۔"

"ہُوں ــ" نوجوان کُرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ کا اگر عشق کرنے کا موڈ ہو تو میں آپ کے لئے یہ پتہ چلا سکتا

ہوں اور بھی کچھ کام کر سکتا ہوں مگر صاحب میں بہت کم کماتا ہوں مجھے کام کرنے کا کچھ معاوضہ آپ کو دینا ہوگا۔"

"او، بس۔" نوجوان نے کہا۔ "مگر منیجر سے تمہاری شکایت کرنے کے بعد ــــ

"صاحب، صاحب۔" بوائے پریشان ہوگیا۔

"ہر ایک کے ساتھ تم ایک ہی طرح پیش آنے کے عادی ہو چکے ہو، یہ نہیں سمجھتے ہو کہ یہاں بھکاری سے لے کر نواب اور راجے تک آتے رہیں۔" نوجوان نے ذرا رعب ڈالا۔

"غلطی ہوگئی، معافی چاہتا ہوں صاحب!" بوائے نے نگاہیں جھکالیں۔

"منیجر سے جاکر کہو کہ رام نگر کے نواب آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔"

اور بوائے کے جانے کے تھوڑی دیر بعد شہناز مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"کیا حکم ہے نواب صاحب!"

"شراب ملے گی ــــ؟"

"ملے گی ضرور مگر کالے بازار سے اور دوگنی قیمت پر۔" شہناز بولی۔

"قیمت کی تم فکر مت کرو، ہاں آنے والی رات کے لئے مجھے دو بوتلیں چاہییں۔" نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور ایک خدمت تمہیں کرنی ہوگی۔"

"کیا شراب پلانے کی ــ؟" شہناز نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"تم کافی سمجھدار ہو۔" نواب صاحب نے کہا۔ "تمہیں شراب پلانے کا منہ مانگا انعام ملے گا۔"

"مگر افسوس میں انعام لینا نہیں چاہتی۔" شہناز کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اُس کے جی میں تو آیا کہ وہ اور کچھ کہہ دے مگر مالک کے خفا ہو جانے کے خیال سے وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ راجستھان ہوٹل کا مالک عجیب نرالے ڈھنگ کا آدمی تھا۔

"تو پھر دوستی کے ناتے تمہیں یہ خدمت کرنی ہوگی۔" نواب صاحب نے کہا۔ "اور اگر یہ بھی تمہیں منظور نہیں تو پھر میرے لئے ایک ساقی کا انتظام کر دو۔"

"اور اگر مجھ سے یہ بھی نہ ہو سکے ــ؟" شہناز نواب صاحب کو

شاعر مجلسی

دیکھتی رہی۔

"تو میں یہ سمجھوں گا کہ تم اِس ہوٹل کے منیجری کے لائق نہیں ہو۔" نواب صاحب نے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ تم اپنی صلاحیت کا ثبوت دو گی۔"

اور جب شہناز جانے لگی تو نواب صاحب نے خاص ادا سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آج رات ناچ اور گانے کا بھی انتظام کیا جائے اور آج کی رات کے بعد ہر رات جب تک میں یہاں قیام کروں گا، کیونکہ راگ رنگ سے مسرور ہوئے بغیر مجھے نیند ہی نہیں آتی۔

"لیکن آپ نے اخراجات کے متعلق غور فرما لیا ــ؟" شہناز نواب صاحب کو دیکھتی رہی۔

"ایک بار میں نے تم سے کہہ دیا نا کہ روپے کے متعلق تم فکر مت کرو۔" نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہزار، دس ہزار بھی کوئی چیز نہیں۔"

اور شہناز نواب صاحب سے مرعوب ہو کر چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد نواب صاحب نے سوٹ بدلا، اور آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو سنوارنے لگے۔ اور جب وہ بن سنور گئے تو بوائے کو حکم دیا کہ کیک اور چائے کے ساتھ اپنی منیجر صاحبہ کو یاد کرو۔

"میں آگئی ہوں۔" شہناز کمرے میں داخل ہوتی ہوئی بولی۔ "رم نہیں مل سکی، وہسکی منگواؤں ــ؟"

"موسم تو رم کا ہے پر وہسکی بھی چلے گی۔" نواب صاحب نے کہا۔ "میں کوئی چیز اکیلے کھانے کا عادی نہیں ہوں، امید ہے تم ناشتہ میں میرا ساتھ دو گی۔"

"یہاں آپ کا کوئی دشمن نہیں جو آپ کو زہر دے گا۔" شہناز مسکرائی

"کون جانے یکایک کوئی ہو ہی جائے۔" نواب صاحب کے ہونٹوں پر بڑی لطیف مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے بولے

"میں تمہیں کس نام سے یاد کروں ــ؟"

"منیجر کے نام سے۔" شہناز ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا میں تمہارا نام نہیں جان سکتا ــ؟"

"اِس کی تو میں کوئی ضرورت نہیں سمجھتی۔"

"مگر میں جو سمجھتا ہوں۔"

"کیوں عشق فرمانے کا خیال ہے کیا ــ؟"

"ہوں" نواب صاحب مسکرائے "بولو، ارادہ تو برا نہیں۔؟"

"نقصان کا ڈر نہ ہو تو پھر برا نہیں" شہناز نے اٹھتے ہوئے کہا

"اچھا نواب صاحب اب میں چلی"

"لیکن ناشتہ میں اکیلے......"

"آج تو اکیلے کھانا ہی ہوگا" شہناز مسکراتی ہوئی چلی گئی اور اُس کے جانے کے بعد نواب صاحب اس کے متعلق سوچنے لگے۔ غور کرنے لگے اُس تل کی خوبصورتی پر جو اُس کے رخسار کا پھول تھا۔ اور دن بھر نواب صاحب کے خیالات انہی باتوں کے درمیان چکر کاٹتے رہے اور جب رات آئی اور اُن کے کمرے میں پائل بجی اور نغمہ بھی اُبلا تو وہ اپنے جذبات کے دھاروں میں آپ بہنے لگے۔ وہسکی کی بوتل خالی ہوتی گئی اور دیکھتے دیکھتے جب فضا کی شوخی شہناز کی آنکھوں میں ناچ اٹھی تو اُس نے نواب صاحب سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ناچ پسند آیا ــــ ؟"

"تمہارے انتخاب کا جواب نہیں" نواب صاحب نے وارفتگی کے انداز میں کہا۔ "پیوگی وہسکی ــ ؟"

"میں نے کبھی پی نہیں ــ"

"آج پی لو" نواب صاحب نے پیگ پیش کرتے ہوئے کہا۔ "اور آج کے پینے کے بعد مجھے امید ہے کہ تم آبِ حیات سے دور نہ رہوگی"

"نہیں نواب صاحب مجھے آبِ حیات کی ضرورت نہیں"

"منیجر ــــ!" نواب صاحب نے بہت رومان آگیں انداز سے شہناز کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "میری بات تمہیں ماننی ہی ہوگی۔"

"اور اگر میں نہ مانوں تو ــ؟" شہناز مسکرائی۔

"تم انکار نہیں کر سکوگی" نواب صاحب نے کہا۔ "تمہاری مخمور آنکھیں تمہارے دل کا بھید مجھے بتا چکی ہیں"

"ہو سکتا ہے کہ وہ غلط ہو، حرفِ فریب" شہناز نے کہا۔

"ممکن نہیں منیجر" نواب صاحب نے وہسکی کا پیگ شہناز کے ہونٹوں سے لگا اور وہ پی گئی۔ بالکل خاموشی سے جیسے دل سے تیار تھی۔ اور شہناز نواب صاحب کے کمرے میں ان کے قریب بیٹھی اُن کے ساتھ آبِ حیات سے سُرور حاصل کرتی رہی۔ اور پیتے پیتے دونوں کی آنکھیں بھاری ہو کر بند ہو گئیں

دوسرے دن ــــ

شام کی ہلکی تاریکی پھیلنے سے پہلے نواب صاحب اپنے گاؤں جاتے ہوئے بہت ہی شرمندگی کے احساس کے ساتھ شہناز سے کہہ رہے تھے

"یہ جان کے تمہیں دکھ ہوگا شہناز کہ میں رام نگر کا نواب نہیں بلکہ ایک معمولی کسان ہوں۔ جو ریس کے روپیے سے کچھ دنوں کے لئے نواب بن گیا تھا۔ مگر شہناز میرے نواب ہونے کی طرح یہ ہرگز جھوٹ نہیں کہ میں تمہیں بہت چاہتا ہوں"

"میں بھی ایک ایسا ہی انکشاف کرنے والی ہوں" شہناز نے کہا "تمہیں یہ جان کر افسوس ہوگا کہ ہوٹل کی منیجری کرنے سے پہلے میرا پیشہ وہی تھا جس سے ہر شریف آدمی نفرت کرتا ہے"

"پر حقیقی معنوں میں شریف وہی ہیں شہناز جو نفرت نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو گندگی سے نکال کر شرافت کی راہ پر لے آتے ہیں" نواب صاحب نے بڑے خلوص، بڑی چاہت، بڑے پیار سے شہناز کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور شہناز کے رخسار کا پھول جو برسوں سے حالات کی تمازت سے کمھلایا ہوا تھا کھل اٹھا۔

(بقیہ "اُردو شاعری کے جدید میلانات" صفحہ ۱۲)

کے عظیم اور ارتقا یافتہ ادب سے بہت قریب کر دیا ہے۔

غرض موضوع و مواد و ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے دورِ جدید میں اُردو شاعروں نے عالمی ادب میں پیدا ہونے والے تقریباً تمام اہم رجحانات کو سمیٹ کر اپنے طور پر ان کا اظہار کر دیا ہے۔

(بقیہ "ادب اور زبان" صفحہ ۲۴)

"الفاظ ایک ذریعہ ہیں تجربوں کو بیان کرنے کا۔ یا یوں کہیے کہ تحریر سراپا بننے کے لئے یا مجسّم ہونے کے لئے موزوں اور مناسب الفاظ کو چن لیتا ہے...." (کلیم الدین احمد)

"نثر میں اچھے لفظوں کی اچھی ترتیب ہوتی ہے۔ اور شعر میں بہترین لفظوں کی بہترین ترتیب ہوتی ہے..." (کالرج)

ترجمہ: سرنواس لاہوتی
ونکٹیش ماڈگولکر

طنزیہ کہانی

(مراٹھی سے)

ولایتی مُرغیاں

صبح کے ناشتے کے بعد گاؤں والے اپنے کھیتوں کی طرف
نے لگے۔ گاؤں کا پٹیل اپنی شکستہ حویلی کے سامنے صحن میں کھیلو
دانا چگاتا ہوا دکھائی دیا۔ صبح کی سنہری دھوپ میں پٹیل مٹھیاں
بھر کر دانے پھینک رہا تھا اور دو ولایتی مرغے اُن دانوں کو چگتے
رہے تھے۔

گھر کے کام کاج میں آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنے والا پٹیل آج
یوں کو دانا کیوں چگا رہا تھا؟ گاؤں والے سوچ میں پڑ گئے۔ ہاتھ
ں ہنسیا اور رسّی لیے دس پانچ گاؤں والے پٹیل کے صحن میں جمع
کر اس نظارے سے لطف اندوز ہونے لگے۔

پٹیل گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا اپنی 'بنڈی' کی جیب سے سفید
اد کے دانے نکال نکال کر مرغوں کی طرف پھینک رہا تھا۔ پرانی
ٹ لگی جوار کو چھوڑ کر وہ صاف اور نئی جوار کیسے چگائے جا رہا
ا ــــ لوگ تعجب میں پڑ گئے۔ وہ پٹیل کی اس کارستانی کو
ہ نہ سکے۔

ہاں یہ بات سچ تھی کہ دانہ چُگنے والے مُرغا اور مُرغی بالکل
قسم کے تھے۔ گاؤں کے بڑے سے بڑے مُرغے کے مقابلے میں وہ
بصورت اور موٹے تازے تھے۔ بڑا مُرغا چونچ کے اوپر کی بھاری
کم کلغی ہلاتے ہوئے دانہ چُگ رہا تھا۔ سفید رنگ کا یہ مُرغا
سا پولیس افسر سے شان میں کم دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گردن اُوپر
کے لوگوں پر ایک نظر ڈالتا اور پھر دانہ چُگنے میں مصروف ہو جاتا۔
ویسے ہی مُرغی بھی تھی۔ دیکھنے میں حسین مگر جسامت میں بالکل
سا بڑے افسر کی بیوی کا نظر آتی تھی۔ ایک عجیب شان سے چلتی تھی
ر گردن کو مٹکا کر دانے چُگتی تھی۔

بے شک مُرغیاں اچھی ہیں مگر اس کا یہ مطلب تھوڑے ہی
نو بھی

ہے کہ پٹیل خود اُنہیں دانہ چگائے؟ اُن ولایتی مرغیوں کو بوئی
جانے والی جوار چگائی جا رہی تھی ــــ ویسے دیکھا جائے تو
اتنے بہت سے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ مگر اس کا کوئی اثر پٹیل کے
چہرے پر نہیں تھا ــــ جیسے کوئی کسی افسر سے برتاؤ کرتا ہو۔
اسی طرح پٹیل مرغیوں کے ساتھ برتاؤ کر رہا تھا ــــ بڑے ادب
کے ساتھ' بڑے اپنے پن سے ــــ لیکن آخر یہ سب کیا ہے؟
بھولا سے نہ رہا گیا۔ ایک بار کھنکھار کر' تھوک کر دھیرے
سے بولا۔" ولایتی جوڑا کہاں سے خرید لائے ہو"؟
آنکھیں اوپر کر کے پٹیل بولا۔ "کیا کہا"؟
" جوڑا ولایتی لائے کیا"؟
" ہاں۔ ہاں"۔
اتنی حامی بھر کر پٹیل پھر مرغیوں کی طرف ادب سے دیکھنے لگا۔
بکریاں چرانے والا لڑکا دل کو لگنے والی بات کہہ گذرا۔"
"بھولا' چار سیر گوشت تو نکلیگا ہی اِن کا۔ کیوں"؟
ہاتھ پیچھے کر کے کھڑا ہوا۔ بکو بولا۔ "بے شک۔ ہمارے
گاؤں کے مرغے تو اسکی پاسنگ میں بھی نہیں اُترتے"۔
لوگوں میں اس جوڑے کی چرچا ہونے لگی۔
" بھائی' کونسے دیش کی ہیں"؟
" میں سمجھتا ہوں ولایتی نہیں ہیں۔ جرمنی کی دکھائی دیتی
ہیں"۔
"جرمنی' کیا"؟
" ایک ملک ہے وہیں کی ہونگی"۔
" تو نے کیسے جانا"۔
" ممبئی میں ہمارے صاحب کے پاس بھی ایسی

ہی تھیں۔"

دانے چُگتے چُگتے مُرغے کو جُنبش سوار ہوئی اور وہ مُرغی کے گرد چکر کاٹنے لگا۔ پر پھیلا کر گھومنے لگا ۔۔۔ وہ بھاگنے لگی ۔۔۔ گردن لٹکا کر وہ پیچھا کرنے لگا ۔۔۔ مُرغی گردوں کوں اُچکر چلنے لگی۔ صحن بھر میں بھونچال شروع ہوگیا۔

پٹیل بیڑی کا کش لیتے ہوئے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

ہلکو نے پوچھا ۔۔۔ "جوڑی کتنے کی پڑی، پٹیل؟"

"ہلکو، میری نہیں ہیں یہ مرغیاں۔"

"پھر؟ دکھائی دے رہی ہیں، سو چاہے تمہاری ہی ہوں گی۔"

"تو پھر؟"

"مہمان لے آئے کیا؟"

"نہ، سرکاری ہیں۔"

"سرکاری؟"

"ہاں۔ ہاں۔ اپنے گاؤں کے لئے سرکار نے بھیجی ہیں۔"

سب تعجب میں پڑ گئے۔ سرکار سزا دیتی ہے۔ انعام دیتی ہے۔ لیکن مُرغے؟

"گاؤں کو مُرغے دینے والی کونسی سرکار ہے؟ سوچنے کی بات ہے۔" بھولا بولا۔

گاؤں میں افسر آتے ہیں۔ انہیں کھانا کھلانا ہی ہوتا ہے۔ گاؤں کے مُرغے انہیں کیونکر پسند آئیں گے۔ اس لئے سرکار نے مُرغے بھیجے ہیں۔"

اس پر پٹیل نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "ارے، پاگل۔ افسروں کو مُرغے؟"

"پھر کس لئے؟"

مُرغی ہار گئی تھی۔ اُسکی چونچ پر کی کلغی لال لال ہوگئی تھی۔ پھر بھی وہ مُرغے کے پاس پاس چل رہی تھی۔ مُرغے نے رُک کر بایاں پاؤں اٹھا کر، سینہ تان کر ایک لمبی بانگ دی۔

بانگ سُنکر پڑوسی سُنار باہر آیا اور بھیڑ کے درمیان کھڑا ہوگیا۔

ولایتی مُرغے دیکھ کر پوچھنے لگا۔ "بانگ اس نے دی؟"

سُنار بوڑھا تھا۔ اس کے دانت جھڑ چکے تھے۔ پوپلا منہ، کان اور سینے کے بال سفید ہوچکے تھے ۔۔۔ لوگوں کے ہاں کہنے پر وہ ہاتھ کا چھپّا دیر کر کے کہنے لگا۔ "آج اتنے سال سے مُرغے

[illegible]

کی بانگ سُنتا رہا ہوں۔ مگر آج صبح جیسی بانگ کبھی نہیں سُنی۔"

پٹیل پھولا نہیں سمایا۔ کہنے لگا: "آج صبح نا؟ پھر وہ بانگ تو ان سرکاری مرغوں کی ہی تھی۔"

سُنار خوش ہوگیا۔ اور بولا۔ "سرکاری ہیں نا، چلو بات ختم ہوئی۔ روپئے ادا کئے ہوں گے تم نے؟"

"ہاں" پٹیل نے صفائی پیش کی۔ "سرکار اب گاؤں میں مرغوں کی افزائشِ نسل کو ترقی دے گی۔ اور یہ مُرغے ہم سنبھالیں گے تاکہ پانچ سال میں ان مرغوں کی اتنی نسل بڑھ جائے کہ گاؤں میں سوائے اس نسل کے اور کسی دوسری نسل کے مُرغے باقی نہ رہیں۔"

سب کو یہ بات اچھی معلوم ہوئی۔ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد بھولا نے کہا۔ "اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ جوڑی سرکار نے بھیجی ہے۔"

"اور کیا۔"

"لیکن، پٹیل کہیں بیماری سے مرگئیں تو پھر کیا ہوگا۔ سرکار دام وصول کرلیگی؟"

بھولا، کا یہ اندیشہ ٹھیک تھا۔ پٹیل بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اس مسئلہ پر پٹیل نے خود ہی نہیں کیا تھا ۔۔۔ تھوڑی دیر رُک کر بولا ۔۔۔ "ارے بھولا۔ ان ولایتی مرغیوں کو بیماری ہی نہیں لگتی اور اگر بیمار ہو بھی جائیں تو سرکار نے انتظام کیا ہے۔ دوائی کی پیٹی بھیجی ہے جو میرے پاس ہے۔ دوا دیتے ہی ٹھیک ہوجاتی ہیں۔"

"اچھا۔ پھر ہماری مرغی بیمار پڑے تو لائیں تمہارے پاس؟"

"ہٹ ۔۔۔ ارے پاگل ۔۔۔ وہ ولایتی دوائی گاؤں کی مُرغیوں پر اثر نہیں کرے گی۔" پٹیل کی باتیں سُنکر گاؤں والوں نے اپنا راستہ لیا۔

آٹھ دس دن گذرے ہونگے کہ اچانک لیکھپال، تحصیلدار کا تانگہ گاؤں میں آ کر رُکا ۔۔۔ گاؤں کے حساب کتاب کی جانچ کرنے ۔۔۔ پٹیل گھبرا گیا۔

ہنومان جی کے مندر میں شطرنجی اور تکیے بچھائے گئے۔ چپراسی نے پٹیل سے پانی منگوایا۔ ہاتھ منہ دھو کر صاحب تمبو

ہوئے اور پٹیل سے معائنہ کے لئے کاغذات منگوائے۔ کاغذات آتے ہی معائنہ شروع ہوا۔ اور غلطیاں پکڑی جانے لگیں۔ پٹیل اور اس کا کارندہ بستر کے کنارے منہ لٹکائے بیٹھے ہوئے تھے گاؤں کے کچھ سربرآوردہ لوگ کوٹ ٹوپی اور شملہ باندھے میلا سے کھمبے کا سہارا لئے کھڑے تھے۔ کچھ گاؤں والے سامنے کے میدان میں بیٹھے زمین پر لکیریں کھینچ رہے تھے۔ سب لوگ اس طرح سے خاموش تھے جیسے ان کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ صاحب کاغذات ٹٹول ٹٹول کر غلطیاں پکڑنے میں مصروف تھے اور چپراسی دیوار کا سہارا لئے قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔ کھونٹی پر صاحب کی نیلے رنگ کی شیروانی ٹنگی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں بیڈنگ، توشہ دان، چھتری اور چمڑے کا بیگ رکھا ہوا تھا — پھر یکایک گرجدار آواز میں تحصیلدار صاحب کہنے لگے۔ "گدھے کہیں کے۔ کام کرتے ہو یا حجامت؟ بے شرم، پاجی، حرامخوری کی تنخواہ پاتے ہو؟ اب کون تمہارا باپ ٹھیک کرے گا اسے"؟

پٹیل اور کارندے کا چہرہ پیلا پڑ گیا، ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ افسران کی چمڑی ادھیڑنے پر تُلا ہوا ہے۔

آس پاس کے لوگ سہم گئے۔ سنبھل کر بیٹھ گئے اس اندیشے کے پیشِ نظر کہ کہیں صاحب اُن پر بھی برس نہ پڑیں۔

صاحب کے چہرے پر ایک رنگ جا رہا تھا اور ایک رنگ آ رہا تھا۔ اُنکی زبان سے الفاظ بھی برابر ادا نہیں ہو رہے تھے۔

"کیوں جی پٹیل؟ نوکری کیوں کرنے بیٹھے، حجام کی دوکان کیوں نہیں کھول لی، غنڈہ گردی کرتے ہو، پیسے کھاتے ہو، لوگوں کو چوستے ہو، حرام خور، پاجی، اُلو کہیں کے!!

پٹیل ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ گڑگڑا کر کہنے لگا — "اب آپکے ہاتھ میں ہے، صاحب — مہربانی کیجئے، مجھے بچا لیجئے"!

"کیا بچاؤں؟ خاک! شرم نہیں آتی غلطیاں کرتے؟ کتنا پیسہ ہضم کر لیا اور ڈکار بھی نہیں لی"۔

پٹیل کے اوسان خطا ہو گئے۔ کھانے کے وقت تک تحصیلدار صاحب بولے چلے جا رہے تھے۔ لاکھوں غلطیاں تلاش کر ڈالیں۔ صاحب کھانا کھانے کے لئے اُٹھے۔ توشہ دان میں سے کھانا نکالا گیا — کھانے کے بعد آرام کرنے لگے — بھوک سے کانپتے ہوئے پٹیل کو ایک طرف لیجا کر چپراسی کہنے لگا — "رات کو اچھا کھانا پکواؤ۔ پھر سب ٹھیک ہو جائیگا"۔

"بہت اچھا" "مگر کھانا میٹھا ہو یا نمکین"، پٹیل نے دریافت کیا۔

"میٹھا کاہے کے لئے؟ ارے مرغی کا، تو مرغی۔ مزہ آجائے ایسی بناؤ"۔

"بہت اچھا۔ صاحب"۔

پٹیل واپس گھر آیا اور بیوی کو حکم دینے لگا۔ "صاحب رات کو یہیں ٹھہرے گا۔ عمدہ کھانا پکاؤ۔ مگر مرغی بھی ہونی چاہیئے"۔

پٹیل کی بیوی نے عمدہ کھانا بنایا۔ چپراسی توشہ دان بھر کر لے گیا۔ کھانے کے بعد صاحب ٹھنڈا پڑ گیا اور لہجے میں کچھ نرمی پیدا ہوئی۔ صبح اچھی خاصی ہدایتیں دیکر جاتے وقت پٹیل کہنے لگا "کھانا تو خوب بنایا، پٹیل رات میں۔ اتنی اچھی مرغیاں تمہارے پاس ہیں اسکی خبر ہمیں نہیں تھی"۔

پٹیل ایکدم ہنس دیا اور بولا — "ضرورت ہو تو ایک دو ساتھ لیجایئے"۔ صاحب اس پر خاموش ہو گئے۔ لیکن چپراسی پٹیل کے اطراف گھومنے لگا۔ پٹیل گھر جا کر بیوی سے کہنے لگا۔ "وہ مرغی چاہتا ہے۔ کہتا تھا — "ایسی مرغیاں تمہارے پاس ہیں اسکی خبر ہمیں نہیں تھی"۔

پٹیل کے جملہ ختم کرتے ہی اسکی بیوی کہنے لگی۔ "صاحب کی بڑی خوشامد کرنے لگے ہو! وہ مرغی مانگتا ہے؟ ہماری خریدی کہاں اچھی ہیں وہ تو اپنی ہی مرغیاں کھا کر جا رہے ہیں"۔

"کس منہ سے ایسا کہوں"۔

"پھر کیا کریں؟ روز تمہارا صاحب آئیگا اور مرغی مانگے گا۔ پھر ایک بھی مرغی باقی نہیں بچیگی؟ رات میں بچی ہوئی مرغیاں اپنی تھوڑے ہی تھیں"۔

"پھر پٹیل سناٹے میں آگیا۔
"سرکاری مرغیاں پکالی گئی تھیں"۔ پٹیل کی بیوی نے
جواب دیا۔
پٹیل ایکدم زمین پر بیٹھ گیا اور اُسکی زبان سے نکلا۔
"ہائے بھگوان۔ اب تو میں مرگیا۔"
باہر کھڑے ہوئے چپراسی نے سب سُن لیا تھا۔ وہ
سیدھا صاحب کے پاس پہنچا۔ اور تمام باتوں کی انہیں رپورٹ
دے دی۔
تانگہ چلنے لگا تب پٹیل اپنی بیوی کے پاگل پن کی وجہ سے
پریشان ہوکر تانگے کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔
صاحب نے دریافت کیا۔ "پٹیل مرغی لائے"؟
پٹیل چاپلوسی کی ہنسی ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ "دیسی مرغیاں
اب نہیں رہیں، صاحب!
"دیسی یعنی کیسی"؟
"ولایتی، صاحب"۔
"اچھا۔ ولایتی مرغیاں بھی تم پالتے ہو"؟
"میں نہیں صاحب.... وہ مرغیاں......!
"بولو، کہو! کیوں خاموش ہو"؟
"نہ صاحب.... پر.....!"
"بولو، کیا بات ہے"؟
"بچالو صاحب مجھے۔ بیوی نے غلطی کی ہے۔ میرے
پیچھے سرکاری مرغیاں کاٹ کر پکا دیں ــــ آپ کے لئے"!
"پاجی۔ بے شرم"!
صاحب بپھکارنے لگے۔ پٹیل نے تانگے میں بیٹھے ہوئے
صاحب کے قدم تھام لئے اور عرض کرنے لگا "سنبھال
لو صاحب! اب آپ کے ہاتھ میں ہوں"۔
"کیا سنبھالوں، خاک؟ اب کلکٹر مجھے کچا چبا جائیگا۔
اب میں کیا کروں"؟
"میری غلطی نہیں ہے صاحب! بیوی نے ایسا کر دیا۔
مجھے پتا تک نہیں چلا ــــ بچالو صاحب! اب کی بار بچالو"!
"بے وقوف؟ اوپر سے منہ چلاتا ہے۔ تیری بیوی بے عقل
ہے اس سے مجھے کیا سروکار"؟
تانگہ آگے اور پٹیل پیچھے پیچھے۔ صاحب گالیاں دیتے
رہے اور پٹیل اُن کے پیر پڑتا رہا۔ یہ سلسلہ ایک میل تک
چلتا رہا۔ آخر میں صاحب نے کہا:۔
"جاؤ۔ دفان ہو یہاں سے ــــ درخواست دو
مجھے کہ مرغیاں بیماری سے مرگئیں۔ میں تصدیق کردونگا
جاؤ، پاگل، بے شرم کہیں کے!!!"

(بقیہ افسانہ صفحہ ۵۰ "اونچی منڈیر")

یاد آرہی ہیں جیسے کل ہی کی بات ہو" بوڑھی عورت نے بھرائی ہوئی
آواز میں کہا "تیس برس سے اوپر ہو گئے۔ ایسی ہی بات تھی
تم اُن دنوں بس چھ مہینے کے تھے۔ وہ اور میں یہاں آئے تھے۔ یہ
منڈیر تب نامکمل تھی۔ یہاں بیٹھ کر انہوں نے کہا تھا کہ اِس شہر میں کسی
شخصیت کا آدمی آئیگا۔ وہ یہاں اِس منڈیر پر سے لوگوں کو اپنا
دے گا۔ انہیں کتنا انتظار رہتا۔ ہائے وقت سے پہلے کیسے پتہ تھا کہ وہ
شخصیت اُن ہی کی ہے۔ آج وقت اُن پر رک گیا ہے دیکھو تو اُن
ہاتھاؤں ہی چاندنی میں چمکا کرتا تھا۔ وہی مسکراہٹ ہے۔ وہی
انداز ہے......"
بوڑھی عورت کے نزدیک کھڑا ایک ننھا سا بچہ بڑے
بھولپن کے ساتھ نوجوان آدمی سے بولا "بابا یہاں کتنے پھول"
نوجوان نے بچے کو گود میں لیکر کہا "یہ سب عقیدت کے پھول
ہیں بیٹا۔ یہ ہمارے بابا کا مجسمہ ہے۔ انہوں نے بڑا کام کیا تھا
کہ اوصاف آج بھی زندہ ہیں۔ لوگ انہیں یاد کرتے ہیں۔ جب
موقع ملے تم بھی یہاں آیا کرنا"۔
بچے نے سر ہلایا اور غور سے اپنے بابا کے بابا کو بڑی حیرت
سے دیکھنے لگا۔

تبسم شفائی

بہتے دھارے

خان صاحب کے قدم بوجھل پڑنے لگے۔ وہ کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے رک گئے۔ رات پہلی سردی کی تھی۔ گیارہ بجنے والے تھے۔ کھڑکی سے ہوا کے سرد جھونکے آرہے تھے۔ جن کے لمس سے جسم میں ایک جھرجھری سی پیدا ہورہی تھی۔ اور گلابی جاڑے کا احساس جاگ رہا تھا۔ اگر کوئی دوسرا موقع ہوتا تو شاید خان صاحب اونی سوٹ میں ملبوس، گردن میں اپنا قیمتی کشمیری مفلر لپیٹے نظر آتے۔ لیکن آج ان کے جسم پر صرف ایک کھادی کا کرتا اور ڈھیلی مہری کا پائجامہ تھا۔ برساتی جو پونہ سے لے کر آئے تھے وہ کرسی پر پڑی تھی، کھڑکی کے سامنے سڑک پر بجلی کے کھمبے کھڑے اونگھ رہے تھے جن کی روشنی میں اندھیرے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ بالکل ایسے ہی اندھیرے جو روشنی کی حدوں کو محفوظ کر دیتے ہیں اور زندگی بھی ان اندھیرے اجالوں کے گھیرے میں الجھ کر رہ جاتی ہے لیکن انسان کو اس کا احساس ہوتا کہاں ہے؟ ——— شاید ان اندھیرے اجالوں کی آنکھ مچولی کے کھیل کا نام ہی تو زندگی ہے۔

خان صاحب نے رک کر سڑک کی طرف دیکھا۔ دُور دُور تک نظریں دوڑائیں، بجلی کے کھمبے اور سیمنٹ کے خوبصورت بے جان ڈھانچے، نظروں کا مرکز بن کر رہ گئے۔ جھنجھلاہٹ کے نقوش لمحہ بھر کے لئے ابھرے اور آہستہ آہستہ مٹنے لگے۔ ماحول کچھ اور ہی زیادہ بوجھل و اداس ہوگیا۔ ایک اچٹتی ہوئی نگاہ میز پر ڈالی اور بے ترتیب رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئے۔

عرفی انہیں بغور دیکھنے لگا۔ وہ ایک کرسی پہ بیٹھا میز پہ سر ٹکائے کچھ سوچ رہا تھا۔

خان صاحب نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور میز کی طرف بڑھ گئے۔ عرفی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی جس میں طنز تھا، تلخی تھی شاعر بھی

گویا اُن کے اس عمل کا اُسے بہت دیر سے انتظار رہا ہو۔ خا[ن] صاحب نے وہسکی کا گلاس اٹھایا اور قریب قریب نیٹ [و]ہ یعنی خالص وہسکی چڑھا گئے اور ایک موٹی سی گالی دے کر بولے

"ابے او عرفی کے بچے! شیام اور سندر کہاں مر گئے؟"

خان صاحب کے اس جملے کا عرفی نے جواب دینا زیادہ [مناسب] نہیں سمجھا۔ صرف گردن اٹھا کر خاموش رہ گیا۔ وہ گرم بنیا[ن،] شرٹ اور دھوتی پہنے تھا۔ شرٹ کے اوپر ایک ہلکی زرد ر[نگ] کی جیکٹ بھی تھی۔ عرفی خاموش اپنی کرسی سے اٹھا۔ اُسکی ظاہ[ری] کیفیت سے یہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اُسے سردی لگ ر[ہی] ہے۔ وہ اسی سردی کے احساس کو مٹانے کے لیے ٹیبل کی طرف بڑ[ھ] گیا۔ اور آہستہ سے وہسکی کا گلاس اٹھالیا۔ بالکل اسی ا[نداز سے] جیسے یہ کوئی شیشے کا گلاس نہیں بلکہ کسی نازک سی الہڑ لڑکی [کو] پیار کر رہا ہو۔ اور گلاس کو ہونٹ سے لگا کر خان صاحب [کی] طرف دیکھنے لگا۔

خان صاحب سگریٹ جلا کر لائٹر کو جیب میں رکھتے [ہوئے] کھڑکی کی طرف بڑھ گئے۔ اور نہ جانے کیا سوچتے ہوئے دُو[ر] خلاؤں میں دیکھنے لگے ——— دُنیا سو رہی تھی لیکن اُن کی آ[نکھوں] میں ذرا بھی خمار کی کیفیت نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا گ[ویا] رات کا جاگنا ان کے روزانہ کے معمول میں شامل ہے۔ کسی [نے] شانے پر دھیرے سے ہاتھ رکھا۔ وہ سمجھے شیام اور سُندر [ہیں] مگر جب مُڑ کر دیکھا تو سامنے غیرت سنگھ کو کھڑا پایا ——— اد[ھیڑ] عمر کا، اونی سوٹ میں ملبوس، نیلی ٹائی میں ایک سونے کی پن لگائے۔ جیسی کسی زمانے میں عورتیں اپنی ساڑھی میں لگا

کرتی تھیں۔ اور اسے فیشن میں شمار کیا جاتا تھا۔ پن کا کچھ حصہ کوٹ سے چھپا ہوا تھا۔ کیونکہ کوٹ کے تمام بٹن لگے ہوئے تھے۔

عرفی کی آنکھیں سرخ تھیں اور اُن میں لال، گلابی ڈورے ابھر آئے تھے۔ خان صاحب نے اس کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔ غیرت سنگھ کے ساتھ ایک اور نوجوان تھا۔ دراز قد، سڈول، صحت مند جسم، عمر یہی کوئی تیس سال کے لگ بھگ۔

وہ دونوں قریب آگئے تھے۔ عرفی نے نوجوان کی طرف ذرا تعجب سے دیکھا۔ اور وہسکی کی بوتل اور گلاس بڑھا دیا۔ غیرت سنگھ نے خان صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آیئے ہم سب کا پتہ بیچئے ہو جائے۔"

اور سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی لیکن اس کا اثر خان صاحب یا عرفی پر کوئی نہیں ہوا۔ وہ بدستور نوجوان کو گھورے جا رہے تھے۔ اور نوجوان شائد اسے اپنی عظمت سمجھ کر کھلکھلا پڑا۔

"یہ ہیں چرن داس ——!" نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غیرت سنگھ نے کہا۔ اور نوجوان کے چہرے پر آئی ہوئی کھلکھلاہٹ پھر مسکراہٹ میں بدل گئی، جس میں ندامت کی کیفیت بھی شامل تھی۔

"اور یہ ہیں ہمارے خان محبوب علی کنٹریکٹر پی، ڈبلیو، ڈی۔"

"آئی ایم ویری گلیڈ ٹو سی۔" نوجوان مسکرا دیا۔

"بڑی خوشی ہوئی۔"

خان صاحب نے کہا۔ وقتی طور پر اُن کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"اور یہ ——"

نوجوان نے غیرت سنگھ کی توجہ عرفی کی طرف کرائی۔

"یہ پونا کے گودام انچارج مسٹر عرفی۔"

عرفی کے چہرے پر بھی وہی مسکراہٹ چھا گئی جو کچھ دیر پہلے نوجوان کے ہونٹوں پر چھائی تھی۔

ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا۔ سب کی توجہ دروازے کی طرف ہو گئی۔ کمرے میں شیام اور سُندر داخل ہو رہے تھے۔ تعارف کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوا۔

"آپ ہیں چرن داس۔"

شاعر بمبئی

"اور آپ سے ملئے، آپ ہیں شیام صاحب، خان صاحب کے پارٹنر اور یہ سندر صاحب بھی۔ ہمارے پارٹنر ہیں اور لنگوٹیا یار یہ"

"آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ——"

نوجوان نے سندر کا ہاتھ بڑی گرم جوشی سے دبایا۔

غیرت سنگھ نے ایکبارگی اپنی مخمور نگاہیں اُوپر اٹھائیں۔

"ارے خان صاحب! آپ وہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہیں —— ؟"

خان صاحب بغیر کچھ کہے کرسی پر آبیٹھے۔ پہلے تو بڑی متانت سے وہسکی کا گلاس اٹھا کر ایک پیگ پیا اور پھر سگریٹ سلگاتے ہوئے بولے۔

"نیلم ڈیم کا ٹینڈر منظور ہو گیا ہے۔"

اُن لوگوں میں کوئی بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ انہیں یہاں کیوں بلایا گیا ہے، لیکن خان صاحب کے اس مختصر سے جملے نے اطمینان کی ایک لہر سب کے چہرے پر دوڑا دی۔

غیرت سنگھ نے نوجوان کی طرف فخریہ انداز سے دیکھا۔

"ڈرنگل ڈیم میں صرف اڑتیس ہزار کا پرافٹ ہوا ہے۔" خان صاحب نے کہنا شروع کیا۔

"اگر سیمنٹ کی جگہ چونا استعمال کیا جائے تو مزید بیس ہزار کی اور بچت ہو سکتی ہے۔"

"پانچ پرسینٹ سیمنٹ ہی کم کر دی جائے تو کیا بُرا ہے؟" غیرت سنگھ نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"بُرا تو کچھ نہیں ہے لیکن اوورسیئر...... ؟"

"ارے اوورسیئر اپنی پارٹی کا آدمی ہے۔"

"پچھلے ٹائم ہم دھوکا کھاتے کھاتے بچے، ان لوگوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اچھا چرن داس! سیمنٹ کی ویگن کل آرہی ہے بات ابھی پکّی ہو جائے تو بہتر ہے۔"

"ہاں —— ہاں! ہو جانی چاہیئے۔"

"ابھی فی الحال چھ سو بوریاں آپ کے گودام میں پہنچ جائیں گی۔ ذرا عرفی صاحب کو ایڈریس نوٹ کرا دیں۔"

چرن داس نے ترچھی نظر سے غیرت سنگھ کی طرف دیکھا جو ایک ٹک خان صاحب کے چہرے کو دیکھے جا رہا تھا۔

مشینوں کے اس شہر کی ہنگامی کیفیت کسی حد تک اب ختم ہو چکی تھی کبھی کبھار ٹرک یا کسی کار کی آہٹ سے سڑک جاگ اٹھتی اور فضا دوسرے ہی لمحہ خاموش ہو جاتی۔

بمبئی میں شراب کی ممانعت ہے لیکن یہاں کے اکثر ہوٹلوں میں بغیر شراب کے محفل جمتی ہی نہیں۔ رات با ہر ٹھٹھر رہی تھی اور تاج محل ہوٹل کے اُس روم میں بلیک اینڈ وھائٹ برانڈ وہسکی کے دَور چل رہے تھے۔ اور محفل اپنے پُورے شباب پر تھی۔ ایک بجے تک اس محفل کا یہی عالم رہا۔

"اچھا اب چلیں گے ـــ" نوجوان نے کہا۔

اور تمام لوگ اپنی اپنی کُرسی سے اٹھنے لگے۔ غیرت سنگھ اپنے گلاس میں بچی ہوئی وہسکی کو حلق میں انڈیلتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

سُندر کے ہونٹوں پر بدستور مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"ارے آپ پُونا سے کب آئے ؟"

"شام میں آیا ہوں۔ تین دن سے لگاتار بارش ہو رہی تھی، جس کی وجہ سے نکلنا دشوار ہو گیا اور مجبوراً اسی بارش میں آنا پڑا۔"

اور خاں صاحب سر جھکائے بوتل سے وہسکی انڈیلنے لگے۔

"ہواؤں میں کتنی خنکی ہے۔"

چلتے چلتے چرن داس نے خاں صاحب کی توجّہ ایک بار پھر سیمنٹ کی بوریوں کی طرف کرائی۔ خاں صاحب نے سب کو رخصت کیا تاج محل ہوٹل کے اس کمرے میں تھوڑی ہی دیر بعد سکوت چھا گیا اور خان صاحب نیلم ڈیم کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گئے۔

دوسری صبح اُن کی آنکھ دیر سے کُھلی۔ سامنے مورننگ ایکسپریس کا تازہ شمارہ پڑا ہوا تھا۔ جیسے کچھ دیر قبل بوائے رکھ گیا تھا۔ ابھی یہ اخبار اٹھا ہی رہے تھے کہ غیرت سنگھ کمرے میں داخل ہوا ایک دم بدحواس سا۔

"ڈُرنگل ڈیم ٹوٹ گیا۔"

"کیا ! ـــ" خان صاحب کچھ نہ سمجھ سکے۔

"ڈُرنگل اور ڈھولا، دونوں ڈیم ٹوٹ گئے ہیں۔ اور پوری پونہ بستی بہہ گئی۔"

"اوں ـــ" خان صاحب کا دماغ چکرا گیا۔ غیرت سنگھ کہے جا رہا تھا۔

"ابھی ابھی بمبئی ریڈیو نے اناؤنس کیا ہے۔ بالکل اچانک ہی یہ ڈیم ٹوٹے ہیں۔ جس کی وجہ سے کوئی سرکاری مدد نہیں پہنچائی جا سکی۔"

اور خاں صاحب اس کے آگے کچھ نہ سُن سکے۔ اُنکی نگاہوں میں سب سے پہلے جو تصویر اُبھری وہ ڈُرنگل ڈیم کی تھی اور پھر ڈُرنگل ڈیم کے قریب بنے ہوئے ان کے کوارٹر کی اور بعد میں نعیمہ کی، جو اُن کی بیوی تھی۔ ساتھ ہی سُہیل کا چہرہ بھی اُن کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ یہ سب چہرے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگے ـــ پانی چاروں طرف پھیل گیا۔ اور سب چہرے اُس میں گُھل گئے۔

خان صاحب خاموش نگاہوں سے غیرت سنگھ کو دیکھ رہے تھے ـــ گویا کچھ کہنا چاہتے ہوں، کچھ بولنا چاہتے ہوں، لیکن وہ کہیں بھی تو کیا اور پوچھیں بھی تو کیا ؟ ـــ شاید یہی اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ غیرت سنگھ اُنہیں گھُورتا تک رہا تھا۔ خان صاحب کے ذہن سے نعیمہ اور سُہیل کی تصویریں دھندلاتی گئیں، پھر اندھیرا چھانے لگا چھاتا چلا گیا، اور مورننگ ایکسپریس کا تازہ شمارہ چھوٹ کر ان کے ہاتھوں سے گر پڑا۔

رفعت صدیقی

زندہ تربت

کمرے میں ایسی خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ ایک بھونرے کی بھنبھناہٹ بھی یوں لگ رہی تھی جیسے کوئی ٹرک، شہر کے باہر اپنے چھیلے ڈرائیور کے ہاتھوں میں چنگھاڑ رہا ہو اور اس خاموشی میں چھوٹی اماں کی سانس رُک رُک کر ایسے چل رہی تھی جیسے کوئی شرابی لڑکھڑا رہا ہو — زندگی اور موت میں چند قدم کا فاصلہ تھا۔ منزل قریب تھی — سفر ختم ہو رہا تھا — چند قدم اور — کچھ سانسیں اور — پھر رُوح کا پنچھی اُڑ جاتا، گوشت کا سب جال توڑ کر اپنے پیچھے چھوڑ کر —

یکایک احسن، شاید جمود توڑنے کے لئے مصنوعی طور پر کھانسا اور سب کی نظریں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ مسکرا دیا "بھئی، بڑھی مری تو نہیں چکتی"۔ اُس نے جمیل کے کان میں چپکے سے کہا "میرا سارا پروگرام چوپٹ ہوا جا رہا ہے"۔ اُس کے باپ محسن نے تنگ آکر شاید بیسویں مرتبہ اپنی رسٹ واچ کو قہر آلودہ نظروں سے گھورا۔ "اُفوہ! ڈاکٹر نے تو کہا تھا۔ ابھی ایک ہی گھنٹے کی مہمان ہیں اور یہ ہیں کہ ابھی سانس ہی لیتی جا رہی ہیں! اور وہاں کلکٹر صاحب میرا انتظار کر رہے ہوں گے"۔

"سیدانی بی!" وہ چیخے، "کہاں گئیں سیدانی بی؟"

"آ رہی ہوں سرکار!" ایک نحیف آواز آئی۔ اور پھر سلیپروں کی چاپ سنائی دی۔ سیدانی بی سفید براق ساڑھی اور لمبے کرتے میں ملبوس عینک کے دھندلے شیشوں میں سے سب کو گھورتی ہوئی داخل ہوئیں۔

"آپ کو قرآن مجید کی اچھی سورتیں تو یاد ہوں گی؟"

"اے، واہ بیٹا!" سیدانی بی نے ہاتھ نچایا۔ "بارہ برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا اور تم کہتے ہو......"

"اچھا! اچھا!!" محسن سٹپٹا گئے، "پڑھیے ذرا سرہانے آکر تاکہ دم نکلنے میں آسانی ہو"۔

سیدانی بی پلّو سر پر ڈال کر مریضہ کے سرہانے بیٹھ گئیں اور پھر کچھ مُنہ ہی مُنہ میں بُدبُدانے لگیں۔ سب کی نظریں اب مریضہ کے چہرے پر تھیں۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں ورنہ آج وہ دیکھ لیتیں کہ جنھوں نے ایک عرصے سے اُن کی صورت نہ دیکھی تھی اب وہ سب کے سب اُنھیں گھیرے ہوئے ہیں۔ کیا موت سے قربت اتنی زندگیوں کو اُن کے قریب لا سکتی ہے؟

یکایک اُن کی پلکوں میں جنبش سی ہوئی۔ نحیف سا ہاتھ کسی نازک سے پودے کی طرح ہوا میں لہرایا۔ عین اُسی وقت احسن کی نظریں اُن کی پلکوں سے ہٹ کر فہمیدہ کی نظروں سے ٹکرا گئیں اور وہ دونوں ایک لمحے کے لئے کسی اور ہی دُنیا میں پہنچ گئے، جہاں نہ چھوٹی اماں کی موت سے آنکھ مچولی کا منظر تھا نہ رشتہ داروں کا ہجوم۔

مریضہ کی پلکوں میں پھر حرکت ہوئی اور اُنھوں نے ایک بے نور آنکھیں کھول دیں — اتنے بہت سے آدمی — اُن کی آنکھیں پھیل گئیں۔ جب وہ بے ہوش ہوئی تھیں تب تو کوئی بھی نہ تھا اور اب — ؟ اُنھیں مُردار خوار گِدھوں کا خیال آیا جو کسی لاش پر جھپٹنے کی تیاری کر رہے ہوں اُنھوں نے آنکھیں بند کر لیں — مگر پھر کھول دیں اور سب کا جائزہ لینے لگیں۔ یہ محسن ہے میرا بڑا سوتیلا بیٹا۔ یہ اُس کی بیوی — یہ اُن کا احسن شاعر بھی

ـ یہ جمیل ہے، محسن کا سالا ـــــ یہ فہمیدہ ہے، اُن کے موتیلے بیٹے حسن کی بیٹی۔ لیکن حسن ـــــ؟

"حسن ـــــ حسن نہیں آئے؟" اُنہوں نے رُکتے رُکتے پوچھا۔

"وہ ابھی آئیں گے" احسن بولا

اُن کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں ـــــ تو حسن نہیں آیا! بے ایمان کہیں کا! کمبخت گھڑے گھڑے ہی آجاتا تو دیکھ لیتی ـــــ برسوں ہی تو ہو گئے ہیں اُسے دیکھے ہوئے۔ ارمان رہ جائے گا ـــــ اُنہوں نے کروٹ بدلنی چاہی لیکن سینے میں اس بری طرح درد اُٹھا کہ وہ ایک لمحے کے لئے اُس اینٹھن کو بھی بھول گئیں جس نے تقریباً ایک ہفتے سے اُنہیں جکڑ رکھا تھا۔ ڈاکٹر نے تو کہہ ہی دیا تھا کہ دونوں پھیپھڑے قطعی بے کار ہو چکے ہیں ـــــ پھر کون تھا جو اُن کے علاج کے لئے کہتا؟ اُن کی زندگی سے کس کو دلچسپی تھی؟ ہاں دلچسپی تھی تو اُن روپوں سے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ اُنہوں نے کہیں چھپا کے رکھے ہوئے ہیں۔

اُنہوں نے اَدھ کھلی آنکھوں سے چھت کی طرف نظر ڈالی۔ کل یہ بوسیدہ کمرہ جس کی چھت اُن ہی کی طرح سالخوردہ تھی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُن کے وجود سے خالی ہو جائے گا ـــــ کل جب سورج کی پہلی کرن اندر داخل ہوگی تو اُنہیں لیٹے لیٹے مناجات نہ پڑھتے دیکھ کر گھبرا اُٹھے گی ـــــ کل وہ اِس گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلی جائیں گی جس میں اُنہوں نے اپنی زندگی کے پچاس سال گزارے تھے۔ اس وقت سے جب کہ وہ دو بچوں کے باپ کی دوسری بیوی بن کر آئی تھیں، آج تک کتنی لمبی کہانی ہے! موت بھی بڑی ناز برداریاں کراتی ہے!

اُنہوں نے اپنا ننھا سا ہاتھ جس کا اٹکا ہوا چمڑا گندھے ہوئے آٹے کی طرح نرم تھا، اپنے سینے پر رکھ لیا۔ جہاں نشتر سے چبھ رہے تھے کتنی عجیب تھی وہ رات، جب وہ دلہن بن کر اِس ڈیوڑھی میں آئی تھیں۔ کئی عمر رسیدہ عورتوں نے ان کا استقبال کیا تھا۔ اور کافی دیر تک اُنہیں گھیرے ہوئے اُن کی ہر ہر حرکت کا بغور مشاہدہ کرتی رہی تھیں جیسے کوئی جوہری کسی نگینے کو پرکھتا ہے۔ پھر اُنہیں ایک اور کمرے میں لایا گیا جہاں زربفت کے پردے جھول رہے تھے۔ اور قالینوں سے فرش جگمگا رہا تھا۔ لطیف سی خوشبوئیں فضا میں رچی ہوئی تھیں۔ اُنہیں ایک پلنگ پر بٹھا دیا گیا تھا۔ پھر آواز آئی۔ "دلہن! دلہن!! آنکھیں کھولو!" ان کی آنکھیں بند ہی رہیں۔

"واری جاؤں بیگم جان، آنکھیں کھول دو!" یہ ان کے میکے سے آئی ہوئی مغلانی کی آواز تھی۔ اُنہوں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں اور اپنے آپ کو مغلانی اور ایک نورانی چہرے والی بڑی بی کے درمیان بیٹھا پا کر اطمینان کا سانس لیا تھا۔ وہ عورتوں کی بے باک تنقیدیں ـــــ بھونڈے مذاق اب اُن سے بہت دُور تھے۔

"دلہن! وہ دیکھو تمہارے دونوں بیٹے!"

"بیٹے!" وہ دل ہی دل میں مسکرائی تھیں۔ یہ پہلے روز ہی میں اچھی دو بچوں کی ماں بن گئی۔ اُنہوں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ گیارہ برس کا لڑکا محسن اور چار برس کا حسن بڑی حیرت سے اُن کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن کے بھولے پن پر اُنہیں پیار آ گیا۔ اُنہوں نے حسن کو اپنی طرف کھینچا۔ وہ جھجکنے لگا۔

"ارے پگلے! اپنی ماں سے شرماتا ہے؟" بڑی بی اپنے پوپلے منہ سے بولیں "چھی! چھی!! یہ تو تمہاری امّی ہیں، سمجھے! اب سے تم اِنہیں امّی کہا کرنا!"

اور دونوں نے سوالیہ نظروں سے اُن کی طرف دیکھا تھا گویا پوچھتے ہوں کیا واقعی تم ہماری امّی ہو؟ یا محض ہمارے ابّا کی دوسری بیوی!

وہ مشفقانہ انداز سے مسکرائیں۔

اور پھر جب بہت رات گزر گئی۔ بڑی بی اور مغلانی کی آنکھیں نیند کے بوجھ سے جھپکنے لگیں اور جب اُنہوں نے بھی پلنگ کے بتّھے پر سر ٹیک دیا تو باہر ایک آہٹ سنائی دی۔ کوئی بھاری قدموں سے کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ پھر ایک سیاہ فام بھاری بھرکم شخص اندر داخل ہوا۔ بڑی مونچھیں ـــــ پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی۔ بھویں عجیب انداز سے سکڑی ہوئی۔ کیا یہی میرے لئے رہ گیا تھا میرے معبود!

دنیا تو بہت بڑی ہے۔

"آداب عرض ہے" ایک بھاری آواز گونجی۔ وہ خاموش رہیں۔

"کیا ہے مُغلانی! تمہاری بی بی کچھ جواب ہی نہیں دیتیں؟"

"کچھ نہیں سرکار!" بڑھیا نے باچھیں چیر دیں۔ "نئی نئی ہیں، شرم تو رہے گی"

اور پھر وہ دونوں کمرے سے نکل گئیں۔ اُن کے مقدّر کے مالک بازو ہی کی آرام کرسی پر دراز ہوگئے تھے۔

"آرام سے بیٹھو!" اُن سے کہا گیا۔ "تکلیف کیوں جھیلتی ہو؟"

جھیلنی تو ہے ہی اب عمر بھر ـــــ ان کا دل بھر آیا۔

اچانک ایک ہاتھ آگے بڑھا اور اُن کا گھونگھٹ الٹ گیا۔ ہاتھ والا مبہوت ہوگیا۔ گلابی سے چہرے پر پلکیں جھکی ہوئی تھیں جیسے گلاب کی کلیوں پر دو بھونرے بیٹھے ہوں۔ اُف، اچانک محسن سوتے میں قریب ہی کھانس اُٹھا اور اس کے ابّا کو چونکنا پڑا۔ تبھی اُنہیں احساس ہوا کہ اِس کمرے میں اُن کی نئی نویلی بیوی ہی نہیں بچے بھی ہیں۔ اور یہ شادی اُنہوں نے بچّوں کے لئے ہی تو کی تھی۔ ورنہ ان کا کیا تھا وہ تو عمر بھر رنڈوے رہ سکتے تھے! اُنہوں نے خود کو جیسے تسلّی دی۔

اس طرح بیگم جان کی شادی شدہ زندگی کا آغاز ہوا۔ دن کسی میدان میں بہنے والے دریا کی طرح آہستہ آہستہ گزرنے لگے۔ نہ کوئی ہلچل، نہ کوئی شور۔ اور نہ کوئی سرخوشی ـــــ دن کی روشنیاں، شام کے سایوں کا پیچھا کرتی رہتیں۔ حتیٰ کہ دونوں مل جاتے اور تھوڑی دیر کے لئے اندھیرا گہرا ہوجاتا ـــــ سمندر کی تہہ کی طرح۔ پھر روشنیاں اندھیرے کا سینہ چاک کر دیتیں۔ اس طرح ظلمت دنور کا یہ کبھی نہ ختم ہونے والا دَور چلتا رہا ـــــ دن مہینوں، اور مہینے سالوں کی آغوش میں سماتے رہے۔ اُنہوں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا یا یوں کہیئے کہ اُنہیں یہ سمجھوتہ کر لینا پڑا تھا شوہر کے سال خوردہ جذبات کے کُند ہوجانے کا تو ذکر ہی فضول تھا۔ چھری بھی ایک مدّت کے بعد زنگ پکڑ لیتی ہے۔ پھر یہ تو انسان کا معاملہ تھا، اُنہوں نے اپنی جوانی کے خوابوں کو کفن پہنا کر کہیں دفن کر دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی خوابوں کا یہ بھوت اُنہیں ڈرانے اور پریشان کرنے کے لئے بھی آجاتا۔ زندگی کو ایسے موقع پر وہ بچّوں کے پیار کی رشوت دینے کی کوشش کرتیں۔ آہستہ آہستہ یہ رشوت قبول ہوتی گئی۔ حسن کو ان کے بغیر چین نہیں آنے لگا۔ ماں کی ممتا سے محروم بچّے نے اُن کی محبّت بھری آغوش کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے، لیکن محسن کسی قدر کھنچا کھنچا سا رہتا۔ پھر بھی جیسے جیسے دن کٹتے گئے جیسے کسی مالدار کنجوس کی دولت ختم ہو رہی ہو۔ لیکن ایک دن ـــــ

ایک دن اُن کے گھر میں چمپا آگئی۔ گھر میں بہت دنوں سے ایک ماما کی ضرورت تھی۔ چمپا آئی اور دھڑلّے سے آئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں باورچی خانے کی صورت بدل گئی۔ بیگم جان خوش ہوگئیں۔ پھر جب چمپا نے کارکردگی کے ساتھ ساتھ شوخی کا بھی مسالہ لگایا تو میاں بھی متوجّہ ہوئے۔ باورچی خانے کے ساتھ ساتھ دیوان خانے کی بھی نوکری لگی ـــــ کچھ دن اور گزرے اور باورچی خانہ ویران نظر آنے لگا کیونکہ باورچی خانے کی بہار تو میاں کے دل کے غنچے کھلا رہی تھی۔ اب بیگم جان کی آنکھیں کھُلیں۔ انہوں نے بڑی آہستگی سے احتجاج کیا جب اِس کا کچھ اثر نہ ہوا تو ایک بار وہ جی کڑا کر کے میاں کے آگے رو دیں لیکن جواب میں ڈانٹ ملی۔

اس کے بعد اُنہوں نے کچھ نہ کہا۔ کہنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ اُن کے میکے میں کوئی زندہ ہوتا تو کچھ کیا بھی جاسکتا۔ ہندوستانی شادی شدہ عورت کے لئے میکہ وہ پارس پتھر ہے جسے استعمال کرنے کی دھمکی دے کر زیادہ تر صورتوں میں سسرال کے سنہرے دن حاصل کئے جاسکتے ہیں لیکن جب پارس پتھر ہی گم ہوجائے تو ـــــ ؟

پھر چمپا آہستہ آہستہ اُن پر حاوی ہوتی گئی اور وہ قعرِ مذلّت میں گرتی گئیں ـــــ مالکن سے نوکرانی تک، نوکرانی سے مالکن تک بڑے عجیب مراحل ہیں۔ لیکن جب میاں کا دل ہی مٹھی میں نہ ہو تو کیا نوکرانی اور کیا مالکن!

ذلّت کے اِس اذیت ناک دَور سے ابھی وہ گُذر رہی تھیں کہ ایک اور واقعہ ہوا ـــــ ایک صبح چپا گھر سے غائب تھی زیورات کے ایک ڈبّے کے ساتھ ـــــ اور تھوڑی دیر بعد یہ بھی معلوم ہوا کہ محلّے کا ایک نوجوان دوکاندار بھی لاپتہ ہے۔ پولس میں رپورٹ لکھوائی گئی مگر کچھ بنا نہیں۔ رو پیٹ کر میاں بیٹھ رہے، بدنامی نے گویا اُن کی کمر توڑ دی۔ یک بیک عمر میں کئی سال کا اضافہ ہوگیا۔ خضاب کی شیشیوں اور قسم قسم کی دواؤں سے اعتقاد اُٹھ گیا۔ نئی نئی بیماریوں نے آگھیرا ـــــ لاچار وظیفہ کی درخواست دے دی جو فوراً منظور ہوگئی ـ وظیفہ ملنا تھا کہ میاں بالکل چارپائی سے لگ گئے اور پھر ایک دن ـــــ ایک دن بیگم جان نے اپنی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔

بیگم جان نے بیماری میں اپنے میاں کی جان توڑ خدمت کی تھی۔ دن رات ایک کر دئے تھے۔ لیکن میاں کے بعد محسن اور حسن نہ جانے کیوں یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اُن کے باپ کو موت جو آئی تھی وہ بیگم جان ہی کی وجہ سے آئی تھی۔ اب اُن کا لڑکپن بھی نہ رہا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ انہیں یتیمی کے احساس نے اپنی سوتیلی ماں سے اجنبی بنا دیا تھا۔

پھر کیا ہوا ـــ؟ چھوٹی اماں کے حافظے کے دُھندلے پردے پر کچھ اور دُھند چھا گئی ـــــ جب یہ دُھند چھٹی تو انہیں یاد آیا کہ محسن نے ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور وہ اپنی قسمت پر قانع ہو کر ایک کوٹھری میں بیٹھ رہیں۔ پھر ڈیوڑھی میں شادیاں ہوئیں ـــــ بچّوں کی ننھی منّی آوازیں گونجیں لیکن یہ آوازیں اُن سے اجنبی ہی رہیں اور اُن کی زندگی جائے نماز پر پانچ مرتبہ روزانہ سر جھکانے، تسبیح گھمانے اور پن کٹّی سے پان نکال نکال کر کھانے تک محدود ہوگئی۔ بڑھاپے نے اُن پر بڑی جلدی کرم کیا تھا۔ چلو اچھا ہوا سفر سے اُکتائے ہوئے مسافر کو شام کی آمد نے پڑاؤ کا مژدہ سُنا دیا تھا۔

ویسے محسن اور حسن کو ان سے اب کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی مگر ان کا خیال تھا کہ بڈّھی نے اپنے زیورات کہیں چھُپا کر رکھے ہیں۔ بیگم جان کا دل اب اُن سے اتنا کھٹا ہوگیا تھا کہ وہ ان کی صورت بھی دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔ دن میں تین بار نوکر بچا کھچا کھانا اُن کے کمرے کی دہلیز پر رکھ جاتا (بڑے مزاج شناس ہوتے ہیں یہ نوکر بھی مالکوں کے!) اور سال میں ایک بار، جیسا کہ وہ کہا کرتیں، ان کے لئے کفن بن جایا کرتا۔ کوٹھی میں دعوتیں ہوتیں، جشن ہوتے، خوشیاں منائی جاتیں، ہنگامے ہوتے لیکن اُن کی دنیا، ان کی کوٹھری میں ختم تھی۔

اُنہوں نے پھر پاؤں اینٹھے جیسے کوئی ان کی ٹانگیں چیر رہا ہو۔ سینے میں جیسے کوئی بار بار نشتر چبھونے لگا۔ اُنہوں نے دانت بھینچ لئے۔ سیدانی بی کی آواز اور تیز ہوگئی جیسے اُنہوں نے کچھ دیکھ لیا ہو۔ باہر کھٹ کھٹ کی آواز سُنائی دی اور حسن کمرے میں داخل ہوئے۔ بڑے بھائی نے اُنہیں دروازے ہی پر روک لیا۔ بولے۔ "بہت کوشش کی کہ کسی طرح پتہ چل جائے لیکن بتاتی نہیں کہ زیورات کہاں رکھے ہیں؟"

"میں دیکھتا ہوں" حسن نے معنی خیز انداز سے سر ہلایا۔

وہ آہستہ چلتے ہوئے چھوٹی اماں کے قریب آئے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔ ایک کراہ سی اُن کے مُنہ سے نکلی اور بیگم جان نے آنکھیں کھول دیں۔ حسن کو دیکھتے ہی جیسے اعضاء میں زندگی دوڑ گئی۔ نحیف سا ہاتھ سر پر جانے کے لئے اٹھا مگر اٹھ کر رہ گیا اور حسن پھوٹ پڑے۔ دونوں ہاتھوں سے اُنہوں نے چہرہ چھُپا لیا تھا۔ اور جب اُنہوں نے ہاتھ ہٹائے تو آنسو آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ چھوٹی اماں کی آنکھیں چمک اُٹھیں جیسے ساری زندگی ہار کر اُنہوں نے یہ آنسو جیت لئے ہوں۔ کانپتے کانپتے وہ بولیں۔ "مت رو میرے لال! مت رو! میں جانتی ہوں تو دل کا بُرا نہیں ـــ حالات نے تجھے ـــ ایسا بنا دیا تھا کہ ت ـــــ تُو مجھے بھول گیا" وہ ہانپنے لگیں، جیسے اور آگے سانس لینا دو بھر ہو لیکن وہ بات ـــ "زیورات ـــ نیم ـــ نیم کے پیڑ کے نیچے ـــ لے لینا ـــ بیوٹوں کے ـــ" وہ اتنا ہی کہہ پائی تھیں کہ بدن میں بری طرح کپکپاہٹ شروع ہوگئی ایک لمحہ تک زلزلہ سا جاری رہا اور پھر اُن کی گردن ایک جھٹکے کے ساتھ ایک طرف ڈھلک گئی۔ ایک ایک کر کے سب باہر نکلے۔ اُن کے چہروں پر اطمینان کے آثار تھے۔

ساتھ کے کمرے میں محسن، حسن سے کہہ رہے تھے، "واہ بھائی جان! ذراسی اداکاری نے کتنا بڑا مسئلہ حل کر دیا۔ آنسو دیکھتے ہی بڈّھی نے سب کچھ اگل دیا" اور چادر کی سفیدی کے نیچے چھوٹی اماں کے جھرّیوں بھرے چہرے پر مُسکراہٹ سی چھائی ہوئی تھی، جیسے انہیں سب کچھ پتہ تھا!

محمد عظیم فیروزآبادی

(مزاحیہ)

میرے چچا

چچا کا نام نادر بخش تھا اور وہ سچ مچ تھے بھی بڑے نادر، اتنا بڑا ڈیل ڈول کہ آپ ایک بار اُنہیں دیکھ لیں تو ناممکن ہے کہ اُنہیں بھول جائیں۔ چچا کا تصور آتے ہی سب سے پہلے میرے ذہن میں اُن کا پیٹ اُبھرتا ہے۔ پیٹ کاہے کو تھا، اچھا خاصا مٹکا تھا۔ جس پر اُن کا تہبند اِس طرح لپٹا رہتا تھا جیسے گرمیوں میں لوگ نئی گول پر کپڑا یا بورا لپیٹ دیتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ گول پر کپڑا مضبوطی سے لپٹ جاتا ہے، لیکن تہبند کو تو پیٹ سے خدا مارے کا بیر تھا۔ وہ بار بار اُسے باندھتے تھے، اُدپر کھسکاتے تھے اور وہ بار بار نیچے آجاتا تھا۔ جب دیکھو چچا کے ہاتھ میں تہبند ہے۔ بیٹھتے تو تہبند باندھ کر بیٹھتے اور اُٹھتے تو تہبند ہاتھ میں ہوتا۔ قمیص پہننے کی توفیق کم ہی ہوتی تھی۔ بازار جاتے تو البتہ پہن لیا کرتے ورنہ زیادہ تر ایک شلوکا پہنے رہتے جو اُن کے جسم سے زیادہ اُن کی چارپائی کی زینت بنا رہتا۔ چلتے وقت کندھے پر ایک رومال پڑا رہتا جو ہاتھ منہ پونچھنے یا سودا سُلف باندھنے کے کام آتا۔ پیر میں نیوکٹ جوتا، جس کی ایڑیاں ایک طرف پچکی ہوئی ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ ایک کالی شیروانی بنوائی تھی، پہن کر نکلے تو لوگوں نے ٹوک ٹوک کر ناک میں دم کر دیا۔ گھر آتے ہی اُسے خیرات کر دیا اور پھر کبھی ایسی غلطی نہیں کی۔

جتنا بڑا پیٹ تھا، اُتنا ہی بڑا چہرہ بھی تھا۔ موٹے موٹے ہونٹ، پونگا سی ناک، یہ بڑا ماتھا کیا کسی ہاتھی کا ہوگا، اُس سے بھی بڑے کان، سُرخ سفید رنگ جو عمر کھینچنے سے تبدیل ہو کر [illegible] جیسا ہو گیا تھا [illegible]، [illegible] چھوٹے دانت جو کبھی اِتنے مضبوط تھے کہ چچی اُن سے پکڑ کر [illegible] انھا لیا کرتے تھے، لیکن چونکہ چھوٹے تھے اور چچا کے جسم سے مناسبت نہیں رکھتے تھے اس لئے ہمیشہ کیلئے

شاعر بھی

رُخصت ہوگئے۔ اور اب چچا نے مستقل بتیسی چڑھالی تھی جو منہ دھوتے وقت چارپائی پر شلوکے کا ساتھ دیا کرتی تھی۔

ڈاکٹر اقبال چچا کے ہم عصر تھے، لیکن اُنہیں بدقسمتی سے چچا سے مُلاقات کرنے کا شرف حاصل نہیں ہوا ورنہ اُن کی بندوں کو گننے کے بجائے تولنے کی حسرت پُوری ہو جاتی، واقعہ یہ ہے چچا اپنی ذات سے ایک فرد نہیں، پُوری انجمن تھے۔ ایک بار دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ ٹرین سے اُتر کر جب پھاٹک پر بابو کو اپنا ٹکٹ دیا تو اُس نے کہا ایک ٹکٹ اور دیجئے چچا یہ سمجھے کہ یہ عورت جو ابھی گزر رہی ہے، بابو اُسے میری بیوی سمجھ کر اُس کا ٹکٹ مجھ سے مانگتا ہے۔ بولے وہ میری گھر والی نہیں ہے، اُس کا ٹکٹ میں کیوں دوں۔ بابو نے کہا نہیں حضرت آپ اپنا ایک ٹکٹ اور دیجئے چچا نے اُسے اِس طرح گھورا جیسے اُسے بھی اپنے جسم کا ایک حصّہ بنا لیں گے اور وہ مُسکرا کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

چچا کی تنومندی کا ذکر آگیا ہے تو اُن کی بے اندازہ قوت کا بھی ایک قصّہ سُن لیجئے۔ بھاری بھرکم جسم کو اُٹھانے سے ٹانگیں احتجاج کرتی تھیں، لیکن چچا اُن کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ ہاں یہ ضرور کیا تھا کہ اُنہیں سہارا دینے کے لئے ایک موٹا سا بید لے کر چلتے تھے۔ لیکن کیا مجال کہ صبح کا سودا سُلف خود نہ لائیں یا شام کو کارخانہ کا تقاضا وصول کرنے کے لئے بازار جانے سے پہلو تہی کریں۔ روپیوں کی تھیلی لی، منّی کو ساتھ لیا اور بازار چل دیئے۔ ایک ایک دوکان پر جاتے، اطمینان سے بیٹھتے، کوئی جلدی تھی نہیں۔ تھوڑی دیر اور بیٹھے یا جی میں آیا تو چل دیئے۔ غرض سارا بازار گھوم کر ہنستے کھیلتے دفتر آجاتے تھیلی نموماً [illegible] نہیں ہوتی تو یہ فکر نہیں تھی کہ کس نے دیا کس نے نہیں دیا۔ کاروبار کی الجھن یا فکر کے آثار چہرے پر نظر نہیں آتے۔ جانے وہ زمانہ کیسا تھا یا وہ لوگ

کیسے تھے۔ تو ہاں یہاں ذکر کر رہا تھا اُن کی تنومندی کا۔ ایک دن بازار میں بھری تھیلی دیکھ کر تلن بخش نے اُن سے کہا، "اُستاد، تمہاری یہ تھیلی کوئی چھین لے تو کیا کرو گے؟" اُستاد نے ہنستے ہوئے جواب دیا، "تمہارے سوا اور تو کوئی نظر نہیں آتا۔" تلن بخش جوان آدمی تھا۔ پہلوانی کرنے کی وجہ سے بازوؤں میں کس بل تھا۔ طبیعت میں زُعم تھا، کہنے لگا "دس روپے تمہارے ایک روپیہ میرا، جو دے پٹکے اُٹھالے جائے۔" باتیں سُن کر آس پاس کے دوکاندار جمع ہو گئے۔ لوگ تماشا دیکھنے کے مُوڈ میں تھے۔ کچھ نے چچا کو شہ دی۔ تلن بخش تو تلا بیٹھا ہی تھا، تہبند اونچا کر کے سامنے آگیا۔ چچا کو بھی لوگوں نے کھڑا کر دیا۔ بازار اچھا خاصا اکھاڑا بن گیا ــــ چچا نے تلن کو دے پٹکا لوگوں نے روپئے اٹھالئے اور بازار میں مٹھائی تقسیم ہونے لگی۔

تلن بخش کو ہار جانے کا کوئی غم نہ تھا، غم تھا تو دس روپوں کے چلے جانے کا۔ اور دس روپئے اُس زمانے میں بہت ہوتے تھے۔ دوسرے دن حاضر ہوا اور کہنے لگا، "اُستاد اب تو میرے روپئے دے دیجئے۔" استاد نے کہا: "روپئے اب کہاں؟ وہ تو لوگ مٹھائی کھا گئے۔" لیکن لوگوں نے سفارش کی تو روپئے تو خیر لوٹے ہی، مزید مٹھائی اور تقسیم کرنی پڑی۔ اور ہارنا جیتنا تو ایک بہانہ تھا۔ سچ بات یہ ہے کہ انہیں کھانے اور کھلانے میں بڑا لطف آتا تھا۔ اِتنا کھاتے تھے جتنا بڑا پیٹ تھا۔ خاصا بڑا گھر تھا جہاں کہاں کہاں سے لوگ آکر بس گئے تھے۔ کوئی سالا تھا، اور نہیں سالا تھا تو سالا تھا، کھانے والوں کی دنیا میں کیا کمی ہے۔ کوئی بھتیجا تھا، کوئی داماد تھا کوئی حوالی تھا، کوئی اپنا رشتہ دار تھا۔ کوئی بیگم کا رشتہ دار تھا اور بیگم کے رشتہ داروں کی تو وہ ریل پیل رہتی تھی کہ سارا گھر ہوٹل بنا رہتا تھا۔ کہتے تھے کہ پُردل پُور (بیگم کا میکہ) والوں نے ایک پودا لگایا تھا اب وہ درخت بن گیا ہے۔ لوگ پھل کھانے چلے آتے ہیں۔ بیگم بُرا مانتی تھیں، لوگ بُرا مانتے تھے، لیکن اُن کے کہنے کا کوئی بُرا مانتا نہیں تھا بلکہ سب جُڑ کے تُوں جمع رہتے۔ چچا جو کچھ خود کھاتے، دوسروں کو کھلاتے، گوشت کی ایک ایک بوٹی، پھلوں کا ایک ایک دانہ منتخب کرتے بااصرار کر کے کھلاتے، خود تعریف کرتے اور چاہتے تھے کہ دوسرے بھی اُنہی کی پسند کی تعریف کریں۔ ایسا لگتا تھا کھانے کی حسرت پُوری نہیں ہوتی تو اُسے دوسروں کو کھلا کر پُورا کرنا چاہتے ہیں۔

چچا کے مرتے ہی وہ سب لوگ رُخصت ہو گئے۔ خدا کا شکر ہے اُن شاعر بھتیٔ

سب کا کل میں نے اپنے تجربے سے پُشتی کر دی ہے۔

چچا نے شادیاں تو تین کی تھیں، لیکن اولاد صرف تیسری بیگم سے ہوئی اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اولاد کا نمبر بھی تین سے آگے نہیں بڑھا ــــ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا تو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تیسری کو میری محبت اور رفاقت نے گوارا نہ کیا کہ اسے خدا کو سونپ دیا جائے۔

اپنی بیگم سے چچا کو بڑی محبت تھی۔ وہ کبھی بیمار ہو جائیں تو اپنا سب کچھ بھول کر اُن کی تیمارداری میں لگ جاتے۔ ڈاکٹر کو خود بُلا کر لاتے، اپنے ہاتھ سے اُنہیں دوا پلاتے اور اِس طرح ان کی خدمت کرتے جیسے دنیا میں اُنہیں اور کوئی کام نہ ہو۔ لیکن اسقدر محبت ہوتے ہوئے بھی کوئی دن نہ جاتا تھا، جب چچا اور بیگم میں لڑائی نہ ہوتی ہو۔ صبح ہوتے ہی، یا دن کے کسی حصہ میں بیگم کے کسی رشتہ دار پر کوئی فقرہ چُست کرتے جسے سُنتے ہی بیگم کا پارہ چڑھ جاتا، یا خدانخواستہ اُنہوں نے ضبط بھی کیا، تو پھر دوسری چنگاری چھوڑ دی، بس پھر کیا تھا جنگ چھڑ جاتی، جس میں پُوری سنجیدگی سے حصہ لیتے۔ ظاہر ہے روز کی اِس تُو تُو مَیں مَیں سے لوگوں کو کوفت ہوتی تھی ــــ ایک دن میں نے دبی زبان سے دخل در معقولات کی تو جو کچھ چچا نے جواب دیا اس کا مطلب تھا ــــ میاں، اصل مقصد ہمارا لڑنا لڑانا نہیں ہے۔ لڑنے سے تجدیدِ محبّت ہوتی رہتی ہے۔ اگر لڑائی نہ ہو تو محبّت فنا ہو جائے۔

لُطف کی بات یہ ہے کہ اُنہی رشتہ داروں کے طفیلی پن پر کوئی اعتراض کرتا تو کہتے میرا کیا لیتے ہیں، اپنے مقدر کا کھاتے ہیں۔ اور اِس پر اُنہیں کامل یقین تھا۔ اُن کی حیات میں تعمیر کا سلسلہ کبھی بند نہیں ہوا۔ ہر دوسرے تیسرے دن مستریوں اور مزدوروں کے لئے گھر سے کھانے جاتے، اُنہیں کھلاتے اور لذّت حاصل کرتے۔ بیگم پُلانے پلانے جانے پر معترض ہوتیں تو پھر تجدیدِ محبت ہونے لگتی۔ میرا مطلب ہے جنگ چھڑ جاتی۔ جنگ ختم ہوتی تو پھر سامانِ رسد باہر پہنچنے لگتا۔

زندہ دلی اور لڑکپن ساری عمر اُن کے مزاج سے نہیں گیا۔ بڑھاپے میں بھی جینے کی اُمنگ اور زندگی سے حظ اُٹھانے کا حوصلہ نوجوانوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھا۔ بہت سے پُرانے مقولے اور شعر اور خصوصاً ایسے شعر اُنہیں ازبر تھے جن سے زندگی پھوٹی پڑتی

ہو۔ اور جنہیں اکثر لوگ خوشی کے لمحات میں گنگنایا کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے لیے کونسا لمحہ خوشی کا لمحہ نہیں تھا۔ شعر گنگنانے کے وہ قائل نہیں تھے۔ خوب بلند آواز سے شعر پڑھتے۔ جس میں تحت اللفظ بھی ہوتا اور ترنم بھی، بھرپور قہقہہ لگاتے اور پھر خود ہی داد دیتے۔ کیا خوب کہہ گیا ہے۔ ؏ "کام آتی ہے عاشق کے بہت رات اندھیری"

اور عاشق تو وہ تمام عمر رہے۔ عورت جوان ہو، ادھیڑ عمر کی ہو، فاحشہ ہو، بازاری ہو ہر ایک سے یکساں لذت اندوز ہوتے، گھل مل کر اُن سے باتیں کرتے، اُس کا دکھ درد پوچھتے، کوئی اُنکے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا، کیا کہے گا، اِس کی اُنہیں فکر نہیں تھی۔ اُن کی اِس محبت اور رفاقت میں جنسی ناآسودگی صاف نظر آتی تھی۔ میں تو اسے جنسی ناآسودگی ہی کہونگا، اگر آپ چاہیں تو اُسے اُن کی زندہ دلی اور خوش طبعی سمجھ لیجئے۔ خود ہنسنا، دوسروں کو ہنسانا، زندگی کی حرارت سے بھرپور قہقہہ لگانا اُن کے اخلاقی فرائض میں داخل تھا۔ اور بعض دفعہ اِس سلسلہ میں ایسی حرکات اُن سے سرزد ہوتی تھیں کہ لوگ لحاظاً بھلے اُن سے کچھ نہ کہیں، دل میں ضرور اُن سے ناراض ہوتے ہونگے۔

ایک دن کا ذکر ہے، حسبِ معمول گودام کے دروازے میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھے تھے کہ ایک عورت کا اُدھر سے گذر ہوا، معمولی نقش و نگار کی عورت تھی، نہ جوان نہ بوڑھی۔ عورت کی جیسے ہی نظر اُن پر پڑی، اُنہوں نے ایک روپیہ اُسے دکھا دیا۔ روپیہ دیکھتے ہی عورت کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ کھڑے ہوکر اُنہیں گالیاں سنانے لگی۔ گالیاں سُن کر دو چار لوگ اکٹھے ہوگئے اور کھٹی کھٹی نظروں سے چچا کو دیکھنے لگے۔ چچا عمر کی اُس منزل میں تھے جب انسان کا زہر زائل ہو جاتا ہے۔ خاموشی سے اُس کی گالیاں سُنتے رہے جیسے وہ خود اُس کے مخاطب نہ ہوں۔ حاضرین میں سے جب ایک صاحب نے اُنہیں ٹوکا تو بڑے زور سے قہقہہ لگایا اور بولے ـــــ بزرگوں سے سُنا تھا، زیادہ روپیہ کم روپیہ کو کھینچ لیتا ہے۔ میں نے اندازہ کرنے کے لئے کہ اِس کی جیب میں کتنا روپیہ ہے، ایک روپیہ اِسے دکھایا تھا کہ زیادہ روپے ہونگے تو میرا روپیہ کھنچ جائے گا۔ ورنہ اُس کی ریزگاری میری طرف آجائے گی۔ معلوم ہوا بزرگوں کا مقولہ غلط ہے۔ لیکن بڑی دیر کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ بزرگوں کی بات غلط نہیں ہوتی۔ ہو نہ ہو اِس شاعرہ بھی

کی جیب خالی ہے۔ لطیفہ سُنتے ہی لوگوں کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔ لیکن عورت کا غصہ تب بھی فرو نہیں ہوا۔ اور وہ برابر گالیاں دیتی رہی۔ تو چچا کو بھی جیسے غصہ آگیا۔ کہنے لگے، عجیب عورت ہو، میں نے تمہیں گالیاں دی ہیں جو مجھے گالیاں دیئے چلی جاتی ہو میں نے تمہیں ایک روپیہ دکھایا ہے، تم مجھے دو روپیہ دکھا دو۔ گالیاں دینے کی کیا تک ہے۔ لوگ ہنستے رہے، چچا ہنستے رہے اور وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ غنیمت ہے وہ زمانہ اور تھا، آج کا زمانہ ہوتا تو اسی بات پر ہندو مسلم فساد ہو جاتا۔

چچا مسلمان تھے، اس لئے کہ اُن کی پیدائش ایک مسلم گھرانے میں ہوئی تھی۔ اگر وہ کسی ہندو خاندان میں پیدا ہوتے تو بھی میرا خیال ہے اُن کی روش کچھ زیادہ مختلف نہ ہوتی۔ میرے خیال سے اُن کے مذہب کو اُن کی تجارت نے متعین کیا تھا۔ کچھ اخلاقی اصول تھے جنہیں وہ تجارت میں اور اپنی روزمرہ زندگی میں پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے۔ دیانت داری یا لین دین کے کھرے پن کو وہ نہ صرف ایک تاجر کی بلکہ عام انسان کے ایمان کی کسوٹی سمجھتے تھے۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی نمازی ہو، روزہ دار ہو، پرہیزگار ہو، اگر اُن کے اِس معیار پر پورا نہ اترتا تھا تو وہ اُس کی عبادت کو محض نمائش یا فریبکاری پر محمول سمجھتے تھے۔ انسان ہمدردی یا دوسروں کی دل آسائی اُن کے نزدیک اصل عبادت تھی روزہ نماز کے وہ پابند نہیں تھے۔ کبھی کبھی روزہ رکھ لیا کرتے تھے۔ البتہ عید، بقرعید کی نماز پڑھنے ضرور جاتے تھے۔ عید کی صبح ہوتے ہی خوب مل مل کر نہاتے۔ نئے کپڑے پہنتے، عطر لگاتے، بچوں کو ساتھ لے کر نماز پڑھنے کے لئے چل دیتے۔ اُس دن اُن کی خوشی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ عیدگاہ جاتے ہوئے سب کو خوش دیکھ کر اُن کے دل کی کلی کھل جاتی تھی۔ اُن کا جی چاہتا کہ روز اِسی طرح عید ہوتی رہے، اور روز اِسی طرح ہنستے مسکراتے، شاداب چہرے نظر آتے رہیں۔ اِسی طرح بقرعید کو بھی خوش و خرّم ہوکر پڑھنے جاتے تھے۔ البتہ قربانی اُنہوں نے کبھی نہیں کی۔ ایک بار اُن کی بیگم نے ضد کر کے ایک بکرا خرید لیا تو اُسے ذبح کرتے وقت عین عید کے دن اِس بات پر جھگڑا ہو گیا کہ بیگم کہتی تھیں تم اپنے ہاتھ سے اِس پر چھری پھیرو۔ اور چچا کہتے تھے کہ میں یہ عذاب اپنی گردن پر کیوں لوں۔ یہ الٹا ثواب تمہیں کو مبارک رہے۔ آخر بکرا کو بیچا گیا اور اِس کے پیسے کسی حاجت مند کو دے کر ثواب سیدھا کیا

گیا۔

چچا کے دوست زیادہ تر پکّے قسم کے تھے۔ سوائے مولوی چراغ دین سیالکوٹی کے۔ مولوی صاحب چمڑیوں کا بیوپار کرتے تھے۔ اور مال خریدنے سال میں دو بار ضرور آیا کرتے تھے۔ جب بھی فیروز آباد آتے چچا کے ساتھ ٹھہرتے۔ اور اُن کا قیام مہینہ سوا مہینے سے کم کبھی نہیں ہوتا تھا۔ اُن کے آنے پر چچا بھی اپنی چارپائی گھر سے کارخانے اُٹھوا لیا کرتے تھے۔ رات رات بھر خوش گپیاں ہوتی رہتیں۔ مولوی مُتقّع اور چچا ہنسوڑ، اُن دونوں کی دوستی دیکھنے اور گفتگو سُننے سے تعلق رکھتی تھی۔ دونوں خوش خوراکی کے مریض تھے۔ مولوی کو مُرغ مُسلّم اور بریانی پکانے کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ چچا کا دن مولوی صاحب کا مال تیار کرانے اور مولوی کا دن کھانا پکانے کے سلسلہ میں نت نئے تجربے کرنے میں گُزرتا۔ شام ہوتی تو سُخن آرائی کی محفل جمتی، تجارت اور مذہب سے لیکر گھر گرہستی تک کوئی موضوع ایسا نہ تھا، جس پر آزادانہ گفتگو نہ ہوتی ہو۔ کبھی کبھی مولوی صاحب اپنی پر آجاتے۔ کہتے، بھئی نادر بخش نماز تو ضرور پڑھ لیا کرو اور چچا کہتے اگلی دفعہ آپ آئیں گے تو انشاء اللہ ہم کو نمازی پائیں گے۔ حالانکہ یہ اگلی دفعہ اُن دونوں کی زندگی میں کبھی نہیں آئی۔ کبھی کہتے مولی صاحب (مولوی صاحب نہیں) ابھی تو ہاتھ پیر چلتے ہیں۔ مطلب یہ تھا جب کسی کام کے نہیں رہیں، بالکل نکمّے ہو جائیں گے تو نماز پڑھنے پر اتر آئیں گے۔ مولوی صاحب کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کی اصل وجہ یہ تھی کہ اُنہوں نے نماز ترک کر دی ہے۔ اور چچا کے نزدیک اصل وجہ نماز ہی تھی جس کے علاوہ اُنہوں نے اور سب کچھ ترک کر دیا ہے۔ مولوی صاحب کے مزاج کی خوبی یہ تھی کہ چچا کیسی ہی کُفر انگیز باتیں کیوں نہ کریں، اُنہیں کبھی غصّہ نہیں آتا تھا۔ چچا کے خیالات سے وہ واقف تھے۔ اور کب تک واقف نہ ہوتے، ایک زندگی کا ساتھ تھا۔ کبھی وہ چچا کو چھیڑتے اور کبھی چچا اُن کو اور پھر دونوں مل کر قہقہہ لگاتے۔ چچا کہتے مولی صاحب اس تصنّع کی زندگی سے خود تم کو بھی تکلیف ہوتی ہوگی۔ مولوی صاحب فرماتے ارے بھئی، تم تو نرے جاہل ہو، اور چچا کہتے، مولی صاحب یہ نہ بھولئے وہ پہلا شخص جس نے علم ایجاد کیا، جاہل ہی تو تھا ــــ اور جیسے کوئی نئی دریافت ہوئی ہو، مولوی صاحب کے لئے اور چچا کے لئے بھی، دونوں ایک دوسرے کو مسرّت بھری نظروں سے دیکھتے اور خوش ہوتے۔

ایک دفعہ مولوی صاحب کو رمضان کا مہینہ فیروز آباد میں گُزارنا پڑا۔ مولوی صاحب اعتکاف میں جا بیٹھے۔ معمولات میں فرق آجانے سے چچا کو بڑی تکلیف ہوئی۔ بار بار اُن کے پاس جاتے اُن کو مراقبہ میں دیکھ کر کبھی چُپ چاپ واپس چلے آتے، کبھی اُن کو آواز دینے لگتے ــــ ایک دن مولوی صاحب کو غصّہ آگیا۔ کہنے لگے، جب میں یکسوئی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں تم مجھے آواز دینے لگتے ہو، عجیب آدمی ہو۔ ناک میں دم کر دیا ہے۔ چچا نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور کہا،

"مولی صاحب، میں تم کو صرف دو تین بار پُکارتا ہوں تو تم پریشان ہو جاتے ہو، اور جو تم ہر دم "اللہ اللہ" پکارتے ہو، وہ کتنا پریشان ہوتا ہوگا؟"

ہزاروں رحمتیں ہوں چچا محترم پر، جن کی نگاہِ کرم نے مجھے کمیونسٹ ہونے سے بچا لیا۔ یوں بھی ایک کمیونسٹ اور مُسلمان میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا ــــ ایک کے پلّے میں صرف خدا اور رسول ہوتے ہیں، اور دوسرے کے پلّے میں وہ بھی نہیں ہوتے۔

شاہد بھٹی

(بقیہ ڈرامہ "محبّت کا مطلب" صفحہ ۴۳)

قیصر۔ محبت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم میری خاطر اپنی جان دے دو۔ محبّت کا یہ مطلب نہیں کہ تم دُلہن کے رُوپ میں گھر سے بھاگ آؤ اور اپنے والدین کو بدنام کرو...... وحیدہ.... یہ تم نے کیا کیا ــــ تم نے اچھا نہیں کیا وحیدہ...... تم نے اچھا نہیں کیا......

پردہ گرتا ہے۔

ل۔م۔ شاہد

(ڈرامہ)

محبت کا مطلب

کردار

قیصر	ایک بیمار گیت کار
عفت	ایک شادی شدہ ادب نواز عورت
وحیدہ	قیصر کی محبوبہ
قمر	وحیدہ کا چھوٹا بھائی، عمر بارہ سال

ایک چھوٹا سا کمرہ، ایک دروازہ باہر کی طرف کھلتا ہے اور دوسرا اندر کی طرف۔ دریچہ ایک ہی ہے جو باغ کی طرف کھلتا ہے۔ دریچہ کے پاس ایک میز رکھی ہے۔ میز پر دوا کی شیشیاں ہیں۔ اور چند کاغذات بکھرے ہوئے ہیں۔ ذرا ہٹ کر ایک چارپائی بچھی ہوئی ہے۔ چارپائی کے نیچے ایک صندوق پڑا ہوا ہے۔ دیواروں پر مشہور شاعروں کی تصویریں آویزاں ہیں۔

قیصر ایک عرصہ سے کھانسی کے مرض میں مبتلا ہے، پردہ اُٹھتا ہے۔ قیصر چارپائی پر لیٹا ہوا نئے گیت کے بول یاد کر رہا ہے۔ عفت کمرے میں داخل ہوتی ہے۔

قیصر۔ عفت ذرا میز سے سگریٹ کا پیکٹ اُٹھا دو۔

عفت۔ سگریٹ پینے سے کھانسی بڑھ جائے گی۔

قیصر۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ سگریٹ نہ پیوں، مگر عادت جو ہے۔ اگر سگریٹ نہ پیوں تو اور بھی کھانسی بڑھ جائے۔ کبھی کبھی پینے میں کوئی حرج نہیں ہے عفت!

عفت سگریٹ کا پیکٹ قیصر کی طرف بڑھا دیتی ہے۔

قیصر سگریٹ نکال کر سُلگاتا ہے۔

قیصر۔ تم میکے سے کب آئیں؟

عفت۔ آج ہی آئی ہوں۔ خبر ملی کہ تمہاری طبیعت بہت خراب ہوگئی ہے اِس لئے چلی آئی۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ تم جلد اچھے ہو جاؤ گے مگر سگریٹ پینا ضرور کم کر دو۔ تم ایک گیت کار ہو۔ لوگ تمہارے گیتوں کی قدر کرتے ہیں۔ کل ہی رسالہ "نشیمن" میں ایک قاری کا خط چھپا ہے۔ اُس خط میں لکھا ہے کہ کیا بات ہے اِن دنوں قیصر کے گیت آپ کے رسالے میں نہیں آ رہے ہیں؟ تم کتنے مقبول ہو — کتنے مشہور ہو؟ مجھے یاد ہے وہ دن، جب میں تم سے پہلی بار نیرا کافی ہاؤس میں ملی تھی۔ تم سے مل کر میں جھوم اُٹھی تھی۔ پہلی ہی مُلاقات میں تم مجھ سے بے تکلف ہو گئے تھے۔ میں تمہیں اپنے بنگلے پر لے آئی تھی۔ اُس دن، رات کا کھانا تم نے میرے ساتھ کھایا تھا۔ اِس کے بعد تم شملہ چلے گئے۔ تمہارے جانے کے بعد میری زندگی اُداس ہو گئی۔ اِتنی اُداس کہ مجھے اُس سے ڈر لگنے لگا تھا۔ وحشت سی ہونے لگی تھی۔ جب تمہارا کوئی گیت کسی رسالے میں شائع ہوتا تو اُس گیت کو کئی روز تک گنگناتی رہتی۔ پھر بھی اُداسی دُور نہ ہوتی۔ اور ایک دن جب یہ خبر آئی کہ تم اِسی شہر میں آ رہے ہو تو اُداسی کھو گئی۔ اب تلاش کرتی ہوں تو ملتی نہیں —

(جذباتی لہجے میں)

تم ایک بڑے فنکار ہو۔ میں تمہاری قدر کرتی ہوں۔ میں تمہیں چاہتی ہوں، حالانکہ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں، پھر بھی میرے دل میں اندھیرا نہیں ہے۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم زندہ رہو۔ گیت لکھتے رہو۔ تمہارے گیتوں نے

عوام کو حوصلے دئے ہیں، پیار دیا ہے، روشنی دی ہے۔

قیصر۔ تمہیں میرے گیت پسند ہیں۔ عوام کو میرے گیت پسند ہیں۔ تم میری قدر کرتی ہو، یہ میں جانتا ہوں ۔۔ عفت تمہاری ہمدردیاں بھی یاد رہیں گی۔ تم نے ہمیشہ میرا خیال رکھا ہے۔ ڈاکٹر بھجوایا ۔۔ دوا کی فیس بھجوائی۔ پھل بھی بھجواتی ہو۔ تم ایک امیر گھرانے کی لڑکی ہو اور میں ایک مفلس گیت کار۔ میں بھی تمہاری عزت کرتا ہوں عفت۔ اور میں چاہتا ہوں کہ تم میری خاطر شک و شبہ کی نظر سے نہ دیکھی جاؤ۔ یہ سماج بہت ظالم ہے عفت! یہ سماج ہمیشہ غلط کاریوں کا عادی ہے۔ یہ ہمیشہ غلط سوچتا ہے۔ تمہیں میرے فن کے حسن سے محبت ہے مگر سماج کی نظر میں یہ محبت محبت نہیں ہے۔ (کھانستا ہے)

عفت۔ زیادہ باتیں نہ کرو، ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔

قیصر۔ عفت جب تم آتی ہو تو میرے ذہن میں ایک گیت ابھرتا ہے، اور جب چلی جاتی ہو تو گیت مر جاتا ہے۔

عفت۔ وحیدہ آتی ہے یا نہیں ۔۔؟

قیصر۔ آتی ہے، مگر وہ کیا کر سکتی ہے، وہ خدا تو نہیں۔ ایک دن وہ اپنے دادا جان کو لے کر آئی تھی۔ اُس کے دادا جان ایک حکیم ہیں، مگر اُن کے علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔

قیصر بُری طرح کھانسنے لگتا ہے۔ عفت اُٹھ کر تھام لیتی ہے۔

عفت۔ تم بے حد کمزور ہو گئے ہو قیصر۔ تم میرے ساتھ چلو۔ میں تمہارا کسی بڑے ڈاکٹر سے علاج کراؤں گی۔ دیکھتی ہوں تم کیسے اچھے نہیں ہوتے۔

قیصر۔ (مسکرا کر) کتنی بھولی ہو تم۔ تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ تم ایک شادی شدہ عورت ہو، تم اِس طرح میری خدمت کرو گی تو سماج کیا کہے گا۔ کیا سماج یہ سب کچھ دیکھ کر چُپ رہ سکے گا کیا تم بدنام نہ ہو جاؤ گی۔ اور میں تمہیں کبھی بدنام ہونے نہ دوں گا مجھے اسی حال پر چھوڑ دو عفت!

عفت۔ اگر تم اِسی حال پر رہے تو ایک دن دُنیا تم سے اور تمہارے فن سے محروم ہو جائے گی۔

قیصر۔ (جذباتی لہجے میں) نہیں ۔۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں شاعر بھی

زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے زندگی سے پیار ہے۔ یہ دُنیا بڑی خوبصورت ہے۔ جب سورج پُورب سے نکلتا ہے اور جب اس کی کرنیں درختوں پر ناچنے لگتی ہیں، جب برسات میں آکاش بادلوں سے ڈھک جاتا ہے اور جب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگتی ہیں اور جب ہلکی ہلکی بارش شروع ہو جاتی ہے تو جینے کو جی چاہتا ہے۔

عفت۔ (تسلی آمیز لہجے میں) تم ضرور زندہ رہو گے۔ تمہیں ہوا کیا ہے، یہی نا کہ کھانسی ہے۔ گھبراؤ نہیں یہ کھانسی خود بخود مر جائیگی تم اچھے ہو جاؤ گے ۔۔ تم زیادہ نہ سوچا کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں قیصر!

قیصر۔ حوصلہ افزائی کا شکریہ ۔۔ عفت میں تو یہ کہنا بھول ہی گیا ۔۔ آج وحیدہ کی شادی ہے۔ شام کو شہنائیاں بجیں گی آج وہ دُلہن بنے گی۔

اتنے میں قمر آتا ہے۔

قمر۔ آپ کو دعوتی کارڈ دے چکا ہوں۔ مگر آپا نے پھر بھیجا ہے کہ میں آپ کو یاد دلا دوں، آپ شادی میں ضرور شرکت کیجئے گا۔ میں یہی کہنے آیا ہوں۔ اِس وقت شام کے چھ بجے ہیں سات بجے بارات آجائے گی۔

عفت کمرے کی بتی جلا دیتی ہے۔ قیصر کھانسنے لگتا ہے، کھانستے کھانستے قے آتی ہے اور گرم گرم خون جا رہا پیپ میں جاتا ہے،

عفت۔ (چیخ کر) قیصر......!

قیصر قمر کی طرف دیکھتا ہے۔

قیصر۔ شادی مبارک ہو ۔۔ مگر میں شرکت نہیں کر سکوں گا۔ کاش میں وحیدہ کی اِس آخری خواہش کو پُورا کر سکتا۔ وحیدہ میرے ساتھ ایک دوست کی حیثیت سے رہنا چاہتی تھی۔ مگر ہندوستان کی ایک جوان عورت کسی جوان مرد کے ساتھ ماں بن کر، بہن بن کر یا بیوی بن کر رہ سکتی ہے، دوست بن کر نہیں۔ اور ایک ہندوستانی لڑکی میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے شادی کرے۔ آج وحیدہ کی شادی بھی اُس کی مرضی کے خلاف ہو رہی ہے اور وہ چُپ ہے۔ وہ ایک ہندوستانی لڑکی ہے ایک ہندوستانی لڑکی گونگی ہوتی ہے۔

قمر جاتا ہے۔

قیصر۔ تم تو رو رہی عفت!

اتنے میں شہنائیوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ سات بجنے میں چند منٹ باقی ہیں۔

قیصر۔ (طنزیہ لہجے میں) خون دیکھ کر تم رونے لگیں ـــــ میں مروں گا نہیں عفت! مجھے زندگی سے پیار ہے۔ یہ دنیا بڑی خوب صورت ہے ـــ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔۔۔۔ عفت ۔۔۔۔ مت رو عفت ۔۔۔۔۔ میں مروں گا نہیں ۔۔۔۔ اگر میں مر بھی جاؤں تو کیا ہوا۔ میرے گیت تو زندہ رہیں گے۔

عفت۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) نہیں ـــ ایسا نہ کہو ـــ ایسا نہ کہو ۔۔۔۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔

اتنے میں وحیدہ دروازے کے پاس آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ وحیدہ شادی کے لال جوڑے میں ملبوس ہے۔ ریشمی کپڑوں سے عطر کی خوشبو آرہی ہے۔ ہاتھوں میں مہندی لگی ہے ـــ قیصر وحیدہ کی طرف حیرانی سے دیکھتا ہے۔

قیصر۔ تم ۔۔۔۔ تم کیوں آئی ہو ۔۔۔۔ شاید اس لئے آئی ہو کہ میں تمہیں دُلہن کے رُوپ میں دیکھ کر چیخ پڑوں ـ اپنی ناکامی پر آنسو بہاؤں ـــ روؤں ۔۔۔۔۔۔

وحیدہ کچھ نہیں کہتی ہے۔ اُس کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑتا جا رہا ہے۔

قیصر۔ (سخت لہجے میں) میں پوچھتا ہوں تم کیوں آئی ہو ـــ آج تمہاری شادی ہے۔ شہنائیاں بج رہی ہیں۔

وحیدہ۔ میں ایک ہندوستانی عورت ہوں۔

قیصر۔ ہاں ایک ہندوستانی عورت بے بس ہوتی ہے اور تم شاید اپنی جرأت کا ثبوت دینے آئی ہو۔

وحیدہ۔ محبت کا ثبوت دینے آئی ہوں۔ میں نے آپ سے محبت کی ہے میں نے زہر کھا لیا ہے ـــــ میں ۔۔۔۔ آپ کے قدموں میں جان دینے آئی ہوں ـــــ

وحیدہ لڑکھڑا کر گر جاتی ہے۔ عفت بڑھ کر وحیدہ کو سنبھال لیتی ہے۔ قیصر وحیدہ پر جھک جاتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۶۹ پر دیکھیے)

شاعر بمبئی

نجم آفندی

میرے لہو سے میرا چمن لالہ زار ہے
کیا اس سے بڑھ کے اور دلیل بہار ہے

ہم اعتبارِ وقت کی حد سے گذر چکے
اب وہ ہیں' اُنکا وقت ہے اور اعتبار ہے

حیراں ہوں عرضِ شعلہ و پروانہ دیکھکر
یہ کسکے اہتمام سے تقسیمِ کار ہے

بس اے ہجومِ یاس بغاوت پہ تُل نہ جائے
بگڑا ہوا سہی دلِ اُمّید وار ہے

یارب حسین پھولوں کی مہچوں کی خیر ہو
سنتے ہیں باغباں کو غرورِ بہار ہے

قسمت کی الجھنوں سے کئے جا مقابلہ
اے دوست ایک بھی جو گریباں میں تار ہے

یہ سوچتے ہیں عیش جنہیں راس آگیا
باقی خدا کے بندوں کو غم سازگار ہے

میں فرشِ میکدہ پہ بھی ہوں مثلِ برگِ گُل
واعظ غریب مسند و منبر پہ بار ہے

ہنستے ہیں کیا وہ میرے غمِ انتظار پر
دُنیا تمام سلسلۂ انتظار ہے

کیا حال ہوگا رقص جو کرنا پڑے نہیں
صدیوں سے جنکے سامنے رقصِ بہار ہے

کیا اُس کو فیضِ سرمدیِ عشق کی خبر
وہ حکمتِ بشر جو ابھی شیرخوار ہے

جب ہم نے ترجمانِ حقیقت بنا دیا
اُردو زباں کا نجم وہ دن یادگار ہے

ساز بمبئی

احسان دانش

پہلا سا وہ دل ہے نہ وہ پہلی سی نگاہیں
اب ہم اُنہیں چاہیں تو کس اُمّید پہ چاہیں

اِک وقت تھا وہ بھی کہ اُنہیں پاسِ وفا تھا
اَب صرف ہمیں فکر ہے کسطرح نباہیں

اُن کا یہ تخیّل کہ اُنہیں حق ہے ستم کا
اپنا یہ تصوّر کہ زباں دی ہے نہ باہیں

ہرچند ترے قُرب کا امکاں نہیں کوئی
پھر بھی تری صُورت کو ترستی ہیں نگاہیں

عِصیاں کا نہیں قصد مگر واہ رے فطرت
ہر عارضِ گلگوں پہ ٹھٹکتی ہیں نگاہیں

ہے سامنے وہ سانولی صورت ارے توبہ
سورج بھی پکارے تو اُٹھاؤں نہ نگاہیں

کس کوچے سے داخل ہوں کہ گمراہ ٹھہروں
ہر سمت سے آتی ہیں ترے شہر میں راہیں

ہم تم سے مِلے ہیں تو یہ معلوم ہُوا ہے
کسطرح بدلتی ہیں زمانے کی نگاہیں!

طرفہ بھنڈاروی

کلی کلی مُسکرا اُٹھیگی، گُلوں کو رنگِ بہار دُونگا
نسیم شانہ جو مجھکو دے گی چمن کے گیسو سنوار دُونگا

اندھیرے غم کے رہیں گے کبتک چھٹیگی کبتک نہ یہ سیاہی
دِلوں سے دُور اِضطراب ہوگا سکون دونگا قرار دُونگا

دماغ و دل مُتحد تو ہولیں، مُنافقت کی گرہ تو کھولیں
چمک اُٹھیگا ضمیرِ عالم طبیعتوں کو نکھار دُوں گا

ابھی مرے ذہن میں ہیں لاکھوں ترقیٔ رنگ و بُو کے خاکے
ہر ایک گوشہ چمن بنے گا لطیف نقش و نگار دُونگا

ابھی طلب میکشوں کی شایانِ شغلِ بادہ کشی کہاں ہے
ڈھلیگی جب تلخیوں میں حسرت تو ساغرِ زرنگار دُونگا

مرے چمن پر فسُردگی کی تہیں مُسلط نہ ہوسکیں گی
خزاں کی شامِ غُبارِ کش کو جمالِ صُبحِ بہار دُونگا

شکست خوردہ فضا میں رہنا ہے غیرتِ زیست کے منافی
ضرورتِ نُصرتِ وطن پر میں زندگی اپنی ہار دُونگا

وہ زندگی کیا کہ جسکے دامن پہ بے وفائی کا آنے دھبّہ
لگے گا جب کوئی داغ ایسا قبائے ہستی اُتار دُونگا

نہیں ہے کیا میرے پاس طرفہؔ خدا نے کیا کچھ نہیں دیا ہے
کریگا کوئی طلب جو مجھ سے شعور دُونگا شعار دُونگا

شاعر بمبئی

شفیق کوٹی

خود سے گلشن، نہ ہم قفس لیں گے
تم جہاں بھی بساؤ بس لیں گے

گنگناتے ہوئے سے یہ بھونرے
ہر رسیدہ کلی کا رس لیں گے

جو بھی موقع ملے غنیمت ہے
آؤ دو ہی گھڑی کو ہنس لیں گے

آپ کی بات ہر گھڑی ہوگی
آپ کا نام ہر نفس لیں گے

کل قدم لینگی اُن کے منزل بھی
آج اپنی کمر جو کس لیں گے

یاد رکھیں گلوں کے متوالے
انتقام اِن سے خار و خس لیں گے

باخبر رہنا دوستوں سے شفیقؔ
آستینوں کے سانپ ڈس لیں گے

مفتوں کوٹوی

ہر تبسم زیست سے مسرور و فروزاں گذرے
ہم خزاں سے بھی بہ عنوانِ بہاراں گذرے

کر گئے دیکھنے والوں کی نگاہوں سے چمن
ہم اداؤں سے یہ اربابِ بیاباں گذرے

اشکِ شوق کا بہر حال نہ احسان لیا
میری پلکوں کے قریں سے کئی داماں گذرے

کبھی موقع تو ملے معرکہ آرائی کا
منتظر ہے مری کشتی، کوئی طوفاں گذرے

پھر بھی ہوں داغ تو اے رحمتِ کونین! معاف
اپنی حد تک تو بچائے ہوئے داماں گذرے

اہلِ دانش کو رہا فخر جنوں پر جن کے،
جادۂ عشق سے کچھ ایسے بھی انساں گذرے

کبھی ہم رنج و مصیبت میں رہے خندہ بلب
کبھی ہم بزمِ مسرت سے پریشاں گذرے

گرچہ وقفِ غم و آلامِ جہاں تھے مفتوں
پھر بھی ہم جادۂ ہستی سے غزل خواں گذرے

شاعرِ عشق

رونق دکنی

وہ ان کی بات جو کہتے تو کوئی بات بھی تھی
ہجومِ شوقِ فراواں سے کچھ نجات بھی تھی

فریب کار ہی ہوتی تو صبر کر لیتے
مگر یہ عمرِ گریزاں کہ بے ثبات بھی تھی

کسی کو فکر تھی خاموشیوں میں نغموں کی
کسی کے ذہن میں تخلیقِ کائنات بھی تھی

نقاب اٹھا نہ سکے روئے انبساط سے ہم
کچھ اس میں سازشِ محرومیٔ حیات بھی تھی

وہ ایک ادا جسے دنیا نے کافرانہ کہا
وہی خدا کی قسم موجبِ نجات بھی تھی

یہ کیسی چاند کے رُخ پر ہے گردِ محرومی
فرازِ چرخ پہ تاروں کی جب برات بھی تھی

مسرتوں میں نہ تھا احتمالِ غم رونق
یہ یاد ہی نہ رہا اُن کے بعد رات بھی تھی

کفیل آزر

ہوگیا دل درد سے معمور، تیرے شہر میں
اب بدل جائیں گے سب دستور، تیرے شہر میں

خواہشوں پر خوفِ رسوائی کا پہرہ لگ گیا
ہر تمنّا ہوگئی مجبور، تیرے شہر میں

جیسے سب کو آنسوؤں کی بے زبانی راس ہو
ایک بھی چہرہ نہیں مسرور، تیرے شہر میں

جس نے لب کھولے اُسے زنجیر پہنا دی گئی
اور یہ ہے روز کا دستور، تیرے شہر میں

بجھ گئے جب سے ترے شاعر کی پلکوں پر چراغ
ہوگئی ہر انجمن بے نور، تیرے شہر میں

سر اٹھائے پھر رہے ہیں آج کل تیری طرح
ہوگئے ہیں سانپ بھی مغرور، تیرے شہر میں

میرے زخموں کے مسیحا تیری عظمت کی قسم
رِس رہے ہیں اور بھی ناسور، تیرے شہر میں

میں تجھے دیکھوں، تجھے چاہوں، تجھے اپنا کہوں
یہ کسی کو بھی نہیں منظور، تیرے شہر میں

میرا جی چاہے کہ میں رو لوں تو رو سکتا نہیں
ہوگیا ہوں کس قدر مجبور، تیرے شہر میں

ایک آوارہ مرا ہے رات آذر نام کا
دور اپنے گھر سے کوسوں دور، تیرے شہر میں

ندرت کانپوری

اے رندِ بوالہوس، یہ تقاضا بھی چھوڑ دے
ساقی نہ ملتفت ہو تو پینا بھی چھوڑ دے

تو اور بزم دل سے اُٹھے برہمی کے ساتھ
جلتا ہوا چراغِ تمنّا بھی چھوڑ دے

نادان دل کو کون رفیقِ سفر کہے
امکان ہے کہ یہ مجھے تنہا بھی چھوڑ دے

یہ بھی انہیں گراں ہے تو اُن کی طرف نہ دیکھ
تھوڑی سی زندگی کا سہارا بھی چھوڑ دے

کیا کیا ستم ہوئے ہیں قفس میں، ابھی نہیں
گزری ہوئی بہار کا چرچا بھی چھوڑ دے

کیوں تلخ کر رہا ہے اسیروں کی زندگی
ظالم درِ قفس کو کبھی وا بھی چھوڑ دے

فرزانہ گلستاں میں رہے، وسعتوں کے ساتھ
دیوانہ، ایک گوشۂ صحرا بھی چھوڑ دے!

قیدِ تعیّنات سے سجدوں کو دور رکھ
ندرتؔ تلاشِ نقشِ کفِ پا بھی چھوڑ دے

مظہر علی خاں مظہر کوٹی

بہار آئی تو لوٹنے لگے تنکے نشیمن کے
فروغِ آشیاں دیکھوں کہ رنگِ گلستاں دیکھوں
خدا کے گھر کبھی تھے، اب تو ہیں جھگڑے کے گھر دونوں
کوئی اور آستاں دیر و حرم کے درمیاں دیکھوں
بھروسہ کیجئے تو دوست بن جاتا ہے دشمن بھی
بنا کر کیوں نہ بجلی کو چراغِ آشیاں دیکھوں
کہیں سے ہاتھ آ جائیں جو کچھ تنکے نشیمن کے
تماشا برق کا، رقصِ نگاہِ باغباں دیکھوں
مجھے دیوانگیٔ شوق پر اپنی بھروسہ ہے
نگاہِ یاس سے میں کیوں غبارِ کارواں دیکھوں

ساحل ٹونکی

وہ بے نقاب جو گلشن میں آ گئے ہوتے
چمن کی ساری بہاروں پہ چھا گئے ہوتے
اگر فریبِ خرد ہم نہ کھا گئے ہوتے
ترے قریبِ تبسم میں آ گئے ہوتے
ہزار چلمنیں جلوؤں پہ ڈال لی ہوتیں
مری نظر سے تو پردے اٹھا گئے ہوتے
بھٹک نہ جاتے اگر اپنے راستے سے ہم
تو آج سارے زمانے پہ چھا گئے ہوتے
نہ ہوتا ہم میں یہ احساسِ کمتری ساحل
اگر ہم اپنی حقیقت کو پا گئے ہوتے

ڈاکٹر سحر اعظمی

بلا سے ساقی نگاہ پھیرے کبھی تو پلٹے گا رُخ زمانہ
میں اپنے ساغر میں رفتہ رفتہ نچوڑ لوں گا شراب خانہ
فریبِ عقل و خرد کے ہاتھوں الٰہی پہونچا کہاں زمانہ
صداقتیں بن گئیں روایت، حقیقتیں بن گئیں فسانہ
مذاقِ سجدہ کی عظمتوں کو سمجھ سکیں گے نہ اہلِ دانش
جبیں جھکائی ہے جب بھی میں نے تو جھوم اُٹھا ہے آستانہ
مرا نشیمن جلانے والے! تجھے یہ شاید خبر نہیں ہے
دھواں اُڑائے گا ترے چمن میں، اگر جلا میرا آشیانہ
فسونِ تیغ و سناں کے بل پر نہ اُس کی تسخیر ہو سکے گی
وہ دل جو از راہِ خوش نصیبی تمہارے ناوک کا ہے نشانہ
سحر تجھے کون جانتا تھا مگر بہ فیضِ جنونِ اُلفت
لبِ حقیقت نواز پر ہے گلی گلی اب ترا فسانہ

مکتوبات

مفتوں کوٹوی (لاہرن بازار — کوٹہ، راجستھان)

"شاعر" کے پچھلے شمارہ میں میرے مضمون "قیس کوٹوی کا آہنگِ غزل" میں مندرجہ مصرع "وسیع اور حذ لِقاکر رہا ہوں" پر اعتراض کیا گیا ہے۔ جس سے 'ع' گرنے کے شک کا اظہار ہوتا ہے۔ 'الف'، 'ع' کا محافظ ہے۔ اور اس میں 'ع' گرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی تقطیع یوں ہوگی — وسی عو، رحدے، لِقاکر، رہا ہوں،
فعولن فعولن فعولن فعولن

اِس شمارے میں مندرجات قابلِ قدر ہیں — ظفر غوری کی غزل بہت پسند آئی۔ احمد رئیس کی نظم خوب ہے۔ خلیل تنویر کی نظم کے دوسرے بند میں شاید کاتب نے پہلا مصرع دوسرے کی جگہ اور دُوسرا پہلے کی جگہ لکھ دیا ہے۔

خاور بانکوٹی (عائشہ بائی چال، سلاٹر ہاؤس، بازار پیٹھ، رتناگری)

اِس بار مجھے سب سے زیادہ مسرت آپ کے "جرعات" پڑھ کر ہوئی۔ اِس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ میں بھی ایک ثانوی مدرّس ہوں۔ آپ نے سیکنڈری ٹیچرز ایسوسی ایشن کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے، وقت کا تقاضا ہے کہ اُس پر سوچا جائے اور عمل کیا جائے۔
شاکر مصطفٰی نے منٹو کے "پٹھانستان" کا تجزیہ ایک اچھوتے انداز میں کیا ہے۔ "ڈبل پنچ" سے متعلق تمنّا مظفر پوری کا مقالہ کافی معلومات افزا ہے۔ اِدھر نثر نگار شاد نے "سرخ حاشیے" کے بعد اپنے مضامینِ نثر کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اُس میں "ادبی انٹرویو" کیا تھا ساتھ "شانِ نزول" بھی ایک حسین اضافہ ہے۔ نظموں میں "اجنبی دوست"، "فن کار"، "بازیافت"، اور "مطالبہ" جدید رجحانات کی حامل ہیں۔ افسانوں میں ابھی صرف "تلاش" کو پڑھ سکا ہوں۔ البتہ غزلوں میں دل کو چھو جانے والے بہت سے اشعار ملے۔ خاص طور سے یہ شعر،

سر بکف یوں تو راہوں میں لاکھوں ملے، باریابی کی دل میں تمنا لئے	کون ہوتا ہے دیکھیں وہاں سُرخرو منزلِ دار تک آ کے اے دشمنو!	(ظفر غوری)
آ دِل بیٹھ کے زخموں کا مداوا سوچیں	تا بکے درد کا اظہار کریں گے یارو!	(شاہد کبیر)
حسرتِ سیرِ تماشائے جہاں کیا کیجیے	آنکھ جو دیکھ رہی ہے وہ تماشا ہے بہت	(ایم۔ نظمی)
دعوتِ عام جو دی تھی تجھے اے ساقی!	پہلے میخانے کو میخانہ بنایا ہوتا	(شارق میرٹھی)
میرے جنوں کی خاکِ پا سرمۂ دیدۂ خرد	مجھ سے نہ پُوچھ ہم نفس وقت کو میں نے کیا دیا	(عقیل شبلی)
اِک وہی جام ہوا باعثِ آغازِ سحر	دستِ ساقی سے چھلک کر جو گرا آخرِ شب	(راشد قریشی)
ممکن ہے شبِ تار اِسی طرح نکھر جائے	کچھ تم ہی فروزاں ہو غمِ دل کے شرارو!	(واحد بریلی)
جس زاویۂ لُطف سے تم دیکھ رہے تھے	وہ زاویہ تبدیل ہوا، ہم نے سُنا ہے	(سلام سنگری)
ہر نئے رُوپ میں تجھکو دیکھا	ہر نئی بات تیرا افسانہ	(سعد آفریدی)
تیرا احساسِ جفا چوٹ نہ کھائے تو کہوں	اب تری بات کا مشکل سے یقیں ہوتا ہے	(آزاد گلاٹی)

تمنّا مظفر پوری (محمد پور مبارک، پرشوتم پور، مظفر پور، بہار)

"شاعر" نوازی کا شکریہ —! اِس شمارے میں مقالات کا حصّہ وزنی اور اہم ہے۔ خاص طور سے راز چاند پوری صاحب کا "داستانے چند" اور شاکر صاحب کا "منٹو کے ایک افسانے کا تکنیکی تجزیہ"۔ شاکر صاحب نے "پٹھانستان" کا تجزیہ فنکارانہ کیا ہے۔ میرا مضمون "ڈبل پنچ" دہلی "صفحہ ۳۳

قطعہ آخری مصرع کا آخری شعر سے دیں مکرر بہ زبان وانند.... چھپ گیا ہے، حالانکہ ہونا اس طرح چاہیئے تھا:

دیں مکرر بہ زبان داند نداز رہ ہے دریغ　　　سید احمد خاں نمائندہ وائے بہر سال او

ظفر احمد صاحب کا ڈرامہ "ایک سوال" بہت پسند آیا۔

ضیاء حسنی (کاشانۂ سنجری، محلہ چھوٹی بازار، فتح پور، یو، پی)

مارچ کا "شاعر" ملا، اب کی آپنے اتنا خوب صورت پرچہ بھیجا کہ انتظار کی ساری اذیتیں ختم ہو گئیں اور ذوقِ مطالعہ کو صحیح معنوں میں سیری حاصل ہوئی۔ آپنے اداریئے میں صحیح لکھا ہے "اس وقت اردو زبان کی بقا کا انحصار صرف اس کی تعلیم پر ہے" فی الحقیقت بیمار "اُردو" کا یہی مرض ہے، جس کی طرف آپنے توجہ دلائی ہے۔ اور جس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔ خدا کرے آپ کی پر خلوص مساعی بار آور ہوں۔ زیرِ نظر شمارے کا انتخاب نثر و نظم لائقِ تحسین ہے۔ شاکر مصطفےٰ، راز چاند پوری، انجم جائسی کی تخلیقات پسند آئیں۔ "شانِ نزول" بھی خوب ہے، پڑھتے ہی زبان سے 'ہل من مزید' نکلا حامدی کاشمیری اور فیاض رفعت کی کہانیاں پسند آئیں۔ غزلیات کا حصہ کافی اچھا ہے۔

نور الہدیٰ (ہندوستان اسٹیل سنڈیکیٹ، سلطان گنج، پٹنہ)

مارچ کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ یہ بھی حسبِ معمول منفرد ہے۔

علامہ سیماب اکبرآبادی سے متعلق مضمون پڑھا۔ میرا خیال ہے کہ اُن کے شاگردوں کی جو وسیع دُنیا ہے، اُن کے شیدائیوں کا جو وسیع حلقہ آج بھی موجود ہے اُن کے تعاون سے اُن سے متعلق اردو ادب کو بہت کچھ مل سکتا ہے۔ تو پھر ایسا کیوں نہ ہو کہ ایسے لوگ اُن کے بارے میں لکھیں محترم و مکرم جناب علامہ تمنا عمادی صاحب سے بھی علامہ کے بارے میں اُن کے اپنے تاثرات لکھنے کی گذارش کی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اِس مناسب امر میں ضرور تعاون کریں گے۔

یہ مصطفےٰ صاحب کون ہیں۔؟ شاید پہلی بار شاعر میں، زیرِ نظر مضمون "منٹو کے ایک افسانے کا تکنیکی تجزیہ" فاضل مضمون نگار کی منٹو سے بجا عقیدتوں کا آئینہ دار ہے۔ 'ادبی چٹکلوں' کو مختصر افسانہ کی صف میں جائز طور پر لا کھڑا کرنے کی جرأت کرنی، اور قاری کو سو فیصدی CONVINCE کر دینا معمولی بات نہیں۔

صہبا وحید صاحب کی نظم "اجنبی دوست" مربوط، دِلکش اور آفاقی ہے کہانیاں بہت اچھی نہیں کہی جاسکتیں۔ حامدی کاشمیری صاحب کا مرکزِ خیال کرشن جی کی ایک کہانی سے متاثر ہے۔ جسے معلوم کہاں ابھی حال ہی میں پڑھ چکا ہوں۔ بڑی پیاری کہانی تھی وہ!

ظفر علوی صاحب کی غزل خصوصیت کے ساتھ قابلِ تعریف ہے۔ دیگر غزلوں کے مندرجۂ ذیل اشعار مجھے بہت پسند آئے:

یہ تری نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھیں اُٹھیں　　　وہ میخانہ کھلے جیسے ذرا آخرِ شب　　　(راہی قریشی)

دِل تم بھی لے چلو کہ خبر آج گرم ہے　　　خاور کسی حسین کو اِک ساز چاہیئے　　　(خاور مانکوئی)

جو سزا ہے وہی ہر بار ملے گی ہم کو　　　جو کیا ہے وہی ہر بار کریں گے یارو　　　(شاہد کبیر)

کتابت پر اِس بار توجہ کچھ کم ڈالی گئی ہے شاید ــــ

حبیب الرحمٰن راہی (پوسٹ سُکل، ضلع بالاگھاٹ، ایم، پی)

مارچ کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ افسانہ "جرنیل سنگھ" نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اب ہمارے ادب کو ایسے ہی فن پاروں کی ضرورت ہے۔ فیاض رفعت صاحب کے کردار بڑے پیارے اور مقدس ہیں۔ کاش! ہمارے بھارت میں ایسے ہی لوگ ہوتے ــــ غالب کے مجسمہ کی تصویر نے شاعر کی دلکشی کو دوبالا کر دیا ہے۔ اِس تصویر کو دیکھنے کے بعد اُس مجسمہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یعنی یہ مجسمہ کب بنایا گیا کہاں جگہ رکھا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

مقالات میں "منٹو کے ایک افسانے کا تکنیکی تجزیہ" کام کی چیز ہے، اس قسم کے اور بھی مضامین شائع کئے جائیں تو بہتر ہے۔

مہدیؔ پرتاب گڈھی (معرفت اگزیکیٹو انجینیئر، اِری گیشن ڈویژن، پرتاب گڈھ، یو، پی)

مارچ کا شمارہ اپنی صوری اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے معیاری قدروں کا حامل ہے۔ غزلوں کے باب نے خاص طور پر متاثر کیا۔ ظفرؔ احمد کا ڈرامہ "ایک سوال" بڑا جاندار ہے۔ "شاعر" کی جان اُس کے مقالے ہوتے ہیں۔ اِس بار نریش کمار شادؔ کے "سُرخ حاشیے" بعنوان "شانِ نزول" نے مقالات کے باب کو اور بھی زعفران زار بنا دیا۔ احمدؔ رئیس کی جدید طرز پر لکھی ہوئی نظم پسند آئی۔ حالانکہ میں طرزِ جدید کی نظمیں کم ہی پسند کرتا کرتا ہوں۔ مجموعی طور پر مارچ کا شمارہ بڑا وزنی ہے۔

عزیزؔ اندوری ("آشیانہ"۔ جُونا رسالا، گلی نمبر ۱، اندور)

اِس بار پانچوں مقالے منفرد شان رکھتے ہیں۔ "داستانِ چند" اور "زندہ ادب" بطورِ خاص پسند آئے۔ حصۂ نظم میں احمدؔ رئیس کی نظم "فنکار" مجھے بھائی۔ غزلوں کے بعض بعض اشعار تو "شاعر" کے معیار سے ہلکے ہیں۔ تعجب ہے آپ کی نظرِ انتخاب اِس بار اپنی سختی کو برقرار نہ رکھ سکی

اشرفؔ باغی ("آستانہ"، کلالی محلہ، اورنگ آباد، ضلع گیا)

ایک مدت سے "شاعر" کا ذکر اور اُس کی تعریف سُنتا آیا تھا۔ اِدھر کئی مہینے سے باضابطہ اور بالاستیعاب دیکھ بھی رہا ہوں۔ واقعی جیسا سُنا تھا ویسا ہی پایا۔

آپکے اداریئے واقعی اہم اور قابلِ قدر ہوتے ہیں۔ زیرِ نظر شمارہ (مارچ ۱۹۶۲ء) کا اداریہ بھی وقت کی ایک اہم ضرورت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سونے والوں کو جگانے کے لئے آپ ہی جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔

رسالہ "زفرق تا بہ قدم" دیکھ گیا ہوں۔ مقالے سبھی اچھے ہیں۔ مجھے شاکرؔ مصطفےٰ اور رازؔ چاندپوری کے مضامین خاص طور پر پسند آئے۔ نظمیں قریب قریب سبھی یکساں معیار کی اور اچھی ہیں۔ ہاں! غزلوں کا حصہ نظموں سے زیادہ دقیع ہے۔ ظفرؔ غوری، شاہدؔ کبیر، واحدؔ پریمی اور سلامؔ ساگری وغیرہم کی غزلیں فن اور فکر دونوں اعتبار سے حد درجہ کامیاب ہیں۔ افسانے تینوں دلچسپ اور معیاری ہیں۔ ظفرؔ احمد کا ڈرامہ کامیاب ہے

ادارہ

محفلِ اپنی۔۔۔!

زیرِ نظر شمارہ

"شاعر" کا یہ تازہ شمارہ نہایت منتخب تخلیقات پر مشتمل ہے۔ اِس نوبتے صفحات کے مشترک شمارے کی ترتیب میں ادارہ کو کئی بار تبدیلی کرنا پڑی۔ پہلے خیال ہوا کہ اِس میں صرف مقالات اور نظمیں شائع ہوں۔ منتخب افسانوں کی طرف دیکھا گیا تو وہ بھی تعداد میں بہت کافی تھے۔ اگر اُن میں سے چند اِس میں شریک نہ کئے جاتے تو اُن کی تعداد اور بھی بڑھ جاتی۔ بہرحال یہی مناسب سمجھا گیا کہ اِس اشاعت کو متنوع ہی رکھا جائے۔ اور اِس کے معیار کو اِس کی خصوصیت بنا دیا جائے۔ پھر کسی موقع پر کسی ایک ہی صنفِ ادب پر ہم کوئی اشاعت پیش کریں گے۔ "شاعر" کے پڑھنے والوں میں دونوں طرح کے لوگ ہیں علمی و ادبی ذوق رکھنے والے بھی اور افسانوی ادب پسند کرنے والے بھی۔ سب ہی کے ذوق کی تسکین کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اِس اشاعت میں جو کچھ بھی پیش کیا جا رہا ہے اُس کے وزن و معیار کا فیصلہ تو قارئین کریں گے، لیکن چھ مقالوں، پانچ افسانوں، ایک مزاحیہ مضمون اور ایک ڈرامہ میں کوئی چیز بھی تیسرے درجے کی نہیں ہے۔

اِس شمارہ کی ایک خصوصیت کی طرف البتہ ہم اشارہ کریں گے اور وہ ہے اِس بار کی نظموں کا جذباتی اور احساساتی اندازِ اسلوب۔ ہند و پاک میں جو انسانیت سوز حرکات ہوئیں اور ہنوز جو ہیجان، انتشار اور کھنچاؤ پایا جاتا ہے، اُس نے پوری دُنیا کو فکر و تردُد میں مُبتلا کر دیا ہے۔ ہم نے بعض شعراء کو دعوت دی تھی کہ وہ اِس موضوع پر قلم اُٹھائیں۔ جتنی نظمیں موصول ہوئیں وہ شاملِ اشاعت ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ ذہنوں پر اپنا بھرپور اثر ڈالیں گی۔ ضرورت ہے کہ اِس نوع کی نظمیں اُردو کے کثیر الاشاعت اخبارات اپنے یہاں نقل کریں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھ سکیں۔ اس کے علاوہ امن و یکجہتی کی اِس آواز کو دوسری زبانوں کے اخبارات و رسائل تک بھی پہنچانا چاہیئے۔ "شاعر" کے پڑھنے یا لکھنے والوں میں جو لوگ ہندی، گجراتی، مراٹھی، بنگالی اور دیگر

شاعر بمبئی

مُلکی زبانوں سے واقف ہوں وہ اگر اِس طرح کی اُردو نظموں کو اِن زبانوں میں منتقل کرتے رہیں تو یہ مُلک اور قوم کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ صرف اُردو میں صُلح و آشتی، رواداری اور یکجہتی و یگانگت کے متعلق لکھنا کافی نہ ہوگا۔ ہمیں یہ کام بڑے پیمانہ پر کرنا ہوگا۔ پوری توجہ اور خلوص کے ساتھ۔

"شاعر" کے لئے اِس موضوع پر جتنی بھی معیاری نظمیں اور کہانیاں آئیں گی، ڈرامے وصول ہوں گے ہم اُنہیں سب سے پہلے جگہ دیں گے۔ یہ وقت کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ ہم اُردو کے بڑے قلم کاروں کو اِس طرف بطورِ خاص توجہ دلاتے ہیں۔

غفلت اور بے توجہی مناسب نہیں

حالات کے معمول پر آنے میں کتنا وقت لگے گا، یہ کوئی نہیں جانتا۔ متاثرہ علاقوں کا نظامِ زندگی درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے وہاں اُردو رسائل و اخبارات کی مانگ بھی کم سے کم ہو گئی ہے۔ ادبی رسائل پر خصوصیت کے ساتھ بے حد ناخوشگوار اثر پڑا ہے۔ غیر متاثرہ علاقوں کے اُردو جاننے والوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ادبی رسائل کو سنبھالے رہیں۔ اُنہیں سہارا دیں اور اُن کی اشاعتیں کم نہ ہونے دیں۔

وی پی، کیوں واپس کر دئے جاتے ہیں؟

جب دو بار اطلاع دے دی جاتی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کچھ لوگ وی پی کیوں واپس کر دیتے ہیں! یہ ایک بڑی ہی غیر اخلاقی بات ہے۔ اور "شاعر" کو بے حد نقصان پہنچانے والی۔ کسی رسالے کی خریداری کوئی جبر تو ہے نہیں۔ ایسے حضرات جو خریدار نہ رہنا چاہیں یا وی پی نہ منگانا چاہیں وہ بہ آسانی چھ نئے پیسے کے کارڈ کے ذریعہ اطلاع دے سکتے ہیں۔ اور "شاعر" کو بارہ آنے کے نقصان سے بچا سکتے ہیں۔ اُمید ہے کہ آئندہ کبھی "شاعر" کا کوئی وی، پی واپس نہ آئے گا، اور اُس کے تمام معزز خریدار اِس ضروری امر کی طرف ہمیشہ توجہ دیں گے۔ زرِ سالانہ ختم ہو جانے کی اطلاع دینے کے بعد اگر کوئی خریدار خاموش رہتا ہے تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ سلسلۂ خریداری جاری رہے گا۔ اِسی اعتماد پر وی پی بھیج دیا جاتا ہے۔ لیکن وی پی واپس آجاتے ہیں۔ افسوس صد افسوس!!!

نقد و نظر

کلکِ موج

از ——— عبدالعزیز خالد

چند ہی سال میں عبدالعزیز خالد کی کئی کتابیں صوری و معنوی حسن کے ساتھ منظرِ عام پر آگئی ہیں اور انہوں نے اپنے لئے ایک منفرد مقام بنا لیا ہے خواہ اس کا سبب اُن کے مُغلق الفاظ و تراکیب ہوں یا نہایت پیچیدہ خیالات یا مختلف زبانوں اور اُن کے ادب سے استفادہ۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کا مطالعہ نہایت وسیع ہے، اِس لئے وہ اپنی شاعری میں اپنے مُطالعہ کے حاصل کو کسی نہ کسی طرح سمو دیتے ہیں۔ وہ اِس کی پروا نہیں کرتے کہ قاری اُس سے کیا اثر لے گا۔ وہ اکثر شاعری کی حدود و قیود کو توڑ دیتے ہیں۔ اُردو زبان کے مزاج اور اُسکے اسالیب سے بھی انحراف کر جاتے ہیں۔ لیکن اِسی کے ساتھ انہوں نے ایسی بیش بہا چیزیں بھی دی ہیں جو اُردو زبان میں نہ تھیں۔

"کلکِ موج" کو غزلوں کا مجموعہ کہا جاسکتا ہے لیکن اِن پر قدیم غزل کا اطلاق ہوسکتا ہے اور نہ جدید کا۔ اِن میں نہ غزل کی فضا ہے اور نہ اُس کی نزاکت و لطافت، ہم اِسے کلامِ بلیغ کہہ سکتے ہیں۔ اِن غزلوں کے اشعار مختلف النوع ہیں۔ اِن میں کہیں تلمیحات ہیں، کہیں تشبیہات تو کہیں استعارے۔ کہیں اشعار ترجمہ معلوم ہوتے ہیں، کہیں خالص علمی اصطلاحات اور محاورات کا ذخیرہ۔ کہیں ثانی مصرع سیدھا سادا ہے تو اولی مصرع بالکل عربی یا آدھا فارسی۔

عِلم کی انتہا نمی دانم — پردے کھینچو کہ روشنی کم ہے

تساوی لدیہ الحصار والانتصار — نگاہوں پہ کافر کی پردہ پڑا ہے

انا جابر عشرت الکرام — لبوں پر تبسم نظر نیم وا ہے

یہ اسّی اشعار سے زیادہ کی نعتِ شریف کے شعر ہیں۔

مطلع یہ ہے۔ — غلام محمّد کا رُتبہ بڑا ہے

ہر اورنگ زیب اُس کے در کا گدا ہے

اِسی میں بعض اشعار انتہائی برجستہ اور حقیقت کُشا بھی ہیں جن

شاعر بنی

کے پڑھنے سے دل و دماغ متاثر ہوتے ہیں۔ جا بجا اِس مجموعہ کے اشعار پر مختلف قسم کے نوٹ ہیں۔ اِن حوالوں سے بھی خالد کے علم اور ذہن کی پہنچ کا اندازہ ہوتا ہے۔

اِن غزلوں سے ایک فکرِ بلند ضرور آشکار ہوتی ہے، لیکن بڑی ژولیدہ۔ چونکہ خالد نے مختلف زبانوں کے شعر و ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اس لئے بہت سے ایسے خیالات بھی اُن کے یہاں مل جاتے ہیں جن میں کوئی چونکا دینے والی بات ہوتی ہے۔ مثلاً

قربتِ حُسن میں کم حوصلہ اربابِ ہوس

اپنی ہی سانس کی گرمی سے پگھل جاتے ہیں

یہ خیال انہوں نے متنبّی سے لیا ہے اور حوالہ بھی دیا ہے۔ اُن کی یہ سچائی اور ظرف کی بلندی قابلِ تعریف ہے کہ وہ جہاں سے بھی جو کچھ لیتے ہیں اُس کا حوالہ ضرور دے دیتے ہیں۔ ورنہ اُردو میں ایسے لکھنے والے بھی ہوئے اور ہیں جنہوں نے دوسروں کے افکار و خیالات کو اپنا بنا کر پیش کیا۔ صفحے کے صفحے اور دفتر کے دفتر منتقل کر کے اپنی تصانیف بنائے۔

کاش خالد انتہائی مشکل پسندی ترک کر کے اپنی شاعری میں ایک توازن پیدا کریں۔ مشکل پسند غالب اور مومن بھی تھے، اقبال، سیماب، جوش اور اصغر بھی ہیں۔ لیکن اِن سب نے آدابِ شاعری کا خیال رکھا۔ خالد کے پاس نہ خیالات کی کمی ہے اور نہ الفاظ کی۔ اُن کی تمام کتابیں اِس بات کی شہادت دیتی ہیں۔ "کلکِ موج" کے بعض سادہ و آسان اشعار دیکھئے۔

تیرے بارے میں جستجو نہ کروں — عاشقی میں یہ کیسے ممکن ہے؟

فاصلے درد کے زیادہ نہ کم — مرحلے شوق کے نہ ہوسکیں طے

زندہ ہے وہی جو زندگی کی — قدر و قیمت سے آشنا ہو

گلزار تو گھر ہے رنگ و بُو کا — ویرانے میں پھول بن کے مہکو

سچ جھوٹ کی صورتیں ہیں یکساں   ہر شے کو منافقانہ پرکھو

اِس مجموعہ میں دو نمایاں باتیں اور بھی نظر آئیں، ایک تو یہ کہ زیادہ غزلیں غیر مُردَف ہیں۔ دوسرے بعض بحریں تشکیک پیدا کرتی ہیں اُن کے اوزان کچھ اِسی قسم کے ہیں۔

ایک اور بھی عجیب بات جو نہ اُردو کے کسی مجموعے میں دیکھی گئی اور نہ فارسی کے ۔ یہ ہے کہ خالدؔ نے اپنے متفرق اشعار کے ساتھ الگ الگ بہت سے مصرعے بھی دے دیے ہیں۔ اب تک متفرقات میں ایسے ایک ایک دو دو شعر جو مکمل غزل نہ بن سکتے تھے، شعراء اپنے مجموعوں میں دے دیا کرتے تھے، خالدؔ نے اِس میں یہ اضافہ کیا کہ وہ مصرعے بھی جو شعر نہ بن سکے، دے دیئے ہیں۔ اگر اِس کی تقلید شروع ہو گئی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ غزل اپنی دو ٹانگوں کے بجائے ایک ٹانگ کی رہ جائے یا شعری مجموعوں میں شعر یا اشعار کے بجائے ایک ایک مصرع ہی دیا جانے لگے۔

عبدالعزیز خالدؔ اپنی تمام کتابیں اُردو ٹائپ میں خاص اہتمام سے چھپواتے ہیں۔ "فلکِ موج" بھی بہت دیدہ زیب ہے۔ قیمت ساڑھے سات روپیہ،

ملنے کا پتہ:۔ دوآبہ کوآپریٹو پبلشرز لمیٹڈ ۔ ۹۳ نیو کلاتھ مارکیٹ، بندر روڈ، کراچی (پاکستان)

شکنتلا

از ـــــــــــــ منوّرؔ لکھنوی

اُردو کے مشہور و کہنہ مشق شاعر بشیشور پرشاد منوّرؔ لکھنوی کی متعدد تصانیف اب تک شائع ہو چکی ہیں نظموں اور غزلوں کے مجموعوں کے علاوہ، نظم و نثر کے تراجم پر مشتمل کتب بھی شائع ہو کر مقبول ہوئی ہیں۔ منظوم تراجم کا اُنہیں خاص ملکہ ہے، وہ زبان و بیان کی صحت و صفائی کا بھی خیال رکھتے ہیں۔

کالی داس کے مشہور ناٹک "ابھگیان شکنتلا" کے اب تک اُردو نظم و نثر میں کئی ترجمے ہو چکے ہیں اور اِن میں سے بعض واقعی اچھے ہیں۔ اِن کی موجودگی میں منوّرؔ لکھنوی کو ایک مزید ترجمے کی ضرورت ہوں محسوس ہوئی اِس کی طرف وہ خود اشارہ کرتے ہیں۔

"میرے اِس ترجمے کا انحصار اصل سنسکرت ڈرامے کے شاعر یعنی علاوہ کالی داس گرنتھاولی اور راجا لکشمن سنگھ کے ترجمے پر ہے۔ یہ ترجمہ آزاد ہے۔ اِس میں اشلوکوں کا ترجمہ مختلف البحور اشعار میں کیا گیا ہے اور نثری مکالمہ کا ترجمہ نثر میں۔ اصل سے بغاوت یا گریز کہیں نہیں ہے۔"

محض مختلف بحروں کے برتنے کی وجہ سے ترجمہ کو آزاد نہیں کہہ سکتے یہ پابند ہے اور منوّرؔ صاحب نے تمام شاعرانہ آداب کو ملحوظ رکھا ہے۔ اُنہوں نے سنسکرت اشلوکوں کا ترجمہ نہایت شستہ و رَفتہ انداز میں بڑی فصاحت کے ساتھ کیا ہے۔ جن شعروں میں وہ سنسکرت کے الفاظ اور اُس کی تلمیحات لائے ہیں وہاں بھی اشعار گُنجلک یا مُغلق نہیں ہوئے ہیں۔ اِس ترجمہ کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اُنہوں نے بڑی حد تک سادگی، پُرکاری اور راسی کے ساتھ مفہوم کی ادائیگی کا خیال رکھا ہے بعض بعض جگہ تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ سنسکرت کے عالمانہ اور مفکّرانہ اشلوکوں کا ترجمہ ہے۔ جن لوگوں نے ترجمے کیے ہیں وہ ترجمہ کی مُشکلات سے واقف ہیں۔ منوّرؔ صاحب کے اشعار کی سلاست و روانی دیکھیے ؎

دیکھنا ابروئے پُرخم دیکھنا   اُن کا یہ اندازِ برہم دیکھنا

ضبطِ غم سے جو کام لیتا ہوں   آنسوؤں کو جو تھام لیتا ہوں
سوز سا سوز مجھ سے آہوں میں   ہے اندھیرا مری نگاہوں میں
ضبطِ غم بھی کیا نہیں جاتا   لب تک اک لفظ بھی نہیں آتا

مجھ کو اِن دونوں کے بارے میں کوئی اُلجھن نہیں
چاک خارِ فکر سے اب نام کو دامن نہیں

دل اُس کے نظارے سے ہے باغ باغ   ہے کس خانداں کا یہ چشم و چراغ

ہمیشہ اِس سے زینت خانۂ شوہر کی ہوتی ہے
جسے کہتے ہیں لڑکی وہ پرائے گھر کی ہوتی ہے

پیڑ ہمیشہ پھل آنے پر جھک جاتے ہیں   اُوپر کی جانب اُٹھنے سے رُک جاتے ہیں
جب لاتا ہے بھر کر تازہ تازہ پانی   کر دیتا ہے خم بادل کو اُس کی گرانی

پیشِ خورشید بھی ظلمت کہیں رہ سکتی ہے
آئینہ میں بھی کثافت کہیں رہ سکتی ہے

دیکھ کے میں دونوں کی لیلا   چُپ نہ رہوں تو اور کروں کیا

صفحہ ۲۰۷ پر ایک طویل مکالمہ ہے جس کا پہلا مصرع

"تجھ پر جو مٹنے کی تمہارا"

ہے ۔ یہ مکالمہ یوں لگتا ہے جیسے کوئی سیدھی سادی زبان میں نہایت پُراثر باتیں کر رہا ہو ۔ مترجم صاحب چونکہ اب تک دوسری زبانوں سے متعدد منظوم تراجم کر چکے ہیں ۔ اُنہیں الفاظ اور زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے ۔ اس لئے "شکنتلا" کے ترجمہ میں بھی وہ کامیاب ہوئے ہیں ۔ نثر کا ترجمہ سادہ نثر میں ہے ، نثری مکالموں کے بعد منظوم مکالمے لطف دے جاتے ہیں ۔

اشلوکوں کے ترجمے میں آسان اور مشکل دونوں طرح کی بحریں استعمال کی گئی ہیں ۔ جہاں یہ ایک قسم کا تنوع ہے ، مفہوم کی صراحت و وضاحت کے لئے ایک آسانی پیدا ہو گئی ہے ۔ وہیں بار بار بحروں کے بدلنے سے مترجم کو فنی دشواریاں بھی پیش آئی ہیں اور اس کا اندازہ مندرجۂ ذیل اشعار سے ہوتا ہے ۔ ان میں حروف کے دبنے اور گرنے کا غیر شعوری عمل ہوا ہے ۔ اس کی طرف اشارے کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ مترجم صاحب اِن پر نظرِ ثانی فرمالیں اور اگر ہماری نشاندہی صحیح ہے تو آئندہ ایڈیشن میں ترمیم ہو جائے ۔

روشِ تیز کا یہ ہے عالم ٹھہرتے ہی نہیں زمیں پہ قدم

یہاں ٹھہر ـــــ "ٹھیر" ہونا چاہیئے ۔

جنگلی بیلیں یہ رنگ و نور میں نایاب ہیں

یہاں جنگلی ـ "بیگلی" کے وزن پر نظم ہونا چاہیئے تھا ۔

جس میں "انگارے کا سا تھا" التہاب

"کا سا" ـــــ "کسا" پڑھا جاتا ہے ۔

جیوں جیوں آگے قدم بڑھاتا ہوں پیچھے ہی کی سمت لوٹ جاتا ہوں

شاید اس مصرع میں "ہی" کاتب کا اپنا اضافہ ہو ۔

وہ تڑپتا ہے تمہارے واسطے غم سراپا ہے تمہارے واسطے

"سراپا غم" کہنا زیادہ مناسب تھا ۔

سرِ نگار کی گرچہ آرزو تھی رنگیں پھولوں کی جستجو تھی

آفتابِ ضو فشاں صرف ایک بار

اپنے رتھ میں جت دو راہوار

غالباً "یہ راہوار" ـــــ ہو گا

ذاتِ مقدس زندہ باد دولت و حشمت پائندہ باد

"پائندہ" کی "ی" گرتی ہے ۔

شاعر بھی

کہ بچے اس کے جب تک خود بخود اڑنے نہیں پاتے

یہ پکواتی ہے اِن کو دوسرے احمق پرندوں سے

غالباً "پلواتی" ہو گا ۔

زبوں راکشسوں کی ہلاکت کا فرض

کیا ہے سپرد آپ کے اِندر نے

"رکھشسوں" بغیر الف کے تو بحر میں آجاتا ہے ۔

آگ جلتی ہے جب ایندھن کو ہوا دیتے ہیں

لکڑیوں کو زبر و زیر ہٹا دیتے ہیں

یہاں "زبر و زیر" اچھا نہیں لگتا ۔ مگر ترجمہ کی ضرورت مجبوری کو کیا کیا جائے ۔

جس کی پنکھڑیاں نزاکت سے ابھی ہوں ادھ کھلی

پنکھ ڑی ـــــ پنکھ ڑیاں صحیح تلفظ ہو سکتا ہے ۔

ذیل کے مصرعوں میں نار وا تعقید نظر آتی ہے ۔

ہاتھوں سے اپنے حکم اگر دیں تو داب دوں

پھول نہ بر نگِ گل سماتی

ایک عذاب بے درماں ـ سا نازل ہو جاتا ہے

اُس کی پیچ بھری راہوں ـ سے جو گذرنا ہوتا ہے

فرض ہر اک اہم نہایت ہے

بعض کتابت کی غلطیاں بھی ہیں اور اِن کی تصحیح ضروری

صفحہ ۷۰ ـ اُٹھے صدا فگن (صید

" ۷۴ ـ کو لے (کو لیے)

" ۸۶ ـ بلا خیز ستم گر یہ ادائیں (بلا خیز و ستم گر

" ۱۳۱ ـ دولت صولت جب بھی فراواں (دولت و صولت

" ۱۳۶ ـ پیکرِ ناز وادیہ جو (ناز و ادا)

" ۱۷۲ ـ مہ نور کی رقصاں (مہِ نو)

" ۱۰۸ ـ تم بھی چڑھو اِن کی نظروں ، جان و دل قربا (نظروں پہ)

"شکنتلا" کا یہ ترجمہ نہایت قابلِ قدر اور اُردو زبا مزاج کے عین مطابق ہے ۔ کتاب معیاری اور خوبصورت چھپی ابتدا میں نائب صدرِ جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کا ایک خط بطور پیش لفظ شائع کیا گیا ہے ۔ سرورق ہندوستانی آرٹ

مخزن ہے۔ حجم ۲۱۶ صفحات — قیمت چھ روپیہ
ملنے کا پتہ: آدرش کتاب گھر ۲۹ - ۱۵۲۸، فیض گنج —
دریا [illegible]

سیرِ افلاک

از ——— حکیم احمد

آسمانی خلا اور فضا سے انسان کی دلچسپیاں ہمیشہ وابستہ رہی ہیں۔ ہر دَور میں اپنے علم و ذرائع کے مطابق اہلِ علم نے غور کیا ہے، تجربہ اور مشاہدے کئے ہیں۔ افلاکی علم کے نظریات میں تبدیلی ہوتی رہی ہے اور ہمارے دَور کی سائنسی ترقیوں نے تو چاند کو چھُو لینے اور اُس میں انسان کے اُتار دینے تک کے امکانات پیدا کر دیئے ہیں۔ انسان فطرتاً تجسّس پسند واقع ہوا ہے۔ اور کائنات کی ہر چیز کو تسخیر کر لینا چاہتا ہے۔

"سیرِ افلاک" کے مؤلف حکیم احمد نے ۱۹۵۹ء تک اِس موضوع پر لکھی گئی معتبر کتابوں اور مضامین سے استفادہ کر کے اُردو میں یہ معلومات افزا کتاب لکھی ہے۔ اس کا پہلا باب "علم الافلاک کا تاریخی پہلو" ہے۔ دوسرا باب آفتاب، تیسرا چاند اور چوتھا سیاروں پر مشتمل ہے۔ اِس کے بعد فصلیں قائم کر کے ستاروں اور سیاروں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ فضائی فاصلے۔ عالمِ کہکشاں۔ کائناتی سحاب اور ستاروں کی تخلیق۔ عالم ہائے دیگر — نظامِ کائنات — آنسٹین کے نظریے۔ اجسامِ سماوی اور مسئلۂ حیات کے متعلق نہایت دلچسپ مواد فراہم کیا ہے

آخری باب "فضائی سفر" سے متعلق ہے۔ اِس میں رُوس اور امریکہ کی کوششوں اور کاوشوں کا ذکر بھی ہے۔ لیکن چونکہ یہ کتاب ۱۹۵۹ء تک کی کاوشوں کو احاطہ کرتی ہے اور گزشتہ پانچ سال میں چاند تک پہنچنے کے سلسلے میں بے شمار عملی تجربے کئے جا چکے ہیں اس لئے اِس حصّہ کو جدید کے ذیل میں نہیں لا سکتے۔ ویسے جدید تجربات و معلومات پر اُردو میں ایک دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

بہرحال حکیم احمد نے اِس موضوع پر جو بھی مواد فراہم کیا ہے وہ معتبر اور اُن کا طرزِ تحریر عالمانہ مگر سادہ ہے کتاب میں بہت سے نقشے خاکے اور تصاویر ہیں۔ کتاب دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہے۔ حجم دو سو صفحات۔ قیمت پانچ روپیہ، ملنے کا پتہ، انجمن ترقی اُردو (ہند) علیگڑھ
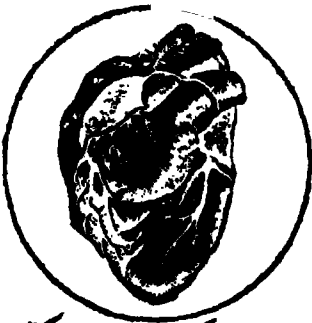
شاعر بمبئی

رَفتار (علمی۔ ادبی اور تہذیبی خبریں)

از۔ سورن (ایڈیٹر چیتنا دہلی)

اَندھایُگ ـــــ ایک انوکھا تجربہ

ہدایت کار، ای۔ القاضی کی نئی پیشکش "اندھا یُگ" دیکھنے کے بعد میرا یہ خیال اور بھی پختہ ہو جاتا ہے کہ اسٹیج کے نقطۂ نظر سے کسی ڈرامے کی کامیابی یا ناکامیابی کا دار و مدار ڈرامہ نگار پر اتنا نہیں جتنا ہدایت کار پر ہے۔

چند سال قبل جب دھرم ویر بھارتی کا منظوم ڈرامہ "اندھا یُگ" چھپ کر منظرِ عام پر آیا تو اُس کے اسٹیج کئے جا سکنے کے متعلق شک عام تھا اور یہ شک بڑی حد تک صحیح بھی تھا۔ چونکہ ڈرامے میں کئی سلسلہ وار مختلف مناظر ہونے کے باعث جہاں سیٹنگز اور اُن کے بار بار تبدیلی کے وقفے سے ڈرامائی تسلسل کو صدمہ پہنچنے کا خدشہ تھا۔ وہاں ڈرامے کی زبان بھی عام ہندوستانی مزاج کے خلاف کچھ اتنی سنسکرت آمیز ہے کہ عام بول چال کی روش سے ہٹی ہٹی پہلے ہی نظر میں کھٹکنے لگتی ہے اور شاید یہی خالص ہندی ڈرامہ میں حصہ لینے والے غیر ہندی فنکاروں کے تلفظ کے آڑے بھی آئی ہے۔

ناکام اشوتھاما (ارون جوگلیکر) مستقبل کے رموز بتانے والے یاچک (ظفر احمد) کا گلا گھونٹنا چاہتا ہے مگر....

"اندھا یُگ" مہابھارت کی جنگ پر مبنی ایک منظوم ڈرامہ ہے۔ کہانی پُرانی ہے، لیکن دھرم ویر بھارتی نے جس انداز سے اِس کہانی کو ڈرامائی رُوپ بخشا ہے، وہ سنسکرت ناٹکوں کی روایت سے ہٹ کر زندگی کا ایک بڑا المیہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور جنگ کی بھیانک تباہی اور آنے والی نسلوں پر اُس کے تباہ کُن اثرات کا ایسا احساس جگاتا ہے جو یقیناً آج کے انسانی سماج کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اور اِس لحاظ سے بلا شبہ "اندھا یُگ" ایک گراں قدر تصنیف ہے۔ مگر اسٹیج کے نقطۂ نگاہ سے اِس میں کئی دشواریاں اور خامیاں بھی ہیں۔ اِن سب کے باوجود جس شاندار کامیابی کے ساتھ اُسے اسٹیج کیا گیا، وہ کچھ القاضی جیسے ہدایت کار ہی کا حصہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ القاضی نے "اندھا یُگ" کے ذریعہ ڈرامائی پیشکش کا جو معیار قائم کیا ہے وہ نہ صرف ہندوستانی اسٹیج کی تاریخ میں یادگار رہے گا بلکہ سنگِ میل بن کر بھاری بھرکم سیٹنگز پر بے شمار روپیہ ضائع کرنے والے ہدایت کاروں کو اِس طرح کے انوکھے اور اچھوتے تجربوں پر اُکساتا رہے گا۔

ای۔ القاضی نے کچھ دنوں پہلے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ اگر واقعی ہندوستانی اسٹیج کو از سرِ نو زندہ کرنے کا سچا جذبہ ہم میں ہے تو وسا ئل کی کمی کے باوجود ہمیں اِس کے لامحدود امکانات پر غور کرنا چاہئے اور ایسے تھیئٹر گاہ کھولنے چاہئیں جہاں کم سے کم اخراجات پر ہم اچھے سے اچھا ڈرامہ پیش کر سکیں۔ اِس سلسلے میں اُنہوں نے خاص طور پر دلّی کے اُن بے شمار کھنڈروں کا ذکر کیا تھا، جنھیں بڑی آسانی سے تھیئٹر گاہوں کا رُوپ دیا جا سکتا ہے اور چند ڈراموں کے لئے تو وہ فضا اور سماں پیدا کیا جا سکتا ہے جو آئیفیکس (AIFACS) اور سپرو ہال جیسے قیمتی ہالوں میں قطعی ناممکن ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جو کچھ اُنہوں نے کہا اُسے کر کے بھی دکھایا۔ فیروز شاہ کوٹلہ کے ایک کھنڈر کو اسٹیج اور آڈیٹوریم (AUDITORIUM) کے رُوپ میں جس خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے وہ کچھ القاضی ہی کا حصّہ ہے۔ کھنڈر کی صرف ایک دیوار کے پسِ پردہ اوپن ایئر اسٹیج (OPEN AIR STAGE) بنا کر روشنی کو مختلف زاویوں سے استعمال کرتے ہوئے جو مختلف مقامات کے تاثرات اُبھارنے کی کوشش کی گئی، وہ انتہائی کامیاب تھی۔ اداکاری کی سحر کاری سے مسحور سامعین کبھی کبھی تو ایسا محسوس کرنے لگتے تھے کہ وہ واقعی اُس دَور میں پہنچ گئے ہیں اور سب کچھ سچ مچ اُن کے سامنے ہو رہا ہے۔

ڈرامے میں شرکت کرنے والے سارے فنکار نیشنل اسکول آف ڈرامہ کے اسٹوڈینٹس ہیں۔ لیکن اِن فنکاروں میں ابھی سے جو پختگی اور گہرائی دیکھنے کو ملتی ہے وہ اِس بات کی شاہد ہے کہ مستقبلِ قریب میں ہندوستانی اسٹیج کو کچھ ایسے اداکار اِس اسکول سے ضرور ملیں گے، جو ڈرامے کی روایت کو آگے لے جانے میں معاون ہوں گے۔ یوں تو تقریباً سارے فنکاروں نے اپنا اپنا پارٹ بخوبی نبھایا ہے، لیکن چند لوگ خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ دھرت راشٹر کے رول میں ہر جیت، سنجے کے رول میں موہن مہارشی، اور زخمی سپاہی کے رول میں دیپا کمار ناتھ نے بڑی خوبی سے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔

بدنصیب گاندھاری (وینا دھر) اپنی بہوؤں کے ماتم کا سیندور پونچھنے کے بعد سنجے کے انتظار میں ....

اُردو، ہندی کے نوجوان افسانہ نگار کے رُوپ میں ظفر احمد کو تو ہم پہلے سے جانتا تھا، لیکن "اندھا یُگ" دیکھنے کے بعد پہلی بار پتہ چلا کہ وہ اسٹیج کا بھی ایک اچھا فنکار ہے۔ یاچک اور ودیادھر کے ڈبل رول اُس نے جس خوبی سے ادا کئے وہ بے حد قابلِ تعریف ہے۔

گاندھاری ڈرامے کا واحد نسوانی کردار ہے جسے مینا پیٹھے اور وینا دھر نے مختلف دنوں میں باری باری سے ادا کیا۔ اِس کردار کے لئے جس گہرائی اور جذبات نگاری کی ضرورت تھی، وہ مینا پیٹھے کی اداکاری میں اتنی نہیں اُبھر سکی، جتنی وینا دھر میں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وینا کی اداکاری زیادہ بہتر اور پُر اثر لگی۔ پس منظر کی آوازوں میں ادم شیو پوری کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جس نے کتھا گائن کے طویل حصّوں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا۔

تبصرہ ادھورا ہوگا، اگر مس کوکیلا موانی کے تیار کردہ مناسب کاسٹیوم، داس گپتا کی پُر سحر لائٹنگ اور راندھو شن گھوش کے اچھوتے میک اپ کی تعریف نہ کی جائے۔

پنجاب کی لسانی پالیسی میں تبدیلی نہیں ہوگی

بحوالہ انڈین ایکسپریس۔ اخباری نمائندوں سے باتیں کرتے ہوئے پنجاب کے وزیر تعلیم مسٹر موہن لال نے کہا کہ ریاست کے تعلیمی اداروں میں اُردو کو لازمی قرار نہیں دیا جائے گا۔ سرکاری پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ لیکن مالیر کوٹلہ اور میوات کے علاقوں

شاعر بمبئی

میں اُردو کی حوصلہ افزائی ضرور کی جائے گی ۔

بیورو آف لینگویج اینڈ لٹریچر

مرکزی وزارتِ تعلیم میں جدید تشکیل کی رُو سے پانچ محکموں کا قیام عمل میں آیا ہے ۔ ثقافتی معاملات اور ہندوستانی زبانوں کی ترقی کا کام بیورو آف لینگویج لٹریچر اینڈ فائن آرٹس (محکمۂ زبان وادب اور فنون لطیفہ) کے سپرد کر دیا گیا ہے ۔ تینوں ، اکاڈمیاں بھی اِسی محکمہ کی زیر نگرانی کام کریں گی ۔

اقبال اور ٹیگور کی یادیں

ڈھاکہ ۔ ۱۰ رفروری کی خبر کے مطابق ڈھاکہ میڈیکل کالج کے طلباء نے دو شاعروں کی یاد میں تین روزہ "کوی جینتی" بڑی دھوم دھام سے منائی ۔ یہ مشرق کے دو عظیم ترین شاعر اقبال اور ٹیگور ہیں ۔ جلسہ میں اِن دونوں شاعروں کی زندگی پر متعدد مقالات پڑھے گئے اور اُن کی شاعرانہ عظمت پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ۔ اِس تقریب میں صوبہ کے ممتاز دانشوروں اور اہلِ قلم نے شرکت کی ۔

ہندی اور علاقائی زبانیں ذریعۂ تعلیم

وزیر تعلیم مسٹر ایم ۔ سی چھاگلا نے لوک سبھا میں بتایا کہ ۳۵ یونیورسٹیوں نے خاص خاص مضامین کے لئے ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں کو علاوہ انگریزی کے ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے منظور کر لیا ہے ۔ بنارس سنسکرت وشو ودیالیہ نے ہندی کے علاوہ سنسکرت کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کر لیا ہے ۔

ظریف جبلپوری کا انتقال

ممتاز مزاح نگار ظریف جبلپوری کا یکم مارچ کو کراچی میں حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے اچانک انتقال ہو گیا مرحوم اُردو کی مزاحیہ شاعری میں ایک خاص مقام رکھتے تھے اُن کے بے وقت انتقال کی خبر تمام ادبی حلقوں میں بڑے افسوس کے

شاعر بمبئی

ساتھ سُنی گئی ۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے مرحوم کے پسماندگان کی فوری امداد کے لئے ایک ہزار روپیہ کا اعلان کیا گیا اور مستقل امداد کے لئے بھی حکومت کو متوجہ کیا گیا ۔

راجستھان ساہتیہ اکیڈیمی اودے پور

راجستھان ساہتیہ اکیڈیمی نے اُردو زبان میں سہ ماہی رسالہ بنام "نخلستان" نکالنے کا فیصلہ کیا ہے ۔ اس کے ایڈیٹر ساہتیہ اکیڈیمی کے رُکن جناب پریم شنکر سریواستو شنکر ہوں گے ۔ راجستھان ساہتیہ اکیڈیمی کی پروجیکٹ یوجنا کے تحت ہندی، سنسکرت، راجستھانی اور اُردو کے معیاری ادبی جریدہ کو امداد دی جاتی ہے ۔ لیکن راجستھان میں اُردو کا کوئی معیاری ادبی رسالہ شائع نہ ہونے کے باعث ساہتیہ اکیڈیمی نے خود ہی ادارۂ نخلستان ادب کی تشکیل کر کے نخلستان کے نام سے سہ ماہی رسالہ نکالنے کا فیصلہ کیا ہے

افسانوی ادب پر بارہ انعام

مرکزی وزارتِ تعلیم نے غیر ہندی علاقوں کے ادیبوں کو "افسانہ" کی کتابوں پر ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپے کے بارہ انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے ۔ کتابیں ۳۰ جون تک پہنچ جانی چاہئیں ۔ گذشتہ تین سال کے دوران درج ذیل لسانی گروپوں میں شائع ہونے والی کتابیں ہی داخل کی جا سکتی ہیں ۔

(۱) اُردو ۔ کشمیری ۔ پنجابی
(۲) مرہٹی ۔ گجراتی ۔
(۳) بنگلہ ۔ اُڑیہ ۔ آسامی ۔
(۴) تامل ۔ کنڑ ۔ تیلگو اور ملیالم

ابتدائی دو گروپوں میں ہر گروپ پر دو انعام، اور نمبر ۳ و ۴ کے گروپوں میں فی گروپ چار انعام دئے جائیں گے

تصحیح

"شاعر" کے گذشتہ شمارہ میں "منٹو کے ایک افسانہ کا تکنیکی تجزیہ" شائع ہوا تھا، جس میں مقالہ نگار کا نام غلط شائع ہو گیا اُن کا صحیح نام نثار مصطفےٰ ہے ۔ ادارہ

خلیل بیگ

پرنٹر پبلشر اور مالک اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ۲۳۔ نوروجی اسٹریٹ شاکر دوار بمبئی ۲ میں چھپوا کر دفتر سے شائع کیا۔

علامہ سیماب اکبر آبادی

کی چند حیات افروز تصانیف

...over printed at ... Printi... ...ss, Bombay 8

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بانی:۔ علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اردو کا قدیم علمی و ادبی ماہنامہ

سال ۔ ۳۵ ÷ شمارہ ۔ ۶

جون ۱۹۶۴ء

ادارہ

اعجاز صدیقی
مہندر ناتھ

زرِ سالانہ	زرِ ششماہی	ممالکِ غیر سے	فی پرچہ
سات روپیہ	چار روپیہ	۱۶ شلنگ	دس آنے (۶۲ نپ)

مکتبۂ قصر الادب
پوسٹ بکس نمبر ۵۲۶۴ بمبئی نمبر ۳

ترتیب

آئینۂ ادارہ
امیرِ کارواں جا رہا — اِدارہ ۷
محفل اپنی....! — اِدارہ ۹۶
نقد و نظر — اِدارہ ۹۸
رفتار (علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں) — ادارہ ۷۴

مقالات
رشید الوطواط پر ایک ہندوستانی محقق کا ایرانی ماخذ — اشفاق علی خاں ۱۲
خطِ تقدیر — سید رضا قاسم مختار ۱۹
فانی کا شعری سوز و گداز — زرینہ ثانی ۲۲
"گردِ راہ" پر ایک نظر — بادا کرشن گوپال مغموم ۲۵

نظمیں
امن کا پھول — رفعت سروش ۸
خوابوں کا مسیحا — اعجاز صدیقی ۹
تو نہیں گر — حسن کمال ۳۱
تمہارا غم — ادیب احمد صہبا ۳۲
خواب — حامدی کاشمیری ۳۳
تلاش — قیصر شمیم ۳۴
زعمِ باطل — درد گورکھپوری ۳۴
اندھیرے — اسرار اکبر آبادی ۳۵
پنجرے کا پنچھی — ندا فاضلی ۳۶
نئے خاکے — سردار الہام ۳۶
ملازمت (مزاحیہ) — وآہی ۳۷
سوال — عزیز اندوری ۳۸
ساعتِ غم — ظہیر ناشاد ۳۸

افسانے
ساجھے کا مُردہ — کرشن چندر ۴۰
انور لاج — ضیاء حسنی ۴۸
ہارلیم میں ٹریجڈی (از او ہنری) — مترجمہ اے خیام ۵۰
آہوں کی زبان — زین العابدین ۵۲

غزلیں
سید حسرت الکلام، نسیم سہارنپوری، اکرم دھولیوی، منشاء الرحمٰن خاں منشا، اصغر مہدی نظمی، صابر شاہ آبادی، کیف احمد صدیقی، رشید منتظر

مکتوبات
صادق مولا، عبدالمجید شاداب، ہلال جعفری، مظفر رئیس، ضیاء حسنی، خاور باگوٹی، ضیاء انصاری، انور راہی، رشید منتظر

شاعر کے بے شمار سالنامے اور خاص نمبر پیش کرنے کے بعد

اگست سنہ ۶۲ء میں بے پناہ خوبیوں سے مزین

ڈراما نمبر

پیش کیا جائے گا

سنجیدہ۔ مزاحیہ۔ اور۔ منظوم۔ ایکانکی ڈرامے

اردو کے ایکانکی ڈراموں پر نقادوں کے مقالے

چند متوقع ڈرامہ نگار

کرشن چندر۔ خواجہ احمد عباس۔ قرۃ العین حیدر۔ کوثر چاندپوری۔ رام لعل۔ جوگیندر پال۔ کشمیری لال ذاکر۔ ڈاکٹر ستیہ پرکاش سنگر
انور عنایت اللہ۔ سہرمنس دوست۔ دیویندر اسّر۔ فرقت کاکوروی۔ زکی انور۔ دیویندر ستیارتھی۔ غیاث احمد گدی۔ ابراہیم یوسف۔ نور شاہ
موہن یاور۔ احمد جمال پاشا۔ ظفر احمد۔ اظہر افسر۔

منظوم:۔ سلام مچھلی شہری۔ رفعت سروش۔ قیصر قلندر۔ عبدالعزیز خالد ــــــ اور دوسرے

تفصیل آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے

جرعات :-

امیرِ کارواں جاتا رہا...!

۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو ہندوستان کے لئے خصوصاً اور پوری دنیا کے لئے عموماً تاریخ کا وہ زبردست المیہ اور سانحہ پیش آیا جس نے روح کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، دلوں کو غم واندوہ سے بھر دیا اور خیالوں کو زخمی بنا دیا۔ ہندوستان کے سب سے زیادہ محبوب رہنما پنڈت جواہر لال نہرو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وہ آنکھیں مُند گئیں جو چپے چپے اور ذرّے ذرّے پر مرکوز رہتی تھیں جن سے فکر، فلسفہ، تدبر، پیار، امن، آشتی، عزم اور استقلال کی کرنیں پھوٹا کرتی تھیں۔ وہ لب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے جو گذشتہ پچاس سال سے قوم کو پیامِ بیداری دیتے چلے آ رہے تھے۔ اُس چہرہ پر مُردنی چھا گئی جس کی مُسکراہٹیں کروڑوں عوام کے دلوں کو مسخر کر لیا کرتی تھیں جس کی افسردگی لاکھوں لوگوں کو افسردہ بنا دیا کرتی تھی۔ ۲۷ مئی کو جواہر لال نہرو کے انتقال کی اطلاع جنگل کی آگ کی طرح تمام دنیا میں پھیل گئی۔ دنیا پر غم کے گہرے بادل چھا گئے۔ امن، تعمیر اور یکجہتی کی روشنی معدوم ہو گئی۔ پھر جو کچھ ہوا، اُن کے جسدِ خاکی کو ہندوستان کے لاکھوں عوام و خواص اور بیرونی دنیا کی بڑی بڑی شخصیتوں نے آنسوؤں، آہوں اور چیخوں کے درمیان جس عظمت واحترام کے ساتھ اُن کی آخری منزل تک پہنچایا۔ جس نوع کے بیانات دئیے۔ جس طرح کا اظہارِ خیال کیا وہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

اِنسانیت کا اتنا بڑا محسن اور ملک وقوم کا ایسا عظیم معمار صدیوں بعد پیدا ہوا تھا اور اب شاید صدیوں پیدا نہ ہو سکے۔ عجیب محبوبیت تھی اُن کی شخصیت میں اور یہ محبوبیت دُنیا کے عوام کے دَرد وغم کو اپنا درد وغم بنانے کی وجہ سے اُن میں پیدا ہوئی تھی۔ عوام سے اُنہیں دلی لگاؤ تھا اور عوام کو اُن سے۔ ہندوستان کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں دوسرے مجاہدینِ آزادی کے ساتھ اُنہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے۔ مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے سیاسی لیڈروں نے اُن کے فہم وتدبر پر جس طرح اعتماد کیا، وہ تاریخ کا ایک الگ باب ہے۔ لیکن غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے کے بعد گذشتہ ۱۶-۱۷ سال میں جواہر لال نے قوم کو جتنا سربلند کیا، انتہائی نازک موقعوں پر اپنی رہنمائی سے ملک کو جن خطروں سے نکالا۔ ہندوستان کی تعمیر وتہذیب کے لئے جو خاکے بنائے۔ قومی یکجہتی پر جتنا زور دیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہندوستان کو دنیا کی سب سے بڑی اور کامیاب جمہوریت بنا دینا، ایک مضبوط جمہوری نظام قائم کر دینا اور ناطرفداری کے اصولوں پر سختی سے کاربند رہ کر دنیا کی بڑی طاقتوں کو جھکا دینا۔ "پنچ شیل" کو منوا لینا۔ سوشلزم اور سیکولرزم کی بنیادوں کو اُستوار کرنا اور اِن ہی کو ہندوستان کی نجات کا ذریعہ سمجھنا۔ بقائے باہمی پر مسلسل زور دیتے رہنا وہ عظیم کارنامے ہیں۔ جنہیں دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ دہرایا جائے گا۔ جواہر لال نہرو کا فکر وفلسفہ پوری دنیا کے لئے مشعلِ ہدایت بنا رہے گا۔ وہ ایشیا کے کتنے ہی غلام ملکوں کے نجات دہندہ تھے۔ امنِ عالم کا اُن سے بڑا داعی اور کوئی نہ تھا۔ جنگ کے شعلوں کو جواہر لال ہی کے انفاسِ نرم نے ٹھنڈا کیا۔

جواہر لال نہرو کیا تھے ۔۔۔ ؟ اِس پر مُدتوں لکھا جائے گا۔ لیکن ہندوستان کے چالیس کروڑ لوگوں کو صرف یہ سوچنا چاہیئے کہ وہ ہمیں کیا دے کر گئے ہیں؟ ۔۔۔ اس وقت نہرو جی کے زرین اصولوں کو اپنا کر ہی ہم اُن کی بیتاب رُوح کو سکون بخش سکتے ہیں۔ وہ ہمیں انسان دوستی، امن ویکجہتی اور محنت واستقلال کی تلقین کر کے گئے ہیں۔ اور اِن ہی چار باتوں میں ہندوستان جیسے عظیم ملک اور اس کے عوام کی نجات پوشیدہ ہے۔ تمام مادی یادگاروں میں جواہر لال نہرو کی سب سے اہم اور بڑی یادگار یہی ہے کہ ہم اُن کے بتلائے ہوئے راستوں پر چلیں۔ اگر ہم اِن سے ایک انچ بھی ہٹے تو خطرات میں گھر جائیں گے۔

رفعت سروش

امن کا پھول

وہ امن و آشتی کا پیمبر کہاں گیا — وہ اکبر و اشوک کا ہمسر کہاں گیا
جس کی ہر اک صدا میں تھا اک انقلابِ نو — تہذیب و ارتقا کا وہ پیکر کہاں گیا
تھی جستجو کہ خوب سے ہو خوب تر کہاں — وہ کاروانِ شوق کا رہبر کہاں گیا
تاریکیوں نے گھیر لیا مہر و ماہ کو — روشن تھا جس سے دہر وہ مظہر کہاں گیا
کاشانۂ وطن ہوا تاریک یک بیک — یہ گھر تھا جس کے دم سے منور کہاں گیا
یہ کرۂ زمیں ہے مجسم سوال آج — صدیوں میں جو ملا تھا وہ جوہر کہاں گیا

خاکِ وطن سے آتی ہے رہ رہ کے یہ صدا
ہے ہے وہ میرا لال، جواہر کہاں گیا

وہ کھو گیا نظر سے مگر دل کے ساتھ ہے — سب کچھ لٹا کے قوم کی محمل کے ساتھ ہے
آزاد ہو گیا ہے وہ اب قیدِ جسم سے — وہ روحِ عصر، روح کی محفل کے ساتھ ہے
اُسکے اصول، اُسکی نظر، اُسکا فلسفہ — سب کچھ ہر ایک رہروِ منزل کے ساتھ ہے
منجدھار میں ہے کشتیٔ قوم و وطن تو کیا — اسکی نگاہ کشتی و ساحل کے ساتھ ہے
پہلو میں زندگی کے مچلتا ہے اُسکا عزم — وہ نغمہ ریز رونقِ محفل کے ساتھ ہے
اُسکی نوا کا شعلۂ رقصاں ہے جاوداں — وہ روشنیٔ طبع ہر اک دل کے ساتھ ہے

اِن آنسوؤں کو روک لے اے مادرِ وطن
ہاں تیرا لال تیری ہی محمل کے ساتھ ہے

دنیا کرے گی اُسکی سدا رہبری قبول — مشعل بنیں گے اُسکے بتائے ہوئے اصول
ایٹم کی زد میں آئے ہوئے اِس جہان میں — ہے امن و آشتی کا نشاں اُسکا سرخ پھول
جب کوئی جنگ جنگ کا نعرہ لگائے گا — چھیڑیگا اپنا نغمۂ گل امن کا رسول
باطل کی تیرگی جو کبھی سر اٹھائیگی — ہوگا فلک سے روشنیٔ صبح کا نزول
جن میں بسی ہیں روحِ جواہر کی نکہتیں — وہ غنچے لالہ زار میں کھل کر بنیں گے پھول
مہکائیں گے فضائے جہاں کو یہ گل عذار — دنیا میں خار و خس ہوں بگولے ہوں یا ببول

تازہ رہیگا علم و عمل کا یہ آفتاب
ہنستا رہیگا امن و محبت کا سرخ پھول

خوابوں کا مسیحا

خواب، جو ایک مُدبّر نے کبھی دیکھے تھے
خواب وہ ٹوٹ گئے
وہ مُدبّر نہ رہا!
وہ مُدبّر، وہ مُفکّر، وہ سیاست کا امام
جس نے کی اپنے تدبّر کی ضیا سے روشن
اِک نئی صبح، نئی لوحِ اُفق، اِک نئی شام
زُعمِ خورشید کو بھی توڑ گئی جس کی کرن

جس کی تابش سے ستاروں کی لَویں تھرّائیں
وِلِمُس سے جس کے فروزاں ہوئی قندیلِ سحر
ظُلمتیں اپنی تگ وتاز سے خود گھبرائیں
اُس نے جب ڈال دی مستور اندھیروں پہ نظر
خواب، جو ایک مسیحا نے کبھی دیکھے تھے
خواب وہ ٹوٹ گئے
وہ مسیحا نہ رہا!
وہ مسیحا، وہی عیسیٰ نفس و خضرِ حیات
پھونک دی جس نے نئی رُوح تنِ مُردہ میں
جس نے دی شرق کو مغرب کی غلامی سے نجات
جس نے خوشیوں کو بکھیرا رہِ آزردہ میں

جس نے ایٹم کے خداؤں کے بھی مُنہ پھیر دئے
شعلۂ جنگ کو ہر بار کیا جس نے سرد
جو چہکتا ہی رہا امن کا پیغام لئے
جس نے محسوس کیا واقعی اِنسان کا درد

خواب، اک محسنِ اعظم جو دیکھے تھے کبھی
خواب وہ ٹوٹ گئے !
اور وہ محسن نہ رہا !
محسنِ قوم و وطن، مرجعِ تہذیب و کمال
چارہ سازِ غم و ہم، ملک کا معمارِ عظیم
مردِ میدانِ عمل، واقفِ مستقبل و حال
جس کے انفاس سے پھوٹی تھی عزائم کی شمیم

منزلیں جس کی تھیں ہر جادۂ و منزل سے الگ
جس نے کانٹوں سے کیا پیار، گلوں کو چوما
اپنی محفل جو سجاتا رہا محفل سے الگ
جس کی دلسوز نوائی سے زمانہ جھوما
خواب، جو ایک مصوّر نے کبھی دیکھے تھے
خواب وہ ٹوٹ گئے!
وہ مصوّر نہ رہا !
رنگ بھرتا رہا جو قوم کی تصویروں میں
روح و جذبات و خیالات کی یکجہتی کا
خونِ دل جس کا چھلکتا رہا تقریروں میں
ایک ہی رنگ عیاں جلوۂ صد رنگ سے تھا

کچھ مرقعوں میں دھڑکتا ہوا جمہور کا دل
کچھ مرقعوں میں سجے ہوئے چہروں کا جمال
کچھ مرقعوں میں بپھرتی ہوئی موجِ ساحل
کچھ مرقعوں میں تنِ ہند کی صنعت کا کمال
خواب، اِک راہنما نے جو کبھی دیکھے تھے
خواب وہ ٹوٹ گئے!
رہنما بھی نہ رہا!
ایسا رہبر کہ جو ہر پیچ و خم رہ میں چلا
نہ غمِ کجِ سفراں تھا، نہ غمِ تنہائی
جس کا ہر لفظ تھا رہرو کے لئے بانگِ درا
ایسا راہی کہ جو منزل کا شناسائی تھا

تیشۂ فکر سے راہوں کے جگر کو چیرا
دستِ پُر عزم سے ہموار کیا جادوں کو
لاکھ طوفان تھے رستوں میں، مخالف تھی ہوا
لے کے چلتا ہی رہا خانماں برباددوں کو

خواب اک جوہرِ تاباں نے جو دیکھے تھے کبھی!
خواب وہ ٹوٹ گئے!
وہ جواہر نہ رہا!

وہ جواہر، کہ جو چمکا گیا تقدیرِ وطن
ارتقا کا جو پیامی تھا نقیبِ تہذیب
وہ جواہر، جو بہر رنگ تھا تنویرِ وطن
دی "نئے ہند" کی تاریخ اُسی نے ترتیب

جس کے سینہ پہ مہکتا ہی رہا "سُرخ گلاب"
جس کی آنکھوں سے اُبلتی رہی صہبائے اُصول
زندگی جس کی تھی مستقبلِ عالم کی کتاب
جس کے ہر صفحے پہ ہے فلسفۂ ردّ و قبول

وہ نئے ہند کا معمار، نئے دور کا خواب
اپنی تعبیر کو اِک زندہ حقیقت دے کر
بن گیا "عالمی تاریخ" میں آپ اپنا جواب
دعوتِ آشتی و امن و محبت دے کر

خواب ٹوٹے ہیں، نہ ٹوٹیں گے کبھی دیوانو!
خواب تو زُردکشِ تعبیر ہُوا کرتے ہیں
خواب جس نے تمہیں بخشے ہیں اُسے پہچانو
قصر خوابوں ہی سے تعمیر ہُوا کرتے ہیں

اُس کی تقلید کرو
اُس کی تعظیم کرو
اُس کی تائید کرو
اُس کی تکریم کرو

جس نے خوابوں کے جزیرے میں ہمیں چھوڑا ہے
اِک بڑے صبر شکن وقت پہ منہ موڑا ہے

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو، دہلی)

جون [illegible]

شاعر، بمبئی

اشفاق علی خاں ایم۔ اے

رشید وطواط پر ایک ہندوستانی تحقیق کا ایرانی ماخذ

سہ ماہی اُردو ادب علیگڈھ کے مارچ ۱۹۵۸ء کے شمارہ میں رشید الدین وطواط پر ایک مضمون ہے۔ جو تمکین کاظمی مرحوم کے نام سے شائع ہوا ہے۔ بڑا بسیط، فاضلانہ اور تحقیقی مضمون ہے۔ جگہ جگہ تحتی حاشیوں میں اہم ماخذ مثلاً تذکرۂ تقی الدین، لباب الالباب عوفی، آثار البلاد قزوینی، تاریخ جہاں کشائے جوینی، تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی معجم الادبا، یاقوت حموی، المعجم فی معاییر اشعار العجم، شمس قیس، کشاف زمخشری، کتاب الانساب سمعانی، معجم البلدان یاقوت، ابن خلکان eu, cat. of her pers. MSS II, 50 76
وغیرہ کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ مضمون ۳۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔

اِس مضمون کو دیکھ کر مضمون نگار کے مبلغ علم، وسعت مطالعہ، سلیقۂ تحقیق اور محنت و کاوش کی داد دینی پڑتی ہے جس نے بھی یہ مضمون پڑھا ہوگا۔ اس نے مضمون نگار کے علم و فضل کے متعلق بہت اچھی رائے قائم کی ہو گی۔ بلا تکلف کہا جاسکتا ہے ہمارے ہاں اُردو میں اس رسوخ علم اور کاوش تحقیق کے ساتھ مضمون بہت کم لکھے جاتے ہیں اور جیسے لکھے جاتے ہیں وہ اس مضمون سے آگے چل کر معلوم ہو جائیگا۔

یہ تو مضمون نگار کے وہ کمالات ہیں جنکا تعلق مضمون کے ظاہر سے ہے اور جنکا اعتراف اس مضمون کے ہر مطالعہ کرنے والے نے کیا ہوگا۔ لیکن مضمون نگار کے جس کمال کا ہمیں معترف ہوں وہ اِن سب سے بڑا ہے۔ اس کمال کے آگے سارے کمالات گرد ہیں۔ اِس کمال کی بلندی اُس مقام پر ہے جہاں آفتاب اتنا ہوا اونچا کہ تارا ہوگیا۔ وہ کمال مضمون کے باطن کا کمال ہے۔

میری نظر سے جب یہ مضمون گزرا تو قوتِ حافظہ کی قوتِ استحضار کو دفعتاً تحریک ہوئی جیسے کوئی جانی پہچانی چیز نام و نشان بدل کر اچانک سامنے آگئی ہو۔ میں پڑھ رہا تھا "اردو ادب" مگر یاد تازہ ہو رہی تھی۔ حدائق السحر کی مضمون اردو میں تھا مگر اس کی فارسی شکل کی عکاسی کر رہا تھا۔ قلم ہندوستان کے تمکین کاظمی کا تھا مگر نام ایران کے عباس اقبال کا یاد آرہا تھا۔ رسالہ کی فہرستِ مضامین میں مصنّف کی حیثیت مضمون نگار کی لکھی تھی۔ مگر میرے حافظہ میں مصنّف مقدمہ نگار کی حیثیت سے محفوظ تھی۔ غرض میرا یہ احساس لحظہ بہ لحظہ ترقی کرتا جارہا تھا کہ میں کتاب حدائق السحر کے مقدمہ نگار عباس اقبال ایرانی کا فارسی مقالہ اردو میں پڑھ رہا ہوں میں نے رسالہ رکھ دیا اور کتاب اٹھالی۔ دونوں کا مقابلہ کرنا شروع کیا تو بیداری میں خواب کا سا عالم تھا۔ حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ تمکین کاظمی صاحب نے عباس اقبال کا پورا مقدمہ حدائق السحر سے نقل کر لیا تھا۔

بیشک تصنیف و تالیف کی طرح ترجمہ بھی ادب کا ایک گرانقدر شعبہ ہے۔ ہر ترقی یافتہ زبان کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ اس میں وقتاً فوقتاً دوسری شائستہ زبانوں کے شاہکاروں کو ترجمہ کر کے منتقل کیا جائے۔ مگر ترجمہ تو اس ادبی کاوش کو کہتے ہیں جس میں اصل مصنّف کا نام ظاہر کر دیا جائے۔ اِس ادبی خدمت کو کیا کہتے ہیں۔ جو اِس طرح انجام دیجائے کہ کسی شخص کا مجھوا

مضمون دوسری زبان میں منتقل کر دیا جائے۔ اور ہر ممکن احتیاط کی جائے کہ پڑھنے والا اسے۔ اصل مصنف کا مضمون نہ سمجھے بلکہ منتقل کرنے والے کے دماغ کی پیداوار سمجھے ؟ یہ مضمون اسی قسم کی ادبی خدمت ہے۔

آپ اوّل سے آخر تک اس مضمون کو پڑھ جائیں۔ کہیں آپ کو اشارۃً بھی اس کا ذکر نہیں ملیگا۔ کہ یہ مضمون اصل نہیں ترجمہ ہے۔ کوئی شخص اس مضمون کو پڑھکر یہ گمان بھی نہیں کر سکتا۔ کہ یہ مضمون کاظمی صاحب کا طبعزاد نہیں ہے۔ جبتک حدایق السحر کا مطالعہ نہ کر نہ دیکھیے۔ کاظمی صاحب نے اس مضمون کے توسّل سے عباس اقبال کی دوسری تصنیفات پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ حاشیہ میں عباس اقبال نے ابن المقفع کے متعلق اپنی تالیف کا حوالہ اسطرح دیا ہے "شرح حال ابن المقفع تالیف نگارندہ" اسی موقع پر کاظمی صاحب حاشیہ میں لکھتے ہیں "تفصیل کے لئے دیکھئے راقم الحروف کا مقالہ" ابن المقفع"

مرحوم عباس اقبال آشتیانی اس صدی میں ایران کے مستند ادیبوں اور بلند پایہ نقادوں میں گذرے ہیں۔ اُنہوں نے پیرس کے نسخہ اور دوسرے نسخوں کی مدد سے رشید وطواط کی مشہور کتاب حدایق السحر کی تصحیح کر کے اسے طہران سے شائع کیا۔ انہوں نے بڑے مفید حواشی لکھ کر شامل کتاب کئے ہیں۔ اور ایک محققانہ مقدمہ رشید وطواط اور اسکی تصنیفات پر لکھ کر کتاب کے شروع میں اضافہ کیا ہے۔ یہ مقدمہ ۱۳۰۸ء کی تحریر ہے۔

لیکن کاظمی صاحب نے عباس اقبال کے اس مقدمہ کا اوّل سے آخر تک اُردو میں ترجمہ کر لیا اور اس کو اپنے طبعزاد مضمون کے طور پر زیرِ نظر رسالہ میں اپنے نام سے چھپوا دیا ہے۔ اگر کوئی شخص اصل مُصنّف کا نام ظاہر کر کے ترجمہ کرے تو اسے حق ہے وہ حرف بحرف پُورا مضمون نقل کر لے۔ اگر کوئی اپنے طبعزاد مضمون میں اقتباسات کے طور پر کسی مصنف کی بعض عبارتیں نقل کرتا ہے اور اصل مُصنّف کا نام ظاہر کر دیتا ہے تو وہ بھی حق پر ہے۔ لیکن یہ حق کسیکو کیوں کر پہنچ سکتا ہے کہ صرف زبان بدل کر دوسرے شخص کی پُوری تصنیف اُسی ترتیب' اُنہیں الفاظ' اُنہیں تحقیقات' نظریات اور خیالات کے ساتھ بالکل اُسی شکل میں جیسی اصل مُصنّف کے قلم سے نکلی تھی اپنے نام سے چھپوا دے؟ کاظمی صاحب کا مضمون تمام و کمال اور حرف بحرف عباس اقبال کے مقدمہ کی نقل ہے۔ حد یہ ہے کہ مقدمہ نگار نے جہاں جہاں اپنے خیالات کا اظہار اپنے لئے متکلم کا صیغہ استعمال کر کے کیا ہے۔ کاظمی صاحب نے بھی اُن مواقع پر ان خیالات کو بلا تکلف اپنے لئے صیغۂ متکلم اختیار کر کے ادا کیا ہے اور اپنی ذات کو مقدمہ نگار کی ذات تصوّر کر لیا ہے۔ شلاً مقدمہ نگار نے رشید وطواط کی تاریخ وفات کی تعیین میں مختلف دلائل پیش کر کے لکھا ہے کہ "ما نیز نظر بقدم عہد یاقوت و معتبر بودن او در نقل و روایت قول اُو را اختیار نمودیم" کاظمی صاحب اس عبارت کو اسطرح نقل کرتے ہیں "ہمارے نزدیک بھی یاقوت ہی کا بیان کردہ سنِ وفات درست ہے"۔ ایک اور جگہ مقدمہ نگار نے لکھا ہے "تقی الدین کاشی و دولت شاہ ۵۷۸ را تاریخ فوت او دانستہ اند و ما قول یاقوت را ترجیح دادیم" کاظمی صاحب اس عبارت کو اسطرح نقل کرتے ہیں "تقی الدین کاشی اور دولت شاہ نے ۵۷۸ھ لکھا ہے مگر ہم یاقوت ہی کے قول کو ترجیح دیتے ہیں"۔

جہاں جہاں اصل مقدمہ میں کتابوں کے حوالے بطور مآخذ دیئے گئے ہیں وہ حوالے من وعن کتابوں کے اُنہیں ناموں اور صفحات کے اُنہی شمارِ اعداد کے ساتھ جو اصل مقدمہ میں درج ہیں اس مضمون میں نقل کر دیئے گئے ہیں۔

کہیں کہیں اصل مقدمہ کے بعض الفاظ اور کہیں کہیں ایک آدھ سطر اس مضمون میں حذف کر دی گئی ہے۔ انتخاب اشعار میں بعض اشعار کم کر دیئے گئے ہیں۔ اصل مقدمہ کے متن میں اشعار جگہ جگہ آئے ہیں۔ ان کے سلسلہ کا ایک آدھ شعر مقدمہ نگار نے حاشیہ میں ضمناً دے دیا ہے۔ کاظمی صاحب نے اُسے وہاں سے ہٹا کر متن کے اشعار میں شامل کر دیا ہے۔

جہاں سے رشید کی نثر اور اسکی مُصنّفات کی تفصیل شروع ہوئی ہے اسکے کئی ورق[1] بالکل چھوڑ دیئے ہیں کہیں کہیں

---

[1] مقدمہ میں "نثر فارسی" کے زیرِ عنوان ۹ صفحوں پر رشید کے مراسلات کی فہرست مع مخطوطات کے نمبروں کی دی ہے۔ مضمون نگار نے یہ [illegible] شاعر بھی

کوئی پیرا چھوڑ دیا ہے۔ جیسے جیسے نقل کا سلسلہ بڑھتا گیا ہے بعض بعض مقامات قلم انداز کرتے گئے ہیں مگر مضمون کی ترتیب اور عبارتیں ہر جگہ وہی رہی ہیں جو اصل مقدمہ میں ہیں۔ ان محذوفات کے سوا سارے مقدمہ کا ترجمہ کر دیا ہے۔ اسطرح یہ مضمون اصل مقدمہ سے کسی قدر مختصر ہو گیا ہے۔ اس اختصار کے سوا کوئی فرق اصل و نقل میں نہیں ہے۔ یہ اختصار بھی اسی قسم کا ہے جیسے کوئی نقل کرنے والا جب تھک جاتا ہے یا جہاں جہاں اصل کا مفہوم اچھی طرح اسکی سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ تو بعض عبارتوں کو قلم زد کر دیتا ہے۔

کاظمی صاحب نے سارے مضمون میں کوئی ایک بات بھی اپنی طرف سے اضافہ نہیں کی ہے۔ نہ کوئی بات مقدمہ کے سوا کسی اور ماخذ سے لکھی ہے۔ صرف چند جگہ آپ کو جزوی اضافے ملیں گے جو یا محض رسمی اور لفظی ہیں یا اصل مقدمہ ہی سے مستنبط ہوتے ہیں یا ایسے ہیں کہ پڑھنے والے کے ذہن کو مضمون کے اصل ماخذ اور مصنف کی طرف سے روکنے میں ممد ہوں اور وہ ان کے توسّل سے پورے مضمون کو کاظمی صاحب کا ادبی کارنامہ سمجھنے کے فریب میں مبتلا رہے۔ وہ اضافہ یہ ہیں۔

جہاں سے رشید کی نظم کی بحث ختم ہوئی ہے اور مقدمہ نگار نے اسکی نثر کی طرف رجوع کیا ہے وہاں نثر کی تنقید کے آغاز سے پہلے یہ سطر اضافہ کر دی ہے؛

"اب تک آپ نے رشید کی نظم کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اب ذرا رشید کی نثر کے متعلق بھی سُن لیجیے"۔

رشید نے ایک قصیدہ میں صدر الائمہ سے خطاب کیا ہے۔ مقدمہ نگار نے وہ قصیدہ نقل کیا ہے اور اس شعر پر اسے ختم کیا ہے۔

حسّاں کجاست تا کہ در آموزمش سخن　　　　در دوزباں مدائحِ اوصافِ خانداں

خانداں پر نشان دے کر حاشیہ میں نوٹ لکھا ہے "مقصودِ خاندانِ نبی است کہ ایں صدر موضوعِ قصیدہ نیز از آں دودماں بودہ چنانکہ در ابتداءِ قصیدہ میگوید:

از آلِ وددمانِ نبی دو صی توئی　　　　وندر جہاں ـــ کراست چنیں آل و دودماں"

کاظمی صاحب بھی اسی "خانداں" والے شعر پر قصیدہ ختم کرتے ہیں اور اس کے فوراً بعد متن میں ہی حاشیہ کی متذکرہ عبارت کا ترجمہ اور حاشیہ کا متذکرہ شعر نقل کر دیتے ہیں۔ اور اسی تسلسل میں حاشیہ کے شعر کی نسبت اتنا اضافہ اپنی طرف سے فرماتے ہیں:۔

"اس شعر سے رشید کے مذہب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وصی اشارہ ہے جناب امیر کی طرف اور یہ اُن کی تفضیلیت پر دال ہے"۔

مقدمہ نگار نے رشید اور خاقانی کی اولاً دوستی پھر مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "مناسبات نیکی کہ ابتداءً بین ایں دو شاعر استاد وجود داشتہ گویا زیاد دوام نکردہ"۔ اس کا ترجمہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ اُن دو استاد شاعروں کے درمیان جو رابطۂ محبت ابتدا میں تھا وہ زیادہ دنوں قائم نہ رہ سکا۔ کاظمی صاحب نے اپنا ایک خود ساختہ نظریہ علماء نفسیات سے منسوب کر کے اس عبارت کا ترجمہ اسطرح کیا ہے۔

"علمائے نفسیات نے یہ کلیہ بالکل صحیح بنایا ہے کہ جو دوستی بہت ہی جلد قائم ہوتی ہے وہ ٹوٹ بھی جلد جاتی ہے۔ چنانچہ ان دونوں کی دوستی کا بھی ایسا ہی حال ہوا۔ بڑی شورہ شوری سے شروع ہوئی اور بڑی ہی بے نکی سے ختم ہوئی"

اتنی عبارت کو خواہ اضافہ کہیئے خواہ آزاد ترجمہ خواہ اضافہ اور آزاد ترجمہ دونوں لفاظیٔ محض!

اسی تسلسل میں مقدمہ نگار لکھتا ہے "زیرا کہ ہم رشید تیز زبان و بکلام خود مغرور بودہ وہم خاقانی خویشتن را سخن سرائے بلند مقام و حسّان عجم می دانستہ و دیگراں را ریزہ خوانِ شعر خود می پنداشتہ است" یہاں پر نشان دے کر حاشیہ میں لکھتا ہے "خود گوید

صفحے چھوڑ دیئے ہیں۔ اس فہرست میں سے مراسلات کے چند مخاطبوں کے نام ۵ سطروں میں دیدئے ہیں۔ "تالیفات و طواط" کے زیر عنوان ۵ صفحے ہیں وہ سب اڑا دیئے ہیں۔ "کتاب حدائق السحر" کا ایک عنوان مقدمہ نگار نے قائم کر کے اس کے تحت کتاب کے موضوع علم بدیع اور مصنفاتِ علم بدیع سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ رشید نے حدائق میں کن کن شاعروں کے اشعار بطور شواہد پیش کئے ہیں اور کن کن مواقع پر مضمون نگار نے یہ سب بحثیں حذف کر دی ہیں۔

شاعر مغلق منم خوان معانی مراست ریزہ خور خوانِ من عنصری و رودکی"

کاظمی صاحب اپنے متذکرہ ترجمہ کے تسلسل میں ہی متن کی عبارت کا ترجمہ اسطرح کرتے ہیں "رشید جتنا تیز زبان مغرور اور متکبر تھا خاقانی اس سے بھی زیادہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو نہ صرف بلند پایہ سمجھتا تھا بلکہ حسان مجسم تصور کرتا۔ اور دوسروں کو ریزہ خور خوانِ شعر خود کہتا تھا۔" اس کے بعد اسی تسلسل میں آدھی سطر کی عبارت بڑھا کر حاشیہ کا متذکرہ شعر جسمیں عنصری و رودکی کو ریزہ خور کہا ہے۔ متن میں لکھدیا ہے وہ اضافہ ہوئی عبارت یہ ہے۔

"ظاہر ہے دو تلواریں ایک میان میں کسطرح رہ سکیں، نتیجۂ مخالفت تھا، خاقانی کا یہ شعر مشہور ہے۔"

مضمون کے ختم کے قریب مقدمہ نگار نے "طبعاتِ حدائق السحر" کا عنوان قائم کیا ہے۔ اسکے ذیل اسکے پانچوں نسخوں کا ذکر کیا ہے جو مختلف مطابع سے طبع و نشر ہوئے ہیں۔ کاظمی صاحب ان پانچوں نسخوں کی تفصیلات بعینہٖ نقل کر کے درج ذیل اضافہ فرماتے ہیں۔

"ایک نسخہ ہندوستان کے کسی لیتھو مطبع کا رائل سائز پر چھپا ہوا مدتوں میرے پاس بھی رہا ہے۔ جو مجھ سے ابو الاعلیٰ مودودی نے اپنے قیام حیدرآباد کے زمانے میں لیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ انہوں نے واپس نہیں کیا۔ معلوم نہیں اب ان کے پاس ہے یا ضائع ہو گیا۔ اس کا سن طباعت اور پریس دونوں مجھے یاد نہیں۔ مگر کانپور یا لکھنؤ دونوں میں سے کسی ایک مقام کا چھپا ہوا تھا اور اس کا مقابلہ ناشر مرحوم نے ایک قلمی نسخہ سے کر کے غلطیاں درست کی تھیں۔ مگر باوجود اسکے اس میں جگہ جگہ عبارت بے ربط تھی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ جس قلمی نسخہ سے مرحوم نے مقابلہ کیا تھا وہ بھی صحیح نہ تھا۔ اس لئے پوری صحت نہ ہو سکی تھی۔"

اس کے بعد تو مضمون ختم کرتے کرتے غضب ہی کر دیا ہے۔ مقدمہ نگار کا آخری عنوان ہے: "نسخۂ خطی کتاب خانۂ ملی پاریس" اس کے تحت مقدمہ نگار نے اِس نسخہ کی تفصیلات دی ہیں اور لکھا ہے کہ اُس نے حدائق السحر کی طباعت میں اِس نسخہ کو مبنیٰ بنایا ہے کاظمی صاحب نے ان تفصیلات کا ترجمہ بطور خلاصہ اسطرح کیا ہے: "کتاب خانۂ ملی پریس میں ایک چھوٹا سا مجموعہ بیاض کی شکل میں محفوظ ہے جو ۔۔ شعبان سنہ ۶۶ھ کا مکتوب ہے ۔ ۔ ۔ ۔ پورا مخطوطہ معرب منقح اور بہت ہی صحیح ہے۔ صرف خرابی یہ ہے کہ درمیان کے دو ورق غائب ہیں"۔ یہ لکھکر اپنی طرف سے ایک جملہ اِس پر غضب کا بڑھایا ہے۔ وہ یہ ہے۔

"اِس مخطوطہ کو مرزا عباس اقبال آشتیانی نے ایک بسیط مقدمہ کے ساتھ طہران سے شائع کیا ہے۔ گویا کاظمی صاحب کا خود یہ مضمون عباس اقبال کے اِس مقدمہ کے سوا کچھ اور ہے؟ عباس اقبال ہی کا سارا مقدمہ نقل کر گئے ہیں اور اسی کے اس مقدمہ کا یہاں پر ذکر کر کے اپنی تحقیق کا مزید اظہار فرما رہے ہیں۔ اِس جملہ کے سوا اور کہیں عباس اقبال کا نام نہیں آیا۔ اس جملہ سے اس مضمون کے پڑھنے والوں کے ذہنوں میں یہ نقش اور گہرا کرنا ہے کہ اِس مضمون کی ساری تفصیلات اور اُس کا ہر ہر حرف مضمون نگار (کاظمی صاحب) کا طبعزاد اور اس کی ذاتی تحقیق کا نتیجہ ہے اور اسطرح یہ آخری حقیقت کہ عباس اقبال نے بھی "حدائق السحر" پر ایک مقدمہ لکھا ہے۔ اسکی ذاتی معلومات کا جزو ہے۔ پورے مضمون میں پڑھنے والوں پر یہ اثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مضمون طبعزاد ہے یہ جملہ لکھ کر اِس تاثر کو آخری حد تک مکمل کیا گیا ہے۔

عباس اقبال نے اپنا مقدمہ اس پر ختم کیا ہے کہ حدائق السحر میں فارسی کے بعض فصیح الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کی جگہ پر اب غیر فارسی الفاظ مستعمل ہیں۔ عباس اقبال کی اصل عبارت یہ ہے "حدائق السحر" با وجود کوچکی حجم دارائے بعضے خصائص لغوی و صرف و نحوی و اصطلاحاتی ست کہ در آن شاء، آں اعصار معمول و مرعی بودہ و لے حالیہ متروک شدہ است (اسکے بعد قریب دو صفحے چھوڑ کر عبارت یہ ہے:) علاوہ در حدائق السحر بعضے اصطلاحات فارسی در ترجمۂ کلمات عربیہ است کہ از فصیح ترین لغات قدیمہ فارسی ست و حالیہ فراموش و بجائے آنہا کلمات عربی یا کلمات دیگرے معمول شدہ است مثل نموذار بمعنی نمونہ، بازپسین بمعنی آخری پیشین بمعنی قبل، باشگونہ = واژگونہ بمعنی مقلوب و معکوس، آخشیج بمعنی ضد، دور دیہ بمعنی موجہ

برسنہ یعنی شاخ، درازنا یعنی طول، پہنا یعنی عرض، چہارسو یعنی مربع، پارہ پارہ یعنی منقطع، پیوستہ یعنی موصل، بخشش یعنی تقسیم وغیرہ" یہاں پر عباس اقبال کا مقدمہ ختم ہوگیا ہے۔

کاظمی صاحب کا مضمون بھی اصل میں اسی عبارت کے ترجمے پر ختم ہوگیا ہے۔ انہوں نے ان دونوں عبارتوں کا علی الاتصال ترجمہ کردیا ہے۔ اور ترجمہ بعینہٖ قائم رکھتے ہوئے جزوی کچھ کچھ اضافہ اپنی طرف سے کئے ہیں۔ ان عبارتوں کا ترجمہ کاظمی صاحب نے یہ کیا ہے۔ (اس ترجمہ میں جو الفاظ اصل عبارت پر بڑھائے گئے ہیں۔ ان کے نیچے میں نے خط کھینچ دیئے ہیں۔

"حدائق السحر" باوجود مختصر یعنی چالیس پینتالیس صفحات کی کتاب ہونے کے صرف ونحو اور لغت پر ایک بہترین تصنیف ہے۔ ان میں بیشتر ایسی اصطلاحات نظر آتی ہیں جو عربی کا ترجمہ اور قدیم فارسی کا بہترین نمونہ ہیں۔ یہ اصطلاحات ایران جدید سے بلا دپی مگر ہندوستان اور دکن میں بجنسہٖ رائج اور مستعمل ہیں[1]۔ مثلاً نمودار یعنی نمونہ، بازپس یعنی آخری، پیش یعنی قبل، باشگونہ و واژگونہ یعنی مغلوب ومعکوس، آخشیج یعنی ضد، دورویہ یعنی موجہ، برسنہ یعنی شاخ، درازنا یعنی طول، پہنا یعنی عرض، چہارسو یعنی مربع، پارہ پارہ یعنی منقطع، پیوستہ یعنی موصل، بخشش یعنی تقسیم وغیرہ"

اس کے بعد اتنی عبارت مزید لکھ کر مضمون ختم کیا ہے۔

"آجتک بازپس، پیشیں، واژگونہ، آخشیج، پہنا، چہارسو، پارہ پارہ، پیوستہ، بخشش ہندوستان اور دکن میں عام اور مستعمل ہیں۔ اور انہیں معنوں میں استعمال ہو رہے ہیں جن معنوں میں کہ رشید نے سات سو سال پہلے استعمال کیا تھا۔ اس میں بعض الفاظ ایسے ہیں جنہیں اب ہم غیر فارسی سمجھ کر بولتے ہیں مثلاً پہنا، بمعنی عرض عام طور پر ہندی یا اُردو سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ کپڑے کا پہنا جسے عام طور پر پنا کہتے ہیں۔ بیشتر لوگوں کی دانست میں ہندی یا اردو لفظ ہے[2]۔ عباس اقبال نے پانچواں پیراگراف کی تفصیل اور حوالۂ استناد کے لئے حاشیہ میں یہ عبارت لکھی ہے۔

"محمد بن محمد بن عبد الجلیل بن عبد الملک بن محمد بن عبد اللہ بن عبد الرحمان بن محمد بن یحییٰ بن مردویہ بن سالم بن عبد اللہ بن عمر بن الخطاب (معجم الادبا یاقوت ص ۹۱ ج ۷)" بالکل یہی عبارت حرف بحرف کاظمی صاحب نے اپنے پیراگراف کے متعلق حاشیہ میں لکھی ہے۔

اس کے بعد آخر تک کاظمی صاحب اپنا مضمون ——— متذکرہ محذوفات و تصرفات کے سوا جنکی کوئی حقیقت نہیں اور جو نہ

---

[1] و [2] ان الفاظ میں بازپس، پیشیں، دورویہ، پہنا، پارہ پارہ، پیوستہ کے سوا باقی الفاظ کی نسبت کاظمی صاحب یہ دعویٰ غلط ہے کہ وہ ہمارے ہاں بجنسہٖ رائج اور مستعمل ہیں۔ نمودار ہمارے ہاں نمونہ کے معنی میں مستعمل نہیں ہے ظاہر ہونے کے معنی میں مستعمل ہے وطواط کا مستعملہ لفظ باشگونہ ہے واژگونہ نہیں ہے۔ اسلئے واژگونہ کی نسبت کاظمی صاحب کا یہ کہنا کہ وہ مستعمل ہے بحث سے غیر متعلق نیز واژگونہ بھی ہمارے ہاں مستعمل نہیں ہے اسکی شکل واژگوں اور واژوں ہمارے ہاں مستعمل ہے مگر فارسی ترکیب کے ساتھ خلافاً فلک واژگوں، بخت واژوں۔ باشگونہ، آخشیج، برسنہ، درازنا، ہمارے ہاں قطعاً مستعمل نہیں ہیں۔ درازنا کے معنی جو درازی مستعمل ہے۔ چہارسو مستعمل ہے۔ مگر جس معنی میں وطواط نے استعمال کیا ہے۔ اس معنی میں نہیں۔ ہمارے ہاں اس معنی صرف چہار جانب کے ہیں۔ بخشش ہمارے ہاں انعام اور مغفرت کے معنوں میں مستعمل ہے۔ تقسیم کے معنی میں پہنا ہمارے ہاں مستعمل ہے مگر بغیر فارسی ترکیب کے نہیں۔ اس کا اسم کیفیت پہنائی ترکیب کے ساتھ اور ترکیب کے دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ کاظمی صاحب نے کپڑے کے عرض کے لئے مستعملہ لفظ پہنا (بالفتح) اسے فارسی و تشدید نون بتایا ہے۔ یہ بھی غلط ہے۔ مستعملہ لفظ پنا نہیں بلکہ پنہاں (بالفتح) بلکہ فارسی ونون باہائے مخلوط ہے۔ یہ عورتوں کی زبان ہے یہ میرے نزدیک پہنا ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

صفحے کے بجائے ہیں ـــــ اسی طرح اصل مقدمہ سے مع حاشیوں کے نقل کرتے چلے گئے ہیں۔ اس حقیقت کی مزید توضیح کے لئے ہر پیراگراف کا مقابلہ اصل سے کرنا بھی بے کار سمجھتا ہوں۔ ایسا کرنے سے خواہ مخواہ ایک دفتر تیار ہو جائیگا جبکہ ہر شخص کو میرے بیان میں شک ہو وہ خود دونوں صفحات سامنے رکھ کر حرف بہ حرف مقابلہ کر لے۔ اس پر خود حقیقت آشکارا ہو جائیگی۔ کسی چیز کا کسی چیز کی نقل ہونا ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ دونوں کا مقابلہ کر لینا کافی ہے۔

بہر حال یہ تو واقعہ ہے کہ یہ مضمون حدائق السحر کے مقدمہ کی اردو نقل ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ مضمون نگار صاحب مقدمہ نگار کی زبان کہاں تک سمجھے ہیں۔ اور ترجمہ میں زباندانی کا کہاں تک حق ادا کیا ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف دو موٹی موٹی مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

عباس اقبال حدائق السحر کے زمانۂ تالیف کی نسبت لکھتے ہیں "حدائق السحر را رشید معلوم نیست بنام کیے از خوارزمشاہیان کہ در خدمت ایشان بودہ تالیف کردہ ولے از قرائن معلوم میشود کہ انشاء کتاب مزبور در عہد ایل ارسلان (۵۵۱ — ۵۶۸) پسر و جانشین اتسز شدہ است زیرا کہ رشید صریحاً در مقدمہ حدائق السحر اتسز را نور اللہ مضجعہ دعا میکند و میگوید: در ایام دولت او عقود فضل منتظم بودہ و بنائے جہل منہدم، ازیں طرز بیان یقین میشود کہ اگرچہ نسخۂ ترجمان البلاغت را اتسز برشید نشان دادہ ولے تالیف حدائق السحر بعبارۃ منہ آں لااقل بعد از فوت اتسز انجام پزیرفتہ است"

کاظمی صاحب نے اس کا اردو ترجمہ یہ کیا ہے: "یہ نہ معلوم ہو سکا کہ رشید نے خوارزمشاہیوں میں سے کس سلطان کے نام لکھی ہے اور یہ کس سلطان کے زمانہ میں لکھی گئی۔ البتہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی ترتیب ایل ارسلان کے زمانہ ۵۵۱-۵۶۸ میں ہوئی ہے کیونکہ مقدمۂ کتاب میں رشید نے اتسز کو نور اللہ مضجعہ لکھا ہے۔ اور اس کے عہد کے متعلق لکھا ہے کہ در ایام دولت او عقود فضل منتظم بودہ و بنائے جہل منہدم۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رشید نے اس کتاب کی تکمیل اتسز کے بعد ہی کی ہے۔ اگرچہ کتاب ترجمان البلاغت اتسز کے حکم و اشارے سے لکھی گئی ہے۔ مگر حدائق السحر اتسز کے انتقال کے بعد ختم ہوئی ہے"

کاظمی صاحب کے خط کشیدہ الفاظ ترجمہ ہیں۔ عباس اقبال کے مذکور الصدر اقتباس کے ان الفاظ کا "اگرچہ نسخۂ ترجمان البلاغت را اتسز برشید نشان دادہ" ان الفاظ کا صحیح ترجمہ یہ ہوا کہ "اگرچہ کتاب ترجمان البلاغت اتسز نے رشید کو دکھائی تھی" اور واقعہ بھی یہی ہے۔ رشید وطواط نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "روزے من بندہ را خداوند ملک عادل خوارزم شاہ اتسز نور اللہ مضجعہ کہ در ایام دولت او عقود فضل منتظم بود و بنائے جہل منہدم طلب فرمود بر موجب مثال نشافتم وسعادتِ خدمت او دریافتم کتابے در معرفت بدائع شعر پارسی کہ آنرا ترجمان البلاغت خوانند بمن نمود"

کاظمی صاحب نے عباس اقبال کے متذکرہ الفاظ کا غلط ترجمہ کرکے ترجمان البلاغت کا زمانۂ تصنیف اتسز کے زمانہ سے ملا دیا ہے جو بطور واقعہ بالکل غلط ہے۔ ترجمان البلاغت اس سے بہت پہلے کی ہے۔

مقدمہ نگار نے آخر میں حدائق السحر کی اس خصوصیت کا بھی ضمناً ذکر کیا ہے کہ اس میں بعض ایسے فارسی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو اس زمانہ کے فصیح ترین الفاظ تھے مگر اب متروک ہو گئے ہیں۔ یہ لکھکر ایسے بارہ چودہ الفاظ نقل کئے ہیں۔ اس مفہوم کا مفصل اقتباس اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔ اس کا ابتدائی جملہ یہ ہے "حدائق السحر با وجود کوچکیٔ حجم دارائے بعضی خصائص لغوی و صرف و نحوی و اصطلاحات ست" ان الفاظ کا ترجمہ جیسا ذکر ہو چکا کاظمی صاحب نے فرمایا ہے "حدائق السحر باوجود مختصر (یعنی چالیس پینتالیس صفحات کی) کتاب ہونے کے صرف و نحو اور لغت پر ایک بہترین تصنیف ہے" مقدمہ نگار کا یہ مطلب کہاں تھا؟ یہ ترجمہ کرکے کاظمی صاحب نے کتاب کی قلب ماہیت ہی کر دی! حدائق السحر خالصتاً علم بدیع کی کتاب ہے اسے صرف و نحو اور لغت سے نام کا بھی واسطہ نہیں مگر اس کو کیا کہا جائے کہ کاظمی صاحب کی تحقیق یہی ہے

وہ اُسے صرف دخو اور لعنت پر بڑی تصنیف سمجھتے ہیں۔ اس رائے کی وطواط کو خبر ہوتی تو جانے غریب پر کیا گذرتی۔ عباس اقبال کے مقدمہ کی تو زبان ہی بدلی، وطواط کی کتاب کا تو کاظمی صاحب نے موضوع ہی بدل دیا۔

معلوم ہوتا ہے کاظمی صاحب نے حدائق السحر پڑھی نہیں۔ والد مرحوم والے نسخہ کی حکایت میں بھی زیب داستان کا حصّہ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اسے دیکھا تو کیا ہوگا ہوش سنبھالتے ہی اس کے ضائع ہونے کی خبر سنی ہوگی۔ اگر تو ارثاً ہاتھ آیا بھی ہوگا تو اس کو کھول کر دیکھنے کی کبھی ضرورت نہیں سمجھی۔ یہاں تک کہ دوسرے صاحب کے ہاتھ لگ گیا۔ اگر ہم یہ نہ مانیں تو کیا مانیں؟ بڑے سے بڑا واقعہ اس ترجمہ کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ ترجمہ کا مطلب اسکے سوا کچھ نہیں کہ کاظمی صاحب کے نزدیک کتاب کا موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ ان دونوں مقدمات کو ترتیب دیجئے تو منطقی نتیجہ اسکے سوا اور کچھ نہیں نکلتا کہ کاظمی صاحب نے یہ کتاب کبھی نہیں پڑھی۔ کیوں یہ نتیجہ صحیح نہ سمجھا جائے؟ اور جب یہ نتیجہ صحیح ہے تو جو واقعہ اُسکے خلاف ہو اُسے کیونکر صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ اس نتیجہ کے پیش نظر والد مرحوم کے نسخہ سے عباس اقبال کے نسخہ تک کوئی ایک نسخہ بھی مشرف بہ مطالعہ نہیں ہوا۔

عباس اقبال کی مرتبہ حدائق السحر کاظمی صاحب کو ضرور ملی۔ مگر اصل کتاب انہوں نے پھر بھی نہیں پڑھی۔ صرف اس کا مقدمہ (عباس اقبال کا لکھا ہوا) پڑھا۔ وہ بھی اسطرح کہ اسکا مطالعہ شروع کرتے ہی خیال آیا کہ مال اچھا ہے۔ ایران میں اس کا منبع کون تلاش کرتا پھریگا۔ کیوں نہ اردو کا قلم لگا کر اسے اپنے قلمرو میں داخل کیا جائے، کیوں نہ اپنے نام کی چھاپ دیکر اسے اپنی ملک قرار دیا جائے؟ یہ خیال آنے کے ساتھ ہی نقل و ترجمہ کا کام شروع کر دیا۔ جہاں سے موضوع کتاب کی بحث شروع ہوتی تھی۔ وہاں پہنچتے پہنچتے تھک چکے ہوں گے۔ آنکھ بند کر کے چھوڑ دیا اور آگے بڑھ گئے۔

ظاہر ہے ایسی ادبی، کارگذاریاں ادب کی خدمت نہیں بلکہ جس زبان میں وہ پیش کی جائیں۔ اس زبان کے ادب اور اہلِ ادب کے دامن پر نہایت بدنما داغ ہیں۔ یہ ادب میں اضافہ نہیں بلکہ اسکے افلاس کا اعلان ہیں۔ دوسری زبانوں کے ادیب اگر ہماری اسطرح کی نقل و حرکت اور نشر و اشاعت سے واقف ہوں تو وہ ہمارے متعلق کیا خیال کریں گے؟ ایرانیوں کو اگر یہ معلوم ہو کہ ہندوستان کے اہلِ قلم ان کے کام سے اپنا نام چمکاتے ہیں اور ان کی تصنیفات کو اپنی ملک بتاتے ہیں تو ہماری عقل و دانش، علم و فضل اور اخلاق و دیانت کے متعلق ان کی رائے کیا ہوگی۔ اسطرح کے ادبی کارنامے خالص مالِ مسروقہ ہیں۔ جسکا کاروبار معلوم نہیں کہاں کہاں ہوتا ہوگا۔ مگر کس کو اتنی فرصت کہ اسکا سراغ لگائے۔ اگر اس کاروبار کی تحقیقات کے لئے کوئی کمیشن بیٹھے اور روزمرہ کی اشاعتوں پر ادبی جاسوسوں کی ڈاک بٹھائی جائے تو بڑے بڑے انکشافات ہوں!

از سید رضا قاسم مختار
سیاح ممالکِ اسلامیہ

خطِ تقدیر

حقیقتیں ہم سُنا رہے ہیں فسانہ و داستاں نہیں ہے
یقین کے ساتھ کہہ رہے ہیں قیاس و وہم و گماں نہیں ہے

مولوی کریم الدین مرحوم جو کہ اپنی "کریم اللغات" کی بنا پر ختلقین کے حلقے میں اور تذکرۂ "طبقات الشعراء" کی بنیاد پر مضوصین میں مشہور ہیں۔ دراصل پانی پت کے رہنے والے تھے۔ لیکن دہلوی کہلاتے ہیں۔

اُن کی ساری زندگی تصنیف و تالیف اور تعلیم و تعلّم میں گذری اور اُن کی تصانیف کی تعداد بھی کم نہیں ہے تعلیم نسواں سے لے کر تذکرۂ شعراء تک کو اُنہوں نے اپنا موضوع قلم بنایا ہے اور چونکہ ان کی ہر تصنیف پر ابتداء سے انتہا تک مُدرسانہ رنگ چھایا ہوا ہے اس لئے زبان و ادب کے اوّل درجے کے معماروں میں ان کا شمار نہیں ہو سکا۔ لیکن انہوں نے ایک ایسی تصنیف بھی یادگار چھوڑی ہے جسکو بجا طور پر اردو زبان میں جدید طرز کی قصّہ نگاری کا نقشِ اولین کہا جا سکتا ہے۔

اُردو زبان میں قصّہ نگاری کے فن نے داستان سے ناول تک ارتقاء کی جتنی منزلیں طے کی ہیں اُن کو پیش نظر رکھتے ہوئے عام طور پر ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی تصنیف "مراۃ العروس" وہ پہلی کتاب کہی جا سکتی ہے جو کہ بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیتی ہے اور روایتی قصّہ نگاری کے خلاف صدائے احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے لیکن "مراۃ العروس" کی اشاعت سے سات سال قبل سنہ ۱۸۶۲ء میں لاہور سے مولوی کریم الدین مرحوم کی کتاب "خطِ تقدیر" شائع ہو چکی تھی۔ جسکا ذکر مشہور مستشرق گارسان دتاسی[1] نے اپنے خطبہ میں اس طرح کیا ہے کہ

> "حال ہی میں جن مصنّفین کی نئی مطبوعات شائع ہوئی ہیں۔ اُن میں مولوی کریم الدین کا نام سب سے پہلے قابلِ ذکر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ سب اُن کے نام سے واقف ہونگے موصوف نے اِس سال چھ[2] تصانیف کی ہیں۔ اور اُن کی ایک کتاب لاہور سے نکلی ہے جس کا نام "خطِ تقدیر" ہے۔ یہ کتاب اخلاق پر ہے اور گرچہ نثر میں ہے لیکن اسمیں بھی جابجا اشعار ہیں۔
> (ملاحظہ ہو خطبہ نمبر ۱۳ سنہ ۱۸۶۳ء مورخہ ۱۰ دسمبر خطبات شائع کردہ انجمن ترقی اردو)

---

[1] - یہ ایک فرانسیسی عالم تھا جسے اُردو زبان سے حقیقی عشق تھا اور اپنے وطن پیرس میں بیٹھے ہوئے اُردو کی رفتار و ترقی کا مطالعہ کرتا رہتا تھا اور ہندوستان میں مقیم اپنے انگریز دوستوں سے معلومات حاصل کرتا رہتا تھا اور ہر سال کے آخر میں پیرس یونیورسٹی میں اُردو کی سال بہ سال ترقی پر لکچر دیتا تھا۔ چنانچہ اس کے انیس[19] لکچر سنہ ۱۸۵۰ء سے سنہ ۱۸۶۹ء تک کے ہیں جو کہ انجمن ترقی اُردو نے ترجمہ کر کے چھاپ دیئے ہیں، اِن لکچروں میں اُردو زبان کے ادب، شاعری، مصنّفین، شعراء، اور اخبارات وغیرہ سب کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے اُردو کی کئی کتابوں کو اپنی ادارت میں چھپوایا اور ترجمے بھی کئے ہیں، چنانچہ اس کی تصانیف میں ایک "اُردو زبان کی تاریخ" بھی ہے نیز اُردو کے متعلق اس کی تصانیف کی تعداد بہت ہے اُن میں اس کا مرتب کیا ہوا وہ تذکرہ نہایت اہم ہے۔ جس میں تین ہزار اُردو شعراء اور مصنّفین کا ذکر ملتا ہے ۔۔۔ (رضا قاسم)

چنانچہ مولوی کریم الدین مرحوم کی تصنیف "خطِ تقدیر" کے تعارف کے سلسلے میں "گارساں دتاسی" نے جو کچھ لکھا ہے وہ بلاشک حقیقت پر مبنی ہے مگر اُس نے یہ ذکر نظر انداز کر دیا ہے کہ اِس کتاب کا تعلق قِصّہ نگاری سے ہے۔ لیکن خود مولوی کریم الدین مرحوم نے اپنی اس کتاب "خطِ تقدیر" کا جو دیباچہ لکھا ہے اور جو کہ بذاتِ خود افسانوی ادب پر تنقید کے سلسلے میں بڑا اہم ہے۔ مگر اس پر بھی دتاسی نے کوئی تعرض نہیں کیا ہے۔ بنا بریں ذیل کی سطروں میں "خطِ تقدیر" کے دیباچے کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ جس سے ناظرین کو مولوی کریم الدین مرحوم کی اس کتاب کی نیز اُن کے نظریہ کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے گا چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

"مدت سے یہ آہنگ تھی کہ تقدیر و تدبیر کا مضمون بطور قِصّہ لکھا جاوے۔ بشرطیکہ مخالف کسی مذہب کے اور خلاف رائے اہلِ فلسفہ کے بھی نہ ہو اور جو باتیں اس میں درج ہوں وہ اخلاق و اطوار اور تجربات انسانی کے ایسی طرح کے ہوں جن کا اثر طبع انسانی پر ہو کر بہتر نتیجہ پیدا کریں۔ اور کہانی ایسے طور پر ہو کہ جو شخص پڑھے یا سُنے اُس کو خیال ہو کہ یہ قِصّہ میرے حسبِ حال لکھا گیا ہے اور زبان اس قِصّے کی اُردو خالص اور سلیس اور محاورات دلچسپ بعد مرتہ ٹھیک اشعار حسب موقع قابل یاد رکھنے کے ہوں تاکہ اس زمانے کے طلبا کو شوق نئی تصنیف کرنے اور مضامین حقیقیہ لکھنے کی ترغیب ہو مگر ایشیائی قِصّوں کی روِش اور طور چھوڑ کر نئی چال چلنا بہتر ہے اور اس کی ضرورت اس واسطے دامن گیر ہوئی کہ سات سَو برس سے عربی اور ترکی میں اور ایک سَو برس سے عربی اور ترکی میں اور ایک سو برس سے ہندی یا اُردو میں قِصّہ نویسی کا جو شوق لوگوں میں پیدا ہوا تو اُس دن سے آج تک یہ دستور رہا ہے کہ ان مصنّفوں نے بادشاہوں یا تاجروں یا فقیروں کی کہانیاں لکھی ہیں اور کوئی قِصّہ مضامین عشقیہ اور محاورات واجب التعزیر سے خالی نہیں ہے اور جس راہ پر اوّل مُصنّف چلا تھا وہی ڈگر آج تک جاری ہے اور کسی نے دوسری روش اختیار کرنے کا خیال نہیں کیا۔ اور متقدمین اس امر میں یعنی قصہ نویسی کی غرض و غایت سمجھنے میں معذور ہیں۔ کیوں کہ ان کو اس کا تجربہ حاصل نہ تھا اور اس قاعدے سے عموماً مُصنّفینِ قصصِ ایشیا ناواقف محض تھے۔ اگر واقف ہوتے تو اس طور پر نہ چلتے۔ مگر اب اس زمانے میں خوب طرح کُھل گیا۔ اور ثابت ہو گیا کہ یہ عام طور تصنیفِ سابق کا اچھا نہ تھا اِس لئے بندہ نے وہ عام طور چھوڑ کر نئے طور سے یہ قِصّہ لکھا اور کوئی لفظ بیہودہ اس میں نہ آنے دیا۔ تاکہ عورتیں اور مرد دونوں اس کتاب کو پڑھ کر حَظ اٹھائیں اور عشق کے پیرایہ میں اس لئے لکھا کہ بدون چاشنی عشق کے کوئی کہانی ایسی مزیدار نہیں ہو سکتی کہ باشندے ایشیا کے اِس پر متوجہ ہوں۔ اگرچہ میں یہ عرض نہیں کر سکتا کہ جس طرز پر میں نے یہ قِصّہ لکھا ہے۔ یہی طور سب سے اچھا ہے۔ شاید کوئی اور طرز جاذبِ طبع اور منتج حسنات کسی اور شخص کے ذہن پر ہویدا ہو جائے۔ پر میری طبیعت نے جو طرز حسبِ حال اِس زمانے کی پسند کی ہے اور جس طور پر یہ قِصّہ مجھ کو لکھنا پسند آیا وہ یہی طرز ہے۔ جو اس میں برتی گئی ہے۔ لِلّٰہ الحمد کہ یہ منصوبہ درمیان سنہ ۱۸۶۲ء کے مقام لاہور میں بن پڑا اور اس کے فروغِ شان کے واسطے عقل نے یہ رہبری کی کہ بخدمت جناب کپتان فولر صاحب ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن مدارس ممالک پنجاب بطور نذر پیش کروں چنانچہ

ایسا ہی ہوا کہ بعد ملاحظہ اور سماعت کے یہ قصہ منظور فرما کر معزز بندے کے اقران و اتراب میں فرمایا۔"

غرض کہ مولوی کریم الدین مرحوم نے اپنی اِس تصنیف کے دیباچے میں جس شدّت سے روایتی قصہ نگاری کی مخالفت کی ہے اور نئے طرز کی قصہ گوئی کو رواج دینے کے لئے جس عزم کا اظہار کیا ہے اس پر یہاں اس مختصر سے مضمون میں کوئی تبصرہ مقصود نہیں ہے۔ بلکہ کہنا صرف اسی قدر ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم نے محض اپنے ماحول کو پیش نظر رکھ کر نئے طرز کا قصہ لکھنے کی ضرورت محسوس کی تھی مگر مولوی کریم الدین مرحوم نے پورے معاشرے کی اصلاح کے لئے یہ اقدام ضروری سمجھا ہے اور وہ عشقیہ مضامین سے بھی قصوں کو معرّا رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن ایشیاء کے باشندوں کو متوجہ کرنے کے لئے انہوں نے اخلاقی باتوں میں عشق کی چاشنی بھی ملادی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے اس قصہ کو اس پیمانہ پر نہیں لکھ سکے ہیں۔ جیسا کہ وہ لکھنا چاہتے تھے!

"خطِ تقدیر" کا متن غالباً قارئین کے پیش نظر نہ ہوگا اِس لئے اِس مضمون میں اِس کا تنقیدی جائزہ نظر انداز کرتے ہوئے سطورِ ذیل میں مختصر طور پر اس قصہ کا تعارف کرا دینا مناسب ہے اور اس سلسلے میں صرف اس قدر کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک تمثیلی افسانہ ہے۔ جس کے کردار تدبیر۔ تقدیر۔ عقل۔ اتفاق۔ کفایت شعاری۔ آمدنی اور خرچ وغیرہ ہیں اور انہیں کرداروں کے توسط سے مولوی کریم الدین مرحوم نے جو فضا تیار کی ہے وہ وہی ہے جس میں وہ خود بھی سانس لے رہے تھے!

مولوی کریم الدین مرحوم کا بنیادی خیال یہ ہے کہ جس کو ہم تقدیر کہتے ہیں وہ حقیقت میں تدبیر کا دوسرا نام ہے اور انسان ہر دور میں وسیع اور کامیاب زندگی گذارنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں اختیار کرتا رہتا ہے۔ اور جبکہ اہلِ مغرب ہمارے ملک پر مسلّط ہو گئے ہیں تو ہم کو زندگی کا چلن اُن سے سیکھنا چاہئے اور جہاں تک تعلیم و تربیت اور تہذیب و تمدّن کا تعلق ہے۔ روایتی نقطۂ نظر کو ترک کردینا ضروری ہے۔

"خطِ تقدیر" کا قصہ گیارہ ابواب پر مشتمل ہے اور اُن مسائل سے متعلق ہے جو کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستانیوں کو پیش آئے تھے۔ اور اِس تمثیل کا اہم کردار "طالبِ تقدیر" ہے جو کہ تلاشِ معاش اور سکونِ قلب کی جستجو میں نکلتا ہے اور محنت و مشقت کے بجائے ملکۂ تقدیر کی محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے اور جب وہ دیکھتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو محض تقدیر اور اتفاق کے سہارے بڑے آدمی ہو گئے تو وہ سوچتا ہے کہ وہ کیوں نہیں بڑا بن سکتا ہے اور اسی خیال کی جستجو میں اس پر بڑی سختیاں گزرتی ہیں مگر ملکۂ تقدیر کسی صورت میں بھی اُس کے قبضے میں نہیں آتی ہے۔ اور تب آخر کار اُس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ جب تک عقل اس کی رہبر اور تدبیر اس کی معین و مددگار نہ ہوگی ناکامی کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہوگا!

چنانچہ "طالب تقدیر" کو راہِ طلب میں جو مسائل درپیش ہوتے ہیں وہ زراعت۔ تجارت۔ ملازمت یا سوداگری ہیں اور ملک میں سے کونسا شعبۂ زندگی اُس کے لئے سودمند ہوگا۔ نیز تعلیم و تربیت کی سماج میں کیا قدر و قیمت ہے۔ اور اس کا ڈھانچا کیسا ہونا چاہئے۔ توہمات سے نجات پانے کا کیا طریقہ ہے اور اُس کے کیا اسباب ہیں کہ اب ہمارے ملک ہندوستان میں نہ تو جدید اختراعات ہوتے ہیں اور نہ علم و عمل کی نئی نئی راہیں نکالی جاتی ہیں؟

خلاصہ یہ کہ مولوی کریم الدین مرحوم کوئی بڑے فنکار نہ تھے۔ اُن کی تصنیفات و تالیفات درسی ضرورتیں تو ضرور پوری کرسکتی ہیں مگر اُن کے اِس قصہ میں فکر و فن کی وہ پختگی نہیں ملتی ہے جو ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے ناولوں

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر دیکھئے)

پروفیسر ثریّا ثانی ایم۔ اے

فانیؔ کا شعری سوز و گداز

فانیؔ کے متعلق رائے دیتے ہوئے اکثر و بیشتر نقاد افراط و تفریط کے شکار ہو گئے ہیں۔ اعتدال اور توازن متانت اور سنجیدگی کی کمی بُری طرح کھٹکتی ہے۔ کسی نقاد نے انہیں "مرگھٹ کا رونے والا شاعر" کہا ہے۔ جوشؔ نے "بیوہ عالم" "سوز خواں" "ہر وقت بسورنے والا اور انسانیت کے درجے سے گرا ہوا" گردانا ہے۔ کسی نے فانیؔ پر اس طرح رائے زنی کی ہے "ان کے مسلسل شیون و فریاد سے ناخوشگوار اثر ہوتا ہے۔ اور ان کی شاعری میں تھکا دینے والی یکسانیت ہے"۔ عندلیب شادانی نے تو اُن کی "شاعری کا جنازہ" اچھی طرح نکالا مگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس قسم کے تبصروں اور تنقیدوں میں ایک سنجیدہ توازن کا فقدان ہے اور یہ تمام ترجذباتیت پر مبنی ہیں بلکہ بعض اوقات تو ناقدین کی کسی ذاتی پرخاش کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ ہم فانیؔ کی شاعری کے پُرخلوص لب و لہجہ، اسلوب کی دلکشی اور خوبصورتی، زبان کے لطف و حُسن، شعریت اور صداقت کی جلوہ گری اور بے ساختگی حیرت انگیز چستی اور روانی سے کسی صورت میں بھی انکار نہیں کر سکتے۔ بقول فراقؔ گورکھپوری "اُن کے یہاں فلسفیانہ آہنگ اور انداز بیان کا تیکھا پن ہے"۔ اسی طرح آل احمد سرور نے کہا ہے کہ وہ واردات انسانی کے کامیاب مصوّر ہیں۔

بے شک کلیہ ہے کہ فن کار کے فن پر ماحول کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ اس کا فن اپنے عصر کے تقاضوں سے عاری نہیں رہ سکتا۔ فانیؔ کی شاعری بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ جس وقت فانیؔ کی شاعری عروج پذیر تھی۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی ختم ہو رہی تھی۔ ماحول پر انتشاری اور اضطرابی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ نئی تہذیب اپنے قدم جمانے کے لئے کوشاں تھی۔ اور پرانی قدریں متزلزل ہونے کے لئے تیار نہ تھیں۔ غدر کی ناکامیابی کے اسباب سے فضا پر مُردنی، شکستگی اور افسردگی طاری ہو گئی تھی اور اس شکستگی، انتشار اور شوریدگی سے فانیؔ کا ذہن متاثر ہوا تھا۔ اُن کے یہاں جو سوز و گداز، بو رچی ہوئی غمگینی، دھیمی دھیمی آنچ، اور جو درد و الم کی لہریں موجزن ہیں وہ اسی ماحول کی دین ہیں۔ اس لئے فانیؔ کے یہاں جو قنوطیت ہے اُس پر ناک بھوں چڑھانے کی ضرورت نہیں اُنہیں فضا ہی ایسی ملی تھی جس میں خوش گواری کے آثار اور اُمید کی کرنوں کا فقدان تھا۔ اُن کا دل "سنگ و خشت" تو نہ تھا جو درد سے بھر نہ آتا۔ حساس دل اپنی نجی اور اجتماعی زندگی کے دُکھ کے تصادم سے اور زیادہ حساس ہو گیا۔ اور درد و الم کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے کسی حد تک فراریت میں بھی پناہ لینی چاہی۔ جیسے اس شعر سے ظاہر ہے۔

یاس نے درد کی نہیں حق تو یہ ہے دوا ہی دی
فانیؔ نا اُمید کو موت کا آسرا دیا!

ماحول کی اس دین کے علاوہ ادبی اور اصلاحی تحریکوں نے بھی اُن کی شاعری پر گہرا اثر ڈالا۔ ان

تحریکوں کے سربراہوں میں حالی اور آزاد پیش پیش تھے دوسری جانب اُن کے مخالفین کا گروہ آمادۂ پیکار تھا جو غزل کے انحطاطی دبستان کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں کی کوشش یہ رہی کہ غزل کے پودے کو کچلنے کے بجائے اُسے نت نیا روپ دیں۔ اُسے نیا رنگ، نیا موڑ، نیا آہنگ اور جدید وقار سے مزین کرکے غیر فانی بنا دیں۔ ان نمائندوں میں فانی ایک موثر قوت تھے۔ جن کا اثر دبستانِ غزل کے شعرا پر مدتوں رہیگا۔ انہوں نے غزل میں وسعت اور صلاحیت پیدا کی۔ غزل کو نئی نئی راہوں سے آشنا کیا۔ اس کے اسلوب میں تنوع اور رنگارنگی پیدا کی۔ فانی کی غزلوں پر انفرادیت کی گہری چھاپ ہے۔ کیونکہ انھوں نے اجتہادی انداز اختیار کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ ابتدا میں اُن کے یہاں اُسی روایتی رنگ کی جھلکیاں ہیں۔ جو امیر اور داغ کا رائج کردہ تھا مگر آہستہ آہستہ وہ اپنی طبیعت کے تقاضے احساس اور تاثر کی شدت کی وجہ سے داغ اور امیر سے منحرف ہوکر میر اور غالب کی طرف رجوع ہوگئے۔ اور یہ موڑ اُن کی شاعری کے دوسرے دَور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے یہاں جہاں میر کا سنجیدہ گداز، اُن کی لطافتِ بیان اور نزاکتِ خیال، بے پایاں درد اور لامحدود یاس کی فراوانی ہے وہیں اُن عناصر کے ساتھ ساتھ غالب کی حکیمانہ نظر اور مفکرانہ ادراک، اسلوبِ فکر اور غم کا عرفان بھی شامل ہوگئے ہیں۔ اس طرح میر اور غالب کی خصوصیات شیر و شکر ہوکر فانی کے یہاں ایک عجیب جدت کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ جہاں رشید احمد صدیقی نے میر کے سوز و گداز کو فانی کی شاعری کا اصل جوہر قرار دیا ہے وہیں آل احمد سرور نے فانی کے رنج و الم اور غالب کے رنج و الم میں مماثلت بتائی ہے۔ میر اور فانی کی زندگی کی ہم آہنگی اُن کی شاعری کی ہم آہنگی بن گئی ہے۔ درد و یاس کے مضامین میر کا طرۂ امتیاز رہے ہیں۔ اور فانی نے بھی انہیں اپنا محبوب موضوع بنایا۔ وہ کہتے ہیں ؎

نامراد رہنے تک نامراد جیتے ہیں　　سانس بن گیا اک اک تار نارسا ہوکر

کرم بے حساب چاہا تھا　　ستم بے حساب میں گذری

میر جہاں چھوٹی بحروں کے بادشاہ ہیں وہیں فانی کی چھوٹی بحریں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ جیسے ؎

موت کا انتظار باقی ہے　　آپ کا انتظار تھا نہ رہا

کھل گیا میری زندگی کا راز　　اے غم دوست تیری عمر دراز

بسا اوقات تو اندازِ بیان اور جذبات اتنے مشترک ہو جاتے ہیں کہ پہچان دشوار ہو جاتی ہے ؎

بھڑک کے شعلۂ گل پر کبھی تو گر بجلی　　جلاتا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا۔　　میرؔ

بھڑک کے شعلۂ گل تو ہی اب لگا دے آگ　　کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا۔　　فانیؔ

غرض فانی نے غالب اور میر کے حسین رنگوں کے امتزاج سے اپنی شاعری کی قوسِ قزح بنائی ہے اور اسی امتزاج نے اُن کے رنگ کو نکھار دیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ہمارے لئے عبادت بریلوی کی یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ "میر کا سوز و گداز اور غالب کا تفکر اُن کے یہاں یکجا نظر آتے ہیں لیکن یہ یکجائی کسی تقلید یا نقالی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس میں فانی کے اپنے مزاج اور افتادِ طبع کو دخل ہے" ملاحظہ ہو۔

غلط انداز نگاہوں کو سنبھال　　میری گستاخ نگاہی کو نہ پوچھ

اب جنوں سے بھی توقع نہیں آزادی کی　　چاکِ داماں بھی بہ اندازۂ دامان نکلا

ماحول کی سوگواری، میر کی خستگی، غالب کی حکیمانہ نظری، لکھنوی اسکول کی ماتمی لے، ان سب کو لیکر فانی نے ایک نئے راگ میں تبدیل کیا ہے۔ اور اس قدر متنوع اور مختلف راگ ایک ہی ساز پر گانا ان کی تخییل

کی بلندی اور تفکر کی گہرائی اور گیرائی کا پتہ دیتے ہیں ؎

روح اربابِ محبت کی لرز جاتی ہے ۔۔۔ تو پشیمان نہ ہو اپنی جفا یاد نہ کر

میری آنکھوں میں آنسو تجھ سے ہمدم کیا کہوں کیا ہے ۔۔۔ ٹھہر جائے تو انگارہ ہے بہہ جائے تو دریا ہے

یوں چرائیں اس نے آنکھیں سادگی تو دیکھئے ۔۔۔ بزم میں گویا مری جانب اشارہ کر دیا

بہت سر پٹختی ہیں آرزوئیں ۔۔۔ کوئی ناکام جاتا ہے جہاں سے

ان اشعار میں احساسات کی شدت، ایک تھرتھراہٹ اور ایک لرزش محسوس ہوتی ہے جو دل پر بے ساختہ اثر کرتی ہے۔ غزل کی خصوصیت اثر انگیزی ہے۔ اور فانی کی غزلیں صحیح معنوں میں غزل کہلانے کی مستحق۔ فانی نے اشعار میں شعریت اور بلیغ نغمگی کو ضرور سمویا ہے مگر افادی پہلو کو کبھی پیش نظر نہیں رکھا۔ سچ پوچھئے تو وہ ادب میں افادیت کے قائل ہی نہ تھے۔ وہ شعر کے تعمیری حسن کی طرف متوجہ تھے۔ اسی لئے ان کے یہاں اسلوب میں تربیت یافتہ نزاکت الفاظ، خوش سلیقگی، رچی ہوئی بلاغت، زبان کا نکھار، لب و لہجہ میں سوز و گداز، متانت اور سنجیدگی دوسرے شعرا سے نسبتاً زیادہ ہے اور یہیں ایک نیا پن ملتا ہے ؎

کچھ کہہ کے چارہ ساز نے تسکین دی تو ہے ۔۔۔ سنتا تو ہوں کہ اب مری حالت سنبھل گئی

سنتے تھے محبت آساں ہے واللہ بہت آساں ہے مگر ۔۔۔ اس سہل میں جو دشواری ہے وہ مشکل سی مشکل میں نہیں

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات ۔۔۔ جب مزاجِ یار کچھ برہم نظر آیا مجھے

ان کی شاعری ہمیں اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ وہ عام معیارِ تغزل سے الگ ہے۔ ان کے احساسات، ان کے ذاتی تخیل اور تجربے کا نتیجہ ہیں۔ ان کے فلسفیانہ ادراک اور ان کی بصیرت نے ان کے سامنے نئی نئی شاہراہیں کھول دی ہیں۔ فن کی رعنائیاں اور رنگینیاں ایک دوسرے میں ضم ہوتی گئی ہیں۔ جسکے نتیجہ میں تاثر آفرینی، تڑپ اور کسک بدرجہ اتم ملتی ہے۔

آزادی خطرے میں ہے
اپنی پوری طاقت سے اس کی حفاظت کیجئے

جواہر لال نہرو
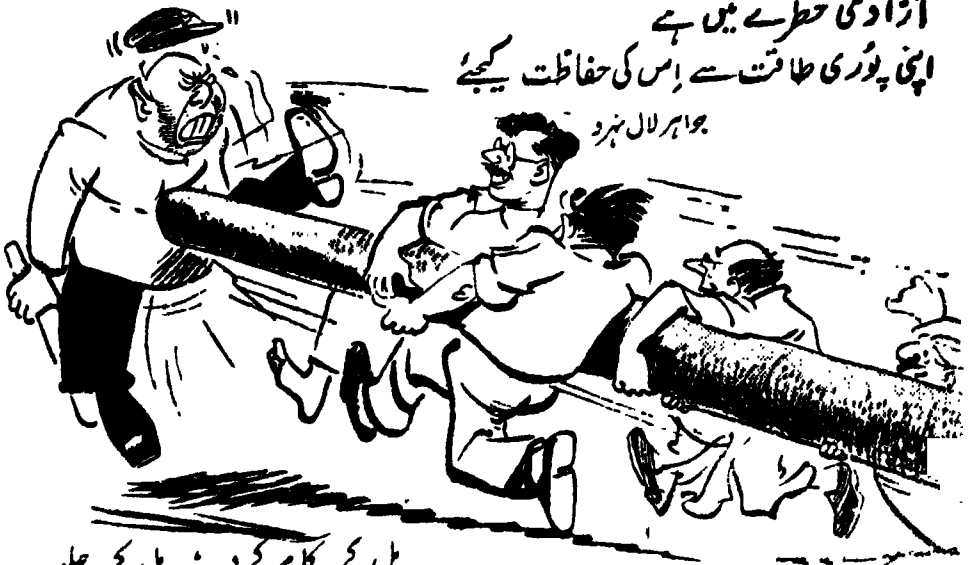
مل کر کام کرو • مل کر چلو

ملک کی طاقت، ملک کے عوام کے نظم و ضبط، میل جول اور مل کر کام کرنے میں ہے۔
ہماری آزادی کو جو خطرہ درپیش ہے، اُس کا مقابلہ ایکتا اور ہمیں ٹوٹ کوششوں ہی سے ممکن ہے۔ ایکتا بنائے رکھیں۔ من، لگن سے کام کریں۔

ملک کے دفاع کو مضبوط بنائیے

شاہ بیبی جون ۱۹۶۴ء

باوا کرشن گوپال مغموم

"گردِ راہ" پر ایک نظر

ضیاؔ ہمارے ملک کے نہایت برگزیدہ اور عظیم المرتبت شاعر و استادِ فن حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی مرحوم و مغفور کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ اور پچھلے پچیس تیس برسوں سے اپنے استادِ محترم کی صحت مند، اعلیٰ اور ارفع شعری روایات کو بہ لحاظ برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ مسلسل فکرِ سخن اور مشق و مزاولت نے انہیں ایک منفرد اسلوبِ بیان اور امتیازی مقام عطا کیا ہے۔ قابلِ فخر ہے اور لائقِ رشک بھی،

زیرِ نظر مجموعہ ۴۴ رباعیات، ۱۴ نظموں، ۶ گیتوں، ۸ آزاد نظموں اور ۳۷ غزلوں پر مشتمل ہے۔ پیش لفظ مولانا ابر احسنی گنوری نے لکھا ہے اور تعارف حضرت خوشتر گرامی نے سپردِ قلم فرمایا ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ یہ مجموعۂ کلام کتابت کی اغلاط سے یکسر پاک ہے۔

ضیاؔ نے قریب قریب تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور وہ بلاشبہ ہر صنفِ سخن میں یکساں طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔ اُن کی بساطِ سخن کی بوقلمونی اُن کے مشاہدے اور نفسیاتی مطالعے پر دلالت کرتی ہے۔

رُباعیات رُباعی ایک بڑی کافر صنفِ سخن ہے۔ اس میدان میں گھوڑا دوڑانے کے لئے بڑی مشاقی اور چابکدستی کی ضرورت ہے یہاں بڑے بڑے شہسواروں کا دم پھول جاتا ہے۔ ضیاؔ کی پختگیٔ فن و شعور نے یہ دشوار گزار مرحلہ بحسن و خوبی طے کر لیا ہے۔

موضوع کے اعتبار سے اس مجموعے کی ۴۴ رُباعیات کی تقسیم یوں ہے:-

جوشِ عمل ۹ - رندانہ ۷ - فلسفیانہ ۶ - رُومانی ۵ - حُبِّ وطن ۵ - آزادی ۴ - شانِ اُردو ۴ - دیوالی ۴ = ۴۴

چند بلند پایہ رباعیات ملاحظہ ہوں:-

(۱)

سُورج کی کرن سے بزمِ امکاں روشن پرتو سے بہار کے گلستاں روشن
بالکل ایسے ہی اے اسیرِ دانش ہے شمعِ جُنوں سے عقلِ انساں روشن

(۲)

بادہ میں متاعِ ہوش گھولی ہے کبھی اشکوں سے جبینِ شوق دھولی ہے کبھی
ہر ذرّے میں صد ہزار سورج روشن اے طالبِ دید! آنکھ کھولی ہے کبھی

(۳)

سانچے میں خلا کے ہم نے گیندیں ڈھالیں ہر مہ و انجم پہ کمندیں ڈالیں
دھرتی نے، فلک نے، نور نے، ظلمت نے انساں کے ارتقا کی قسمیں کھا لیں

نظمیں اور گیت

مجموعہ میں نظموں اور گیتوں کی مجموعی تعداد ۶۱ ہے۔
موضوع کے اعتبار سے اِن کی تقسیم یوں ہے :۔

رُومانی ۲۲ - سماجی ۱۸ - وطنی ۱۶ - متفرق ۵ = ۶۱

جملہ نظموں میں درج ذیل نظمیں خاص طور پر پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں :۔
صدائے جرس - ہجر - سجدۂ ارتقا - مَیں اور چاند - عالمِ شباب - دُوربینی - یاد کی یاد - حسن آمد، اور آزادی کے دس برس۔

ضیا کی نظموں میں جا بجا غزل کی دلکشی، رنگینی اور لطافت ہے۔ نظم "حُسن" کے دو شعر ملاحظہ ہوں :۔

شباب بن کے رگ و پے میں جاری و ساری ۔۔۔ شراب بن کے پیالوں میں آرہا ہے حسُن
تجلیات کا مصدر، ضیاؤں کا مخزن ۔۔۔ جہانِ تیرہ میں شمعیں جلا رہا ہے حسُن

"سجدۂ ارتقا" ایک بلند پایہ نظم ہے۔ جب حکمِ ایزدی کی تعمیل میں حضرت آدم جنت کو چھوڑ کر ارضِ خاکی پر وارد ہوئے تو اجنبی فضا اور ماحول دیکھ کر حیرت و استعجاب کی تصویر بن گئے۔ ضیا نے اس عالم تحیر کی تصویر کشی میں اپنا شاعرانہ کمال یوں دکھایا ہے :۔

اُتر کر ارضِ خاکی پر زمیں دیکھی، فلک دیکھا ۔۔۔ بڑی حیرت سے ہر منظر کو دیکھا دیر تک دیکھا
کہیں دیکھا اٹھائے سر فلک سا کوہساروں کو ۔۔۔ کہیں دیکھا حسیں نغمات بر لب آبشاروں کو
کبھی تاروں کو دیکھا جگمگاتے نُور پھیلاتے ۔۔۔ کبھی پھولوں کو دیکھا مسکراتے، رنگ برساتے
خلاؤں میں پرندے مائلِ پرواز بھی دیکھے ۔۔۔ لرزتے پردہ ہائے سازِ بے آواز بھی دیکھے
کیا نظارہ دُنیا کی بلندی اور پستی کا ۔۔۔ ہر اک منظر نظر کش تھا فضائے بزمِ ہستی کا

کھُلیں ظاہر کی آنکھیں، رنگ و بو میں وہ گُم ہو کر
یہی ہوتا ہے عالم حق سے بندے کا جُدا ہو کر

نظم "مقامِ شاعر" کے دو شعر ملاحظہ ہوں :۔

گھٹا بن کر برستا ہے سمن زارِ تخیل پر ۔۔۔ تبسّم ریز ہوتا ہے کلی کی تازگی لے کر
ہر اک گُل گوش بر آواز اِسکی نَے نوازی پر ۔۔۔ غنچہ و سہلا کا ہے اسکی سرفرازی پر

نظم "سالِ نو" بھی پُر خلوص تاثرات کی حامل ہے۔ سیدھی سادی مگر سچّے کی باتیں ہیں۔ اور بے تکلف اندازِ بیان۔ نظم کے اختتامی اشعار ملاحظہ ہوں :۔

اَن گنت سال تازہ آئے ہیں ۔۔۔ آرزوؤں کو گدگداتے ہوئے
پھر چلے بھی گئے ہیں چُپ سادھے ۔۔۔ جیسے بیگانہ، اجنبی، انجان
"آپ کو سالِ نو مبارک ہو ۔۔۔ اِن دُعاؤں میں کچھ اثر ہی نہیں
یہ اُمیدیں ہیں جاگتے کا خواب ۔۔۔ وقت بہتا ہوا ہے اِک دریا

کب کسی کا یہ ساتھ دیتا ہے

"بھگوان کرشن" اِس مجموعہ کی ایک اور دلکش نظم ہے۔ اسی موضوع پر حضرت سیماب اکبرآبادی مرحوم نے متعدد نظمیں کہیں جو اپنا جواب آپ ہیں۔ ضیا کے چند شعر خالی از دلچسپی نہ ہوں گے۔

کسی نے اُسکو تصور کیا خدا کا نورُ ‏ ‏ تمام عالمِ ہستی میں ظاہر و مستور
کسی نے اُسکو غمِ زیست کی دوا سمجھا ‏ ‏ کسی نے کشتیٔ انساں کا ناخدا سمجھا
کسی نے اُسکو محبت کا دیوتا جانا ‏ ‏ کسی نے منزلِ ہستی کا رہنما جانا
کسی نے مان لیا گوپیوں کا متوالا ‏ ‏ کنارِ ندیٔ جمن راس کھیلنے والا
کسی نے گوالوں کے ہمراہ شاد باد دیکھا ‏ ‏ کسی نے جنگ کے میداں میں کامراں دیکھا

غرض وہ سب کو نئے رُوپ میں نظر آیا
کہ آپ وشنُو بہ پیراہنِ بشر آیا

"دُور بینی" ایک رُومانی نظم ہے۔ درج ذیل دو بند کیف پرور و وجد انگیز ہیں:۔

اِک شعرِ سراپا کی طرف دیکھ رہا ہوں ‏ ‏ اِک معجزۂ صہبا کی طرف دیکھ رہا ہوں
اُلفت کے کلیسا کی طرف دیکھ رہا ہوں ‏ ‏ فردوسِ تمنا کی طرف دیکھ رہا ہوں

میں دُور سے میرا کی طرف دیکھ رہا ہوں

چھائی ہوئی گردون پہ ہیں گھنگھور گھٹائیں ‏ ‏ بوندوں سے گلے مل کے ہیں مدہوش ہوائیں
آتی ہیں کہیں دور سے گانے کی صدائیں ‏ ‏ جذبات کے ہیجان میں نقصان ہیں فضائیں

میں دُور سے "میرا" کی طرف دیکھ رہا ہوں

صفیا نے اپنی نظموں، گیتوں، اور غزلوں میں ہندی کے درج ذیل خوبصورت اور مترنم الفاظ و تراکیب کے استعمال سے حُسنِ شعر کو چار چاند لگا دیئے ہیں:۔

جوالا۔ گگن۔ دیوی۔ آشا۔ کٹیا۔ سمان۔ کامناؤں۔ سیوا۔ اہنسا۔ مدماتی۔ مُسکان۔ جیون۔ بھکشا۔ پریم کُٹی۔ سُندر بانی۔ ابھیانی۔ پرماتما۔ آجُوتی۔ سندیسہ۔ رُوپ۔ رَین۔ مَدرا۔ برہن۔ مرگ نینن۔ آس۔ جوت۔ امبر۔ گوری۔ گگری۔ امرت جَل۔ ساجن۔ سواگت۔ سجنی۔ بپتا۔ چندر۔ اگنی۔ مایا جال۔ متوارے۔ بالم۔ باٹ۔ درپن۔ بندی۔ کاجل۔ بگیا۔ پریتم۔ کاگا۔ دھرتی۔ آکاش۔ ساگر۔

ہندی کے رنگ میں ڈوبا ہوا۔ ایک پیارا گیت ملاحظہ ہو:۔

اندھیارے کے بعد اُجالا روشن روپ دکھائے ‏ ‏ دُکھ کی کالی رین کٹے تو سُکھ کا دن آجائے
نیل گگن سے مدماتی بدلی مدرا برسائے ‏ ‏ برہن کے مرگ نینن میں آس اپنی جوت جگائے
ہریالی کی سُندر دیوی کھیتوں میں مُسکائے ‏ ‏ امبر ناچے، دھرتی جھومے، گیت جوانی گائے
پنگھٹ کی گوری گگری سے امرت جل چھلکائے ‏ ‏ دھیمی دھیمی بہتی ندی لہرائے، بل کھائے

مجموعۂ زیرِ نظر میں آٹھ آزاد نظمیں ہیں۔ اور سب کی سب خیال انگیز۔ نمونے کے طور پر ایک نظم "دریچے سے" کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

اینٹ چونے کی نظر آتی ہیں جو دیواریں
اوٹ میں اُنکی گناہوں کے لگے ہیں انبار
—— وہ گنہ جنکے تصور سے ہے لرزاں ابلیس!
خود کو دھوکا یونہیں رہ رہ کے دیئے جاتا ہے

حود عرض، اہلِ ہوس کا وہ جفا کار گروہ
جسے کہتے ہیں سماج
رہنمائی کی جگہ راہزنی پر مائل
اس کے قانون و اُصول — ابن آدم کے لئے ایک فریب اعظم!

مختصر یہ کہ مینا کی نظمیں اُن کے بلند اور پاکیزہ مذاقِ شعری کی آئینہ دار ہیں۔ اُن کے یہاں اعلیٰ اقدار کا احترام ہے۔ والہانہ محبت اور حبّ الوطنی کے جذبات نے اُن کی شاعری کو تاثیر کا جوہر عطا کیا ہے۔

غزلیں

مینا کا تغزّل مفکرانہ ہے۔ اور اُن کا متین اور باوقار لب ولہجہ لئے ہوئے اُن کی غزل گو "زلف ولب ورُخسار" کی شاعری نہیں بلکہ محبت کے بالغ شعور کی نغز گوئی ہے۔ جیسا کہ خود انہو نے کہا ہے اُنکی غزل کا پیکر روایتی سہی، اس میں کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور ملے گی۔ اور اُن کا یہ قول، قولِ برحق ہے

روایتی پیکرِ غزل میں بھرا ہے رنگِ جدید میں نے
مینا! مرے شعر میں ہمیشہ کوئی نئی بات ہی ملے گی

ہستی کی راہ بڑی دشوار اور پُرپیچ ہے جو کسی رہبرِ کامل کی رہنمائی کے بغیر طے نہیں کی جا سکتی۔ شاعر نے محبت کو رہبرِ حیات بنا لیا۔

ہزاروں پیچ و خم ہر گام پر تھے راہِ ہستی میں
محبت کو نہ تم رہبر بنا لیتا تو کیا کرتا

محبت کے بارے میں مینا کا نظریہ کتنا بلند اور پاکیزہ ہے:۔

محبت ہے انسان کی آبرو بغیرِ محبت بشر کچھ نہیں

آج کا دَور "ایٹمی دَور" ہے۔ سائنس مہلک ترین ایجادات میں معروف ہے لیکن شاعر تو سوزِ محبت کا طالب ہے۔ نہ کہ "ایٹمی جلال" کا جو کسی وقت بھی ہنستی کھیلتی، بھری پُری دنیا کو شعلوں کے جہنم میں جھونک سکتا۔ ملاحظہ ہو:۔

مجھے محبت کا سوز دے دو، یہ ایٹموں کا جلال لے لو
حرارتِ خوں کی آرزو ہے، شرار لے کر میں کیا کروں گا؟

مینا کی غزل میں 'ہجر و فراق' کا رونا دھونا نہیں۔ اُن کا تغزّل صحت مند اور توانا ہے۔ جس میں اُمید حوصلے اور یقین کی جلوہ پاشیاں ہیں۔ اُن کی غزل ایک نکھری ہوئی دھوپ ہے۔ جس میں ناکامی، محرومی اور حرماں نصیبی کے سایوں کا دُور دُور تک پتہ نہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

سحر کی منزلِ پُر نور سے بھٹکا ہوا راہی اندھیری رات میں شمعیں جلا لیتا تو کیا ہوتا

شبِ غم ہے مری تاریک بہت ہو نہ ہو صبح ہے نزدیک بہت

اُن سے میں دُور ہوا خوب ہوا آ گئے وہ مرے نزدیک بہت

رہِ پُرخار و بادِ تُند، ہیبت ناک خاموشی　　دلِ ناداں ابھی تو قربتِ منزل کی باتیں ہیں

سحر کی منزلِ روشن پہ جا پہنچے وہ دیوانے　　شبِ تاریک میں جو نُور کا لے کر علَم نکلے

اُجالوں کو ڈھونڈو، سحر کو پُکارو!　　اندھیروں میں رونے سے کیا فائدہ ہے؟

یقیں کے پاؤں میں لغزش نہ آئے　　بدل جاتی ہیں تقدیریں یقیں سے

بر بنائے مصلحت کچھ باتیں کھُل کر نہیں کہی جا سکتیں۔ ایسے نازک مواقع پر غزل لطیف اشاروں اور کنایوں بات کرتی ہے۔

اِس قبیل کے دو شعر ملاحظہ ہوں:۔

وہی ہے پژمردگی گلوں پر وہی عنادل کے لب پہ نالے
بہار اگر نام ہے اسی کا بہار لے کر میں کیا کروں گا

کیوں نہ بڑھ کر چھین لُوں ساقی سے مینا و سبُو　　رِندِ سرکش، میکشِ خودسر کی باتیں کریں

کچھ لطیف اور پُرکیف شعر ملاحظہ ہوں:۔

ذوقِ طلب! ہائے پاسِ وفا! ہائے لذّتِ غم! ہائے مجبوری　　سمجھا نہ جسے دل نے اب تک اُس درد کا درماں کیا ہوگا

یہ کس کافر نے چھیڑا سازِ مستی　　لرز جائے نہ ایمانوں کی دنیا

تڑپنا ہمارا بڑے کام کا تھا　　ترے غم میں دنیا کو تڑپا گئے ہم

کبھی خلوت کے افسانے، کبھی محفل کی باتیں ہیں　　اِنہیں کیا عقل سمجھے گی، یہ میرے دل کی باتیں ہیں

فروشِ شمعِ محبت ہے، پھر بھی حُسن کی ضو!　　گلوں سے تا بہ ثُریا ہے، دیکھیے کیا ہو!

بادل جھُومے نیل گگن پر　　گوری نے گیسُو لہرائے

گیت ہیں، جوانی ہے، ابر ہے، بہاریں ہیں　　مضطرب اِدھر میں ہوں، تو اُدھر پریشاں ہے

کھوئی ہوئی تھی تیری تجلّی سے کائنات — پھر بھی مری نگاہ تجھے ڈھونڈتی رہی

واہ ! کیا قُربتِ مُحبّت تھی — دُور رہ کر بھی دُور رہ نہ سکے

چاند بھی کہہ کے چھپ گیا، شمع بھی کہہ کے بجھ گئی — حُسنِ ازل کی داستاں قصّۂ ناتمام ہے

جہاں سے قہقہے اُٹھتے تھے شاید — مرے آنسو بھی آئے ہیں وہیں سے

ضیاؔ کی شگفتہ طبعی اور خوش مزاجی کے ثبوت میں درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

فریبِ زیست کھائے جا رہے ہیں — حقیقت آشنا، ناآشنا کیا
اپنے سَو بیگانے ہوتے — ایک یگانہ اپنا ہوتا
اُمیدِ عمل اُس دل سے ہے، جو درد و محن کی شدّت میں — تقدیر سے پُوچھا کرتا ہے تدبیر کا عُنواں کیا ہوگا
فلک کو ایک نہ اِک دن چھوہی لے گی — بہت دانا ہے نادانوں کی دنیا
کم سے کم حُسن کی رُسوائی میں — تھی غمِ عشق کی تضحیک بہت
درد ـــــ دوا فروش ہے، ناز ـــ نیاز مند ہے — عشق کا انتظار ہے، حُسن ہے انتظار میں
دُشمنی کو ضیاؔ ! مِل گئی — سایۂ دوستی میں اماں
دُنیا مری نظر سے تجھے دیکھتی رہی — پھر میرے دیکھنے میں بتا کیا کمی رہی ؟
ہو بری خامشی پہ چیں بجبیں — ابھی میں نے کہا نہیں کچھ بھی
سوز بھی اشکِ غم میں شامل ہے — آگ کا میل، اور پانی سے !

ساری تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ "گردِ راہ" واقعتاً ایک قابلِ قدر شعری مجموعہ ہے۔ جسے سنجیدہ مذاق و شعر رکھنے والے حضرات سر آنکھوں پر جگہ دیں گے۔

بقیہ خطِ تقدیر صفحہ ۲۱

کی جاتی ہے تاہم مولوی کریم الدین مرحوم کا یہ کارنامہ اُردو کے افسانوی ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے اور جو کہ بجا طور پر داستانوں اور ناولوں کی ایک درمیانی کڑی کہا جا سکتا ہے۔

ماسوا اس کے مولوی کریم الدین مرحوم ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے پیش رَو تھے اور اُن ہی کی بنیاد پر ڈپٹی نذیر مرحوم نے اپنے ناولوں کی عمارت کھڑی کی ہے۔ اور ہمارے افسانوی ادب میں مغربی اقتدار کے زیر اثر جو تبدیلیاں رُونما ہوئی ہیں اُن کا اوّلین نمونہ مولوی کریم الدین مرحوم کی تصنیف "خطِ تقدیر" ہی ہے نہ کہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی "مراۃ العروس" جیسا کہ عموماً لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں !

حسن کمال

تو نہیں گر.....

کسکو فرصت کہ کرے اپنی شکستوں کا شمار
کسکو حاجت ہے کہ ناکامی کے افسانے کہے
کسکو یہ ہوش کہ دامن میں کبھی یہ دیکھے
پھول ہیں، خون کے قطرے ہیں کہ راہوں کا غبار

عمر بھر ساتھ رہا رات کی تاریکی کا درد
اور تصویر سحر رات کا دیکھا ہوا خواب
زندگی وقت کے صحرا کا فریب و سراب
اور منزل کی تمنا میں ملی گرد ہی گرد

عمر بھر کرتے رہے عشق و ہوس کی تفسیر
دل کو سمجھایا کئے جب بھی بڑھی حسرت دید
شب فرقت کو کہا عشق کی صبح امید
اور یوں دیتے رہے دل کو ہوس کی تعزیر

ایسے عالم میں تری یاد بھی بہلا نہ سکی
تیری یاد دل سے ہی وابستہ وہ گذرے ایام
گردش دور سے جب ہم پہ رہی نیند حرام
زندگی تیرے تصور سے سکون پا نہ سکی

گردش دور تری یاد، سسکتے دن رات
خون میں زہر کی مانند گھلے جاتے ہیں
اور ہم حیرت و حسرت سے تکے جاتے ہیں
ہر جگہ درد ہے رکھیں کبھی کہاں پیار سے ہاتھ

یہ نہ تھی فکر کہ یہ چاک گریباں سلتا
دل کے زخموں پہ کوئی پیار سے مرہم رکھتا
دل کو ارماں تھا فقط ایک، سو وہ بھی نہ ہوا
تو نہیں گر تو ترا غم ہی مسلسل ملتا

اویس احمد دوراں

تمہارا غم

کبھی کبھی تم آ گئیں تو جی مرا بہل گیا
ذرا سی دیر کے لئے چراغِ شوق جل گیا
کبھی کبھی تم آ گئیں تو میرا یہ مشامِ جاں
تمہاری زلفِ عنبریں کی نکہتوں میں بس گیا
کبھی کبھی تم آ گئیں تو روحِ بے قرار میں
بہارِ حسن و عشق کی نسیمِ ناز چل گئی
کبھی کبھی تم آ گئیں تو دل کا درد تھم گیا
لبوں کی پیاس بجھ گئی
تمہاری چشمِ نرگسی شراب سی چھڑک گئی
تمہاری مانگ کی حسیں و دلفریب کہکشاں
مری شبِ حیات کو سہانے خواب دے گئی
مگر مری نشاطِ جاں
یہ لمحہ انبساط کا
ہنوز مختصر رہا
مجھے تو یوں لگا کہ جیسے میری خوابگاہ میں
پلک جھپکتے آئیں تم، اسی طرح چلی گئیں
تمہارے جاتے ہی دلِ حزیں میں درد جاگ اٹھا
وہ درد جس کا سلسلہ ہے دردِ کائنات سے
مرے دکھوں کی شام سے تمہارے غم کی رات سے
مری رفیقۂ سفر
یہ سلسلہ ہے آہنی
جسے نہ ختم کر سکا
قدیم عہد کا بشر
نئے جہاں کا راہبر
تمام دل کی حسرتیں
تمام سوز و آرزو
تمام رنگ و نور و بو
اس آہنی و ظالمانہ سلسلہ میں قید ہیں
کوئی نہیں، کوئی نہیں جو آہنی و ظالمانہ سلسلے کو توڑ دے
کوئی نہیں، کوئی نہیں جو خستہ حال زندگی کے احترام کو اٹھے
کوئی نہیں، کوئی نہیں جو عہدِ قتل و خوں میں اب سنائے گیت!
فریب خوردہ فلسفی، زمانہ ساز رہنما
بنامِ صلح و آشتی
غمِ حیات کی تہیں بڑھا رہے ہیں دمبدم
نڈھال آدمی کے دل میں اک نہیں ہزار غم
کبھی یہ غم کہ زندگی برہنہ سر برہنہ پا
کھڑی ہوئی ہے آج اپنے قاتلوں کے درمیاں
مری متاعِ آرزو مری رفیقۂ سفر
کبھی مجھے تمہارا غم
کہ میری خوابگاہ میں
تمہاری یاد کی جگہ تمہارا جلوہ کیوں نہیں

حامدی کاشمیری

میں دیکھتا ہی رہا چاند کے دریچے سے
نظر میں شوقِ فراواں کا اضطراب لئے
سیہ گھٹاؤں کا سیلِ رواں اُمڈ آیا
سفینے نور کے ٹکرائے پاش پاش ہوئے
نہ جانے کب سے یہ سیلِ رواں اُمڈتا ہے
بنا ہوا ہے یہ کب سے حجابِ دیدۂ و دل
وہ دیکھ سیلِ رواں میں شگاف پڑتے ہیں
تو بولی، جیسے درِ دل پہ دے گیا دستک
صبا کا کوئی مہکتا ہوا حسیں جھونکا!
جبرو کے وا ہوئے، جھولے فضا میں لہرائے
میں ڈھونڈتا ہی رہا تجھکو اِن جبروکوں سے
نظر میں شوقِ فراواں کا اضطراب لئے
مگر کہیں تری پرچھائیاں بھی پا نہ سکا
خلا میں اُبھرا نیا ایک نقطۂ سیّال
جو بڑھتے بڑھتے شبِ تار بن کے پھیل گیا
یہ اجنبی سا دیارِ طلسم اپنا ہے!
یہ بحر و بر، یہ بیابان و کوہ، یہ گلشن
غبارِ نورِ قمر کے مہین جالے میں
نہ جانے رعشہ براندام کیوں ہیں سب کے سب
مگر، وہ ایک وسیع و عریض معبد جو
لئے ہے اپنی جبیں پر خموشیوں کا وقار
جو بے نیاز ہے شام و سحر کی گردش سے
جو سوچتا ہے ازل اور ابد کے رشتوں پر
یہ بام و در، یہ دریچے، یہ چھت، یہ دیواریں
بکھر چکے ہیں مقدّس کتاب کے اوراق
منارے اِس کے ہیں نورانی پَر فرشتوں کے
مہ و نجوم ہیں گنبد پہ اس کے سر بسجود
یہ حجرے جن میں تقدّس کا نور لرزاں ہے
ستارہ بار ہے آیاتِ نور کی محراب
اور اُس کا صحنِ مقدّس یہ کائناتِ بسیط
بنا ہے مقتلِ شوق، اہلِ دیدۂ و دل کا
کفن بدوش، گریباں دریدہ، خاک بسر
ہر ایک سمت یہ مشعل بدست، دیوانے
نہ جانے اپنے خداؤں سے پوچھتے کیا ہیں
نہ جانے چھین لیا کس نے اِن کے دل کا سُرور
یہ بحر و بر، یہ بیابان و کوہ، یہ گلشن!
غبارِ نورِ قمر کے مہین جالے ہیں
نہ جانے رعشہ براندام کیوں ہیں سب کے سب
تو بولی، کھول دے آنکھیں، سحر کھِل اُٹھی ہے
تجھی کو تکتے ہوئے رات نیند آئی تھی!

قیصر شمیم

تلاش

بتکدہ بتکدہ تلاش کیا —
کون جانے کہاں ہے وہ پتھر
جو کبھی تھا صنم عقیدت کا —
ہائے کیا اس کو پاش پاش کیا

رہگزر رہگزر تلاش کیا —
کون جانے کہاں ہے وہ وحشی
جو کبھی دشت دشت پھرتا تھا —
ہائے کس کو جنوں تماش کیا!

آئینہ آئینہ تلاش کیا —
کون جانے کہاں ہے وہ چہرہ
جو کبھی میرا چہرہ ہوتا تھا —
ہائے کتنا غمِ معاش کیا

آدمی آدمی تلاش کیا —
کون جانے کہاں ہے وہ خوشبو
جو کبھی خوشبوئے محبت تھی —
ہائے کیا راز غم نے فاش کیا

زندگی زندگی تلاش کیا —
کون جانے کہاں ہے وہ اُمید
جو کبھی جانِ زندگانی تھی —
ہائے سب نے مجھے تراش کیا

درد گورکھپوری

زعمِ باطل

علم و دانش کی ترقی سے ہیں تارے لرزاں
وسعتِ ارض و سماوات کا سینہ شق ہے
ہم نشیں! ٹوٹ گیا آج طلسمِ نخوت
اہرمن یاس زدہ خوف سے چہرہ فق ہے

چاند کی سُرعتِ پرواز سے سہمے کیوں ہیں
کیوں برستا ہے زر و سیم کی آنکھوں سے ہراس
اپنی طاقت پہ اُنہیں زعم بہت تھا لیکن
کھوکھلی ہو گئی مافوق وسائل کی اساس

لاکھ تاریک ہو معمورۂ محنت لیکن!
ابنِ آدم کی تجلی سے ہے روشن آفاق
اپنے غلبہ کی تگ و تاز میں وہ بھول گئے
امنِ عالم کے قوانین اُصولِ اخلاق

دُور و نزدیک کا وہ اگلا تصور بے سود
مل گئیں خیمۂ ارضی کی طنابیں باہم
زرگری جنگ کا ایندھن وہ بنیں گے اِک دن
فوجی اڈوں کے جہنم ہیں جہاں پر ہمدم

اسلحہ کی یہ تگ و دو ہے ہلاکت انگیز
فوقیت کا یہ تصور ہے سراسر بے سُود
علم اور تجربہ جب جوشِ عمل کے ہیں غلام
چاند کے بعد یقینی نہیں سورج کا وجود؟

اسرار اکبر آبادی

اندھیرے

اجنبی گاؤں کی تاریک ہواؤں میں غبار
جیسے گھل جائے المناک فضاؤں میں دھواں
دور سوئے ہوئے کھیتوں پہ لرزتے سائے
جیسے ظلمت کے سمندر پہ گھٹاؤں کا سماں

دور برگد کے درختوں کی لٹکتی شاخیں
جیسے سانپوں پہ سپیروں نے کیا ہو جادو
باغ کے پاس ہی مرگھٹ پہ سلگتی ہے چتا
درد بیتاب ہے بہتے ہیں فضا کے آنسو

رہگزاروں کی طرح چپ ہے زمیں کا پھیلاؤ
رات کے جال سمٹتے ہی چلے آتے ہیں
گردشیں نیند کے پھندوں میں الجھی ہیں کہیں
وقت کے دائرے کچھ دیر کو تھم جاتے ہیں

خوف کی گود میں لرزیدہ ہے حکمت کی نظر
ضبط کے پاؤں میں، ٹوٹی ہوئی زنجیریں ہیں
ہوش کا ساتھ، کہ چھٹتا ہی چلا جاتا ہے
آنکھ کے سامنے مٹتی ہوئی تصویریں ہیں

غم کی سنسان خلاؤں میں ہیں ویران کھنڈر
نبض ٹھہرے ہوئے ماحول کی چلتی ہی نہیں
دل کی دھڑکن سے بھی مدھم ہیں ہوا کی سانسیں
لفظ خاموش ہیں، آواز نکلتی ہی نہیں

سسکیاں بھرتی ہیں مرگھٹ کی اندھیری راہیں
اونگھتی خاک پہ خوابوں کا فسوں طاری ہے
نقش ماضی کے ابھرتے ہیں، بگڑ جاتے ہیں
اپنا احساس بھی اس وقت مجھے بھاری ہے

رات غمناک ہے، سورج کو خبر تو ہوگی
ان اندھیروں پہ سویرے کی نظر تو ہوگی

افضلی

پنجرے کا پنچھی

اب کسی بات پہ غصہ نہیں آتا اُسکو

ہر کسی بات پہ سر ہنس کے جھکا دیتی ہے

رنج ناول میں بھی بجلی کو بجھا دیتی ہے

اب بڑے شوق سے کرتی ہے صفائی گھر کی

چھوٹی بہنوں سے خفا ہو کے جھگڑتی بھی نہیں

پیٹھ پر چڑھتا ہے پپّو تو بگڑتی بھی نہیں

اب نہیں ہوتا کبھی تیز نمک سالن میں

روٹیاں چاند کی مانند اُتر آتی ہیں

چٹنیاں وقت سے پہلے ہی سنور جاتی ہیں

تنگ پنجرے کی سلاخوں سے اُلجھتا پنچھی

صرف پھولوں کی مہک سے بھی بہل جاتا ہے

یہ بھی کیا کم ہے کسی اجنبی "سگرٹ کا دھواں"

بند دروازے کی جھریوں سے نکل آتا ہے

سردار الہام

نئے خاکے

اُبھر کے سطحِ جوانی سے ڈوب جاتی ہے
وہ موج جس کو تمنا کا آسرا نہ ملے

سرشتِ زیست تلاطم بدوش ہے لیکن
وہ کیا کرے کہ جسے اذنِ ارتقاء نہ ملے

پناہ ملتی ہے گمراہیوں کے دامن میں
شباب کو جو نشانِ رہِ بقا نہ ملے

جو ازتشنہ لبی ڈھونڈتے ہیں دیوانے
جو ناشناسِ رہ و رسمِ میکدہ ہیں ابھی

تمام عمر جو جامِ تہی بدست رہے
بہ وصفِ ساقیِ فیاض غم زدہ ہیں ابھی

حیات پر ابھی محرومیوں کے سائے ہیں
یہ چھٹ سکیں تو پھر اک بار جگمگائے گی

خزاں نصیب جوانی بہار آنے پر
نئے گلوں سے یہی غمکدہ سجائے گی

یہ آہِ نیم شبی و گداز فریادیں
عجب نہیں یہی لحن سردشں ہو جائیں

یہ زندگی کا دہکتا الاؤ یہ شعلے
خلیل ہو تو گلستاں بدوش ہو جائیں

ملازمت

"کیا بُود و باش پوچھو ہو پُورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے"

گو آج تیل بیچ رہے ہیں گلی گلی
لیکن کبھی تھے ہم بھی چراغ اِس دیار کے

ایم۔ اے کیا تھا پاس بڑے امتیاز سے
اُمید تھی کہ دیکھیں گے دن اِقتدار کے

دِن رات صبح و شام تلاشِ معاش میں
کیڑے بنے رہے ورقِ اشتہار کے

دَرخواست دی جہاں نظر آئی کوئی جگہ
اُن مرحلوں سے گُذرے جو تھے اختیار کے

اِنٹرویو کے نام پہ ہر بار بورڈ میں
جی بھر کے امتحاں بھی ہوئے خاکسار کے

یُوں ماہروں نے ہم کو سوالات میں کَسا
مُجرم پڑا ہو جیسے شکنجے میں دار کے

جیسے ہو گوسفند پہ قصاب کی نگاہ
پنجے میں جس طرح ہو کوئی سُود خوار کے

قائل کیا اُنہیں مگر اپنے جواب سے
بیٹھے تو ساکھ اپنی دِلوں میں اُتار کے

لیکن رِزلٹ جب ہوا آؤٹ تو گول تھے
قربان جائیں گردِشِ لیل و نہار کے

ہر بار یہ ہُوا کہ کوئی فون آگیا
گھر سے کِسی مُدبّرِ با اختیار کے

اُن کا کوئی عزیز کِسی دوست کا پسر
چکّر میں پڑ گیا تھا غمِ روزگار کے

درخواست تک نہ دی تھی، مگر حکمِ خاص سے
زُمرے میں لے لیا گیا اُمید وار کے

انٹرویو بغیر تقرّر بھی ہو گیا
ہم خواب دیکھتے ہی رہے اقتدار کے

اِس دھاندلی کے دَور میں ذی علم کیا کریں
بیچیں اگر نہ تیل اُمنگوں کو مار کے

عزیز اندوری

سوال

آج ہمیں تم سمجھاتے ہو!
قدرت ہی نے فرقِ رنگ ونسل کیا ہے
کالے چہرے، گورے ماتھے
آپس میں یہ مل نہ سکیں گے
صحنِ چمن میں "دو رنگے" گل کھل نہ سکیں گے
کیسا چمن ہے یہ بھی تمہارا۔!
کیسا انوکھا اس کا چلن ہے
آج ہمیں تم
خواب دکھا دو
جھوٹے طفلانوں سے بہلا دو
لیکن ہم نے ان خوابوں کی تعبیروں کو جان لیا ہے۔
حق کو بھی پہچان لیا ہے۔
لاکھ چمن میں آج تجلیاں
رنگ و نسل کے فرق کو برتیں
اپنی سیاسی تدبیروں سے
ایسے گلوں کو
جن کی ہنسی بھی
ذہن و نظر پہ بارِ گراں ہے
آج مسل دیں!
لیکن
کل جب بادِ صبا کے نازک جھونکے
صحنِ چمن میں
لے کے پیامِ عیش و مسرت آئیں گے۔
غنچہ غنچہ پھول بنے گا
اور فضائیں رقص کریں گی
جشنِ بہاراں ہوگا ہر سُو
اُس دن تم سے ہم پوچھیں گے۔
"قدرت ہی نے فرقِ رنگ و نسل کیا ہے"؟
شاعر (کذا)

ظہیر ناشاد

ساعتِ غم

رفعتِ بامِ ثریا پہ نظر تھی میری
محفلِ نجم و قمر راہگذر تھی میری
ہمنشیں، آئینہ خانے میں مرے تھا کل تک
عکسِ رخسارِ حسیں پرتوِ صد زہرہ جمال
خلوتِ دل میں مرے رقص کیا کرتا تھا
کسی بنتِ صنمستاں کا جنوں خیز خیال
ہر نفس میں تھی مرے زلفِ معنبر کی مہک
میری راتیں ہمہ نغمہ، ہمہ رنگ و بو تھیں
مری محفل کئی اصنام کا گہوارہ تھی
بادِ جاں بخش مرے ہجر میں آوارہ تھی
میں سرِ شاخِ چمن نغمہ فشاں رہتا تھا
لیکن افسوس کہ وہ ساعتِ غم آپہنچی
دل کے سینے میں کھٹکنے لگی عشرت میری
ایک شعلہ سا اٹھا جل گئی قسمت میری
اب نہ وہ بزمِ طرب ہے، نہ وہ صہبا نہ وہ رات
غم کا ویرانہ ہے اور اس میں بھٹکتی ہے حیات
جانے کس جرم و خطا کی ہے یہ پاداش الٰہی

کرشن چندر

ساجھے کا مُردہ

کرشن چندر کی یہ کہانی "شاعر" کے خاص نمبر ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ چند ماہ پہلے ایک ملاقات میں کرشن چندر نے شکایتاً کہا کہ "شاعر" میں اُن کی کہانی نامکمل شائع کی گئی ہے اور اِس طرح کہانی کا ستیاناس ہو گیا۔ اُن کے اِس انکشاف پر بڑی حیرت ہوئی۔ مطبوعہ کہانی اور مسودے کا مقابلہ کرایا گیا تو اُس کا کوئی حصّہ ایسا نہ تھا جو شائع نہ ہوا ہو۔

کرشن چندر دہلی اور کلکتے کے سفر کی بنا پر کئی مہینے بمبئی سے باہر رہے۔ واپس آکر انہوں نے خود اِس کی چھان بین کی، تو معلوم ہوا کہ اُن کے سکریٹری نے افسانہ کا نصف حصّہ نقل کیا تھا اور غلطی سے وہی "شاعر" کو بھیج دیا گیا۔

ادارہ "شاعر" کو ایک نہایت عمدہ مقصدی طنزیہ کہانی کے اِس طرح ناتمام شائع ہو جانے کا بے حد افسوس ہے۔ قارئین سے معذرت کے ساتھ، اب مکمل کہانی شائع کی جا رہی ہے۔ "خاص نمبر" میں ناتمام کہانی کی اشاعت کے بعد کچھ سوالات اُٹھے تھے۔ اُمید ہے کہ مکمل کہانی پڑھنے کے بعد قارئین مطمئن ہو جائیں گے اور کرشن چندر کے فکر و فن کی داد دیں گے۔

اُردو کے جن ڈائجسٹ رسائل نے "شاعر" سے یہ نامکمل کہانی نقل کی تھی اُن سے بھی درخواست ہے کہ وہ یہ مکمل کہانی دوبارہ شائع کر دیں گے۔ (ادارہ)

ساڑھے چار بجے کے قریب جب بھارگو کی بیوی اُس کے کمرے میں چائے کا پیالہ لے کر گئی تو اُس نے بھارگو کو اپنے پلنگ پر مُردہ پایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوپہر کا کھانا کھا کے قیلولے کے دَوران کسی وقت مر گیا تھا، جب کہ بھگوتی اپنے کمرے میں سلائی کی مشین پر اپنا بلاؤز سینے میں مصروف تھی۔ بھارگو ایک عرصے سے دِل کی بیماری میں مُبتلا تھا اور ڈاکٹر اُس کی حالت اچھی نہیں بتاتے تھے۔ پھر بھی اُس نے کئی برس گھسیٹ کر گذار دیئے تھے اور اُس کی بیوی بھگوتی کو مطلق یقین نہ تھا کہ وہ آج یُوں اچانک بھگت جائے گا۔

سب سے پہلے بھگوتی کے دِل میں خیال آیا کہ وہ ایک نعرہ کی چیخ مارے اور اپنے رونے پیٹنے سے سارے محلّے میں وحشت پھیلا دے، پھر یکایک اُسے اُس تجوری کا خیال آیا جس کی چابیاں بھارگو ہر وقت اپنی جیب میں رکھتا تھا اور کبھی اپنی بیوی کے حوالے نہ کرتا تھا۔ بھارگو کے چار بیٹے تھے۔ دو انگلینڈ میں، دو افریقہ میں۔ بھارگو نے اپنی جمع پُونجی میں سے اپنے چاروں بیٹوں کو اُن کے حصّے کے ڈھائی ڈھائی لاکھ دیدیئے تھے اور باقی رقم لے کر بمبئی چلا آیا تھا۔ یہاں باندرے کی ایک نئی مُضافاتی کالونی میں، اُوشا بلڈنگ میں، تیرھویں سڑک پر اُس نے پچیس ہزار کی مالیت کا ایک فلیٹ خرید لیا تھا اور اُس میں اپنی بیوی بھگوتی کے ہمراہ رہتا تھا۔ اُس کے بیٹوں نے اپنے باپ کے اِس اقدام کو پسند نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اُن کا باپ اپنی بقیہ پُونجی بھی اپنے بیٹوں میں بانٹ دے اور خود باری باری ہر ایک بیٹے کے پاس رہا کرے۔ مگر یہ بات نہ بھارگو کو پسند آئی نہ بھگوتی کو۔ اِس لئے بیٹے بھارگو سے بدظن ہو گئے اور اپنے اپنے حصّے کے ڈھائی لاکھ لے کر اُنہوں نے صبر کر لیا اور ماں باپ کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا۔

چند لمحوں کی خاموش کشمکش کے بعد بھگوتی نے چیخ مارنے

کا ارادہ ترک کر دیا۔ سب سے پہلے اُس نے بھارگو کی جیب سے تجوری کی چابی نکال کر اپنے قبضے میں کی۔ بھارگو کی جیب سے چابی نکالتے وقت بھگوتی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کیونکہ بھارگو بھگوتی کی طرح انتہائی خسیس اور محتاط آدمی تھا، وہ روپے پیسے کے معاملے میں کسی پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ ایک لمحے کے لئے بھگوتی کے دل میں خیال گذرا کہ چابی نکالتے وقت یکایک بھارگو کا ہاتھ حرکت میں آجائے گا اور وہ بھگوتی کی اِس جسارت پر زور کا ایک چانٹا بھگوتی کے رُخسار پر رسید کرے گا۔ لیکن جب جیب سے چابی نکالتے وقت بھارگو کے ہاتھ بے حِس و حرکت رہے اور جب اُس چابی سے تجوری کھول کر بھگوتی نے نوٹوں کی گڈیاں گِنیں اور اس وقت بھی بھارگو اپنے پلنگ سے اُٹھ کر تجوری کی طرف نہ آسکا، تو بھگوتی کو کامِل یقین ہو گیا کہ اُس کا شوہر مر چکا ہے۔ اُس نے تجوری بند کر کے چابی کو کس کے اپنے کمر بند سے باندھ لیا اور عین قریب زور کی چیخ مارنے کو تھی کہ یکایک اُس کی چیخ پھر ملتوی ہو گئی۔ کیونکہ اب بھگوتی کا دھیان اپنے مُردہ شوہر کے ہاتھ کی طرف گیا، جہاں دو بیش قیمت انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ ایک انگوٹھی نیلم کی تھی، دوسری ہیرے کی۔ بھگوتی نے سوچا، تھوڑی دیر کے بعد جب سب محلے والے اِکٹھے ہو جائیں گے اُس وقت تو میں چیخ پیٹ میں مصروف رہوں گی، اُس ہنگامے میں میرے لئے اپنے مُردہ شوہر کی انگوٹھیوں پر نظر رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔ لہذا اِنہیں ابھی سے اُتار لیتی ہوں۔ چُنانچہ بھگوتی نے جلدی سے اپنے شوہر کی انگلیوں سے دونوں انگوٹھیوں کو اُتار کر تجوری میں رکھ دیا۔

پھر اُس نے اپنے بال کھول ڈالے۔ دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھائے اور ایک لمبی خوفناک چیخ ماری۔ اور زور زور سے دو ہتھڑ مار کر اپنا سینہ کوٹنے لگی اور چلّا چلّا کر بَین کرنے لگی۔ اُسی وقت آس پاس کے فلیٹوں کے دروازے کھُلنے لگے اور عورتیں اور مرد بھاگے بھاگے بھارگو کے فلیٹ کے اندر آنے لگے اور جب بھگوتی نے دیکھا کہ آٹھ دس مرد عورتوں کا جمگھٹا ہو گیا ہے تو وہ سب کے سامنے روتی پیٹتی اپنے فلیٹ کی بالکونی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے کے لئے بھاگی۔ مگر سب لوگوں نے اُسے گھیر کر روک لیا۔

بمبئی میں شادی یا موت کا ہنگامہ چند گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ چند منٹ تک لوگوں کے حواس پر سراسیمگی چھائی رہی۔ کچھ عرصے کے لئے لوگ جوق در جوق فلیٹ کے اندر آکر اظہار افسوس کرتے رہے اور بھگوتی ...... کے فرش پر نیم دراز حالت میں تڑپتی ہوئی بین کرتی رہی۔ لوگوں نے بھارگو کو فرش پر لٹا دیا اور اُس کے جسم پر ایک چادر ڈال دی اور زیرِ لب افسوس کے کلمات بُدبُداتے ہوئے چلے گئے۔ گُمان کیا یقین تھا کہ چند گھنٹوں کے بعد بھگوتی کے رشتہ دار یا بھارگو کے رشتہ دار یا دونوں آئیں گے اور بھارگو کی لاش کو ٹھکانے لگا دیں گے اِس یقین کے ساتھ سب لوگ واپس اپنے اپنے فلیٹ میں چلے گئے۔ اور کرتے بھی کیا؟ فلیٹوں کی زندگی ہی ایسی ہوتی ہے۔ یہاں کوئی کسی کو نہیں جانتا، پھر یہ تو ایک نئی مضافاتی کالونی تھی، یہاں تو بالکل ہی کوئی کسی نہیں جانتا تھا، اِس لئے انسانی ہمدردی کی اُوپری سطح کو کھُرچنے کے علاوہ اور کیا ہی کیا جا سکتا تھا؟

البتہ چند لوگوں کو ضرور پریشانی تھی۔ ایک تو مجھے، کیونکہ جہاں میرا کھانے کا کمرہ تھا اُس کے بالکل اُوپر کے کمرے میں بھارگو کی لاش رکھی تھی اور اپنے کمرے میں کھانا کھاتے ہوئے مجھے بجا طور پر یہ احساس ہو رہا تھا گویا میں ایک لاش کو اپنے کندھے پر رکھ کر کھانا کھا رہا ہوں۔ مگر مجھے اِس لئے بھی پریشانی تھی کیونکہ میں بمبئی میں نووارد تھا۔ ورنہ بمبئی کے فلیٹوں کی زندگی میں یہ سب کچھ ممکن تھا۔ کیونکہ جہاں میرے سونے کا کمرہ ہے اُس کے بالکل اُوپر بغل والے فلیٹ کا باتھ روم ہے۔ اکثر اوقات اپنے پلنگ پر لیٹے لیٹے اچانک فلش کی آواز سے میں چونک کر بیدار ہو جاتا ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی صاحب میرے سر پہ بیٹھے ہوئے رفع حاجت میں مصروف ہیں حالانکہ مجھے شکایت نہ کرنی چاہیئے کیونکہ میرا باتھ روم بھی تو کسی کے بیڈ روم کے بالکل اُوپر ہو گا۔ اس لئے مجھے اس قسم کی

باتھ کا عادی ہو جانا چاہیئے۔ اب ایک لاش میرے کمانے کے کمرے کے بالکل اوپر پڑی ہے تو پڑی رہے۔ مجھے کیا؟ بھارگو کے رشتہ دار آئیں گے اور اُسے ٹھکانے لگا دیں گے۔ جب تک میں ریفریجیٹر کھول کر برف میں لگے ہوئے دو آم الفانزو کے کیوں نہ کھا لوں؟ مجھے زور کی بھوک لگی ہے اور میں نے اکثر دیکھا ہے کہ کسی کے مرنے کی خبر سُنتے ہی مجھے زور کی بھوک لگ آتی ہے، شاید یہ زندہ رہنے کی خواہش ہے جو زور سے اُبھر کر بھوک کی صورت میں نمودار ہوتی ہے! کیا معلوم؟ میں الفانزو کھاتے کھاتے اپنے مزاج کی اِس افتاد پر غور کرنے لگا۔

میرے علاوہ مگن بھائی کیمسٹ کو بھی پریشانی تھی، کیونکہ اُس کے فلیٹ کا دروازہ بھارگو کے فلیٹ کے بالکل سامنے کھُلتا تھا اور آتے جاتے دروازہ کھُلتے اُس کی بیوی بچے اپنے فلیٹ سے بھارگو کے ڈرائنگ روم کے فرش پر پڑی ہوئی لاش کو دیکھ سکتے تھے۔ بعض چند قدم کے فاصلے پر، لاش پر سے چادر سرک گئی تھی اور بھارگو کے کھچڑی بال اور اُس کے زرد کان کی ایک لَو نظر آ رہی تھی اور اُسے دیکھ کر مگن بھائی کے بچوّں کے جسم میں ایک عجیب سنسنی سی دوڑتی تھی اور مگن بھائی کی بیوی شاردا کو اُبکائیاں شروع ہو گئی تھیں۔ لاش ایک طرح سے موت کی مسلسل یاد دہانی ہوتی ہے اور اِس یاد دہانی کو کون پسند کر سکتا ہے۔ جتنی جلدی اِس سے چھُٹکارا مل جائے، اچھّا ہے۔

شام کے سات بجے کے قریب بھگوتی کا ایک ماموں آیا۔ بھگوتی کے ماموں کی شکل پیلے رنگ کے ایک امرود سے ملتی جُلتی تھی۔ ماموں بھی دل کے عارضے میں مُبتلا تھا، اِس لیے وہ بھی لاش کے قریب زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرا۔ اظہارِ افسوس کرنے کے بعد اُس نے بھگوتی سے اُس کے بیٹوں کا ایڈریس لیا۔ اُنہیں ٹیلی گرام بھجوانے کا وعدہ کیا۔ احمد آباد میں بھارگو کے کسی رشتہ دار کو بھی ٹیلی فون کرنے کا وعدہ کیا اور بھگوتی کے پاس اپنا ایک آدمی چھوڑ کر چلا گیا۔ ہم یہ سمجھے کہ تجہیز و تکفین کا بندوبست کرنے گیا ہے، مگر جب رات کے دس بج گئے اور بھگوتی کا ماموں نہیں لَوٹا تو ہم نے اُس کے آدمی سے پوچھا، جو لاش کے قریب بیٹھا تھا۔ وہ آدمی افسوس سے سر ہلا کر بولا۔ "ہم کو کچھ مالم نہیں ہم مُردے کا کیا ہوگا؟ ہم کو سیٹھ اِدھر بٹھا کے بول گیا ہے، اِدھر تم اکھّا رات بیٹھے گا۔ مُردے کا جو کوئی سگے والا آئے گا اُس کو مُردے کا مُنہ دکھائے گا۔ پھر چادر ڈال دے گا۔ ہم سارا رات مُردے کے پاس اِس کام کے لئے بیٹھے گا۔ ہم کو اِس کام کے واسطے دس روپیہ سیٹھ دے گیا ہے، صبح چھ بجے ہم چلا جائے گا۔"

"تو کیا آج رات بھر لاش اِسی بلڈنگ میں پڑی رہے گی؟" مگن بھائی نے اُس سے پوچھا۔

"ہم کو کیا مالُم؟" وہ آدمی خفا ہو کر بولا، "ہم کیا مُردے کے سگے والا ہے؟ ہم دس روپیہ رات کا لیتا ہے، جو آدمی آتا، اُس کو مُردے کا مُنہ دکھاتا ہے، تم کو دیکھنا ہو تو دیکھو، جاستی بات مت کرو!"

صبح چھ بجے وہ چلا گیا۔ ہم نے اُسے بہت روکا۔ مگر نہیں رُکا۔ ہم نے اُس سے بھگوتی کے ماموں کا پتہ مانگا۔ اُس نے نہیں دیا۔ بولا، "ہم کو کیا مالُوم؟ سیٹھ نے دوکان پر ٹیلیفون کر کے ہم کو منگایا تھا۔ اب ہم جاتا ہے۔"

"لیکن کہاں؟" میں نے پوچھا

"دوسرے مُردے کے پاس!"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

رات تو کسی طرح گُزر گئی، لیکن یہ دن کسی طرح نہ گُزرتا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے، اگر مُردے کو جلد ٹھکانے نہ لگایا گیا تو لاش سڑنے لگے گی، اِس لیے جب دوسرے دن صبح کے دس بج گئے اور بھگوتی یا بھارگو کا کوئی رشتہ دار لاش کو اُٹھانے کے لیے نہ آیا، تو ہم سب لوگ پریشان ہونے لگے اور بلڈنگ کے لوگ بھارگو کے فلیٹ کے باہر اکٹھا ہونے لگے!

بھگوتی نے بتایا کہ اُس کا ماموں رات سے اب تک نہیں آیا تھا۔ ہم نے بھگوتی سے ٹیلی فون نمبر لے کر اُسے ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ نہیں آ سکتا۔ لڑکے انگلینڈ میں تھے، وہ نہیں آ سکتے تھے، دوا فریقہ میں تھے وہ نہیں آ سکتے تھے۔ احمد آباد میں جو رشتہ دار ہے اُس کے آنے کی کوئی امید نہیں ہے کیونکہ بھگوتی کے بیان کے مُطابق کچھ روپئے پیسے کا جھگڑا تھا۔

دوسرے دن، صبح دس بجے یکایک بلڈنگ والوں پر انکشاف ہوا کہ اِس میت کو اُنہیں ہی سنبھالنا پڑے گا۔ اِس پر سب لوگ پہلے تو پریشان سے ہوئے۔ پھر ایک دم سب کی بشاشت عود کر آئی اور سب لوگ اپنا کام کاج چھوڑ کر میت کو سنبھالنے میں مصروف ہو گئے۔ کیونکہ بے چاری بھگوتی تو عورت ذات تھی، اُسے نہ تو کچھ معلوم تھا، نہ اُس سے کوئی کچھ پوچھ سکتا تھا۔ بے چاری کا سہاگ لُٹ چکا تھا۔ رات بھر روتے روتے اُس کی آنکھیں سوج گئی تھیں اور سُرخ انگارہ سی دہکتی تھیں۔

چنانچہ اِس کام کو سرانجام دینے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس کا سکریٹری مجھے منتخب کیا گیا اور خزانچی شرف الدین بوہرہ کو جو ہماری بلڈنگ کا سب سے امیر آدمی تھا۔ تین آدمی ہماری امداد کے لئے اِس کمیٹی میں شامل کئے گئے۔ پنڈت دیا رام پراشر، کہ وہ بڑے مذہبی اور تجربہ کار برہمن تھے۔ اب تک کئی درجن میتوں کا بھگتان کر چکے تھے۔ مہاشے بھولا ناتھ، کہ اُن کے گھر میں ٹیلی فون تھا اور مکّن بھائی کیمسٹ کہ لاش کو جلد سے جلد ٹھکانے لگانے میں اُن کی دلچسپی سب سے زیادہ تھی۔ کیونکہ اُن کا فلیٹ بھارگو کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ مجھے اس لئے چُنا گیا کہ مجھے ہر مجلس میں سکریٹری چُن لیا جاتا ہے۔ کیونکہ میرے پاس ایک ایسی مشفقانہ سی مسکراہٹ ہے جو ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ جس ہر کمیٹی ممبر اپنے ڈھب کا مطلب لے لیتا ہے۔ ہر کامیاب سکریٹری کے لئے ضروری ہے کہ وہ مونا لزا کی طرح مسکرا سکے!

مگر مُردے کو ٹھکانے لگانے کے معاملے میں میں بالکل کورا تھا۔ اس لئے پنڈت دیا رام پراشر نے مجھے بتایا کہ سب سے پہلے کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیئے اور اُس سے ڈاکٹری سرٹیفکٹ لینا چاہیئے، ورنہ مُردہ کسی طرح جلایا نہیں جا سکتا!"

"مرحوم کس ڈاکٹر کا علاج کرتے تھے؟" میں نے بھگوتی سے بار بار پوچھا۔ مگر وہ بے چاری رونے دھونے میں اِس قدر مصروف تھی کہ ٹھیک سے کچھ بتا نہ سکی۔ بس اتنا پتہ چلا کہ مرحوم نے مرنے سے چند روز قبل اپنا علاج بند کر دیا تھا اور چند روز قبل وہ ڈاکٹر شنباتی کے زیرِ علاج تھے۔

میں شرف الدین بوہرے کی گاڑی میں بیٹھ کر ڈاکٹر شاباتی کے مطب میں گیا تو بھارگو کا نام سُنتے ہی وہ بھڑک اُٹھا، "میں ہرگز ہرگز اُس کے لئے کوئی میڈیکل سرٹیفکٹ نہیں دوں گا! میرے تین ماہ کا بل اُس نے ادا نہیں کیا ہے۔ ڈھائی سو روپے کا!"

"آپ کے پیسے ادا ہو جائیں گے!" شرف الدین بوہرہ کا بل اطمینان سے بولا، "مرحوم ایک امیر آدمی تھا۔"

"ہم ابھی مرحوم کی بیوی یعنی بیوہ سے آپ کے پیسے لا کے دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"پہلے میرا بچھا! تین ماہ کا بل کوئی ادا کرے، اُس کے بعد مجھ سے سرٹیفکٹ مانگنے آئے!"

ہم لوگ گاڑی میں واپس آئے۔ میں نے اندر جا کے بھگوتی سے استفسار کیا تو بے چاری کراہتی ہوئی رونے لگی، "ہائے میں غریب بیوہ، مجھے ابھی سے لوگ لوٹنے لگے۔ مجھے تو کچھ معلوم نہیں، ہائے میرا سہاگ لُٹ گیا اور لوگ مجھ سے پیسے مانگتے ہیں۔"

آدھ گھنٹے تک وہ ایسے ہی ننگے فرش پر چھکی بین کرتی رہی، مگر تجوری سے اُس نے پیسے نکال کر نہیں دئے۔ ناچار بلڈنگ والوں نے چندہ کیا اور ڈاکٹر شاباتی کا بل چکایا۔ اور ڈاکٹر شاباتی کو بھارگو کے فلیٹ میں بُلا لائے۔ ڈاکٹر شاباتی نے بھارگو کی لاش کا معائنہ کرنے کے بعد کہا، "بلاشبہ مرحوم کی موت دل کی حرکت بند ہو جانے سے ہوئی ہے میں اِس امر کا سرٹیفکٹ دے سکتا ہوں۔"

میں بہت خوش ہوا۔ مارے خوشی کے مکّن بھائی کی باچھیں بھی کھِل گئیں، مگر مہاشے بھولا ناتھ کا مُنہ لٹک گیا، بولے، "یہ سرٹیفکٹ نہیں چلے گا!"

"کیوں نہیں چلے گا؟" پنڈت دیا رام پراشر نے ذرا تلخ لہجے میں پوچھا۔ پنڈت دیا رام پراشر، جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا ٹھیٹ سناتنی تھے اور مہاشے بھولا ناتھ پکّے آریہ سماجی، دونوں میں تناتنی رہتی تھی، مگر دھیمی دھیمی!

مہاشے بھولا ناتھ بولے۔ "اِدھر اگر سرٹیفکٹ میں ہارٹ فیلیور لکھ دیا تو پولس مُردہ جلانے نہیں دیتی۔ اُس مُردے کا پوسٹ مارٹم ہوتا ہے۔"

"ہمارے سرگودھے میں تو نہیں ہوتا ہے۔" پنڈت دیا رام پراشر نے حیرت سے کہا۔

"یہ سرگودھا نہیں، بمبئی ہے۔" مہاشے بھولا ناتھ نے فخریہ لہجے میں یوں کہا، جیسے کہہ رہے ہوں، "ڈَن اَپ!"

"ٹھیک کہتا ہے، مہاشے جی ٹھیک کہتا ہے۔" شرف الدین بوہرہ بولا، "اِدھر بمبئی کا رُول بھی ہے!"

"تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے جھوٹا سرٹیفکٹ دینا ہوگا" ڈاکٹر شابانی بولا۔

"جھوٹا کیوں؟" میں نے پوچھا، "بھارگو مر چکا ہے۔ اُس کی لاش تمہارے سامنے موجود ہے!"

"مگر مجھے مرض تو غلط لکھنا پڑے گا۔" ڈاکٹر شابانی بولا۔

"تاکہ لاش کا پوسٹ مارٹم نہ ہو سکے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" مگن بھائی بولا۔

"تو اِس کے لیے الگ فیس ہوگی!" ڈاکٹر شابانی نے اعلان کیا۔ "پندرہ روپے!"

میں نے اندر جا کر بھگوتی سے پندرہ روپے مانگے، مگر وہ مُنہ سے کچھ نہ بولی، سسک سسک کر اور کراہ کراہ کر روتی رہی۔ مگر اُس نے مجھے پندرہ روپے نہیں دیئے، تو میں نے اپنی جیب سے نکال کے دئے۔ تب ڈاکٹر شابانی نے سرٹیفکٹ دیا تو مہاشے بھولا ناتھ نے پوچھا، "مُردے کو جلایا کہاں جائے گا؟"

میں نے جواب دیا، "شمشان گھاٹ میں!"

"ہاں! ہاں! شمشان گھاٹ میں، مگر کس شمشان گھاٹ میں؟" مہاشے بھولا ناتھ نے پوچھا۔۔۔ سب سے اچھا شمشان گھاٹ تو میرن ڈرائیو پر ہے۔ شہر کے تمام بڑے بڑے اور امیر آدمی وہیں جلائے جاتے ہیں۔ بھگوتی کا کیا ارادہ ہے؟"

جب بھگوتی سے پوچھا، تو وہ زور زور سے رونے لگی، "ہائے جب میرا سہاگ ہی لُٹ گیا تو اچھے بُرے کی کیا تمیز، اسے کہیں بھی جلا دو اور ہو سکے تو مجھے بھی اُس کے ساتھ جلا دو!"

مہاشے بھولا ناتھ نے میرن ڈرائیو کے شمشان گھاٹ پر ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ گھاٹ پر ہاؤس فُل ہے۔ رات تک کے لئے لاشوں کی بکنگ ہو چکی ہے، ایک جگہ بھی خالی نہیں ہے۔ مجبور ہو کر ہم لوگ سانتا کروز کے شمشان گھاٹ پر گئے، شرف الدین بوہرہ کی گاڑی میں بیٹھ کر۔ معلوم ہوا سانتا کروز کا شمشان گھاٹ بھی فُل ہے۔ کل صُبح تک ایک سیٹ نہیں مِل سکتی!

"تم ہندوؤں کے یہاں بہت لفڑا ہے، جلانے کا!" شرف الدین بوہرہ نے بڑی بیزاری سے اعلان کیا۔ ٹیکسی میں شرف الدین کے سوا باقی سب ہندو تھے، اِس لئے سب کا خون کھول گیا۔ مگر سب چُپ رہے کیونکہ گاڑی شرف الدین کی تھی۔

سانتا کروز سے ہم لوگ واپس باندرہ کے اُس شمشان کی طرف گئے، جو ریلوے اسٹیشن کے یارڈ میں واقع ہے۔ اُس شمشان گھاٹ تک پہنچنے کے لئے بیچ میں ریلوے کے دو کراسنگ پڑتے ہیں جن کے دروازے اکثر ریلوے والوں کی اپنی ضرورت کے مطابق کُھلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ سانتا کروز سے باندرہ کے اسٹیشن یارڈ کے اندر پہنچتے پہنچتے ایک گھنٹہ اور بیت گیا۔ شمشان گھاٹ کا مہتمم بڑی مُشکل سے مانا۔

"آج بہت رَش ہے۔" وہ سر ہلا کر بولا۔

"کسی طرح سے ہمارا مُردہ لے لو، رات سے سڑ رہا ہے۔" میں نے اُس کی مِنّت سماجت کی۔

"چار لہاسیں (لاشیں) ابھی آنے والی ہیں اور دو جل رہی ہیں۔" مہتمم میری طرف خشونت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا، "جگہ کدھر ہے دیکھتے نہیں ہو؟"

پنڈت دیارام پراشر اُسے ایک کونے میں لے گئے۔ چند منٹ تک اُس سے کچھ کھُسر پھُسر کرتے رہے، آخر وہ رام ہو گیا۔ پنڈت دیارام مہتمم کے ساتھ ہمارے گروپ میں واپس آئے تو کامیابی سے اُن کا چہرہ کِھلا ہوا تھا، بولے، "ہو گیا کام!"

مہتمم نے سر ہلا کر کہا، "لے آؤ، مگر دو گھنٹے کے بعد آنا۔ اِس سے پہلے لاؤ گے تو اندر گھُسنے نہیں دوں گا!"

جب ہم لوگ سب طے کر کے واپس شرف الدین بوہرہ کی گاڑی میں بیٹھے تو پنڈت دیارام پراشر نے بتایا کہ مہتمم اپنی شمشان گھاٹ کا ٹھیلہ بھیج رہا ہے۔ مُردہ اُٹھانے کے لئے!

"کیسا ٹھیلہ۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"چار پہیوں والا ٹھیلہ ہوتا ہے، جس پر مُردے کو رکھ کر لے جاتے ہیں!"

"مُردے کو تو کندھوں پر لے جاتے ہیں نا!" میں نے پوچھا۔

"وہ مرگھٹ میں لے جاتے ہوں گے۔" مہاشے بھولا ناتھ نے اعلان کیا۔ "بمبئی میں نہیں لے جاتے۔" اور فخریہ انداز سے پنڈت دیارام پراشر کی طرف دیکھا۔

پنڈت دیارام پراشر نے جل کر کہا، "اسے کیسا ہے تمہارا شہر بمبئی۔ نہ کرم کا پتہ، نہ لوک لاج کی جگہ، شمشان گھاٹ والے کو چار رد پئے دیئے ہیں جب اس نے ٹھیلہ بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔"

مہاشے بھولا ناتھ کا چہرہ اتر گیا۔ پنڈت دیارام پراشر نے ٹھیلے کے لئے چار روپئے دے کر گویا اسے چپت ماری تھی مگر وہ بھی اس کا بدلہ لے کر رہے گا۔ ذرا ٹھہر جا!

ہم لوگ پھر واپس اپنی بلڈنگ میں پہنچے۔ اس وقت دوپہر کا ایک بج رہا تھا اور مُردے کی سڑاند سے ساری بلڈنگ میں کھلبلی کی سی باس پھیل گئی تھی۔ اور مرد، عورتیں، بچے گھبرا کر اپنے اپنے فلیٹوں سے باہر نکل آئے تھے۔ اور بلڈنگ کے احاطے میں ٹولیاں بنائے کھڑے تھے اور انتہائی پریشان دکھائی دیتے تھے ہماری گاڑی کو احاطے میں آتا دیکھ کر سب ہماری طرف بھاگے اور ہم پر متوحش نگاہیں ڈالتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"کیا ہوا؟"

"کس شمشان گھاٹ میں جگہ ملی؟"

"مُردہ کب جائے گا؟"

"مُردہ سڑنے لگا ہے!"

"مُردے کا پیٹ پھول رہا ہے!"

"بڑا واہیات حادثہ ہے صاحب! میں تو سمجھتا ہوں۔ ایسے میں جب متوفی کا کوئی رشتہ دار بھی یہاں موجود نہیں ہے، ہمیں سیدھے سیدھے پولس کو ٹیلی فون کر کے مُردے کو ان کے حوالے کر دینا چاہیئے!"

"نہیں تو میونسپلٹی کمیٹی کو فون کر کے مُردے کو ان کے حوالے کر دینا چاہیئے۔ عجیب مصیبت ہے، مرے کوئی بھگتیں ہم!"

سب لوگ بولائے ہوئے تھے اور زور زور سے ہاتھ ہلا ہلا کر بات کر رہے تھے۔ اور وہ لوگ بہت برانگیختہ معلوم ہوتے تھے۔ مگر جب ہم نے بتایا کہ شمشان گھاٹ ریزرو ہو گیا ہے اور مُردہ جلانے کا انتظام ہو گیا ہے، تو سب کی جان میں جان آئی۔

"جب تک ٹھیلے والا آتا ہے،" پنڈت دیارام پراشر بولا، "ہم لوگ باقی چیزوں کا انتظام کر لیں!"

"اب اور کیا چاہیئے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "مُردے کو ٹھیلے پر لاد کر گھاٹ لے جائیں گے اور جلا دیں گے!"

مہاشے بھولا ناتھ میری طرف دیکھ کر یوں مسکرائے جیسے کوئی بھولے بچے کی حماقت پر مسکرا رہے ہوں۔ پچکارنے کے انداز میں! "بیٹا! ابھی جلانے کی منزل بہت دور ہے!"

"ابھی تو پھول آئیں گے ارتھی کے لئے،" پنڈت پراشر انتہا شفقت سے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولے۔

"اور گھی آئے گا جلانے کے لئے۔" مہاشے بھولا ناتھ مجھے جلاتے ہوئے بولے۔

"اور کوری چادر آئے گی مُردے پر ڈالنے کے لئے۔" پنڈت پراشر نے مجھے بتایا۔

"اور ایک رنگین ریشمی چادر آئے گی ارتھی پر ڈالنے کے لئے" مہاشے بھولا ناتھ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

"اور پھول بتاشے، بادام، چھوارے اور کچھ نقدی چاہیئے" پراشر بولے۔

"کاہے کے لئے؟"

"جب ارتھی چلے گی تو اس پر پیسے وارے جائیں گے!"

"اور ایک کوری مٹکی آئے گی، کمہار سے" "وہ شمشان گھاٹ کے باہر توڑی جائے گی۔"

"اور ان سب کاموں کے لئے پیسہ کہاں سے آئے گا؟" میں نے پوچھا۔ "میں ہر فلیٹ والے سے دس روپیہ چندہ لے چکا ہوں!"

سب لوگ خاموشی سے میرا منہ تکنے لگے، مگر اپنے پُر معنی انداز میں گویا مجھے کہہ رہے ہوں، ایک دفعہ پھر کوشش کر کے دیکھو

"اچھا کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری بھٹاگو کے فلیٹ کے اندر چلا گیا۔

اندر سخت بدبو تھی۔ ڈرائنگ روم کے فرش پر مُردہ اکیلا پڑا تھا۔ دوسرے کمرے میں چند عورتوں نے بھٹاگو کی بیوی کو گھیر رکھا تھا اور اسے زبردستی دودھ پلا رہی تھیں۔ اور وہ سسک سسک کر انکار کر رہی تھی۔ "نہیں، میں نہیں پیوں گی، میں مر جاؤں گی مگر میں دو

سا پیونگی، ہرگز نہیں پیونگی!"

"کل دوپہر سے بھوکی ہے بے چاری" چاچی گوپال دیوی نے
ت دیا رام پراشر کی بیوی سے کہا۔

چنانچہ دو عورتوں نے ملکر بھگوتی کی ٹانگیں پکڑلیں۔ ایک نے
بازو، دوسری نے دوسرا بازو۔ تیسری نے آگے بڑھ کر دودھ
س بھگوتی کے منہ سے لگادیا۔ بھگوتی بے چاری ناں ناں کرتی
ا اور دودھ پیتی رہی۔ سوا سیر کا گلاس تھا، پنجابی لسّی والا
وڑی دیر میں گلاس خالی ہوگیا۔

جب میں نے اندر آکر سب چیزیں گنائیں جو بازار سے
ن گی، جن کے لئے روپیوں کی شدید ضرورت تھی، تو بھگوتی نے
زور زور سے رونا شروع کردیا۔ "ہائے میں لُٹ گئی، برباد
لئی، میرا تو یہاں کوئی ہے ہی نہیں، کوئی بیٹا ہوتا، تو سب کچھ
نبھال لیتا، اب میں کس کے پاس جاؤں، کس سے پیسے مانگوں
ے مرنے والے اپنے ساتھ مجھے بھی کیوں نہ لے گئے؟"

میں سر جھکا کر فلیٹ کے باہر چلا آیا۔

مجھے اداسی سے چلتا دیکھ کر ایک صاحب جو غالباً قریب کی کسی
نگ سے افسوس ظاہر کرنے کے لئے آرہے تھے، اپنی لمبی تھوتھنی
لکائے میری طرف بڑھے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنی آنکھوں میں
سو اور آواز میں لرزش لاکر بولے "بڑا افسوس ہے آپکا باپ مرگیا"

"ارے وہ میرا باپ نہیں تھا حرامی!" میں نے گرج کر کہا۔ "وہ
ارگو تھا، بھارگو، میرا ہمسایہ!" میں نے زور سے چلا کر کہا۔
بخت بھارگو! جب تک زندہ رہا، پکے راگ سُنا سُنا کر میرا
نت برباد کرتا رہا۔ اُس کی آواز ایسی تھی جیسے کسی کے گلے میں
پڑ پھنس جائے۔ پاپڑ سمجھتے ہو پاپڑ؟ کم بخت مرنے کے بعد
ی پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

میں غم اور غصّے سے اپنے سر کے بال نوچنے لگا، وہ آدمی شرمندہ
ر کر وہاں سے ٹل گیا۔

اتنے میں شرف الدین بوہرہ وہاں آگیا۔ اور بولا۔ "بلڈنگ
الوں نے پانچ پانچ روپے کا مزید چندہ دیا ہے۔ پنڈت دیارام
راشر اور مہاشے بھولا ناتھ باقی چیزوں کا انتظام کرنے میں مصروف
یں۔ تم اِس قدر گھبراتے کیوں ہو؟"

تین بجے تک سب سامان آگیا۔ ٹھیلے والا بھی رتھ کے چار پہیوں
والا ٹھیلا لے کر پہنچ گیا۔ ارتھی کے پھول تو آگئے تھے، مگر ارتھی سجانے
کے لئے بانس کی کھپچیاں منگانا سب بھول گئے تھے۔ جلدی سے مگن
بھائی کیسٹ اپنی گاڑی لے کر اندھیری بھاگا۔ اور بانس کی کھپچیاں
لے کر آیا۔ جو ٹھیلے کے اردگرد چاروں طرف باندھی گئیں اور پھر ان پر
رنگین کاغذ منڈھے گئے۔ رنگین کاغذ منڈھنے کے لئے رنگین کاغذوں
کی ضرورت محسوس ہوئی اور جب وہ ضرورت پوری ہوئی تو منڈھنے
کے لئے گوند کی ضرورت پڑی، اور جب گوند آگیا تو کسی کو خیال آیا
کہ مُردے کو باندھنے کی رسیاں موجود نہیں ہیں۔ اس میں خاصی بھاگ
دوڑ ہوئی۔ مگر اب خیریت یہ تھی کہ کمیٹی کے علاوہ بلڈنگ کا ہر فرد
بشر مُردے کے سلسلے میں کسی نہ کسی کام میں جُٹا ہوا تھا۔ بھاگ بھاگ
کر اور ایسی تندہی سے کام کررہا تھا کہ اگر یہی خلوص اور جذبہ مُلکی
منصوبے میں صَرف ہو تو پنج سالہ پلان تین سال ہی میں مکمل ہو جایا
کرے۔ ہم سب لوگ عجیب بحرانی کیفیت میں گرفتار تھے کیونکہ وقت
گزر رہا تھا اور مُردہ پھول رہا تھا۔ بڑی احتیاط سے مُردے کو
نہلایا گیا۔ اِس احتیاط سے کسی مغل شہزادی کو بھی نہلایا نہ گیا ہوگا کیونکہ
ہر لحظہ یہی ڈر غالب تھا۔ کہیں اس کا پیٹ نہ پھٹ جائے۔ جو اس
دوران میں برابر پھولتا ہی جارہا تھا۔

نہلانے کے بعد جب ہم لوگ میّت کو فلیٹ سے باہر نکالنے لگے
تو بھگوتی نے زور کی ایک پچھاڑ کھائی اور بھارگو کو اُس کے ساتھ ستی
ہو جانے کی دھمکی دی۔ جسکا مُردے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بہت سی عورتیں
آنسوؤں کے بغیر رو رہی تھیں اور جن عورتوں کی آنکھوں میں آنسو تھے
وہ شدید بدبو کی وجہ سے تھے۔

دو آدمیوں نے مُردے کو سر کی طرف سے پکڑا۔ دو آدمیوں نے
ٹانگوں کی طرف سے۔ دو آدمیوں نے بیچ کے دھڑ کو سہارا دیا۔
لاش ہوے ہوے باہر نکلنے لگی۔ تو پنڈت دیارام پراشر بولے۔ "پہلے
سر باہر نکلے گا!"

"نہیں پہلے ٹانگیں جائیں گی!" مہاشے بھولا ناتھ نے انکار کیا۔

"گھر سے نکلتے وقت ہمیشہ میّت کا سر آگے ہوتا ہے!"

"بالکل غلط!" مہاشے بھولا ناتھ بڑی سختی سے بولے۔ "پیر آگے

ہوتے ہیں۔"

"منش کی آتما اُس کے سر میں ہوتی ہے۔" پراشر نے شاستر کا حوالہ دیا۔

"لیکن سوُرگ تک پہنچنے کے لیے تو پیدل ہی جانا پڑے گا، پاؤں سے۔" مہاشے بھولا ناتھ بولے۔

"تم مجھے سمجھاتے ہو؟" پنڈت پراشر غصّے سے چلّا کر بولے۔ پچھتّر برس کی میری عمر ہو گئی ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی ـــــ میرا مطلب ہے گھاٹ گھاٹ کا مُردہ جلا چکا ہوں۔ تم مجھے انتم سنسکار کے بارے میں کیا بتا سکتے ہو؟" میں کہتا ہوں اگر اس گھر سے مُردہ نکلے گا تو سب سے پہلے اس کا سر نکلے گا۔" پنڈت پراشر نے گرج کر کہا۔

"نہیں اس کی ٹانگیں نکلیں گی!" مہاشے بھولا ناتھ اپنے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولے۔

"لڑتے کیوں ہو،" شرف الدّین بوہرہ بولا۔ "ٹاس کر لو!"

لمبی چوڑی بحث و تمحیص کے بعد قرار پایا کہ ڈرائنگ روم سے نکالتے وقت تو مُردے کی ٹانگیں آگے رہیں گی۔ لیکن کوریڈور سے زینہ اُترتے ہوئے سر آگے کر دیا جائے گا کہ اس سے زینہ اُترنے میں آسانی رہے گی۔ اِس مفاہمت پر دونوں فریق راضی ہو گئے اور مُردہ فلیٹ سے نکل کر زینے پر آ گیا۔

مگر زینہ اُترنے میں بڑی دقت تھی کیونکہ بمبئی کے فلیٹوں کے زینے مُردوں کے لیے نہیں بنائے گئے ہیں ـــــ زندوں کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ایک وقت میں ایک ہی آدمی اُن پر چل سکتا ہے۔ یہاں مُردے کو چھ آدمی سنبھالے ہوئے تھے۔ دو سر کی طرف سے دو ٹانگوں کی طرف سے اور دو دھڑ سے، اور زینے پر صرف ایک آدمی کے گذرنے کی جگہ تھی اور وہ بھی جب کہ وہ خود زندہ ہو اور اپنے پاؤں سے چل رہا ہو ـــــ اِس لیے اب کیا ہو؟

"بڑی مصیبت ہے،" بدری پرشاد پائلیٹ بولا۔ "میرے خیال میں تو ارتھی ورتھی اولڈ فیشنڈ ہو چکی ہے۔ اب تو مُردے کو سر، دھڑ، ٹانگیں اور بازو سے الگ الگ کاٹ کے بوری میں بھر کے سمندر میں ڈال دینا چاہیئے۔ یہ طریقہ سب سے سائنٹفک ہے!"

میں نے کہا، "بہت سے لوگ بمبئی میں یہی طریقہ استعمال کرتے ہیں، لیکن اُن کا نام دوسرا ہوتا ہے۔"

"کیا؟"

"قاتل!"

میرا جواب سُن کر پائلٹ چُپ ہو گیا اور ہم لوگ کسی نہ کسی طرح سے لاش کو زینے سے اُتار کر نیچے احاطے میں لے آئے اور اُسے ٹھیلے پر باندھ دیا۔ اُوپر سے ریشمی چادر ڈال دی اور ارتھی کو پھولوں سے سجا دیا۔ اور 'رام نام ست ہے' کرتے ہوئے تیز تیز قدموں سے ٹھیلے کو چلاتے ہوئے سڑک پر بڑھ گئے کیونکہ دھوپ بہت تیز تھی اور ہمارے پاس ارتھی پر وارنے کے لیے پیسے زیادہ نہیں تھے۔ پھر بھی جو تھے وہ ہم جگہ جگہ راستے میں مٹھی بھر بھر کر وارتے جاتے تھے۔ اُنہیں لوٹنے کے لیے لڑکوں کا ایک جمِ غفیر ارتھی کے ساتھ ہو لیا۔ ایک دونی پر دس دس لڑکے پلے پڑتے تھے۔ کئی بچّوں کو چوٹیں آئیں مگر اُن میں جو ثابت قدم تھے اُنہوں نے آج شام کی پکچر کے پیسے بنا لیے اور شمّی کپور کی فلم "جنگلی" دیکھنے کے لیے آدھے راستے ہی سے لوٹ گئے۔

راستے میں ریلوے کا ایک پھاٹک بند ملا۔ اور پندرہ بیس منٹ انتظار کرنے کے بعد بھی جب نہیں کھلا تو پھاٹک والے کی مٹھی گرم کرنے کے بعد کھلوایا گیا اور ارتھی کو آگے بڑھایا گیا۔ شمشان گھاٹ کے باہر ارتھی کو روک کر کوری مٹکی سے جس میں پانی بھرا ہوا تھا پانی ارتھی کے چاروں طرف گرا کر مٹکی کو توڑ دیا گیا اور ٹھیلے کو شمشان گھاٹ کے اندر دھکیل دیا گیا۔

اس شمشان گھاٹ میں چھ لاشوں کو جلانے کی جگہ تھی۔ چھ بڑے بڑے انگیٹھے تھے۔ آدمی کے قد کے برابر، جن کے اِردگرد لوہے کے پول کھڑے تھے۔ اور اُن کے نیچے لوہے یا کنکریٹ کے سپورٹ تھے تاکہ جلتے وقت لکڑیاں اِدھر اُدھر نہ بکھر جائیں اور لاش کم سے کم لکڑیوں کے سہارے جل سکے!

"کتنی لکڑیاں درکار ہوں گی؟" مہاشے بھولا ناتھ نے شمشان گھاٹ کے مہتم سے پوچھا۔

مہتم نے لاش کو اچھی طرح ٹٹولنے کے بعد شکایتاً کہا، "یہ تو بہت موٹا ہے!"

"کیا مطلب مگن بھائی کیمسٹ غرّایا۔ کیونکہ وہ خود بھی بہت موٹا تھا۔

"مطلب یہ کہ مُردہ موٹا ہے۔" مہتم بڑی اُکتاہٹ اور بیزاری سے بولا۔ ایک کھنڈی لکڑی میں ایک مُردہ جلتا ہے، مگر یہ مُردہ ایک کھنڈی میں نہیں جلے گا!"

"ایک کھنڈی لکڑی ہوتی کتنی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چار سو کلو!" مہتم نے کہا۔

"چار سو کلو لکڑی کے پیسے کتنے ہوں گے؟" پراشر نے پوچھا

"۴۰ روپے۔"

"رام، رام!" پراشر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا، "ہمارے سرگودھے میں تیس سات روپے کی لکڑی کافی ہوتی تھی۔"

"یہ سرگودھا نہیں ہے، بمبئی ہے!" مہاشے بھولا ناتھ نے بڑے فخر سے پراشر کو بتایا۔

پراشر گھبرا کر پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔ جس کی شاخوں پر بہت سے گدھ بیٹھے ہوئے تھے۔ لاش انگیٹھے کے باہر رکھی تھی۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ "میرے پاس تو اب مشکل سے ایک کھنڈی لکڑی کے پیسے ہوں گے!"

"ایک کھنڈی کافی ہوگی جی۔" مہاشے بھولا ناتھ بولے۔ "بھارگو کو ایک کھنڈی میں جلنا پڑے گا۔ ہم نے بہت کچھ کر دیا ہے اُس کے لئے۔ بس!! ایک کھنڈی کافی ہے۔"

"تمہاری مرضی۔" مہتم مکمل بے زاری سے بولا، "ہم ایک کھنڈی لکڑی دے کر مُردے کو آگ لگاتا ہے، اگر مُردہ نہیں جلا اور پورا نہیں جلا، آدھا ہی جلا، تو ہم مُردے کو ایسے ہی چھوڑ دیں گے۔"

"ایسے کیسے چھوڑ دیگا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"اور کیا کرے گا، ابھی دو دن کا بات ہے۔ اِدھر ایک غریب بُڈھی آیا۔ اپنے مرد کا مُردہ لے کر۔ ہم مُردہ جلایا، مردہ آدھا جلا تھا کہ مون سون آگیا۔ بارش میں لکڑی بجھ گیا۔ مُردہ آدھا جلا آدھا باقی رہا۔ بُڈھی کے پاس پیسہ نہیں تھا۔ وہ اِدھر دن بھر رکھڑتا رہا۔ رات کے سمے ایک رحم دل لاش والا آیا۔ اس نے اپنے سگے والے کے مُردے کے سنگ اُس بُڈھی کے مُردے کا پیسہ بھی دیا۔ تو مُردہ جلا ——— اور یہ مُردہ تو بہت موٹا ہے!"

"اچھا تو تم دو کھنڈی لکڑی کا پیسہ لے لو، مگر وعدہ کرو، کہ مُردہ ٹھیک سے جل جائے گا؟" شرف الدّین بوہرہ نے تصفیہ کرتے ہوئے کہا۔

"ارے دو کھنڈی لکڑی میں تو ایسا جلے گا کہ ہڈی تک [illegible] ہو جائے گی۔" مہتم لکڑی تولنے کا بڑا ترازو ٹھیک کرنے [illegible]

شام کے چھ بجے تھکے ہارے جب ہم شمشان گھاٹ سے لوٹے تو بلڈنگ کی عورتوں نے بتایا کہ تین دن کے بعد چوتھا ہو [illegible] اور چوتھے کا خرچہ الگ سے ہوگا۔

یہ خبر سن کر میں نے اسی وقت میت کمیٹی کے سکریٹری [illegible] عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

"ارے ایسا مت کرو۔" شرف الدّین بوہرہ مجھے سمجھا [illegible] "آخر ایک دن تم کو بھی ———"

"کیا بات کرتے ہو شرف الدین؟" میں نے تیزی سے [illegible] ٹوکتے ہوئے کہا، "کیا ہے یہ شہر تمہارا؟ جہاں زندگی اِس قدر [illegible] ہے اور موت اسقدر مہنگی ہے۔ یہاں اگر آپ کے پاس [illegible] نہیں ہے تو آپ سلیقے سے مر بھی نہیں سکتے، میں تو آج ہی [illegible] فلیٹ خالی کر کے بمبئی سے باہر جا رہا ہوں!"

شاعر بمبئی

صبا رسی

انور لاج

شہر کی ساری رنگینیاں اور رعنائیاں سمٹ کر ایک مرکز پر آ گئی تھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے انور لاج کی فضا شراب و شعر میں ڈوب گئی ہو۔ دن چھپتے ہی بجلی کے تیز قمقموں، وسیع و عریض لان کے کنارے مہکتے ہوئے بیلے اور جوہی کے پھولوں، دل کش موسیقی کے سہارے اُبلتے ہوئے فلمی نغموں نے ایسا طرب خیز اور رومان انگیز ماحول بنا دیا تھا کہ حدِ نظر تک بہاریں اور رنگینیاں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ ریحانہ جس کی تقریب سالگرہ منائی جانے والی تھی وہ اپنی شوخیوں اور اُمنگوں سے بھرپور نوعمر سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی، اُس کے چہرے سے فکر کے آثار نمایاں تھے، اُس کی نگاہیں جیسے کسی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔

اِسی اثنا میں ایک بیوک کار آکر رُک گئی، کار کو دیکھتے ہی ریحانہ کے جسم میں جیسے زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ ایک خوبصورت تتلی کی طرح اُڑ کر کار کے قریب پہنچ گئی اور نِگار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر شامیانے کی طرف اِس طرح خوشی خوشی بڑھی جیسے نِگار اُس کی گہری سوچ کا حل بن کر آ گئی ہو۔

اُن کی وہ آمد آمد اپنا یہاں یہ عالم اک رنگ آ رہا ہے اک رنگ جا رہا ہے

ریحانہ نے یہ شعر سُنا کر انتظار کی اذیتوں کی ترجمانی کر دی تھی۔

"میں شرمندہ ہوں کہ تم کافی بور ہوئیں، لیکن میری اپنی چند مجبوریاں تھیں جن کی وجہ سے میں جلد نہ آ سکی۔"

اِسی اثنا میں سعیدہ آ گئی اور اُس نے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "شکایتیں پھر کر لینا، چلو! مہمان منتظر ہیں۔"

کیک کاٹنے کی رسم ایسے کیف آور اور مسرت بخش ماحول میں ہوئی کہ انور لاج نقرئی قہقہوں اور دِل کش نغموں سے گونج اُٹھا۔ مُبارک، سلامت کی آوازوں کے درمیان ریحانہ پھولوں سے لد گئی۔ تحفوں سے میزیں بھر گئیں۔ رسمِ سالگرہ سے فارغ ہوتے ہی مہمان ڈنر کی میزوں کے گرد اکٹھا ہونے لگے۔ انواع و اقسام کی ڈِشیں مزے مزے لے کر کھائی گئیں۔ کھانے سے فرصت ہوئی تو رات گئے تک دُنیا جہاں کی باتیں ہوتی رہیں۔ ریحانہ نِگار اور دوسری بے تکلف سہیلیوں کو اپنے کمرے میں لے آئی۔ یہ ایک بڑا کمرہ تھا، جِسے پلائی وُڈ کے ذریعہ دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ جہاں ریحانہ اور اُس کی سہیلیاں انتہائی بے تکلفی کے ماحول میں باتیں کر رہی تھیں۔

"عارف مُصر تھے کہ میں نہ جاؤں لیکن تمہاری محبت کی ڈور مجھے کھینچ لائی۔" نگار نے بات شروع کی۔

"اللہ اللہ! اُنہیں ایک لمحہ کی جُدائی بھی گوارا نہیں۔"

"ایسی بات نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"یہ خود عارف کا دامن چھوڑنا نہیں چاہتیں" رضیہ نے جُملہ چُست کیا۔

"ریحانہ! عارف سے تم واقف ہو، وہ بُلبُلِ رنگین نوا کو نہ تو مائلِ پرواز دیکھ سکتے ہیں اور نہ مصروفِ نغمہ باری، وہ اُسے پنجرے میں بند کر کے دُور سے دیکھنے کے عادی ہیں۔"

"کیا کہہ رہی ہو نگار! عارف تو تمہیں دیوانگی کی حد تک چاہتا ہے۔"

"ہاں، یہی تو المیہ ہے کہ بوریت کی حد تک چاہت مجھے

متین، خاموش اور پُر خلوص محبت کی میں پرستار ہوں۔

"عارف کو دیوانہ بنانے میں تمہارا ہی ہاتھ ہے نگار" رضیہ نے پھر چوٹ کی۔

"مجھے غلط نہ سمجھو! عورت جب اپنے لطیف جذبات کو ظاہر کر دیتی ہے تو اپنی دلکشی کھو دیتی ہے، اور یہ غلطی میں نے نہیں کی۔"

رضیہ اور صالحہ، نگار اور ریحانہ کو مصروفِ گفتگو چھوڑ کر چلی گئیں۔

ریحانہ نے نگار کے قریب کھسکتے ہوئے دھیرے سے پوچھا۔

"اپنی محبت کو دل میں چھپائے رہو لیکن یہ تو بتاؤ عارف سدِّ راہ کیوں بنے ہوئے تھے۔"

"وہ پکچر کا پروگرام بنا چکے تھے، مُغلِ اعظم کی نمائش ہو رہی تھی، اِس پکچر کو دکھانے کے لئے وہ مجھے ترغیب دے رہے تھے، لیکن میں تمہارے یہاں آنے کے لئے بضد تھی: بمشکل وہ راضی ہوئے تو میں باتھ روم چلی گئی۔ نہا کر جیسے ہی فارغ ہوئی تو اچانک میرا پیر پھسل گیا۔ عارف سائیڈ روم میں بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ میں نے انہیں آواز دی تو وہ دوڑے چلے آئے۔ میری داہنی ٹانگ میں ہلکی سی چوٹ آگئی۔ روپے کے برابر نیلا نشان بن گیا اور خون کے چند قطرے اُبھر آئے۔ اُنہوں نے تولیہ میں لپٹا ہوا مجھے اپنے بازوؤں میں اِس طرح لے لیا جیسے میں ایک ننھی منّی سی گڑیا ہوں۔ اُنہوں نے مجھے مسہری پر لٹا دیا اور زمبک چوٹ پر لگا دیا اور اظہارِ تاسف کرتے رہے۔ دھیرے دھیرے میرے بالوں سے کھیلتے رہے۔ نکھرا اور دُھلا ہوا چاندنی کی طرح میرا شفاف بدن اُن کے سامنے تھا۔ وہ لگاتار مجھے دیکھے جا رہے تھے اور پھر وہ میرے ہونٹوں کو چوم کر الگ ہو گئے۔ میں نے کپڑے پہنے، بالوں کو سنوارا، عطر لگایا اور اُن سے کہا کہ وہ مجھے بیوک میں ڈال کر تمہارے یہاں پہنچا دیں۔ اُنہوں نے مجھے آخری بار پھر پروگرام کینسل کرنے پر آمادہ کرنا چاہا لیکن میں کسی طرح راضی نہیں ہوئی اور چلی آئی۔

نہ جانے یہ پُر لُطف مکالمہ بار ایسوسی ایشن کیسے پہنچ گیا؟ عارف کے ساتھی وکیلوں نے حاشیہ چڑھا کر اور مزے لے لے کر جب یہ واقعہ سُنایا تو وہ کافی دیر تک مبہوت سا بیٹھا رہا

عارف پبلک زندگی میں اپنی روشن خیالی کا چلتا پھرتا اِشتہار ہونے کے باوجود اپنی بیوی کے لئے انتہائی رجعت پسند تھا۔ وہ گھر میں آنے جانے والوں پر کڑی نظر رکھتا تھا اور اس حد تک محتاط تھا کہ آس پاس کالج کے طلباء کا قیام بھی اُسے پسند نہ تھا۔ اگر اُس کے بس کی بات ہوتی تو وہ جمال روڈ کے کنارے بسے ہوئے سارے مکانوں کو ویران کر دیتا اور اُن میں کبھی کسی کو آباد نہ ہونے دیتا۔ ایسے شکّی مزاج شخص نے جب یہ باتیں سُنیں تو وہ قطعی ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

"میری وارفتگی کی داستان حلقۂ احباب تک کیسے پہنچی؟"

"زیدی ایسا منچلا شخص کہیں نگار کی قربت حاصل کرنے میں کامیاب تو نہیں ہو گیا؟"

"نِگار، ریحانہ کی تقریبِ سالگرہ میں شرکت کی اِتنی مشتاق کیوں تھی؟"

یہ چند سوالات عارف کی سطحِ ذہن پر اچانک اُبھرے اور آپس میں ٹکرانے لگے۔ وہ دیر تک غور کرتا رہا اور جیسے جیسے سوچتا گیا نِگار کا کردار اُس کی نگاہوں میں مشکوک ہوتا چلا گیا۔

کئی دِن بیت گئے، عارف نہ تو اپنے پیشے کی طرف رجوع ہوا اور نہ ہی اُس کے احباب اُسے متوجہ کر سکے، شہر کی سیاسیات سے بھی وہ قطعی کنارہ کش ہو گیا۔ مقدموں کے سلسلے میں آنے والوں میں سے کئی آدمیوں کو اُس نے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ نِگار نے صفائی پیش کرنا چاہی لیکن وہ برابر طنز کے تیر برساتا رہا۔ نگار کو خود حیرت تھی کہ وہ معمولی سا واقعہ جیسے اُس نے اپنی بے تکلف سہیلی ریحانہ کو سُنایا تھا لفظ بلفظ عارف کے کانوں تک کیسے پہنچ گیا، کبھی وہ سوچتی۔

"ریحانہ ایسا نہیں کر سکتی، کہیں زیدی بھائی نے تو ہم لوگوں کی باتیں نہیں سُن لیں، لیکن وہ مجھے ریحانہ کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ عارف سے اُن کی بے تکلفی ہے لیکن وہ میری زندگی سے نہیں کھیل سکتے۔"

نگار نے ہمت کر کے عارف سے کہا۔ "ریحانہ میری عزیز ترین سہیلی ہے۔ اگر میں نے اپنی کچھ نجی باتیں اُس سے کہہ دیں تو انہیں آپ اِس ناگواری کی حد تک نہ سوچیں۔"

"بجا فرماتی ہیں آپ! ریحانہ سے کہنے میں تو کوئی حرج نہیں

(بقیہ صفحہ ۵۳ پر دیکھئے)

مترجم :۔ اے خیام　　　　　　　　　　(مصنف :۔ او ہنری

ہارلیم میں ٹریجڈی

مسز فنک نچلی منزل پر مقیم مسز کیڈی کے فلیٹ میں داخل ہوئی۔ "دیکھو، آج خوب زور آزمائی ہوئی ہے۔" مسز کیڈی بولی اور اُس نے فخر سے اپنا چہرہ اپنی سہیلی مسز فنک کی طرف گھما دیا۔ ایک آنکھ بند سی تھی، اُس کے اِرگرد ایک نیلی مائل سبز خراش تھی۔ اُس کا ہونٹ کٹا ہوا تھا اور اُس سے خون رِس رہا تھا۔ اُس کی گردن کے دونوں طرف انگلیوں کے سُرخ نشانات تھے۔

"میرے شوہر تو ایسا کرنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔" مسز فنک نے کسی قدر اشک چھپاتے ہوئے کہا۔

مسز کیڈی نے اعلانیہ لہجے میں کہا۔ "مجھے تو ایسا شوہر چاہیے جو ہفتہ میں ایک بار تو ضرور ہی مجھے مارے پیٹے۔ وہ دکھائے کہ وہ میرا کتنا خیال رکھتا ہے۔ مگر جیک نے جو آخری خوراک پلائی وہ کوئی ہومیوپیتھک دوا نہ تھی۔ پھر ہفتہ کے باقی دن اُس سے بڑھ کر شہر بھر میں دوسرا کیا ہوگا۔ اِس آنکھ کے بدلے کم از کم تھیٹر کے ٹکٹ اور بلاؤز تو مل ہی گئے ہیں۔"

"ابھی مسٹر فنک تو اتنے اچھے ہیں کہ کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے" مسز فنک اطمینان سے بولی۔

مسز کیڈی مرہم لگاتے ہوئے ہنسی۔ "چلو ہٹو، تم تو جلتی ہو۔ تمہارا مرد تو اتنا سست اور کاہل ہے کہ تمہیں ایک تھپّڑ بھی نہیں رسید کر سکتا۔ گھر میں قدم رکھا نہیں کہ اخبار سے ہی کشتی شروع ہو گئی۔ کیوں؟ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

مسز فنک نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اِس میں تو کوئی شک نہیں کہ مسٹر فنک گھر آتے ہی اخبار میں سر کھپانے لگتے ہیں مگر یہ جان لو کہ میرا بھرتا بنا کر خود کو خوش نہیں کرتے۔"

مسز کیڈی ایک خوش اور مطمئن گھریلو عورت کی طرح اور اپنے ہیروں کی نمائش کرتی ہوئی ملکہ کی طرح اُس نے اپنے چغے کا کالر ہٹا کر ایک پوشیدہ خراش کو ظاہر کیا۔ ایسی خراش جس کا رنگ گہرا سُرخ تھا اور خراش اب ٹھیک ہو چلی تھی جس کے کرب اور ٹیس کی لذّت اب تک بھلی لگتی تھی۔

مسز فنک نے ہتھیار ڈال دیے۔ اُس کی آنکھوں میں حسد کی جھلک صاف انگڑائیاں لیتی دکھائی دیتی تھی۔ ایک سال پہلے تک، شادی سے قبل وہ دونوں کاغذ کی فیکٹری میں ایک ساتھ کام کرتی تھیں اور گہری سہیلیاں تھیں۔ اب وہ شوہر کے ساتھ میمی اور اُس کے شوہر کے اوپر والے فلیٹ میں تھی۔ اِس لئے وہ میمی کے سامنے بننے کی کوشش نہیں کرتی تھی

"وہ جب پیٹتا ہے تو تمہیں چوٹ نہیں لگتی؟" مسز فنک قدرے حیرت سے پوچھا۔

مسز کیڈی خوشی سے تقریباً چلّا پڑی۔ "چوٹ۔؟ کیا تم پر کبھی مکان گرا ہے؟ بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے ملبہ سے کھود کر مجھے نکال رہا ہو۔ جیک کے بائیں ہاتھ کے ایک جوڑا نئے سینڈل، اور دو تین بکھرے۔ اور دائیں ہاتھ کے میں کوئی ٹکی سیر اور چھ جوڑے ریشمی ڈورے بنائی کے مل جاتے ہیں۔

"لیکن وہ تمہیں پیٹتا کیوں ہے؟" مسز فنک کے لہجے میں زیادہ حیرت تھی۔

مسز کیڈی نے جواب دیا۔ "اِس لئے کہ وہ نشے میں ہے۔ یہ عام طور پر سنیچر کی رات کو ہوتا ہے۔"

شاعر بھی

"مگر تم اِس کا موقع کیسے فراہم کرتی ہو!" اُس نے پھر استعجابیہ لہجے میں پوچھا۔

"اے لو۔ میں اُس کی بیوی نہیں ہوں کیا! دیکھو جیک تو آتا ہے نشے میں چُور اور میں ہوتی ہوں یہاں بر اجمان۔ بھلا میرے سوا اُسے اور کس کو مارنے پیٹنے کا حق پہنچتا ہے؟ کسی اور کو پیٹے تو سہی ـــ کبھی وجہ بھی ہوتی ہے، "کھانا تیار کیوں نہیں ہوا؟" اور کبھی "کھانا تیار کیوں ہے؟" جیک وجوہ کی تلاش نہیں کرتا۔ وہ اُس وقت تک پیتا رہتا ہے جب تک اُسے یاد نہ آجائے کہ وہ شادی شدہ ہے اور تب گھر کی سمت دوڑتا ہے۔ آتے ہی میری پٹائی شروع کر دیتا ہے۔ سنیچر کی رات کو میں نوکیلے قسم کے فرنیچر راستے سے ہٹا دیتی ہوں تاکہ جب وہ اپنا کام شروع کرے تو میرا سَر وغیرہ نہ پھٹ جائے۔ اُس کے بائیں وار سے لذّت آمیز کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو میں پہلے ہی دَور میں حساب لگا لیتی ہوں، مگر جب ہفتہ بھر گھپڑے اُڑانے ہوتے ہیں اور ملبوسات وغیرہ کی کمی ہو جاتی ہے تو دوبارہ مار کھانے کے لئے اُس کے سامنے جانا پڑتا ہے اور کل رات میں نے یہی کیا۔ جیک جانتا ہے کہ ایک ماہ سے میری خواہش کالے رنگ کی ایک ریشمی باڈی لینے کی تھی اور میں جانتی تھی کہ صرف ایک آنکھ زخمی کرا لینے سے یہ نہیں آئے گی اور میں تم سے عرض کر دوں ـــ وہ آج کی رات آئیس کریم بھی ضرور لائے گا۔" مسز فنک گہری سوچ میں ڈوب گئی

"اُس نے کبھی مار پیٹ نہیں کی۔" وہ بولی "کبھی۔" "جیسا کہ تم جانتی ہو، وہ اُداس اور خاموش گھر لوٹتا ہے، ایک لفظ بھی اُس کے مُنہ سے نہیں پھوٹتا۔ وہ کبھی باہر بھی نہیں لے جاتا، سوائے اِس کے کہ گھر میں کرسیاں گرماتا رہتا ہے۔ ضروری اشیا، تو خرید کر دیتا ہے مگر اتنا خاموش رہتا ہے کہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔" مسز کیڈی نے اپنی سہیلی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ "بیچاری!" وہ بولی۔ "لیکن ہر ایک کو جیک جیسا شوہر تھوڑا ہی ملتا ہے! اگر سبھوں کو اُن جیسی ہی ازدواجی زندگی میسّر ہو تو طلاق وغیرہ کا قصہ ہی پاک ہو جائے۔ تم آئے دن جو غیر مطمئن بیویوں کے بارے میں سُنتی رہتی ہو، میں بتاؤں کہ اُنہیں ایسا مرد چاہیئے جو ہفتہ میں ایک بار گھر آتے ہی اُن کی ہڈّی پسلی ایک کر دے اور پھر بوسوں اور چاکلیٹوں سے منا لے۔ اِس سے اُن کی زندگی میں دلچسپیاں پیدا ہوں گی۔ اجی میں تو کہتی ہوں آدمی ایسا ہی ہو کہ جب نشہ میں چُور ہو تو بھُرتا بنا کر رکھ دے اور جب نہ ہو تو گلے لگا لے۔ جس شخص میں اِس قسم کے جذبے نہیں اُس سے خدا محفوظ رکھے۔"

مسز فنک نے ایک سرد آہ کھینچی۔ تبھی صحن میں کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ مسٹر کیڈی کی ٹھوکر سے دروازہ کھُلا ـــ وہ بنڈلوں سے لدا پھندا کھڑا تھا۔ مسز کیڈی اُٹھ کر گئی اور اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر جھول گئی۔ اُس کی آنکھوں میں پیار کا خمار چھا گیا تھا۔

"ہیلو ـــ میری جان!" مسٹر کیڈی چلّایا۔ اُس نے بنڈل پھینک دئے اور اپنی آغوش میں بھر کر اُسے زمین سے اُوپر اُٹھا لیا۔ "میں تھیئٹر کے ٹکٹ لے آیا ہوں۔ اِس بنڈل کو کھولو نا۔ تمہاری خواہش کے مُطابق ریشمی باڈی بھی لایا ہوں۔ اخاہ، گڈ ایوننگ مسز فنک، میں نے تو آپ کو دیکھا ہی نہیں، کہیئے ہمارے مارٹ کا کیا حال ہے؟

وہ ٹھیک ہیں مسٹر کیڈی۔ شکریہ۔" مسز فنک بولی۔ "اب میں چلوں ـــ مارٹ کھانے کے لئے آتے ہوں گے۔ اور ہمیں مسز کیڈی، جو نمونہ چاہیئے تھا وہ کل لا دوں گی۔"

مسز فنک جب اُوپر اپنے فلیٹ میں پہنچی تو اُس کے مُنہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ ایک بے معنی اور واہیات چیخ ـــ ایسی چیخ جس کے بارے میں صرف عورتیں ہی جان سکتی ہیں، غم کا خزانہ جس کے لئے کوئی جگہ مقرر نہیں ـــ

مارٹ اُسے کیوں نہیں مارتا پیٹتا؟ وہ بھی تو جیک کیڈی کی طرح لمبا تڑنگا ہے۔ کیا وہ اُس کی بالکل پرواہ نہیں کرتا؟ اُس نے کبھی جھگڑا نہیں کیا۔ وہ گھر آتا ہے اور خاموش و اُداس ٹہلتا ہے یا پھر پڑا رہتا ہے۔ وہ رسد پانی کا انتظام تو کر دیتا ہے مگر "زندگی کی دوسری شیرینیاں" نظر انداز کر دیتا ہے۔

مسز فنک کے خیالوں کا اُڑتا ہوا جہاز ساکن ہو گیا تھا کاش اُس کا جہاز کچھ ڈانوا ڈول ہوتا اور وہ ہنسی خوشی اُس پہ سفر کرتی رہتی۔ یا یوں کہیں کہ وہ اپنے "ٹکّے" باز کا

سکنے والے ساتھی سے چوٹ کھائے بغیر ہتھیار ڈال دینے کو تیار تھی۔ ایک وقفہ کے لئے اُسے مسز کیڈی سے نفرت ہو گئی۔ مسز کیڈی اور اُس کے زخموں، خراشوں، تحائف اور بوسوں کی داشتہ اور لڑاکو، وحشی شوہر کے ساتھ طوفانی زندگی سے نفرت ہو گئی۔

مسٹر فنک سات بجے گھر پہنچا۔ گھریلو پن کی عاجزی اُس کی رگ رگ سے پھوٹی پڑتی تھی۔ اپنے چھوٹے سے گھر کے باہر وہ قدم ہی نہ رکھتا تھا۔ وہ اُس اژدھے کی مانند تھا جس نے اپنا شکار نگل لیا ہو یا پھر اُس ٹوٹے ہوئے درخت کی طرح، جو جس جگہ گرا، وہیں پڑا رہا۔

"کھانا اچھا لگا مارٹ؟" مسز فنک نے جس نے کھانا بڑی محنت سے تیار کیا تھا، پوچھا۔ مسٹر فنک اور تیزی سے منہ چلانے لگا، حلق سے کچھ عجیب سی آواز نکلی جو شاید اس بات کی علامت تھی کہ کھانا اُسے پسند آیا۔ کھانے کے بعد اُس نے اخبار اٹھا لئے اور پڑھنے بیٹھ گیا۔

اگلے روز مئی کے مہینے کا کوئی خاص جشن تھا۔ مسٹر کیڈی اور فنک تعطیل منا رہے تھے۔ مزدوروں کی پریڈ اور کھیل کود وغیرہ کی دلچسپیاں تھیں۔ مسز فنک علی الصباح مسز کیڈی کے پاس حسب وعدہ نمونہ لے کر پہنچ گئی جو اپنی نئی ریشمی چولی میں سجی بیٹھی تھی۔ اُس کی زخمی آنکھ میں مسرت کی چمک تھی۔ جیک نے اُس کا کفارہ ادا کر دیا تھا۔ پارک میں پکنک کا دن بھر کا پروگرام تھا۔

مسز فنک اپنے فلیٹ میں واپس آئی تو حسد کا بھوت اُس پر بری طرح سوار تھا۔ مسز کیڈی اپنے "زخموں اور مرہم" میں کتنی شاداں ہے! لیکن کیا ساری خوشیوں پر مسز کیڈی کی اجارہ داری ہے؟ مارٹ فنک بھی جیک کیڈی سے کسی طرح کم نہیں۔ پھر کیا اُس کی بیوی بغیر مار پیٹ کے رہ جائے گی۔ اچانک مسز فنک کے دماغ میں ایک ترکیب بجلی کی طرح کوندگئی۔ وہ دکھا دے گی کہ جیک جیسے اور بھی مرد ہیں جو پہلے مار پیٹ کر پھر پیار کر سکتے ہیں۔

فنک کی ازدواجی زندگی میں تعطیل کا کوئی خاص مصرف نہیں تھا۔ رات سے ہی دُھلنے والے کپڑوں سے ٹب بھرا رکھا تھا۔ مسٹر فنک اخبار پڑھنے میں محو تھے۔ اِس طرح جشنِ مئی اختتام کی سمت لڑھکتا جا رہا تھا۔ مسز فنک کے دل میں حسد کی آگ بھڑک چکی تھی اور اس سے بھی زیادہ کچھ کر گذرنے کی خواہش اُس کے دل میں جڑ پکڑ چکی تھی۔ مسز فنک نے سوچا کہ اگر اُس کا شوہر اُس پر حملہ آور نہیں ہوتا، اگر وہ اپنی مردانگی کا ثبوت پیش نہیں کرتا، اگر وہ اپنی ازدواجی زندگی میں دلچسپیاں پیدا نہیں کرتا، تب اُسے اپنے کردار و عمل کی یاد دلانی ہی ہو گی۔

مسٹر فنک نے اپنا پائپ سُلگا لیا اور پُرسکون انداز میں ایک پیر کے پنجے سے دوسرے پیر کی ایڑی کو رگڑتا۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے اُسی قدر مطمئن تھا جیسے پُڈنگ میں بغیر ملا ہوا چربی کا لوندا۔ وہ اپنی آرام گاہ میں پاؤں پھیلائے بیٹھا ہوا، بیوی کے ذریعہ اُچھالی گئی چھینٹوں اور کھانے کی کشش انگیز خوشبو وغیرہ کے درمیان مطالعہ میں منہمک تھا۔ اپنی بیوی کو مارنے پیٹنے کا خیال اُس کے ذہن سے کوسوں دور تھا۔

مسز فنک نے ٹب میں گرم پانی انڈیل دیا۔ جھاگ اُٹھنے لگے۔ نیچے والے فلیٹ سے مسز کیڈی کی ہنسی کی آواز آ رہی تھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس پر طنز کیا جا رہا ہے یا آوازے کسے جا رہے ہیں۔

اب مسز فنک کی باری تھی۔ مطالعے میں منہمک اپنے شوہر پر جھلا پڑی — "او کاہل!" وہ چیخی "کیا میں تم جیسے کاہل کے لئے سارا دن کام میں جان گھلاتی رہوں؟ تم آدمی ہو یا کتے؟"

مسٹر فنک جیسے سکتہ میں آ گیا۔ اخبار اُس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ مسز فنک سمجھ گئی کہ اتنی سی اُکساہٹ کافی نہیں کیونکہ اُس پر اِس قسم کا کوئی ردِ عمل نہیں تھا کہ وہ حملہ آور ہو گا۔ اپنی جگہ سے اُچھلی اور اُس کے چہرے پر ایک بھرپور گھونسا دیا۔ اُسی لمحہ اُس کے دل میں ایسا پیار اُمڈا جیسا آج تک نہ اُمڈا تھا۔

جاؤ۔ مسٹر فنک نے اپنا فرض پہچانو! کاش وہ ایک چار تھپّڑ ہی جڑ دیتا تاکہ اُسے یقین ہو جاتا کہ وہ اُس کی پروا کرتا ہے!

مسٹر فنک اُچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ مسز فنک نے پھر اُس کے ایک گھونسہ رسید کر دیا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور مار کھانے کا انتظار کرنے لگی، جس کی وہ بھوکی تھی۔

نچلی منزل والے فلیٹ میں مسٹر کینڈی بڑی ہمدردی سے اپنی بیوی کی آنکھ پر لیپ چڑھا رہا تھا اور دونوں پکنک منانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ اُنہیں اُوپر والے فلیٹ میں عورت کی اُونچی آواز، دھماکے، لڑکھڑانے اور کرسیوں کے اُلٹنے کی آوازیں سُنائی دیں۔ ظاہر ہے اُنہوں نے اندازہ لگایا ہوگا کہ جھگڑا ہو رہا ہے۔

"مارٹ اور اُس کی بیوی میں ہاتھا پائی ہو رہی ہے" مسٹر کینڈی بولا۔ "مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ لوگ یہ شوق فرماتے ہیں۔ کیا اُوپر جاؤں؟ شاید اُنہیں مرہم پٹّی کی ضرورت پڑے۔"

مسز کینڈی کی ایک آنکھ میں ہیرے کی سی چمک نمودار ہوئی، "اُفوہ" وہ بڑبڑائی "شاید۔ شاید، ذرا ٹھہر و جیک! میں جا کر دریافت کرتی ہوں۔"

وہ اُوپر بھاگی۔ اُس نے دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ اپنے باورچی خانے کے دروازے سے مسز فنک نمودار ہوئی اور اُس پر جھپٹی۔

"اوہ مسز فنک!" وہ چیخی "کیا اُس نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟" مسز فنک نے دَوڑ کر اپنا مُنہ اپنی سہیلی کے کندھوں پر رکھ دیا اور زور زور سے سِسکنے لگی۔ مسز کینڈی نے اُس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اُوپر اُٹھایا۔ اُس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ رنگ زرد پڑ گیا تھا مگر اُس پر مسٹر فنک کے بُزدل گھونسے کا کہیں نشان، خراش یا نوچ کھسوٹ کا معمولی سا زخم تک نہ تھا۔

"سچ سچ بتاؤ ڈارلنگ!" مسز کینڈی نے مِنّت کی۔ "ورنہ میں خود جا کر سب کچھ دریافت کرلوں گی۔ کیا ہوا؟ کیا اُس نے مار پیٹ کی؟ کیا کیا اُس نے؟"

مسز فنک نے سِسکتے ہوئے اپنا چہرہ اپنی سہیلی کے سینے میں چھپا لیا۔

"خدا کے لئے دروازہ نہ کھولنا پیاری" اُس نے سِسکتے ہوئے التجا کی۔ "اور کسی سے نہ کہنا، اِسے راز ہی رکھنا۔ اُنہوں نے مجھے چھُوا تک نہیں۔ اے میرے خُدا۔ وہ کپڑے دھونے لگ گئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کپڑے دھو رہے ہیں۔"

بقیہ افسانہ "انوراج" صفحہ ۴۹

تھا لیکن آپ تو زیدی سے محبت کی پینگیں بڑھا رہی ہیں۔"

نِگار نے رو رو کر اپنی پوزیشن واضح کی لیکن عارف تو قطعی برگشتہ ہو چکا تھا اُس نے کچھ نہ سُنا۔

بات بگڑتی ہی گئی اور میاں بیوی کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج بن گئی۔ عارف نے نگار ایسی حسین و جمیل بیوی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ اُسے عورت کا روپ انتہائی گھناؤنا دکھائی دینے لگا۔ جسے اُس نے پُوجنے کی حد تک چاہا تھا اُسے ایک لمحہ کے لئے دیکھنا بھی ناگوار ہونے لگا۔

ایک دِن جیسے ہی وہ سو کر اُٹھا، سگریٹ اور دیاسلائی کے درمیان ایک جانی پہچانی تحریر نظر آئی۔

"تم نے نگاہیں پھیر لیں تو اِس دنیائے رنگ و بو کی ساری دِلکشی جاتی رہی۔ اب میں جی کر کیا کروں گی؟ محبت کا مفہوم مجھ پر تم نے واضح کیا تھا اور میں اِسے دل میں چھُپائے ہوئے دنیا سے جا رہی ہوں یقین کرو! دو سال کی مختصر ازدواجی زندگی میں یہ دل صرف تمہاری محبت کا امین تھا۔ میں نے الماری سے نکال کر ایسڈ پی لیا ہے جو مجھے جلد ہی موت کی گود میں سُلا دے گا۔"

عارف تحریر پڑھتے ہی نگار کی مسہری کی طرف بھاگا اور اُسے مسہری پر نہ دیکھ کر دیوانہ وار پُکارنے لگا۔ نگار سائیڈ رُوم سے نکل کر انتہائی مضمحل، دھیرے دھیرے اُس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب وہ قریب آئی تو اُس نے بے اختیار ہو کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"تمہیں ایسڈ کہاں مِلا۔ کیا تم اُسے پی چکی ہو؟"

"میں نے اُسے الماری میں چھپا کر رکھ دیا تھا اور اندھیرے میں اُٹھ کر اُسے پی گئی تھی۔"

"لیکن یہ تو نیکو ٹیڈ پیرافین کی شیشی ہے!"

عارف نے خوش ہو کر کہا اور نِگار حیرانی کے عالم میں شیشی کی طرف دیکھتی رہی۔

زین العابدین

آہوں کی زبان

چپراسی ٹیبل پر تار رکھ کر چلا گیا۔ میں فائلوں میں بُری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ غیر ملکوں میں ہماری صنعتی اشیاء کی مانگ زوروں پر بڑھ رہی تھی۔ تھوڑا دم لینے کے لئے میں سگریٹ سُلگا کر کش لینے لگا۔ سامنے پڑا ہوا تار زبانِ خاموشی سے گویا فریاد کر رہا تھا۔ ذرا ایک نظر مجھے بھی دیکھ تو لو۔ میں نے اُٹھا کر لفافہ چاک کیا، اُس کے الفاظ تھے:

"ہوائی اڈّے پر ملو"

تار پڑھ کر میرے جسم میں مسرّت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ خوشی میرے ضبط سے باہر ہونے لگی۔ مجھے اندیشہ ہونے لگا اگر اسی عالم میں فائلوں کو ڈیل کیا تو بہت ممکن ہے کام کچھ غلط ہو جائے۔ اِس وقت مسرّتوں کا خود مجھے بھی اندازہ نہ تھا۔

میرے چہرے کا رنگ بدل چُکا تھا۔ میرے ہونٹوں پہ مُسکراہٹ پھیل چُکی تھی۔ اُف میرے خُدا! ہم کتنے دنوں بعد مل رہے تھے۔ میرے دل نے کہا۔ میں تو بالکل مایوس ہو چُکا تھا جیسے اب کبھی ہماری مُلاقات نہ ہوگی۔ میں سارے کاموں کو چھوڑ کر جلدی سے جلدی ایئر ڈرام پہنچ جانا چاہتا تھا۔ نہ جانے اِس وقت مجھے یہ کیوں خیال آ گیا کہ انسان کے پر کیوں نہیں ہوتے۔ ایسے وقت میں وہ کتنے کار آمد ثابت ہوتے۔

میں نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی حاضر ہوا۔ ڈیلنگ اسسٹنٹ کو بُلایا۔ اُسے سارا کام سمجھایا اور خود کیبن سے باہر نکل گیا۔ میری کار چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ میں چاہتا تھا ساٹھ اور اسّی میل کی رفتار سے بھاگے۔ میں نے ایکسیلیٹر دبا دیا۔ رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ اور اُس کے ساتھ میرے تخیل کی پرواز بھی تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ اُس کی صورت وہ تو نہیں ہوگی جو پہلے تھی۔ تصویر سے تو کسی کی اصلی صورت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ حال میں جو اُس نے تصویر بھیجی تھی اور اِس وقت خود اُسے دیکھ کر پہچاننے میں کہیں دقت تو نہ ہوگی؟ اُف! کتنے دنوں بعد وہ اُس سے ملنے جا رہا ہے۔ شاید سولہ سال بعد۔ وہ لمحے کتنے خوشگوار ہوں گے جب دو مدّت کے بچھڑے ہوئے ملیں گے۔ کار پچاس اور ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ میں نے اپنی کلائی کی گھڑی میں دیکھا۔ ہوائی جہاز آنے میں صرف دس منٹ باقی تھے۔

میں نے رفتار اور بڑھا دی۔ صفدر جنگ ایئر پورٹ کے سگنل ہاؤس کی اونچائی اب صاف نظر آ رہی تھی۔ میں ایئر پورٹ کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ ہوائی جہاز سے مُسافر اُتر رہے تھے۔ استقبال کرنے والوں کے ساتھ میں بھی ریلنگ میں کھڑا ہو گیا۔ سامنے ہوائی جہاز سے مسافر آتے کر کسٹم آفس اور پھر وہاں سے باہر کی طرف جانے لگے۔ اُن کے اپنے بیگانے دوست، احباب پھولوں کے ہار پہنانے لگے۔ تصویر کشی ہونے لگی۔ میری نظر اپنے مسافر کو ڈھونڈنے لگی۔ پی، آئی، اے کا ڈکوٹا سامنے کھڑا تھا۔ کچھ مُسافر اب بھی اُتر رہے تھے۔ آخری سیڑھی سے اُترتے ہوئے میں نے اپنے مہمان کو دیکھ لیا۔ اُس کے قدموں میں وزن، چال میں آہستگی اور چہرے پر ہلکی سی تشویش کے آثار نمایاں تھے۔ اُسے شاید میں اب تک دکھائی نہیں پڑا تھا۔ اُس کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ ہوائی اڈّے کے کسی آدمی نے اُس کی محویت دیکھتے ہوئے کسٹم آفس کی طرف اشارہ کر دیا۔ اُس کا رُخ مُڑ گیا۔ اُس کے پاس

ہینڈ بیگ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ میں ریلنگ میں مغربی کنارے
طرف کھسک گیا تاکہ میں بھیڑ سے الگ ہو جاؤں اور اُس کی
نظر مجھ پر آسانی سے پڑ جائے، اور ہوا بھی یہی۔ جیسے ہی میں
ہوائی کسٹم سے باہر ہوتے ہی اُس کی نظر مجھ پر پڑ گئی میں
ری طرح ریلنگ کے باہر آ گیا۔ وہ "رندھیر" کہتا ہوا مجھ سے
لپٹ گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے کاندھے پر ٹھوڑی
رکھے بہت دیر تک روتے رہے۔ کچھ بولنا چاہتے بھی تو
آواز حلق تک آ کر ٹوٹ جاتی۔ آخر اُس نے شدتِ غم پر قابو
پایا اور میرے کاندھے سے ٹھوڑی ہٹا کر میرے دونوں کاندھوں
کو اپنے ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔

"تو کتنا دُبلا ہو گیا ہے ــــ!" اس کی نظر میرے
چہرے پر جمی تھی۔ آنکھوں پر جھلملاتے آنسوؤں کے پردے
پڑے تھے اور ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ پھیلی ہوئی
تھی۔

"نہیں ــــ تیری آنکھیں دُبلی ہو گئی ہیں۔ اتنے دنوں
سے جو تو دیکھ رہا ہے۔ اسی لئے" میں نے جواب دیا۔

ہم دونوں کار کے پاس پہنچ گئے۔ میں نے فرنٹ سیٹ کا
دروازہ کھولتے ہوئے کہا: "لے اختر تو ڈرائیو کر۔ بھول گیا
ڈرائیونگ ــــ"

"نہیں یار بھولا تو نہیں۔ لیکن مجھے تیرا مکان کہاں معلوم!"

"ارے وہی پرانی جگہ اور کہاں"

"وہ تو ٹھیک ہے یار لیکن شاید میں اب راستہ بھول جاؤں
تو ہی ڈرائیو کر ـــ" وہ بغل میں بیٹھ گیا۔ میں نے اسٹیرنگ
سنبھال لی۔ راستے بھر نئی عمارتیں، نئی سڑکیں، نئے پارک وغیرہ
دیکھ کر وہ متحیر ہوتا رہا۔ نئی دلی اُس کے لئے نئی دُنیا نظر آ رہی
تھی۔ کیونکہ اُس کے سامنے اتنی ترقیاں نہیں ہوئی تھیں۔ اُس
نے شاید اُن کا تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ ہم گھر پہنچے۔ شیر تم آجی نے
دروازہ کھولا۔ اجنبی کو دیکھ کر وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھٹکیں
لیکن میں نے فوراً اُن کی جھجک دور کی۔

"ارے شیل! پہچانا نہیں تم نے ـــ اختر" ۔
اُس نے اپنی گردن گھما کر تصویر دیکھنے کے لئے دیا۔

پر ایک نظر ڈالی اور پھر اسے دیکھ کر ہاتھ جوڑ دیئے۔
"نمستے"

"آداب عرض" اختر نے شیل کو جواب دیا۔

پھر شیل خود ہی بول پڑی "ایک مدت سے آپ کا نام
سُن رہی تھی۔ قریب قریب روز ہی آپ کا تذکرہ ہوتا تھا۔
خوشی کی بات ہوئی کہ آپ آ گئے۔ جایئے غسل کر لیجئے۔ کھانا
تیار ہے۔ کھا پی کر پھر باتیں ہوں گی۔ پپّو! انکل کو باتھ روم
تک لے جاؤ" شیل نے اپنے بچے کو آواز دے کر کہا اور خود
باورچی خانہ میں چلی گئی۔

شام کو ہم تینوں تفریح کے لئے نکلے۔ اوکھلا، قطب مینار
کناٹ پلیس، ڈپلومیٹک انکلائیو کے علاوہ اور کئی جگہوں کی
تفریح کی گئی۔ ہر جگہ کی خصوصیات سے اختر کو روشناس کرایا
گیا۔ اختر اِن تمام جگہوں کو کلفٹن، باتھ آئی لینڈ، صدر،
منورہ، ہاکس بے، کیماڑی، بندر روڈ اور وکٹوریا پارک
سے مقابلہ کراتا جاتا اور ان جگہوں کی خصوصیات سے شیل کو
اور رندھیر کو روشناس کراتا جاتا۔ اختر کراچی کے کیپٹل
(CAPITAL) میں انگریزی فلم "وی۔ آئی۔ پی" دیکھ کر آیا
تھا۔ طے یہ ہوا کہ کناٹ پلیس میں، ریگل میں یہی فلم دیکھی جائے
چنانچہ ہوٹل میرینا میں کھانا کھانے کے بعد سیکنڈ شو میں تینوں
جا بیٹھے۔

پچھلے پہر رات میں جب باتھ روم کی طرف جانے لگا تو میں نے
دیکھا کہ اختر کے کمرے کی بجلی جل رہی ہے، واپس آ کر میں نے
اُس کا دروازہ کھولا "کیوں ابھی تک سوئے نہیں؟" میں نے
اُس سے پوچھا۔ "کچھ پریشان نظر آتے ہو! کوئی تکلیف تو نہیں؟"
نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ نیند نہیں آ رہی ہے۔ سو جاؤں گا
تم فکر نہ کرو" اُس نے ایک کتاب اُٹھا کر کھڑکی کے پاس کرسی پر
بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ مگر جلدی سو جانا" میں چلا گیا۔
پاکستان میں وہ ایک غیر ملکی فرم "جانسن اینڈ جانسن"
میں جونیئر افسر تھا، اس لئے بہت کم فرصت ملتی تھی۔ میری کوشش
یہی رہی کہ کم سے کم دنوں میں زیادہ سے زیادہ تفریح کرے

میری غیر موجودگی میں میری شریمتی جی اُس کی تیمارداری کرتی رہیں۔ وہ اپنی بھاوج سے کافی گھل مل گیا تھا۔ ایک دن جب وہ تفریح سے لوٹ کر کھانے پر بیٹھا تو مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"یار کار میں تو بہت سیر ہو چکی۔ جی چاہتا ہے کہ اب تھوڑا بس سے تفریح کی جائے۔"

"یہ کیا مشکل ہے، کل اتوار ہے، ۳۰ روپے والے ٹکٹ لے لیتے ہیں اور پھر بس میں سیر سپاٹے کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

دوسرے دن ہم خوب سیر کرتے رہے۔ اختر کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا تھا کہ دلّی میں خاص طور پر بسوں میں مرد عورت کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ لڑکے کے بغل میں لڑکی اور لڑکی کے بغل میں لڑکے سیٹ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور کوئی بدتمیزی نہیں ہوتی کوئی کسی کی طرف دیکھتا بھی نہیں، کوئی کسی کی پروا بھی نہیں کرتا ہمارے یہاں تو ڈرائیور کے پیچھے ایک کیبن رہتا ہے جس میں صرف عورتیں ہی بیٹھتی ہیں۔ اُن کے ساتھ کوئی مرد، اپنا رشتہ دار یا ساتھ میں بڑا بچہ بھی نہیں بیٹھتا، خواتین کے چڑھنے اُترنے کا دروازہ بھی الگ یعنی آگے سے ہوتا ہے۔"

"دیکھ لو پیارے ہمارے یہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

جہاں کہیں بھی ہم گئے، میں نے محسوس کیا کہ اختر کو سیر و تفریح سے کوئی خاص دلچسپی نہیں، کیونکہ اکثر مقامات پر وہ باتیں کرتے کرتے کہیں دُور بہت دُور کھو سا جاتا ۔۔۔، کبھی کبھی ہمیں تنہا چھوڑ کر پارکوں میں کسی پیڑ کے نیچے جا بیٹھتا ۔۔۔ اکثر اُس کے چہرے سے اُداسی کے آثار نمایاں ہو جاتے ۔ جنہیں دیکھ کر احساس ہونے لگتا کہ اُس کی ذات جیسے بغیر پھولوں کا چمن یا بے لہروں کا سمندر یا بے رنگ کی ایک تصویر بن کے رہ گئی ہے۔

اور جب واپسی پر رات میں اپنی شریمتی جی سے اُس کا تذکرہ کیا اور رچلپے سے اس کی وجہ پوچھی تو وہ بڑے زور سے مجھ پر برس پڑیں۔

"واہ! وا! تین بچوں کے باپ ہو گئے، یہ بھی نہیں جانتے کہ کسی کی زندگی کیوں ویران ہوتی ہے۔ کوئی کیوں اُداس رہتا ہے۔ کیا سمجھتے ہو اختر تنہائی محسوس نہ کرتا ہوگا۔ آخر وہ جوان ہے، تندرست ہے ....."

"بس بس میں سب سمجھ گیا لیکن شیلا! مجھے حیرت ہے کہ بڑے شہروں میں کیا واقعی کوئی بھی اللہ کا بندہ ایسا نہیں ملتا جو کسی کا مونس و غمخوار ہو!"

"ارے نرمل کے ڈیڈی بات کہتی ہوں صاف، کراچی بڑا شہر ہے، جہاں صرف بڑے لوگ رہتے ہیں۔ چھوٹوں کا کیا گذر۔ اور تم جانو، بڑے لوگوں میں خود غرضی ہوتی ہے. ایسی جگہوں میں تو غرض کے بندے ہزار ملتے ہیں، غرض کے بندے کم ملتے ہیں۔ سُنا نہیں تم نے کل ہی شام تو اختر کہہ رہا تھا کہ تہوار کے دن بھی اسے کسی ہوٹل میں سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس احساس کو مٹانے کے لیے اتنے بڑے شہر میں اس کا کوئی نہیں۔ وہ بالکل تنہا ہے۔ برا ہو تقسیم ملک کے ان منحوس لمحوں کا، جن لمحوں میں سیاسی آقاؤں کے پنجوں نے بیچارے کے ماں باپ اور اس کے پورے خاندان کے ہر فرد کو اُچک لیا۔ خیر چھوڑو۔ گذری باتیں یاد کرنے سے فائدہ بھی کیا ہے۔ بس آج کل میں کوئی سندر سی کنیا اختر جی کے حوالہ کردو تاکہ اُن کی زندگی کے چمن میں بھی بہار آجائے۔

میں اختر کی شادی سے متعلق سوچنے لگا۔ نہ جانے مجھے اپنے آپ پر اتنا بھروسہ کیوں تھا کہ بغیر پوچھے میں نے اختر کے لیے لڑکی کی تلاش شروع کردی لیکن اس سلسلے میں مجھے کوئی زیادہ پریشانی اُٹھانے کی ضرورت نہ پڑی۔ کیونکہ شکیلہ کو میں بچپن سے جانتا تھا۔ جب مولوی اسد حسین صاحب کا انتقال ہو گیا تو شکیلہ کی ماں ہمارے محلہ میں اُٹھ آئیں اور ہماری پڑوسن بن گئیں۔ تاکہ ماں بیٹی دونوں میری نگرانی میں رہیں۔ ماں نے ہزارہا مصائب برداشت کئے لیکن بیٹی پر کسی طرح کی آنچ نہ آنے دی۔ پردے میں رکھا۔ سلیقہ مند بنایا۔ اور اس پر اپنی خودداری کو برقرار رکھا۔ آفریں ہے ایسی ماں پر جس کے سامنے عقیدت سے میری گردن جھکتی ہے۔ جب میں نے اُن سے تذکرہ کیا تو کہنے لگیں: "اب بیٹا مجھے کیا دیکھنا۔ جب تم موجود ہو تو پھر مجھے کس بات کی فکر۔ بہن تمہاری ہے۔ تم اس کے بھائی ہو۔ کوئی بھائی اپنی بہن کا بُرا چاہے گا نہیں۔

اور ایک دن جب سارا انتظام مکمل ہو گیا میری شریمتی جی

اختر کو سہرا باندھنے کے لئے بٹھایا تو اُس پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ اُسے ایسا لگا جیسے کسی نے کہا "آفیز تا بجا پہن" اِسی عالم میں وہ محفل میں بٹھایا گیا۔ انسان کے اندر کئی گہرائیاں ہوتی ہیں۔ ان میں بعض کی تہہ تک تو آدمی پہنچ جاتا ہے اور بعض تک نہیں پہنچ پاتا۔ کون جانے اختر اس وقت آتش فشاں کے کتنے لاووں کو اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھا۔ جو آنکھوں کی راہ بہہ جانے کے لئے مچل رہے تھے۔ مجھے پتہ تھا ایسے خوشی کے موقع پر ماں باپ بہت یاد آتے ہیں۔ لیکن اتنے بڑے ملک میں اس کا یہاں بھی کوئی سگا نہ تھا۔ میں نے بند توڑ کر بہہ جانے والے سیلاب کو روک دینا چاہا۔ تم ایسے مبارک لمحوں میں اپنا دل مت چھوٹا کرو اختر۔ یہ صحیح ہے کہ ہم تمہیں تمہارے ماں باپ اور بڑی بہن نہیں دے سکتے لیکن ان کی ممتا، اُن کی محبت، ان کا پیار، اُن کا خلوص ضرور دے سکتے ہیں۔ یہ الفاظ سُن کر میں نے دیکھا۔ اس کے چہرے پر تھوڑی شادابی آ گئی۔ اس کے سہرے کی کلی کِھل اٹھی۔

شکیلہ کو پاکر اختر جہاں بے حد نازاں تھا وہاں وہ بہت مغموم بھی تھا۔ یہ کیفیت شادی کے بعد ہی سے اس پر طاری تھی۔ ایک شام تو شکیلہ نے کچھ اس طرح گھور کر دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں مجھے بے شمار اندیشے جھانکتے نظر آئے۔ میں نے بھی اپنی نگاہوں سے اُسے سمجھایا۔ کوئی بھائی اپنی بہن کا بُرا نہیں چاہتا۔ اُس کے لئے جو بہترین ہم سفر ہو سکتا تھا وہ میں نے اپنے بچپن کے دوست اختر کی شکل میں اُس کے سپرد کر دیا۔ اُسے کسی تشویش کی ضرورت نہیں وہ مطمئن ہو گئی۔ پاکستان جانے کے دن جتنے قریب ہوتے گئے اختر کی اُداسی بڑھتی چلی گئی۔ ایسی ہی اُداسی خود رندھیر کے چہرے پر بھی چھائی ہوئی تھی جب وہ حال ہی میں پاکستان گیا ہوا تھا۔ چکالہ کے ایک گاؤں ہری پور میں اُس کا بچپن گذرا تھا۔ جس کی گلی گلی سے آواز آتی تھی۔ آرندھیر گلی ڈنڈا کھیلیں۔ وہ گھڑیاں اس پر بڑی کٹھن گذری تھیں جب وہ واپس ہندوستان آ رہا تھا اور اس کے پیدائشی مکان کی گرتی ہوئی دیواروں کی مٹی کا ہر ذرّہ اس کے قدموں تلے سنگِ راہ بن گیا تھا۔ اور ہر کا راستہ روک کر اُس سے پوچھا تھا کیا اسی دن کے لئے میں نے تمہیں جنم دیا تھا کہ ایک دن سیاسی آقاؤں کے ڈر سے اپنی جان بچانے کے لئے مجھے بے سہارا چھوڑ کر پردیس سدھارو؟ بڑی مشکلوں سے اُس نے ان ذرّوں سے چھٹکارا پایا تھا۔ یہی حال اِن دنوں اختر کا تھا۔ فتح پور کی گلیاں اُسے اب تک کئی بار خون کے آنسو رُلا چکی تھیں۔ مگر جس طرح رندھیر کو آنا پڑا تھا اسی طرح اُسے بھی جانا پڑے گا۔ یہ خداوندانِ زمین کا قانون ہے جو موت کی طرح اٹل ہے۔ ۱۹ برس بعد کل وہ ان گلیوں سے ایک بار پھر منہ موڑ کر روانہ ہو جائے گا۔

ہوائی اڈے پر جب یہ لوگ پہنچے تو جہاز پرواز کرنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ الوداع کہنے والے بہت سے لوگ اپنے اپنے دوستوں اور عزیزوں کو ہزار غموں اور آہوں کے بوجھ تلے دبے پھولوں کے ہار پہنانے میں مشغول تھے۔ ایک دوسرے سے پھر جلد ہی ملنے کی جھوٹی تسلیوں سے اپنا جی بہلا رہے تھے ساری فضا مغموم اور اداس تھی۔ جانے والے چلے جائیں گے۔ مگر اپنے پیچھے آہوں اور آنسوؤں کی بے شمار لڑیاں چھوڑ جائیں گے۔ کون جانے پھر کب کس سے کہاں ملنا ہے۔ ملنا بھی ہے یا نہیں۔ عورتوں کی بھیڑ میں شکیلہ اور شیلا رو رو کر اپنا بُرا حال کئے ہوئے تھیں۔ شاخوں کا جب یہ حال تھا تو جڑوں کے عالم کا کیا پوچھنا۔ رندھیر اور اختر کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

اور جب ——— "مسافروں سے گذارش ہے کہ جہاز میں فوراً سوار ہو جائیں، جہاز اب پرواز کرنے والا ہے۔" اناؤنسر کی آواز فضا میں اُبھری تو رندھیر اور اختر ایک دوسرے سے مجنونانہ انداز میں لپٹ گئے ——— چراغِ سحری کی لَو کی طرح اُن کا جذبۂ دوستی بھی تھرا تھرا رہا تھا ——— حیات ایک سراسر حزنیہ بن گئی تھی ——— ایک ناقابلِ فراموش حزنیہ ——— دونوں دُور رہے تھے ——— سیاسی آقاؤں کی بنائی ہوئی آہنی دیواروں کی فلک

(بقیہ صفحہ ۶۵ پر دیکھیئے)

سیّد حرمت الاکرام

کیوں کاہکشاں پر ہے نظر اہلِ جہاں کی
کیا اور کوئی راہ نہیں منزلِ جاں کی

اے قافلے والو! کہیں رہ جاؤ نہ پیچھے
رفتار بہت تیز ہے وقتِ گذراں کی

مجھ کو بھی کوئی غم ہے یہ سوچا نہیں جاتا
دل ہے کہ امانت ہے حدیثِ دگراں کی

تھا منتظرِ بانگِ جرس کوئی مسافر
آواز سنائی دی خود اپنی ہی فغاں کی

اے دل! ترا اس طرح دھڑکنا نہیں اچھا
سینہ میں ہے آہٹ سی کسی برقِ تپاں کی

اِک مجھ سے ہی پوچھا نہ گیا میرا فسانہ
ورنہ مری رُوداد نہ کس کس نے بیاں کی

دامانِ محبت کو نہ اس طرح سمیٹو
جھلسی ہوئی دُنیا کو ضرورت ہے اماں کی

ہم اے دلِ سرکش! ترے ممنون ہیں ورنہ
تھی فکر بہت ہم کو بھی آسائشِ جاں کی

کیا روئیں محبت کو کہ اے عظمتِ آدم!
دنیا نے سلیقے سے عداوت بھی کہاں کی

پہنچا سرِ منزل تو ہوا جیسے یہ احساس
رستے میں ضرورت تھی کسی سنگِ گراں کی

دِل میں کوئی اُمید جواں کیا ہو کہ حُرمت
ہے آب و ہوا اور ہی اس شہرِ زیاں کی!

نسیم سہارنپوری

محفلِ رنگ و بُو میں شام کرو
میکدے میں ذرا قیام کرو

کردگارِ بہار ہیں ہم لوگ
اہلِ گلشن ہمیں سلام کرو

بیکراں ساعتیں گرفت میں لو
اُڑتے لمحوں کو زیرِ دام کرو

ہر مُسرت کو جاوداں کر لو
غم کے لمحوں کو نذرِ جام کرو

چاند تاروں سے ہو چکیں باتیں
خاکساروں سے بھی کلام کرو

حادثہ کہکشاں کو پیش آئے
تم اگر زحمتِ خرام کرو

بڑھ گئی درد کی گرانباری
کارِ چارہ گری تمام کرو

یہ بہاریں نسیم ہم سے ہیں
اِن بہاروں کا احترام کرو

اکرم دھولیوی

○

یہ کب خبر تھی کہ اِک عمرِ انتظار کے بعد
ملے گی دادِ وفا خونِ اعتبار کے بعد

چمن بخیر کسی کو چمن کا ہوش نہیں
چلی ہے ایسی ہوا آمدِ بہار کے بعد

غمِ حیات سے گھبرا کے بھاگنے والے
کوئی مفر بھی ہے اس جادۂ فرار کے بعد

درازدستیٔ عشقِ جنوں شعار نہ پوچھ
نظر ہے دل پہ گریبانِ تار تار کے بعد

دل اک چراغِ شبِ غم تھا بجھ گیا وہ بھی
اندھیری رات ہے اب شامِ انتظار کے بعد

خبر نہیں کہ یہ کس رنگ سے بہار آئی
لہو لہو ہے جگر سیرِ لالہ زار کے بعد

ہنوز ہیں وہی غربت کی سختیاں اکرمؔ
ملیگا چین خدا جانے کس دیار کے بعد

منشاءالرحمٰن خان منشاؔ

○

ہزار خستہ سہی قلبِ زار اپنا ہے
یہی تو ایک حقیقت میں یار اپنا ہے

ہم اپنا غم لئے پھرتے ہیں یوں زمانے میں
کہ جیسے سارا جہاں غمگسار اپنا ہے

جو تم ملو تو پتہ ہم کو خود سے ملے اپنا
ہمیں تمہارا نہیں، انتظار اپنا ہے

اِسے تڑپنے میں کچھ لطفِ خاص ملتا ہے
عجیب شئے دلِ آشفتہ کار اپنا ہے

بھری بہار کی فیاضیاں بجا لیکن
یہاں تو دامنِ غم تار تار اپنا ہے

قدم قدم پہ ہیں مجبوریاں قیامت کی
خود اپنی زیست پہ کب اختیار اپنا ہے

کسی کے چشمِ کرم کے طفیل سے اے منشاءؔ
یہی بہت ہے کہ دل داغدار اپنا ہے

اصغر مہدی نظمی

کون کہتا ہے کہ تعمیرِ جہاں ہم نہ رہے
ہاں مگر شاملِ احساسِ زیاں ہم نہ رہے

یاد آتا ہے بہت آج بھی وہ شہرِ وفا
صورتِ نقشِ کفِ پا بھی جہاں ہم نہ رہے

یوں تو صدیوں کی رفاقت نہیں ٹوٹا کرتی
جانے کیا تھا کہ سرِ کوئے بتاں ہم نہ رہے

ہم کہ ہر دور میں کرتے رہے تدبیرِ سحر
شاملِ انجمنِ شب زدگاں ہم نہ رہے

پاسِ دلداریٔ اسلوبِ غزل ہے ایدوست
ورنہ کہتے کہ ترے غم میں تپاں ہم نہ رہے

یا ہمیں راس نہ آئی ترے کوچے کی فضا
یا گرفتارِ تگ و تازِ جہاں ہم نہ رہے

ڈھل گیا وقت کے سانچے میں ہر اک غم نظمی
یعنی خمیازہ کشِ نازِ بتاں ہم نہ رہے

شاعر بمبئی

صابر شاہ آبادی

رہا نہ ربط کسی اور سنگِ در سے مجھے
ملی ہیں رفعتیں وہ آپ کی نظر سے

سرورِ بادہ سے بڑھ کر ہے دعوتِ بادہ
جو مل رہی ہے کسی شرمگیں نظر سے

مذاقِ عشق و محبت سے بھی لطیف ہے وہ
جو ربطِ خاص ہے اُن کی نظر نظر سے

زہے یقینِ غمِ مستقل نہیں دیکھا
کہ ربط ہی نہ رہا شام بے سحر سے

مرے حبیب اگر مدعا نہیں ملتا
کوئی جواب ہی مل جائے تیرے در سے

شبِ جمیل میں یاد آئے کیوں غمِ دوراں
شکایتیں ہیں تری چشمِ کم اثر سے مجھے

وہ جس نے غم بھی مجھے بے ضرر دیا صابر
تو اور کیا نہیں امید اُس کے در سے مجھے

کیف احمد صدیقی

یہ حسن یہ نازک بدنی کس کے لیے ہے
یہ رنگ یہ گل پیرہنی کس کے لئے ہے

یاد آیا ہے شاید کوئی محروم تبسم
یہ نازش غنچہ دہنی کس کے لئے ہے

اللہ رے معصوم نگاہوں کے اشارے
یہ زحمت ناوک فگنی کس کے لئے ہے

یہ کس کے خیالوں نے کیا ہے تمہیں گم سم
یہ خامشی و کم سخنی کس کے لئے ہے

شانوں پہ بکھرتے ہوئے گیسوئے شب رنگ
یہ عالم برہم زدنی کس کے لئے ہے

آنچل سے چھپائے ہوئے یہ چہرۂ روشن
در پردہ یہ جلوہ فگنی کس کے لئے ہے

یہ کیف میں ڈوبی ہوئی سرشار ادائیں
رہ رہ کے یہ اعضا شکنی کس کے لئے ہے

رشید منظر

کیا لطف انبساط ہے اس انتشار میں
گل ہنس رہے ہیں سایۂ دامان خار میں

اب کیا کروں میں سیر چمن ہجر یار میں
ان کے بغیر آگ لگی ہے بہار میں!

تیرے ہی زلف و رخ کا کنایہ ہے صبح و شام
تیرا ہی عکس حسن ہے لیل و نہار میں

وہ بھی تمہاری وعدہ وفائی نے چھین لی
لذت جو مل رہی تھی ہمیں انتظار میں

اپنی تھکن نے راہ کو منزل بنالیا
نیند آ گئی ہمیں شجر سایہ دار میں

میری زبان درد سمجھتا نہیں کوئی
منظر میں اجنبی ہوں خود اپنے دیار میں

صادق مولی ـــــــــــ اُجین

"شاعر" اپریل مئی سنہ ۶۴ء دیکھا - بہت پسند آیا، بالخصوص آپ نے تنقید و تبصرہ کا جو معیار پیش کیا ہے وہ قابلِ قدر ہے
اِس وقت عبدالعزیز خالدؔ کا تازہ ترین مجموعۂ کلام "کلکِ موج" میرے سامنے میز پر رکھا ہوا ہے اور میں آپ کے تبصرہ
اِن سطور سے محظوظ ہو رہا ہوں ..... "اگر اِس کی تقلید شروع ہو گئی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ غزل اپنی دو ٹانگوں کے بجائے ایک
ٹانگ کی رہ جائے - یا شعری مجموعوں میں شعر یا اشعار کے بجائے ایک ایک مصرع ہی دیا جانے لگے -"
واقعی آپ نے ایک "خطرناک رجحان" کی طرف اشارہ کیا ہے - ویسے بھی خالدؔ اور اُن کی شاعری آج کا بحث طلب موضوع ہے
اور اِسکے متعلق ہم کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتے -

عبدالمجید شاداب ـــــــــــ بھیمڑی

"شاعر" کے تازہ شمارہ میں میں نے آپ کا اداریہ پڑھا - ہند و پاک کے فرقہ وارانہ فسادات کے متعلق اِس شمارہ کی نظمیں
بہت پُر اثر ہیں - لیکن آپ نے جو یہ تحریر کیا ہے کہ "شاعر" کے لئے اِس موضوع پر جتنی بھی معیاری نظمیں، کہانیاں اور ڈرامے،
موصول ہوں گے ہم انہیں سب سے پہلے جگہ دیں گے، تعجب ہے کہ آپ اِس ضمن میں غزل کو بالکل ہی بھول گئے - کیا غزل میں اِن واقعات
کی مذمت نہیں کی جا سکتی ؟ کیا آپ کے خیال میں غزل کا دامن اتنا تنگ[1] ہے ؟

ہلالؔ جعفری ـــــــــــ پرولیا پچھمی بنگال

"شاعر" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا - اب تک شعری حصّہ دیکھ سکا ہوں - سلامؔ صاحب مچھلی شہری کی نظم "پھول گرم
ہیں" بہت خوب ہے - واقعی ایک انسان اِس نظم اور انسانیت کے نام" آپ لوگوں کی اپیل سے متاثر ہوئے بغیر نہیں
رہ سکتا -

غزلوں کے مندرجۂ ذیل اشعار بہت پسند آئے -

میرے لہو سے میرا چمن لالہ زار ہے ــــ کیا اِس سے بڑھ کے اور دلیلِ بہار ہے (انجمؔ آفندی)
اُن کا یہ تجسّس کہ انہیں حق ہے ستم کا ــــ اپنا یہ تصوّر کہ زباں ہی ہے بنا ہیں (احسان دانش)
با خبر رہنا دوستوں سے شفیقؔ ــــ آستینوں کے سانپ ڈس لیں گے (شفیق کوٹی)

[1] غزل کا دامن کتنا تنگ یا کشادہ ہے اِس کا جواب وہ غزل ہے جو "دیکھو دیکھو چلو" کے عنوان سے اسی شمارہ میں شائع ہوئی ہے - غزل میں غزل کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے - خارجی حالات و کوائف کو سمونا بڑا نازک کام ہے - یہ کارِ شیشہ و آہن سب کے بس کا نہیں - ادارہ

مظفر رئیس ــــــــــــ بھوپال

"شاعر" کا تازہ شمارہ ملا۔ آپ کے "تجربات" سے لے کر تمام مقالات، نظمیں، کہانیاں اور غزلیں، سب ایک ہی بیٹھک میں پڑھ گیا۔ اس عام شمارہ میں اتنی حسین اور معیاری تخلیقات پاکر احساسِ تشنگی کافی حد تک مٹ گیا۔

آپ جو کچھ کہتے ہیں ہمیشہ بے باک ہو کر کہتے ہیں لیکن اس بار "تجربات" میں جن چبھتی ہوئی باتوں کا ذکر آپ نے فرمایا ہے۔ اُن کا احترام کرنا ہر ادیب و شاعر کا فرض ہے۔ اور یہ وقت کا ایک اہم تقاضا بھی ہے۔ نظموں کا انتخاب بہت حسین ہے۔ آپ کی غزل اور سلام صاحب کے منظوم خط نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا ہے۔

ضیاء حسنی ــــــــــــ (فتح پور، یوپی)

ملکی مسائل کی زلف ذرا سی بھی اُلجھتی ہے، تو آپ کا دردمند دل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا اور آپ اُسے سُلجھانے میں لگ جاتے ہیں۔ آپ کا پُرخلوص جذبہ قابلِ قدر ہے۔ اب کے "اداریئے" میں جو باتیں آپ نے لکھی ہیں اُسے ہر حساس اور غیرت مند آدمی پسند کرے گا۔ آپ نے ادباء اور شعراء کو اس اہم موضوع پر لکھنے کی دعوت دی ہے اور اشاعت کے معاملہ میں انہیں اولیت دینے کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ اُردو کا ادیب و شاعر ہر اُس موقع پر پیش پیش رہا ہے جب ملک کو اس کی جنبشِ قلم کی ضرورت ہوئی ہے۔ اور آج بھی وہ آپ کی آواز پر لبیک کہے گا۔ آہ ایسے میں ہمارے بیچ سے وہ پیامبرِ صلح و آشتی اُٹھ گیا۔ جس کا نام ہیبت اور یگانگت پر کامل اعتقاد تھا۔ اور جس کی ساری زندگی یکجہتی اور اتحاد کے جذبات کو فروغ دینے میں بسر ہوئی تھی۔ آج جواہر لعل ہمارے بیچ میں نہیں ہیں لیکن اُن کی بھائی چارگی اور محبت کا پیام ہمیں برابر چونکاتا رہے گا۔ اور اُن کی اتحاد و اتفاق کی تلقین آسمان کی بلندیوں سے برابر ہمارے کانوں تک پہنچتی رہے گی۔ کاش! ہم اُس روشنی کو برقرار رکھیں جو ہمارے عظیم لیڈر نے ہمارے دلوں میں جلائی تھی۔

ہند و پاک میں جو مذموم اور غیر انسانی حرکات سرزد ہوئیں اُن سے شعراء کے جذبات کافی حد تک مجروح ہوئے۔ اور اُن چوٹ کھائے ہوئے دلوں کی آواز نے ہمارے دلوں پر بھرپور اثر ڈالا۔ ادارۂ شاعر نے ان نظموں کو شائع کرکے مفید کام کیا ہے۔ نازشؔ پرتابگڈھی کی نظم "انتباہ" روزنامہ "قومی آواز" میں بھی چھپ چکی ہے لیکن آپ کے جریدے کے ذریعہ شاعر کا موثر پیام کافی دُور تک پہنچ جائے گا۔

غزل کے باب میں شفیقؔ کوٹی کافی پسند آئے اور بھی غزلیں اچھی ہیں۔ شروع کے تین افسانے پڑھ چکا ہوں۔ اچھے خوب صورت افسانے ہیں۔ مقالات میں ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ، جمیل الرحمان زخمیؔ اور سلطان احمد پسند آئے۔ سب مقالات نہیں پڑھ سکا ہوں۔

خاور بانکوٹی ــــــــــــ (رتناگیری)

تازہ شاعر (اپریل مئی) میں آپکی غزل معرکے کی چیز ہے۔ سلام نے بھی اپنی ایک مخصوص تکنیک میں بے حد خوبصورت اشعار کہے ہیں۔ "ہند و پاک" کے موجودہ حالات پر دوسری نظمیں بھی اچھی ہیں۔ افسانے جاندار ہیں۔ خصوصیت سے مجھے مراٹھی افسانے کا ترجمہ زیادہ پسند آیا۔ مراٹھی کے دوسرے افسانوں کے ترجمے ہوتے رہیں تو یہ اچھی بات ہوگی۔ خاص طور سے اُردو پڑھنے والے، بیچارے اور کھاندیکر سے بہت محظوظ ہوسکتے ہیں۔ ترجمہ کا کام ویسے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ڈرامے بھی کافی ہیں جو اُردو میں منتقل کئے جاسکتے ہیں۔ غزلیں بھی اس بار وزنی ہیں۔ مقالات میں

... ہے ... ادب اور زبان اور غالب کی عظمت سے بھی محظوظ کیا۔ "چچا" ایک بہترین مزاحیہ ہے۔ ڈرامہ "محبت کا مطلب" بہت سرسری ہے۔

ضیا انصاری ——— ناگپور

ماہ نامہ "شاعر" شمارہ مئی کا پوری آب وتاب اور آرائش وزیبائش کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ افسانو رضاء الجبار، تبسم شفائی، رفعت صدیقی اور شباب دائروی کے افسانے پسند آئے اور نظموں میں سلام شہری کی نظم "پھول زخمی ہیں"، نازش پرتاب گڑھی کا "اشتباہ" اور شمس فریدی کی نظم "ماں" ایک بلند مقام ہیں۔ غزلیں بھی بہت خوب ہیں۔ احسان دانش، طرفہ قریشی، مفتون کوٹوی، شفیق کوٹی کے مندرجہ ذیل اشعار نوعیت کے اعتبار سے ایک انوکھا پن لئے ہوئے ہیں۔

ہم تم سے ملے ہیں تو یہ معلوم ہوا ہے کس طرح بدلتی ہیں زمانے کی نگاہیں (احسان
وہ زندگی کیا کہ جس کے دامن پہ بے وفائی کا لگے دھبہ لگے گا جب کوئی داغ ایسا قبائے ہستی اتار دوں گا
(طرفہ قریشی
اشک شوئی کا بہرحال نہ احسان لیا! میری پلکوں کے قریں سے کئی داماں گزرے
(مفتون کو
گنگناتے ہوئے سے یہ بھونرے ہر دمیدہ کلی کا رس لیں گے (شفیق کو

انور راہی ——— (کلٹی۔ بردوان)

(اپریل، مئی ۱۹۶۲ء) کا "شاعر" باصرہ نواز ہوا۔
"انسانیت کے نام پر" آپ کا اور مہندر ناتھ کا لکھا ہوا مشترکہ اداریہ بے حد ٹھوس اور حقیقت آموز ہے۔ آ... غزل "دیکھ کر چلو" واقعی بار بار پڑھنے کے لائق ہے۔

ساحل پہ ایک شور ہے، موجوں میں اضطراب اے صاحبانِ گنگ وجمن، دیکھ کر چلو
ضیاؔ خود ہی صید ہوں، ایسا نہ ہو کہیں پھیلا ہوا ہے دامِ کہن، دیکھ کر چلو
ڈھنڈلا ذرا اس قدر تو نہ آنکھوں کی مشعلیں کچھ کہہ رہا ہے دورِ محن، دیکھ کر چلو

"شاعر" کے مقالات جتنے جاندار ہوا کرتے ہیں دوسرے پرچے ایسے مقالات پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ نظموں میں سلام مچھ... کا "پھول زخمی ہیں" (ایک منظوم خط) پُر درد ہی نہیں پُرسوز بھی ہے۔ نازش پرتاب گڑھی۔ خالد شفائی۔ شمس فریدی بھی ... ہیں۔ افسانے اچھے ہیں ——— غزلوں میں یہ اشعار قابلِ داد ہیں۔

ہنستے ہیں کیا وہ میرے غمِ انتظار پر دنیا تمام مسئلۂ انتظار ہے (نجم آفندی)
عصیاں کا نہیں قصد مگر واہ رے فطرت ہر عارضِ گلگوں پہ بھٹکتی ہیں نگاہیں (احسان دانش
اشک شوئی کا بہرحال نہ احسان لیا! میری پلکوں کے قریں سے کئی داماں گزرے (مفتون کوٹوی
یہ بھی انہیں گراں ہے تو ان کی طرف نہ دیکھ تھوڑی سی زندگی کا سہارا بھی چھوڑ دے (ندرت کانپو...

رشید منظر ــــــــ مظفرپور (بہار)

مئی کا شمارہ موصول ہوا۔ یہ شمارہ کئی تخلیقات کی بنا پر خاص قدر و قیمت کا حامل ہے۔ انسانیت کے نام پر آپ نے اور بہنداتھ نے فنکاروں کو جو پیغام دیا ہے وہ واقعی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ادب صلح و آشتی کا سب سے موثر پیامی ہے۔

آپ کی غزل مسلسل "دیکھ کر چلو" نے خاص طور پر متاثر کیا۔ مقالات کا حصہ کافی وقیع ہے۔ ڈاکٹر سید عبد حسین نے "ادب اور زبان" کے عنوان سے زبان میں الفاظ کی مختلف حیثیتوں اور ان کے محل استعمال پر بھرپور اور جاندار مقالہ لکھا ہے۔

سلام مچھلی شہری، ارشد صدیقی اور عنوان چشتی نے بڑی خوبصورت نظمیں لکھی ہیں۔ عنوان چشتی کی نظم "تاج محل" کے تیسرے بند کے تیسرے مصرع کو یوں ہونا چاہئے ۔

"کوئی صدا، کوئی سنتا ہے تو کوئی میری"

کتابت میں "ہے" چھوٹ گیا ہے۔ نازش پرتاپگڈھی، خالد شفائی اور شمس فریدی نے بھی اپنے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ حضرت نجم آفندی کی نظم کا یہ شعر حقیقت حال کا ترجمان ہے۔

میرے لہو سے میرا چمن لالہ زار ہے ‏ ‏ کیا اس سے بڑھ کے اور دلیل بہار ہے

اور حضرت احسان دانش کی غزل کا یہ شعر خاص طور پر پسند آیا ۔

ہم تم سے ملے ہیں تو یہ معلوم ہوا ہے ‏ ‏ کس طرح بدلتی ہیں زمانے کی نگاہیں

انہی کی غزل کے اس مصرع ۔

"کس کوچے سے داخل ہوں کہ گمراہ ٹھہروں"

میں گمراہ کے بعد کاتب نے "نہ" کا لفظ حذف کر دیا ہے۔ فرزند علی، روفی دکنی، کفیل آذر اور ڈاکٹر سحر آغلمی کی غزلوں نے خاص طور پر محظوظ کیا۔ ڈاکٹر سحر اعظمی کے اس مصرع میں

"دھواں اڑائیگا سے چمن میں اگر جلا میرا آشیانہ"

میں "اڑائیگا" غلط چھپ گیا ہے اسے اُڑے گا ہونا چاہئے۔

بقیہ افسانہ آہوں کی زبان صفحہ (۵۷)

بوسیوں کے احساس تلے دبے ہوئے ــــ دونوں زندگی کی اندھی قوتوں کے رحم و کرم پر خون کے آنسو بہا رہے تھے ــــ دونوں میں سے کسی کو یہ تک پتہ نہ چلا کہ دونوں ایک دوسرے سے کب بچھڑ گئے۔

رندھیر اور شیلا جب ایروڈرام سے باہر آئے تو انہوں نے آہوں اور آنسوؤں کو جھلاتے ہوئے۔ پردے کی اوٹ سے خلاء کی طرف دیکھا۔ اختر اور شکیلہ کو لیکر ہوائی جہاز حدود نظر سے آگے بڑھ گیا تھا۔

[illegible]

محفلِ اپنی۔۔۔!

یہ تازہ شمارہ

جون ۶۴ء کا یہ شمارہ چار مقالوں، چار افسانوں، تیرہ نظموں اور آٹھ غزلوں پر مشتمل ہے۔ "شاعر" کے مستقل ابواب بھی اس بار بھرپور ہیں۔ "رشید وطواط پر ایک ہندوستانی تحقیق کا ایرانی ماخذ" مقالہ نگار کی وسعت نظر کے سوا اور کچھ نہیں۔ اسے ہم طنز و تعریض نہیں بلکہ ایک تحقیق کہہ سکتے ہیں۔ کاش اشفاق علی خان کا یہ مضمون تمکین کاظمی مرحوم کی زندگی میں شائع ہوا ہوتا۔ "خطِ تقدیر" ایک مختصر مضمون ہے اور مولوی کریم الدین مرحوم کے بھولے بسرے قصے کی یاد تازہ کرتا ہے۔ پروفیسر زرینہ ثانی، نئی تنقید نگار ہیں۔ انہوں نے فانی کے سوز و گداز پر سلیقہ سے قلم اٹھایا ہے۔ امید کہ وہ اردو ادب کو اچھی نگارشات دے سکیں گی۔ "گردِ راہ پر ایک نظر" یاد اکرشن گوپال مغموم کا ایک تجزیاتی مضمون ہے۔ انہوں نے ضیا فتح آبادی کے شعری مجموعے پر مخلصانہ نظر ڈالی ہے۔

جیسا کہ ہم کئی بار عرض کر چکے ہیں۔ "شاعر" کے لئے کافی تعداد میں اچھے مقالے آئے ہوئے ہیں۔ اور ان میں ہر روز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مجبوراً بہت سے مقالے واپس کرنے پڑتے ہیں۔

افسانوں میں کرشن چندر کے افسانے کے متعلق ادارتی نوٹ موجود ہے، بقیہ تینوں افسانے بھی منتخب ہیں امید کہ یہ پسند کئے جائیں گے۔

اس شمارہ کی نظمیں نہ صرف تعداد ہی میں زیادہ ہیں بلکہ مواد و معیار کے اعتبار سے بھی بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اِدھر نظمیہ شاعری میں خاصا ابھار پیدا ہو رہا ہے اور غزلیہ شاعری کی بھیڑ بھاڑ میں یہ ایک اچھا شگون ہے۔

ڈراما نمبر

اِس بار اگست میں ادارہ نے "ڈراما نمبر" پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ "شاعر" نے اب تک جتنے بھی خاص نمبر پیش کئے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی جہت سے امتیازی حیثیت کے حامل رہے ہیں ہماری کوشش ہوگی۔ کہ "ڈراما نمبر" بھی قدرِ اوّل کی چیز ہو۔ جن قلم کاروں کو "ڈراما نمبر" کے لئے دعوتِ نگارش دی گئی ہے، اگر اُن کے علاوہ بھی کچھ اچھے ایکانکی ڈرامے وصول ہوئے تو شریک کئے جائیں گے۔ ڈرامہ نمبر میں کوئی ریڈیائی ڈرامہ شامل نہیں کیا جائے گا۔

صرف سَو ہمدرد

اِدھر تقریباً ہر شمارہ میں "شاعر" کی توسیع اشاعت کے سلسلہ میں اشارے کئے جاتے رہے ہیں، مگر افسوس کہ ہماری درخواستیں صدا بہ صحرا ثابت ہو رہی ہیں۔

آج ایک عمومی درخواست سے ہٹ کر ہم صرف اُن احباب کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ جو "شاعر" اور ادارۂ "شاعر" سے ایک خصوصی ربط و تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ایسے سو ہمدرد اپنی طرف سے صرف دس دس خریدار فراہم کر دیں تو "شاعر" کو بڑی تقویت پہنچ سکتی ہے۔ اُمید کہ مخلصین اس ذیل میں فوری توجہ فرمائیں گے۔ اور اپنی طرف سے دس دس نئے خریداروں کے چندے یکمشت ذریعہ منی آرڈر بھیج کر ہمیں ممنون فرمائیے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے نئے خریداروں کے نام وی۔ پی نہ منگوائے جائیں۔ اس لئے کہ وی۔ پی۔ اکثر واپس کر دیئے جاتے ہیں۔

اُمید کہ آئندہ شمارہ سے ہم دس دس نئے خریدار دینے والے ہمدردوں کے ناموں کی اشاعت کی مسرت حاصل کر سکیں گے۔ کسی ایک ہی شہر میں دو دو چار چار احباب مل کر بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔

پھر سے چھپا

شاعر کے گذشتہ شمارہ میں محمد عظیم صبا کا جو مضمون اس عنوان سے چھپا ہے اس پر غلطی سے "مزاحیہ" لکھ دیا گیا تھا وہ ایک حقیقی کیریکٹر اسکیچ ہے اور مزاح سے اسکا کوئی تعلق نہیں۔

ادارہ

نقد و نظر

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

اوراقِ مصوّر

از ــــــــــ سکندر علی وجد

اُردو تنقید ابتدا سے اِس متعدی مرض میں گرفتار ہے کہ جنہیں اُچھالے گی، اُنہیں اچھالے ہی چلے جائیگی اور جنہیں نظرانداز کرنا شروع کرے گی، اُن تک مشکل سے نظر پہنچے گی۔ چاہے اُن لوگوں کا مقام کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔

اُردو کی شعری تنقیدوں میں مشکل ہی سے کہیں سکندر علی وجد کا نام ملے گا۔ کیا بحیثیت نظم نگار، اور کیا بحیثیت غزل گو۔ اگر یقین نہ ہو تو تنقیدی مجموعے اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ یوں بڑے سے بڑے تنقید نگار سے وجد کی بعض نظموں "اجنتا"، "ایلورا"، اور کاروانِ زندگی وغیرہ کے متعلق پوچھا جائے تو چند توصیفی کلمات سُننے کو مل جائیں گے، لیکن کسی بندۂ تنقید سے آج تک یہ نہیں ہوا کہ وہ کُھل کر کلام وجد سے بحث کرتا اور اُردو شاعری میں وجد کے مقام کی تعیین کرتا۔ اُردو تنقید کا یہ کرم وجد ہی پر نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سے قابلِ قدر شعراء اِس کی زد میں ہیں۔ جیسے اُردو شاعری کو خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور اُردو تنقید نے "خود پسندی" اختیار کی ہے، جانبداریوں کا بازار گرم ہے۔ جدید و قدیم شعراء میں ہر پھیر کر چند مخصوص نام سمجھ لئے جاتے ہیں، اُن ہی پر لکھا جاتا ہے۔ حیرت اور افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ نہایت بے مصرف شاعری کرنے والوں اور دو دو چار چار سال سے شعر و ادب کی دنیا میں آنے والے لوگوں پر تو ہمارے رسائل کے صفحے کے صفحے رنگے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن جنہوں نے اپنی عمریں فکر و فن کے لئے وقف کیں، جو اپنے علم و فضل انداز و اسلوب اور زبان و بیان کی پختگی کے اعتبار سے ایک وقار سنجیدگی اور گہرائی لئے ہوئے ہیں۔ اُن پر بہت کم لکھا جاتا ہے۔

وہ تو غنیمت گذری کہ سکندر علی وجد کا تعلق سرزمینِ دکن سے ہے۔ اور وہاں کے بعض لکھنے والوں نے کبھی کبھی وجد کے شاعرانہ فکر و فن کی داد دی ہے۔ وجد محتاط سہی، وہ پروپیگنڈے کے فن سے ناواقف سہی، اُن کا تعلق کسی گروپ اور کسی اِزم سے نہ سہی لیکن اِس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وجد اور اُن کے ہم مزاج دوسرے بڑے اور اچھے شعراء پر قلم نہ اٹھایا جائے۔ وجد لکھتے ہیں:

نادان مجھے دربکار نہیں داد کا صدقہ
کیا شعر مرا کاسۂ دریوزہ گری ہے
ہے شہرتِ ارزاں کی طلب اہلِ ہوس کو
محتاجیٔ عالم کا سبب بے ہنری ہے
میں کچھ نہیں سب کچھ ہے مرا حسنِ تخیل
اِس حُسن کا زیور مری آشفتہ سری ہے
یہ زندہ حقیقت ہے کہ ہر شعرِ دلآویز
معراج کمالاتِ خیالِ بشری ہے
ملحوظ رہے فکرِ فلک رس کا تقدس
یہ رہگذرِ منزلِ پیغامبری ہے
پیغمبرِ برحق ہوں جمالِ ازلی کا
ہر شعر میں اک معجزۂ خوش نظری ہے
ہے حسنِ عمل شعر، خرد مند جنوں کا
تخلیقِ سخن، جوہرِ الماس گری ہے
رنگین بہانہ ہے فقط نظم و غزل کا
مقصود حقیقت کی یہاں پردہ دری ہے
ہے آتشِ دل سازِ صہبائے سخن میں
خشکی مرے لب کی، مری آنکھوں کی تری ہے
تیرے لئے طاعت ہے مری شعلہ نوائی
تیرے لئے اک مشغلۂ خوش سحری ہے
میں گرمیٔ محفل کے لئے دے نہیں سکتا
اشعار میں جو سوزِ دعائے سحری ہے

مندرجۂ بالا نظم "تحسین ناشناس" وجد کے شاعرانہ مقصد کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس میں وجد کے مسلک کا اظہار ہی نہیں ہے۔ بلکہ اُن کے رنگ و آہنگ کی صحیح تنقید بھی ہے۔ انہوں نے اپنے شعر کو واقعی "کاسۂ دریوزہ گری" نہیں بنایا۔ "اوراقِ مصوّر" کی نظموں اور غزلوں سے "حسنِ تخیّل" آشکار ہے۔ اُن کی خوش فکری اور الماس گری سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جس سوزِ دعائے سحری کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے۔ اُسی نے اُن کی شاعری کو جلا بخشی ہے۔ اُردو کے بعض ایسے شعرا جو تیس پینتیس سال سے فکرِ سخن کر رہے ہیں۔ جن کا اُردو شاعری میں ایک مقام ہے اُن میں سے اکثر قدیم تہذیبی، اخلاقی اور رُوحانی قدروں سے وابستگی رکھتے ہیں۔ اپنے دَور کے جدید تقاضوں کو قبول کرنے کے باوجود وہ کلاسیکی روایتوں کا پُوری طرح احترام کرتے ہیں۔ چنانچہ وجد کے یہاں بھی نہ صرف فن کی نزاکتیں پائی جاتی ہیں۔ بلکہ ہمہ گیری کا بھی احساس ہوتا ہے۔ "لہو ترنگ" اور "آفتابِ تازہ" کے شاعر اور "اوراقِ مصوّر" کے شاعر میں کوئی زیادہ مزاجی فرق تو محسوس نہیں ہوتا لیکن فکری کشادگی، جذبے کی گرفت اور بلند نظری کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

دیارِ حُسن سے شعر و شباب لایا ہوں
نظر بلند و دلِ کامیاب لایا ہوں

شاعری میں سارے معاملات دل ہی سے تعلق رکھتے ہیں محسوسات و مشاہدات کے بغیر اچھا اور بڑا شاعر پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ وجد نے اپنے اشعار میں اپنی شاعری کے متعلق کئی جگہ دعوے کئے ہیں۔

"ہر غزل معجزۂ حُسنِ بیاں ہے اے دوست"

معجزہ سے قطعِ نظر، وجد کے حُسنِ بیان سے انکار کی گنجائش نہیں اور یہ حُسنِ بیان بھی دوسرے شعرا سے کچھ مختلف ہے۔

حریفِ نغمہ ہے اندازِ گفتگو میرا
ازل سے فطرتِ چنگ و رباب لایا ہوں

اُن کے الفاظ و تراکیب میں واقعی ایک قسم کی نغمگی ہوتی ہے۔ وجد کے اسلوب کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ شاعر بھی نہایت لطیف و سبک الفاظ کے ساتھ ساتھ کسی کسی شعر میں عجیب "مردانہ وار انداز" اختیار کر لیتے ہیں۔

آخر یہ کس نشے میں اکڑتی ہے زندگی!
کب تاب و تب ہے اس خمِ آتش سوار میں

اُن کی کئی نظموں میں بھی اس طرح کا رجزیہ آہنگ ملتا ہے اور اُن پر دبستانِ انیس و دبیر کی پیروی کا گمان ہوتا ہے۔ شمشاد قد، اسپِ ثابت قدم۔ لالۂ خونیں کفن۔ شکارِ شیر و شاہین۔ جمالِ ازلی۔ خوش نظری۔ خیابانِ خامشی۔ غم کی سرکار۔ خوش جادوں۔ لعلِ گہر ریاضِ سخن اور اسی نوع کے الفاظ و تراکیب سے وجد کو پہچانا جا سکتا ہے۔ اُن کے وجدان میں جلال و جمال کا امتزاج ہے۔ وہ حُسن کے پرستار ہیں، چاہے حُسنِ ازل ہو یا حُسنِ انسانی۔ تاریخی عمارتوں کا حُسن ہو یا حُسنِ فطرت۔ وہ آرٹ کے شیدائی ہیں۔ اور آرٹ میں اس حد تک خود کو کھو دیتے ہیں کہ خود ایک آرٹسٹ بن جاتے ہیں۔ اُن کی نظمیں ایلورا، اجنتا، تاج محل، نیلی ساگر، رقاصہ، اور کاروانِ زندگی وغیرہ۔ شاعرانہ آرٹ کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان نظموں کی حیثیت دوامی ہے۔ "اوراقِ مصوّر" کی نظموں میں نقش و نگار۔ خانہ بدوش۔ عالم آشوب۔ نذرِ وطن۔ نظیر اکبر آبادی۔ پچاس بہاریں۔ کامیابی۔ پیامِ اقبال۔ ہم۔ گہوارۂ مسیح۔ تحسینِ ناشناس اعلیٰ پایہ کی نظمیں ہیں۔ نیلی ناگن اور محمد علی۔ یہ دونوں نظمیں اپنے زورِ بیان کے اعتبار سے انیس و دبیر کی یاد دلاتی ہیں۔ انہوں نے بعض شخصیتوں پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ جیسے چکبست۔ محمد علی۔ عبدالرزاق لاری۔ اقبال۔ ولی اورنگ آبادی وغیرہ۔ مہاراجہ کشن پرشاد پر اُن کی نظم کا ایک شعر دیکھیئے ؎

دیکھو اب تنگِ چمن رنگِ رواداری ہے
پھول خاموش ہیں تبلیغِ ستم جاری ہے

نظم چاند بی بی کے یہ دو شعر

احمد نگر کے دل پہ ترے غم کا داغ ہے
یہ داغ اس کی بزمِ عزا کا چراغ ہے
سرشار ہو کے توڑ گئی جامِ زندگی
لوحِ جہاں پہ چھوڑ گئی نامِ زندگی

اُن کے اسلوب کی سلاست، اندازِ بیان کی حلاوت اور حقیقت

سندی کے سلسلے میں بطور ثبوت پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کوئی نظم
یسی نہیں ہے جس میں اس طرح کے اشعار نہ ہوں۔ ہر چند تمام
یں بیانیہ ہیں اور ان کا علامتی شاعری سے کوئی تعلق نہیں۔
س کے باوجود ان کے اثر و دلکشی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔
چار چار شعر کی دو نظمیں "میر آسکات" اور "جیالے چراغ" بڑی
اثر ہیں۔

طوفاں بپا ہے سر پہ لیکن
موجوں میں گھر تو پل رہے ہیں
بیدار دلوں کی روشنی سے (جیالے چراغ)
آندھی میں چراغ جل رہے ہیں

وجد نے اپنے دیباچہ میں کہا ہے،

"اس حقیقت کا بھی شدید احساس ہے کہ یہ شاعری
وقت کے حوصلوں، مزدوروں، اور آرزوؤں کی پوری
ترجمانی نہیں کرتی۔"

لیکن ایسا نہیں ہے کہ وجد اپنے دور اور اس کے تقاضوں
سے ایک تماشائی کی طرح گذر گئے ہوں۔ انہوں نے وقت کی
دھڑکنوں کو کسی نہ کسی حد تک ضرور محسوس کیا ہے۔ اس کے ثبوت
یں ان کی تین نظمیں آثارِ سحر۔ بشارت۔ اور آفتاب تازہ
پیش کی جا سکتی ہیں۔ آثارِ سحر میں انہوں نے کہا تھا ؎

ہو گیا ہے آگ تپ تپ کر غلاموں کا لہو
اب سلاسل کے پگھلنے کا زمانہ آگیا

وجد کو موضوع کے اعتبار سے الفاظ کے انتخاب کا سلیقہ آتا ہے۔
وہ نرم و گرم الفاظ کے صرف کا پورا پورا ادراک رکھتے ہیں۔ یہی
ادراک اور یہی سلیقہ شاعر کو امتیاز عطا کرتا ہے۔ اس میں گہرائی
پیدا کرتا ہے۔ پیام اقبال صفحہ ۱۱۳ اسی کا زندہ ثبوت ہے۔
یہ نظم اقبال ہی کے انداز و اسلوب میں کہی گئی ہے، اور خوب ہے
ایک طرف ان کے مجموعے میں ایسی بلیغ نظمیں ہیں تو دوسری طرف
جوہیّت جیسی سلیس اور رواں نظمیں بھی مل جاتی ہیں۔

"نیلی ناگن" کا ایک مصرع ہے۔

"احساس کی لہروں کا نشا جال بچھا ہے"

یہ "نشا جال" سمجھ میں نہیں آیا۔
[illegible]

"تقدیر نے رکھ دیا ہے کلیجا نکال کے"

یہ مصرع کسی دوسرے کے یہاں بھی دیکھنے میں آیا ہے۔

"کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجا نکال کے"

وجد کی غزلوں میں تفکر ضرور ہے لیکن یہ فلسفیانہ گہرائی نہیں
رکھتیں۔ ہاں ان کے تغزل میں سنجیدگی اور شگفتگی ہے۔
واردات و احساسات بھی ہیں۔ مگر وہ شدت نہیں جس کا تعلق
دلِ تپاں سے ہوتا ہے۔ یہ غزلیں وجدانی ضرور ہیں لیکن ان
میں وہ گرمی نہیں جو ہونی چاہئے۔ ہر چند انہوں نے غزلوں کا
انتخاب سختی سے کیا ہے، کسی غزل میں چھ سات شعر سے زیادہ
نہیں ہیں۔ اس کے باوجود بعض اشعار بالکل روایتی انداز کے
ہیں۔ ان میں نہ فکر ہے نہ فلسفہ ہے اور نہ جذبہ کی تیز آنچ۔
یہ بالکل سیدھے سادے ہیں اور خیالات سامنے کے ؎

مسکراتے ہیں پھول کانٹوں میں   ہائے کیا طرزِ دل ربائی ہے
اور تو آئینے میں عیب نہیں   صاف دل ہے یہی برائی ہے

سینے میں جیسے پھانس کھٹکتی ہے دم بدم
تیرا خیال دردِ جگر بن کے رہ گیا

ترے پاس آنے کو جی چاہتا ہے   نئے زخم کھانے کو جی چاہتا ہے
لبوں پر مرے کھیلتا ہے تبسم   جب آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے

ہر یا قہر ترے چاہنے والے کے لئے
ہر ادا جان سے پیاری ہے تجھے کیا معلوم

حسیں ہو گئی ہے نگاہِ تمنا   حسینوں کے رنگین جلووں میں پل کے

اگر ایسے اشعار شاملِ مجموعہ نہ ہوتے تو اچھا تھا۔ ان سے وجد کی
شاعرانہ عظمت مجروح ہوتی ہے۔ وجد کی غزلوں کے چند اچھے
اور خوبصورت اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں اور ان ہی کو وجد
کا معیارِ تغزل قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ نشاطِ تیز گامی ہے کمالِ شاد کامی
مجھے منزلوں سے مطلب نہ غبارِ رہ گذر سے

وہ مقام میکدے ہیں وہ جہاں جہاں رکے ہیں
ہیں قدم قدم پہ گلشن وہ گذر گئے جدھر سے

لے کا عیب ہیں تری بے التفاتیاں   نالہ مرا گلے میں اثر بن کے رہ گیا
موت کتنی ہی شاندار سہی   زندگی کا مگر جواب نہیں

نشانِ شمعِ محفل ہے نہ خاکِ اہلِ محفل ہے
سحر اب پوچھتی ہے رات پر وانوں پہ کیا گذری

جب وہ مسرور نظر آتا ہے ہر طرف نور نظر آتا ہے
قرب سے ہاتھ اُٹھا یا جب تو بھی دُور نظر آتا ہے
میں ہی بے بس نہیں اے کہ ہاتھوں تو بھی مجبور نظر آتا ہے

وقت بھی ہم سفر ہے تیز چلو
ساری دُنیا، حریمِ ناز نہیں

روز و شب سِلسلۂ حادثہ پیمائی ہے
وقت حالات کا خاموش تماشائی ہے
خود پرستی کا سبب ظلمتِ تنہائی ہے
آئے محفل میں جسے دعویٔ یکتائی ہے
بے خبر دامنِ صحرا سے گذرنے والے
گلستاں گر کر روبندۂ صحرائی ہے

سحر کا ذکر، اندھیرے کی بات ہی نہ ہوئی
وہ جب سے آئے مرے گھر میں رات ہی نہ ہوئی

یہ کیوں دم بدم ہچکیاں آرہی ہیں
بھلایا کسی نے کہ ہم یاد آئے
مرے آنے کی مسرت کو بھی سے نہ چھپا
کون سی شمع نہیں منتظرِ پروانہ

ذرا مسکرایا جو ساقی سنبھل کے
کئی ہاتھ کانپے، کئی جام چھلکے
اصلِ زندگی کیا ہے کوئی کسطرح جانے
زندگی سناتی ہے آدمی کو افسانے

تبصرہ کی گراں باری کے خیال سے وحید کی غزلوں کے مزید زندہ و پائندہ اشعار کا انتخاب نہیں دیا جا رہا ہے۔

"اوراقِ مصوّر" کی ترتیب و طباعت میں بھی پوری پوری حُسن کاری سے کام لیا گیا ہے۔ یہ نفیس کاغذ پر دو رنگ میں اُردو ٹائپ میں نہایت خوبصورت چھپا ہے اپنی صوری و معنوی خوبیوں کے اعتبار سے "اوراقِ مصوّر" صاحبانِ ذوق تک پہنچنے کے لئے اپنی سفارش آپ ہے۔ امید کہ نقادانِ ادب، وحید کے فکر و فن کی صحیح قدر دیکھے

قیمت ۶ روپیہ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ اور پرنسس بلڈنگ ۔۔ ابراہیم رحمت اللہ روڈ۔ بمبئی ۳

خمار بمبئی

دھنک

از ——— آنند موہن اعجاز

یہ چھوٹا سا پاکٹ سائز خوبصورت مجموعہ آنند موہن اعجاز کے قطعات کا ہے۔ آنند موہن اعجاز کو شاعری ورثہ میں ملی ہے۔ وہ نوجوان ہیں اور جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ جذبات و واردات جو رُخ بھی اختیار کرلیں۔ آنند موہن اعجاز نے اپنے جذبات کی تہذیب و ترتیب کے لئے قطعات کا سہارا لیا ہے۔

تیری آنکھوں کی تبسم کی نوک غم زدہ دِل کا کنول کھلتا ہے
چھاؤں جب زُلف کی ملتی ہے مجھے کیا کہوں کتنا سکوں ملتا ہے

میری تسکین و تسلی کے لئے غم زدہ آنکھ چھلک جاتی ہے
وصل کے اشکوں کی حسین شبنم سے زندگی اور مہک جاتی ہے

کیف زا نغمگیں خیال ترا یُوں مرے دِل کو گدگداتا ہے
جیسے جھولے پہ بیٹھ کر کوئی گیت ساون کے گنگناتا ہے

شاعری قطعات کی ہو یا رباعیات و غزل کی۔ جب اس میں رعنائی خیال و جذبات شامل ہو جاتی ہے تو اس سے پڑھنے اور سننے والے متاثر ہوتے ہی ہیں۔ آنند موہن اعجاز کے قطعات میں رس رنگ، لوچ، شگفتگی، اور ایک طرح کا رچاؤ موجود ہے۔ لطافت اور نزاکت بھی ہے۔ اُن کے اکثر قطعات کا موضوع "عورت" ہے اُس کا رُوپ اور اُس کے ہجر و وصال کی لذّت ہے۔ بعض قطعات میں اُنہوں نے منظر نگاری بھی کی ہے۔ بعض میں شیخ و برہمن پر پھبتیاں ہیں۔ ہر قطعہ میں شاعرانہ شعور کی جھلک ہے لیکن یہ شعور ابھی بہت زیادہ پختہ نہیں ہے۔ باتیں بڑی خوبصورت ہیں مگر اپنی باتوں کو وہ گہر انگریز انداز نہیں دے سکے ہیں۔ اپنی دانست میں اُنہوں نے فن کو برتا ضرور ہے لیکن خود اُسے پرکھا نہیں ہے۔ "دھنک" کے بعض قطعات اس قابل ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے اور بعض ایسے جن سے ناپختگی صاف جھلکتی ہے۔

آس کی چڑھتی ہوئی بیل نہ توڑ دِل کی کھلتی ہوئی کلیوں کو نہ مسل
"کلی" ملی نہیں جاتی بلکہ مسلی جاتی ہے۔ بڑی آسانی سے یہ عیب دُور ہو سکتا تھا۔

"دِل کی کھلتی ہوئی کلیاں نہ مسل"

ستمہارا مجھ کو جنوں گر مرا نہیں دیتا

یہاں "جنوں گر مرا" شعور کی ناپختگی کی دلیل ہے۔

موت کا سایہ جب مچلتا ہے

"سایۂ موت" کہا جا سکتا تھا۔

ایک دن اُس کو بھڑکنا تھی بھڑک اُٹھی ہے
آتشِ عشق کو اشکوں سے بجھاتا کب تک

"بھڑکنا تھی" غلط ہے، "بھڑکنا تھا" ہونا چاہیئے۔

ڈوبو پُر پیچ نے مانگا ہے خرام
برق کی نظروں میں اس کا ہے جمال

"برق کی نظروں" کے بجائے "نگہِ برق" کہا جاتا تو مصرع صاف ہو جاتا۔

طالبِ دولت و زر کو نہیں آرام کبھی
جب بھی دیکھا ہے انہیں ہم نے پریشاں دیکھا

"طالبِ دولت" کہا ہے تو دوسرے مصرع میں "اُسے" کہنا چاہیئے۔ اگر پہلے مصرع میں "طالبانِ دولت" ہوتا تو "انہیں" کہہ سکتے تھے۔

(۱) ہو کے ناکام "یونہی آہ مری در سے ترے"
(۲) بزمِ اغیار میں سبھی کو دوست
(۳) دھول دُھل جاتی ہے، بڑھ جاتا ہے پھولوں کا نکھار
(۴) رنگ لائے ہیں کیا قیامت خیز
(۵) رازِ ہستی سے نہ تھی جو آگہی
(۶) دل کی ہر چوٹ پرانی ابھری
(۷) کس کی زلفوں سے لپٹ آئی ہے
(۸) زندگی کی اندھیری راتوں میں
(۹) جام و مینا میں یہ "ملتی کہاں مستی" مجھ کو
(۱۰) اس لیے میں نے جوانی میں ہی توبہ کر لی
(۱۱) جادو جب دخترِ رز کرتی ہے اپنا اعجاز

(۱) پورا خط کشیدہ ٹکڑا الجھا ہوا ہے (۲) دوست سے پہلے حرفِ ندا ہونا ہی چاہیئے تھا (۳) "دھول دُھل جاتی" کتنا ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ "گرد دھل جاتی" کہنے میں کیا مضائقہ تھا۔ (۴) "کیا قیامت خیز" کے بجائے "کس قیامت کے" کہنا چاہیئے (۵) "جو" کا نہیں جب کا محل ہے (۶) "پرانی چوٹ" کہ "چوٹ پرانی" موجودہ صورت میں ابھری سے پرانی کا تعلق
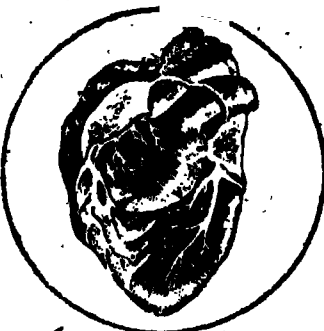
(بقیہ صفحہ ۷۲ پر دیکھئے)

رفتار

(علمی - ادبی - اور تہذیبی خبریں

میر کی کتابیں غیر ملکی زبان میں ترجمہ ہونگی

لکھنؤ ۱۶ مئی۔ میر اکیڈمی کے چیرمین مسٹر مقبول احمد لاری نے نمائندہ نافین سے بات چیت کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ میر تقی میر کی کتابوں کے ترجمے غیر ملکی اور ہندوستانی زبانوں میں کئے جائینگے۔ اس مقصد کیلئے زبانوں کے ماہروں کی خدمات حاصل کی جائینگی۔ میر تقی میر کی اکثر نظمیں پنجابی، فارسی، عربی، ہندی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

الہ آباد میں شام جگر

لکھنؤ۔ ماہ ستمبر میں الہ آباد میں "شام جگر" کے نام سے ایک تقریب۔ جس کا افتتاح ہندوستان کے نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کریں گے۔ آل انڈیا جگر میموریل کمیٹی کے ایک عہدیدار نے کہا کہ اس موقع پر جگر مرادآبادی کے ایک مجسمے کی نقاب کشائی کی جائیگی۔

ایک مجلس مباحثہ میں جگر مرادآبادی کی شاعری پر روشنی ڈالی جائیگی۔ ایک انڈو پاک مشاعرہ بھی ہوگا۔

مرزا غالب کی نادر تصویر

لکھنؤ ۴ مئی۔ غالب اکیڈمی کے صدر مولانا خیر بہوری نے مرزا غالب کی ایک نادر تصویر حاصل کی ہے۔ یہ تصویر مرزا غالب کے انتقال سے چھ ماہ قبل سنہ ۱۸۶۹ء میں لی گئی تھی۔ جبکہ مرزا بیمار تھے اور اُن کے شاگردوں نے انہیں بستر سے اُٹھا کر کرسی پر بٹھایا تھا اور یہ تصویر لی تھی۔

سخن در سخن

ادبی حلقوں کو اس اطلاع سے مسرت ہوگی کہ مشہور ادیب و شاعر اور اُردو زبان کے دیرینہ خدمت گذار اعجاز صدیقی کی غزلوں کا مجموعہ "سخن در سخن" ترتیب دیا جا رہا ہے۔ جدید اُردو غزل کو عظمت و رفعت عطا کرنے میں اعجاز صدیقی کا بھی حصہ ہے۔ "سخن در سخن" میں صرف وہ غزلیں ہونگی جو موصوف نے گذشتہ ۱۳ سال میں وقفوں وقفوں سے کہی ہیں اور جنکی انفرادیت مسلم ہو چکی ہے۔ جن کے اکثر اشعار عوام و خواص کی زبان پر ہیں۔

اعجاز صدیقی اپنے پہلے دور کے جس میں ۲۰ سال کا بہترین سرمایہ ہے کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف دورِ آخر کی ایسی منتخب غزلیں مجموعہ میں دے رہے ہیں جو آفاقی حیثیت رکھتی ہیں اور جن میں آنے والے وقت کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ جو ہمارے دور کی حقیقتوں اور صداقتوں کو منفرد لب و لہجہ میں پیش کرتی ہیں اور جن کا زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ جن میں روایتی غزل سے انحراف کے باوجود کلاسیکی رچاؤ فکری گہرائی اور فنی التزام ہے۔

"سخن در سخن" ایک ایسے شاعر کا مجموعۂ کلام ہوگا جو تیس سال کی مشق و مزاولت کے باوجود افراط و تفریط سے بچا رہا۔ سنگلاخ زمینوں میں شگفتہ کاری اعجاز صدیقی کی خصوصیت ہے۔ "سخن در سخن" کی غزلوں میں تجربات و مشاہدات کی تیز آنچ سے زندگی، حرارت اور توانائی پیدا کی گئی ہے۔ ہر غزل "جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے"

خاص اہتمام کے ساتھ اکتوبر سنہ ۶۴ء تک "سخن در سخن" کی اشاعت متوقع ہے۔

ردو مثنویاں" پر غالب پرائز

حکومت اُتر پردیش نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی کتاب
ستانی قصّوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں" کو حالیہ اُردو
ں میں سے بہترین قرار دیتے ہوئے ڈیڑھ ہزار روپیہ کا غالب
" دینے کا اعلان کیا ہے۔ اس کتاب میں نہایت تلاش
ت سے اُردو مثنویوں کی ہندوستانی بُنیاد کا جائزہ لیا گیا
۔ اور ان مثنویوں سے مفصّل بحث کی گئی ہے جن کے قصّے
ستان کی عوامی اور تاریخی روایتوں سے لئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر
۔ آجکل امریکہ کی وِسکانسن یونیورسٹی میں اُردو کے
ٹنگ پروفیسر ہیں۔

بر مینائی پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری

آگرہ یونیورسٹی نے ابو محمد سحر کو اُن کے مقالے، "اُردو ادب
میر مینائی کا حصّہ" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی ہے
سحر "اُردو میں قصیدہ نگاری" اور "تنقید و [illegible]" جیسی
قدر کتابوں کے مصنّف ہیں۔

سب سے وزنی اور قیمتی کتاب

پیرس ۱۵ اپریل۔ دنیا کی سب سے بیش قیمت کتاب
ہ ہنڈرویٹ وزن رکھتی ہے اور جس کا دس لاکھ ڈالر میں
ایا گیا ہے۔ بحری جہاز "فرانسس" پر نیویارک کے عالمی
ے کے لئے روانہ کی گئی ہے۔ اس کتاب کا نام "اپیو کالیپسی"
۔ اس کے حروف اور تصاویر طلائی ہیں۔ اس کتاب کی نمائش
۱۹ سے اب تک متعدد یورپی مقامات پر کی جا چکی ہے۔

شن چندر پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری۔

اُردو کے عظیم افسانہ نگار کرشن چندر پر مسٹر احمد حسن ایم اے
باد یونیورسٹی میں تحقیق کر رہے تھے۔ اُن کے تحقیقی مقالے
نوان "کرشن چندر۔ اُس کی حیات اور تصانیف" تھا ڈاکٹر
رفیق حسن کی زیر نگرانی یہ مقالہ مکمل ہو گیا ہے اور اس پر
ر بھی
مسٹر احمد حسن کو پی، ایچ، ڈی کی ڈگری دے دی گئی۔

آگرہ کی ثقافتی تاریخ

معلوم ہوا ہے کہ روس میں آگرہ کے ثقافتی ورثہ کے بارے
میں ایک جامع کتاب چھاپی جائے گی۔ یہ کتاب اُردو میں
لکھی گئی ہے۔ اور اس کا روسی اور ہندوستانی زبانوں میں
ترجمہ کیا جائے گا۔ اور اسے بیک وقت روس اور ہندوستان
میں چھاپا جائے گا۔

اس کتاب کے مصنّف مشہور اُردو شاعر میکش اکبرآبادی
ہیں۔ کتاب تقریباً مکمل ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں پچاس
سال قبل کے آگرہ کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور
اُن شخصیتوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کا تعلق آگرہ کی ثقافتی
زندگی سے ہے۔ اس میں شاعروں، کوی سمیلنوں اور ہندوؤں
اور مسلمانوں کے میلوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

رسالہ مولوی کے ایڈیٹر کا انتقال

منشی عبدالحمید صاحب ایڈیٹر رسالہ مولوی کا طویل علالت
کے بعد انتقال ہو گیا۔ منشی صاحب مرحوم علاج کے لئے اپنے
بچوں کے پاس گئے ہوئے تھے۔ مرحوم دہلی کے نہایت پرانے
صحافی تھے۔ اور اُس گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جسے خواجہ حسن
نظامی کے فیضِ صحبت نے صحافت کی طرف مائل کیا تھا۔
مرحوم کا رسالہ "مولوی" ایک زمانہ میں اُردو کا سب سے کثیر الاشاعت
پرچہ رہ چکا ہے۔

بیرم خان کے اشعار کے مجموعہ کی دریافت

عاشق آباد۔ سوویٹ سائنس اکاڈمی کا ادارہ برائے
ایشیائی عوام کے اسٹاف کے رکن حجی دوائی عبداللطیف نے اکبر اعظم
کے جنرل بیرم خان کے اشعار کا مجموعہ دریافت کیا ہے جو ترکمانی
زبان میں تحریر ہے۔ اس مجموعے میں دو ہزار اشعار ہیں۔ یہ مجموعہ
حقیقتاً ۱۶ ویں صدی کی ترکمانی زبان میں پہلی ادبی
دستاویز ہے۔

ہوتا ہے۔ (۸) "زلفوں سے" نہیں "زلفوں کی" کہنا چاہئے
"اندھیری" کی جگہ "سیاہ" رکھ کر مصرع کو رواں بنایا جا سکتا
(۹) "مئی کہاں مستی" میں اُلجھاؤ ہے۔ (۱۰) "ہی ہیں" کہنا چاہئے۔
جادو جب دخترِ رز" میں وہی اُلجھاؤ جو بعض دوسرے مصرعوں
ہے "سحر" سے ایک حد تک یہ خرابی دُور ہو جاتی۔
کوئی محل کی کھڑکی سے مجھکو دیکھے اور دیکھ کر چھپ جائے
رے مصرع میں حروف کے گرنے اور دبنے کا سخت عیب ہے "مجھ کو"
ہے۔ اگر شاعر کا شعور پختہ ہوتا تو وہ یوں کہتا سہ
دیکھ لے اور دیکھ کر چھپ جائے
ن کئی قطعے ایسے ہیں جو معیار پر نہیں اُترتے مثلاً خونِ اثیار ۔

حجم ۸۶ صفحات۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔
ملنے کا پتہ:- ادارۂ کاروانِ سخن۔ جیوی الیکٹرک کلیس بھوپال

مولانا حامد حسن قادری کا انتقال

۶ جون ۱۹۶۴ء کو کراچی میں مولانا حامد حسن قادری انتقال فرما گئے۔ افسوس ہماری انجمن سے ایک پرانا با وضع ادیب، نقاد اور شاعر اُٹھ گیا۔ تمام عمر انہوں نے علم و ادب کی خدمت کی۔ وہ بڑے با اصول اور خاموش خدمت گذاروں میں سے تھے۔ ادارۂ "شاعر" کو اُن کے پسماندگان سے دلی ہمدردی ہے۔ اُن کے انتقال سے اُردو زبان و ادب کا بڑا نقصان ہوا ہے۔ (چیف ایڈیٹر)

ن جس کا ایک مصرع ہے۔
ں میں کسی الّہڑ کی صورت مستی
رقص کرتے ہوئے نہ کبھی سنا
دیکھا۔ البتہ عالمِ مستی میں
ہو سکتا ہے۔ کاہل۔ دوستی۔
ت جیسے قطعات مجموعہ میں
نہیں ہونے چاہئے تھے

غزل کی کلیاں۔ سازِ فطرت
جشنِ ساغر، رازداں، ذکرِ مئی
کشمکش۔ چند رنگی۔ کیف و مستی
پتوار۔ شکستِ نظر۔ زندگی۔ یاد
زلفِ حیات۔ ہار جیت بہید اچھے
اور خوبصورت قطعات ہیں۔
آئندہ جناب اعجاز اگر اسی طرح کے

قطعات کہتے رہے تو اُن کا شمار
اچھے قطعہ نگار شعراء میں ہو سکتا ہے۔
ایک مختصر سے مجموعہ پر یہ
تفصیلی اظہار خیال صرف اِس
لئے ہے کہ نوجوان شعراء اپنے فکر و
فن کو خود سمجھیں اور خود اُس کا
جائزہ لے کر آگے بڑھیں۔

Regd. No. B. 6032
The "SHAIR" Bombay. 8
(35 Years of Publication)
THE MOST POPULAR OLDEST LITERARY & CULTURAL URDU JOURNAL

علامہ سیماب اکبر آبادی

کی چند حیات افروز تصانیف

کلیم عجم	(غزلیات)	چار روپیہ اٹھ آنے
سدرۃ المنتہی	(غزلیات)	چار روپیہ
کار امروز	(نظمیں)	چار روپیہ اٹھ آنے
شعر انقلاب	(نظمیں)	تین روپیہ
عالم آشوب	(رباعیات)	تین روپیہ
نمیرِ غم (عزائی نظمیں اور سلام)		ایک روپیہ

جلدوں پر خوبصورت اور رنگین گردپوش

(مکمل سیٹ کی خریداری پر صرف محصول ڈاک معاف)

مینجر ، شاعر ، مکتبۂ قصر الادب پوسٹ بکس ۵۲۶ ، بمبئی ۸
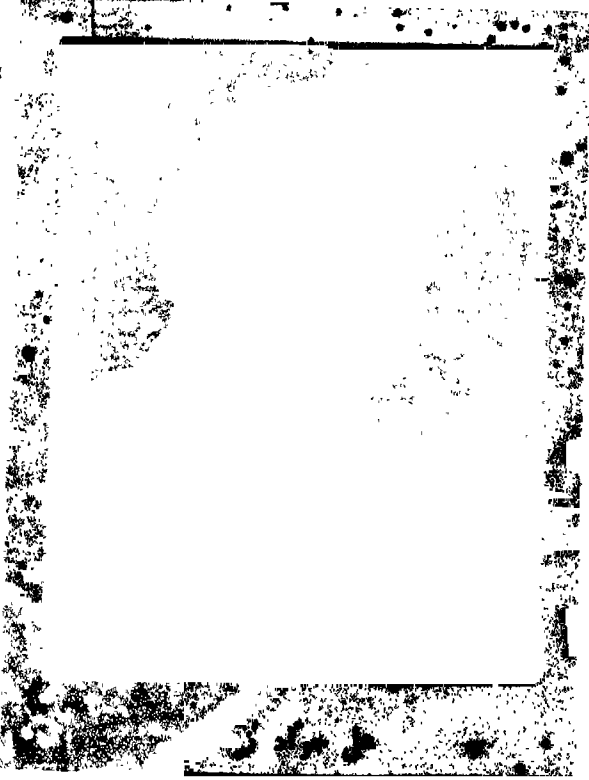
Only cover printed at Adabi Printing Press, Bombay-8

دِفاع اور ترقی کا کام ساتھ ساتھ چلتا ھے
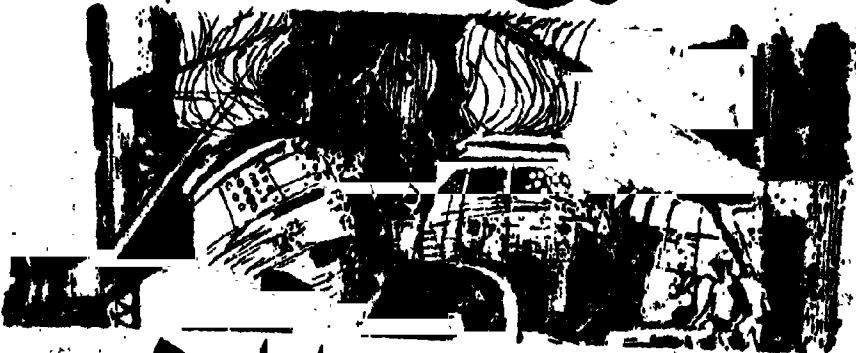
دفاعی کوششوں میں براہ راست شریک ہونے کے لئے فولاد کی صنعت نے اپنی پیداوار بڑھادی ہے اور رولنگ ملوں کے پیداواری پروگراموں میں ضروری ترمیم و تبدیلی کردی گئی ہے۔ مسلح افواج کے کام میں آنے والی موٹر گاڑیوں کا معیار ممتاز کر دیا گیا ہے۔ انجینئری صنعت کی صلاحیت بھی بڑھادی گئی ہے۔ برقی پلانٹ چالو کرنے کا کام بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ ہنگامی صورت میں استعمال کے لئے جنریٹر مشینوں کا ایک ذخیرہ بنایا جارہا ہے۔ ریلوے ورکشاپوں سے زیادہ تعداد میں مال ڈبے بن کر نکل رہے ہیں۔ اہم و دوسری سڑکوں کو بہتر اور جدید بنایا جا رہا ہے۔

ان نئی ترجیحات سے ملک کے دفاعی نظام کی مضبوط بنیاد تیار ہو رہی ہے۔ اس مہم کو کامیاب بنانے کے لئے جی جان سے ہاتھ بٹایئے۔

افکار ادارہ

رہنمائے اعظم جواہر لال نہرو پر تعزیتیں	ادارہ	
صنیل اپنی ......!	ادارہ	۶۱
نقد و نظر	ادارہ	۶۳
رفتار (علمی ادبی اور تہذیبی خبریں)	ادارہ	۶۴

فہرست

مقالات

بابائے اردو نواب امیر خاں انجام	سید نقی احمد ارشاد	۸
علی جواد زیدی کا تغزل	ساجد ادیب	۱۵
بڑھاپا اور ثابت لکھنوی مرحوم	مفتوں کوٹوی	۲۲

نظمیں

خاکستر پروانہ (مادام کیمپ)	نازش پرتاب گڈھی	۲۹
دیا سلائی کی تیلی	رونق نعیم	۳۰
گمراہ	سید احمد شمیم	۳۱
ہم نژاں کا نور (بورس پاسترناک)	صبا وحید	۳۲
نہرو کے بعد	خاور باگوی	۳۳
سیہ تہیں	رؤف خلش	۳۳

افسانے

یادیں اور آنسو	تجمل سمیع	۳۵
ٹھنڈے ہاتھ	گربچن سنگھ	۳۹
گیلی لکڑی	رفعت نجمی	۴۲
خلش	روشن آرا نیر	۴۷

غزلیں

مظفر حنفی — اختر نظمی — محسن احسان

ظفر حمید — عبد المجید شیدا — قطب شاہین

عبد الصمد تپش

مکتوبات

صابر شاہ آبادی — سید حرمت الاکرام — مفتوں کوٹوی — نزاکت فیضی — شارق میرٹھی

عنوان چشتی — رام لعل — رفعت سروش — خاور باگوی

شفیق بھوپالی

ساحرے

بے شمار سالنامے اور خاص نمبر پیش کرنے کے بعد
اگست ۱۹۶۲ء کے وسط میں بے پناہ خوبیوں سے مزین

ڈراما نمبر پیش کیا جا رہا ہے

سنجیدہ — مزاحیہ — اور منظوم — ایکانکی ڈرامے

مضامین

اردو میں ایکانکی ڈرامے	ڈاکٹر عبدالعلیم نامی
اردو میں مختصر ڈراما	ڈاکٹر سید حامد حسین
ہندی ایکانکی کے اصلی نقلی چہرے	دیویندر اسر

منظوم ڈرامے

پرچم زرفشاں کی چھاؤں میں	سلام مچھلی شہری
شہر کی جنت	رفعت سروش
رہسنا کے بعد	خاور باکولی

★ سنجیدہ ڈرامے ★

مچھلی والی	کرشن چندر
للکا	کرتار سنگھ دگل
سہاگ کا پھول	کنہیا لال کپور
بزدلی چکر	انور عنایت اللہ
اک رول نیا	جوگیندر پال
چور کی شامت	رام لعل
فرار	ڈاکٹر دت گوپال سنگھ
لوہا پگھلتا ہے	ہربنس دوست
آگ اور پھول	زکی انور
خالو جان کا خواب	علی محمد لون
بابو لوگ	غیاث احمد گدی
محل نگاراں	ابراہیم یوسف
واپسی	نور شاہ
؟	موہن یاور
حسین ساگر کے کنارے	اظہر افسر
اندر کی آواز	حیدر پٹھان
ہمارا راستہ	ظفر احمد
یہ ٹیس یہ کسک	اقبال صدیقی
گھر بچاؤ تحریک	رسول احمد

بین الاقوامی شہرت یافتہ آرٹسٹ

اے - اے - المیلکر

کا بنایا ہوا چار رنگ کا حسین سرورق

ایجنٹوں کو معقول کمیشن — مستقل خریداروں کو مفت

ڈیڑھ سو صفحات سے زیادہ۔ بہترین کتابت و طباعت۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ

سید نقی احمد ارشاد

بابائے اُردو نواب امیر خاں انجام

سالِ ولادت نامعلوم ۔ سالِ رحلت ۱۱۵۹ھ ۔ جائے ولادت ۔ دہلی ۔ جائے مدفن ۔ دہلی ۔ قیام افغانستان ۔ نامعلوم تا ۱۱۲۲ھ ۔ قیام دہلی ۱۱۵۲ھ ۔ ۵۹ ۔ ۱۱۵۶ھ ۔ صوبہ داری الہ آباد ۔ ۵۶ ۔ ۱۱۵۲ھ

اجداد ان کے والد کا نام تاریخوں میں امیر خان میر میراں درج ہے ۔ آپ خلیل اللہ خان یزدی کے صاحبزادے تھے ۔ خلیل اللہ خان یزدی کی شادی حمیدہ بانو سے ہوئی تھی ۔ حمیدہ بانو بیگم، سیف خاں کی صاحبزادی تھیں ۔ یہ سیف خان یمین الدولہ آصف خاں کے نواسے تھے ۔

خلیل اللہ خاں عہد شاہجہاں میں پنج ہزاری تھے ۔ اور میر توزک تھے ۔ اس کے بعد دہلی کے صوبہ دار مقرر ہوئے اور میر خانی کا خطاب پایا ۔ اس کے بعد جموں (کشمیر) کے فوجدار مقرر ہوئے ۔ علی وردی خان عالمگیر شاہی کے انتقال کے بعد امیر خاں کلاں الہ آباد کے صوبے دار مقرر ہوئے ۔ ان کی شادی صاحب جی دختر نواب علی مردان خاں سے ہوئی ۔ علی مردان خاں نے قندھار کی حکومت شاہ عباس ماضی بادشاہ ایران کے زمانہ کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آکر شاہ جہاں کے حوالے کی تھی ۔ چونکہ سرد ملک کے رہنے والے تھے اس لئے انہیں کشمیر کی حکومت بادشاہ دہلی نے عطا کی تھی ۔

جب عہد اورنگ زیب میں افغانوں نے دوبارہ سر اٹھایا ۔ تو امیر خان کو افغانستان کی حکومت عطا کی گئی ۔ امیر خاں نے نہایت دور اندیشی، بردباری اور حاکمانہ جور و استبداد سے افغانستان پر حکومت کی ۔ ان کی بیوی صاحب جی ان کی دست [illegible] تھیں، یہ نہایت دانشمند خاتون تھیں، یہ نہایت عاقلہ تھیں اور معاملات ملکی و مالی میں اپنے شوہر کی برابر شریک رہیں ۔ ایرانی نژاد اور نہایت خوبصورت تھیں ۔

کہتے ہیں کہ بعہد ایام جوانی میں یہ ایک بار "چوڈول" سے کہیں جا رہی تھیں ۔ بیچ راہ میں شاہی فیل بگڑ کے "چوڈول" کا سد راہ ہوگیا ۔ کہار مارے خوف کے چوڈول بیچ کوچے میں چھوڑ کے بھاگے ۔ ساتھ کے تیر اندازوں نے ہاتھی کو تیروں سے مار کے بھگانا چاہا مگر بھاگنے کے بجائے ہاتھی نے چوڈول کو سونڈ سے لپیٹ کے چور چور کر دینا چاہا ۔ صاحب جی پردے میں تھیں جب انہوں نے یہ کیفیت دیکھی تو چوڈول سے اتر کر ایک صراف کی دکان میں چلی گئیں ۔ دکان میں پہونچکر انہوں نے دروازہ بند کر لیا ۔

جب امیر خاں کو یہ معلوم ہوا تو چونکہ یہ امرائے ہند میں تھے نہایت غیرت آئی ۔ کچھ دنوں تک انہوں نے بیوی سے بات نہیں کی ۔ جب شاہجہاں کو یہ معلوم ہوا تو اس نے امیر خاں کو بلوا کے کہا "او کارِ مردانہ کرد ۔ سترِ خود و ناموسِ تو نگاہداشت ۔ اگر فیل بخرطوم پیچیدہ و بجائے می نمود، کدام آبرو می ماند" (اس نے بہادرانہ حرکت کی ۔ اس نے اپنی ستر پوشی کی ۔ اور تمہارے ناموس کی حفاظت کی ۔ اگر ہاتھی اپنی سونڈ میں لپیٹ کے اسے تمام لوگوں کو دکھاتا تو آبرو کہاں رہتی) امیر خان پر بادشاہ کی بات کا بے حد اثر ہوا ۔ اس واقعہ کے بعد جب تک وہ زندہ رہتے ہمیشہ صاحب جی کے با مرید بن کے رہے

امیر خان نے ۲۲ سال تک افغانستان پر حکومت کی۔ اُن کے دورِ حکومت میں وہاں کوئی بدامنی نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ
ھ میں انہوں نے رحلت کی۔ اپنے شوہر کی رحلت کی خبر صاحب جی نے بالقصد اس لئے چھپائی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ افغا
نستان میں کوئی بلوہ کھڑا ہو جائے۔ امیر خان نے کابل میں رحلت کی تھی اور صاحب جی نے اُس کی اطلاع بذریعہ سوانح
اورنگ زیب تک پہنچا دی تھی۔

امیر خان کی موت سے اورنگ زیب نہایت متردد ہوا۔ یہ خبر بادشاہ کو رات کے وقت ملی تھی۔ اُس نے فوراً ارشد خان
طلب کیا۔ جو ایک زمانہ تک کابل میں دیوان رہ چکا تھا۔ اورنگ زیب نے نہایت اضطراب کے عالم میں ارشد خان سے کہا۔

"سخت آمدے دریاد کہ امیر خان درگذشتہ وملکے کہ جہاں نے ہزار شور خرابی فتنہ انگیزی است خالی ماندہ"

رشد خان نے بغیر تامل و پس و پیش کئے ہوئے جواب دیا "امیر خان زندہ است!"
یہ جواب پر اورنگ زیب جیسے بادشاہ کو حیرت ہوئی اور اُس نے سوانح نگار کا وہ پرچہ ارشد خان کے سامنے رکھ
کہا "یہ ہیں"

رشد خان نے جواب دیا "مسلم! لیکن ضبط و ربط واقعی وفتقِ آں ملک وابستہ بہ صاحب جی است!"

رشد خان نے جیسا جواب دیا تھا، اورنگ زیب نے ویسا ہی پایا۔ صاحب جی نے بعد وفات امیر خان فوراً یہ ترکیب کی کہ
امیر خان کی لاش کو دہلی بھیج دیا۔ ایک دوسرے شخص کو جو امیر خان سے مشابہ تھا، پالکی آئینہ دار میں بٹھا کے پھولوں طرف گشت
کروایا۔ خود امیر خان کے فوجی بھی اُسے نہ پہچان سکے۔ اور روزانہ اِس نقلی امیر خان کے آگے مجرا بجا لاتے رہے۔ اِس طرح
قریب دو سال گذر گئے۔ یہاں تک کہ شاہزادہ معظم (شاہ عالم اول) نے صوبہ داری کا عہدہ سنبھال لیا۔

قانونِ مغلیہ میں بعد فوت امیر، اُس کی جاگیر اور مال و متال ضبط کئے جاتے تھے۔ امیر خان کے انتقال کے بعد صاحب
نے دوسری ہوشیاری یہ کی کہ افغانستان کی حکومت سے دست بردار ہونے سے پہلے اُس نے حج بیت اللہ کی بادشاہ سے
اجازت لے لی۔ بادشاہ نے اجازت دے دی۔ حکومت سے دست بردار ہونے کے بعد جا وہ بُرہان پور گئی۔ جس نے کابل
ہی سے امیر خان کے سب لڑکوں کو بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ خود بُرہان پور گئی۔ اور جلد ہی بندر سورت پہنچ کر
معظمہ کو روانہ ہو گئی۔ بادشاہ نے صاحب جی کی طلبی کے لئے اُس وقت آدمی بھیجا جب وہ بندر سورت سے روانہ ہو چکی تھی۔

ایسی دانش مند اور عاقلہ خاتون کے آغوشِ تربیت میں نواب امیر خان انجام کی پرورش ہوئی۔

امیر خان انجام کون تھے؟

صاحب جی کے بطن سے نواب امیر خان میر میراں کے جب کوئی اولاد نہیں
ہوئی تو انہوں نے دہلی میں خدیجہ بیگم زوجہ رُوح اللہ خان ثانی سے عقد ثانی
کیا۔ مرزا ابراہیم مرحمت خان اور مرزا اسحاق امیر خان انجام خدیجہ بیگم کے بطن سے تھے۔

یہاں دو واقعے اور قابلِ ذکر ہیں۔ مآثر الامراء جلد اول ص ۲۸۶ کی عبارت ہے۔ "امیر خان را از صاحب جی فرزند نشد۔
چوں او بر خانِ مزبور سمت غالب بود، در کمالِ اخفا "مدخولہا" نگاہداشتہ اولادِ بسیار بہم رسانید"

"مدخولہ" کے معنی ہیں ٹھیٹ ہندی میں "رکھیلی" یا "داشتہ"۔ واللہ عالم بالصواب۔ اِس میں تو کوئی شک نہیں کہ خدیجہ بیگم
نہایت معزز گھرانے کی خاتون تھیں اور امیر خان میر میراں کی منکوحہ بیوی تھیں۔ خدیجہ بیگم کے بطن سے صرف دو ہی لڑکے
تھے۔ مرزا ابراہیم مرحمت خان اور مرزا اسحاق امیر خان انجام۔ اِن کے علاوہ اور بھی صاحب زادے تھے۔ جن کے نام
تاریخوں میں موجود ہیں۔ یہاں تین چار نام گنا دئے جاتے ہیں۔ پسرِ کلاں۔ امیر خان۔ اورنگ زیب نے انہیں خطاب میر خانی
اور منصب ہزاری مرحمت کیا۔ یہ خطاب سنہ ۱۱۱۱ھ میں کابل سے مراجعت کے بعد ملا۔ اِن کی شادی بہرہ مند خان میر بخشی کی

حویلی امیرخاں" کے نام سے تاریخ اور تذکرہ میں ہر جگہ درج ہے۔

امیرخاں انجام کا بڑھتا ہوا عروج وزیر اعتماد الدولہ قمرالدین خاں کو کھٹکا۔ اُس نے انہیں اُکھاڑ پھینکنا چاہا۔ بادشاہ بجت دیا تھا۔ بہادر شاہ اوّل کے بعد مغلیہ سلطنت میں یہ ایک بڑی خرابی ہوئی کہ زیادہ تر اخیر کے مغل سلاطین ایسے گذرے جنہوں نے جوانی کا بیش قیمت حصّہ لال قلعہ کی جیل میں گذارا تھا۔ اگر اُن کی فوجی تربیت ہوتی تو وہ ہرگز ان منہ زور اُمراء سے نہ دبتے۔ محمد شاہ میں یہ عیب تھا کہ وہ میدان کا سپاہی نہ تھا۔ عقل مند ضرور تھا مگر فوجی قابلیت نہ ہونے سے وہ اُمراء سے دبتا تھا۔

قمرالدین خاں کے دباؤ سے اُس نے نواب امیرخاں انجام کو الہ آباد کا ناظم بنا کے بھیج دیا۔

اِلہ آباد سے تعلق

اِس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ امیرخاں کلاں یعنی انجام کے والد اِلہ آباد کے صُوبہ دار رہ چکے تھے۔ امیرخاں انجام کے لئے اِلہ آباد کوئی نئی جگہ نہ تھی۔ اِن کے حقیقی بھائی مرحمت خاں فیروز جنگ مانڈو (نزد مالوہ) کے فوجدار اور قلعہ دار تھے۔ اُس زمانے میں اُن سے سیّد حسین علی خاں بادشاہ گر سے اَن بَن ہوگئی تھی۔ حسین علی خاں جب دکن سے واپس آ رہے تھے اور نربدہ ندی پار کر کے مانڈو کی سرحد میں داخل ہوئے۔ تو مرحمت خاں حسبِ دستور اُن کے استقبال کو نہ گئے۔ یہاں دو متضاد روایتیں ہیں۔ تاریخ مظفری میں درج ہے۔

"چوں حسین علی خاں بقصدِ دست گیر کردن محمد فرخ سیر از دکن روانہ حضور شد۔ از آب نربدہ عبور شدہ مُتصل قلعہ مانڈو واقع صُوبہ مالوہ (کہ مرحمت خاں خلف امیرخاں کلاں تعلقہ داری و فوجداری آں ضلع مامور بود) رسید مرحمت خاں بنا بر توہم ناسازگاری مزاج حسین علی خاں خود را پیشِ اُو نہ توانست رسانید۔"

اِس کے بعد تحریر ہے۔ "و چنیکہ زمانہ جام موافقت بکام ہردو باد رپیمود، جاگیر مرحمت خاں را ضبط نمود۔"

مآثرالامراء میں تحریر ہے۔ "بنا بر وفور غیرت یا نظر بریں کہ بادشاہ را از خانِ مذکور خوش نمی دانست، بقدر تعارض ملاقات نکرد۔ حسین علی خاں بعد رسیدن بحضور او را معزول ساخت۔"

جب اُن کا محمد شاہ کے عہد میں اچھا وقت آیا تو صُوبہ داری پٹنہ ملی۔ اِن کے ایک صاحب زادے بقاء اللہ خاں تھے، جن کی شادی مرزا محسن برادرِ حقیقی صفدر جنگ کی صاحب زادی سے ہوئی۔ مرزا محسن بعد امیرخاں انجام کئی سال تک اِلہ آباد کے صُوبہ دار رہے۔ مرحمت خاں کے زمانے میں کئی سال تک بقاء اللہ خاں الہ آباد کی صُوبہ داری کی نیابت انجام دیتے رہے۔

سنہ ۱۱۵۲ھ تا غایت سنہ ۱۱۵۶ھ تک نواب امیرخاں انجام اِلہ آباد ہی میں رہے۔ اُن کی جُدائی بادشاہ کو نہایت شاق تھی۔ آخر اُس نے پھر انہیں دہلی بُلوا لیا۔ اور اُنہوں نے دہلی پہونچکر اودھ کے صُوبہ دار صفدر جنگ کو بُلوا لیا۔ اُن کے حقیقی بھتیجے کی شادی صفدر جنگ کی حقیقی بھتیجی سے ہوئی تھی۔ صفدر جنگ فیض آباد سے دہلی آئے۔ اور اس دفعہ دار وغہ توپ خانہ مقرّر کئے گئے۔ اِن دونوں نے اب کے تورانی پارٹی کو اُکھاڑ پھینکا۔ مآثرالامراء کی تحریر ہے۔

"حسبِ العرض اُو صفدر جنگ ناظمِ اودھ (کہ مابین ہر دو اخلاصِ بسیار مُحقق بود) طلبِ حضور شدہ، فردوس آرام گاہ (محمد شاہ) را بہ سرِ علی محمد خاں روہیلہ بُردند۔"

حملۂ نادرشاہ

سنہ ۱۱۵۱ھ میں نادرشاہ کا ہندوستان پر حملہ ہُوا۔ یہ واقعہ نواب امیرخاں انجام کی روانگی الہ آباد سے ایک سال پہلے کا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب صمصام الدولہ خاں دوراں خاں (خواجہ عاصم) کا جنگ کرنال میں تہس نہس ہو گیا۔ اور نادرشاہ لال قلعہ میں داخل ہُوا تو امیرخاں انجام بھی اُس کے دربار میں حاضر تھے۔ اِن کی زبان آوری مشہور تھی۔ بچپن سے شباب تک کابل میں رہے۔ باپ ایرانی النسل جو ۲۲ سال تک افغانستان کا صُوبہ دار رہا۔ سوتیلی ماں صاحب جی ایرانی یعنی نواب علی مرداں خاں کی دختر۔ صاحب جی کی تعلیم نے اور بھی سونے پر سُہاگہ کا کام کیا۔ نادرشاہ اچھی طرح سے نواب شاعر بھی

نواب امیر خاں کلاں سے واقف تھا۔ اُن کی دھاک دہلی سے خراسان تک تھی۔ جب ہی باوجود اختلافِ مذہب اورنگ زیب ایسے جابر بادشاہ نے اُنہیں افغانستان کی صوبہ داری پر برقرار رکھا تھا۔

نادر شاہ نے اُنہیں ذلیل کرنے کے لیے بھرے دربار میں کہا "امیر خاں مرد ولایتی، زنِ او ہندی، بچہ چہ می شود؟" امیر خاں انجام نے اس کا نہایت ہی برجستہ جواب دیا "بلے! نادر می شود!" وہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔ جب بادشاہِ دہلی اور نادر شاہ سے سمدھیانہ ہونے لگا۔ یعنی نادر شاہ کے بھتیجے کی شادی ہونے لگی۔ تو بادشاہِ دہلی کی طرف سے یہ دریافت کیا گیا کہ مغل شاہزادی کا تو حسب و نسب معلوم ہے نادر شاہ اپنا حسب و نسب بتائیں۔ اس کا جواب نادر شاہ نے یہ بھیجا۔ "نادر شاہ ابن شمشیر، ابن شمشیر، ابن شمشیر"۔ امیر خاں انجام نے تو اُس کے سوال کا جواب دے دیا مگر جو سوال اُس سے کیا گیا تھا اُس کا جواب وہ نہ دے سکا۔ وہ خونریزی کا دور بھی اس قسم کے لطائف سے خالی نہ تھا۔ اس کا ذکر سائیکس کی تاریخ فارس میں موجود ہے۔

الغرض نواب امیر خاں انجام صاحبِ حسب و نسب تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہرگز اُن کے حقیقی بھتیجے کی شادی مرزا محسن کی لڑکی سے نہیں ہوتی۔ مرزا محسن کی اہلیہ خاندانِ صفوی کی لڑکی تھی اور مرزا نجف خان کی حقیقی بڑی بہن اس کے علاوہ سیف خاں، امیر خاں انجام کے سوتیلے بھائی نے اپنے خاندان کی برتری کے خیال ہی سے نفیسہ بیگم، مُرشد قلی جعفر خاں کی نواسی سے عقد نہیں کیا۔ مآثر الامرا کی تحریر جیسی کہ قبل پیش کی گئی ہے کوئی وقعت نہیں رکھتی ہے۔ تاریخ غلط ہوسکتی ہے مگر اسبابِ وجوہ غلط نہیں ہوسکتے ہیں۔ قرینہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مآثر الامرا نے اپنے سرپرست نظامِ دکن کا حقِ نمک ادا کیا ہے۔

امیر خاں انجام کی شہادت

امیر خاں انجام اور صفدر جنگ دہلی تو چلے گئے مگر اب یہ وہ دہلی نہ تھی جو حملۂ نادر شاہ کے پہلے تھی۔ بادشاہِ دہلی بھی اب وہ بادشاہ نہ تھا۔ اُمورِ سلطنت میں اُس کی کسبی اُدھم بائی کو دخل تھا۔ اور اُدھم بائی محلی خواجہ سرا جاوید خاں پر عاشق تھی۔ جاوید خاں نواب امیر خاں سے جلتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ایک تو یہ دولت مند تھے۔ اُمرا، فقرا، موسیقار، علما، شعرا، صاحبِ صنعت و حرفت غرض کہ ہر طبقہ میں اُن کی قدر و منزلت تھی۔ بادشاہ خود اُن کا گرویدہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس رشک و حسد کی وجہ سے اُس نے ایک دن نواب کو قتل کرا دیا۔ مآثر الامرا کی تحریر ہے۔

"۱۱۵۹ھ حسب الطلب بہ دربار می رفت۔ چوں بدروازۂ دیوانِ خاص رسید، یکے از نوکرانِ نوازش اُدرا بہ زخمِ جمدھر کُشت"!

اس کا بدلہ صفدر جنگ نے یہ لیا کہ اپنے نشقچی کو حکم دے کر جاوید خاں کو مروا ڈالا۔ اور پھر ہمیشہ کے لئے خاندانِ سالار جنگ کے ساتھ فیض آباد چلے آئے۔ اس ہنگامہ میں جب امیر خاں کی حویلی کا سامان ضبط کیا جا رہا تھا، اُن کا کتب خانہ تباہ و برباد ہوگیا۔ تقریباً دو لاکھ کتابیں ہر فن کی برباد ہوگئیں۔

فنونِ لطیفہ و ادب کی خدمت

فکرِ بلیغ جلد اوّل میں شاد عظیم آبادی نے جا بجا مشاہیر شعرا و صاحبِ فن کے حالات تذکروں اور تاریخوں کے حوالوں سے جمع کر دیئے ہیں۔ افسوس کہ یہ سب حالات "فکرِ بلیغ" جلد اوّل میں نہ شائع ہو سکے۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں کے بعض حالات اصلاح طلب ہیں کیونکہ خود مصنف علیہ الرحمۃ کو نظرِ ثانی کا موقع نہ مل سکا۔ تاہم جو باتیں تحریر ہیں وہ سب غور طلب ہیں۔ نواب امیر خاں انجام کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

"ہندوستان بھر میں جتنی زبانیں رائج ہیں، ان کے علاوہ سنسکرت، بھاکا، کشمیری، پشتو، ترکی، عربی، فارسی اور فرنچ زبان میں پورے فاضل تھے۔ فنِ موسیقی میں اتنے بڑے ماہرِ کامل تھے کہ بڑے بڑے کلاونت نے ان کا نارا[1] ہاتھ

---

[1] نارا ہاتھ پر باندھنا کلاونتوں کی خاص رسم ہے، جس طرح ناچنے والیاں پاؤں میں گھنگھرو باندھ کے دونوں کان پکڑتی ہیں تب ناچنے کو کھڑی ہوتی ہیں۔

سپہ سالار سلطنت تھا جس کو یہ خطاب جانتے تھے "اکالانت مرزا ولی رہتے تھے!"

"ایک مورخ زبانی ایک سیاح کے لکھتا ہے (ملاحظہ ہو سیر المتاخرین) کہ نواب صاحب کے قتل ہونے کے وقت بچہ
جیسے دہلی گئے تھے۔ جس باکمال یا اہل پیشہ کے ہاتھ میں گئے سب کو نواب کا ماتم دار پایا اور اس نے اپنے ہی کمال یا پیشہ سے
متعلق کہا کہ جس کام باکمال میں نواب صاحب کا کوئی جواب نہ تھا اور وہ آنسوؤں سے روتا تھا۔ آپ کے کتب خانے میں دس لاکھ
کتابیں تھیں جن میں صرف ۱۵۰۰۰ ہزار لغات کی تھیں!"

"محمد شاہی دور کو جب ابتدائی کشمکش سے پندرہ سولہ سال امن و امان نصیب رہا تو اس زمانے نے خدائے زبان (میر)
ایسا پیدا کیا جو سات زبانوں کا فاضل و ماہر تھا اس کا دور دور نزدیک کہیں جواب نہ تھا۔
یہ یکتائے زمانہ عمدۃ الملک نواب امیر خاں بہادر تھے یعنی آپ کی سرکار میں پانچ ہزار ہر فن کے ماہر ملازم تھے لیکن تحقیق
باکمال فن ادب و انشاء اور کئی کئی زبانوں کے ماہر و شاعر منتخب روزگار تھے۔ نواب ممدوح موسیقی و فنون لطیفہ کی اصلاح
و اختراع کیا کرتے تھے۔ اس زبان "ملکی" (ہندی) کی اصلاح میں بھی زیادہ کوشاں رہے۔ اس کا ایک دفتر آپ کی سرکار
قائم تھا جس کی نظامت مولوی سید حیدر علی مرحوم کے سپرد تھی۔ اس جلسہ کے اراکین اوّل میں نواب محمد اسحاق خاں بخشی الممالک
نیشاپوری اور ان کے تینوں لائق فرزند تھے۔ شمس الدولہ لطف اللہ خاں صادق اور ان کے فرزند معین الدولہ نواب عنایت
خاں راسخ مصنف کتاب "عنایت نامہ" وغیرہ و مرزا جان جاناں مظہر، شاہ مبارک آبرو، میر ضاحک اور ان کے بیٹے میر حسن
جعفر حسین وغیرہ تھے۔

اکثر محمد شاہ خود سر دربار پوچھتے۔ "کیوں امیر خاں! اس لفظ یا محاورہ کو تم کیوں کر بولتے ہو؟" یہ عرض کرتے "پیر و مرشد
خانہ زاد یوں بولتا ہے" یہاں تک تو صرف تاریخوں کی باتیں کہی گئیں۔ اب کچھ تذکروں کی عبارتیں بھی ملاحظہ ہوں۔ میر غلام حسین
شورش اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

"انجام امیر ابن الامیر، صاحب تدبیر، دانائے وقت، ارسطوئے زماں، نواب امیر خاں بہادر غفر اللہ تعالیٰ مخاطب
بخطاب عمدۃ الملک انجام تخلص، از امرایان عظام دہلی بودہ۔ در فہم و فراست و عقل و کیاست، از دانایان روزگار بود
در لطیفہ گوئی و بذلہ سنجی نظیر خود نہ داشت۔ دو بیت شعر ریختہ کہ از زبان شیریں بیانش تراوش نمودہ ایں است ؎

نہ سن واعظ کی بات ہرگز جو اپنی دشمن کا پکا ہے — خدا حافظ ترا دوزخ بھی اک شرمی ڈر کا ہے"

شیخ محمد وجیہ الدین عشق عظیم آبادی تذکرۂ عشق میں تحریر کرتے ہیں

"نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام تخلص۔ مردے والا تدبیر و خوش تقریر از مشاہیر امراء باختصاص و مقربان خاص الخاص
محمد شاہ بادشاہ غازی و در لطیفہ گوئی و بذلہ سنجی از نظیران عہد خود گوئے سبقت ربودہ و طرز نکتہ اندیشی و بدیہہ رسائی را بہ
نہایت تمام تازہ نمودہ۔ لطائف و ظرائف او مطبوع طباع جمیع و تحفۂ فہمان دانش گزیں و حکایات دلکش او مقبول خاطر سخن سنج
بیتی از ویست از دست ؎

کمک تو فرصت دے کہ دہشت جو چلیں ہم یا ہم — کہ تو اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم"

آپ نے اردو کے دو اشعار ملاحظہ کیے، زبان کس قدر صاف و شستہ اور اشعار معنی خیز ہیں۔ یہ محمد شاہ کے عہد کی اردو ہے
جب ولی دکنی اور شاہ دیوان وہاں دہلی میں وارد ہوئے تھے ۱۱۵۹ھ میں انجام کی حویلی لوٹ لی گئی۔ اور اس میں ان کا کلیات
ضائع ہو گیا۔ صرف تذکروں میں چند اشعار باقی رہ گئے ہیں۔

شاد کی تحریر میں جتنے شعرا کے نام آئے ہیں، ان کے علاوہ میر شیر علی افسوس اور ان کے باپ دادا بھی نواب امیر خاں کے
شاعر تھے

(بقیہ صفحہ ۲۱ پر دیکھیے)

اجد ادیب

علی جواد زیدی کا تغزل و تفکر

جب سے نظم کی آواز بلند ہوئی غزل کا نقطۂ قدر سے کم ہو گیا تھا۔ حالیؔ و آزادؔ کے دور سے متعلقین ادب نے یہ اعلان شروع
[ک] شاعری غزل کے محدود دائرے میں رہ کر اپنے معاشرتی فرائض کو کماحقہٗ انجام نہیں دے سکتی۔ جوشؔ ملیح آبادی نے نظم اور نثر
[د]ونوں ہی میں اس صنف پر قاتلانہ حملے کئے اور کلیم الدین احمد نے تو اسے نیم وحشی صنف تک کہہ ڈالا۔ لیکن اردو ادب کی یہ
[سخ]ت جان صنف اب بھی زندہ ہے۔ بہت سے شستہ نظم گو جیسے علی جواد زیدی اور غلام ربانی تاباںؔ تو اس کے در پر پلٹ کر دوبارہ
[آ]ئے ہیں۔ مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب ترقی پسندی کی رَو میں علی جواد زیدی نے اپنی پچاس ساٹھ غزلوں کا مجموعہ نذرِ آتش کر دیا تھا
[ا]س ذخیرہ میں کیا تھا یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے لیکن اس دَور کے دو تین شعر غالباً اب بھی بعض حافظوں میں محفوظ ہوں گے مثلاً

بے خودی میں ہاتھ کا نپا جام چھلکا مے گری
جانے کن نظروں سے دیکھے گی بھری محفل مجھے

آنکھوں میں اشک بھر کے مجھ سے نظر ملا کے
نیچی نگاہ اٹھی پیتے ہوئے جھکا کے

دیدار کی تمنا کل رات رکھ رہی تھی
خوابوں کی رہ گذر میں شمعیں جلا جلا کے

ان میں پہلا شعر تو کوئی بتیس برس پرانا ہو گا اور باقی دو شعر بھی اسکے آگے پیچھے کہے گئے ہیں۔ اگر غزل گوئی کا یہ سلسلہ جاری رہتا
[تو آ]ج کیا عالم ہوتا۔ اس کا جواب قیاس آرائی کی حدوں میں شامل ہے۔ لیکن کوئی پچیس برس تک غزل گوئی سے الگ رہنے کے
[بعد] انہوں نے یکایک غزل گوئی شروع کی اور پھر دفعتہً ان کی غزلوں کا مجموعہ "میری غزلیں" ہمارے سامنے آیا تو ہم کو حیرت تھی۔
[ا]تنی غزلیں انہوں نے کیسے کہہ لیں۔

ہمارے ذہنوں میں علی جواد زیدی کا تعلق اس گروہ سے ہے جس نے جدید نظم کے بعض اہم رجحانات کی تشکیل و تکمیل میں حصہ
[لے] لیا ہے۔ انہوں نے اچھی خاصی تعداد میں نظمیں کہی ہیں۔ جس کے گواہ ان کے دو مجموعے "رگِ سنگ" اور "دیارِ سحر" ہیں۔ انہوں
[نے] ترقی پسند تنقید میں ایک معتدل اور فن پرستانہ رویّہ اختیار کر کے جدید اردو شاعری کے فنی خد و خال کی تعیین میں بھی ہماری مدد کی
[ہے]۔ اب "میری غزلیں" دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان کے اندر ایک اچھا غزل گو ہمیشہ پوشیدہ رہا ہے۔ جس نے کبھی کبھی ان سے نظموں میں
[بھی] ایسے متغزلانہ شعر کہلوائے ہیں

چبھ گئے تھے جتنے کانٹے زندگی کے پاؤں میں
بیٹھ کر ہم نے نکالے گفتگو کی چھاؤں میں

میرے خیال میں ان کے مزاج، وسعتِ مطالعہ اور دقتِ نظر سب کا تقاضا یہی تھا کہ وہ غزل کو التزام سے برتتے رہتے۔ خیر
[وق]ت پیچھے پاؤں پلٹ نہیں سکتا۔ 'دیر آید درست آید'

زیدی کی غزل کی طرف واپسی ادبِ اردو کے چند خوشگوار واقعات میں سے ہے۔ غزل کی طویل روایتوں کو برتتے ہوئے مضمو[ن]
[خی]الات کو اشعار میں ڈھالنے کے لئے جس مشق، تجربات کے تنوع، مطالعہ اور ممارست درغنتِ فکر کی حاجت ہوتی ہے وہ زیدی
[کے] یہاں موجود ہے۔ شاعروں اور قلموں کی چلتی ہوئی ہلکی پھلکی غزلوں کی بات اور ہے لیکن اس نازک صنف میں تجربات کی وسعت
[کے] ساتھ قدرتِ فن کا صحیح امتزاج صرف استادوں اور شعراء کے یہاں ہی مل سکتا ہے۔ میں نے زمانے کے سرد و گرم کو نہیں دیکھا یا دیکھا

تو اُس پر متفکرانہ نظر نہیں ڈالی جس نے زندگی سے عشق کرنا نہیں سیکھا اور وقت پڑنے پر موت کو لبیک کہنے کا انداز نہ جانا جس نے سماجی ظلم و الم کو اپنایا نہیں اور ذاتی حرماں و مصیبت کو عالمی حوادث کے پس منظر میں پرکھا نہیں وہ اچھا غزل گو نہیں ہو سکتا بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ وہ غزل گوئی کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس لئے اچھا ہی ہوا کہ زیدی غزل کی طرف اس وقت لوٹے۔ جب انہوں نے اپنے دامن میں پھول بھی سمیٹ لئے اور کانٹوں سے وہی دامن اُلجھا بھی لیا۔ جب انہوں نے سیاسی جدوجہد کے سلسلہ میں قید و بند کی صعوبتیں بھی انگیخت کر لیں۔ اور عیش و آرام کی جھلک بھی دیکھ لی جب اُن کے پہلو میں ہجر کے نشتر بھی چبھ چکے اور وہ وصل کی جلوہ باریاں بھی دیکھ چکے۔ ان منزلوں سے گزرنے کے بعد اُن کی غزل میں یہ دیدہ وری اور ہمہ گیری آپائی ہے!

زیدی کا تصورِ غم

غم غزل کا محبوب موضوع ہے۔ پہلے یہ صرف غمِ جاناں تک محدود تھا لیکن رفتہ رفتہ اس میں غمِ دوراں کی وسعت بھی شریک ہونے لگی۔ غم کا مفہوم رونا پیٹنا نہیں ہے بلکہ غزل کی اصطلاح میں محبت سے گہرے لگاؤ کے اظہار اور حصولِ حسن کی جدوجہد کی تمام منزلوں میں گدازِ دل کے ساتھ ہمتِ مردانہ لئے ہوئے آگے بڑھتے رہنا ہی غم ہے۔ لیکن یہ راہ بال سے بھی باریک ہے۔ اگر غم کو بذاتہٖ نصب العین بنا لیا جائے تو پھر شاعری گوہر غریباں اور میت کی شاعری ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر غم جہدِ حیات اور راہِ عشق کی مشکلوں سے نبرد آزما ہونے کا نام ہے اور حصولِ آرزو کی شدت کے مرادف ہے۔ تو اس میں بے جان قنوطیت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ غم مصیبتوں میں بھی مسکرانا اور عیش و مستی میں بھی چشمِ نم کا احترام کرنا سکھاتا ہے۔ درحقیقت گدازِ غم کے بغیر دنیا کے حسن کا احساس صحیح نہیں ہو سکتا۔ بقول زیدی

ذوقِ غم بھی چاہیئے احساسِ لذت کے لئے
دل میں جب چبھنے لگیں کانٹے تو لطفِ دید ہے

غمِ ہستی ذرا ہشیار رہنا
اُڑاتا ہے تمہارے انداز کوئی

رہِ جستجو میں ہمدم جو غمِ دو جواب دیدے
تو ہری طرح سے کرنا غمِ دل سے استفادہ

عیش غم تک، غم نشاطِ جاوداں تک آ گیا
یہ تو اپنی اپنی ہمت جو جہاں تک آ گیا

دور کے کارواں بھی سن لیں گے
غم کے صحراؤں کی صدا ہوں میں

جس کو تاکا اُسے سنوار دیا
غم میں بھی شانِ کبریائی ہے

یہ غم کائنات کے ذرے ذرے سے عشق کے بغیر وجود میں نہیں آتا۔ مختصر لفظوں میں زیدی کا غم آفاقی محبت ہی کا دوسرا نام ہے

بزمِ فکر و ہوش ہو یا محفلِ عیش و نشاط
ہر جگہ سے چند نشتر، چند غم لاتا ہوں میں

ہم اہلِ دل نے معیارِ محبت بھی بدل ڈالے
جو غم ہر فرد کا غم ہے اُسی کو غم سمجھتے ہیں

منتظر ہے راہِ غم میں عشق، دیکھیں تا بکے
ٹھوکریں کھائی بغیر زندگی آتی نہیں

شاہراہِ زندگی میں عشق کا غم کے بغیر
غم تو آ جاتا ہے غم کی زندگی آتی نہیں

ظاہر میں جو غم میرا غم ہے وہ اصل میں ہے آفاق کا غم
دنیا کو سنوار سکے وہ کیا، جو غم سے کنارا کرتے ہیں

اور اس غم میں تخلیقی صلاحیتیں پنہاں ہیں۔ بقول زیدی ع

تخلیق کی جتنی راہیں ہیں گزری ہیں سبھی راہِ غم سے ـــ یا

یہ اور کون ہوگا بجز عشق کعبہ کوش
تیشہ بدست، ساعقہ، دردِ دل، کفن بدوش

بجھا بجھا سا ہے بزمِ حیات کا ماحول
غمِ جہاں نے جلائے نہیں چراغ ہنوز

ایسا بھی نہیں ہے کہ زیدی کا غم وارداتِ عشق کے اظہار سے خالی ہے، لیکن انہیں کے بقول ؎

مثال کے لئے یہ میکدہ، یہ تشنہ لبی
جہاں میں عشق ہی تنہا نہیں بہت غم ہیں

سُنی تھی خود غمِ جاناں سے ایک بات کبھی — غمِ زمانہ سے ممکن نہیں نجات کبھی

لیکن وہ عشق کی وادی میں دُنیا کا غم ساتھ لے کر آئے ہیں ؎

ہمیں سے کی غمِ جاناں نے چھیڑ پہلے پہل — ہمیں تھے گردشِ دوراں کے آزمائے ہوئے

ہے غمِ عشق میں اک لذّتِ جاں دیدہ مگر — اس غمِ دہر سے اے دل کوئی چارا بھی تو ہو

پھر بھی جب زیدی غمِ جاناں کی بات کرتے ہیں تو اُن کے تغزّل کا تیکھا پن نئی شان دکھاتا ہے ؎

لائی ہے خوشبو چُرا کر پھر کسی گل سے نسیم — تھم ذرا اے درد اب میں اور ہی عالم میں ہوں

تجھ سے کیا پردا اشارا طیا دیار — غم کا پیچیدہ سوال آ ہی گیا

تھا کہاں عشق کو سلیقۂ غم — وہ نظر مائلِ کرم تو نہیں

اُن کے دل سے سوال کرنا ہے — یہ تبسّم شریکِ غم تو نہیں

میری نگاہِ غم میں شکوے ہی سب نہیں ہیں — اک بار اِدھر تو دیکھو تم بھی نظر اُٹھا کے

کسی کے جلوۂ معصوم کا عطیہ تھی — وہ پہلی چوٹ کہ مدت کے بعد بھی ہے ہری

بس ایک کیفِ ملاقات سے ذرا کم تھی — وہ لذّتِ غم وہ ہی جو رات بھر پائی

پھر جب زیدی غمِ عشق کی مختلف کیفیتوں کا اظہار کرنے لگتے ہیں تو اُن کی شدّتِ احساس، معاملہ سنجی اور خلوص ان کیفیتوں کو نشتر سے چبھو دیتے ہیں۔ جن کی کھٹک خود ہمارے پہلو میں محسوس ہونے لگتی ہے۔

ذرا دم تو لینے دے اے یادِ ماضی — کہ ٹوٹا ہے آج ایک چھالا تپک کے

اب نہ چھیڑو کہ دل بھر آیا ہے — دل گیا دل لگی کی بات گئی

درد دل میں کمی ہوئی ہے کہیں — تم نے پوچھا تو کہہ دیا کم ہے

خود ہی چھیڑا تھا میں نے سازِ غم — اور خود میری آنکھ بھر آئی

پوچھنے والے شکریہ تیرا — درد تو اب بھی ہے مگر کم ہے

ہائے کس وقت آئی ہے تری یاد — دل سے جب خواہشِ نجات گئی

زخمِ دل بھرنے لگا تھا کہ اُسی زخم کے پاس — اور اک تیر تری بخیہ گری نے مارا

رہِ وفا کی فضا میں نہ جانے کیا دیکھا — کہ وہ بھی آئے تو کچھ اشکبار سے گذرے

نہیں ہے بے سبب ہلچل سی دل میں — کہیں ہے گوش بر آواز کوئی

صورتِ زندگی

زیدی کے تصوّرِ غم سے ہی یہ بات صاف ظاہر ہے کہ وہ غم کو شکست خوردگی سے الگ چیز سمجھتے ہیں۔ اُن کے غم میں فعّال اور تخلیقی عناصر کارفرما ہیں اور اُن کے یہاں غمِ جاناں سے غمِ دوراں تک اُن کے آفاقی تصوّرِ عشق نے ایک تسلسل قائم کر رکھا ہے۔ پھر بھی اُن کا زندگی کا تصوّر ہمہ تن غم نہیں ہے۔

عیش ہی عیش ہے نہ سب غم ہے — زندگی اک حسین سنگم ہے

اک ذرا مسکرا کے بھی دیکھیں — غم تو یہ روز روز کا غم ہے

کہاں ملیگا وہ رقص و رباب و مستی میں — دیا ہے زخمِ جگر نے جو ذوقِ نغمہ گری

زندگی میں ترے جادو بھرے جلووں کے نثار — عقل تیری ہی تمنا میں قریب پہنچی

ہیں وجودِ شئے میں پنہاں ازل و ابد کے رشتے — یہاں کچھ نہیں دو روزہ کوئی شئے نہیں ہے فانی

ذرا میرے [illegible] کی رفتار تو دیکھیں   جو [illegible] زندگی کو قدم دو قدم سمجھتا ہیں
بنتی جاتی ہے بنتی جاتی ہے   زندگی کا عجیب عالم ہے
اے غمِ دہر کے گرفتارو   عیش بھی تو لازمۂ آدم ہے
ابھی کچھ بھی نہیں دل سے خلشِ حیات کا   کیسے کیا ہم ہٹ گئے جشنِ ظفر کے بعد بھی

اسی تصورِ حیات کو ان کی ناقابلِ تسخیر رجائیت نے بڑی انقلابی توانائی بخشی ہے ؎

آج جا پہنچی سیہ طاقوں میں بھی کوئی کرن + روشنی اب تو در و بام تک آ پہنچی ہے
ایک قدم اور بھی اے دل بشکلِ پیشِ رو!   اب تری پرواز سے دور نہیں ماہتاب

زیدی کی رجائیت تقدیر پرستی پر مبنی نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ دنیا جدوجہد سے بدلتی ہے۔ قسمتوں سے نہیں بدلتی۔

تلخ ہستی تضادات سے بدلا   قسمتوں سے تغیرات کہاں

فلسفۂ عمل

زندگی کے صالح تصور اور ذات و کائنات، ماحول اور سماج کے دکھ درد سے پرخلوص وابستگی ایک فلسفہ ہے۔ ظاہر ہے کہ غزل کا پیمانہ فلسفیانہ خیالات کے اظہار کے لئے ایک ناکافی پیمانہ ہے۔ دو مصرعوں میں اور وہ بھی فلسفیانہ مفہوم ادا کر دینا آسان نہیں ہے۔ زیدی نے اسے جنوں، شوق، خرد، زنداں، وارفتگی جیسی [illegible] کے ذریعے ادا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ انہوں نے ان قدیم علامتوں میں بہت سی جدید معنویت [illegible] ان کی یہ کامیابی خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہے۔ اگر زندگی کا [illegible] ضروری ہے، اگر یہ سچ ہے کہ اس وقت استحصالی قوتیں [illegible] کے سوتوں کو خشک کر دینے پر تلی ہوئی ہیں، اگر یہ درست ہے کہ ایسے مرحلوں پر ڈھیلے ڈھالے پن سے کام نہیں چل پاتا بلکہ دو ٹوک [illegible] اور ہمت کے ذہنی افراد کی ضرورت ہے جو مشکلات کو ٹھکرا سکیں تو ان کے لئے جنوں، شوق سے بہتر اصطلاح اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ "جنوں" دیوانگی نہیں ہے بلکہ عقل کی مصلحت اندیشیوں پر جذبۂ حسین کو فوقیت دینے کا دوسرا نام ہے۔

زیدی کا مسلک ترقی پسندانہ ہے۔ وہ کسی یقین پر کر کے کسی چیز کے قائل نہیں ہو جاتے بلکہ ان کے یہاں جستجو کے واسطے منزل تشکیک ہے۔ وہ کسی حقیقت کو اس لئے حقیقت نہیں مانتے کہ دوسرے مانتے ہیں یا لوگ صدیوں سے ایسا ہی کہتے آئے وہ اس پر غور و خوض کرتے ہیں اور پھر وہ یہ اعلان کرتے ہیں کہ اس حقیقت سے کتنے افسانے وابستہ کر دیئے گئے ہیں۔ وہ ان کو حقائق سے الگ کر لیتے ہیں۔ کبھی کبھی تشکیک اور تفکر کے نتیجے میں یقین وہم سے بدل جاتا ہے اور کبھی وہم میں حقیقت کے نقش ابھر آتے ہیں۔

جب کبھی دیکھا ہے اے زیدی نگاہِ غور سے   ہر حقیقت میں ملے ہیں چند افسانے مجھے
ہر حقیقت پرست کو پرکھا   ہیں سبھی مبتلائے افسانہ
تجسس نے کھولے ہیں وہ آنکھ شک کے   کہ ابھرے حقیقت دوبارہ چمک کے
عقل سے کہئے کہ تجدیدِ عقائد پھر کرے   شک سلامت، ہر یقیں حدِ گماں تک آگیا

اور جب عقل تجدیدِ عقائد کرتی ہے تو مزعومات و موہومات کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھرتا ہے۔

بغاوت کی شعاعیں جستجو کے قلب سے پھوٹیں   [illegible] کے نئے رستے اوامر سے نواہی تک

اسی سلسلے میں زیدی کی نگاہیں بار بار وسعت تک جا پہنچتی ہیں اور وہ حوا اور عیسیٰ جیسی عصر آفریں شخصیتوں کی مثالیں دیتے ہیں

تجسس و تجسس کی عظمت انسان نے حوا سے پائی   معصوم بغاوت ہے زیدی پہ درودِ مریم کیا کہیے

عمل کے شدید احساس کو زیدی نے کبھی کبھی جنوں کی علامت سے بھی ظاہر کیا ہے۔ عقل بعض اوقات صرف سود و زیاں کے

میں گھر کر رہ جاتی ہے۔ چونکہ قدامت پرستی، توہم پرستی اور مفاد پرستی کے عنکبوتی جال سے باہر نکلنے کے لئے انسان کو زبردست جد و جہد کرنی پڑتی ہے، بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے اور زندان و دار کی وادیوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ اس لئے مصلحت کے بجائے ولولۂ تیز گام سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر صرف مالی اور ذاتی فائدے کے پیمانے سے ناپا جائے تو شاید برائیوں کا طلسم ٹوٹنے کی ہمت پیدا ہی نہ ہونے پائے لیکن ایسے لمحوں جنون شوق، جنون تعمیر یا جنونِ انقلاب کا جذبہ چند صاحبانِ عمل میں ابھرتا ہے جو کسی مصیبت کی پروا نہیں کرتے۔ اور دیوانہ وار آگے بڑھتے ہیں۔ صحرا صحرا، جنگل جنگل، مارے مارے پھرتے ہیں، سرِ دار مسکراتے ہیں اور زنجیروں کے ساز پر نغمے گاتے ہیں۔ یہ جذبۂ جنوں سہمے ہوئے عوام کو جھنجھوڑ دیتا ہے، کمزور دل کے ساتھیوں کی ڈھارس بندھاتا ہے اور تیز قدمی خوانی کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔

زیدی خرد کا ساتھ نہیں چھوڑتے لیکن اُن کی تلقین یہ ہے کہ ؏

"جنوں سے راہِ خرد میں بھی کام لینا تھا"

وہ مشکلات سے گھبراتے نہیں بلکہ مشکلات میں گھرے رہ کر آگے بڑھتے رہنے کو حقیقی مسرت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ وہ نکلے راستے میں مشکلیں نہ ہوں تو انہیں یہ حیرت ہونے لگتی ہے کہ کہیں وہ کسی اور منزل میں تو نہیں پہنچ گئے۔

نہ ریگِ گرم، نہ کانٹے، نہ راہزن نہ غنیم   یہ راستہ کہیں غیروں کا راستہ تو نہیں

زیدی کو راہِ عمل میں ساتھیوں اور ہمراہیوں کی بھی تلاش نہیں ہوتی۔ وہ بس چل پڑتے ہیں اور مقصد کی عظمت خود ہی لوگوں کو اس راہ میں گھسیٹ لاتی ہے۔ بے عمل حسد بھی کرتے ہیں لیکن کارواں آگے ہی بڑھتا ہے۔

جوق در جوق چلے آتے ہیں چلنے والے   کارواں بڑھتا ہے جلتے رہیں جلنے والے

اور پھر وہ اس کاروانِ عمل میں ہنستے گاتے آگے بڑھتے ہیں۔

جنوں کی راہ میں تدبیرِ سرخوشی کے لئے   بس ایک ولولۂ تیز گام لینا تھا

اردو غزلوں میں "منزل" کی علامت سے بہت کام لیا گیا ہے۔ گزرے زمانے میں سفر کی یہ سہولتیں اور نقل و حمل کے یہ تیز رفتار ذرائع نہیں تھے۔ لوگ کاروانوں میں چلتے تھے اور منزل بہ منزل رکتے جاتے تھے۔ لیکن عشق کی منزل کیا ہے۔ یہ سوال بہت دنوں سے پوچھا جا رہا ہے، دوسری منزل کیلئے لوگ کاروانوں میں چلتے لیکن منزلِ عشق میں تنہا ہی چل کے آگے آنا پڑتا ہے۔ جو ساتھی ہیں وہ اپنے اپنے غم میں مبتلا ہیں۔ اور تنہائی سے معذور ؎

ایسی منزل پر آگیا ہوں میں   آپ ہی اپنا رہنما ہوں میں

شوقِ منزل ہم سفر ہے ذوقِ زیدی راہبر   کس سے اس صحرا میں پوچھوں گا کدھر جاتا ہوں میں؟

لیکن اس شوقِ منزل کی شدت کے باوجود یہ بھی محسوس ہوتا رہتا ہے کہ عشق کی کوئی منزلِ آخر نہیں ہے بلکہ

منزل اسی کا نام ہے اے اہلِ کارواں   ہر راستے کے بعد نیا راستہ ملے

ہر منزل ہے اک راہ نئی، پہنچتے ہی پھر چل پڑنا ہے   رہنا بھی پڑے گر منزل میں تو الجھن ہے آرام کہاں

اسی لئے زیدی جیسے راہرو شام و سحر کی فکر کئے بغیر چلتے رہے ہیں ؎

اس راہِ وفا میں اے ہمدم سایہ بھی نہیں، منزل بھی نہیں   امکان ہو رکنے کا تو کوئی سوچے بھی کہ ہوگی شام کہاں!

اس منزل میں قدم قدم پر الجھنیں ہیں، مشکلیں ہیں، مصیبتیں ہیں، بلکہ زندان و صلیب و دار کا بھی سامنا ہے۔ اس پر وہی چل سکتا ہے جس میں ان مشکلوں کے جھیلنے کا حوصلہ ہو۔ اہلِ ہوس بھی عشق کی راہوں پر چل پڑتے ہیں لیکن آخر کار وہ پچھتاتے ہیں اور راستے ہی میں رک جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو زیدی نے نشانۂ تنقید بنایا ہے ؎

کم ظرف احتیاط کی منزل سے آئے ہیں   ہم زندگی کے جادۂ مشکل سے آئے ہیں

منزل دار ہے یہ آئیے اے اہلِ ہوس   آپ بھی تو ہیں رہِ عشق پہ چلنے والے

ہے بھی جو غمِ دوراں کو چٹکیوں میں اڑا دینے کا دعویٰ کرتے ہیں جب عشق کی منزل پر آتے ہیں تو شش و پنج میں پڑ جاتے ہیں۔ یا انہیں اس وقت للکارتے ہیں ؎

عشق کی منزلِ اوّل ہے یہ کیا سوچتے ہیں   چٹکیوں میں غمِ دوراں کو مسلنے والے

راہِ عشق کے کچھ مسافر ہوس پرست ہیں وہاں ان میں کچھ پُر خلوص نووارد بھی ہیں۔ ایسے لوگوں کو زیدی کا یہ مشورہ ہے کہ مسرت کی تلاش ہو تو جان تک کی بازی لگانی پڑے گی ؎

اے ہمرہانِ منزلِ آوارگانِ عشق   دو گام تا بہ دار چلو تب مزہ ملے

ہاں تری منزلِ مراد دُور بہت ہی دُور ہے۔   پھر بھی ہر ایک موڑ پر دل میں یہ اضطراب کیا؟

تھی پہلے جا چکے ہیں وہ بھی بڑے ستم ظریف تھے۔

گزرے ہیں جس طرف سے کانٹے بچھا دیئے ہیں   منزل کے ساتھیوں نے کی ہے یہ دل لگی کیا؟

زیدی کے چہرے پر شکن کے آثار نمودار نہیں ہوتے بلکہ وہ ہنستے کھیلتے بڑھتے ہیں ؎

آنسو بدل گئے ہیں تبسم میں بارہا   ہم راہِ غم میں ایسی بھی منزل سے آئے ہیں

تو ساتھ ہے تو خوف نہیں اے نگاہِ دوست   مانا کہ راہ سخت ہے منزل بھی دُور ہے

جب سر منزل پہنچتے ہیں تو وہ اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کا ایک ذہنی جائزہ بھی لے لیتے ہیں ؎

سرِ منزل پہنچ کر آج یہ محسوس ہوتا ہے   کہ لاکھوں لغزشیں ہر گام پر ہوتی رہیں مجھ سے

یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ واقعی کن بھیانک راہوں سے گزرنا پڑا ہے ؎

بے مہری و زنجیر و صلیب و رسن و دار!   کن منزلوں سے گزرے ہیں بے خوف و خطر ہم

قربِ دوست

زیدی کے ہاں فکری عناصر، غزل کو ایک خاص آب و رنگ دیتے ہیں لیکن ان کے یہاں محبت کے لطیف ترلمحات کی عکاسیاں بھی قدم قدم پر ملتی ہیں۔ ان کا عشق صرف ہجر کی داستان نہیں بلکہ وہ ہجر سے زیادہ قربِ دوست کے احساسات سے آشنا معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ان کی ایک مسلسل غزل ہے جس کی ردیف ہے "آج کی رات"

شام سے کچھ تو ہے الجھن میں کمی آج کی رات   راستا بھول کے آتا ہے کوئی آج کی رات

تیز ہے شمع کی لَو بجتے ہیں خود ساز کے تار   بزم میں ایسی بھی کیا بات ہوئی آج کی رات

میری پلکوں پہ وہ ننھے ننھے ستاروں کی قطار   اُن کے آنے کی قیامت ہے خوشی آج کی رات

مطرب و شمع و نظر، شیشہ و پیمانہ و مے   مقدمِ دوست میں جاگیں گے سبھی آج کی رات

نغمہ در نغمہ مرے ہونٹوں پہ رکتی ہوئی آہ   جلوہ در جلوہ نئی کم نگہی آج کی رات

میری آنکھیں متبسم، مرے جلوے سنگیت   اُسنے شاید کوئی اک بات بھی کی، آج کی رات

فرش پر بکھری ہوئی پنکھڑیوں کی سوگند   گُل نے دیکھی نئی گُل پیرہنی آج کی رات

اُن کا محبوب وفا آشنا ہے اور دکھ میں شکھ کا مرکز ہے ؎

... نے پیار کرے دل پھر بھلا ...   بہت ہی خوبصورت ہے اس جسم پر یہ پیراہن

وہ آندھیوں میں گھری غم کی زندگی اپنی　　وہ خوشبوؤں میں بسی تیری رہگزر کی پون
اللہ رے اس اُچٹتے ہوئے تیر کا مزا　　اے اوّلیں نگاہ مجھے پھر سزا ملے
یہی نگاہ کہ جس نے چبھوئے ہیں نشتر　　اسی نگاہ کو پھر ہوگی فکرِ بخیہ گری
کشمکش میں پھنس گئی ہے وہ نگاہِ شوخ و شنگ　　اس بھری محفل میں اب نظریں جھکا لیتے ہیں ہم

اگرچہ خلوص و عشق کی گرمی اب نگاہِ خاص کی منزل تک آ گئی ہے لیکن کم نگاہی کی لذت اب بھی زیدی کو یاد ہے۔

نگاہِ خاص بھی اِک دولت گرامی ہے لیکن　　خلش میں اور ہی لذت تھی اُن کی کم نگاہی تک

اور یہ اداشناسی بھی قابلِ ذکر ہے کہ

ہر چند اہلِ بزم پہ زلفوں کے سائے ہیں　　احساسِ قرب دوست سے رُخ تمتمائے ہیں

اور پھر یہ اقرار

اللہ ری احتیاطِ نظر کی لگاوٹیں!　　کیا ہم نے چوٹیں کھائی ہیں کیا تلملائے ہیں
اُس نے نظریں پھیر تو لیں بزم میں　　پھر بھی ماتھے پہ پسینا آ گیا

مختصر یہ ہے کہ زیدی کی غزلوں میں ایک نیا آہنگ ہے' نئی آواز ہے۔ اُن غزلوں میں فکر بھی ہے' جذبہ بھی' حسن بھی ہے ذوقِ عمل بھی۔ یہ آواز روایاتِ ادب سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے دوسرے ساتھیوں کی آواز سے مختلف مگر پُرکیف اور پُراثر ہے۔ اُمید ہے کہ زیدی ہمیں بہت کچھ اور بھی دیں گے۔ اُن کی غزلوں سے واقعتاً بڑی توقعات ہیں۔

بقیہ بابائے اُردو نواب امیر خاں انجام صفحہ ۱۴

کے متوسلین دربار میں سے تھے۔ میر تقی میر مرحوم نے بھی اپنی جوانی حویلی امیر خاں کی ڈیوڑھی کے ایک گوشے میں کاٹی تھی۔
انجام کا فارسی کا ایک شعر آخر الامرا کے حوالے سے نقل کیا جاتا ہے ؎

من از جمعیتِ اسودگانِ خاک دانستم　　کہ غیر از خشت بہر خواب راحت نیست بالینے

موسیقی میں ان کی خاص ایجاد سوز خوانی ہے۔ جس کا اب تک عام رواج ہے۔ نواب امیر خان انجام کے بعد اُن کی حویلی کو اُن کے بھانجے کرم اللہ خاں دردؔ نے آباد کیا تھا۔ ان کے متعلق شورش کی عبارت ہے۔
"دردؔ کرم اللہ خاں دردؔ تخلص ہمشیر زادہ نواب عمدۃ الملک امیر خاں بہادر است۔ فکر عالی دارد۔ از دست ؎

مرے سینے میں ہر اک سانس ہو کر پھانس کھٹکے ہے　　خلش دِل کی نکل جاوے تو کچھ آرام ہو جاوے۔
سامنے ہوتے ہی پھر لاشِ ذیائی دل کی　　!!　　بٹ گیا نوکِ سناں پر صفِ مژگان کے بیچ

تذکرۂ عشقی کی عبارت ہے۔
"دردؔ تخلص۔ اسم کرم اللہ خاں' ہمشیر زادۂ نواب عمدۃ الملک' مردے کریم الطبع' کرم پیشہ' از امرائے ذیشان عصر محمد شاہ خلد بارگاہ بود کلامش از چاشنیِ درد خالی نیست۔ می گویند کہ در ہنگامہ مرہٹہ بر شاہجہاں آباد شہید گردید۔ از وست ؎

تحمل آتشِ غم میں دلِ بے تاب کیا جانے　　ٹھہرنا ایک دم بھی آگ پر سیماب کیا جانے"

"ہنگامہ مرہٹہ" سے مُراد غالباً سکندر آباد پر مرہٹوں کے تسلط سے ہے۔ جب وزیر عماد الملک نے سکندر آباد کو ہلکر کے حوالے کر دیا تھا۔ اور احمد شاہ ابن محمد شاہ وہاں سے سراسیمہ دہلی کو بھاگا تھا۔
بعد کو حویلی امیر خاں انجام نواب سید اکبر علی خاں کرم الدولہ کے قبضے میں عہدِ شاہ عالم ثانی میں آئی اور اُس کے بعد تاریخ و تذکرہ کے اوراق سے غائب ہو گئی۔

مفتوں کوٹوی

بڑھاپا اور ثابت لکھنوی مرحوم

"نیرنگِ خزانِ زندگانی دیکھو"

ہمارے اُردو شعرا نے جوانی کی ہنگامہ آفرینیوں اور قیامت خیزیوں کا ذکر آندھی اور طوفان کی زبان میں کیا ہے ؎

نام ہے کیا اسی ہنگامہ کا آغازِ شباب؟ — ایک آندھی سی چلی آتی ہے ارمانوں کی (نہال سیوہاروی)
اُس بُت کی ابتدائے جوانی مُراد ہے — موتن کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں (موتن)
مُعطّر سانس، چہرہ رشکِ گُل، مستی بھری آنکھیں — جوانی ہے کہ اِک سیلابِ رنگ و بُو کا دھارا ہے (احسان دانش)
مستیوں کا رنگ ہے جوشِ شباب میں — گویا کہ وہ نہائے ہوئے ہیں شراب میں (مرزا انور)
قدم ڈگمگائے، نظر بہکی بہکی — جوانی کا عالم ہے سرشاریاں ہیں (جگر)
گھٹا، سبزہ، ستارے، پھول سب اپنی جگہ برحق — تری کافر جوانی پھر تری کافر جوانی ہے (ماہر القادری)
اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی — اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی (داغ)
کم بخت جوانی سینے میں ناگن کی طرح لہراتی ہے — ہر موجِ نفس اِک طوفاں ہے کونین شکن ارمانوں کا
(جوش ملیح آبادی)

اِن تمام بدمستیوں، سرشاریوں اور فتنہ آرائیوں کے باوجود انجام کار سے آنکھیں بند نہیں کر لی گئیں۔ انجام شباب اور مآلِ جوانی پیشِ نظر رہا ہے ؎

کل ہم آئینے میں رُخ کی جھرّیاں دیکھا کئے — کاروانِ عمر رفتہ کا نشاں دیکھا کئے (صفی لکھنوی)
یہ جھرّیاں نہیں ہاتھوں میں ضعفِ پیری سے — چُنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو (انیس)

موقع مناسب ہے، یہیں جناب ثابت کا ایک شعر بھی ملاحظہ کیجئے ؎

ضروری ہے بڑھاپے میں ضعیف و ناتواں ہونا — یہ پیری کی موجیں ہیں بدن پر جھرّیاں ہونا۔

عہدِ جوانی کے اختتام اور موسم رنگیں کے انجام کا یہ منظر کتنا عبرت ناک ہے! ؎

ہائے جوانی کیا کیا کہئے، شور سروں میں رکھتے تھے — اب کیا ہے وہ عہد گیا، وہ موسم وہ ہنگام گیا (میر)
مئے رنگیں تھا سادہ پانی بھی — ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی (جوش)
دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا؟ — جو کوئی دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا (میر)
شاد نہ وہ دیدار پرستی اور نہ وہ بے نشہ کی مستی — تجھ کو کہاں سے ڈھونڈھ کے لائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے
(شاد)

اب ہے دل باقی نہ دل کی شورشیں — آہ وہ ہنگامۂ عہدِ شباب! (حسرت موہانی)
کہنے لگتے ہیں جوانی کی کہانی جو کبھی — پہلے ہم دیر تک بیٹھ کے رو لیتے ہیں (شاد عظیم آبادی)

شاعرانہ بصیرت۔ مآل و انجام میں کس قدر ہا حاصل لئے ہوئے ہے ؎

وقت پیری شباب کی باتیں　　ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں　　(ذوقؔ)

دیکھئے اِس شعر میں کیا کیفیات چھپی ہوئی ہیں ؎

ضعفِ پیری جو بڑھا موت کے پیغام چلے　　آگیا وقتِ سفر، صبح چلے شام چلے　　(ریاضؔ)

شباب کی دل کشیوں، دل نوازیوں اور دار فتگیوں میں نہ کھو جانا، بڑھاپے کی یاد اِس ہنگامہ خیز زمانہ میں برقرار رکھنا، یقیناً اُردو شاعروں کی انجام بینی اور عافیت اندیشی کی عمدہ ترین مثال ہے، ایسا کیوں ہے یہ مذہبی گرفتوں کا بھی نتیجہ ہوسکتا ہے۔ اِس میں ہمارے دیش کے رشیوں، منیوں، اور فقیروں کی تعلیمات کی کارفرمائی بھی ممکن ہے۔ آخرت کا تصور اُردو شعراء میں چاہے وہ کسی مذہب سے متعلق ہوں، کسی نہ کسی صورت میں ذہن نشین ہے، اِس تصور کے سایہ میں مآل اندیشیوں کا پرورش پانا بھی متوقع ہے۔ اِس سلسلہ میں اپنے ملک کے تاریخی انقلابات، فضا، ماحول کے اثرات اور ذہنوں میں رچی بسی روایات کی اثراندازی بھی دخیل ہوسکتی ہے۔ بہرحال جوانی دیوانی کی بے راہ رویوں سے ہمیشہ چونکایا جاتا رہا۔ بڑھاپے کی طرف سے نہ غفلت برتی گئی۔ نہ برتے جانے کا موقع دیا گیا۔ بے ثباتیِ دنیا کی تعلیم و تلقین سے اُردو ادب بھرا پڑا ہے۔ "ہر چند کہیں کہ ہے۔ نہیں ہے۔" قسم کے عقائد ہر شاعر کے یہاں دستیاب ہوسکتے ہیں ؎

ہستی اپنی حباب کی سی ہے　　یہ نمائش سراب کی سی ہے　　(میرؔ)

پائی ہے باغِ جہاں میں ہم نے گُل کی زندگی!　　رنگ بن کے آئے ہیں، بُو بن کے اُڑ جائیں گے ہم (آنند دلکھنوی)

جناب ثابتؔ لکھنوی بھی اسی کاروانِ ادب کے عافیت بیں ممتاز شعراء میں سے ہیں۔ انہیں عقبیٰ کا تصور اور اللہ کی یاد کا دھیان ہمیشہ رہا ہے، وہ بھی عالمِ شباب میں پیری و ضعیفی کو نہیں بھولے ہیں۔ بے ثباتیِ دُنیا سے بے رُخی نہیں برت سکے ہیں چنانچہ جب بڑھاپے اور ضعیفی نے انہیں گھیر لیا۔ تو وہ قطعاً ہراساں نہیں ہوئے بلکہ مضمون آفرینیوں اور سخن پروریوں کے ساتھ کبھی بڑھاپے کی افادیت زیرِ بحث لاتے ہیں۔ اور کبھی اس کے نتائج و اثرات کا ذکر شاعرانہ انداز میں کرتے ہیں ؎

گذری جوانی اور جوانی کے ولولے　　اِک چاند تھا کہ ڈوب گیا چاندنی کے ساتھ
ہر خوشی کا باغِ عالم میں تباہی ہے مآل　　کھلکھلا کر جب ہنسیں کلیاں پریشاں ہوگئیں
پیاسا ہیں شباب نے پھر خود بھی چل دیا　　رہتا نہیں ہے کوئی ہمیشہ کسی کے ساتھ

جوانی کی رخصت اور بڑھاپے کی آمد ہی پر یہ سکونِ دماغی اور اطمینان قلبی نہیں ہے بلکہ نزع و موت کے مراحل میں بھی وقار و متانت ہے۔ یہی عاقبت بینی اور مآل اندیشی موجود ہے۔ کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ قضائی امور، وقوع پذیر ہو کے رہیں گے۔ گھبراہٹ اور پریشانی سے حاصل بھی کیا ہے؟ یہ مرحوم کی بالغ نظری اور وسیع الظرفی کی دلیل ہے۔ ذیل کی رُباعی دیکھئے ؎

احباب کے جلسوں کا جو شیدائی ہے　　کچھ یاد تجھے قبر کی تنہائی ہے
ثابتؔ یہ موت کا تعجب کیسا؟　　مرنا، جینے کی علتِ غائی ہے

کچھ اشعار بھی قابلِ ملاحظہ ہیں ؎

لازمی باتوں میں ثابتؔ انتشارِ وہم کیوں　　موت آنے کے لئے ہے جان جانے کے لئے
نقارہ بج رہا ہے کہ ہے رُوح کا سفر　　یٰسین کا ہے شورِ دمِ واپسیں بلند
بے کسی میں کاتبِ اعمال بھی رخصت ہوئے　　رہ گئے اعمال اپنے ساتھ جانے کے لئے

اِن رُباعیوں میں بھی یہی مضمون بیان کیا گیا ہے، لہجہ کا ٹھہراؤ، مزاج کی سنجیدگی اور طبیعت کی طمانیت قابلِ غور ہے۔

پیری میں جوانی کا پلٹنا معلوم   پھیلی ہوئی دھوپ کا سمٹنا معلوم
دیتے ہیں عبث نزع میں شربت احباب   تلخیٔ اجل کا اِس سے گھٹنا معلوم

کب نزع میں زیست کے مزے ملتے ہیں   کملائے ہوئے پھول کہیں کھلتے ہیں
ہے کوچ، نہ دم حلق میں کیوں کر اُلجھے   نفس اور نفس بہم گلے ملتے ہیں

جب نزع میں موت کا ستارا چمکا   شبدیزِ نفس بھر کے طرارہ چمکا
آنسو بہہ کر جما نہیں یہ رُخ پر   صُبحِ شبِ زندگی کا تارا چمکا

نزع کے بعد قبر کا آرام مُلاحظہ طلب ہے ؎

خدا کا شکر ہے طے ہوگئی یہ زیست کی منزل   تھکا ماندہ تھا رستہ کا، مِلا آرام منزل میں

اِنسان جب انجام کی دُشواریوں کے لئے مُستعد ہوجائے۔ زندگی جب موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلے کی جُرأت کرلے اُس وقت یہ وِقار و سُکون میسّر آتا ہے۔ وِداعِ شباب و آمدِ پیری ایسے اِنسان کو کیا ہراساں کرسکتی ہے؟ چُنانچہ تلقین و تبلیغ کا یہ انداز، مرحوم کی مآل اندیشیوں اور حوصلہ مندیوں کی ترجمانی کرے گا ؎

ڈھلا پہر ہے، چونک تغافل کے خواب سے   پہرا بدل رہا ہے بڑھاپا شباب سے
کہتی ہے ضعیفی کہ جُھکا دوں گی میں گردن   مغرور ہے کیوں خلق سے جُھک کر نہیں ملتا

اب خود مرحوم کی بڑھاپے کی تیاری مُلاحظہ کیجئے۔ نہ کچھ خوف نہ کچھ پریشانی، بلکہ "چہل سال عمرِ عزیزت گذشت" کے مِصداق اپنے آپ کو تازیانۂ عبرت مارا جارہا ہے ؎

تری پچاس سے اوپر ہے عُمر اے ثابت   مگر تو اپنے گناہوں سے شرمسار نہیں

ایک منظر اور۔ اب پچاس سے آگے بڑھ کر ساٹھ برس کی عُمر ہوچکی ہے ؎

زوروں پہ ہے ضعفِ ناتوانی دیکھو   نیرنگِ خزانِ زندگانی دیکھو!
اب عُمر ہوئی ساٹھ برس کی ثابت   آنکھوں سے بڑھاپے کی جوانی دیکھو

لفظوں کی رعایت اور صنائع بدائع کی موجودگی آپ کے مدِّ نظر رہنی چاہئیں۔ اظہارِ خیالات میں اگر زبان و بیان کی خُوبیاں بھی برقرار رہیں تو قادر الکلامی میں شک کی کیا گنجائش باقی رہتی ہے؟ ادیب اور غیر ادیب، شاعر و غیر شاعر میں یہی چیز مابہ الامتیاز ہے۔ جس طرح ثابت مرحوم موت کے لئے تیار تھے جیسا کہ اوپر ذکر ہوچکا ہے۔ موت آنے کے لئے ہے، جان جانے کے لئے۔ اِسی طرح وہ جوانی کے جانے اور بڑھاپے کے آنے سے بھی واقف تھے۔ اور اِس آنے جانے کی باخبری نے انہیں بڑا اطمینانِ دل و دماغ دے رکھا تھا ؎

ضعفِ پیری نہیں دینے کا اماں، آپ سے آپ   جائے گا سُوئے نشیب آبِ رواں آپ سے آپ

جوانی ختم ہوگئی۔ بڑھاپا آگیا! اور اُس میں کتنا عرصہ لگا، یہ پہلے میر انیس سے سُنئے ؎

نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک   ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

اب ثابت مرحوم کو سُنئیے، یہی قافیہ، یہی ردیف، یہ شعر تھا، اُن کا مطلع ہے ؎

اِک آہِ سرد بھری ہم نے اور شباب نہ تھا   ہوا سے موج نے کروٹ جو لی حباب نہ تھا

آہِ سرد کو ہوا سے جو نسبت ہے اُس کے لحاظ سے شباب کو حباب بنا کر پیش کرنا کتنا مُؤثّر و مفید پیرایۂ بیان ہے، مصرعۂ ثانی کی حقیقت نے مصرعۂ اولیٰ کے دعوے کو بلا شک و شُبہ ثابت کردیا ہے۔

پیری کیا ہے؟ شباب کیا ہے؟ اس رُباعی میں بتایا گیا ہے ؎

پیری کے سبب ضعیف ہیں بے توقیر — منحوس یہ زندگی کے ہفتہ کی ہے پیر
کہتے ہیں شباب کو سخنور سب خواب — اس خواب پریشاں کی ہے پیری تعبیر

اندازِ بیان شاعرانہ و ادیبانہ ہے اور یہی ایک مکمل ادیب کی پہچان ہے کہ اظہار و ابلاغ میں ادبی رکھ رکھاؤ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ "توقیر" اپنے وقار و قوت میں کتنا وسیع المعنی ہے۔ اِس کا یہاں استعمال، پیری و ضعف میں بڑا زور پیدا کر گیا ہے۔ پیری کے سبب ضعیف ہیں بے توقیر۔ مصرعہ ثانی میں لفظ "پیر" کا استعمال کیا کچھ نشان دہی کرتا ہے۔ زمانہ شناس تطریں اس سے محفوظ۔ پیری کا ماحول اِن دونوں مصرعوں سے مرتب کرکے اور شباب کو خوابِ پریشاں جتا کر پیری کو اُس کی تعبیر بتانا اس رُباعی کو بڑا دلکش اور پُر اثر بنا گیا ہے۔ یہی معنی آفرینیاں اربابِ فہم کے لئے استادی و برتری کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں۔ یہ شعر بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے ؎

زمانہ کی ترقی و تنزّل کا یہ خاکہ ہے — جوانی میں تمہارے وقت پیری جھریاں ہونا

پیری اب آہی گئی تو شبابِ رفتہ کی یاد سے فائدہ بھی کیا؟ بہتر یہی ہے کہ اسے قطعاً بھلا دیا جائے ؎

روزِ عشرت کی وہ دوپہر یاد نہیں — ہے ذہن میں مُبتدا، خبر یاد نہیں
پیری میں ہے یہ شبابِ رفتہ کا خیال — بشیر میں تھا بہت خواب مگر یاد نہیں

روزِ عشرت اور دوپہرِ شباب، یقیناً شباب اِس روزِ عشرت کی دوپہر ہے۔ ذہن میں خبر کے یاد نہ رہنے سے پیری کا ماحول مُرتب ہو گیا ہے۔ رُباعی کا چوتھا مصرع اسی شرط کی پابندی اور اسی خوبی کی ترجمانی کر رہا ہے۔ کہ شروع کے تینوں مصرعوں کا اُسے خلاصہ ہونا چاہئے۔ اور مضمون کے عُروج و ارتقاء کا مکمل حامل بھی۔ ثابت مرحوم، خاندانِ دبیر سے وابستگی رکھتے تھے اور دبستانِ دبیر معنی آفرینیوں کے لئے دُنیائے ادب میں اپنا خصوصی مقام رکھتا ہے۔ ثابت بھی اپنے خاندانِ شاعری کی جابجا نبھاتے ہیں۔

پیری کی ابتدا مُوئے سیاہ کی سفیدی سے ہونے لگتی ہے۔ مُوئے سفید تارِ کفن کی یاد دہانی کرتے ہیں، اب "صبح چلے، شام کا مرحلہ درپیش ہے۔" عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے" کا مقام حاصل ہے۔ شبِ زندگی ختم ہو رہی ہے، بال سفید نہیں ہوئے صبح کی کرن پھوٹی ہے۔ "غافل ہشیار ہو کرن پھوٹ چکی" (اسیر مرحوم)، اور یہ صبح ایسی صبح ہے جو کبھی ختم نہ ہو گی!

"یہ وہ ہے سحر جس کی کوئی شام نہیں" (تسخیر مرحوم)

ایک رُباعی مرزا دبیر مرحوم کی اِس ضمن میں ملاحظہ کیجئے ؎

اب نامِ خدا زبان پر جاری کر — غافل دمِ آخری تو ہشیاری کر
بالوں کی سیاہی پہ سفیدی آئی — لے صبح ہوئی، کوچ کی تیاری کر

بالوں کی سفیدی، رہ زیست کے غافل مسافر کو، کوچ کی تیاری کے لئے چونکاتی ہے۔ زادِ سفر لے کر مرگ و لحد و برزخ و وحشت آمادگی کے پر اکساتی ہے۔ ہمارے شعرا نے اِس سلسلہ میں بڑی مضمون آفرینیوں سے کام لیا ہے۔ مرزا دبیر کا صرف ایک بند درج کیا جاتا ہے۔ جو اِس سلسلہ میں مکمل درسِ عبرت ہے ؎

بالوں کی سفیدی سے سر مُو نہیں رنجور — دھوپ آگئی سایہ پہ تو سوتا ہے بدستور
ہشیار کہ نزدیک رہا اب سفرِ دُور — ہاں ڈھونڈ کفن، مشکِ جوانی ہوا کافور
اے ملکِ عدم کے سفری! زادِ سفر لے — مرگ و لحد و برزخ و محشر کی خبر لے

آخر مصرع میں الفاظ جس ترتیب سے دئیے ہیں' اِنسان اُنہیں منزلوں سے گزرتا بھی ہے' یہ مرزا دبیر کا کمالِ شعری ہے۔ ثابت مرحوم اِن کے صاحب زادہ مرزا اوج سے مستفید ہوئے ہیں۔ یہی صفاتِ فنی اور نکاتِ ادبی اُن کے یہاں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اُن کے اِن کمالات پر روشنی ڈالنا اِس مضمون کا موضوع تو نہیں لیکن ضمنی طور پر اگر اِس طرف بھی نظر پڑتی رہے تو مرحوم کی ادبی خوبیاں مزید اضافۂ احتظاظ کا باعث ہوں گی۔ ثابت مرحوم کی حقیقت شناسی اور واقعہ پرستی موہائے سفید کو خضاب سے رنگین کرنے پر ذرا بھی آمادہ نہیں۔ اِن کے نزدیک یہ اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ بڑھاپے کو ذلیل و رُسوا کرنا ہے ؎

خضاب میں جو بہارِ شباب دیکھتے ہیں   شباب دیکھتے ہیں یا وہ خواب دیکھتے ہیں
پیری مقابلہ کو چلی تھی شباب سے   رُسوا و رُوسیہ ہوئی آخر خضاب سے

خضاب سے متعلق ثابت مرحوم کی اور رُباعیاں پیش کر رہا ہوں' رنگِ خضاب سے بیزاری اور رنگِ بیان کی خوشگوئی اِن میں آپ کو ملے گی ؎

دِل توڑ لگتا ہوں کی گِراں باری نے   نیرنگ دِکھلائے چرخِ زنگاری نے
پوشیدہ نہیں سیاہ بالوں میں سفید   نیکی کو چھپایا ہے سیہ کاری نے

اچھا نہیں انجام ستمگاری کا   اندازہ نہ سیکھ چرخِ زنگاری کا
اچھا نہیں بار بار بالوں میں خضاب   جم جائے نہ پھر رنگ سیہ کاری کا

بڑھاپا اب چھا گیا ہے۔ شبابِ رفتہ کا خواب دیکھا تھا مگر یاد نہیں رہا۔ بھُلا دیا گیا ہے' بڑھاپے کا دورِ جوانی اپنی آنکھ سے دیکھنے کے لیے مستعد رہنا ہی بہتر ہے' ماحول سے ساز گاری ہی قلب میں طمانیت و متانت پیدا کرتی ہے ؎

نہ لڑکپن نہ جوانی نے دیا ساتھ اپنا   ہاں بُرے وقت کا دم ساز' بڑھاپا دیکھا

کچھ رُباعیاں مُلاحظہ کیجئے۔ جن سے پیری و موت کے متعلق مرحوم کے احساسات کا اندازہ ہو سکے گا ؎

ہر شئے دُنیا کی ایک دِن فانی ہے   حیران ہوں کیوں دل کو پریشانی ہے؟
ہے قیدِ حیات نام اِس ہستی کا   زندہ جو شخص وہ زندانی ہے

آزاد ہُوئے تو شادکامی نہ رہی   گھبرا فِکروں نے جب غلامی نہ رہی
کامِل جو لبشر ہُوا' اجل آ پہنچی   بوسیدہ ثمر ہُوا جو خامی نہ رہی

مرحوم پیرانہ سالی کی کافی منزلیں طے کر کے ہم سے رُخصت ہُوئے ہیں۔ زمانے کے نشیب و فراز سے بہ خوبی واقف تھے۔ ایسے بوڑھے' اِنسان کی زبان ہی سے یہ تعلیمات اپنے اثرات میں بے پناہ ہو جاتی ہیں ؎

اِنساں سے زمین کا تخمِ بخا ہے   ہُشیار کہ دُور کا سفر کرنا ہے
ہوتا نہیں کیوں غیر کی میت میں شریک   آخر تجھ کو بھی ایک دِن مرنا ہے

جو کہہ گئے' راہبر' وہی ہونا ہے   بیکار ہے جھینکنا' عبث رونا ہے
کوٹھے پہ کُھلی ہوا میں سونے والے   اِک دِن تجھے بند قبر میں سونا ہے

سرکش! یہ غرور و غیظ سب بیجا ہے   تو آگ نہ بن کہ خاک کا پُتلا ہے
مِلنا ہے اسی خاک میں اِک دن تجھ کو   آخر کو بڑے بول کا سر نیچا ہے

مندرجۂ ذیل رُباعی میں کیا کچھ پنہاں ہے' کیا کہا گیا ہے' کیوں کر کہا گیا ہے' قابلِ غور ہے ؎

پیری میں کہاں شان تہوّر کی ہے   کچھ دن میں تمام عُمر کی تُر کی ہے
رعشہ نہ سمجھ' موت کا ڈر غالب ہے   آمدِ مَلک الموت بہت دَر کی ہے

میر کا ایک شعر ہے ؎

عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں مُوند — یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا،

ثابت مرحوم کا یہ شعر اسی مضمون میں قابلِ ملاحظہ ہے ؎

پیری میں غفلتوں نے کیا اور بھی خراب — پھر نیند آگئی ہمیں جاگے جو خواب سے

جوانی جاکر نہیں آتی۔ بڑھاپا آکر نہیں جاتا۔ آپ نے اوپر طفلی و شباب کی بے وفائی اور بڑھاپے کی دمسازی ملاحظہ کرلی۔ اس رُباعی میں بڑھاپے کی اسی قسم کی افادیت ملاحظہ کیجئے ؎

طفلی جو گئی دل ہُوا تھوڑا میرا — پھر قلب شباب نے بھی توڑا میرا
ممنون بڑھاپے کا ہُوں میں ثابت — مرتے مرتے نہ ساتھ چھوڑا میرا

پیری کے فوائد میں میر ضمیر کی رُباعی اُستادانہ فن کی حامل ہے ؎

پہلے تو یہ شہرہ تھا ضمیر آیا ہے — اب کہتے ہیں اُستادِ دبیر آیا ہے
کر دی مری پیری نے مگر قدر سوا — اب قول یہی ہے سب کا پیر آیا ہے

"سب کا پیر" بنا دینے میں پیری نے بڑا ساتھ دیا ہے۔ ثابت مرحوم اپنے اسی خاندانی شاعری کے تحت پیری اور ضعفِ پیری سے مضمون آفرینی کرتے ہیں ؎

تکلیف اُٹھائی خطِ نفسانی سے — سمجھا دشمن کو دوست نادانی سے
ضعفِ پیری کی قدر کر اب ثابت — تن سے نکلے گی جان آسانی سے

خلاقیِ مضامین ہی تو ہے۔ شاعر کا رجحان جس جانب ہو جائے۔ اُسی جانب گُل کاریاں کر دیتا ہے،
اب تک پیری کی مدحت تھی اور اب ؏ غور مذمت سے تھوڑا سا مگر بھی سن لے

پیری میں بشر کمال بے عزت ہیں — گر مال نہیں تو قابلِ نفرت ہیں
ثابت ہر شے کا تھا جوانی میں مزا — پیری میں گناہ بھی تو بے لذت ہیں

ایک رُباعی اور ؎

دندان پیری میں سب بھول گئے — موسم آیا خزاں کا پھل پھول گئے
غالب جو ہُوا طبع پہ سہو و نسیاں — سب جوش جوانی کے مزے بھول گئے

پیری میں دنداں کا چلا جانا، خزاں میں پھل پھول کا چلا جانا ہے۔ آپ "نیرنگِ خزانِ زندگانی" ملاحظہ کر رہے ہیں، اُ
رُباعی اور ملاحظہ کیجئے۔ جو بڑی تابدار و آب دار ہے۔ اور موتیوں میں تولنے کے قابل ہے ؎

دنداں ٹوٹے کہ ہائے ٹوٹے موتی! — رہزن تھا بڑھاپا جس نے لُوٹے موتی
ہو ایسے دانت بھی تو کب ہوتا ہے — سچوں کو پہنچتے نہیں جھوٹے موتی

رُباعی ہمارے یہاں بڑی مشکل صنفِ سخن ہے۔ لیکن اساتذہ نے اسے اظہارِ کمال و فن کا مخصوص ذریعہ بنایا ہے، اس کی تمام شرائط و قیود پر حاوی ہوکر اپنے جذبات و تاثرات کو بڑی قادر الکلامی سے ظاہر کیا ہے، امجد حیدرآبادی ماہرِ فن رُباعی ہی کے ہو کر رہ گئے۔ اور اسی صنفِ ادب میں اپنی استعداد و خداداد کے جوہر دکھائے۔ مرزا دبیر کے لئے مشہور ہے کہ اُن کے لئے رُباعی کہنا باتیں کرنے کے مترادف تھا۔ میں ثابت مرحوم کی بیشتر رُباعیاں، اُن کے اسی اظہارِ کمال تحت درج کر رہا ہوں۔ مرزا دبیر نے بڑھاپے کے متعلق ایک رُباعی کہی ہے ؎

پیری سے ذال قد میں خم اور ہُوا | دم تیز روِ مُلکِ عَدم اور ہُوا
سمجھو نہ عصا سوئے عدم جانے کو | دو پاؤں تو تھے ایک قدم اور ہُوا

رُباعی میں اِس قسم کی مضمون آفرینی پختہ کاروں ہی کے بس کی بات ہے' ہر شاعر رُباعی کی نزاکتوں اور لطافتوں کو نہیں نبھا سکتا۔ جھوٹے موتی سچّوں کو نہیں پہنچ سکتے۔ یہ وہی حقیقت پرستی ہے۔ جس نے خضاب سے بیزاری و عدم رواداری مرحوم کے دل میں پیدا کر دی تھی۔ تصنّع و تکلّف اُنہیں ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ آنکھوں کے متعلق اُن کی یہ رُباعی بیحد قابلِ تحسین ہے۔ معنی پروری، رعایتِ لفظی، محاورہ و ترکیب مدِّ نظر رکھئے۔ اظہارِ مدّعا میں اِن امُور کا التزام قادرالکلامی و پختہ مشقی کا مظہر ہے۔ مرحوم نے کیا حقیقت بیان کی ہے ؎

جو اہلِ بصیرت ہیں وہ دیکھیں مجھ کو | کیا ہوگیا پیرانہ سری میں مجھ کو
ڈھیلوں میں ہوئیں اگر لگاؤں عینک | آنکھیں بھی دکھانے لگیں آنکھیں مجھ کو

یہی حقیقت پسندی ذیل کی رُباعی میں بھی جاری و ساری ہے۔ ثابت مرحوم کی یہ رُباعی یقیناً آپ کو پسند آئے گی۔ یہ کتنی حقیقتوں سے لبریز ہے۔ اربابِ نظر اِس کا احساس کریں گے ؎

کم ظرف امیری میں بدل جاتے ہیں | اپنے بھی فقیری میں بدل جاتے ہیں
بنواتے ہیں دانت اور آنکھیں بڈھے | اعضا بھی تو پیری میں بدل جاتے ہیں

آخر میں مرحوم سے تھوڑا بہت تعارف بھی حاصل کر لیجئے۔ نام مولوی افضل حسین۔ تخلّص ثابت۔ مولد و وطن لکھنؤ۔ جہاں سے اٹھارہ سال کی عمر یعنی سنہ ۱۸۸۰ء عیسوی میں وہ حاجی سیّد جعفر حسین سیشن جج ریاست کوٹہ کے ہمراہ کوٹہ (راجستھان) آئے۔ اُن کی تمام عمر اوّلاً بسلسلۂ ملازمت۔ بعدہٗ بسلسلۂ وکالت کوٹہ ہی میں گزری۔ "حیاتِ دبیر" اُنکی بڑی گراں قدر تصنیف ہے۔ اُن کے غزلی کلام کا مجموعہ "صبرِ جمیل" — تاریخی نام "برقِ غم" — شائع ہو چکا ہے۔ "دربارِ حسین" بھی اُنہیں کی تالیف ہے جو اُردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ پیدائش ۱۵ رجب ۱۲۷۸ھ ہجری مطابق ۱۸۶۲ء میں بمقام لکھنؤ ہوئی۔ یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو بہ عمر ۷۹ سال داعیٔ اجل کو لبّیک کہا۔ کوٹہ ہی میں سپردِ خاک کئے گئے۔ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا الیہ راجعون ؎

اہلِ کمال اُٹھ گئے افسانہ رہ گیا

ناز ش پرتاب گڑھی

خاکسترِ پروانہ

روسی شاعرہ مادام کیمپ کی نظم کا ترجمہ

ملا ہوں میں خورشیدِ زندگی و شعلۂ مضطر
کہ جو اپنے ہی سوزِ دل کے ہاتھوں اب ہے خاکستر
یہ خاکستر بہت دھیمے سُروں میں گنگناتی ہے
سنو اے صاحبانِ دل! یہ کیا نغمہ سناتی ہے
اٹھاؤ! آسماں کی سمت اٹھاؤ مجھ کو انسانو!
مرے شوقِ تمنا کو جو ممکن ہو تو پہچانو!
میں خاکستر ہوں لیکن بال و پر محفوظ رکھتا ہوں
دلِ بے تاب میں ذوقِ سفر محفوظ رکھتا ہوں
فضائے نیلگون و بے کرانہ میں جھولے لے کر
بکھیر دو پھر وہاں سے مجھ کو ہندوستاں کے سینے پر
میں اس دھرتی کو اپنی راکھ کی چادر اڑھاؤں گا
اور اُس کے کان میں یوں چپکے چپکے گنگناؤں گا
مری ماں! بول، کیا اس لمحہ مجھ کو چھو رہی ہے تو
تجھے اس راکھ میں محسوس ہوتی ہے مری خوشبو؟
یہ میری زندگی و موت ۔ وہ شعلہ، یہ خاکستر
بہر صورت، بہر عنواں نچھاور میں ہوا تجھ پر
کہے گی میری ماں، جب مجھ کو سینے سے لگائے گی
مگر کچھ یوں کہ کوئی جنبشِ لب ہو نہ پائے گی
مرے لال! اے جواہر لال! امر ہے زندگی تیری
رہے گی ۔ رہتی دنیا تک رہے گی روشنی تیری
یہ تیری راکھ، جو بکھری ہوئی ہے مجھ پہ ۔ زندہ ہے
اسے اب بھی گلابِ سرخ و نازک کی تمنا ہے
رہے گا ہو کے تو بیگانۂ دستِ اجل ۔ مجھ میں
سدا کھلتا رہے گا تیرے جیون کا کنول مجھ میں

میں اک موجِ رواں تھا، دم کہیں لیتا نہ تھا رک کے
اور اب خاموش و بے حرکت ۔ وہ شعلہ ہو جو خاکستر
یہ خاکستر بہت دھیمے سُروں میں گنگناتی ہے
سنو اے صاحبانِ دل! یہ کیا نغمہ سناتی ہے
مری اس راکھ کو مٹھی میں بھر لو اے وطن والو!
الہ آباد جا کر نذرِ دریا تم اسے کر دو
سُبک رفتاریٔ گنگا بہا لے جائے گی مجھ کو
کوئی بحرِ ابد کی موج اڑا لے جائے گی مجھ کو
بہے گی دھیرے دھیرے وہ مجھے لے کر سمندر تک
پہونچ جائے گی آخر میری خاکستر سمندر تک
سمندر، امتیازِ قوم و ملت جس میں کھوتا ہے
سمندر، جو حدِ ملک و وطن سے دور ہوتا ہے
میں حل ہو جاؤں گا کچھ یوں سمندر کے اجالوں میں
کہ ابھروں گا ہر اک انساں کے سنجیدہ خیالوں میں
مرے کانوں میں سرگوشی کریں گے آدمی جھک کر
تم اے جویائے امن! آرام کیوں کرتے نہیں رک کر؟
اُٹھے گی موج میری راکھ کا تاجِ حسیں پہنے
زمانے بھر کے انسانوں سے صرف اک بات یہ کہنے
قریب اک دوسرے کے آؤ ۔ آؤ ۔ اور قریب آؤ
ملو ۔ بڑھ کر گلے مل جاؤ ۔ ہم آغوش ہو جاؤ
وہ موج اُٹھ کر، گلے سے اور موجوں کو لگائے گی
پھر ۔ آگے، اور بھی آگے، لپکتی بڑھتی جائے گی
جہاں مہکا ہوا ہے اضطرابِ زیست کا گلشن
جہاں پھیلا ہوا ہے زندگی و حسن کا دامن
وہ موج آگے بڑھے گی، ہر طرف، ہر سمت جائے گی
محبت، امن اور انسانیت کے گیت گائے گی

رونق نعیم

دیاسلائی کی تیلی

عہدِ رفتہ کا ذکر کیا چھیڑوں
شجرِ سایہ دار کہتے سے تھے
سب مجھے باوقار کہتے تھے
خود کو تشبیہ دوں تو کس سے دوں

اب تو کچھ بھی نہیں ہے میرا وجود
شکل بدلی تو حال بھی بدلا
میرا ذوقِ جمال بھی بدلا
کھل گیا مجھ پہ رازِ بود و نبود

میرے ہی تن سے گھر بنا میرا
اپنی سکھیوں سے مل کے رہتی ہوں
خامشی کی زباں میں کہتی ہوں
صاف ظاہر ہے مدعا میرا

میرے دل میں سلگ رہی ہے آگ
کچھ عجب سا ہے میرا سوزِ دروں
یوں تو لکڑی کی ایک تیلی ہوں
پھر بھی مجھ سے ہے روشنی کا سہاگ

میری ہر فرد کو ضرورت ہے
اک ذرا گھس کے مجھ کو اترائیں
آپ سگریٹ اپنی سلگائیں
جل کے بجھنا تو میری قسمت ہے

جب بھی اونچے سُروں میں گاتی ہوں
تیرگی کانپ جاتی ہے
رات جب دھیرے دھیرے آتی ہے
میں گھروں میں دیئے جلاتی ہوں

عشرتِ خور و نار ہے مجھ سے
سر پہ بارود ہے تو کیا غم ہے
آشنا مجھ سے ایک عالم ہے
سرخوشی کی بہار ہے مجھ سے

سرد چولھوں کو گرم کرتی ہوں
رازداں ذائقے کی جنت کا
میرا دنیا میں کام ہے اونچا
پھر بھی میں سرد آہ بھرتی ہوں

روح جلتی ہے دل بھی جلتا ہے
چین آئے تو کس طرح آئے
ہوش مندوں کو کون سمجھائے
وقت بھی اپنا ہاتھ ملتا ہے

حق نہیں مجھ کو مسکرانے کا
ہر کوئی روشنی کا دشمن ہے
آدمی آدمی کا دشمن ہے
رنگ اب اور ہے زمانے کا

لوگ اب انتقام لیتے ہیں
پھیلتی ہے خوشی کے گھر میں آگ

بستی بستی نگر نگر میں آگ
مجھ سے یہ کیسا کام لیتے ہیں

جل گئی آرزوئے لالہ رُخاں
جل گئے بام جل گئے جلوے
جل گئے ساز جل گئے نغمے
جل گئے شوخ مہ رخوں کے مکاں

جل گئی کوکھ جل گیا سیندور
جل گئے ہونٹ جل گئی آواز
جل گئی جلوہ گاہ ناز و نیاز
جل گیا امن و آشتی کا سُرور

جل گیا رنگ و بُو کا پیراہن
جل گئی شاخِ گُل کی شوخ لچک
جل گئی گیسوئے صبا کی مہک
جل گیا برگ و بار کا دامن

جل گیا دھرم جل گیا ایماں
جل گئی قلب و جاں کی بیداری
جل گئی رُوح کی ضیا باری
جل گیا وید جل گیا قرآں

ایسے جذبوں میں آگ لگ جائے
جن سے بڑھتے ہوں موت کے سائے

سید احمد شمیم

گمُراہ

(حالیہ فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر ہو کر)

نہ جانے کتنے ہی رہبروں نے
پیمبروں نے
خیال و فکر و نظر کی شمعیں جلائیں لیکن
ہوئی نہ روشن یہ رہگذارِ حیات اب تک
وہ آدمی جو کہ جنگلوں میں
شکار کرتا تھا سادہ دل تھا
جو کم طلب تھا
ہزارہا فلسفوں، عقیدوں کی ظلمتوں میں
گھرا ہوا ہے
ہزار آنکھیں
ہزار لب ہیں
ہزار فکر و نظر کے بُت ہیں
یہ کون سمجھے، یہ کون بُوجھے؟
کہ کون حق پہ ہے کون حق سے ہٹا ہوا ہے؟
مگر بچارا، غریب انساں
نجانے کب سے
انہیں خیالی بُتوں کی خاطر
سَروں کو اپنے کٹا رہا ہے
یہ راستے سے بھٹک گیا ہے
یہ ظلمتوں میں گھرا ہوا ہے ——— !

صہبا وحید

خزاں کا نور

(روسی ادیب بورس پاسترناک کی ایک نظم (AUTUMN) کا عکسِ لطیف)

ہائے دیرینہ محبت کے سہانے بندھن
اپنے ہاتھوں ہی سے خود توڑ دیے ہیں میں نے
اب کہاں ہونگے رفیقانِ وطن کون بتائے؟
دوست احباب بھی سب چھوڑ دیے ہیں میں نے
اور تنہائی کسی دائمی ساتھی کی طرح
بغضِ ماحول بھی ہے روحِ دلِ زار بھی ہے

ریگزاروں کی طرح دشت ہے بے جوش و خروش
ہر طرف یاس کا غمناک فسوں طاری ہے
جیسے گیتوں کی ابھرتی سے ہوں کھوئے کھوئے
آج خوابیدہ نظر آتے ہیں راہوں کے نقوش
پھر بھی اس گوشۂ خلوت میں تمہاری قربت
روحِ ناشاد کو دیتی ہے مسرت کا پیام

کتنی دلگیر ہیں لکڑی کی یہ دیواریں بھی
جو تکا کرتی ہیں دونوں کو بصد حسرت و یاس
ہم نے سوچا ہی نہیں چھوڑ دیں ان کی آغوش
یہ بھی سچ ہے نہیں نوش کریں جامِ فنا

ایک بج جائے تو بیٹھیں گے وہاں میز کے پاس
تین بجتے ہی مگر میز سے اُٹھ جائیں گے، ہم
میں کتاب اپنی لئے، تم یہ کشیدہ کاری
اور پھر وقتِ سحر، یاد نہ ہوگا ہم کو
جانے کب ختم ہوئے وصل کے اسرار و رموز

برگِ اشجار! اُٹھو!
آج ہو رقصِ وحشت
شوقِ وارفتہ کا نظارۂ جاں سوز بھی ہو،
اور چلتے رہیں صہبائے غمِ دوش کے دور،
مرے ساغر میں مگر تلخئ امروز بھی ہو،
ذوقِ ناموسِ وفا، سوزِ دروں، سازِ نشاط
اب ستمگر ہی کی شورش کے حوالے کر دو
اور ہو جاؤ خزاں دیدہ نظاروں میں نہاں
ورنہ خاموش رہو، یار ہو شوریدہ مزاج

میری ہمدم!
مرے ویرانۂ دل کی رونق!
آج یخ بستہ اداسی کی فسوں کاری ہے
جسمِ مرمر سے جدا کرکے گرا نبار لباس
(جیسے اشجار جدا کرتے ہیں دھانی بانات)
تم بدل ڈالو کوئی ریشمی پھندنے کا گاؤن
سرد آغوش کو دو آج تب و تابِ حیات
آؤ یخ بستہ اداسی کا مداوا کر لیں
دو گھڑی ہی کے لئے، ہو کہیں تزئینِ حیات

زندگی دکھ سے بھی بڑھ کر ہے الم بار یہاں
اور جرأت کہ ہوئی جاتی ہے معیارِ جمال
اِس خرابہ میں مگر پیار کی فردوس ہو تم
یہی تنویرِ یقیں دیتی ہے الفت کو فروغ

وزؔ بانکوٹی

نہرو کے بعد

جو خزاں کو بھی ڈھال دیتا تھا
مسکراتی ہوئی بہاروں میں
آج وہ باغباں نہیں ہم میں
اس کی تدبیر سے کھلائے ہوئے
گلستاں میں حسین پھول تو ہیں
جن کی نرم و لطیف خوشبو سے
غمزدہ دل سرور پائیں گے

شمع کی طرح دل جلایا تھا
جس نے تاریک رہگذاروں میں
آج وہ میرِ کارواں نہ رہا
پھر بھی بھارت کی رہبری کے لئے
اس کے چھوڑے ہوئے اصول تو ہیں
روشنی لے کے، یاد سے اس کی
قافلے، منزلوں تک آئیں گے

وقت کا ساز جو اٹھاتا تھا
امن کے گیت جو سناتا تھا
نہیں محفل میں اب وہ شعلہ نوا
اس کی آواز اب بھی زندہ ہے
فرق اتنا ہے، ہاتھ بدلے ہیں
وقت کا ساز اب بھی زندہ ہے

رؤف خلش

"سیہ تہیں"

وہ خاکداں پہ بچھ گئیں سیہ تہوں کی چادریں
سکوں نوازیوں کا مانگنے لگا خراج کون؟
کچھ اس طرح سے چاک دامنی کا شغل بڑھ گیا
لباس اتر گئے بدن سے تار تار ہو گئے!
کچھ اور بھی سمٹ گئیں حیات و موت کی حدیں
کچھ اور بڑھ گئے حسین منزلوں کے فاصلے
کرن کرن نہا گئی لہو اگلتی آگ میں!

سیہ تہیں کفن ہیں ارضِ رنگ و بو کے واسطے
اب ان کی تیرگی کا سلسلہ ہی ٹوٹ جائیگا
لہکنا چاہتی ہے شاخ، رنگ چاہتے ہیں پھول
پناہ مانگتے رہے ہیں ظلمتوں کے دیوتا!
نکل پڑے جو نور کا غبار ہر نگاہ سے
ہنوز نغمۂ بہار خام تو نہیں رہا
سحر کے آنگنوں میں رقصِ شام تو نہیں رہا

نجمہ سیمیع

"یادیں اور آنسو"

بارش بدستور ہو رہی ہے۔ ہوا کے سرکش جھونکوں سے دیو دار اور سلور اوک کے درخت جھوم رہے ہیں۔ پانی کی تیز بوچھار کھڑکیوں کے شیشے سے ٹکرا رہی ہے۔ رات بھیانک اور طوفانی ہے۔ مگر میرے کمرے میں موم بتیوں کی نرم اور پرسکون روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ اور میرے سامنے فریم کے چوکھٹے میں تمہاری تصویر مسکرا رہی ہے۔ تم یہاں نہیں ہو۔ تم مجھ سے بہت دور نہ جانے کس ماحول میں ہو مگر آج ــــ تمہاری موجودگی کا شدید احساس ہو رہا ہے اور میں اس بھیانک رات میں تمہاری افسردہ آواز سن رہی ہوں۔ تمہیں اپنے دل سے قریب محسوس کر رہی ہوں۔

تمہیں یاد ہے افروز ــــ؟

جب ہم آخری بار ملے تھے ــــ ہوا کے ایسے ہی تیز سرکش جھونکے تھے۔ باہر طوفان گرج رہا تھا مگر اندر کمرے میں سکون تھا کیونکہ تم میرے پاس تھے۔ تمہارے ہاتھوں میں نرگس کے ڈنٹھلوں والے پھول تھے جو تم میرے لئے لائے تھے۔ تم مجھ سے نہ جانے کیا کیا کہہ رہے تھے۔ شاید اپنی گزشتہ سرد مہری کی تاویلیں ڈھونڈ رہے تھے اپنی مجبوریوں کا ذکر کر رہے تھے ــــ تمہاری آواز میں افسردگی تھی "غم تھا" مگر میں جیسے کچھ نہیں سن رہی تھی ــــ کچھ نہیں دیکھ رہی تھی ــــ پھر تم چلے گئے۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے باہر کا طوفان اندر گھس آیا ہے۔ اور میں اس بھیانک طوفان میں گھر گئی ہوں۔ اب یہ طوفان کبھی نہیں تھمے گا۔ اور سویرا کبھی نہیں ہوگا ــــ

کاش اس روز تم نہ آئے ہوتے ــــ

تم سے جدا ہو کر میں نے زندگی کے کتنے ہی کٹھن سال ہنستے ہنستے گزار دیئے تھے۔ کیونکہ وقت پا کر آنسوؤں نے مسکراہٹ کا سبق سیکھ لیا تھا۔ تم سے دور ہو کر میں زندگی سے اور قریب ہو گئی تھی۔ میں نے تمہاری محبت کا رخ ادب' آرٹ اور موسیقی شاعری کی طرف پھیر دیا تھا۔ مجھے اب انسانیت سے محبت ہو گئی تھی۔ میں دن رات دکھی اور کمزور انسانوں کی خدمت میں مصروف رہتی۔ میں نے دوسروں کے دکھوں کو اپنا لیا تھا۔ اور اب اس اجتماعی غم کے سامنے مجھے اپنا غم حقیر لگتا۔ مجھے تمہارے بغیر زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ آ گیا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ گزرتا گیا!

اور ایک دن اچانک تم پھر آ گئے۔

تمہیں ایک بار پھر اپنے مقابل دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کتابوں کا سارا علم میرے ذہن سے فراموش ہو گیا ہے۔ ایک پل کے لئے میں سب کچھ بھول گئی ــــ میں تم سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ تمہاری چمکیلی آنکھوں میں اپنی کھوئی ہوئی محبت تلاش کرنا چاہتی تھی۔ لیکن نہ جانے میں کیوں کچھ بھی نہ کہہ سکی ــــ اور تم چلے گئے ــــ تمہارے لائے ہوئے نرگس کے پھول مرجھا گئے۔ فضا میں افسردگی کا غبار سا اڑ رہا ہے میرا کمرہ ویران ہے۔ یہ ہمیشہ یونہی ویران رہے گا ــــ کیونکہ ہم کبھی نہ ملنے کے لئے جدا ہو گئے ہیں۔ افروز ــــ وہ کتنی اداس رات تھی ــــ محسوس ہوتا تھا کہ وہ میری زندگی کی آخری رات ہے ــــ لیکن میں آج بھی جی رہی ہوں ــــ تم سے بہت دور بیچ گلی کی خشک فضا میں سانس لے رہی ہوں۔ شاید زندگی کی آخری سانس ــــ "ہیملٹ" کی معصوم اوفیلیا چشمے میں ڈوب کر مر رہی ہے۔ اور اس کا ہیملٹ اس کی دردانگیز موت کے سوگوار منظر کو نہیں دیکھ رہا ہے

افروز ــــ مجھے بتاؤ وہ روشنی کہاں چلی گئی۔ جو تمہارے ساتھ میری زندگی میں آئی تھی ــــ وہ کارواں کدھر کھو گئے۔ جن کی گھنٹیوں کی سریلی آوازیں میری وادی میں گونج رہی تھیں ــــ وہ وقت کے دھارے پھر میری

چند محبت کے جزیرے اُبھرتے آرہے ہیں۔ تین
سال پہلے کے وہ چند لمحے مجھے یاد آرہے ہیں۔ جب ہم
پہلی بار ملے تھے۔ تمہیں وہ لمحے یاد ہیں یا تم نے اُن لمحوں کو
ماضی کے اندھیرے میں دفن کر دیا ہے۔ مگر میرے ذہن
میں وہ ایک ایک لمحہ آج بھی روشن ہے —— وہ ملاقات
جس قدر مختصر مگر ہمیشہ یاد رہنے والی تھی ——

گھر کے گھٹے گھٹے اور پریشان کن ماحول سے گھبرا کر
سکون کی تلاش میں یونہی بے مقصد گھوم رہی تھی ——
ابھی رات کا دھندلکا پھیلا نہیں تھا۔ اُس وقت سڑک پر بڑی
رونق تھی۔ بڑی بڑی دُکانیں اور اُن میں رکھی ہوئی خوبصورت چیزیں
بجلی کی تیز روشنی میں جگمگا رہی تھیں۔ میری نظریں بار بار شوکیس
میں اُس جُوتے کا جائزہ لے رہی تھیں جو شیشے کے دوسری طرف
کھڑا میری مفلسی کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ یہ چھوٹا سا خوبصورت سفید
جوتا تھا۔ اِس جُوتے کو دیکھ کر مجھے اپنی بہن کے برہنہ پیر یاد آرہے
تھے۔ میری ننھی منی سی بہن! جو لڑکھڑاتے قدموں سے چلنا سیکھ
رہی تھی اور جب اُس کے چھوٹے چھوٹے نازک تلوؤں میں کوئی
کانٹا چبھ جاتا تو وہ چیخ کر رو پڑتی۔ کچھ دیر کے لئے زمین پر
بیٹھ جاتی اور پھر ننگے پاؤں ہی چلنے کی کوشش کرتی ——

میری نظریں اِس چھوٹے سے جُوتے پر جمی تھیں اور میرے
بوجھل قدم آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے۔ کہ اچانک میرے کندھے
پر زبردست دھکا لگا۔ اور میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔
تم گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ اور میں بھی سمٹ کر ایک طرف ہو گئی۔
تم معذرت کے انداز میں چُپ چاپ میرے سامنے کھڑے تھے۔
"آپ نے مجھے دیکھا نہیں ——؟" میرے لہجے میں ضرورت
سے زیادہ دُرشتی تھی۔

"معاف کیجئے —— میں بھی آپ کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتا
ہوا چل رہا تھا۔ تمہارے لہجے میں نرمی تھی۔

"اوہ —— کوئی بات نہیں ——" اور میں نے جھک کر
زمین پر سے اپنا بیگ اُٹھا لیا۔ پھر تم نے مجھے اپنے ساتھ چائے
پینے کی دعوت دی۔ شاید اِس طرح تم اپنی غلطی کا اِزالہ کرنا
چاہتے تھے۔ اور میں تمہارے ساتھ چلنے پر راضی ہو گئی۔ کیونکہ
شاعر بھی

میں اُس وقت تنہا اور اُداس تھی ——

ہم دونوں ساتھ چلتے گئے ——

تم اُس دن بہت سادہ کپڑوں میں تھے۔ سفید قمیص اور گرے
رنگ کی پتلون —— تمہارے لبوں کے خم میں ایک سگریٹ تھا۔
تمہاری نظریں دُور اُفق کی طرف نہ جانے کیا دیکھ رہی تھیں۔
تم خاموشی سے چل رہے تھے۔ اور تمہارے اطراف ایک ہنگامہ برپا
تھا۔ لوگ ہنستے' قہقہے لگاتے' باتیں کرتے' جا رہے تھے۔ مگر تم
خاموش تھے! میں خاموش تھی۔ میں خاموش تھی —— اور ہم دونوں
خاموشی سے آگے بڑھ رہے تھے۔

اور پھر ایک معمولی سے ٹی ہاؤس میں پہنچ کر تم نے چائے
کا آرڈر دینے کے بعد اپنا تعارف کرایا تو میں چونک پڑی —— میں
نے بڑی حیرانی سے تمہاری طرف دیکھا۔ تمہیں تو میں عرصے سے
جانتی تھی تمہاری بنائی ہوئی تصویریں مجھے بہت پسند تھیں۔ تو یہ تمہیں تھے
جس سے ملنے کی شدید آرزو برسوں سے میرے دل میں تھی۔ تمہاری بنائی
ہوئی تصویریں دیکھ دیکھ کر میں نے گھنٹوں تمہارا تصور کیا تھا اور تم۔ اُس
وقت ایک سادہ وقار کے ساتھ میرے سامنے بیٹھے تھے اور میرے دماغ میں
خیالات کا ایک ہجوم تھا۔ تم سے ملاقات اور یوں میرے رب! ایسا میں نے تصور تک نہیں کیا تھا۔

پھر —— ہم اکثر کسی نہ کسی کافی ہاؤس میں ملتے رہے —— میں
گھنٹوں تمہاری تصویروں کی تعریفیں کیا کرتی اور تم خاموش
سُنتے رہتے۔ کبھی کبھی تمہارے ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ آجاتی۔
مگر صرف ایک لمحے کے لئے اور پھر تم ویسے ہی سنجیدہ ہو جاتے۔
شاید تم تعریفیں سُننے کے عادی ہو گئے تھے۔

تمہاری خاموشی اور اجنبیت سے اُکتا کر میں اکثر سوچا کرتی
کہ شاید تمہیں مجھ سے نفرت ہے مگر تم مجھ سے ملتے ہی کیوں ہو ——؟
میں نے تو تمہیں ملنے پر مجبور نہیں کیا تھا بلکہ تم ہی اکثر دبی زبان
سے اور بظاہر لاپرواہی کے ساتھ آئندہ ملاقات کا وقت مقرر
کر دیتے تھے اور میں تمہاری طبیعت کا یہ تضاد سمجھ نہیں سکتی تھی
میں اُس وقت محبت اور نفرت کے سنگم پر کھڑی تھی اور نہیں جانتی
تھی کہ کس سمت نفرت ہے اور کس سمت محبت —— اور اسی لئے
کبھی کبھی میرا جی چاہتا تھا کہ تم سے ملنا چھوڑ دوں —— کاش میں
ایسا ہی کرتی ——

اگر میں ایسا ہی کرتی تو آج زندگی کے جس دوراہے پر کھڑی ہُوں یہ دوراہا میری زندگی میں کبھی نہ آتا ۔ میری زندگی آج جن پُرپیچ اور خاردار راستوں سے گزر رہی ہے کبھی نہ گزُرتی مگر تمہیں مجھ سے یا میری زندگی سے اب کیا دلچسپی ۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا ۔

کچھ دن بعد میں نے جان لیا کہ تُم مجھ سے کیوں ملتے ہو ۔ دوسرے کو اپنے سے زیادہ غریب دیکھ کر انسان میں ایک طرح کا احساسِ برتری پیدا ہوتا ہے ۔ اور تُم ۔۔۔ اُن دِنوں اسی قسم کے احساسِ برتری کے شکار تھے ۔ تُم مجھے کبھی کبھی چائے یا کافی پلا کر ایک طرح کی طمانیت سی محسوس کرتے ۔ اور جس دن تمہارے پاس چائے کے لئے بھی پیسے نہیں ہوتے تو تُم ہمیشہ سے زیادہ گمبھیر اور خاموش رہتے ۔ اُس وقت تمہارا چہرہ تمہاری ذہنی الجھنوں کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔ مگر تُم سمجھتے کہ میں تمہارے دُکھوں سے واقف نہیں ۔ تمہاری پریشانیوں کو نہیں جانتی ۔ میں صرف اتنا جانتی ہُوں کہ تُم بہت اچھے آرٹسٹ ہو ۔۔۔ تُم کہتے بے وقوف تھے افروز ۔

کون نہیں جانتا کہ ہندوستان میں آرٹسٹ ہی نہیں، ہر بڑا فنکار بھوکا مرتا ہے ۔ اگر تُم بھی اُن دِنوں غمِ روزگار کے چکر میں سرگرداں تھے تو اِس میں تعجب کی کیا بات تھی ۔ اُن دِنوں تمہاری زندگی دو حِصّوں میں بٹی ہوئی تھی ۔ چوبیس گھنٹے میں تُم آٹھ گھنٹے کارخانے میں مزدوری کرتے ۔ اور باقی گھنٹے آرٹ اور تخیل کی دنیا میں بسر کرتے ۔ تُمہیں پیٹ پالنے کی خاطر مجبوراً کارخانے میں مزدوری کرنی پڑتی ۔ ورنہ تُم چوبیس گھنٹے آرٹ کی دُنیا میں غرق رہنا چاہتے تھے ۔

افروز ۔۔۔ دُنیا میں ایسے کتنے ہی انسان ہیں جن میں ایک اچھا فنکار، ایک اچھا آرٹسٹ، ایک بہترین انجینیئر اور ایک بُلند پایہ لیکھک بننے کی صلاحیت ہے ۔ مگر اُنہیں ایسا ماحول نہیں ملتا ۔ اُنہیں اتنی سہولتیں نہیں کہ وہ اُبھر سکیں، دُنیا میں بہتر کام کر سکیں ۔۔۔ ورنہ اُنہیں اگر موقع ملے تو وہ دُنیا کو بہت سی خوبصورت چیزیں پیش کر سکتے ہیں ۔ تاج محل سے زیادہ خوبصورت اور کار آمد ۔۔۔ مگر جب تک دولت کمینے اور نا اہل لوگوں کے ہاتھوں میں رہے گی ۔ تب تک فنکار

سڑکوں پر پھریں گے ۔ بھُوکے مریں گے ۔ اور تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا ۔ اور تُم افسُردہ اور غمگین تھے ۔ مگر مجھے تمہاری اِس غُربت ہی پر پیار آتا تھا ۔ اِس غُربت ہی نے تو تمہیں مجھ سے قریب کر دیا تھا ۔ تُم اپنے دیرینہ دوستوں کو چھوڑ کر صرف مجھ سے اِس لئے ملتے تھے کہ تُم مُفلس تھے اور میں تُم سے زیادہ مفلس ۔ اِسی مُفلسی نے ہم دونوں کو چند لمحوں کے لئے ایک دوسرے کا ساتھی بنا دیا تھا ۔ ہم انجانے طور پر ایک دوسرے سے قریب ہوتے جا رہے تھے ۔ کیوں کہ اِنہیں دِنوں ایک مُلاقات کے دَوران میں جن گہری نظروں سے تم نے مجھے ایک بار دیکھا تھا وہ نگاہیں میں آج تک بھی نہیں بھُول سکی ۔ اور نہ میں بھُولنا چاہتی ہوں کیوں کہ وہ لمحے میری زندگی کا سرمایہ ہیں ۔ میری زندگی ہیں ۔۔۔ اِن لمحوں کو لئے میں آج تک تمہارا انتظار کر رہی ہُوں اور کرتی رہُوں گی ۔

تُم ہمیشہ کی طرح چُپ تھے اور میں ہمیشہ کی طرح تمہاری ایک تصویر کی تعریف کر رہی تھی ۔ جس کے تخیّل سے مجھے اختلاف تھا ۔ باتوں کی دُھن میں میں نے بڑے جوش سے کہا تھا "حُسن غُربت کا ساتھ دے سکتا ہے افروز صاحب !" اور اُس وقت تُم نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پُوچھا تھا "سچ کہہ رہی ہو ۔۔۔" تمہاری اِن نظروں کی تاب نہ لا کر میری آنکھیں جُھک گئی تھیں اور تُم مُسلسل مجھے دیکھ رہے تھے ۔ یہ سب کیا تھا افروز ۔۔۔ یہ نازک لمحہ ہمارے نزدیک کیوں آیا تھا ۔۔۔؟ اور یہی ایک لمحہ نہیں اِس کے بعد کئی لمحے ہمارے درمیان آئے اور اپنی زندگی کا راستہ چھوڑ کر میں نے تمہارے راستے پر چلنا شروع کر دیا ۔۔۔

آج شاید تُم اِس کا جواب نہ دے سکو کہ یہ نازک لمحے ہمارے درمیان کیوں آئے تھے ۔۔۔؟ اس لئے کہ اِن کو گزرے ایک عرصہ ہو چُکا ہے ۔ اِن لمحوں کو تُم اب بھُول چُکے ہو گے کیوں کہ یہ لمحے تمہارے بے کار اور افسردہ دِنوں کے ساتھی تھے ۔ ۔۔۔ آج تُم بے کار نہیں افسُردہ نہیں، اب تم ایک بہت بڑے آرٹسٹ ہو (بڑے آرٹسٹ تو تُم پہلے بھی تھے) اب تمہارے پاس اپنا ایک اسٹوڈیو ہے جہاں تُم بڑے بڑے سرمایہ داروں کی

مجسّموں کی تصویریں بناتے ہو۔ کیوں کہ اُنھیں تصویروں سے تو تم نے اپنا اسٹوڈیو بنا لیا ہے۔ اپنی آسودہ زندگی بنالی ہے۔ اور اس نئی زندگی نے تمہیں بہت سی پُرانی چیزوں کو چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔ پُرانے دوستوں کو پُرانے ساتھیوں کو اور پُرانی یادوں کو ـــــ اب تمہارے ہاتھ میں ۵۵۵ سگریٹ کا ٹن رہتا ہے۔ تم گیبرڈین کے بہترین سُوٹ میں ملبوس اپنی چھوٹی سی ہِل مین کار میں گھومتے رہتے ہو۔ تمہیں اب کسی چھوٹے کافی ہاؤس میں جانے کی فرصت نہیں ـــ تمہیں اب لوگ "تاج محل" جیسے بڑے ہوٹل میں مدعو کرتے ہیں جہاں تم کسی رپورٹر کے مجبور کرنے پر کسی گلیمر گرل کے ساتھ اسے اپنی تصویر کھینچنے کی عزّت بخش دیتے ہو۔ اور کچھ دن بعد اخباروں میں تمہاری یہ تصویر دیکھ کر میں کچھ اور غمگین ہو جاتی ہوں۔ اس لئے کہ تم اب ہم سے کس قدر دُور ہو گئے ہو۔ تم اب جس قسم کی مصنوعی زندگی گزار رہے ہو۔ کیا یہ زندگی تمہیں پسند تھی۔ کیا اسی زندگی نے تمہارے آرٹ کا گلا نہیں گھونٹ دیا ـــ؟ تمہاری آرٹسٹک صلاحیتوں کو ختم نہیں کر دیا۔؟ سچ بتانا افروز ـــ ان دنوں تم نے جو تصویریں بنائی ہیں اُن میں کتنی جان ہے ـــ؟ تمہاری رُوح کا کتنا عکس ہے ـــ؟ کیا تمہارے خیالات اور تمہارے جذبات کی صحیح ترجمان ہیں یہ تصویریں ـــ؟

میں سوچتی ہوں ـــ تم اپنی ذہنی آسودگیوں سے مُنہ موڑ کر صرف اپنے جسم کو آسودہ کرتے رہو گے۔ کیا تم اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر ہمیشہ اِن نااہل زر کے ٹھیکیداروں کا ساتھ دے سکتے ہو ـــ جو تمہارے آرٹ کو سمجھ نہیں پاتے۔ جو تمہارے تخیّل کی بلندیوں کو چھو بھی نہیں سکتے ـــ

افروز ـــــ کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ تمہارا فن تمہاری اپنی میراث نہیں ـــ یہ قوم کی میراث ہے ـــ یہ تمہارے دیس کی امانت ہے ـــ مگر تم نے مصنوعی فن کے حسین پردوں سے ہمیشہ دُوسروں کو دھوکہ دیا ہے۔ اپنے آپ کو دھوکہ دیا ہے۔ اور نہ جانے کب تک دیتے رہو گے ـــــ

تین سال کے بیتے ہوئے لمحے میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہے ہیں ـــ میں پلنگ پر لیٹے لیٹے اُٹھی، کہ اُن لمحوں ...

میں گم ہوں۔ رات، تاریک اور طوفانی ہے۔ اور میں اس طوفان میں اکیلی ہوں۔ مینٹل پیس پر تمہاری تصویر مُسکرا رہی ہے۔ میرے ویران کمرے میں موم بتی کی زرد روشنی بکھری ہوئی ہے۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا ـــ کچھ سُنائی نہیں دیتا۔ طوفان کب تھمے گا ـــ یہ طوفان کب تھمے گا۔ سویرا کب ہوگا ـــ

کاش میں تم سے اُس دن نہ ملی ہوتی ـــ یہی بارش کا وہ پہلا قطرہ ہے جو اپنے ساتھ سات سمندروں کے طوفان لایا ـــ اِس طوفان میں میری زندگی کی کشتی ہچکولے کھا رہی ہے ـــ

مجھ پر آج ستاروں کے دریچے کھُل رہے ہیں ـــ آسمان کی نیلگوں فضاؤں میں بہت دُور ـــ کوئی انجانا راستہ مجھے نظر آ رہا ہے ـــ اس راستے پر چلتے چلتے میں ستاروں سے بھی پرے آسمان کی تابناک دُنیا میں پہنچ جاؤں گی ـــ جہاں میری بنائی ہوئی منزل اپنے ننھے ننھے کنگروں اور گول خوب صورت بُرجیوں سمیت اپنے محرابی دروازے سے وا کئے میرے انتظار میں ہوگی ـــ وہاں پہنچ کر میں تمہارا انتظار کروں گی ـــ

اب رُخصت رومیو! رات کے دیئے بجھ گئے ہیں
اور صبح پہاڑوں کی چوٹیوں پر ایڑیاں اُٹھائے جھانک رہی ہے۔

ہمیں اب جُدا ہو جانا چاہئے ـ تاکہ کل مِل سکیں ـــــ

ـــــ پڑھتے پڑھتے افروز نے غیر ارادی طور پر گلاب کا ایک پھول گملے سے توڑ لیا۔ اور اُس کی پتیاں نوچ کر پھینکتے پھینکتے اُس نے خط کے ٹکڑے بھی دریچے سے باہر پھینک دیئے۔

کرنجیت سنگھ

ٹھنڈے ہاتھ

ٹھنڈے سے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ برتن دھوتے دھوتے دیپو کا دھیان کسی دوسری طرف چلا گیا تھا۔ آج سویرے جب ماں گاؤں سے آئی تھی تو بی بی جی نے اُس سے اُس کی بہت ساری شکایتیں کی تھیں ان شکایتوں کی بی بی جی سے ماں نے معافی مانگی تھی۔ گاؤں لوٹنے سے پہلے ماں اُسے سمجھاتی رہی تھی۔ دیکھو، من لگا کر کام کر دیو۔ بی بی جی تیری بہت شکایت کر رہی تھیں۔

وہ گیا تھی۔ چُپ چاپ سُنتی رہی تھی، کہنے کو تو بہت کچھ کہہ سکتی تھی۔ لیکن نہیں . . . ! اُس نے اپنا منہ کھولنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ بہت دنوں سے سوچ رہی تھی، اِس مرتبہ جب ماں شہر آئیگی۔ تو وہ اُس سے ایک سوٹ کا کپڑا اور بالوں میں ٹانکنے کو ایک ربن لے دینے کو کہے گی۔ لیکن یہاں معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ شکایتیں، اور شکایتیں۔ بی بی کا سَر پر احسان جو تھا وہ اُسے نوکرانی بنا کر گھر سے یہاں لائی تھیں۔ اپنے گھر کے جھوٹے برتن منجوانے کو۔ آج کام میں اُس کی طبیعت بالکل نہیں لگ رہی تھی، وہ ہولے ہولے برتن دھو رہی تھی۔

اچانک اندر کے کمرے سے آواز سُنائی دی۔ دیپو۔! برتن مانجھ لئے ۔۔ ؟ وہ چونک سی گئی ۔۔ "جی ہاں! دھو رہی ہوں" یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔ عین اُسی وقت بی بی جی کی لڑکی گردیپ وہاں آئی۔ اور بولی "ایک گلاس پانی دے ۔۔" اُس نے کانسے کے گلاس میں پانی بھر کر آگے بڑھایا۔

"نہیں ۔۔ وہ جھڑک کر بولی۔ "گندی کہیں کی۔ میں نے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ مجھے کانچ کے گلاس میں پانی دیا کر ۔۔"
اُس نے چُپ چاپ کانچ کے گلاس میں پانی بھر کر آگے بڑھا دیا۔

پانی پیتے پیتے گردیپ کی نظر اُس کے بالوں پر پڑی۔ اور وہ بولی۔ "یہ جو ربن تو نے اپنی دُم کے ساتھ باندھ رکھا۔ کہاں سے لیا ؟ ۔۔" دیپو نے جواب دیا۔ "یہ تو پڑا ملا ہے۔ نل کے پاس یُوں ہی پڑا ہُوا تھا"

"چوٹی کہیں کی ۔" گردیپ منہ بناتی ہوئی سے چلی گئی ۔۔ یہ جملہ گولی کی طرح اُس سینہ چھید گیا۔ کتنے سے اُس نے ربن اپنی چوٹی میں باندھا تھا۔ اُسے بھی گر کی طرح اپنی چوٹی میں ربن باندھنے کا شوق تھا۔ رنگ ربن۔ لیکن . . . . !

وہ برتن دھو کر اور اُنہیں ٹھکانے سے رکھ کر کی رسوئی کے لئے دال چھانٹنے لگی۔ آئے دن کوئی نہ کو بات ہو ہی جاتی ہے، جسکے درد سے اُس کا دل ٹوٹنے لگ وہ تو گھر میں سب سے اچھی طرح میٹھی میٹھی باتیں کرنا چ ہے۔ وہ تو سب سے بھائی بہنوں اور بچوں کی طرح مل کر چاہتی ہے۔ لیکن کوئی اُس سے سلیقے سے بات نہیں کرتا۔ آ اُس کا دل اور بھی دُکھی تھا۔ ماں آئی اور چلی گئی وہ اُس سے باتیں بھی نہ کر سکی۔ بی بی جی کمرہ سے باہر آئیں اور بولیں "ہمارے لئے آج رات کا کھانا مت پکانا۔ ہم دعوت میں جا رہے ہیں ۔۔"

"اچھا ۔۔" آہستہ سے اُس نے جواب دیا۔
جس دِن گھر کے لوگ کسی کے یہاں دعوت میں یا شادی میں جاتے، اُس دِن گھر میں وہ اور بوڑھی دادی ہی رہ جاتی ہے۔

رات کے وقت بابو جی، بی بی جی، گردیپ اور بھیّا، سب دعوت میں چلے گئے تھے۔ تنہائی میں گھر بڑا سُونا سا لگ رہا تھا۔ وہ تھوڑا بہت کام نپٹا کر گھر کے

میں جا بیٹھی۔ موتی کتا قریب آکر دُم ہلانے لگا۔ اُس نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔

بولی ــ "بدمعاش۔ آج سارا دن کہاں رہا"
موتی مُنہ چاٹنے کے لئے بے چین ہو اُٹھا۔ اُچک اُچک کر دُم ہلانے لگا۔

"چل پرے ہٹ" موتی کو ایک طرف ڈھکیلتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور گردیپ کے کمرے میں چلی آئی۔ اُس نے دیکھا۔ ہینگر میں شلوار قمیص اور خوب صورت رنگ برنگے دوپٹے لٹک رہے تھے۔ عنابی رنگ کا سُوٹ اُسے بہت پسند تھا۔ وہ سُوٹ اُس نے ہینگر پر سے اُتارا اور پہن لیا پھر وہ میز کے سامنے لگے شیشے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اُس نے بہت مرتبہ گردیپ کو اپنے چہرے پر اسنو اور پاؤڈر ملتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُس کی بھی یہ خواہش تھی کہ وہ بھی اپنا چہرہ خوبصورت بنائے۔ وہ سنگار میز کے سامنے چھوٹے سے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ چہرے پر کریم ملی، پاؤڈر لگایا اور پھر ماتھے پر چھوٹی سی بندیا ٹانک دی۔ سُوٹ کے رنگ سے ملتی جلتی اوڑھنی بھی سر پر ڈال لی۔ اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ یوں کھڑی کتنی خوبصورت لگ رہی تھی وہ۔ اپنے آپ کو اُسے پہچاننا ہی مشکل ہو رہا تھا وہ گردیپ سے کم خوبصورت نہیں ہے۔ اچانک اُسے بوڑھی دادی کی پکار سنائی دی۔ اُس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ جلدی جلدی کپڑے اُتارنے لگی۔ سب کچھ اتار کر ٹھکانے رکھ دیا۔ پھر اپنا لباس پہن کر دادی کے قریب آئی۔

"کیا ہے دادی جی؟"
دادی نے پوچھا۔ "کیا ابھی تک کوئی گھر نہیں پلٹا...؟"
وہ بولی ــ نہیں...!
دادی نے اُس کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ اور بولی۔ "جا ایک گلاس پانی لا ــ!"

وہاں اُس کے لئے ٹھہرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ فوراً کمرے سے باہر نکل گئی۔ اچانک اُسے احساس ہوا۔ بی بی جی اور گرد تو آنے ہی والے ہیں۔ وہ اُسے اِس رُوپ میں دیکھینگی تو کیا کہیں گی؟ بی بی جی، خوب پیٹیں گی۔ گردھی پیٹے گی۔ وہ نل پر گئی اور مُنہ ہاتھ دھو کر دادی کے لئے ایک گلاس میں پانی لے آئی۔

رات گئے سب گھر لوٹے۔ دیپو اندر بڑے کمرے میں صوفے پر بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ بی بی جی نے ڈپٹ کر اُسے جگایا۔ اور بولی۔ جا تھوڑا پانی گرم کر لا۔"

اُس نے دیکھا۔ رنجیت بھیا بڑا نڈھال ہو رہا تھا۔ اور ایک ہاتھ سے پیٹ تھامے ہوئے تھا۔ شاید پہلے کی طرح آج بھی اُس کے پیٹ میں درد شروع ہو گیا تھا۔ وہ باورچی خانہ میں پانی گرم کرنے چلی گئی۔

رنجیت اُس سے نرمی کے ساتھ برتاؤ کرتا تھا۔ وہ اکثر اُس سے مذاق کر بیٹھتا۔ اُسے رنجیت کی باتیں بڑی پیاری لگتیں۔ ایک اُس کا بھائی بھی تھا۔ بالکل رنجیت جتنا بڑا۔ بیمار پڑا تھا۔ اور مہینوں چارپائی سے لگا رہا تھا۔ پھر اُس چارپائی سے اُس کی لاش ہی اُتاری گئی تھی۔

رنجیت کو دیکھ کر اُسے اپنا بھائی یاد آجاتا۔ وہ اُس کے قریب کھڑے ہو کر خاموشی سے اُس کی باتیں سنتی رہتی وہ اکثر اُسے ہنسانے کی کوشش کرتا۔ اور کئی طرح کی باتیں کر کے ہنساتا رہتا۔ وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں حیا سمیٹے اُس طرف کنکھیوں سے دیکھتی رہتی۔ کہیں بی بی جی کی نظر پڑ جاتی تو وہ دونوں کو ڈپٹ دیتیں۔ خاص کر دیپو کو تو بُری طرح ڈانٹتیں "بے حیا کام نہیں ہے کیا...؟ کھڑے کھڑے کیا نخرے کر رہی ہے...؟"

"نخرہ کسے کہتے ہیں۔ یہ ٹھیک طرح اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا ــ جب وہ پانی گرم کر کے لائی تو دیکھا۔ رنجیت درد سے کراہ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اُسے بڑا دُکھ ہوا۔
گرم گرم پانی بوتل میں بھر دیا گیا اور سینکائی کی جانے لگی بی بی جی اُس سے بولیں ــ "تو جا اپنا کام کر۔"
وہ من میں ایک درد لئے کمرہ سے باہر نکل آئی۔
کچھ دیر بعد جب وہ سب لوگ رنجیت کے کمرے سے نکل آئے تو وہ دبے پاؤں وہاں گئی اور بولی۔ "بھیا پیٹ میں بہت زیادہ درد
رنجیت مریل آواز میں بولا ــ اب ٹھیک ہے دیپو۔

"میں تمہارے پیر دبا دوں......؟"

"نہیں۔ اِس کی ضرورت نہیں.....!"

مین اُس وقت ماں اُس طرف آئی اور بولی۔۔۔ "کیا کر رہی ہے دیپو یہاں...؟" جا سو مر... سویرے اُٹھنے کا نام نہیں لے گی۔"

دیپو سے اور وہاں کھڑا نہیں رہا گیا۔ وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ وہیں سے اُس نے سُنا، بی بی جی رنجیت سے کہہ رہی تھیں۔۔ "چھوکری کو اِس قدر منہ مت لگاؤ۔ گھر کی بات ہے۔ کوئی باہر والا دیکھے گا تو کیا کہے گا....؟"

دیپو کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ بی بی جی ایسا کیوں کہتی ہیں...؟ بہت دیر تک وہ اُس پر غور کرتی رہی۔ موتی اُس کے قریب آکر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے اُسے کس کر اپنے ساتھ چپٹا لیا۔ موتی بے چارہ اُس سے کبھی ناراض نہیں ہوتا ہمیشہ پیار کرتا ہے اور اُس وقت وہ گھر والوں کا رُوکھا پن بالکل بھول جاتی ہے۔

بہت رات تک اُسے نیند نہیں آئی، وہ لیٹی لیٹی کروٹیں بدلتی رہی۔ بی بی جی کے رنجیت کو کہے ہوئے الفاظ اب بھی اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ بات اب بھی اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

سویرے سویرے گرو اُس کے کمرے میں آئی اور بولی۔۔ "چل بی بی جی تجھے بُلا رہی ہیں۔۔!" وہ آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔

گرو پوچھنے لگی۔ "یو نہیں کی، کیا کل رات کو میرے کمرے میں گھُسی تھی۔۔؟" وہ ہڑبڑا کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔۔ "نہیں تو....!"

"جھوٹ بولتی ہے بدمعاش، نہیں تو۔ چل ماں تیری خبر لیں گی۔"

"دیپو...! اندر کے کمرہ سے بی بی جی کی کرخت آواز سُنائی دی۔

وہ فوراً اُٹھ کر منہ ہاتھ دھونے نل کی طرف چلی گئی۔ وہاں سے وہ بی بی جی کے پاس آئی۔

بی بی جی اُسے دیکھتے ہی بَپَٹ پڑیں۔۔ "کیوں کلموہی، کیا رات کے وقت تو گرو کے کمرے کی تلاشی لے رہی تھی..؟"

"نہیں تو....! بڑے بھولے پن سے وہ بولی۔

"تو اُس کے کپڑے اور دوسری چیزیں اِدھر اُدھر کس نے رکھیں....؟"

"میں تو اُس کے کمرے میں نہیں گئی تھی بی بی جی....!" پھر اُس نے قصور ماننے سے انکار کیا۔

"کیا تو چوری کرنا سیکھ رہی ہے۔ ہاتھ کاٹ کر رکھ دوں گی۔" کہتے ہوئے بی بی جی نے کھینچ کر ایک تھپّڑ اُس کے منہ پر جڑ دیا۔

وہ گرتے گرتے بچی۔ گرو اُس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔۔

"جا جا کر اپنا کام کر۔" بی بی جی ڈپٹ کر بولیں۔ "پھر بغیر اجازت کسی کے کمرے میں گئی تو تیری ٹانگ توڑ کر رکھ دوں گی۔"

وہ آنکھوں میں آنسو لیے چُپ چاپ باورچی خانے میں آگئی اور وہاں پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ اُس دِن اُس نے کھانا نہیں کھایا۔ کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ رات کے وقت وہ دبے پاؤں پھر رنجیت کے کمرے میں گئی اور بولی۔۔ بھیّا۔ میرا ایک کام کر دو گے؟

"کیا کام ہے دیپو...؟" رنجیت نے شیریں لہجے میں پوچھا۔

"گاؤں میری ماں کو ایک چٹھی لکھ دو۔ وہ مجھے آ کر لے جائے۔۔"

"کیوں؟ کیا بات ہے....؟"

"میں یہاں نہیں رہوں گی۔ بس۔۔!" اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ رنجیت ہمدردانہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

چند لمحوں بعد دیپو نے پھر اپنے الفاظ دُہرائے۔۔ لکھ دو گے نا۔؟

رنجیت آہستہ سے بولا۔۔۔۔ ہاں....!

وہ دوپٹے کے آنچل سے آنکھوں کے آنسو پونچھتی ہوئی اپنی

رفعت بلخی

"گیلی لکڑی"

برسات کے ختم ہوتے ہی جنگلوں اور غیر متعلقہ علاقوں کے راستے کھل گئے تھے۔ پہاڑی ندیوں کا زور گھٹ چکا تھا۔ اور خام سڑکوں کی کھنکتی ہوئی جوانی نے سطح پر جا بجا ابھرے ہوئے پتھر کو نمایاں کر دیا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ڈاکٹر رنجن بورال کی عمر رواں نے اس کے چہرے پر کئی نمایاں نقوش چھوڑے تھے۔ سڑک برہنہ تھی۔ ارد گرد کوئی سایہ دار درخت نہ تھا۔ اور ڈاکٹر بورال اسی کھردری سڑک پر آتے جاتے لوگوں کے لئے کچھ اس قدر مانوس ہو گیا تھا کہ لوگ اسے ڈاکٹر دا کہا کرتے تھے۔ صرف ڈاکٹر دا۔ ڈاکٹر یہی کوئی پینتالیس پچاس کا کم سخن سنجیدہ انسان تھا۔ درخت کی پرانی چھال کی رنگت والا یہ پست قد ڈاکٹر خود میں بے پناہ کشش رکھتا تھا۔ اوسط جسم نیلے ملائم ہونٹ، جنہیں وہ عالم اضطراب میں سہلایا کرتا تھا۔ اور سنہلی کمانی کا جرمنی فینسی فریم کے پیچھے اس کی مسکراتی ہوئی دو آنکھیں تھیں۔ جن میں جستجو و آرزو کی نمی تھی۔ بڑی دلآویز شخصیت تھی۔

ڈاکٹر دا بیرم کے قریب ہی ایک بلاک میں محکمۂ صحت عامہ کی طرف سے کسی اسکیم کے تحت عرصہ سے کام کر رہا تھا۔ وہ ہیلتھ وزیٹر (HEALTH VISITOR CENTRE) کا انچارج بھی تھا مجھے یاد ہے یہ کوئی پرانی بات بھی نہیں۔ میں اسی بلاک میں توسیع زراعت کے سلسلہ میں اپنا عہدہ سنبھالنے آ رہا تھا۔ بیلاموں فورٹ کے بعد راستہ بہت ہی ویران تھا۔ گھنے جنگل تھے۔ بانس اور ساگوان کے لانبے لانبے درخت تھے۔ جو حد نگاہ تو کیا حد خیال تک پھیلے ہوئے تھے۔ میرا تبادلہ شہر سے ایسے مقام پر ہوا تھا جہاں سنا ہے کبھی معصوم مسافروں کی قربانیاں دی جاتی تھیں۔ اتفاق سے میں دوران تعلیم میں نہ کبھی جغرافیہ کا طالب علم رہا اور نہ تاریخ کا محقق کہ یہ خطۂ نادیدہ میری توجہ کا مرکز بنتا۔ البتہ ادب سے تھوڑا تعلق رہا ہے جس نے فی الوقت میری نگاہ شوق کو گوشۂ جنت کا ازلی سکون بخشا تھا اور میں دن ڈھلے سفر طے کر رہا تھا۔ بس چھپا دو پہر ہوتی ہوئی اکسی پہونچی۔ شام ہو چلی تھی۔ سورج کی سنہری شعاعیں درختوں کے سبز پتوں اور بانس کی کچن کونپلوں پر ساون کی پھوار کی طرح برس رہی تھیں۔ بس کی رفتار نے ٹھنڈک کا احساس شدید کر رکھا تھا۔ میرا سہ رنگی دھاری دار مفلر سر اور کانوں سے ہوتا ہوا شیو جی کے ناگ دیوتا کی طرح میری گردن میں جھول رہا تھا۔ اکسی کے بعد راہیں تاریک ہو گئی تھیں۔ نہ چاند تھا نہ چاندنی، صرف جنگل کا سکوت تھا یا کبھی جھینگروں کی صدا تھی۔ جو سرد شام بن کر گونج رہی تھی۔ راکسی کے ڈاک بنگلہ میں کوئی روشنی نہ تھی۔ احاطے کے قریبی حصے میں آگ سلگ کر سرد پڑتی جا رہی تھی۔ غالباً چوکیدار نے الاؤ جلا رکھا تھا جو شبنم سے بجھتا جا رہا تھا۔ سبز پوش پہاڑیوں کے لامتناہی سلسلے دھند میں ڈوب گئے تھے۔ سب ڈوب گئے تھے۔ بعض کا اونگھتا ہوا بد لو بھیگا مسافر بھی ڈوب گیا تھا۔ جو بیرم میں ہوا اجلا کر ٹھیرتا ابھیجتا ہے اور جیسے پی کر ایک دفعہ کسی جنگلی عورت نے اپنے مریل سے شوہر کا جسم نوچ لیا تھا کہ وہ اب سلگ کر راکھ ہو چکا تھا۔ پھر بھی اس کی مفلوج تمناؤں نے کوئی کمسن تند و تیز آتش سیال ڈھونڈ نکالی تھی۔ جیسکی برہنہ پیٹھ سیاہ چٹان کی طرح دھوپ میں چمکتی تھی اور جس نے اپنے جوڑے میں پیار کے پھول آرڈس لئے تھے۔ بسیار خرابی کے باوجود وہ نہ کبھی تھکی اور نہ کبھی ہاری۔ کبھی پی کر

نشے میں زیادہ بگڑ در ہو جاتی تو سرد پتھر کی طرح اپنے اُداس شوہر سے چنگاری پیدا کرنے کی سعئی لا حاصل کرتی۔ کوئی کچھ کہتا تو کہتی ــــ " اِنگیماسیتاس جُرھیاں راآدس" (میرا شوہر بہت اچھا ہے)

مجھے یاد ہے ــــ جب میں بیرم پہونچا تھا تو تاریک رات کی سیاہ چادر میں ہر چیز لپٹی ہوئی تھی۔ جاڑے کی سرد رات تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اِسٹینڈ سے پرے صرف ایک چراغ برآمدے میں جل رہا تھا۔ میں نے وہاں پہونچکر پکارا ــــ پھر وہی چہرہ سامنے تھا جس کے سکوت میں وقار تھا۔ اور جس نے میرے سلام کا نہایت مخلصانہ جواب دیا اور فوراً ہی خود کو مجھ سے متعارف کرا دیا۔

"ہم ڈاکٹر بورآل ہے دلعا۔ رنجن بورال۔ آپ اِدھر کہاں سے آتا ہے؟" میں اُس کے خلوص سے بے حد متاثر ہوا۔ اور اُسے ایک ہی سانس میں سب کچھ بتا دیا۔ اور پھر ہم یوں ملے کہ جدا ہونا مشکل ہو گیا۔

رنجن دا چوسر کا رسیا تھا اور میں نے بساط بچھانا اپنے مُنیہ ماموں سے سیکھا تھا جو اس فن کے کوروپانڈو مانے جاتے تھے۔ ایک طرف سمور میں چائے بنتی۔ چائے کا دور چلتا۔ اور دوسری طرف ڈاکٹر دا ہم سبھوں کے ساتھ رات رات بھر جاگ کر تاش یا چوسر کھیلتا۔ ہاں دوران مشغولیت میں بھی اُس کے ہونٹ بے تابد ہا کرتے تھے جنہیں وہ اپنی انگلیوں سے سہلا سہلا کر حسب عادت سکون بخشتا تھا۔ یہ اُس کا شعوری یا غیر شعوری عمل تھا۔ جس کی وجہ پوچھنے پر وہ گو مگو ہو جایا کرتا یا لب کے کسی گوشے میں تازہ سگریٹ کھونس کر دھواں اس طرح اُڑاتا جیسے جلی ہوئی سگریٹ چبا ڈالے گا۔ ہم میں سے کچھ اُس کے اِس بوہیمین (BOHEMIAN) عمل کو بُرا سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر دا کو نیند بھی کم آتی تھی۔ وہ ناول بہت پڑھتا تھا۔ کبھی کہیں نکلتا بھی تو اپنے خاکی رنگ کے بوسیدہ بلیزر کے لمبے کوٹ میں کوئی نہ کوئی ناول ضرور ٹھونس لیتا اور جب کبھی اُسے موقعہ ملتا تو وہ اُسے پڑھنے بیٹھ جاتا۔ اتنے نشیب و فراز اور ناہمواری کے باوجود وہ بہت حد تک معقول اور انسان دوست تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کسی موضوع پر بھی ڈاکٹر دا کا فیصلہ ہم سبھوں کے لئے حرف آخر ہوتا۔ ایک بار باغی شاعر نذرل کی "ازلی محبوبہ" پڑھتے وقت اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں ــــ وہ پڑھ رہا تھا۔

"...... ابھی اور کتنے دن باقی ہیں۔

شاید میرے پہلو میں آنے سے پہلے میری آنکھیں بند ہو جائیں گی۔ میں ہر رنگ تمہاری محبت میں اشکبار رہا ہوں یہی وجہ ہے کہ آنسو کے قطرے تارے بن کر آسمان پر جگمگا رہے ہیں۔ جہاں بار بار میری زندگی کا چراغ بجھتا ہے مگر تمہیں دیکھنے کی اُمید میں میری آنکھیں بند نہ ہوئیں۔" اور میں نے دیکھا آنسو کے موٹے موٹے قطرے اُس کے پچکے ہوئے سیاہ گالوں کی کمزوری شکنوں میں پھیل گئے تھے۔ میرا جی اِس ویرانے میں نہیں لگا۔ ڈاکٹر دا بھی بالکل تنہا تھا وہ سب کچھ کہتا مگر اِس استفسار پر گہرا سکوت اختیار کر لیتا۔ کہ اُس کا اپنا کون ہے اور کہاں ہے؟

ویرانئ دل بڑھی تو میں گھر سے اپنے بیوی بچوں کو لے آیا۔ آتے ہی کدم کے شگفتہ پھولوں کی طرح معصوم شہاب ڈاکٹر دا سے بے حد مانوس ہو گیا۔ وہ میرے بچے سے بہلتا رہتا۔ اور میں اُس کے سکون سے مطمئن تھا۔ پھر بھی برابر میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ ڈھونڈھتا ہے۔ اُس کی تلاش ادھوری سہی مگر بے معنی نہ تھی۔

ہولی کے تیوہار تک دوپہر میں نیم گرم پُروائی بہنے لگی تھی کہ ہمارے بلاک میں ایک لیڈی ہیلتھ وزیٹر (LADY HEALTH VISITOR) آئی۔ کلپنا ادھیڑ عمر کی خشک عورت تھی۔ وہ کھنڈر کی طرح ویران تھی۔ اُس کی آمد نے ہم لوگوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی ــــ کم بخت فیاض تو تھا ہی غیر ذمہ دار۔ اُس کی پیاسی عادت کے لئے یہ گدلا پانی بھی بُرا نہ تھا ــــ سو وہ جب پینے کے قریب آیا تو کسی نے پیالہ ہی گرا دیا۔ اور وہ نامرادی کے عالم میں بڑی لمبی فرصت لے کر گڑھوا چلا گیا۔ کلپنا بھی چلی گئی اور سنٹر (CENTERE) پھر سے خالی ہو گیا۔ اس کی دیواروں

کی سفیدی قبل ہی ڈھنڈلا گئی تھی اور اب ترپال کی چھت میں جگہ جگہ شگاف بھی پیدا ہو گیا تھا۔ جن سے آسمان کی روشنی اُترتی تو کمرے کی زمین پر دائرہ سا بن جاتا۔ اور چھت سے زمین تک شعاعوں کا سفر جاری رہتا۔ جبکہ ہم سفر وہ ذرات ہوتے جو میرے بچے کو پہروں متحیّر کئے رکھتے تھے۔

جُون تک جنگل لیک اُٹھا۔ ڈاکٹر دا شہر گیا ہوا تھا۔ یہ اُسکا اپنا کام نہ تھا بلکہ حسب عادت وہ دوسروں ہی کے لیے پریشان تھا۔ اُس کے مزاج اور پیشے میں گہرا رابطہ تھا جگدیش کی بیوی کے بچہ ہوا تھا۔ یہ اُس کا دسواں بچہ تھا۔ جس میں چار مُہلک بیماریوں، بھوک اور بدحالی کے شکار ہو گئے تھے۔ باقی جو بچے تھے۔ اس میں بیٹیاں زیادہ تھیں۔ وہ بہت پریشان رہا کرتا تھا۔ جس کی سوہترا جوان ہو چلی تھی اور دفتر کا گنجا سپروائزر (SUPER VIS OR) جنتا داس کے یہاں بلا وجہ بہت آنے جانے لگا تھا۔ جگدیش کم تنخواہ اٹھانے والا پریشان حال کلرک تھا۔ وہ آج اِس لیے بھی زیادہ پریشان تھا کہ اُس کی رتنا کی حالت خراب ہو گئی تھی اُسے ٹٹنس (TETANUS) کی بیماری ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر دا کا شہر میں کوئی پرایا نہ تھا۔ کئی اچھے ڈاکٹر اُس کے اپنے تھے۔ اور وہ جب ڈاکٹر کو لے کر لوٹا تو بچہ رو رہا تھا اور ماں خاموش تھی —— کہتے ہیں بچوں کی آواز فرشتوں کی زبان ہوتی ہے۔ اُس دن کانی لو چلی تھی۔ شام ڈھلے ندی کے کنارے سُرخ ہو گئے تھے۔ سورج ڈوب چلا تھا اور چِتا کی راکھ میں چنگاریاں بجھنے لگی تھیں۔ پھر نہ دھواں تھا نہ کوئی روشنی تھی۔ بس ایک اندھیرا تھا جسے جگدیش سے زیادہ ڈاکٹر دا سمجھ رہا تھا کہ وہ غم نصیب ہوتے ہوئے بھی سب کا غمخوار تھا۔

رتنا کی موت نے ڈاکٹر کے دل پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ کچھ دن تک تو اُس نے نہ تاش ہی کھیلا اور نہ ناول پڑھا۔ بڑا اُداس رہا کرتا تھا۔ پھر میں نے سکوت توڑا ——

"ڈاکٹر دا"

"کی" ؟

"تم خاموش رہے گا تو ہم سب نہیں آئے گا۔ یہ لوچلا"

اور اُس نے بڑھکر ہم سبھوں کا راستہ روک لیا۔ اُس کی بھوری آنکھیں ہم سبھوں میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ وہ خاموش تھا مگر ہم سب سُن رہے تھے۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو ——

"سپنے، سرتو، سامنتا میں زندگی کے راستے پر منہ کھولے ایک پرانی قبر ہوں جہاں مکڑیوں نے حادثات کے گھنے جالے بُن رکھے ہیں۔ اور جن کی تاریک گہرائیوں سے جھنکی آتا جھانکتی ہے۔ یہاں کوئی نہیں رُکتا۔ سب بھاگ جاتے ہیں کہ یہ ایک آسیبی بنجر زمین ہے۔ تم سب بھی اُکتا گئے۔ کترائے۔ مگر ایک بار مجھے سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ بس ایک بار۔" اور وہ رات درحقیقت ہم سبھوں پر بڑی گراں گزری۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر دا کے غم کا کانٹا اُس کی گھائل شخصیت کی گہرائیوں میں روز بروز دھنستا ہی جا رہا ہے ——

پھر بھی اُس کی بے پناہ اُداسیوں کا راز ہم سبھوں کے لئے راز ہی رہا۔ ہم جب اُس کے کوارٹر سے لوٹ رہے تھے تو زرد چاند پُرانے ساگوان کے درخت کی اوٹ میں جُھک گیا تھا۔ بورال کا کُتا میرے پیچھے پیچھے زبان نکالے بھاگتا آ رہا تھا۔ چاندنی میں میڈوں کی گھاس پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ میں نے بجھی ہوئی سگریٹ کو پرے پھینک دیا۔ گھر قریب تھا۔ کُتا لوٹ گیا۔ مجھے نیند نہ آئی۔ ڈاکٹر کی کڑوی کافی کی تلخی کا احساس ہنوز میرے حلق میں پھنسا تھا۔

آج بلاک میں گرام پنچایت کی اہم میٹنگ تھی۔ کئی گاؤں کے مکھیاؤں کا اجتماع تھا۔ کچھ ترقیاتی پروگراموں کو زیرِ بحث لایا گیا تھا۔ دوپہر کی دھوپ بلاک آفس کے سبز میدان میں اچھی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک لاتھ کے مکھیا مدن یادو نے میٹنگ کا رُخ ہی بدل دیا۔ بات بس اتنی تھی کہ دھنیت اہیر کی چھوکری نگیا نے علاقے بھر کو کافی پریشان کر رکھا تھا۔ کم بخت پر جوانی کیا آئی تھی کہ تنگ ندی میں اچانک سیلاب آ گیا تھا۔ جدھر مُڑتی کنارے کاٹ لے جاتی۔ اُس کا حُسن ساون کی پورنیما تھا۔ گاؤں میں یہ بات عام ہو چلی تھی کہ نگیا بن بیاہے ماں بننے والی ہے۔ گاؤں کی عزت جب پنچایت میں آئی تو

مقدمے کے فیصلے کو آخری شکل دینے سے قبل نگیا کی ڈاکٹری جانچ کو ضروری جانا گیا۔ غریب دھنیت کی آہ و فغاں کو کسی نے نہیں سُنا۔ ٹھیک اُسی وقت پنچایت گھر کے تنگ اسارے میں نگیا نے قے کی۔ اُس کی طبیعت ہمیشہ مالش کرتی رہتی تھی۔ وہ بیمار سی تھی۔

جمعہ کے دن ڈاکٹر دا نے اُس کا مُعائنہ کیا۔ اِدھر سارا گاؤں ایک اعلان سُننے کے لئے بے چین تھا۔ نگیا کا گناہ سوچا سمجھا ہُوا تھا۔ اب اُسے صرف ڈاکٹری سند ملی تھی۔ اُس دن شام کو تھوڑی بارش بھی ہوئی تھی۔ پھُوس کی جھونپڑی میں چھوٹی ٹِبّتی والا دُھندلا دِیا جل رہا تھا۔ باہر مکھیا گرام سیوک، ساہوکار اور چوکیدار کے علاوہ بہُت سے دوسرے لوگ بھی کھڑے تھے۔ نگیا اپنی غُربت، افلاس اور بہُت سی کمزوریوں کی وجہ سے ہر کسی کے ہاتھ کا کھلونا بنی ہوئی تھی اور بڈھا دھنیت لاج کے سمندر میں شکستہ تختے کی طرح بہہ رہا تھا۔ اُس دن ڈاکٹر دا کے جذبات کا عجیب عالم تھا۔ اندر کچھ عورتیں تھیں جو ناک سمیت اپنا آدھا چہرہ بوجہ نفرت اپنے بدبُودار آنچل سے ڈھکے تھیں ـــ جیسے آج نگیا کے سوا ہر عورت تقدیس و تکریم کے لائق تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر دا باہر آیا۔ اُس نے فکر آمیز لمبی سانس لی۔ پھر آلہ لمبے کوٹ کی مختصر جیب میں ٹھُونستے ہوئے کہنے لگا۔

"مادَن بابو ناگتی بیمار ہے"

"تو سالا سچ نِکلا" نندو کی ہُوک جاگی۔

"کا سچ نِکلا بابا۔ تُم لوگ بکتا ہے۔ اُس کو بھیتر میں لڑیکا ناہیں ہے۔ اُس کا پیٹ میں گولا ہے۔ اور تو کوئی بات ناہیں" یہ بھی کچھ لوگ دِن انگلیوں پر گن رہے تھے۔ وہ ناحق کسی تباہی کے منتظر تھے۔ نگیا کا اعتماد اٹل تھا۔ ڈاکٹر دا بھی اُس دِن سکون کی نیند سویا۔

آج بھی ہر روز کی طرح بس دیر کرکے آئی۔ تمام مسافروں کے بعد ایک عورت اُتری۔ سانولی رنگت اور سیاہ بالوں والی کم سِن عورت جس کی غلافی آنکھوں میں کاجل کے باسی ڈورے تھے، زعفرانی رنگ کی ہینڈلوم ساڑی میں ملبوس تھی۔ اُس کا جسم اپنی ساخت کے اعتبار سے دو حصّوں میں منقسم تھا۔ اُس کی تعمیر میں عجیب تناؤ اور کشش تھی۔ جیسے سفید پتھر میں ترشا ہوا اطالوی مجسّمہ ہو۔ جیسے سنگ تراش نے کچھ اس طرح جنم دیا تھا کہ عورت کے جسمانی نقوش صاف اُبھر آئیں اور اُس کا مقصد تخلیق سمجھ میں آنے لگے۔ وہ بلند و بالا، توانا و تندرست تھی جیسے کسی مندر کا جگمگاتا کلس ہو۔ راستے کی گرد نے اُس کے چاند سے چہرے کو دھندلا دیا تھا۔ اور جب اُس نے چہرے سے گرد صاف کی، تو کرنوں کو اِس چاندنی میں نیند سی آنے لگی۔ بس خالی ہو چکی تھی۔ مسافر جا چکے تھے اور گرمی کی دوپہر میں راستے پھر ویران ہو گئے۔ وہ پتہ پوچھتی ہوئی سنٹر کی طرف چلی گئی۔

ڈاکٹر دا کئی روز سے بیمار تھا۔ اُس کے سرہانے کی کھڑکی کھلی تھی۔ اور قریب ہی کسی گھنے درخت سے امر لتا کی سبز بیل لپٹی ہوئی تھی اور جس کے کچھ حصّے ڈاکٹر دا کی کھڑکی تک جھک گئے تھے۔ اُس نے جو دوا پی تھی اُس کی تلخی اُس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اُس کا ہم عمر چپراسی اُس کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ اُس کی خاموشی خود اُس کے لئے اکتاہٹ پیدا کر رہی تھی۔ اُس کی بڑھی ہوئی داڑھی اور بے ہنگم بالوں نے جس میں سفید اور سیاہ رنگ کا قدرتی امتزاج تھا۔ عجیب بھیانک پن پیدا کر رکھا تھا۔ ٹیبل کا بوسیدہ لیمپ بھی اس کے حالات کی نمائندگی کرتا نظر آ رہا تھا۔ اور اندھیرے اُجالے کی اِس ملی جُلی کیفیت میں وہی عورت ڈیوٹی جوائن کرنے آئی۔ تو ڈاکٹر دا ایک دم سے چونک پڑا۔ پلنگ پر نیم دراز ہو کر اُسے دیوانوں کی طرح گھورنے لگا۔

"تم۔ مونا ـــ ؟"

"نمستے ـــ سر میں مونا نہیں منا کشی ہوں" اُس نے نبض پر ہاتھ رکھ کر ڈاکٹر کے بخار کا اندازہ لگانا چاہا۔ ڈاکٹر ہنوز کھویا کھویا سا تھا۔ منا کشی کچھ نہ سمجھ سکی۔

رفتہ رفتہ ڈاکٹر نے صحت پالی۔ اُس کی صحت کی واپسی میں مِناکشی کی تیمارداری اور جذباتی تعلق کو بھی بڑا دخل تھا۔ اُس میں بہت سی غیر متوقع تبدیلیاں بھی عود کر آئیں۔ اُس کی اُداسی دُور ہو گئی۔ اور اب جب کبھی وہ تاش یا چوسر کھیلنے بیٹھتا تو بازی ہارنا بھول گیا تھا۔ اُس کے خاکی بلیزر کے لمبے کوٹ میں کوئی ناول بھی نہیں رہتا۔ جیسے اُس کا مطالعہ مکمل ہو گیا ہو۔ ڈاکٹر میں اتنا بڑا انقلاب لوگوں کے لئے بہت دنوں تک پہیلی ہی بنا رہا۔ نہیں ثابت ہو سکا۔ دھیرے دھیرے محلیں ویران سی ہو گئیں۔ نہ تاش، نہ چوسر نہ چائے ڈاکٹر زیادہ تر باہر ہی رہتا۔ ڈاکٹر انجام سے بے خبر مناکشی میں ڈوبتا چلا گیا۔ مِناکشی اِس لئے خوش بھی کہ اُس کا باس اُس سے خوش تھا۔ پھر بھی وہ یہ نہ سمجھ سکی کہ سونا کون تھی اور ڈاکٹر نے ایامِ علالت میں اُسے سونا کیوں جانا ـــــ دوسرے وہ اِس لئے بھی اِس زندگی سے مطمئن تھی کہ ایک دفعہ کسی نجومی نے اُسے بتایا تھا کہ سترہ سے بائیس سال کی عمر تک وہ عظیم غم اور بے انتہا خوشی دونوں دیکھے گی۔ اُس کا غم اُس کے طلاق شوہر کی اچانک موت تھی اور اُس کی خوشی ـــــ شاید زندگی کا یہ نیا موڑ ہو۔ اور وہ ڈاکٹر کی قربت کے احساس سے شرما گئی۔ ٹھیک ہے۔ اُبھرتے سُورج سے ڈوبتا سُورج زیادہ قیمتی اور قابلِ دید ہوتا ہے۔ اُسے یہ سوچ کر بڑا سکون ملا۔

اِدھر ڈاکٹر کے رہائشی پروگرام میں بھی بڑی قاعدگی آ گئی تھی وہ روز صبح سویرے اپنے پچکے ہوئے سیاہ گالوں کو پھلا پھلا کر شیو بناتا تھا۔ صابن سے نہاتا اور سر میں جو خشک جزیرے کی طرح برہنہ تھا گھنٹوں لوما (LOMA) ملتا رہتا۔ وہ ہزار سال پُرانے پتھر پر زعفران کی کھیتی سبز کر رہا تھا۔ ایک دفعہ سرجو نے تو نہایت تلخ انداز میں ڈاکٹر دادا پر بھرپور طنز بھی کیا مگر وہ حسبِ عادت صرف مسکرا کر رہ گیا۔

"ڈاکٹر اگر دمے کا مریض تیر کر انگلش چینل پار کرنے کی سوچے تو انجام کیا ہوگا؟"

"ڈوب مرے گا۔"

"تو تم بھی ڈوب مرو ڈاکٹر۔" سامنتا نے جیسے ڈاکٹر کو گالی دی۔ مگر اب وہ موت کے سوا زندگی کا ہر انجام برداشت کرنے کو تیار تھا۔

ـــــ اور ایک شام یہ خبر جنگل میں وحشی آگ کی طرح پھیل گئی۔ کہ ڈاکٹر دیبن بورال مناکشی کو نکال لے گیا۔ اور سنیے تو کچھ اِس طرح کہہ رہا تھا جیسے رات اُس کے ہاں ڈاکہ پڑا ہو۔ اور وہ شدید زخمی ہو کر پولیس کو اپنا بیان دے رہا ہو۔ غم یہ نہ تھا کہ ڈاکٹر جو اِس قدر شریف اور قابلِ اعتماد تھا کس طرح اِس عمر میں مناکشی کے جال میں پھنس ذِلت کے اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اُس نے سونے کے پیالے سیاہ زہر پیا تھا ـــــ بلکہ لوگوں کو دُکھ اِس کا تھا کہ مناکشی نے بہت عجلت سے کام لے کر غلط انتخاب کیا تھا۔ بھلا ڈاکٹر میں کیا دھرا تھا۔ برسا ہوا بادل جو نہ آسمان کی زینت ہوتا ہے اور نہ زمین کی رحمت۔ یا گیلی لکڑی جو تیز آنچ پر بھی نہیں سُلگ سکتی۔ گویا اُمیدواروں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ میرا اپنا حال بھی کچھ عجیب تھا۔ پھر بھی میں واقعہ کی تہہ جاننے کے لئے بے چین رہا۔ ہاں اِس واقعہ کے بعد شہاب میاں کی ماں کی نگرانی مجھ پر کچھ زیادہ ہونے لگی تھی:

اِس کے بعد بلاک میں سوائے ویرانی کے کچھ نہ بچا تھا۔

کافی عرصہ گذر گیا۔ مگر ڈاکٹر دادا نہیں لوٹا۔ کچھ دنوں تک تو اُس کے متعلق بلاک میں طرح طرح کی افواہیں پھیلتی رہیں۔ پھر سمندر شانت ہو گیا۔ ایک مدت کیا اب بھی ڈاکٹر کی کمی کا احساس سبھوں کو تھا۔ گناہ کے مقابلے میں ثواب زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ اِس کا محاسبہ مشکل تھا کہ ڈاکٹر زیادہ مجرم تھا یا ملزم۔ ایک دن میں اپنے بیمار بچے کو صحرا لئے جا رہے کی دھوپ کھا رہا تھا کہ ڈاکیہ نے زنجیر ہلائی دروازہ کھلا اور وہ سامنے تھا۔ اُس نے مجھے ایک لفافہ دیا۔

خط پا کر میں چونک پڑا۔ ڈاکٹر دادا کی مختصر تحریر سامنے تھی۔ جس میں مقام اور تاریخِ تحریر نہیں درج کیا گیا تھا۔ لکھا تھا ـــــ "میں بہت دُور نکل آیا ہوں جہاں سے لوٹنا ممکن نہیں۔ تم لوگ میرے متعلق کچھ بھی سوچ کر ناحق اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ کچھ دن ہوئے میں نے ایک بکس تمہاری ...

(بقیہ صفحہ ۶۶ پر دیکھئے)

روشن آرا نیر

خلش

نازش کی اُنگلی کٹ گئی

حویلی میں جیسے بھونچال آگیا، جیسے دیکھئے وہ حواس باختہ تھا۔ حواس کھو بیٹھنے والوں میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی، بوڑھے بھی تھے جوان بھی۔ کوئی اسپرٹ کی بوتل لئے تو کوئی شنگرف اور بنڈیج لئے دوڑا جارہا ہے۔ پوری حویلی میں گویا ایک طرح کی بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔

نازش کی انگلی کٹ جانا کوئی معمولی حادثہ تو تھا نہیں کہ فراموش کردیا جاتا۔ بلکہ کینڈی کی ہمت جس طرح ساری دُنیا میں ذہنی خلش چھوڑ سکتی ہے ویسے ہی نازش کی انگلی کا کٹ جانا بھی حویلی والوں کے لئے پریشانی اور ذہنی خلش سے کچھ کم نہ تھا۔ نواب عنایت اللہ کے بھی تو ایک لڑکی تھی جو پیر منگل کی دعاؤں سے شادی کے چار سال بعد ہوئی تھی۔ والدین کی محبت میں بیٹی اور بیٹا دونوں کا ایک ہی درجہ ہوتا ہے۔ پھر کیوں نہ اس حادثے کی خبر ویسا ہی اثر رکھتی جب کہ نازش کے نیچے نوکروں کی ایک پلٹن اور ہمدردی کے لئے نواب کا پورا خاندان حویلی میں موجود تھا۔

نواب صاحب دیوان خانے میں گاؤ تکیہ لگائے اپنے دوستوں کے ساتھ شطرنج پر گھوڑے دوڑا رہے تھے جس پر اُن کے باپ بھی زندگی کی بازی لگا کر گذر گئے تھے۔ یہ منحوس خبر جب انہیں ملی تو وہ بے تحاشہ ننگے سر ننگے پاؤں اپنے بھاری بھرکم جسم کو لیے زنانہ خانے کی طرف دوڑ پڑے۔ انہیں اِس بات کا بھی ہوش نہیں رہا کہ زنان خانے میں کسی کو آواز دیکر یا کھنکھار کر ہی جائیں تاکہ پاس پڑوس کی آئی ہوئی بیبیاں پردہ کرلیں۔ ان لوگوں نے جب نواب صاحب کو دیکھا تو جھٹ اوٹ میں ہو گئیں۔ بعض نے تو گنبت ہی سے پردہ کرلینا مناسب سمجھا۔

میری بچی تجھے کیا ہوا۔ تونے کیسے اپنی انگلی تراش لی؟ نواب صاحب نازش کے گورے گورے ملائم ہاتھ کو پکڑ کر بے قراری سے بولے۔ اُن کی تھکی ہوئی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔

"کچھ نہیں ابّو۔ ناخن کاٹ رہی تھی کمبخت بلیڈ گوشت میں اُتر گئی"۔ اُس نے جواب دیا۔ اُس کی خوب صورت انگلیاں پر خون کے پھیل جانے سے سُرخی چھا گئی تھی۔

"میری تو جان ہی نکل گئی بہن۔ جانے کون سی منحوس گھڑی میں لاڈو ناخن کاٹنے بیٹھی تھی"۔ نواب صاحب کی بڑی بہن عزیزہ نے جو نواب صاحب کو بچپن ہی کے نام سے پکارتی تھی، محبت جتائی۔ "اللہ نہ کرے میری لاڈو کو کچھ ہو جاتا تو..... مولیٰ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے"۔ انہوں نے شکر کے لئے ہاتھ اُٹھا کر دعائیں مانگیں۔

"اور بھائی جان"، چھوٹی بہن نے فوراً کہا۔ "اللہ کی قسم جب رحیمہ نے یہ جان لیوا خبر لا کر دی تو میں اس وقت منے کے ابّا کے لئے بادام کا شربت تیار کروا رہی تھی۔ سب کچھ چھوڑ اپنی لاڈلی کو دیکھنے آگئی"۔ فرزانہ بیگم نے نواب صاحب کو گویا یقین دلانا چاہا کہ وہ آپا جان سے زیادہ نازش کو چاہتی ہیں۔ وہ نازش کو بڑی پیاری پیاری نگاہوں سے دیکھے جارہی تھیں جیسے قصاب کسی تندرست بکرے کو ذبح کرتے وقت آمدنی کے متعلق مسکرا مسکرا کر سوچا کرتا ہے۔

"مجھے کیا خبر تھی۔ شرفا نے جب کہا تو میرے اوسان خطا ہوگئے" نواب صاحب بولے۔ "یا خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے جو تونے اپنے کرم سے میری بچی کو بال بال بچا لیا۔ دیکھو بھئی نازش اب ہر کام میں احتیاط برتنی چاہیئے"۔

"اور نہیں تو کیا" فوزیہ بیگم بولیں "کوئی بچہ تو رہی نہیں خدانخواستہ اگر انگلی اُتر جاتی تو .... ؟

"اے ہے۔ آپا جان" نازش کی امی حمیدہ بیگم جو اب تک خاموش تھیں ترش لہجے میں بولیں "بھلا یہ بھی کوئی اول فول بکنے کا وقت ہے۔ میری جان نکلی جا رہی ہے۔ اور آپ ہیں کہ جو کے لگائے جا رہی ہیں" فوزیہ بیگم کے تیور بگڑ گئے۔ لیکن نواب صاحب کی موجودگی میں وہ کوئی نامناسب بات نہ کہہ سکیں۔ حمیدہ بیگم نے بیٹی سے بڑے ہی شفقت سے پوچھا "کیسی طبیعت ہے بیٹی ؟"

"ٹھیک ہوں امی۔ درد تو چلا گیا البتہ چپکیں اُٹھتی ہیں" وہ ایک سسکی لیکر بولی۔ "میں ڈاکٹر کے یہاں سے خود جا کر دوائی لے آتا ہوں بیٹی۔ انشاءاللہ چپک بھی جاتی رہے گی۔ نواب صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔

چھوڑیئے بھی ابو۔ اب تو ٹھیک ہی ہوں۔ خوامخواہ زحمت سے کیا فائدہ۔ نازش نے کہا۔ "تم چپکی بیٹھی رہو" امی نے ہلکے سے پیار بھری ڈانٹ سُنائی۔ "ارے اشرف۔ دیکھنا تو ڈاکٹر مطب میں ہے ؟"

"جی۔ ابھی جاتا ہوں" اشرف جیسے موقع کے انتظار میں تھا۔

"امی۔ اشرف بھائی کو کیوں تکلیف دے رہی ہیں۔ مجھے نیند آ جائے تو طبیعت کی ناسازگی بھی ختم ہو جائے گی۔ اور چپک بھی جاتی رہے گی۔ نازش نے امی سے کہا۔

امی نے اشرف کو ڈاکٹر کے یہاں جانے سے روک دیا۔ اور وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اُن کی دیکھا دیکھی آنِ واحد میں کمرہ خالی ہو گیا۔ سوائے اشرف اور جمال کے۔

جمال نواب صاحب کی بڑی بہن فوزیہ بیگم اور اشرف چھوٹی بہن فرزانہ کا لڑکا تھا۔ عمر میں ایک دوسرے سے سال دو سال کے چھوٹے بڑے تو تھے لیکن قد میں چھوٹے بڑے کی کوئی خاص گنجائش نہ تھی۔ ایک اعلیٰ خاندان کے کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ ہونے کی وجہ سے جہاں ان میں کشش اور طور طریقے میں سلیقہ تھا تاہم نوجوان تھے اور اُن کے جذبات بھی عام نوجوانوں کی طرح تھے

نازش نے جب سے اپنے آپ کو کمرے میں قید کر لیا تھا آج ایک ماہ کے بعد انگلی کے کٹ جانے سے موقع ملا تھا۔ جمال نے کچھ کہنے کا قصد ہی کیا تھا کہ نازش بیچ میں بول پڑی "بھائی صاحب! میں ممنون ہوں کہ آپ لوگوں نے میرے لئے تکلیف کی۔ ایک احسان اور کریں۔ مجھے آرام کی سخت ضرورت ہے اگر تنہا چھوڑ دیں تو نوازش ہوگی" اُس نے خشک لہجے میں کہا۔

"توبہ۔ توبہ۔ کیسی باتیں کرتی ہو نازش" جمال نے جلدی سے کہا "جب سے تم نے اپنے آپ کو قید کر لیا ہے۔ خدا گواہ ہے کہ ہمیں ایک پل بھی چین نہیں۔ تم آرام کرو۔ ہم لوگوں کی مسرت تو تمہارے ہی دم سے ہے"۔

"بالکل۔ بالکل" اشرف یہ موقع جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ "ہم لوگوں نے تم پر کون سا احسان کیا ہے۔ بلکہ تمہارے احسانات کے نیچے ہم دبے ہوئے ہیں۔ نازش کوئی معقول جواب دینے ہی کو تھی کہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔

وہ کمرے میں اکیلی تھی۔ اُس نے دروازہ بند کیا اور اپنی انگلی کو بغور دیکھنے لگی۔ مخروطی اُنگلی پر بنڈیج کسی ہوئی تھی ٹنچر کی بُو اُٹھ رہی تھی۔ اُس نے بُو کی تلخی کو دُور کرنے کے لئے بجلی کے پنکھے کا بٹن دبا دیا ایک گھر گھر کی آواز ہوا کے ساتھ پھیل گئی۔

نازش کے دماغ میں جمال اور اشرف کے کہے الفاظ گونج رہے تھے۔ ایسا بھی نہ تھا کہ وہ بالکل عقل کی کچی تھی۔ وہ ان کے مقاصد و اغراض کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اُن کے خلوص کے پیچھے نازش کو وہ ناپاک جذبہ دکھائی پڑتا جو زمانے کی ریت ہو چلا ہے۔ پھوپھیوں کی محبت اور خلوص بھی دکھاوے کے تھے بظاہر وہ محبت دکھاتیں۔ لیکن باطن میں وہ کیا تھیں یہ نازش بخوبی جانتی تھی۔ ایکبار اُس نے خود ابو کو امی سے کہتے سنا "اجی سنتی ہو۔ نازش کی شادی اگر جمال یا اشرف سے کر دی گئی تو کیسا رہے ؟"

"توبہ آپ کو دن رات یہی سُوجھا کرتا ہے۔ بھلا کون سی ایسی جلدی پڑ گئی ہے کہ نازش کی شادی کر دی جائے

بیگم ترش روئی سے کہتیں "ابھی عمر ہی کیا ہوئی ہے جب ہم کسی شادی کریں گے تو کیا جمال اور اشرف سے اچھا لڑکا ہی نہ ملے گا؟"

"اُف"۔ نواب صاحب جھنجھلا جاتے "میرا یہ کہنے کا مقصد نہیں تھا۔ بلکہ جمال یا اشرف کسی سے بھی نازش کی شادی کر دی جائے تو بہتر ہے۔ کیونکہ گھر کی لڑکی گھر ہی میں رہے گی۔ تینوں بچپن کے ساتھی ہیں۔ ایک دوسرے کے مزاج کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ پھر ہمارے بعد اتنی بڑی جائداد اور اس عالی شان حویلی کا مالک کون ہوگا۔ کون جانے باہر کا لڑکا کیسا ہو۔ گھر کے لڑکے پر تو مجھے پورا اعتماد ہے۔"

"تو کر دیجئے نا شادی۔ آپ کو روکتا کون ہے۔ اپنوں میں خوب موج کریگی" حمیدہ بیگم نواب صاحب کو جل بھن کر جواب دیتیں۔

نواب صاحب ان کی خفگی پر بے اختیار مسکرا پڑتے اور انہیں چھیڑنے کے انداز میں کہتے "خیر تمہاری مرضی۔ اب یہ بتاؤ کہ تم روز بروز جوان کیوں ہوتی جا رہی ہو؟ تو بہ ہو گئی۔ گھر میں جوان لڑکی بیٹھی ہے۔ بڈھے ہو چلے مگر چونچلے ختم نہیں ہوتے" وہ شرما جاتیں۔ اور مصنوعی غصہ دکھاتیں۔

نازش مزید آگے کچھ سُنے بغیر کھسک جاتی۔ وہ اپنی امی کے خیال سے متفق تھی۔ جمال اور اشرف سے اُسے شدید نفرت تھی۔ دونوں اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے اور ایک باشعور لڑکی کی طرح وہ بھی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی۔ دونوں اُس سے نہیں بلکہ اس کی دولت اور حویلی سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور یہی خاص وجہ تھی کہ بلا ناغہ دونوں پھوپھیوں میں جھگڑے ہوتے گو کہ دونوں سگی بہنیں تھیں لیکن دولت۔ ؟

لفظ دولت ہر چیز میں تغیر پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ سے ہر شے میں نمایاں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اس میں نہ تو انسانیت ہی پائی جاتی ہے اور نہ انصاف۔ یہ انسانیت اور انصاف دونوں سے عاری ہے۔ اپنی بے پناہ طاقت سے حیوان اور انسان کو ایک کر دیتی ہے۔ یہ بادشاہ کو فقیر اور فقیر کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔

انسان فطرتی طور پر بالکل آزاد رہنا پسند کرتا ہے لیکن نازش کیلئے اشرف اور جمال دو ایسے مستعد باڈی گارڈ تھے جن کا نازش کے ساتھ پایا جانا کوئی خاص بات نہ تھی۔ پر یہ باڈی گارڈ نازش کے لئے ٹریجڈی بن گئے رہتے۔ اگر وہ دودھ پیتی بچی ہوتی تو اُسے اتنا غم نہ ہوتا۔ وہ تو اٹھارہ سال کی ایک مکمل دوشیزہ تھی یا یوں کہیئے کہ ایک نواب خاندان کی دوشیزہ میں جن خوبیوں کا پایا جانا لازمی ہوتا ہے وہ سبھی خوبیاں بدرجہ اتم اُس میں موجود تھیں۔ مثلاً وہ بی اے پاس تھی۔ رنگ بالکل صاف تھا۔ تیکھے نقوش تھے۔ بڑی بڑی سحر انگیز آنکھوں میں جہاں جھیل کا سا سکوت تھا وہیں شوخی بھی ویسا ہی مقام رکھتی تھی۔ جیسے کسی شریر بچے نے پتھر مار کر جھیل کی خاموشی کو........ شوخ، چنچل لہروں میں بدل دیا ہو۔ کالج کے ماحول میں رہ کر پڑھی ہوئی لڑکی یہ کیسے برداشت کر لیتی کہ اُس کے پاؤں میں خیالات و آزادی میں بیڑیاں ڈال دی جائیں۔ بس خود مختاری کا احساس ہوتے ہی عورت کی خودداری جوش میں آگئی! اور وہ اٹھارہ سال کی دوشیزہ سے تیس پینتیس سال کی ایک عورت بن گئی! اور اس عورت کا پہلا حملہ اشرف اور جمال پر ہوا۔ کامیابی تھی نفرت۔ عورت کی عظیم الشان فتح! ایک دفعہ اشرف تنہائی پا کر نازش کی خوبصورتی کی تعریف کرنے لگا لیکن نازش کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اُلٹی وہ درشت لہجے میں بولی "اشرف بھائی۔ غیر ضروری باتوں سے پرہیز کیا کریں تو بہتر ہے۔ اس قسم کی باتیں مجھے بدتمیزی ہی لگتی ہیں۔" نازش کی طرف سے خشک جواب سُن کر وہ خاموش ہو گیا۔ اُس دن سے پھر کبھی اشرف نے ہمت نہیں کی۔ جمال بھی موقع بموقع اپنی حرکتوں سے نازش پر محبت کا عکس ڈالنے کی سعی کرتا۔ لیکن نازش تھی کہ لوہے کا مجسمہ۔ ہمت افزائی تو درکنار مسکرانا بھی گوارا نہ کیا۔ جو لڑکیوں کی ایک خاص ادا یا عام سی عادت ہوتی ہے۔ جذبات کی اس پامالی کے بعد جمال اور اشرف دونوں

خاموشی سے آنے والے دن کے منتظر ہو گئے۔ جب نازش دلہن بن کر آئیگی تو ......؟

کالج کی بیوٹی کوئین نازش جو سنجیدگی بہ خامہ عبور رکھتی تھی اور جب شوخ ہو جاتی تو اس کی شوخی پر گلشن کے پھول شرما کر سمٹ جاتے۔ اپنے جوان و گداز جسم میں بلا کی سیکس اپیل رکھنے والی سیاہ زلفوں میں مدھر گیت کا پیغام لیے سب کی بڑی بڑی نیلگوں آنکھوں میں تجسس بھی ہوتا اور جذبات کے شعلے بھی اس کے باوجود نازش کے دل میں کبھی کبھی ہلکا سا درد ہونے لگتا۔ وہ تڑپ جاتی۔ لبوں پر خشکی آجاتی۔ آنکھوں میں ویرانی چھا جاتی۔ چہرہ سپید ہو جاتا لیکن دل نے ہنوز کسی کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ پھر بھی خیال کے پرتو سے دل و دماغ میں ایک نقطہ نمودار ہوتا جو پھیلتے پھیلتے ایک انسانی ہیولہ بن جاتا اور وہ ہیولہ بچپن کے ساتھی ہاشم کا ہوتا۔ اس کے نام سے نازش پر لرزہ سا طاری ہو جاتا اور وہ جذبات سے مغلوب ہو کر سر کو کسی چیز پر دے مارتی۔ درد کی شدت خیالات کی حدت کو دبوچ لیتی۔

ہاشم بوا رحمانی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بوا نواب صاحب کے یہاں کی خاندانی نوکرانی تھی جب جوان ہوئی تو نواب صاحب کے والد جمال الدین نے اس کی شادی ایک کھاتے پیتے گھرانے میں کر دی لیکن ہائے رے قسمت! ہاشم کی پیدائش کے چند مہینوں کے بعد اس کے شوہر کا اچانک ہارٹ فیل ہو گیا اور بوا رحمانی پھر سے روتی دھوتی نواب صاحب کی حویلی پر آ گئی۔ ہاشم نے جب حویلی کی فضا میں آنکھیں کھولیں تو اسے ایک ساتھی ملا۔ بچپن کی نازش آئینہ کسی ساتھی کا انتظار کر رہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور بے لوث جذبات نے انہیں اکٹھا کر دیا۔ بچپن ہی سے ہاشم اور نازش کا ساتھ رہا۔ چونکہ وہ شروع ہی سے ذہین اور اپنے اندر بلا کی کشش رکھتا تھا اس لئے امیری اور غریبی کے باوجود نازش پر کوئی پابندی نہ ہوئی۔ دونوں ایک ساتھ کھیلتے آپس میں جھگڑتے اور نہ جانے اسی دوران میں جمال اور اشرف

بھی مع اپنے والدین کے حویلی کی ویرانی ختم کرنے آدھمکے۔ اشرف اور جمال شروع ہی سے امیرانہ ٹھاٹ باٹ اور اس کے رکھ رکھاؤ کے عادی تھے لہٰذا انہیں اس بات کا احساس تھا کہ غریب لڑکوں کے ساتھ رہنا ایک گناہ ہے عادات و اطوار کے بگڑ جانے کا خدشہ ہے۔ اس ذہنیت میں ان دونوں بچوں کا کوئی قصور نہ تھا بلکہ وہ جس امیرانہ فضا میں پرورش پا رہے تھے یہ اس کا قصور تھا اور دولت مند طبقہ کبھی غریب کی خیر خواہی یا اپنے قریب آنے کی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ اس طرح سوچنا ان کے خیال کی بہت بڑی گستاخی مانی جاتی۔

جمال اور اشرف نے جب نازش کو ہاشم کے ساتھ دیکھا انہیں یہ بات بہت بری لگی۔ ذہن کے اندر اصول کے کیڑے خود بخود رینگنے لگے۔ ایک نواب کی لڑکی ہو کر نوکرانی کے لڑکے کے ساتھ کھیلے؟ ان پر امارت کا نشہ طاری تھا۔ اس لئے وہ کبھی کبھی موقع دیکھ کر ہاشم کو ڈانٹ دیتے۔ اور ایک دو ہاتھ لگا دینے سے بھی نہ چوکتے۔ ان کی دیکھا دیکھی نازش بھی ہاشم سے نفرت کرنے لگی۔ نفرت کا یہ نشہ معصوم دماغ کے تاریک گوشوں پر ڈیولپ ہوتا گیا۔ ہاشم معصوم نگاہوں سے ان کو دیکھتا۔ ڈبڈبائی آنکھیں لئے گھر جاتا جہاں وہ اپنی ماں سے لپٹ کر زار و قطار روتا۔ اور اپنی ناعقلی کی بنا پر خوب مار کھاتا۔ بعد کو ماں کی ممتا جب جوش میں آتی تو وہ اسے اپنے کلیجے سے بھینچ لیتی اور بڑی شفقت سے کہتی "میرے بیٹے! وہ لوگ نواب ہیں۔ اور تو ایک معمولی نوکرانی کا لڑکا۔ بھلا تیری اور ان کی جوڑی کیسی ہم تو ان کے پیر کی جوتی بھی نہیں۔ جس سے نہ سکے اس کے ساتھ کھیلا کر۔

"ماں! نازش کہتی ہے۔ تیرے کپڑوں سے بدبو آتی ہے وہ مسک کر کہتی۔ ہار بیٹے! وہ سچ کہتی ہے غریب کے کپڑوں سے مفلسی کی بو آتی ہے۔ مت کھیلا کر میرے بچے" ماں اسے سمجھاتی۔ سمجھانے کا اثر کچھ دنوں تک اس پر رہتا۔ کچھ دنوں تک دونوں میں گفتگو نہ ہوتی لیکن

ش بہر حال نازش بھی اُسے منانے میں کامیاب ہوجاتی
ور وہ سب کچھ بھول کر پھر سے ساتھی بن جاتا۔
رفتہ رفتہ غریبی کے مصائب نے ہاشم کے دماغ میں وہی
مخصوص سوال کر ڈالے جو ہر غریب کا بچہ ہوش میں آنے کے
بعد سوچا کرتا ہے اور وہ سوال ہوتا ہے۔ ہم انسان ہو کر
نفرت کی نگاہوں سے کیوں دیکھے جاتے ہیں۔؟ اس کے
دماغ نے اچھی طرح سے امیری اور غریبی کے تضاد کو سمجھ لیا غربت
و افلاس جب چیخنا چاہتے ہیں تو دولت کی کھنک کسی
طرح اُس چیخ کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ ہاشم ایک
تھکے ہارے مسافر کی طرح منزل سے دُور جا کھڑا ہوا جہاں
سے اُسے جمال، اشرف اور نازش کے پیکروں کے صرف
نقطے ہی نظر آتے۔ وقت کی چکی اپنی رفتار بڑھتی، وہ دن
و ماہ اور ماہ کو سال میں پیستی رہی اور بچپن کے یہ ساتھی اپنی
اپنی منزل کی طرف تیزی سے گامزن رہے۔
ماں نے کسی نہ کسی طرح ہاشم کو بی۔ اے کرا لیا۔ چاروں
نے ایک ساتھ ہی امتحان دئے تھے فرق یہ تھا کہ نازش
صرف پاس ہوئی تھی، جمال اور اشرف فیل ہو گئے تھے
اس کے برعکس ہاشم پورے کالج میں اوّل آیا تھا۔ نازش
کے پاس ہونے کی خوشی میں اُس دن حویلی میں کافی چہل پہل
تھی اور ہاشم کے پاس ہونے پر اُسکی ماں نے سوا پانچ آنے کی
جلیبیاں منگا کر نیاز دلائی تھی۔ گھر کے کونے میں جلتی ہوئی
مدینہ دربار اگربتیوں کی خوشبو میں ماں بیٹے نے خدا کا شکر
ادا کیا تھا۔

حویلی دلہن کی طرح سجا دی گئی تھی۔ چاروں طرف قمقموں
کی روشنی میں وہ اپنی کھڑکی سے باہر کا حسین منظر دیکھ
رہا تھا۔ دل و دماغ دونوں ایک خاص نقطے پر الجھے ہوئے
تھے۔ اور وہ نقطہ نازش تھی۔ نازش اور اُس کی سہیلیوں
کی کھنکتی ہنسی کی آواز، مردوں کے قہقہے اور نواب صاحب
کی مشغولیت اُس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ
لے آئی۔ اس تضاد نے اُسے کوٹھری میں بند کر دیا تھا اور نازش
کو شمع محفل بنا دیا تھا۔

وہ ایک لمحے کے لئے چونک پڑا اس کے تلخ خیالات کا
سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اُس نے دیکھا نازش اس کی کوٹھری کی طرف
آ رہی تھی۔ دل کا دھڑکنا فطری تھا۔ کیونکہ یہ پہلا اتفاق
تھا جب سے نازش نے خود میں اور ہاشم میں فرق محسوس
کیا تھا۔ وہ اس سے باتیں بھی نہ کرتی تھی۔ وہ اُس فرق کے
پردے کو توڑ کر آ رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ گم سم بیٹھا رہا۔ اس
کی نگاہیں دروازے کی طرف تھیں جہاں ابھی ابھی نازش
پلکیں جھپکائے کھڑی تھی۔ اُس کے آنے سے سارا کمرہ سینٹ
کی بھینی بھینی خوشبو میں نہا گیا۔ وہ سفید شلوار اور جمپر میں
ملبوس تھی۔ فیروزی رنگ کی اوڑھنی نے اُس کے حسن میں
نیا نکھار پیدا کر دیا تھا۔
"کیا تم میری خوشی میں شریک ہونا پسند نہیں کرتے؟"
اُس نے پوچھا۔
"ایں۔ وہ سوتے میں جیسے چونک پڑا ہو۔ آپ کچھ مجھ
سے کہہ رہی ہیں؟
"جی ہاں" وہ مسکرائی "مگر آپ، نہیں بلکہ تم"
"جی نہیں۔ تم کے لئے ہم لوگ مخصوص ہیں۔ آپ کے
لئے یہ بہت بڑی گستاخی ہے" وہ بولا۔
ایسا سوچنا غلط ہے۔ تمہارے دماغ پر احساس کمتری
کا سایہ ہے" اُس نے کہا۔ خیر! تمہاری مرضی۔ لیکن باہر
چلو۔ ابو تلاش کر رہے ہیں!
"مجھے۔ کوئی ضروری کام پڑ گیا ہے کیا؟ ہاشم نے پوچھا۔
"میں کیا جانوں۔؟" اُس نے سادگی سے جواب دیا۔
وہ خاموشی سے نازش کے ساتھ ہو لیا۔ جب نواب صاحب نے
اُسے اپنی بیٹی کے ساتھ دیکھا تو انہیں ایسا لگا جیسے بھری محفل
میں اُن کی بے عزتی ہو گئی ہو۔ سب کی نگاہیں ایک ساتھ
ان کا مذاق اُڑا رہی ہوں۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ نواب
عنایت اللہ کی بیٹی ایک نوکر کے ساتھ۔ وہ برہم ہو کر بولے
ہاشم! تم ٹہل رہے ہو۔ دسترخوان بچھاؤ۔ اور ہاں ذرا
بڑوں کے سامنے آنے سے قبل ادب و تہذیب بھی سیکھو
وہ سناٹے میں آ گیا۔ اُس نے نازش کی طرف دیکھا تو وہ

یار ہی تھی۔
غلطی ہو گئی جناب۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی
شش کی۔ ہاشم کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔
ش نے اُسے ذلیل کرنے ہی کے لیے نواب صاحب کا حوالہ
تھا۔ آخر کیوں؟
وہ چہک چہک کر کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں سے
نے پر اصرار کر رہی تھی اور ہاشم دوڑ دوڑ کر اُس کے ہر حکم
تعمیل کر رہا تھا۔ نازش کے دوستوں میں سے اکثر لڑکے
ور لڑکیاں اُس کے ہم ساتھی تھے۔ لیکن اُن لوگوں نے ہاشم
بالکل نظر انداز کر دیا۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں اس سے گفتگو
نے میں نازش اور نواب صاحب خفا نہ ہو جائیں۔ کون اتنے
بصورت ساتھی اور بے تکلف میزبان کو کھونا چاہے گا؟
ھانے کے دوران کسی نے ہاشم کا مذاق اُڑایا۔ "میاں
ن سی جماعت پاس ہو؟"
جی" وہ چونک گیا۔ پوچھنے والے۔ ادھیڑ عمر کے باوقار
احب تھے۔ اُسے اپنی طرف دیکھتا پا کر جھینپ گئے۔ "جواب کیوں
نہیں دیتا ہے چھوکرے؟" اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔
س کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ وہ قریب آ کر بولا "
انسانیت کے سوداگر۔ میرا نام ہاشم ہے۔ میں نے اسی سال
بی اے میں پوری یونیورسٹی میں ٹاپ کیا ہے۔" اور وہ
تیزی سے باہر نکل گیا۔ پوچھنے والے صاحب سکتے میں آ گئے
نہوں نے تائید کے لیے جب نواب صاحب کی طرف دیکھا
تو انہوں نے کہا "ہاں بھئی! آج کل تعلیم تو ٹکے سیر بکتی ہے
جانے یہ چھوکرا کیسے ٹاپ کر گیا؟"
سبھی خاموشی سے ہاشم کے متعلق سوچ رہے تھے جس
نے بھری محفل کے منہ پر زبردست طمانچہ مارا تھا۔
جس دن سے ہاشم بھری محفل میں بے عزت ہوا تھا۔
اُسی دن سے نازش اپنی حرکت پر بے حد نادم تھی۔ اُس کے
دل میں ایک انجانی خلش تھی۔ اُس رات اُس نے ہاشم کے
چہرے پر دکھ درد کی عجیب کشمکش دیکھی تھی۔ اس کشمکش
کے بارے میں اُس نے جوں جوں سوچا اُس کے لاشعور
شاعر بھی

میں ہاشم داخل ہو گیا۔ وہ ایک دن شرم و حیا کی قید سے
نکل کر اُس کی طرف دوڑ پڑی۔
ہاشم کراٹا کے بارڈر کے نیچے لیٹا ہوا ایک روسی ناول "وہ
جھونکے بہار کے" پڑھ رہا تھا۔ یکبارگی اس کی نگاہ نازش
پر پڑی۔ "اوہ۔ آپ؟" وہ حیرت سے بولا۔ اور اُٹھ کر
بچھی ہوئی چادر کو صاف کرنے لگا۔ "میں اس بوسیدہ چادر
پر تو آپ کو بٹھانے کی گستاخی کر نہیں سکتا۔ کہیں آپ
کے سفید کپڑوں میں داغ نہ لگ جائیں۔ ٹھہریے میں کرسی
لے آتا ہوں۔" وہ جانے لگا لیکن نازش نے لپک کر اُس
کے ہاتھ پکڑ لیے۔ اور لجاجت سے بولی۔ "رہنے دو میں اسی
چادر پر بیٹھوں گی۔"
"نہیں۔ آپ مذاق اُڑا رہی ہیں۔ اگر کوئی کام ہو تو
بتا دیجئے۔ فوراً حکم بجا لاؤں گا۔" وہ خالص خدمت گارانہ
لہجے میں بولا۔ اب نازش کے اندر برداشت کی تاب نہ رہی
تھی۔ وہ ہاشم کے طنز کو بخوبی سمجھ رہی تھی۔ اُس نے امارت
کی دیوار اور حیا کی زنجیر توڑ ڈالی۔ ہاشم کے ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی
"نہیں نہیں ہاشم! مجھے معاف کر دو۔ میں تاریکی میں تھی
اب تاریکی سے نکل کر اُجالے میں آ گئی ہوں۔"
وہ چند ثانیہ کے لیے بوکھلا گیا۔ پھر حواس قائم کر کے بولا۔
"نازش صاحبہ! ہوش میں آیئے میں غریب ہوں۔ میں تو
آپ کی روٹیوں کے ٹکڑوں پر پلنے والا غلام ہوں۔ کیا نواب
صاحب سے جوتے کھلوانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔
آپ تاریکی سے نکل کر اُجالے میں آ سکتی ہیں۔ آپ کے لیے
کوئی چیز ناممکن نہیں۔ لیکن ہم لوگ نہ تو تاریکی سے نکل سکتے
ہیں۔ قانونِ خدا، فطرت انسان یہ کبھی برداشت نہیں
کر سکتی۔"
"نہیں اب تمہیں کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔"
وہ ایک عزم کے ساتھ بولی۔
"کیوں۔؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔
"میں" اُس نے ہاشم کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا "تم سے شادی
کروں گی!"

(بقیہ صفحہ [illegible] پر دیکھیے)

گیا۔ وہ بھڑک گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آئی۔ وہ تلخی سے بولا۔ معاف کیجئے گا۔ مگر میرا کوئی ارادہ آپ سے شادی کرنے کا نہیں۔ اب آپ جا سکتی ہیں۔

نازش کو قطعی اُمید نہ تھی کہ اُسے اتنا خشک جواب ملیگا۔ ہاشم اُس کے جذبات کو روند بھی سکتا ہے۔ وہ تو یہ سمجھ رہی تھی کہ...... کہیں ہاشم خوشی سے پاگل نہ ہو جائے۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ وہ اپنا سا منہ لئے لوٹ آئی۔ سر پکڑ کر رو پڑی۔ کمرے میں نہ جانے وہ کب تک سسکتی رہی۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ وہ کسی بات پر روئی تھی۔ اس نے تو سمجھا تھا کہ دولت سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔

اُس دن کے بعد نازش کا معمول ہو گیا کہ وہ کسی سے بات تک نہ کرتی اور اگر کسی سے کرتی تو جھنجھلا جاتی۔ اس کی اِس تبدیلی نے پُوری حویلی کے سکون کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اگر کوئی نازش کی گوشہ نشینی اور تبدیلی کی وجہ جانتا تھا تو وہ تھا ہاشم۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ دولت دل کے زخم کو کیسے مندمل کرتی ہے؟

دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونک پڑی۔ اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اُس نے کروٹ بدلی۔ پنکھے کی آواز بدستور اپنی رفتار پر تھی۔ اس نے دروازہ کھولدیا۔ سامنے بُوا رحمانی کھڑی تھی۔ اس نے پوچھا۔ کیا ہے بُوا؟ کچھ نہیں بیٹا۔ ذرا تمہیں دیکھنے آئی تھی۔ اب طبیعت کیسی ہے بُوا نے جواب دیا۔ ہاشم بھی کہہ رہا تھا کہاں دیکھو تو آؤ نازش کیسی ہے؟

ہاشم..... او..... ہاں۔ ٹھیک ہوں بُوا۔ وہ جیسے دُور سے بولی۔ اُس کا دل رو پڑا۔ آنکھوں سے آنسو لڑھکنے لگے۔ ہاشم ایسا پتھر دل بھی ہوگا۔ آج ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو رہا ہے۔ لیکن ہاشم نے کبھی یہ آ کر بھی نہ پوچھا کہ تم کیسی ہو؟ کیوں خود کو کمرے میں قید کئے ہوئی ہو؟ چلو میں اپنی باہوں کا سہارا دیتا ہوں۔ تمہارے لئے پُر لطف نغمے چھیڑتا ہوں۔ اُس نے سوچا تھا ہاشم ضرور آئے گا۔ ایک بچپن کے دوست کے ناطے نہ سہی، محبوب کے ناطے ہی شاعر بھی۔

نازش صاحبہ! اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے کے قریب ہاشم کھڑا ہوا تھا۔ نازش نے بے قرار نگاہوں سے دیکھا وہ کتنا بدل گیا تھا۔ شیو نہ کرنے کی وجہ سے داڑھی نکل آئی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ وہ دھیرے سے بولی۔ "جی!

"میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ درد ختم ہوا یا نہیں؟

"ہاں ختم ہو گیا۔ لیکن آپ کیوں مضطرب ہیں؟

"نازش! گستاخی معاف کرنا لیکن ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہیں بچپن سے چاہا تھا۔ میری چاہت کی قدر نہ کر کے تم نے ہر موقع پر میری بے عزتی کی۔ اس لئے نا کہ میں ایک نوکرانی کا بیٹا ہوں اور تم ایک نواب کی لڑکی ہو۔ ایک جھونپڑی حویلی جیسی شان و شوکت کہاں سے لا سکتی ہے۔ اپنی بے عزتی کے باوجود میں تمہیں چاہتا رہا اور جب تک زندہ رہوں گا تمہارا خیال میرے دل میں شمع کی مانند فروزاں رہے گی۔ اور اس کی تپش سے دل موم کی طرح پگھلتا رہے گا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ آج میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حویلی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ نازش کی نگاہوں میں آنسو تھے۔ ہونٹوں پر درد دل کا فسانہ تھا۔ ہاشم جا رہا تھا۔ اس نے تپائی پر رکھے چاقو کو اٹھا کر پہلے زخم کو نئے اور گہرے زخم میں تبدیل کر دیا۔ ضبط کے باوجود ایک کربناک چیخ اُس کے منہ سے نکل ہی گئی۔ ہاشم نے پلٹ کر دیکھا تو نازش اُنگلی پکڑے ہوئے تھی۔ اور خون رس رس کر زمین پر گر رہا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا اُس کے قریب آیا اور پوچھا۔ یہ تم نے کیا کر ڈالا نازش؟

کچھ نہیں دل کا درد نکال رہی تھی۔ وہ مسکرائی۔ "تا کہ زخم کھانے کی عادت پڑ جائے۔"

"نازش!" وہ بمشکل بولا۔ اور زخم پر اپنے لبوں کو پیوست کر دیا۔ اس کے ہونٹوں پر تازہ خون پھیل گیا۔

ہاشم! وہ چیخ کر اس سے لپٹ گئی۔ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ ہاشم میرے پیار کو نہ ٹھکراؤ۔ میں زہر کھا لوں گی۔

پگلی۔" ہاشم نے اُسکی ریشمی زلفوں میں اپنے کو چھپا لیا

جس سے خون کی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں

صافی

نظام عصبی کے فعل کو درست کرتی ہے، خون کو صاف کرتی ہے اور شفاف خون پیدا کر کے چہرے پر تازگی لاتی ہے۔

دہلی — کانپور — پٹنہ

مظفر حنفی

مجھ پہ اس "جورِ مسلسل" کا سبب تو دیکھو
"ظلم پر داد کا طالب ہے" غضب تو دیکھو

وہ تو الزام لگانے میں تکلّف نہ کریں
ہم صفائی بھی نہ دیں۔ "شرطِ ادب" تو دیکھو

رقصِ بسمل ہے بہر حال اُنہیں کے دم سے
شہریاروں سے کہو "جشنِ طرب تو دیکھو"

کچھ "نقیبانِ سحر" ہی تو نہیں پردے میں
دوستو! آج پسِ پردۂ شب تو دیکھو

یُوں تو ہر بات سے اِک بات نکل آئے گی
بات پلٹو نہ ابھی۔ بات کا ڈھب تو دیکھو

ہاتھ پھیلا کے ندامت کے سِوا کچھ نہ مِلا
لوگ ہنستے ہیں کہ "اندازِ طلب تو دیکھو"

حکم ہوتا ہے کہ "محفل سے اُٹھا دو اِن کو
"تازگی" دیکھ چکے۔ "جنبشِ لب" تو دیکھو

جب مظفر مرے اشعار میں رنگینی تھی
بات ہی اور تھی اُس وقت کی۔ اب تو دیکھو

اختر نظمی

زندگی کیوں ہے؟ زندگی کیا ہے
کون سمجھائے، کون سمجھا ہے
میں وہاں قافلے سے بچھڑا ہوں
جس جگہ دھوپ ہے نہ سایہ ہے
آج وہ شدّتیں نہیں، نہ سہی!
یاد تو اب بھی کوئی آتا ہے
اُن سے ترکِ تعلقات کے بعد
پُوچھنا ہے کہ حال کیسا ہے
نقش روشن ہے یادِ ماضی کا
دُور کوئی چراغ جلتا ہے
صاف چہرے نظر نہیں آتے
روشنی میں بڑا اندھیرا ہے
اب کوئی غم بھی آس پاس نہیں
جانے کیوں دل اُداس رہتا ہے
زندگی کیا ہے ایک حشر کا دن
آدمی کیا ہے؟ ایک لمحہ ہے
میرے نغموں میں کچھ نہیں نظمی
اک تاثر ہے، ایک جذبہ ہے

محسن احسان

صبا میں تھا نہ دل آویزیٔ بہار میں تھا
وہ اک اشارہ کہ اُس چشمِ مُنتظر میں تھا

گذر کچھ اور بھی آہستہ اے نگارِ وصال
کہ ایک عمر سے میں تیرے انتظار میں تھا

ہوائے دہر کی زد میں بھی آکے بجھ نہ سکی
بلا کا حوصلہ اک شمعِ رہگذار میں تھا

ہم اپنی دُھن میں چلے آئے جانبِ منزل
پلٹ کے دیکھا تو اِک کارواں غبار میں تھا

ملے تو پھول کھل اُٹھے تھے شاخِ مژگاں پر
جُدا ہوئے تو ہُو چشمِ اشکبار میں تھا

تجھے پکار کے چپ ہو گئے ہیں دیوانے
بس ایک نعرۂ مستانہ اختیار میں تھا

ہوائے کم نگہی نے بجھا دیا ورنہ
میں وہ چراغ کہ روشن حریمِ یار میں تھا

اب اک کرن بھی نہیں نیم وا دریچے میں
خوشا وہ دن کہ کوئی میرے انتظار میں تھا

تری نگاہ سے اوجھل سہی مگر محسنؔ
خزاں کا عکس بھی آئینۂ بہار میں تھا

ظہور حمیدی

اِمتحانِ آرزو کا حوصلہ رکھتے ہیں ہم
ہر جفائے سفلہ رُو کا حوصلہ رکھتے ہیں ہم
خانماں برباد ہیں لیکن پئے تسکینِ دست
اہتمامِ رنگ و بُو کا حوصلہ رکھتے ہیں ہم
باغباں کو فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں
کوئی موسم ہو نمو کا حوصلہ رکھتے ہیں ہم
بے رُخیٔ خضر کا کچھ غم نہیں اے راہرو
منزلوں کی جستجو کا حوصلہ رکھتے ہیں ہم
بابِ میخانہ سبھی کے واسطے اب کھول دو
رقصِ مینا و سبو کا حوصلہ رکھتے ہیں ہم
ٹوٹ جائے گا تمہاری مجبوری کا غرور
اپنے زخموں کے رفو کا حوصلہ رکھتے ہیں ہم
دُور کرنے کے لئے اُن کی غلط فہمی ظفرؔ
بالمشافہ گفتگو کا حوصلہ رکھتے ہیں ہم

عبدالمجید شاداںؔ

بیگانۂ رفتارِ جہاں رہنے دو ہم کو
وگو کسی گوشہ میں پنہاں رہنے دو ہم کو
آوارہ سرِ کوئے بتاں رہنے دو ہم کو
رسوا سرِ بازارِ جہاں رہنے دو ہم کو
آماجگہِ طعنۂ زناں رہنے دو ہم کو
پیہم سرِ شمشیر و سناں رہنے دو ہم کو
ہاں قیدِ قفس میں بھی غزل خواں رہے ہم لوگ
اب دار پہ بھی رقص کناں رہنے دو ہم کو
یا زیست کو رخشندہ و تابندہ بناؤ
یا تیغ زباں شعلہ بیاں رہنے دو ہم کو
ہنس لیں گے کبھی گردشِ ایام پہ بھی ہم
کچھ دیر ابھی اشک فشاں رہنے دو ہم کو

قطب شاہینؔ

اُن کے تو لب خزاں میں تبسم اثر رہے
ہم چھاؤں میں گلوں کی بھی باچشمِ تر رہے
صحنِ چمن میں خار بھی، سبزہ بھی تھا مگر
بجلی گری انہیں پہ کہ جو دیدہ ور رہے
اِس کو سحر کہیں گے نہ اہلِ نظر کبھی
جس کی ضیا میں رات کا بھی کچھ اثر رہے
جو حق نگر تھے دار پہ کھینچا گیا انہیں
لیکن جو حق فروش تھے وہ تخت پر رہے
منزل پہ آگئے ہیں بہ فیضِ شعور ہم
رہبر کے ساتھ تھے تو نہ جانے کدھر رہے
کچھ بھی نہیں ہے چاند ستاروں کی کاوشیں
شاہیں! یہی ہے خوب زمیں ہی پہ گھر رہے

عبدالصمد تپشؔ

آج ہر کوچے میں قاتل ہے، خبردار رہو
قاضیِ شہر بھی غافل ہے خبردار رہو
بدگماں صرف عدو ہو تو کوئی بات نہیں
نگہِ یار بھی شامل ہے، خبردار رہو
ڈر ہے صحرا میں بدل جائے نہ گلشن اپنا
باغباں شاخ کا قاتل ہے خبردار رہو
اے اُجالوں کے امیں صبح کے پیغامبرو
تیرگیِ شب کے مقابل ہے خبردار رہو
گھر سے نکلے تو ہو منزل کی طلب میں لیکن
ساتھ رہبر ہے کہ قاتل ہے خبردار رہو
دیکھو بہہ جائے نہ اے تنگ دِلو کم نظرو
زد پہ طوفان کے ساحل ہے خبردار رہو
حق پرستی کا جنوں سر سے اُتر جائیگا
چار سُو شورِ سلاسل ہے خبردار رہو

مکتوبات

صابر شاہ آبادی ــــــــ شاہ آباد (گلبرگہ)

تازہ شاعر ملا' غزل کی اشاعت کا شکریہ!
"اوراقِ مصوّر" پر آپ کا تبصرہ فکر و فن کے اعتبار سے عالمانہ ہے اور وجد صاحب کی شعری لیعیت اور نقادوں کی مسلسل بے توجہی کے لحاظ سے آپ کا احساس عارفانہ ہے اور یکسر تحریک آفریں!
"سخن در سخن" کی اشاعت کی خبر سے وجدانی مسرت ہوئی۔ آپ نے اپنے مجموعہ کا نام بڑا منین اور تہہ دار رکھا ہے۔ اللہ کرے کہ پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہو کر انفرادی مقبولیت حاصل کرے۔ آمین

سید حرمت الاکرام ــــــــ مرزا پور

اِدھر عرصے سے آپ بالکل خاموش ہیں۔ خدا کرے بعافیت ہوں۔ "شاعر" (اپریل مئی) نظر نواز ہوا' ممنون ہوں۔ غزل مسلسل کی شکل میں آپ کے تازہ تاثرات بے حد دلپذیر ہیں' سیاسی و سماجی کوائف کی سنگینوں کو غزل کے آبگینے میں ڈھالنا بڑا کٹھن کام ہے۔ مقطع میں آپ کا وار بڑا گہرا ہو گیا ہے:

اعجاز کچھ تو وقت کی سمجھو نزاکتیں!
تم اور یہ بیانِ سخن' دیکھ کر چلو۔

یہ شمارہ اپنے مضامین کے لحاظ سے کافی وزنی ہے۔ آئندہ بھی ایسے ہی مضامین دیجئے' کیا کیا جائے۔ آجکل ادبی دکانوں کے پکوان عموماً پھیکے ہو رہے ہیں۔ اور غزلوں' نظموں اور افسانوں کی طرح بڑے ناموں کے ساتھ سرسری اور معمولی مضامین شائع ہو رہے ہیں۔
متعدد جرائد میں آپ کے مجموعۂ کلام "سخن در سخن" کا اعلان نظر سے گذرا اور دلی مسرت کا باعث ہوا۔ کاش! یہ مجموعہ جلد سے جلد منظرِ عام پر آجائے۔ آپ نے اپنی شدید ترمصروفیتوں اور چند در چند پریشانیوں کے باوجود شعر کی شکل میں جو کچھ کہا ہے۔ اس کی یکجا اشاعت بے حد ضروری تھی شکر ہے کہ یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔

مفتوں کوٹوی ــــــــ کوٹہ

مجھے اس خبر سے بیحد مسرت ہوئی کہ آپ نے اپنے مجموعہ کلام کی اشاعت کی جانب توجہ کی۔ "ہماری زبان" میں یہ خبر پڑھ کر طبیعت پھڑک اٹھی۔ کیا قدیم کلام اب نظری رہے گا۔ اُسے کہیں ضائع نہ کر دیجئے گا۔ لاحقہ کے طور پر کچھ اوراق' اس کلام کے انتخاب پر مشتمل بھی شامل مجموعہ کر دیجئے۔ فکر و فن سے وہ اشعار یقیناً بھرپور ہوں گے اُن سے عدم اتفاقی میرے خیال میں قطعاً مناسب نہیں۔ آپ شاید اس پر غور کر سکیں۔

نزاکت فیضی ــــــــ بمبئی

"نقد و نظر" میں آپ نے بالکل بجا فرمایا کہ ابھی تک جناب سکندر علی وجد پر کہیں لکھا نہیں گیا اور یہ ابتدا آپ ہی نے کی ہے۔ لیکن آپ کا بھی جواب نہیں۔ "نظموں میں رکھ دیا ہے کلیجا نکال کے"۔ شعر یوں ہے۔

نامہ کو میرے پڑھنا ذرا دیکھ بھال کے
کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجا نکال کے

بے شک تنقید اسی کا نام ہے۔

شارق میرٹھی ــــــــ مؤ دھا (ہمیر پور)

"سخن در سخن" کی اشاعت کے لئے مبارک باد قبول فرمائیں۔ اس کی اشاعت سے یقیناً ادب کو فائدہ پہنچے گا جب چھپ جائے تو مطلع فرمائیں تاکہ اُسے منگا سکوں۔

عنوان چشتی ــــــــ آگرہ

شمارۂ جون کے مقالات میں اشفاق علی خاں کا مقالہ رازِ درونِ پردہ کو سامنے لاتا ہے۔ اس مقالہ میں خوب خوب دادِ تحقیق دی گئی ہے۔ زینہ ثانی کا مضمون اچھا

مگر تشنہ، فانی پر میں بھی مسلسل لکھ رہا ہوں۔ "سوز و گداز اور غم فانی" پر میں نے بھی ایک طویل مقالہ لکھا ہے۔

آپ کی نظم "خوابوں کا مسیحا" ایک بھرپور مکمل اور مؤثر نظم ہے۔ آج تک اس موضوع پر جتنی نظمیں میری نظر سے گزری ہیں ان میں ادبیت کم اور پروپگنڈا زیادہ دیکھا گیا۔ آپ کی نظم پہلی نظم ہے جس میں ادبیت کی شان بھی جھلکتی ہے اور جذبہ و تفکر بھی ہے۔ یہ نظم شاہکار ہے۔

"سخن در سخن" کے بارے میں پڑھ کر خوشی ہوئی۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کئی بار عرض کیا تھا کہ آپ اپنا کچھ نہ کچھ کلام کتابی صورت میں ضرور لائیے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ اپنے کلام کا انتخاب شائع فرما رہے ہیں۔ یہ انتخاب یقیناً اہلِ ذوق کے لئے سرمایۂ تسکین ہوگا۔ چھپتے ہی ایک جلد میرے نام بھجوا دیجئے۔ ابھی سے منتظر رہوں گا۔

اسرار اکبر آبادی۔ راہی اور حرمت الاکرام کی تخلیقات پسند آئیں۔ رشید منظر کی غزل نے بھی متوجہ کیا۔ نسیم سہارنپوری کی غزل سادگی و پرکاری کی مثال ہے۔ کیف احمد صدیقی کی غزل پہلے کہیں پڑھی اور سنی ہوئی ہے۔

رام لعل ——— لکھنؤ

ہو سکے تو اپنی [illegible] صحت کا احوال دیجئے۔ میں آپ کی صحت کے لئے دعا کر رہا ہوں۔ اردو کی خدمت کرنے والے اب چند ہی لوگ رہ گئے ہیں۔ جو درد آپ کے دل میں اس زبان کے لئے ہے وہ کسی اور میں نہیں ہے۔ اردو کے سلسلے میں ایک کل جماعتی کنونشن کی ضرورت ہے، جس میں ایسے سیاست داں نہ گھسنے پائیں جو صرف اپنی پبلسٹی چاہتے ہیں۔ بمبئی جیسے مقام پر ایسا کنونشن کرنا غیر ممکن نہیں ہے۔ اس سلسلے میں کرشن چندر۔ راجندر سنگھ بیدی۔ مجروح سلطانپوری۔ سردار جعفری۔ خواجہ احمد عباس۔ ساحر لدھیانوی۔ قمر جلالآبادی۔ راجہ مہدی علی خاں۔ مہندر ناتھ۔ وشوامتر عادل۔ انور عظیم۔ پریم دھون اور کتنے سارے شاعر و ادیب معاون ہو سکتے ہیں۔ "بلٹز" جیسا بے خوف اخبار بھی آپ کی مدد کر سکتا ہے۔

رفعت سروش ——— دہلی

آپ کی علالت کی خبر پڑھ کر بہت تشویش ہوئی۔ دستِ بدعا ہوں، کہ خدائے بزرگ و برتر آپ کو جلد از جلد مکمل صحت عطا فرمائے۔ آپ کی صعوبات بھی مرض سے کچھ کم نہیں آپ کے حق میں۔

جس نے ہر شخص پر گرانی کی وہ اس کو میں ناتواں اٹھا لایا

مجھے خود بے حد افسوس ہے "امن کا پھول" نظم کے ادھر ادھر چھپ جانے کا۔ دراصل "ملاپ" اخبار والے اردو مجلس سے براہِ راست کچھ نظمیں لے گئے تھے۔ اس موضوع پر آپ کی نظم "خوابوں کا مسیحا" پڑھ کر طبیعت پھڑک گئی۔ بہت ہی خوبصورت پیرائے میں نظم کہی ہے آپ نے۔ رشک آیا پڑھ کر۔

خاور بانکوٹی ——— رتناگیری

تازہ "شاعر" ملا۔ پنڈت جواہر لال نہرو پر لکھی گئی نظموں میں آپ کی نظم "خوابوں کا مسیحا" ہنگامی نہیں ہے بلکہ زبردست تاریخی اور ادبی اہمیت رکھتی ہے۔ قیصر شمیم کی نظم "تلاش" پہلے دھرم یگ (ہندی) میں نظر سے گزری تھی۔ ندا فاضلی سے بمبئی میں بہت دیر تک ان علامتوں پر بات چیت ہوتی رہی تھی۔ جنہیں وہ اپنی نظموں میں برتنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ "پنجرے کا پنچھی" پڑھ کر محسوس ہو رہا ہے کہ وہ اپنی کوشش میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ اسرار اکبر آبادی کی نظم "اندھیرے" کا ایک مصرع ہے ؎

"دور برگد کے درختوں کی لٹکتی شاخیں"

شاخوں کا لٹکنا بہت بھدا معلوم ہوتا ہے۔ برگد کی جٹائیں لٹکتی ہیں اور ان جٹاؤں ہی کی مناسبت سے کہا گیا ہے۔ ؎

"جیسے سانپوں پہ سپیروں نے کیا ہو جادو"

اس بار نظمیں واقعی انتخاب ہیں۔ خاص طور سے "توہین گر ...."۔ "مہاراغم"۔ "نئے خاکے" اور "تلاش" نے مجھے کافی متاثر کیا۔ غزلوں میں ابتدائی پانچ غزلیں بہت اچھی ہیں۔ اور یہ اشعار تو دل میں اتر گئے ہیں۔

مجھ کو بھی کوئی غم ہے یہ سوچا نہیں جاتا
اک مجھ سے ہی پوچھا نہ گیا میرا فسانہ
دل ہے کہ امانت ہے حدیثِ دگراں کا
ورنہ مری روداد نہ کس کس کی زباں کی

حرمت الاکرام

بے کراں ساعتیں گرفت میں لو
اڑتے لمحوں کو زیرِ دام کرو

نسیم سہارنپوری

اک اک چراغ شب غم تھا بجھ گیا وہ بھی
اندھیری رات ہے اب ختم انتظار کے بعد — اکرم دھولیوی

جو تم ہو تو پتہ ہم کو خود ملے اپنا
ہمیں شمار نہیں انتظار اپنا ہے — منشا

یوں تو صدیوں کی رفاقت نہیں تم نا کرتی
جانے کیا تھا کہ سر کوئے بتاں ہم نہ رہے — اسعد مہدی نجمی

نیند درختوں کے سائے میں آجاتی ہے۔ مگر رشید منتظر نے اسی بات کو عجیب ڈھنگ سے پیش کر کے اپنی غزل میں خواہ مخواہ ایک عیب پیدا کر لیا ہے۔ ع "نیند آگئی ہمیں شجر سایہ دار میں"

اشتیاق علی خاں اور زرینہ ثانی کے مقالات خوب ہیں۔ کرشن چندر کا "ساحیے کا مژدہ" مکمل صورت میں پڑھ کر ان کے فکر وفن کی بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ یقیناً افسانوں میں صرف "آہوں کی زبان" پڑھ سکا ہوں۔

شفیق بھوپالی ——— بھوپال

"شاعر" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ "جرعات" میں آپ نے کیا اچھی بات کہی ہے۔ کہ ہم نہرو جی کے زریں اصولوں کو اپنا کر جلاؤ کی بے تاب روح کو سکون بخش سکتے ہیں۔

منظومات میں آپ کی نظم "خوابوں کا مسیحا" میں بھی پنڈت جی کے زریں اصولوں پر چلنے کی تلقین کی گئی ہے ؎

"خواب جس نے تمہیں بخشے ہیں اُسے پہچانو!
قصر خوابوں ہی سے تعمیر ہوا کرتے ہیں"

آپ نے ہمیشہ وقت کا ساتھ دیا ہے۔ جب چین نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا اس وقت بھی آپ نے نظم "ناگزیر" کہکر ادب میں گراں مایہ تخلیق کا اضافہ کیا تھا۔ آج بھی وہ نظم ذہن میں گونج رہی ہے ؎

"جنگ اک جبر ہے ہم امن پسندوں کے لیے"

مقالات میں ابھی اشتیاق علی خاں ایم اے کا "رشید وطواط پر ایک ہندوستانی محقق کا ایرانی ماخذ" اور پروفیسر زرینہ ثانی ایم اے کا "فانی کا شعری سوز و گداز" پڑھ پایا! پسند آئے۔

"سخن در سخن" کی اشاعت کی خبر پڑھ کر خوشی ہوئی۔ واقعی یہ مجموعہ ہمارے لئے مشعل راہ ہوگا۔

محفلِ اپنی ...!

...تازہ شمارہ

...ئی ۱۹۶۲ء کے اس تازہ شمارہ کے تینوں مقالے بڑی
...تے ہیں۔ نواب امیر خاں انجام پر نفیس احمد صاحب استاد
...والوں سے جو پُر مغز مقالہ لکھا ہے وہ یقیناً پسند کیا جائیگا،
...عضاء کام کرنے کی ضرورت ہے۔ "بڑھاپا اور تابت
...بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے نیا ہے۔ مقتوں کو ٹی
...یں بہترین مواد جمع کیا ہے۔ اور بڑے اچھے انداز و اسلوب
...ں لکھا ہے۔ اردو میں کیسے کیسے جواہر پارے موجود ہیں لیکن
...ہم اُن کی طرف متوجہ نہیں۔ علی جواد زیدی کی نظموں،
...ں کی طرف بھی توجہ کم دی گئی ہے، وہ ملک کے بلند پایہ
...، ساجد ادیب نے اُن کے تغزل و تفکر پر قلم اُٹھایا ہے
...ہ موضوع کے ثبوت میں جو اشعار منتخب کئے ہیں۔ اُن سے
...ر زیدی کے یہاں سے لئے جا سکتے تھے۔

...شاعر" کے قارئین میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو چاہتا ہے کہ
...یں افسانے زیادہ شائع کئے جائیں۔ ادارہ اِس ذوق
...کا احترام کرتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اچھی کہانیاں کم آتی ہیں
...، چار نہایت خوبصورت کہانیاں پیش کی جا رہی ہیں۔ اسی
...طرح غزلوں کا بھی حال ہے۔ غزلیں آتی تو ہیں سینکڑوں
...دیں لیکن اُن میں اشاعت کے قابل چند ہی ہوتی ہیں اِس
...لئے غزلیں کم دی جا رہی ہیں کہ اچھی غزلیں موجود نہ تھیں،
...ہم نظموں کے متعلق وثوق کے ساتھ کہیں گے کہ یہ بے حد اچھی،
...ی اور اہم موضوعات پر ہیں یہ اتفاق ہے کہ دو نظمیں وصی
...کے شعرا کی ہیں۔ صبا وحید اور ناز ش پرتاپ گڈھی نے
...بڑی چابکدستی سے اُردو نظم میں ڈھالا ہے۔ نظم "دیاسلائی"
...پنے موضوع کے اعتبار سے بالکل نئی ہے۔ دوسری مختصر نظمیں
...ی طرح غیر اہم نہیں ہیں۔ یہ ایک عام رائے ہے کہ "شاعر"
...پڑھنے والوں کے لئے زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر
...فراہم کرتا ہے۔ محض صفحات کو پُر کرنا مقصود نہیں ہوتا۔

...ا نمبر

...آخر ایک غیر یقینی بات نے یقین و عمل کی شکل اختیار کر لی۔
...ر بہی

ہم بے حد اندیشہ مند تھے کہ ایک بابی تازہ ڈرامے کس طرح لکھتا
جا سکینگے۔ یہ قلم کاروں کا کرم ہے کہ اُنہوں نے ہماری دعوت قبول
کی۔ اور "ڈرامہ نمبر" کے لئے تازہ ترین و شاہکار ڈرامے لکھ دیئے۔
"ڈرامہ نمبر" ایک خاصے کی چیز ہوگا اور بے حد پسند کیا جائے گا۔ اس
کے لئے بڑے اچھے منظوم اور منثور ڈرامے وصول ہوئے ہیں۔

ہر چند ڈرامہ نمبر کاغذ کی مجبوری کی وجہ سے بہت بڑی تعداد
میں نہیں چھپوایا جا رہا ہے پھر بھی اتنا ضرور ہے کہ ایجنٹ حضرات
کے بڑے آرڈروں کی تعمیل کی جا سکے گی۔ ایجنٹوں سے درخواست
ہے کہ وہ جلد اپنے آرڈر بھیج دیں۔

نہایت ضروری

اِس شمارہ کے ساتھ جن خریداروں کا سالِ خریداری ختم
ہو رہا ہے اُن سے درخواست ہے کہ وہ تجدیدِ خریداری فرمائیں۔
اور کسی صورت "شاعر" سے اپنا دیرینہ رشتہ توڑیں نہیں۔ وی۔ پی
کے بڑے خرچ سے بچنے کے لئے مناسب ہے کہ زرِ سالانہ منی آرڈر
سے بھیجا جائے اور یہ بھی ہے کہ "ڈرامہ نمبر" نہایت محفوظ طور پر
وی پی کے ذریعہ پہنچ سکتا ہے، جو صورت بھی مناسب سمجھی جائے۔
اُس کی اطلاع ایک کارڈ کے ذریعہ دفتر کو ضرور دیدی جائے۔

ہمدردانِ "شاعر" سے بھی درخواست ہے کہ وہ "ڈرامہ نمبر"
سے اپنے احباب کو "شاعر" کا خریدار بنا کر ادارہ کو شکریہ
کا موقع دیں۔ اور "شاعر" کی بنیادوں کو استحکام بخشیں۔

> **آپ کا سالِ خریداری ختم ہو چکا ہے**
>
> اگر اس دائرے میں سُرخ نشان لگا ہوا ہو تو اس کے
> معنی یہ ہیں کہ اس شمارہ کے ساتھ آپ کا سالِ خریداری ختم ہو چکا ہے
> ازراہِ کرم شمارہ دیکھتے ہی زرِ سالانہ منی آرڈر سے اپنی اولین فرصت میں روانہ
> فرما دیجئے۔ بصورتِ دیگر آئندہ شمارہ آپ کے نام بذریعہ وی۔ پی بھیجا
> جائیگا۔ جس کا وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہے اگر تجدیدِ خریداری
> منظور نہ ہو تو ایک کارڈ کے ذریعہ فوراً دفتر کو اطلاع دیجئے۔ تاکہ
> وی۔ پی نہ بھیجا جائے۔ — منیجر

نقد و نظر

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

رقصِ خیال

از ــــــــ ظفر حمیدی

ڈاکٹر سعد اللہ ظفر حمیدی صوبۂ بہار کے معروف نوجوانوں میں سے ہیں۔ اُن کی شہرت کا ایک سبب تو یہ ہے کہ وہ مظفر پور کے قابل ترین ڈاکٹروں میں سے ہیں۔ اُن کے پاس ہند اور بیرونِ ہند کی اعلیٰ ڈگریاں ہیں۔ دوسرا سبب اُن کا ذوقِ شعری ہے جو انہیں فطرتاً ودیعت ہوا ہے۔ "رقصِ خیال" دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن میں اچھی شاعرانہ صلاحیتیں ہیں لیکن اُنکے پیشے کی مصروفیتوں نے انہیں ادب و شعر کی صحیح سمت تک پوری طرح نہیں پہنچنے دیا۔ پھر بھی انہوں نے ۱۲-۱۳ سال میں جو کچھ کہا ہے۔ وہ اُن کے ایک خوش فکر شاعر ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اُن کے یہاں ایک جدید ذہن بھی جھلکتا ہے۔

تعمیرِ نَو کا دَور ہے، قیدی بھی ہیں نئے
شکوہ نہ کیجئے کہ یہ زنداں نیا بنا

پھر کوئی نشیمن جل اٹھا یہ روشنی کیسی پھیل گئی
آنکھوں پہ مری پردہ ڈالو تابش سے مرا جی ڈرتا ہے

کاش اِس جدید ذہن کی تعمیر پوری طرح ہو جاتی اور وہ قدیم فکر و اسلوب کے حصار سے نکل جاتے۔ "رقصِ خیال" میں نظمیں، غزلیں اور قطعات ہیں۔ نظموں میں ظفر حمیدی کا شاعرانہ شعور زیادہ رچا ہوا نظر آتا ہے۔ اُنہوں نے جس موضوع کو بھی نظم کا جامہ پہنایا ہے اُس کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ نظمیں کافی رواں ہیں اور اِن کا مواد اچھا ہے، چونکہ انہیں پوری طرح نکاتِ فن سے آشنا نہیں کیا گیا، اِس لئے غزلوں اور نظموں میں جابجا جھول نظر آتے ہیں۔ لیکن اِن سے ظفر حمیدی کی شاعری کا مجموعی تاثر مجروح نہیں ہوتا۔ "ٹیمز کے کنارے"۔ لندن کی ایک صبح۔ نرس۔ خواب۔ شاعر، بمبئی وغیرہ سے ظفر کی بلندیٔ فکر آشکار ہے۔ غزلوں کے ذیل کے چند اچھے اشعار سے بھی ظفر کو سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ رنگ ہر جگہ نہیں ہے۔ اور ایسے اشعار مجموعے میں کم ہی ہیں۔ چونکہ یہ ۱۹۶۱ء تک کا کلام ہے۔ اس لئے قطعیت کے ساتھ کوئی بات کہنا مناسب نہیں۔ ظاہر ہے اِدھر اُن کے فکر و فن نے اور بھی ترقی کی ہوگی۔ ظفر حمیدی بہار کے اچھے شعرا میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔

چند موہوم امیدوں کا سہارا لے کر — زندگی تلخ سہی گرمیٔ بازار تو ہے
محوِ دیدار کبھی اور کبھی یاد میں گم — تیرے دیوانے تو ہر حال میں سرشار رہے

ہمارے حصے میں آئی متاعِ سوز و گداز
چراغِ زیست ہیں خونِ جگر جلا کے جیئے

اندھیرے اُجالے سے ٹکرا رہے ہیں — نہ جانے سحر آج کیا رنگ لائے

جب مجھے راہِ وفا میں کوئی ہمدم نہ ملا
اپنا چھوڑا ہوا ہر نقشِ قدم یاد آیا

مرے نفس کی حرارت نہ پوچھ میرا کالہو — ملے گا ان سے زمانے کو زندگی کا

افسوس کہ مجموعے میں کتابت کی بہت غلطیاں رہ گئی ہیں۔

۱۷۳ صفحات۔ قیمت دو روپیہ پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔ ڈاکٹر سعد اللہ حمیدی۔ محلہ کلیانی۔ مظفر پور (بہار)

توی اور جہلم

از ــــــــ موہن یاور

یہ افسانوی مجموعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے کچھ مختلف ہے۔ اس میں مختلف افسانہ نگاروں کے ۱۴ منتخب افسانے شامل ہیں۔ اور اِس کتاب کو موہن یاور نے مرتب کیا ہے۔ جموں کشمیر نے ہر دور میں مختلف زبانوں میں اچھے ادیب و شاعر پیدا کئے۔ ادیب و شاعر ہی نہیں، بہت سی اہم اور تاریخی شخصیتیں

رس جنّت ارضی سے اُبھرے ہیں۔ اگر سب کے نام گنا لیے جائیں۔ تو فہرست بڑی طویل ہو جائے گی۔ اِس مجموعہ میں پریم ناتھ پردیسی۔ رام لعل ساگر۔ ٹھاکر پونچھی۔ پریم ناتھ در۔ کشمیری لال ذاکر۔ موہن یاور۔ مجبور شیں کتول۔ نرسنگھ داس نرگس۔ پشکر ناتھ۔ وید راہی۔ نوشا بیج بہادر۔ برج کیتال۔ حامدی کاشمیری۔ علی محمد لون۔ اور غلام رسُول سنتوش کے افسانے شامل ہیں۔ اِن میں سے کتنے ہی افسانوی ادب میں ایک مسلّم حیثیت رکھتے ہیں اور موہن یاور نے اُن کی نہایت خوبصورت کہانیاں منتخب کی ہیں۔ اُن پر ایک اچھا پیش لفظ لکھا ہے۔ "توی اور جہلم" میں شامل شدہ اکثر افسانوں میں کشمیر کا ماحول ہے۔ اور یہ افسانے زندگی کی بہت سی حقیقتوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ یہ اپنے دَور کے عکّاس ہیں۔

۱۸۶ صفحات۔ قیمت تین روپے پچھتر پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔ شاردا کارز۔ ریذیڈنسی روڈ۔ جموّں (توی)

صبحِ بنارس

از ـــــــ عشرت کرتپوری

صُبحِ بنارس اور شامِ اودھ کو اُردو شعر و ادب نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا، یہ بات تفصیل طلب ہے۔ اجمالاً اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ "صُبحِ بنارس" اُردو شاعری میں ایک اہم علامت ہے۔ اسے بطور تشبیہ و استعارہ بھی استعمال کیا گیا ہے اور اُردو فارسی کے شعرا نے تو بنارس پر بڑی مکمل اور موثر نظمیں کہی ہیں۔ یہ مجموعہ جسے عشرت کرتپوری نے کافی تلاش و جستجو اور محنت سے مرتّب کیا ہے، ابتدائی دَور سے اِس وقت تک کے بہت سے شعرا کی نظموں اور اُن کے متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔ اِس میں حزیں۔ راسخ غالب۔ صفی۔ عزیز۔ سیماب۔ جوش۔ بے نظیر شاہ۔ احسان دانش منظر صدیقی۔ جان نثار اختر۔ مسعود اختر جمال۔ رئیس امروہوی اور کئی دوسرے شعرا کی نظمیں شامل ہیں۔ اب تک صُبحِ بنارس پر نظمیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ عشرت کرتپوری نے انہیں یکجا کر کے ایک مفید کام کیا ہے۔ بقول اُن کے یہ مجموعہ "قومی یکجہتی" کے مقاصد کو بھی تقویت پہنچائے گا۔ اس کے علاوہ "صبحِ بنارس" سے ہمارے شعرا نے جو تاثر لیا اور جس جس نقطۂ نظر سے اُسے دیکھا وہ بھی ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اِس مجموعے کو شاعر بھی ہندی زبان میں بھی چھاپا جائے۔

کتاب کو سنجیدگی اور خوش ذوقی سے مرتّب کیا گیا ہے۔ اِس میں مرتّب نے بنارس اور صبحِ بنارس پر تاریخی اعتبار سے ایک مفید دیباچہ بھی لکھا ہے۔ آخر میں کتابیات کے عنوان سے حوالوں کی ایک فہرست دی گئی ہے۔

۱۲۸ صفحات۔ لکھائی، چھپائی اور گرد پوش معیاری۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔ جاوید پبلشرز۔ اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

دو کنارے

از ـــــــ موہن یاور

وِسکی کی بوتل۔ بچوّں کی پارلیمنٹ۔ تیسری آنکھ۔ اور سیاہ تاج محل کے بعد "دو کنارے" موہن یاور کے افسانوں کا نیا مجموعہ ہے۔ افسانہ نگاری میں اب موہن یاور کی شخصیت مسلّم ہو چکی ہے۔ بقول علی جواد زیدی "اِن افسانوں میں زندگی اپنی تمام پیچیدگیوں، محرومیوں اور تمنّاؤں کے ساتھ سامنے آتی ہے"۔

شہر خموشاں کا ہیرو۔ دو میرے۔ بارہ فٹ لمبا انسان۔ بدصورت لڑکی۔ یہ پیسے یہ رشتے۔ میراث۔ زندگی کی دَوڑ۔ بستی بستی۔ خوبصورت لڑکی۔ مکان اور گھر۔ امانت۔ دو کنارے۔ کُل ۱۲ افسانے اِس مجموعہ میں ہیں۔ ایک مختصر سے تبصرے میں ہر افسانہ کا تجزیہ تو ممکن نہیں۔ لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ افسانے قاری کو مایوس نہیں کرتے۔ یہ دلچسپ ہی نہیں ہیں، اِن میں مقصد کے ساتھ نفسیات کی گہرائیاں اور گیرائیاں بھی ہیں۔ موہن یاور کے چھوٹے چھوٹے سادہ اور منجھے ہوئے جملے ہر افسانے میں مل جاتے ہیں۔ اِن افسانوں کے کردار جامد نہیں بلکہ جیتے جاگتے ہیں۔

کاش موہن یاور اپنے مجموعوں کی کتابت و طباعت پر توجہ دیا کریں۔ اِس مجموعے کے آخری حصّے کی کتابت و طباعت دیکھ کر تو بڑی مایوسی ہوئی۔

۱۹۰ صفحات۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ کلدیپ سنگھ سینڈ۔ پکا ڈنگہ۔ جموں (توی)

رفتار (علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں)

یادِ رفتگاں

مولانا حامد حسن قادری مرحوم

پندرہ سولہ سال پہلے کے اکبر آباد (آگرہ) کا جب تصور کیا
کیا جاتا ہے تو ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ محلہ شاہ گنج سے لے کر کوہ
خانخاناں۔ چھم چھم گلی۔ گلاب خانہ اور حکیموں کی گلی تک ادیبوں
شاعروں اور اہلِ علم کا ایک جگمگھٹا تھا۔ مرزا عاشق حسین بزم
اکبر آبادی۔ علامہ سیماب۔ ل۔ احمد۔ محمود اکبر آبادی۔ مولانا انتظام اللہ
شہابی۔ نجم آفندی۔ محمد طاہر فاروقی۔ خادم علی خاں اختر۔ مسکین
اکبر آبادی۔ پنڈت راج ناتھ کنزرو۔ مولوی عابد حسین فریدی۔ منتظر
صدیقی۔ رعنا اکبر آبادی۔ صبا اکبر آبادی، غرض کس کس کے نام
لئے جائیں۔ ان ہی میں ایک ذات مولانا حامد حسن قادری کی تھی۔
دُبلا پتلا۔ چھریرا بدن، گورا رنگ، بات کریں تو منہ سے پھول جھڑیں،
مشرقی اخلاق و تہذیب کا ڈھلا ڈھلایا نمونہ نہایت منکسر المزاج،
گفتگو سے علم و فضل آشکار، بالکل فرشتہ خصلت، گوشہ نشین،
ہمہ وقت درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف۔
اکبر آباد کی یہ محفل اُجڑی تو ۱۹۵۵ء میں قادری صاحب بھی
کراچی (پاکستان) ہجرت کر گئے، اور وہیں ۶ جون ۱۹۶۴ء کو
۸۰ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ نصف صدی سے بھی زیادہ
کی ہماری ادبی تحریکوں میں وہ شریک رہے، کبھی خاموش
تماشائی کی حیثیت سے اور کبھی قلمی تعاون کے ساتھ۔ وہ
پُرانے رنگ و مزاج کے آدمی تھے۔ لیکن جدید دور اور جدید نظریوں
سے بہت زیادہ کترانے نہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کے
طلبا میں اُردو زبان و ادب و شعر کا صحیح مذاق پیدا کرنے کے
لئے انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔

مرحوم ۱۸۸۴ء میں بچھراؤں ضلع مُرادآباد میں پیدا ہوئے
تھے۔ مدرسۂ عالیہ رام پور میں تعلیم حاصل کی تھی۔ تحصیلِ علم کے بعد
مدرسۂ عالیہ کے علاوہ بڑودہ کالج۔ اسلامیہ کالج اٹاوہ۔ حلیم
مسلم کالج کانپور میں کافی دنوں تک تدریسی خدمات ا
دینے کے بعد سینٹ جانس کالج آگرہ کے صدر شعبۂ اُردو
ہوئے اور مدت مدید تک اس عہدے پر فائز رہے۔
میں اس سے سبکدوش ہوئے۔ وہ ایک پختہ مشق ذ
راز رامپوری سے اصلاح لی تھی لیکن شاعری سے زیا
نثر نگار کی حیثیت سے اُنہوں نے شہرت و مقبولیت حا
اور کئی قابلِ قدر کتابیں تصنیف فرمائیں۔ تاریخ گوئی م
ید طُولیٰ حاصل تھا۔ داستانِ تاریخ اُردو۔ نقد و نظر۔
تاریخ مرثیہ گوئی۔ کمالِ داغ۔ انتخابِ مومن اور انشا
اُن کی مشہور و مقبول تصانیف ہیں۔ ویسے مطبوعہ
اور چھوٹی بڑی کم و بیش چالیس کتابیں اُن کی ت
سے ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ ادیب و انشا پرداز

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم

۱۴ جون ۱۹۶۴ء کو منٹگمری (پاکستان) کے
مقام پر مولانا صلاح الدین احمد کا انتقال ہوگیا۔ وہ
میں بمقام لاہور پیدا ہوئے تھے۔ ۶۱ سال اُن کی عم
ابھی اُردو کے لئے بہت کام کرتے لیکن افسوس کہ ا
اجل آگیا۔

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم نے اسلامیہ ہائی
سے میٹرک کرنے کے بعد ایم اے او کالج سے بی اے
ابتداءً پولس میں ملازمت کر لی تھی۔ لیکن رجحان
ادبی تھا۔ چنانچہ جلد مستعفی ہوگئے۔ ترکِ موالات
میں حصہ لیا۔ اور پھر ۱۹۲۹ء میں کلیۃً خود کو اُردو
ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ پہلے رسالہ
جولائی

نکلا۔ اور پھر مولانا تاجور نجیب آبادی سے "ادبی دنیا" لے لیا اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک اُسے چلاتے رہے۔ "ادبی دنیا" کا انتقالی دَور بڑا شاندار تھا۔ یہ رسالہ جہازی سائز پر نکلا کرتا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد مرحوم نے بہت سے جدید ذہن کے ایسے نئے لکھنے والے پیدا کئے جو بعد میں اردو کے ممتاز ادیب و شاعر ثابت ہوئے۔ انھوں نے "پنجاب اکیڈمی" قائم کی تھی اور پچھلے دنوں "اُردو فاؤنڈیشن" کی طرح ڈالتے ہوئے اپنی ساری جائداد اُس کے لئے وقف کر دی تھی۔

پنجاب میں اُردو کی ترویج و ترقی میں اُن کا زبردست حصہ تھا۔ وہ ایک کامیاب ایڈیٹر، ادیب اور انشاء پرداز تھے۔ ہنوز اُن کے مضامین کتابی شکل میں طبع نہیں ہوئے ہیں۔ مرحوم بے حد عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور یہ نتیجہ تھا اُن کی انتھک خدمات کا۔

بقیہ افسانہ "گیلی لکڑی" صفحہ ۴۶

میں رکھ چھوڑا تھا۔ جلدی میں میں اُسے ساتھ نہ لے سکا۔ تم اُسے کھولو۔ میرے کپڑے خیرات کر دو۔ میرے غیر ضروری کاغذات تلف کر دو۔ ہاں ایک ڈائری ہے جو نامکمل ہے اُسے جلا دو۔ اور اُس کی راکھ کی حفاظت اُس وقت تک کرو جب تک کہ تم میری موت کی خبر نہ سُن لو۔ وہ ڈائری میرا سرمایۂ حیات ہے۔ میں اس تابوت کو مدتوں اپنے کمزور کندھے پر لئے پھرا ہوں۔"

بکس کھولتے ہی میرے دل کا چور جاگا۔ اور ڈائری کو سپردِ آتش کرنے سے پہلے اُسے پڑھنے لگا۔ اُس کے ہر حرف میں ڈاکٹر طوا کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ پھر ایک تصویر ملی۔ جیسے موتنا اور مناکشی ایک ہی شخصیت کے دو نام ہوں۔ ڈاکٹر نے ڈائری کی راکھ اپنی موت تک شاید اسی لئے محفوظ کئے رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ اب میں لوگوں کو کیسے طرح یقین دلاؤں کہ اس میں ڈاکٹر طوا کا کوئی گناہ نہیں۔ اُسے شاید ایسا کرنا ہی چاہئے تھا کیونکہ مناکشی موتنا تھی۔ بالکل موتنا۔ وہی موتنا جس نے ڈاکٹر طوا کا برسوں انتظار کیا۔ تڑپی۔ روئی اور ہجر کی راتیں کاٹ کاٹ کر وہ روگ لگا بیٹھی جس سے جانبر نہ ہو سکی۔ ایک رات جبکہ کھانستے کھانستے اُس کی دھنسی ہوئی خشک کٹوریوں میں آنسو چھلک پڑے تو اُس نے ڈاکٹر طوا کو آخری بار دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ گھر والوں نے تھا اسپتال میں اُس کی بہتی پانچیاں اٹھالی تھیں۔ اور ڈاکٹر جب کمرے میں داخل ہوا وہاں صرف موتنا تھی۔ جو دنوں بیمار رہ کر کروٹ بدلنے کی طاقت بھی کھو چکی تھی اُس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے اور لب بے چین تھے۔ وہ بغل میں بیٹھ کر تسلی دینے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کا وہ جملہ بھی ڈائری کے آخری صفحے میں درج تھا۔ "مایوس نہ ہو موتنا۔ میں تم سے دُور نہیں۔" مگر اُس نے اپنا منہ پھیر لیا تھا۔ اُس نے کہا "مجھے اسی طرح چوم کر رخصت کرو جیسے پہلی بار تم نے مجھے اپنے کمرے سے کیا تھا۔" اور وہ اپنے ہونٹوں کی حرارت کو منتقل کرنے کے لئے اس پر جھک گیا۔ پچیس سال کی تحریر کا رنگ اڑ رہا تھا۔ موتنا کے چہرے کی رنگت کی طرح ڈائری کے کاغذ اُس کے لبوں کی طرح زرد پڑ گئے تھے ــــ یہیں ڈاکٹر نے یہ لکھ کر باقی ورق سادہ چھوڑ دیا تھا کہ "نیلے لبوں کا زہر میرا کی جگتی سے زیادہ تیز ہے۔ میں انہیں نہیں کر سکتا۔"

ڈاکٹر کے الجھن بھرے ہونٹوں کا راز کھل چکا تھا۔ اب بھی جب میرے ذہن کے کسی کونے میں ڈاکٹر طوا کی معصوم اور مُربیانہ تصویر اُبھرتی ہے تو مجھے نیلے ملائم ہونٹ یاد آتے ہیں۔ جنہیں وہ بوہیمین (BOHEMIAN) انداز سے انگلیوں سے سہلا سہلا کر سکون بخشتا تھا اور تب مجھے اس بات کا پورا یقین آ جاتا ہے کہ ڈاکٹر مناکشی کو سب کچھ دے سکتا ہے مگر اپنے بے قرار لبوں کی قربت نہیں بخش سکتا کہ . . .

بقیہ افسانہ "خلش" صفحہ ۵۲

نازش سسک رہی تھی چیخ پر دوڑ کر آنے والے پہلے جاوید بعد میں اشرف بھی آ گیا۔ ان دونوں کا چہرہ ایسا لگتا تھا۔ کسی نے بے دردی سے اُن کے جسم سے خون کا آخری قطرہ نچوڑ لیا ہو۔

ایک خلش تھی ــــ

جو ہاشم اور نازش کے بیچ سے امارت کی دیوار گرائے ہوئے تھی۔

ادارۂ ادبستانِ اردو کی اور ایک منفرد پیش کش

ماہنامہ — "پگڈنڈی" — امرتسر

— کا —

تلوک چند محروم نمبر باتصویر

ہمارا دعویٰ ہے کہ ہندوستان میں اردو کے کسی رسالے نے آج تک کسی ادبی شخصیت کے بارے میں اتنا مفصل اور مربوط مستند اور مکمل نمبر پیش نہیں کیا۔ یہ ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جسکی قدر و قیمت زمانے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے گی۔

یہ نمبر تلوک چند محروم پر مستقل سوانح اور تنقیدی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

چند لکھنے والے

ڈاکٹر ذاکر حسین۔ پروفیسر احتشام حسین۔ فراق گورکھپوری۔ نیاز فتحپوری۔ ڈاکٹر اعجاز حسین۔ ڈاکٹر زور۔ عبدالقادر سروری گوپی ناتھ امن۔ ڈاکٹر سلامت اللہ۔ ڈاکٹر نارنگ۔ ڈاکٹر منوہر سہائے انور۔ روش صدیقی۔ حکم چند نیر۔ ہنس راج رہبر گوربچن چندن۔ عرش ملسیانی۔ منور لکھنوی۔ انجم کرمانی ماہر القادری اور بہت سے۔

سالانہ خریداروں کی خدمت میں یہ نمبر مفت پیش کیا جائیگا۔ سالانہ چندہ چھ روپے۔ تقریباً ۴۰۰ صفحات۔ قیمت :۔ تلوک چند محروم نمبر پانچ روپے کتابت و طباعت دیدہ زیب۔

اِدارۂ ادبستانِ اردو ہال بازار امرتسر (پنجاب)

رہائش 44793 — فون نمبر دفتر 42224

ماہنامہ صبح نو پٹنہ کے عام شمارے بھی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اسلئے کہ اس میں ہر ماہ —

معیاری تنقیدی اور تحقیقی مقالات

جدید طرز کی نمائندہ نظمیں

نئی اور پرانی قماش کی غزلیں

نئے اور پرانے افسانہ نگاروں کی تخلیقات

دلچسپ انشائیے — اور —

اعلیٰ غیر جانبدارانہ تبصرے ہوتے ہیں۔

اب جلد ہی "صبح نو" کا

علی عباس حسینی نمبر

یادگار علمی و ادبی مرقع بن کر سامنے آرہا ہے جسمیں مندرجہ حضرات کی شرکت ہو رہی ہے

ڈاکٹر سید اعجاز حسین۔ پروفیسر احتشام حسین۔ آل احمد سرور، خواجہ احمد عباس، خلیل الرحمن اعظمی، سید سجاد ظہیر، سید مسعود حسین رضوی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر۔ وقار عظیم۔ ڈاکٹر اختر اورینوی، جمیل مظہری۔ رام لعل۔ علی جواد زیدی۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی۔ حیات اللہ انصاری۔ سہیل عظیم آبادی علامہ اختر علی تلہری۔ پروفیسر مسیح الزماں شمیم کرہانی۔ کشور زیدی۔ پروفیسر شبیہ الحسن، کلام حیدری۔ نواب زادہ سید محمد مہدی وغیرہ۔

مشتہرین کیلئے نادر موقع۔ مطالعہ کے شائقین سالانہ خریداری قبول کر کے یہ نمبر مفت حاصل کریں۔

زر سالانہ چھ روپے۔ ملنے کا پتہ :۔

ماہنامہ صبح نو۔ پوسٹ بکس ۱۳۲ پٹنہ ۔

شاعر بمبئی پرنٹر پبلشر اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ۲۳ فورجی اسٹریٹ ٹھاکر دوار بمبئی ۲ میں چھپوا کر دفتر سے شائع کیا۔

... Bomb... DE...
(35 Years of Publication)
MOST POPULAR OLDEST LITERARY & CULTURAL URDU JOURNAL

علامہ سیماب اکبر آبادی

کی چند حیات افروز تصانیف

کلیم عجم	(غزلیات)	چار روپیہ آٹھ آنے
سدرۃ المنتہیٰ	(غزلیات)	چار روپیہ
کار امروز	(نظمیں)	چار روپیہ آٹھ آنے
شعر انقلاب	(نظمیں)	تین روپیہ
عالم آشوب	(رباعیات)	تین روپیہ
[illegible]	(عزائی نظمیں اور سلام)	ایک روپیہ

جلدوں پر [illegible] اور رنگین گردپوش

(مکمل سیٹ کی خریداری پر نصف محصول ڈاک معاف)

منیجر شاعر ، مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس ۲۴۹۶

...Printing Press, Bombay-3

ساقی
فراق جولائی ۱۹۵۹ء

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بانی علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم

اردو کا پینتیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

جلد - ۳۵ — شمارہ - ۱۱

نومبر ۱۹۶۷ء

ادارہ

اعجاز صدیقی

مہندر ناتھ

زرِ سالانہ	زرِ ششماہی	ممالک غیر سے	فی پرچہ
سات روپے	چار روپے	۱۶ شلنگ	۱۰ آنے (۶۲ پیسے)

مکتبہ قصر الادب

پوسٹ بکس ۴۵۲۶ - بمبئی نمبر ۸ بی سی

ایک
کیلو صرف
ایک کیلو ہی کے
برابر ہے
اس کے جوڑ توڑ سے سیر یا پونڈ
کا حساب نہ لگائیں
کیلو ہی
قانونی
باٹ ہے
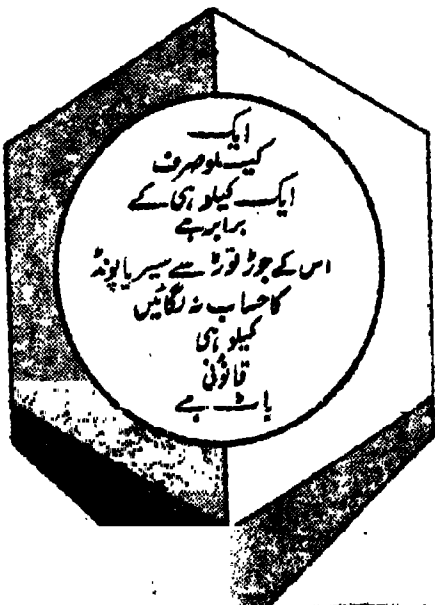
افکار ادارہ

کیا دیکھ رہے ہیں!	۷	اعجاز صدیقی
نقد و نظر	۶۶	ادارہ
محفل اپنی....!	۶۹	ادارہ
رفتار (علمی ادبی اور تہذیبی خبریں)	۷۱	ادارہ

مقالات

فراق کی غزلیں	۹	قمر اعظم ہاشمی
منٹو کی کردار نگاری	۱۵	پروفیسر زرینہ ثانی
فانی — ایک جائزہ	۲۰	جمال

نظمیں

یہ زمیں یہ نسلِ آدم	۲۴	رونق نعیم
نئے راہی سے	۲۵	علیم اللہ حالی
بھرم	۲۵	صبا بہرائچی باغوی
سراب	۲۶	اثر غوری
آواز	۲۶	نقی احمد ارشاد
بوجھ	۲۷	ندا فاضلی
ننگِ وجود	۲۷	عزیز اندوری
سوال	۲۸	ظفر احمد نظامی
عقربِ آگہی	۲۸	سید شمیم احمد

افسانے

منحوس دن	۳۰	اختر ملیح آبادی
خوابوں کے دائیں چلتی ہیں	۳۹	عالم شاہ خاں
مجوملیں، ابلیس اور فرشتہ	۴۴	شہاب دائروی
اپنا گھر	۴۷	عابد ضمیر

طنزیہ

ایک ہنگامہ پہ....!	۳۶	خفیف فرحت

غزلیں

سردار جعفری	۵۴ ۵۵	اعجاز صدیقی
ظرفہ بھنڈاروی	۵۶	حامدی کاشمیری
راہی قریشی	۵۷	احسن جعفری
اصغر مہدی نقوی	۵۸	احمر رفاعی
نذیر بنارسی	۵۹	دل ایوبی ٹونکی
رحمن جامی	۶۰	منشاء الرحمن منشا
زوار حسین احمر	۶۱	شاغل ناگپوری
منظر کوئی	۶۲	لطفی کوٹوی
		مدحت الاختر

مکتوبات

حامدی کاشمیری	حرمت الاکرام	رونق نعیم
منشاء الرحمن خاں	شیام کنول	واحد بیرہمی
علی حید رملک	رام لعل	جاوید انصاری
شہاب دائروی	اظہر افسر	نثار احمد صدیقی

اربابِ ذوق کیلئے

"شاعر" کے سالنامے اور خاص نمبر

شاعر نے اب تک بے شمار "سالنامے" اور "خاص نمبر"
ے کئے ہیں۔ جو اپنے حُسن و معیار کے اعتبار سے بے حد
ل ہو چکے ہیں۔ آئے دن اہلِ ذوق اِن کے متعلق
یافت کرتے رہتے ہیں۔ ذیل میں اُن تمام پُرانے خاص
روں اور سالناموں کی ایک فہرست دی جا رہی ہے
دفتر میں موجود ہیں۔ اِن میں سے بعض کی صرف
دس کاپیاں ہی باقی رہ گئی ہیں۔ یہ سب ادب
ر، تنقید و تحقیق، اور افسانہ و ڈرامہ نہایت قیمتی
یاب ہیں اور سیکڑوں صفحات پر مشتمل۔ ہر نمبر میں مشاہیر
ِ قلم کے شاہکار فن پارے ہیں۔

(۱) سالنامہ ۱۹۵۰ء	دو روپیہ
(۲) منٹو نمبر ۱۹۵۵ء	ایک روپیہ
(۳) افسانہ نمبر ۱۹۵۵ء	دو روپیہ
(۴) خاص نمبر ۱۹۵۸ء	ایک روپیہ چار آنے
(۵) خاص نمبر ۱۹۵۹ء	ایک روپیہ آٹھ آنے
(۶) خاص نمبر ۱۹۶۱ء	ایک روپیہ بارہ آنے
(۷) جمہوریت نمبر ۱۹۶۲ء	ایک روپیہ آٹھ آنے
(۸) افسانہ نمبر ۱۹۶۳ء	ایک روپیہ دس آنے
(۹) سالنامہ ۱۹۶۳ء	ایک روپیہ آٹھ آنے
(۱۰) خاص نمبر ۱۹۶۳ء	ایک روپیہ چار آنے
(۱۱) سالنامہ ۱۹۶۴ء	ایک روپیہ
(۱۲) ڈرامہ نمبر ۱۹۶۴ء	ایک روپیہ بارہ آنے

بیک وقت تمام سالنامے اور خاص نمبر
خریدنے والوں کو ۲۵ فیصد رعایت
(محصول ڈاک ذمۂ خریدار)

منیجر "شاعر" مکتبۂ قصر الادب۔
پوسٹ بکس نمبر ۵۲۶۴۔ بمبئی نمبر ۸۔ بی سی

اُردو کی منتخب اور معیاری مطبوعات

(اِس فہرست میں کئی نایاب کتابیں شامل ہیں)

شعرستان۔ پاکستان کے کئی درجن معروف شعرا کا باتصویر ضخیم تذکرہ ۲/۵۰
سفرِ حجاز۔ حکیم عبدالکریم قمر کا سفرِ حجاز کا دلچسپ سفرنامہ ۲/-
سمندر کی بغداد و نینوا۔ ساغر نظامی کا ایک طویل دلچسپ افسانہ ۲/۴۰
حُسنِ کار۔ محمد صادق ضیا کے فنونِ لطیفہ پر بہترین مضامین ۲/۷۵
خوابوں کے ویرانے۔ مسعود جاوید کے بہترین افسانوں کا پہلا مجموعہ ۲/-
چاندنی کے سائے۔ مسعود جاوید کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ۲/-
آیاتِ شفا۔ اُردو کے مشہور شاعر شفا گوالیاری کا پہلا مجموعۂ کلام ۲/۷۵
صبحِ مشرق۔ محمد صادق ضیا کی نظموں اور غزلوں کا نمائندہ مجموعہ ۲/-
جمالِ کربلا۔ جمال قریشی کے سلاموں اور مذہبی نظموں کا دیدہ زیب مجموعہ ۱/۵۰
پہلی کرن۔ مشہور شاعر ظریف قریشی کا بہترین مجموعۂ کلام ۲/۷۵
رعنائیاں۔ مشہور شاعر شکیل بدایونی کا دیدہ زیب مجموعۂ کلام ۳/۵۰
لکیریں۔ جدید نسل کے معروف شاعر ناز خیر تابگڈھی کا منتخب کلام ۱/-
مصحفِ بیدم۔ حضرت بیدم شاہ وارثی کا نایاب دیوان ۲/-
حیاتِ جانی۔ ریختی کے مشہور استاد جانی کے حالات اور اُن کا کلام ۱/۷۵
مقامِ محمود۔ مشہور ادیب عبدالمالک آروی کے مضامین کا نایاب مجموعہ ۲/۲۵
مضامینِ مالک۔ عبدالمالک آروی کے معیاری مضامین کا دوسرا مجموعہ ۲/۵۰
عکسِ خیال۔ از ارشد صدیقی۔ انگریزی زبان کی مشہور نظموں کا منظوم ترجمہ ۲/-
نبضِ حیات۔ شفا گوالیاری کا دوسرا مجموعۂ کلام ۱/-
دستک۔ نرمل ککار شاد کا مشہور مجموعۂ کلام ۲/-
نشترکدہ۔ حضرت نشتر ہنگامی کا یادگار ضخیم دیوان ۳/۵۰
خضرِ عروض۔ علمِ عروض پر احسان دانش کی مفید کتاب ۱/-
جمالِ ہم نشیں۔ شعرائے مالیگاؤں کا ضخیم تذکرہ اور منتخب کلام ۲/۵۰
زبورِ عرفاں۔ مالیگاؤں کے مشہور شاعر اختر مالیگانوی کا مجموعۂ کلام ۱/۵۰

احسان دانش کے نایاب مجموعے

شیرازہ	گورستان	نغیرِ فطرت	مقامات
۱/۵۰	۱/۵۰	۲/۵۰	۲/۵۰

منیجر مکتبۂ قصر الادب۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۲۶۴ بمبئی ۸

جُرعات:۔

کیا دیکھ رہے ہیں؟

صُوبائی زبانوں کو اپنانے اور اُنھیں ترقی دینے کی کوششیں تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہیں۔ ہر صوبہ اِس کے لئے سخت جدوجہد کررہا ہے اور نفع و ضرر سے قطع نظر کرتے ہوئے ہر کام صوبائی زبان میں انجام دینے کے لئے سخت احکامات نافذ کئے جارہے ہیں۔ دوسری طرف ہر صوبائی زبان کے ساتھ ہندی اور انگریزی زبان بھی رائج ہے۔ غیر ہندی علاقوں کے سرکاری کاموں میں گویا تین زبانیں دخل انداز ہیں اور اِس طرح کام کرنے والوں کو جو دُشواریاں پیش آتی ہیں وہ کچھ کام کرنے والے ہی جانتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک ہی دفتر میں ایک کاغذ کسی زبان میں ہے تو دوسرا کسی زبان میں اور تیسرا کسی زبان میں۔ انگریزی زبان کو واقعتاً ہندوستان کی اکثریت چھوڑنا نہیں چاہتی یہ دوسری بات ہے کہ بہ جبر اِس عالمی زبان کو چھڑوا دیا جائے۔ ہندی زبان سرکاری طور پر نافذ کی جاتی ہے اور صوبائی زبان، اپنے صوبے سے محبت کے نتیجے میں لوگ بولنا اور لکھنا پڑھنا چاہتے ہیں۔

صوبۂ گجرات میں وزیرِ تعلیم شری چھاگلہ نے انگریزی کو قائم رکھنے کے سلسلے میں کچھ باتیں کہی تھیں جن کا ردِعمل بڑا ناخوشگوار ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُونٹ کس کل بیٹھے گا۔ ملک کے کروروں طلباء کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اُس کا کسی کو احساس ہی نہیں ہے۔ عام طور پر طالب علم نہ اچھی انگریزی سیکھ سکتا ہے، نہ ہندی اور نہ صوبائی زبان اور اگر اِن میں کسی زبان میں دسترس حاصل کر بھی لے تو ہو سکتا ہے کہ اُسے کام کسی ایسی زبان میں کرنا پڑے جس پر اُسے عبور نہ ہو۔ سائنس ٹکنالوجی اور میڈیکل تعلیم ہر جگہ انگریزی میں ہوتی ہے۔ تمام طریقے مغرب کے اپنائے جاتے ہیں۔ مشینیں انگریزی میں جواب دیتی ہیں۔ ڈاکٹروں اور سائنس دانوں کے دماغ انگریزی میں سوچتے ہیں، ڈاکٹری اور دیگر ٹیکنیکل مضامین کی تمام کتابیں انگریزی میں ہیں۔ اِسی طرح قانون انگریزی زبان میں پڑھا جاتا ہے۔ بحث انگریزی یا سیدھی سادی اُردو زبان میں ہوتی ہے۔ ججوں اور مجسٹریٹوں کے فیصلے بیشتر صوبوں میں انگریزی زبان میں ہوتے ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ انگریزی زبان سے نفرت کیوں؟۔ پُورے ہندوستان میں عام بول چال جب آسان اُردو میں ہوتی ہے تو کیا سبب ہے کہ تقریروں اور تحریروں میں بعض لوگ وہ ہندی استعمال کریں جو کوئی سمجھ ہی نہ سکے۔

شریمتی اندرا گاندھی کے وزیرِ نشریات و اطلاعات ہونے کے بعد بڑی اُمید تھی کہ کم از کم آل انڈیا ریڈیو کی زبان ایک معتدل زبان بن جائے گی۔ چاہے اُس زبان کا نام ہندی ہی ہوتا مگر وہ سمجھ میں تو آتی۔ افسوس کہ روز بروز ریڈیو کی زبان سخت سے سخت تر ہوتی جارہی ہے۔ ہم دعوے اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں پانچ فیصد لوگ بھی آل انڈیا ریڈیو سے ہر روز نشر کردہ خبریں نہیں سمجھ پاتے۔ محض خالص سنسکرت آمیز ہندی زبان کو پھیلانے کے جنون میں اہلِ مُلک کو ہر روز کی اہم خبروں سے اِس طرح محروم رکھنا دانش مندی نہیں ہے۔ ایسے کروروں لوگ جو یہ سنسکرت آمیز سخت ہندی نہیں جانتے، انگریزی زبان بھی اُنھیں نہیں آتی آخر کیا کریں؟۔ ایک طرف خبروں کی زبان اتنی سخت، دوسری طرف خبریں نشر کرنے والے کا لہجہ نہایت کرخت، بھاری اور کانوں کو ناگوار، اگر آل انڈیا ریڈیو صرف اُونچے قسم کی سنسکرت جاننے والوں کیلئے

ہے تو ہمیں کچھ نہیں کہنا ہے اور اگر اس کا تعلق عوام سے ہے (اور یقیناً ہے) تو وزیر اطلاعات و نشریات اور ریڈیو کے ذمّہ دار افسروں کو اس پر غور کرنا چاہئے۔ مُلک میں زبانوں کے سلسلے میں اتنے تضادات کیوں ہیں، اس درجہ خلفشار کیوں؟ عوام کا اتنا نقصان ہو رہا ہے کہ اس کی تلافی ممکن نظر نہیں آتی۔ آل انڈیا ریڈیو سے ہمہ وقت فلمی گانے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ ان فلمی گانوں نے قوم کے کردار و اخلاق کو جو نقصان پہنچایا ہے غالباً اُس پر کسی کی نظر نہیں۔ اگر گانوں سے ہٹ کر کچھ پروگرام ہوتے ہیں تو وہ کثیر و بیشتر عوام کے ذہن و فکر سے تال میل نہیں کھاتے۔ کبھی کبھی کچھ اچھے پروگرام بھی ہوتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ عام طور پر بکثرت ایسے اچھے پروگرام کیوں نہ ہوں۔ آل انڈیا ریڈیو کو تو ایک ایسی معتدل زبان اپنا لینی چاہئے تھی جسے ہندوستان کی اکثریت سمجھ سکے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ملک کے دانشور اور عوام کیا دیکھ رہے ہیں — کیوں خاموش ہیں؟ عام قومی نقصان پر خاموش رہنا ایک ناقابلِ معافی گناہ ہے۔ مفادِ عامہ سے آخر کب تک چشم پوشی کی جائے گی؟۔ ہمارے اسکول اور کالج اب اور کب تک نااہل طالبِ علم پیدا کرتے رہیں گے۔ ہر بات کی ایک حد و انتہا ہونی چاہئے۔

ایسا نہیں ہے کہ جن اُمور کے سلسلے میں ہم عرض کر رہے ہیں اُن کا مُلک کے رہنماؤں کو احساس نہیں ہے۔ اُنہیں احساس ہے اور کبھی کبھی اُن کے بیانات بھی آتے رہتے ہیں۔ لیکن بات بیانات و احساسات سے آگے نہیں بڑھتی۔ عملی اقدامات وہی اُٹھتے ہیں — ہم نہیں جان سکتے کہ کن مجبوریوں کے تحت ایسا ہوتا ہے۔ کونسا جبر ہے جو دیدہ و دانستہ عوامی نقصان کراتا ہے اور وہ کون حاکم ہے جس کے حکم سے یہ سب کچھ ہوتا ہے۔؟ ہم جمہوریت کے دعویدار ہیں لیکن جمہور کے احساسات کا پاس و لحاظ نہیں رکھتے۔ ہمیں آزاد ہوئے ایک طویل مُدت ہو گئی۔ کیا ہم نے آزادی اس لئے حاصل کی تھی کہ ہمارا معیارِ تعلیم گر جائے۔ ہماری طرزِ فکر کمزور ہو جائے۔ ہماری صحتیں گر جائیں، زبانوں کی آڑ لیکر ہم قومی یکجہتی کو نقصان پہنچائیں۔ نئی نسلوں کو اس سائنسی دَور میں دوسروں سے پیچھے لیجانے کی کوشش کریں۔! اس پینتالیس چھیالیس کروڑ آبادی والے مُلک میں اگر چند ہزار یا چند لاکھ کوئی امتیازی حیثیت رکھتے ہیں تو یہ ایک بے معنی سی بات ہے۔ اُجالا تو وہ ہے جو ہر طرف پھیلے!

آخر میں ہم یہی عرض کریں گے کہ مُلک کو سب سے زیادہ نقصان زبانوں کے اس ٹکراؤ سے پہنچ رہا ہے۔ جب تک اس کا کوئی حل نہیں نکالا جائے گا ہمارا قومی نقصان ہوتا رہے گا۔ ذہنی اور تعلیمی اعتبار سے مُلک کمزور ہی ہوتا چلا جائے گا۔ ہم آج بھی دنیا کے معیارِ زندگی سے سیکڑوں سال پیچھے ہیں۔ آخر اور کب تک یہ پس ماندگی رہے گی۔؟

اعجاز صدیقی

۲۱ر نومبر ۶۴ء

قمر اعظم ھاشمی

فراق کی غزلیں

زندگی اور اُس کے تمام متعلقات عہد کے ایک زنجیری سلسلۂ زماں سے وابستہ ہیں، بادی النظر میں ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان زبردست فاصلے حائل نظر آتے ہیں مگر بنظرِ امعان دیکھئے تو زمانوں کے یہ فاصلے برائے نام ہو ثابت ہوں گے ہمارے اجداد کا حال ہمارے لئے ماضی بن چکا ہے اور ہمارا حال ہماری نسلوں کے لئے ماضی ہو جائے گا۔ مستقبل کچھ اتنی خاموشی مگر برق وشی سے سوادِ حال میں داخل ہو کر ماضی کی گپھاؤں میں گم ہو جاتا ہے کہ اس کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔ دراصل ان تینوں زمانوں میں قابلِ قدر اور اہم زمانۂ حال ہے۔ ہماری زندگی براہ راست ہمارے حال سے وابستہ ہے۔ وہی حال جسے ہمارے اجداد ہمارا مستقبل کہتے تھے اور جو ہماری نسلوں کا ماضی ہو جائے گا۔ یہ حال چاہے ماضی اور مستقبل کے درمیان" ایک مکالمہ" نہ ہو۔ ماضی اور مستقبل کا خالق ضرور ہے۔ فنکار کا وجود ممکن ہے اس قیدِ زمانہ اور بندِ شب و روز میں جکڑا ہو۔ مگر خالق اعصار اور نگارندۂ آفات کا کچھ نہ کچھ وصف اس کے اندر بھی موجود ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ عظیم فنکار زمانہ کو متاثر کرتا ہے۔ بڑے فنکار کی اپنے عہد پر اس اثر اندازی کی تقدیر و تقویم کی ذمہ داری آنے والے دور کے مورّخ کے سر ہے لیکن اس کی نوعیت اور کیفیت سے فی زمانہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ تاریخ ازخود ایسی شخصیتوں کو امر بنا دیتی ہے جو اپنے حال اور مستقبل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہر نیا حال زندگی کی نئی قدریں اپنے ساتھ لاتا ہے لیکن اس کے باوجود ماضی کی کچھ قدریں اس نئے حال" میں بھی برقرار رہتی ہیں۔ تاریخ نئی پرانی قدروں کو نہیں ان کی غیر فانیت اور استحکام کو دیکھتی ہے۔ ولی، میر، نظیر، غالب اور اقبال اردو کے ایسے عہد آفریں شعراء ہیں جن کو ہمارا ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا، انھوں نے نہ صرف حال پر اپنے مستحکم اثرات مرتسم کئے بلکہ مستقبل کو بھی پوری طرح اثر انداز کیا ہے۔ ان شعراء میں بعض ایسی خصوصیات ہیں جو انھیں کی ذاتوں سے وابستہ ہیں، ان کی یہی منفرد خصوصیتیں انھیں اصحاب طرز بناتی اور ان کے اپنے عہد اور معاصرین میں انھیں ممتاز و فائق کرتی ہیں۔ ان کی یہ ذاتی خوبیاں ایک طرف تو ان کے حال کے لئے بالکل انوکھی اور نادر تھیں دوسری طرف ان کی نسلوں کے مستقبل کیلئے مشعلِ راہ اور شمعِ منزل۔ اقبال کے بعد اردو دنیائے ادب میں بہت سے شعراء اُبھرے جن میں بعضوں نے اردو شاعری پر اپنے فن کے گہرے نقوش ثبت کئے اور اُسے کچھ نئی شعری قدریں بھی عطا کیں ان میں شاد، حسرت، فانی، اصغر اور سیماب وغیرہ کے نام ابتک یقینی فراموش نہیں کئے گئے ہیں، مستقبل کی تاریخ انھیں یاد رکھے گی یا نہیں اس کا فیصلہ خود میزانِ وقت کرے گا۔

ان شعراء کے بعد جگر، جوش، حفیظ، فیض، جمیل اور کئی دوسرے سامنے آئے لیکن ایوانِ شاعری میں آواز آج صاف طور پر مسلسل توازنِ آہنگ کے ساتھ سنائی دے رہی ہے وہ فراق گورکھپوری کی ہے ہم نہیں جانتے

آئندہ اس آواز کا حشر کیا ہوگا لیکن صحیح اُنکی شاعری کے جادو نے جو نئے شگوفے اور گل بوٹے کھلا رکھے ہیں وہ یقینی
عہد کے لئے ناقابلِ فراموش ہیں، فراقؔ واقعی خالق ہیں کیونکہ ان کی فنکارانہ صناعی کا دائرۂ عمل بڑا وسیع و عریض
اُنھوں نے نہ صرف نئی نسل کے ایک خاص طبقہ کی فکری پرورش کی ہے بلکہ اپنے عہد کے ایک حلقہ کو پوری طرح
متاثر کیا ہے، اُن کے اندر بھی وہ خلاقانہ صلاحیت موجود ہے جو ماضی، اور حال اور مستقبل کے فاصلہ کو کم کر کے انھیں
متعطا یکجا کر دیتی ہے۔ فراقؔ ہندوستان کے نشاۃ ثانیہ کے ایک اہم نمائندہ ہیں۔ ان کی غزلیں اردو کے شعری سرمایہ میں
اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اُنھوں نے اپنے کئی نقائص کے باوجود اس صنفِ سخن کو نئی قدروں سے سرفراز کیا ہے۔
کے سوچنے کا طریقہ نیا ہے، دیکھنے کا نیا انداز اور گفتگو کرنے کا نیا ڈھنگ ہے اُن کا یہ نیا پن یقیناً نہ صرف حال بلکہ
مستقبل کو بھی متاثر کرے گا۔ فراقؔ کی کچھ غزلوں کے ایک سرسری مطالعہ کے بعد میں نے جو خیالات قائم کئے، کوشش
کروں گا کہ سطورِ ذیل میں من و عن انھیں پیش کر دوں۔

معشوق سے مہ رخوں کے سلسلہ میں ایک بہترین تقریبِ ملاقات ہے اور غزل لطیف ذریعہ اظہارِ مدعا اور حسین
ذریعۂ گفتگو۔ غزل کی تمام نیم وحشیانہ خامیوں کے باوجود اس کی دلکش محبوبیت! اور دلفریب معشوقیت سے انکار کی کوئی
گنجائش نہیں شادؔ نے کہا ہے ؎

نہ قصہ آئینہ کا اور نہ حالِ شانہ کہتے ہیں حقیقت میں جمالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں

جمالِ یار کی یہی افسانہ طرازی غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔ فراقؔ بھی غزل گو ہیں اور ایک کامیاب غزل گو کی طرح
وہ بھی اس کے تمام ایمائی حسن اور رمزی خوبیوں سے کما حقہٗ واقف ہیں۔ غزل کے مطالبوں اور تقاضوں کو وہ
ہر وقت سامنے رکھتے ہیں خود کہتے ہیں ؎

مری ہر غزل کو یہ آرزو تجھے سج سجا کے نکال لئے مری فکر ہو ترا آئینہ مرے نغمے ہوں ترے پیرہن

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ محبوب کو غزل کے رُوپ میں سج سجا کے پیش کرنے کا حق فراقؔ نے ادا کر دیا۔ غزل
خالص متغزلانہ رنگ میں جس فنکارانہ چابکدستی سے فراقؔ نے برتا ہے، میرا خیال ہے ابتک کم ہی شعراء برت سکے
ابتک ہمارے غزل گو شعراء اپنے معشوقانِ نازک اندام سے دور دور ہی رہکر محبت کیا کرتے تھے، بس نظارۂ محبوب
ان کے لئے کافی ہوا کرتا تھا۔ اپنے انتہائی شوقِ ملاقات کی تسکین کے لئے اگر قریب گئے بھی تو محض چند ساعتوں
کے لئے اُس کے بعد پھر ایک وسیع صحرائے ہجر کے طلسم میں گرفتار ہو گئے۔ اس کے برعکس فراقؔ نے اپنے محبوب کی
خوب قربتیں حاصل کی ہیں، اُس کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اُسے ہر طرح سے جانچا اور پرکھا ہے اُس کے ہر
عضوِ بدن کو غور سے دیکھا ہے، اس کی سانسوں کی آہٹیں سُنی ہیں اور اس کی نبضوں کی رفتار کو محسوس کیا ہے۔
وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں جسمانی قربتوں کا احساس اور وہ لمساتی کیف ملتا ہے جو واقعی اردو شاعری کیلئے
اور انوکھی چیز اور ایک نادر و بیش بہا تجربہ ہے ؎

وہ تمام روئے نگار ہے، وہ تمام بوس و کنار ہے
وہ ہے چہرہ چہرہ جو دیکھئے وہ ہے چومئے تو دہن دہن
کفِ پا سے تا درِ ناز تیں کئی آنکھیں کھلتی جھپکتی ہیں
کہ تمام مسکن آہواں ہے دمِ خمسانہ ترا بدن

مجھ کو فراقؔ یاد ہے پیکرِ رنگ و بوئے دوست پاؤں سے تا جبینِ ناز مہر فشاں و مہ چکاں

ان اشعار میں جو معصومانہ (PNORMIC) فنکاری برتی گئی ہے وہ کچھ فراق ہی کی تخلیقی صلاحیت کے بس بات تھی۔ ان کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ عاشق و معشوق کے درمیان خطوط نویسی نہیں اور نہ ان کی محبت ب کے جزیرے کے شہزادے شہزادی والی محبت ہے۔ قاری بہ آسانی سمجھ جائے گا کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے اچھی طرح ارف ہیں اور ان میں خاصی قربت بھی ہے۔ فراق نے محبوب کے خال و خط اور رنگ روپ کو نئے انداز سے متشکل کیا ۔ انھوں نے غزلوں کی روایتی لکیروں کو پیٹنے کے بجائے نئے راستے دریافت کئے عشقیہ مسائل کی کشود کاری اور تجزیہ یل میں فراق کو بڑی قدرت حاصل ہے، یہ چیز صدیوں سے اردو شاعری کا مرکزی موضوع رہا کی ہے لیکن ق اس جوئے کم آب سے مطمئن ہو کر بیٹھ نہیں رہے، بلکہ اسے نئی وسعتیں عطا کیں اور اپنی زبردست تخلیقی قوت اختراعی صلاحیت کے ذریعہ اس موضوع کو نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیا۔ معشوق کے سراپا کی نقاشی اور تراشی میں جس حسین فنکاری کا مظاہرہ فراق نے کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، ایک غزل کے چند اشعار حظہ فرمائیں۔ ؎

پیکر یہ لہکتا ہے کہ گلزارِ ارم ہے — ہر عضو چہکتا ہے کہ ہے صوتِ ہزاراں
زیر و بم سینہ میں وہ موسیقیِ بے صوت — یہ پنکھڑی ہونٹوں کی ہے گلزار بداماں
یہ موجِ تبسم ہے کہ پگھلے ہوئے کوندے — شبنم زدہ غنچے لب لعلیں سے پشیماں
ان پتلیوں میں جیسے ہرن مائلِ رم ہوں — وحشت بھری آنکھیں ہیں کہ اک دشتِ غزالاں
ہر عضو بدن جام بکف ہے دمِ افتاد — اک سروِ چراغاں نظر آتا ہے خراماں
اک عالمِ شب تاب ہے بل کھائی لٹوں میں — راتوں کا کوئی بن ہے کہ ہے کاکلِ پیچاں

پیکرِ محبوب کے گویا لہکتے ہوئے گلزارِ ارم کے ہر عضو کو چہکتا ہوا صوتِ ہزاراں کہنا۔ زیر و بم سینہ کی موسیقیِ بے صوت کو سننا، موجِ تبسم کو پگھلے ہوئے کوندوں سے تشبیہ دینا، آنکھوں کو دشتِ غزالاں اور ان میں پتلیوں مائلِ رم ہرن کہنا، اعضائے جسم کو دمِ رفتار جام بکف دیکھنا اور معشوق کی خوش خرامی کو سر تا بہ قدم ایک سروِ راغاں کی سرگرم خرامی کہنا بڑے پختہ اور بالیدہ شعور اور بالغ ادراکی قوت (MATURED PERCEPTIONAL POWER) والے ہی کا کام ہے۔ یہی وہ انفرادی رنگ ہے جو اردو کی غزلیہ شاعری میں فراق کو ممتاز رتا ہے۔ حسن و عشق کے موضوع کو یوں تو سیکڑوں شعرا تختۂ مشق بناتے رہے ہیں لیکن ان کا حشر بالآخر ہی ہوا جو شاخِ نازک پر آشیانہ بنانے والوں کا ہونا چاہیے۔ فراق برسوں مطالعات و مشاہدات کی دنیا کی سیر کرتے رہے تجربات کی بھٹی میں تپے مشق و ممارست اور فنی ریاضت کی منزلوں میں سرگرداں پھرے، احساسات و خیالات کی وادیوں میں بھٹکے تب ان پر ایک خاص رنگ چڑھا، ان کی اپنی انفرادیت کا ان کے شعورِ فن میں یہ پختگی اور رچاؤ ان کے احساس فن میں یہ لطافت اور پاکیزگی، ان کے تجربہ و مشاہدہ میں یہ باریکی اور نکتہ آفرینی، شعر و ادب کے صدہا نشیب و فراز کو طے کرنے کے بعد آسکی ہے۔ وہ کائنات کی ہر چیز کو اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دوسروں کے متعین کردہ میزان و معیار سے وہ استفادہ ضرور کرتے ہیں لیکن کام میں وہ اپنے ہی میزان و معیار کو لاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حسن و عشق کے معاملہ میں بھی ان کا ایک خاص اندازِ نظر ہے، وہ افلاطونی، ماورائی یا غیر فطری عشق سماوی کے قائل نہیں۔ حسن و عشق کے معاملات میں وہ جسم کو مرکزِ افعال سمجھتے ہیں جو عین فطرت کے مطابق ہے۔ فراق کا یہ رجحانِ فکر روایت پر ضرب کاری ثابت ہوا۔ ان کا عہد جھنجھلا اٹھا، اعتراضات ہوئے، جنسی آلودہ کہا گیا

کے گھڑے ہوئے الزامات اُن کی شاعری پر بھی عائد کئے گئے لیکن اس کے باوجود فراقؔ کی شاعری کی پھیلتی ہوئی وسعت پر کوئی پہرہ نہ بٹھا سکا۔ اُن کے مندرجہ ایک شعر کو بالخصوص نشانہ بنا کر بعض تنگِ فکر افراد نے فحش گوئی کا الزام عائد کیا لیکن اردو شاعری کے قدیم سرمایہ میں فحشیات کا جو انبارِ عظیم ہے اُس میں فراقؔ کے اِس شعر کو ڈال دینا بڑی ناانصافی اور بددیانتی ہوگی ؎

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

موضوع اور اندازِ اظہار دونوں اعتبارات سے یہ شعر اپنی آپ مثال ہے۔ اتنی نزاکت، لطافت اور ... سے اس موضوع پر شاید ہی کوئی اور شعر ملے۔

فراقؔ نے اس عہد کی نسل کو خاصہ متاثر کیا ہے۔ اگر وہ بھی ادبی لات ومنات کو پوجتے ہوتے اور روایتوں پر ڈھلتے رہتے تو پھر آج اُن کی اہمیت بھی پچاسوں دوسرے غزل گو شعرا سے زیادہ نہ ہوتی اور وہ بھی اردو غزل کی معنوی جہتوں سے روشناس نہ کرا سکتے۔ اسی ایک موضوع عشق کو لے لیجئے، اب تک ہزار زاویئے سے شعرا اس پر روشنی ڈالتے رہے ہیں، لیکن اس قسم کے بیشتر اشعار بس ایک محدود معنوی دائرے میں گردش کرتے نظر آتے ہیں صرف پیراہنِ الفاظ بدل جاتے ہیں۔ مانگے کے اُن اجالوں کا بڑا نقص یہ سامنے آیا کہ شعر سے جذبہ احساس اور ... بالکل مفقود ہو گیا، فراقؔ کے ایسے اشعار پڑھئے، احساس کی زبردست گہرائی کی انتہائی شدت ملے گی، ممکن نہیں کہ شعر نظروں سے گذر کر رہ جائے قاری کا متاثر اور متکیف ہونا لازمی ہے اور مزہ یہ ہے کہ جذبہ و احساس اس شدت کے ساتھ فکر کی رعنائی اور عمق بھی موجود ہے، چند شعر دیکھئے ؎

تری نگاہ سے بچنے میں عمر گذری ہے
اُتر گیا رگِ جاں میں یہ نیشتر پھر بھی

نام بھی لیتا ہے جس کا اک جہانِ رنگ بو
دوستو اس نوبہارِ ناز کی باتیں کرو

عکس سا پڑ کے رہ گیا جیسے تری نگاہ کا
یاد سی آ کے رہ گئیں بھولی ہوئی کہانیاں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے، ایسا بھی نہیں

لپٹ گیا ترا دیوانہ گرچہ منزل سے
اُڑی اُڑی سی ہے یہ خاکِ رہگذر پھر بھی

فراقؔ کی غزلوں میں جو دوسرا عنصر نمایاں نظر آتا ہے وہ ان کا احساسِ غم اور روحانی اضطراب ہے۔ غزل معنوی اور صنفی دونوں اعتبار سے جذبہ و تاثر کی شاعری ہے۔ اس صنف میں خواہ غریب الوطن میر طبع آزمائی کریں یا نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، داخلی اور جذباتی رنگ کا وجود ضروری ہے۔ غزل میں شاعر کی شخصیت اور تمام روشن اور تاریک پہلو سامنے آتے ہیں۔ غزل گو اپنے من کی دنیا میں ڈوب کر شعر کہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے شعروں میں اُس کی ذاتی پریشانیاں، محرومیاں اور خواہشیں موجزن ہوتی ہیں۔ وہ جس پستی اور جس بلندی سے گذرتا ہے اس کے فن میں اس کی نمایاں لکیریں سی اُبھر آتی ہیں۔ اس کے اِن نجی عشرت و عسرت کے جذبات کے ساتھ اکثر اُس کے عہد کے مسائل اور سماجی خیر و شر بھی اُس کے فن میں جلوہ فرما ہوتے ہیں کیونکہ فنکار اپنے ماحول سے بے نیاز رہ ہی نہیں سکتا۔ غزل کے اس وصف کے سلسلے میں آپ بیتی اور جگ بیتی، غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی ... عام طور پر مستعمل ہیں۔ دیکھئے فراقؔ نے مزاجِ غزل کے اس رُخ کو اپنا انفرادی رنگ برقرار رکھتے ہوئے کس فنکاری سے ملحوظ رکھا ہے۔

چھڑتے ہی غزل بڑھتے چلے رات کے سائے　　آواز مری گیسوئے شب کھول رہی ہے

اپنا ہو فراق کہ اوروں کا کچھ بات ہی ایسی آن پڑی
میں آج غزل کے پردے میں دکھ درد سنانے بیٹھا ہوں

مجھے پا کے تنہا مری بے بسی　　سر شام بستر لگا جاتی ہے

شام ہی سے گوش بر آواز ہے بزم سخن　　کچھ فراق اپنی سناؤ کچھ زمانے کی کہو

عمر فراق یونہی بسر کی　　کچھ غم جاناں، کچھ غم دوراں

جسے ڈس لیا ہے زمانے نے کوئی زندگی ہے یہ زندگی　　یہ سوادِ شام اجل اجل یہ ضیائے صبح کفن کفن

تجھے منزلیں بھی ہیں رہگذر مجھے رہگذر بھی منزلیں　　یہی فرق ہے مرے ہمسفر یہ ترا چلن وہ مرا چلن

اس غم کی حقیقت کوئی پوچھے مرے دل سے　　جینا غم محبوب میں آسان نہیں ہے

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
یاد سی آ کے رہ گئیں دل کو کئی کہانیاں -!

فراق کے غم کی نوعیت انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی - اس کے نظام احساس کو جب کوئی داخلی یا خارجی مہیج مشتعل کرتا ہے، اس کے متوقع ردعمل کے طور پر خیالات شعر میں متشکل ہو جاتے ہیں - فراق کے ایسے اشعار میں جذبہ و احساس کا بڑا حسین ہم آہنگ توازن ہوتا ہے - ان کے شعروں کی معنویت کو اگر ان کے شعوری مشاہدوں اور فکری قوتوں نے بلندی عطا کی ہے تو ان شعروں کو جذبہ و تاثیر کے عنصر سے ان کے برق وش تخیل اور دہکے ہوئے احساسات (FLAMED FEELINGS) نے روشناس کرایا - فراق کا غم محض برائے غم نہیں، اس میں سوز بھی ہے اور ساز بھی، وہ انھیں غموں میں اپنی زندگی تلاش کرتے ہیں کیونکہ انھیں زندہ رہنے کی تمنا ہے، وہ حیات اور اس کے مظاہر سے متعلق منفی رجحان نہیں رکھتے - ان میں بڑی رجائیت ہے وہ سوادِ شام کی اجل نمائی اور ضیائے صبح کی کفن پیراہنی سے خوفزدہ نہیں ہوتے، رہگذارِ فرار اختیار نہیں کرتے اور شدتِ غم سے خواہش مرگ نہیں کرتے بلکہ ؎

فراق غم بھی ہے میرا حریفِ زندہ دلی　　فسردگی میں بھی یاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

کی صدا لگاتے ہیں - وہ غم کو ایک امر مستقل سمجھتے ہیں - بھیگی راتوں کی پُراسرار خاموشی اور سکوتِ مسلسل سے پیدا شدہ اضطراب دنوں کے باوجود زندگی سے بھاگتے نہیں، اس کی مزید قربت حاصل کرتے ہیں اور اس کے لئے وہ اپنی پریشانیوں ہی کا سہارا لیتے ہیں ؎

مجھ کو غم نے فرصتِ غم بھی نہ دی فراق　　دے فرصتِ حیات نہ جیسے غمِ حیات

اور اس لحاظ سے ان کا یہی رجحانِ الم میر کے فلسفۂ غم سے قریب ہے - بعض اوقات تو میر ہی کی طرح فراق بھی اندر اندر سلگتے ہیں مگر زبان سے اُف بھی نہیں کرتے -

سوزِ نہاں میں وہ قرار، قلبِ تپاں میں وہ صفا　　شعلہ تو تھا تڑپ نہ تھی، آگ تو تھی دھواں نہ تھا

بالکل یہی ضبطِ غم اور جبرِ الم ہمیں میر کے یہاں نظر آتا ہے - بہرکیف فراق کے ایسے شعروں میں بھی شعورِ فن کی وہی پختگی، بالیدگی اور انفرادیت ملتی ہے جو ان کی غزلوں کی وجہِ امتیاز ہے - فراق نے چونکہ اس عہد کی زندگی کا مطالعہ بہت قریب اور غور سے کیا ہے اسلئے ان کے آرٹ میں اس زمانے کی سچی اور صحیح تصویریں منعکس

ہوتی ہیں۔ اُن کی غزلوں میں جلنے اور جلانے کی دونوں کیفیتیں موجود ہیں۔ اپنے وجود کا احساس بھی ہے اور بشریت کے تقاضوں کا اظہار بھی۔ اُن کی تشبیہوں میں بڑی توانائی اور ندرت ہوتی ہے تراکیب کے اختراع اور الفاظ کی موزوں نشست و برخواست پر بھی ان کو پوری مہارت حاصل ہے۔ چند متفرق اشعار حاضر ہیں ؎

کبھی دادِ شوق نہ دے سکا مرے دل کو پر تو دلبری — کہ لرز گیا ہے یہ آئینہ جو لپک گئی ہے کوئی کرن

تجھے پا کے خود کو میں پاؤں گا کہ تجھی میں کھویا ہوا ہوں میں — یہ تری تلاش ہے اس لئے کہ مجھے ہے اپنی ہی جستجو

ہر ایک سانس ہے تجدیدِ یادِ ایامے — گذر گیا وہ زمانہ جسے گذرنا تھا

یہ سکوتِ ناز یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا — خامشی میں کچھ شکستِ ناز کی باتیں کرو

ہوئی واردات سحر بیاں تو گلوں کا سینہ دھڑک اٹھا
یہ چلی کہ تیغِ نسیم نے کہیں ہاتھ اچھال دیا لہو

عنوان غفلتوں کے ہیں فرصت ہو یا وصال — بس فرصت حیات فراق ایک رات ہے

آپ نے دیکھا ان اشعار میں اپنی ناقدریوں کے شکوے بھی ہیں اور اپنی جستجو بھی۔ بات تو عام ہے مگر انداز پیش کش اور ذریعۂ اظہار کے تاثر کو ملاحظہ فرمائیں۔ سکوتِ ناز اور دل کی رگوں کے ٹوٹنے کے اوقات میں شکستِ ساز کی باتیں کرنا اور وارداتِ سحر سے گلوں کے سینے کی دھڑکن محسوس کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔

فراق کی غزلیں بے شبہ اس عہد کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ صنف غزل میں آج بھی ایک صاحب طرز کی حیثیت سے اپنی منفرد آواز کے ساتھ داخل ہو جانا بڑی بات ہے۔ اگر فراق نے غزل کے خارجی حسن کی تزئین و آرائش اور داخلی و معنوی خوبیوں کا یہ حسین امتزاج خلوصِ فن کے ساتھ ہمیشہ برقرار رکھا تو یقینی اُن کے اثرات اور گہرے ہوتے جائیں گے اور آئندہ نسل اُن سے خاطر خواہ استفادہ کر سکے گی۔ ان کے یہاں ایک نقص جس کی شکایت اب عام طور پر کی جانے لگی ہے پست و بلند اشعار کی یکجائی ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ اگر فراق اپنی غزلوں کی غیر ضروری طوالت کو حذف کر دیا کریں تو پھر ان کا ایک عیب دور ہو جائے، غزل میں ہر قافیہ کا ڈھونڈ کر استعمال میں لے آنا استادانہ خصوصیت کا تو مظہر ہے، فنکارانہ عظمت کا سبب نہیں۔

زرینہ ثانی

منٹو کی کردار نگاری

تہذیب و تمدّن کی تبدیلیاں ہر چیز پر اثر انداز ہوا کرتی ہیں اور اس قسم کے تغیّرات افسانوی ادب پر بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک زمانہ تھا جب ہم "مافوق الفطرت" قسم کے کرداروں کے بارے میں پڑھتے ہوئے نہ تو اکتاہٹ محسوس کرتے تھے اور نہ ہی وہ ہمیں غیر دلچسپ معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ ہماری تمام تر توجہ اُن پر مرکوز ہو جاتی تھی۔ یہ اس وجہ سے تھا۔ کہ اُس زمانے کی پیداوار ہی اسی قسم کا ادب تھا جبکہ انسان زمانے کی تلخیوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر پناہ اور فرار کا راستہ تلاش کرتا تھا۔ اور اس قسم کے کرداروں کے درمیان وہ یہی محسوس کرتا کہ کسی اور دنیا میں ہے مگر آج تہذیب و تمدّن اور سماجی تقاضوں نے ہمارے ذہن کو بدل دیا ہے آج ہم افسانوی ادب کے کرداروں میں ایسی قدریں تلاش کرتے ہیں جو ہمارے اور اُن کے درمیان مشترک ہوں۔ وہ بھی ہماری طرح اسی دنیا کے رہنے بسنے والے انسان ہوں —— ہم ایسے ہی گوشت پوست کے بنے ہوئے کرداروں سے محبت کرتے ہیں۔ جو نہ تو مجسّم رحمانی ہی ہوں اور نہ صرف پیکرِ شیطانی۔ بلکہ ہماری ہی طرح کے انسانی کردار ہوں۔ انہی کو ہم خود سے قریب پاتے ہیں اور ہماری ہمدردیاں اُن کے ساتھ ہو جاتی ہیں جہاں ان کی بُرائیوں پر نفرت سے منہ سکیڑ لیتے ہیں وہیں ان کی اچھائیوں پر تحسین و آفریں کے پھول نچھاور کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جہاں اُن کی بُرائیوں سے گُریز کرنے کی کوشش ہوتی ہے وہیں اچھّائیوں کو اپنانے کی بے پناہ خواہش بھی۔

آج ہم کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے انسانیت اور مُدنیت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ زمانہٗ موجودہ کے معیار کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں، کیونکہ ہمارے تخیّلات اور ذہنی دنیا میں انقلاب کے ساتھ ساتھ وسعت بھی پیدا ہو گئی ہے اور ہم کسی کردار کے "مسیحائی قسم" کے فعل کو "غیبی امداد" سے تعبیر کرنے کی بجائے اُس کی ذہانت صلاحیت اور محنت پر مبنی سمجھتے ہیں۔ گویا کرداروں کی صحیح قدر و قیمت اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ وہ ہماری دنیا کے کردار ہوں ہمیں منٹو کے یہاں اسی قسم کے کردار نظر آتے ہیں —————— اُن کے کرداروں میں اس درجہ حقیقت ہوتی ہے کہ کبھی کبھی افسانوی رنگ بھی پھیکا پڑ جاتا ہے جس طرح جملوں میں تیزی اور تیکھا پن ہوتا ہے اُسی طرح اُن کے کرداروں میں بھی تیکھا پن ہوتا ہے، ان کے کرداروں کے خدوخال اس طرح ابھرتے ہیں کہ ذہن کے پردوں پر اس کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔

کردار دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو افسانہ نویس اس کی شخصیت کی تشریح و تاویل سے پیش کرتا ہے جسے ہم "توصیفی" کہتے ہیں، دوسرے وہ جو بذاتِ خود اپنی حرکات و سکنات سے اپنی شخصیت کے خطوط نمایاں کرتے چلے جاتے ہیں، جسے ہم "تمثیلی" کہتے ہیں۔ منٹو کے یہاں دونوں ہی قسم کی کردار نگاری ملتی ہے۔ وہ اپنے کردار کی

ہرتہ کو کھول کر سامنے رکھ دیتے ہیں کبھی تو اُن کی شخصیت کا اظہار اُن کے حرکات و سکنات سے ہوتا ہے اور کبھی خود منٹو کی تشریحات سے۔ منٹو کے یہاں کردار کا ارتقا عام رفتار سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ ہوتا ہے یہ رفتار ایک چونکا دینے والے نکتے پر آکر ختم ہوجاتی ہے اور اختتام پر قاری چونک پڑتا ہے "موذیل" کے کردار کا ارتقا اسی سُرعت سے ہوتا ہے۔ یہ کردار انتہائی متاثر کن ہے۔ وہ ایک پیشہ ور لڑکی، ایک بے وفا اور شادی کے معاملے میں ترلوچن کو دھوکا دینے والی کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے لیکن ترلوچن سے اُس کی محبت کی گہرائی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب وہ اپنی جانِ عزیز کی قربانی دیکر ترلوچن کی دوسری محبوبہ کرپال کور کو فساد زدہ علاقے سے نکلوانے میں کامیاب ہوجاتی ہے، ابتدا میں اس کے کردار سے نفرت ہوتی ہے مگر اس کی عظیم قربانی ہمیں اس بات پر سوچنے کے لئے مجبور کر دیتی ہے کہ چاند کے دھبے اس کی روشنی کو جذب نہیں کر سکتے، اسکی دودھیا روشنی ہمیشہ فضا میں خنکی اور نرمی بکھیرتی ہے۔ جب ہم ایسی لڑکی میں انسانی محبت اور ہمدردی پاتے ہیں تو یہ سوچنے کے لئے مجبور ہوجاتے ہیں کہ انسان میں شیطنت اور شر کے ساتھ ساتھ انسانیت اور خیر کے جذبات بھی کسی نہ کسی گوشہ میں ضرور ملتے ہیں، یہ کردار ہمیں نظریات سے زیادہ عمل کا حامل نظر آتا ہے، ذہین —
اُس کی ذہانت ہمیں پہلی بار اسوقت نظر آتی ہے جب وہ پولیس والے کو جھانسا دیتی ہے۔

"اُدھر اُس باجو ہمارا بہن رہتا ہے اس کی طبیعت خراب ہے، ڈاکٹر لے کر جا رہا ہے" اور پھر سگریٹ پیش کرتی ہے، اس طرح سپاہی کو چکمہ دیکر کھٹ کھٹ کرتی چلی جاتی ہے، دوسری بار جب لوٹ کا مال لے کر ایک آدمی آتا ہے اور ترلوچن کو مارنے پر تیار ہوجاتا ہے تو اس کی ایکٹنگ قابلِ ستائش ہے، وہ لڑکھڑاتی ہے جیسے نشہ میں چُور ہے، آدمی کو دھکا دیکر مخمور لہجہ میں کہتی ہے

"اپنے بھائی کو مارتا ہے؟ اس سے ہم شادی کرنے کو مانگتا"

اور پھر ترلوچن سے کہتی ہے

"اٹھاؤ یہ پرت اور رکھ دو اس کے سر پر"

جب کرپال کور کو نکالنے کی کوشش میں جان دے دیتی ہے تو ہماری ہمدردی اُس کے ساتھ ہوجاتی ہے اور ہم اس کے کردار کی بلندی و عظمت کے قائل ہوجاتے ہیں۔ اُس کی قربانی پر بے ساختہ دل بھر آتا ہے اور آنکھیں نم ہوجاتی ہیں، کامیاب کردار نگاری کی بہترین مثال موذیل ہے۔ منٹو نے ظاہر کر دیا ہے کہ گندگی میں بھی پاکیزہ گوہر ہوتے ہیں۔ بُرے سے بُرے انسان کے دل میں بھی کہیں نہ کہیں نیکی کی کرن جگمگاتی ہے۔

منٹو نے نچلے طبقے کے کرداروں کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ اُن کے یہاں مہذب زر پرستوں اور ظاہر داروں سے زیادہ انسانیت ہے، وہ اپنی بُرائیوں کو پس پردہ ڈال کر خود کو اعلیٰ درجہ کا انسان ظاہر نہیں کرتے بلکہ جیسا باطن ہے اسی لباس میں سامنے آجاتے ہیں۔ جیسے عبدا کا کردار۔ یہ ایک کوچوان کی کہانی ہے۔ جو اچھائیوں پر جنون کی حد تک یقین رکھتا ہے۔ انسانیت کے زیور سے مرصّع و آراستہ اپنے تانگے اور گھوڑے سے پیار کرنے والا۔ وہ فسادات کی آندھیوں میں دوسروں کی طرح دولت سمیٹنے کی کوشش نہیں کرتا، اگر کوئی کچھ دیتا ہے تو اپنی بلند ظرفی کا یوں اظہار کرتا ہے۔

"لالہ جی"! یہ وقت ہے کہ آپ سے انعام لوں؟ جب آپ واپس آئیں گے تو دیکھا جائے گا"
وہ قواعد کا پابند ہے جب ایک سکھ مہاجر لڑکی لوٹ آتی ہے۔ تو اُسے محفوظ مقام پر پہنچانے کی قسم کھاتا ہے

شاعر بمبئی

مگر وہ مصیبت کی ماری اُس میں انسانیت کی جھلک دیکھ کر اُس کے پاس پناہ گزین ہو جاتی ہے۔ عبدا بے انتہا پریشان ہوتا ہے اور اُس کو اُس کی ذات برداری کے پاس بھیجنا چاہتا ہے مگر روپ اس کے کردار کی پاکیزگی سے بے انتہا متاثر ہوتی ہے اور کہتی ہے۔

" نہیں ۔۔۔ تم تانگے والے ہو جو عام طور پر بدمعاش ہوتے ہیں مگر تم نے کوئی ایسی حرکت نہ کی جس نے مجھے ڈرایا ہو اور جس نے مجھے جتایا ہو کہ میں محفوظ نہیں ۔۔۔ میں ..... میں ..... تمہارے پاس رہوں گی یہ الگ بات ہے کہ تم مجھے دھکے دے کر باہر نکال دو "

اس کے بعد وہ تہیہ کر لیتا ہے کہ اُس کی حفاظت کرے گا اور اس کے اعتماد کے شیشے میں بال تک نہ آنے دے گا۔ اس کردار کا ارتقا بڑا فطری ہوتا ہے رات میں وہ نیند سے کوسوں دور کروٹیں بدلتا ہے لڑکی کا چہرہ بار بار اُس کے سامنے رقص کرتا ہے، اُس کے جذبات کی اس کشمکش کو نمایاں کیا گیا ہے، اور جب صبح لڑکی سے ملتا ہے تو اس پر چور نگاہ ڈال کر پشیمان ہو جاتا ہے اور اپنی اس حرکت کو واہیات سمجھتا ہے۔ پھر بڑی صاف گوئی سے کام لے کر کہتا ہے۔

" تم نوجوان ہو۔ خوبصورت ہو۔ میں لاکھ ایماندار سہی مگر جی پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ بہتر ہے تم چلی جاؤ "

مگر وہ روتی ہے اور اُس کے پاس رہتی ہے۔ دو زندگیوں کے خرچ کے بعد بھی عبدا کسی کو لوٹتا نہیں جبکہ دوسرے تانگے والے اُس سے کئی کئی گنا زیادہ کرایہ لیتے ہیں، مگر وہ وہی لیتا ہے۔ جو پہلے لیا کرتا تھا۔ اس کردار میں منٹو کی حقیقت نگاری نقطۂ عروج پر ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ انسان نہ ہی محض شر ہے اور نہ ہی محض خیر، بلکہ دونوں کا مرکب ہے۔ انسان گوشت پوست کا بنا ہوا ہے، اس کے دل میں صرف " افلاطونی عشق " کے جذبات نہیں بلکہ ایک عام انسان کے جذبات ہوتے ہیں۔ وہ گناہ کرتا ہے، اس کے متعلق سوچتا ہے مگر روپ کا رویہ اُسے تسلی دیتا ہے۔ روپ کی بیماری میں وہ سب کچھ بیچ دیتا ہے۔ بال بال مقروض ہو جاتا ہے اس پر بھی جب روپ اسے لاپروائی کا طعنہ دیتی ہے تو اس کا دل دکھ جاتا ہے وہ کسی نہ کسی طرح اس کی دوا کے لئے بارہ روپئے لاتا ہے، مگر روپ کو اپنی غلطی کے احساس کے ساتھ ساتھ ندامت بھی ہوتی ہے اور اتنے اچھے انسان کو طعنہ دیکر زندگی کو موت پر ترجیح دیتی ہے۔ اس طرح کہانی ختم ہو جاتی ہے اور عبدا کا کردار ہمارے ذہنوں پر ایک نہ مٹنے والا نقش مرتسم کر دیتا ہے،

منٹو ہر قسم کی نفسیات کا ماہر ہے۔ وہ اپنے کرداروں میں نفسیاتی پہلوؤں کو اُبھارتا ہے۔ جو نفسیات کے لحاظ سے اعلیٰ اقدار کے حامل ہوتے ہیں۔ جیسے " گونی " میں عورت کی نفسیات کو واضح کیا ہے۔ عورت کتنی ہی روشن خیال مہذب اور تعلیمیافتہ ہو، مگر وہ اپنی محبت میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کر سکتی۔ جب شفقت عائشہ کی ہمدردی اپاہج لڑکی کے ساتھ دیکھتی ہے تو درد بھرے لہجے میں کہتی ہے۔

" شفقت صاحب! کون شادی کرے گا ایک اپاہج سے "

" مردوں کے دل میں رحم کہاں " تو شفقت کی انسانیت اُبھرتی ہے اور وہ اُس کا حل عائشہ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ مگر عائشہ کی ساری ہمدردی رقابت کے جذبہ میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اور وہ چلاتی ہے،

" شفقت صاحب میں گولی مار دوں گی اُسے، اگر آپ نے اُس سے شادی کی " اسی طرح کی دوسری مثال کلثوم ہے جو اپنی سہیلی کے ساتھ اپنے شوہر کی ہمدردی دیکھ کر اُس سے قطع تعلق کر لیتی ہے۔ یہ ہے عورت کی نفسیات کا صحیح تجزیہ، جیسے عائشہ جیسے کردار میں پیش کیا گیا ہے، یہ ہمارے معاشرے کا ایک بلند کردار ہے جیسے موذیل جیسے کردار سے اعلیٰ مانا گیا ہے۔ مگر موذیل کی انسان دوستی سے ہم بے ساختہ متاثر ہوتے ہیں جب کہ

عائشہ کے سلسلے میں عورت کی فطرت کی کجی کو دیکھ کر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔
منٹو نے کرداروں کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اس کے بعد اُن کی الجھنوں کو سلجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے، اس نے مختلف کرداروں کا تجزیہ کر کے بتلایا ہے کہ کون سی چیز سے ہمیں پہلو بچاتا ہے اور کہاں انسانیت کی خاطر جان دیتا ہے، جیسے سردار زور آور سنگھ کا کردار ہے، جسنے اپنے دوست کا اعتماد حاصل کیا۔ جس کا دوست اس بات پر خوش ہوتا ہے کہ اس نے اس کی غیر موجودگی میں اس کی بیوی کا خیال رکھا۔ اس کی تیمار داری نرس سے بڑھ کر کی، جو اس کے ساتھ انتہائی خلوص برتتا رہا۔ مگر جب سردار زور آور سنگھ کا اصل رُوپ ہمارے سامنے آتا ہے تو تنفر سے منھ سکڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ریاکاری سے دوست کا اعتماد حاصل کر کے اُس کے سرمایۂ حیات پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ اس کے برخلاف باسط کا کردار ہے، صاف مجلّا۔ اُجلا ستھرا۔ جو ماں کی خوشی کی خاطر سعیدہ سے شادی کر لیتا ہے اور یہ سوچ کر کہ اس میں سعیدہ کا کیا قصور ہے اُسے ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے اس کے خوفزدہ رہنے پر اُسے پیار سے تھپتھپاتا ہے اور کہتا ہے۔

"اب ذرا ہنسو — ہنسو میری جان" شاباش اسی طرح مسکراتا ہوا چہرہ ہونا چاہئے ہر وقت"

اُس کی انتہائی کوشش نباہ کی ہے۔ جب سعیدہ اسقاطِ حمل کے لئے اس کی نظریں بچا کر سفوف پھانکتی ہے اور باسط کی آمد پر چونک کر خوفزدہ ہو جاتی ہے، باسط کو شبہ بھی نہیں ہوتا۔ اور یہی سمجھتا ہے کہ کسی بیماری کا علاج ہو رہا ہے۔ مگر حقیقت سامنے آتی ہے اور وہ دلیرانہ انداز میں اس کا مقابلہ کرتا ہے، وہ معاشرے اور سماج کی نام نہاد عزت کے چاہنے والوں کی طرح اُسے طلاق دیکر قصہ تمام نہیں کرتا۔ بلکہ سعیدہ کے بارے میں سوچتے سوچتے ہمدردی کا جذبہ بڑھ جاتا ہے۔ اُس پر ترس آتا ہے، اُسے اس کی ماں کے یہاں پہنچا دیتا ہے اور ماں کے ڈانٹنے پر کہتا ہے"

"نہیں امّی جان! سعیدہ بڑی اچھّی لڑکی ہے"

ماں کے استفسار پر سعیدہ کا راز چھپانے کی غرض سے کہتا ہے"

"وہ ..... کچھ نہیں امّی میری نکسیر پھوٹی تھی"

آخر میں، ہر طوفان کا مقابلہ کرنے کے بعد باسط اس سے پیار سے کہتا ہے"

"زیادہ رونا اچھّا نہیں سعیدہ جو خدا کو منظور تھا ہو گیا"

الغرض باسط کے کردار میں انسانیت کی تمام خوبیاں نمایاں ہیں" حالانکہ آج کے انسانوں میں اس قسم کے جذبات اور قربانی کی کمی ہی نہیں بلکہ فقدان نظر آتا ہے، آج کے معاشرے میں ہمیں صرف نام نہاد عزت وقار اور فضیلت کی ضرورت ہے جو ہم سے اس قسم کی انسانی جسارت کرنے کی سزا میں چھین لی جاتی ہے حقیقی انسان وہی ہے جو جھوٹے نام اور عزت کے لئے انسانی جذبات کو قربان نہ کرے۔

منٹو کے زیادہ تر افسانوں میں ہمیں بازارِ حُسن کی عورتوں کے کردار ملتے ہیں۔ مگر کردار نگاری کے سلسلے میں منٹو یہاں بھی اونچا ہے۔ اُس نے اس طبقے کے کرداروں کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے یہاں کی عورتوں کی نفسیاتی الجھنوں کو بے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ یہاں بھی منٹو کے یہاں وہی انسانی جذبات نظر آتے ہیں جو دوسرے قسم کے کرداروں میں ہیں۔ طوائف صرف طوائف نہیں بلکہ اس کے سینے میں بھی گوشت پوست سے بنا ہوا دل دھڑکتا ہے جس میں سچی چاہت کی لگن ہوتی ہے، جس میں ممتا کی روشنی ہوتی ہے۔ جو خلوص سے معمور ہوتا ہے۔ مگر ہمارے سماج

میں اس کی قدر نہیں ہوتی۔ شاردا اور جانکی کے کردار میں خصوصاً اس بات کو پیش کیا ہے۔ شاردا کا ہیرو نذیر اسکی خاطر شکنتلا سے ملتا ہے مگر یہ اس کے بس کی نہیں۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ شاردا سے ملتا ہے، جو اپنی بہن کو بجانے کی خاطر وہاں آتی ہے۔ وہ ایک بیمار بچی کی ماں ہے، جب نذیر اس کی بچی کے لئے دوا منگواتا ہے تو اس کے لئے جذبۂ تشکر ابھر آتا ہے۔ اور جب وہ اس ننھی بچی سے پیار کرتا ہے تو سب کچھ بھول کر خود کو اس کے حوالے کر دیتی ہے، یہاں تک کہ اس کے کہنے سے شراب بھی پی لیتی ہے۔ اس افسانے میں مامتا کا جذبہ پورے عروج پر ہے پھر نذیر کے پاس شاردا تک جانے کے لئے روپیہ نہیں ہوتا تو شاردا اکریم دلال کے ہاتھوں اس کے پاس بہت سے نوٹ بھجواتی ہے۔ اور نذیر کو تکلیف نہ ہو اس لئے وہ بچے پور اپنی بہن کے کولے کر چلی جاتی ہے شاردا کے کردار میں انسان دوستی کی مکمل تصویر ملتی ہے۔ اسے جب پتہ چلتا ہے کہ نذیر مالی مشکلات میں مبتلا ہے تو اس کی امداد کرتی ہے روپے سے — جو عام طور سے طوائفوں کا سرمایۂ حیات ہوتا ہے۔ آخر کار فسادات میں جب نذیر کی بیوی چلی جاتی ہے اور وہ تنہا ہوتا ہے تو شاردا کا رنگین تصور اس کے ذہن پر چھا جاتا ہے اور وہ اسے بلوا لیتا ہے۔ مگر اب شاردا میں نہ وہ کشش ہے نہ وہ لذت۔ جو پیسہ دیکر اسے خریدنے میں ملتی تھی۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ بیوی سے غداری کر رہا ہے، اس پر جھلاہٹ سوار ہوتی ہے آخر کار وہ مورد عتاب بنتی ہے۔ مایوس ہو کر شاردا اس کی غیر موجودگی میں اپنی محبت کا جنازہ اٹھائے چلی جاتی ہے، یہاں پر نذیر کے کردار کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔ سماج کے عام انسانوں کی طرح اس کا ارتقا ہوتا ہے۔ اس میں مختلف قسم کے جذبات کا تصادم اور کشمکش نظر آتی ہے، دوسری طرف ہم شاردا کی پیار پانے کی تمنا اور انسانیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور اس طبقے کی عورتوں کی مجبوری سے ہمیں ہمدردی ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح جانکی کا کردار ہے جو خدمت گذار ہے جو اپنے گاہکوں کے لئے مامتا کی قسم کا جذبہ رکھتی ہے جو عزیز اور سعید کیلئے مرتی ہے۔ مگر وہ لوگ اس کے خلوص پر اعتماد نہیں کرتے۔

سچ پوچھئے تو اس قسم کے گھناؤنے کردار کی ذمہ داری بہت کچھ سماج ہی پر عائد ہوتی ہے۔ اور سماج کے باعزت لوگ ہی ایسے کرداروں سے نفرت کرتے ہیں، حالانکہ لذت پرستی اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے ایسے ہی لوگ تاریکی میں اُن کے در پر جبہ سائی کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا گیا ہے ؎

واعظ کتاب وعظ لئے ہے تو کیا ہوا
بوتل شراب کی بھی تو پنہاں بغل میں ہے

منٹو نے اپنے افسانوں میں بعض کردار ایسے بھی پیش کئے ہیں جنھیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان کرداروں نے مصنف کو اپنے وجود میں لانے کے لئے اکسایا نہیں بلکہ "ضرورت" یا محض لذت پرستی کی غرض سے یہ وجود میں آئے اور اس طرح افسانے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

جمال

فانی ـــــــ ایک جائزہ

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
رنج و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

میرؔ کی شاعری میں سوز و گداز، درد و کرب، اضطراب و اضطرار، یاس و نا اُمیدی کے عنصر پانے والے شاید اس مقطع کو اپنے دعوے کی سب سے بڑی اور آخری دلیل سمجھتے ہیں۔ یاوسی اور نامُرادی کی مرثیہ خوانی ایسے نقادوں کے لیے تاثیر کا سرچشمہ ہے۔ میرؔ کے اشعار کو اُن کے بجی، رنج و غم کی دین سمجھنے والے اس نکتے کو فراموش کر جاتے ہیں کہ میرؔ نے جن رنج و غم کا ذکر کیا ہے وہ اُن کے اپنے نہیں پرائے ہیں، اُنھوں نے محض انھیں جمع کیا ہے۔ گویا میرؔ کی قنوطی فطرت ہمیشہ اس تلاش میں رہتی تھی کہ کہیں انھیں رنج و غم ملیں، اور انھیں بٹور لائے، اگر میرؔ نے اپنے اس مقطع میں صداقت سے کام لیا ہے تو اُن کی زندگی میں کربناکی کا تصوّر خود بخود دُھندلا ہونے لگتا ہے۔ ان کی حیاتِ معاشقہ کی ناکامی افسردہ خاطر نظر آنے لگتی ہے۔ اور اُن کے ساتھ سوتیلے پن کے سلوک کا افسانہ اپنی جاذبیت کھو بیٹھتا ہے اور ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ میرؔ نے غم و الم کی جو راگنی چھیڑی تھی اُس میں اُن کے دل کی آواز شامل نہیں تھی۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ ان کے دھیمے لہجے اور رونی صورت نے کچھ دیر کے لئے سننے والوں کو متاثر ضرور کیا تھا۔ لیکن اس کی تاثیر دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ ہم سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آخر یہ بے وقت کی شہنائی کیوں چھیڑی گئی۔ یہ شکوے اور شکایت کیوں اور کس سے؟ دنیا اور دنیا والوں سے بیزاری کس لئے؟ کیا یہ افسردہ نگاہی نہیں ہے کہ دنیا کے وسیع گلشن میں چند کانٹوں کو مرکزِ نظر بنایا جائے اور بے شمار حسین و شگفتہ پھولوں کے حقوق پامال کر دئے جائیں۔ کسی شاعر کے کلام میں عصری روح کے پائے جانے سے ہرگز یہ مُراد نہیں کہ وہ اپنے ماحول کی صرف یک رُخی تصویر پیش کر دے۔ یہ بھی ہے کہ شاعری خواہ کتنی ہی داخلی کیوں نہ ہو وہ خارجی اثرات قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اور شاعر کے جذبات و تاثرات ماحول ہی کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ مگر ماحول صرف برائیوں سے عبارت نہیں ہے۔ اور اگر ماحول کی خرابیوں ہی کو اجاگر کرنے کا نام شاعری ہے تو تبلیغ اور اصلاح کو کس نام سے یاد کیا جائے گا۔ اور ایک شاعر اور مبلغ میں کیا فرق باقی رہ جائے گا۔ شاعر کو ہر حال میں شاعر رہنا ہے۔ غم ہو یا خوشی، سیاست ہو یا سماج، مذہب ہو یا فلسفہ کوئی موضوع ایسا نہیں جو شاعر کی توجہ اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔ لیکن یہ ہمارے لئے قابلِ قبول اُسی وقت ہو سکتے ہیں جب یہ شعر کے سانچے میں ڈھل کر ہمارے سامنے آئیں۔ میرؔ کا رنج و غم کے انبار کو اپنے دیوان کے نام سے تعبیر کرنا۔ ایک ذاتی فعل ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص اُن کی رائے سے متفق ہو جائے۔ شاید میرؔ پرستی کے جذبہ ہی نے اس گمراہ کُن خیال کو جنم دیا ہے کہ غزل نام ہے سوز و گداز کا، نرم لہجگی کا، درد و کرب کا، مایوسی و نامُرادی کا، عاجزی و انکساری کا۔ نشاط و انبساط، بلند آہنگی، شکوہِ الفاظ اور یقین و رجا سے غزل اپنی تاثیر کھو بیٹھتی ہے۔ تاثیر کیا ہے؟ یہ ایک

بحث طلب مسئلہ ہے: "آہ" اور "واہ" کہہ دینے سے یہ گتھی نہیں سلجھتی۔ ہم میں سے کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ ہم اسے محض رنج و غم کے بیان تک محدود کر دیں۔ اور اس کا سہرا میر کے سر باندھ دیں۔

اردو شاعری "دلِ پُرخوں کی اک گلابی" سے عمر بھر "شرابی سی" نہ رہ سکی۔ اس کی بڑھتی ہوئی تشنگی نے نئے جام و مینا بنائے۔ غالب کی ہوشیار سرشاری سے آئینِ میکدہ بدلے۔ اردو شاعری پرانی ڈگر چھوڑ کر، نئی منزل کی طرف گامزن ہوئی۔ مگر منزل اتنی جلد کب شکست مانتی ہے۔ راستے میں پھر پیچ و خم ابھرنے لگے۔ داغ نے، میر کی رہنمائی میں منزل کا فاصلہ اور بڑھا دیا۔ داغ کے چھوڑے ہوئے نقوشِ پا نے بیشمار کج نظر رہروانِ ادب کو گمراہ کیا۔ فانی کا آغازِ سفر بھی انہی نقوشِ پا کے ساتھ شروع ہوا۔ ان کے شعور کی پختگی نے انھیں بروقت سہارا تو دیا اور انھوں نے اپنی سمت بدل بھی لی لیکن اُن کا رختِ سفر اسلاف کے توشہ خانے ہی کا مرہونِ منت ہے۔

میت، کفن، لاش، قبر اور کافور کے بے دریغ استعمال سے فانی کی شاعری زندگی سے بیزار، موت کی آرزومند اور یاسیت کا شکار نظر آنے لگی۔ کم نظروں نے فانی کو بھی میر کا ہمنوا سمجھ لیا۔ "یاسیت کے امام" کا بھاری بھرکم لقب عطا کیا گیا۔ فانی قنوطی اور الم پرست ٹھہرائے گئے۔ اُن کے کلام میں بھی وہی خود ساختہ سوز و گداز، وہی درد و کرب، وہی نرم لہجگی ڈھونڈ نکالی گئی جو میر کا خاصہ سمجھی جاتی ہے۔

فانی کے کلام میں جو زندگی سے بے پناہ محبت ملتی ہے، ان کے غم میں خوشی کی جو آرزو جھلکتی ہے، اور ان کی ناامیدی میں یقین کا جو عکس پنہاں ہے، اس تک کسی کی نظر نہ گئی۔ فانی کی شاعری میں دل و دماغ جس طرح ایک دوسرے سے گھل مل گئے ہیں، میر کے یہاں اس کا ایک ثبوت بھی نہیں ملتا۔

فانی کا کلام اگر اردو کے کسی شاعر سے زیادہ مماثل ہے تو وہ ہیں غالب اور اگر غور سے فانی کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ فانی نے غالب کا تتبع جتنے خلوص اور شعور کے ساتھ کیا نہ عزیز لکھنوی سے ہو سکا اور نہ وحشت کلکتوی سے۔ اس لئے فانی کا شمار اردو کے فکری شاعروں میں ہونا چاہیئے نہ کہ میر جیسے "بے فکرے" شاعروں میں۔

میر اس لئے روتے تھے کہ انھیں رونے میں مزا آتا تھا۔ فانی اس لئے روتے ہیں کہ وہ ہنسنا چاہتے ہیں۔ فانی کا اضطراب، سکون کی تلاش میں ہے۔ ان کی ناامیدی ان کے یقین کی پیداوار ہے۔ وہ زندگی سے شکایت اس لئے کرتے ہیں کہ زندگی سے انھیں وفا کی توقع تھی۔

فانی افلاس کی آغوش میں پلے، محنت و مشقت سے تعلیم حاصل کی، جوان بیٹی کو اپنے سامنے دم توڑتے دیکھا، بیوی کی موت نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ مسلسل المناک حادثوں کا شکار ہونے کے بعد بھی اگر ان کے لہجے میں بلند آہنگی پائی جاتی، اگر وہ نشاطِ کامرانی کے گیت گاتے اور زندگی کی نعمتوں کے ممنون نظر آتے تو یقیناً ان کی شاعری غیر فطری بن کر رہ جاتی۔ اُن کے حالات کا تقاضا یہی تھا کہ ان کا ہر ہر لفظ درد و کرب میں ڈوب جائے۔ ان کی حساس طبیعت نے حالات کا اثر قبول کیا اور ان کے اشعار نالوں میں ڈھل گئے۔ لیکن ان کے نالے نغمہ بیزاری کی علامت نہیں۔ فانی اپنی زندگی کے غم و الم کے ناشر تو ہیں مگر یاس کے شکار کہیں بھی نظر نہیں آتے۔

وہ نامرادِ اجل بزمِ یاس میں بھی نہیں   یہاں بھی فانیٔ آوارہ کا پتا نہ ملا

جب امید کے تار و پود بکھرنے لگتے ہیں، خوابوں کے تانے بانے ٹوٹتے دکھائی دیتے ہیں، دنیاوی وسائل نظر پھیر لیتے ہیں، کوششیں اور تدبیریں کترانے لگتی ہیں تو پائے استقامت میں لرزش پیدا ہونا ضروری ہے۔ دنیا

بیزاری کا خیال بھی جنم لینے لگتا ہے۔ زندگی کے زخم کے لئے صرف موت ہی کا مرہم تلاش کیا جاتا ہے۔ فانیؔ کے قدم بھی کہیں کہیں لڑکھڑائے ہیں۔ زندگی کے کارزار سے فرار کی راہ ڈھونڈنے کا جذبہ اُبھرا ہے لیکن وہ اپنی نظر عروسِ حیات کے جلوؤں سے کبھی نہ پھیر سکے۔ وہ زندگی سے روٹھے مگر اس سے قطع تعلق نہ کر سکے۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے   اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

موجِ حوادث سے ہنستا کھیلتا گزرنا۔ آسانیوں کو دشواری سے تعبیر کرنا قنوطیت کی نشانی نہیں ہے۔ یہ اولوالعزمی؛ یہ بلند حوصلگی زندگی سے بیزاری کا ثبوت نہیں۔ یہ عزم صرف اسی کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے جو منزل پر پہنچنے کا کامل یقین رکھتا ہو۔

فانیؔ غزل کے شاعر تھے۔ غزل کی صنفی مجبوریوں کا احساس رکھنے والے جانتے ہیں کہ ایک حسّاس اور باشعور غزل گو شاعر کے لئے اپنے متنوّع محسوسات و جذبات کو غزل کے محدود دائرے میں سمونا کس قدر دشوار کام ہے۔ غزل کا مزاج اتنا نازک ہے کہ وہ ذرا سی بھی سختی برداشت نہیں کر سکتی۔ حُسن و عشق کے روایتی مضمون کو الفاظ بدل بدل کر بیان کر دینا ہی غزل کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ فانیؔ کی دنیا صرف حسن و عشق تک محدود نہ تھی۔ ان کے سامنے زندگی کے دوسرے مسائل بھی تھے۔ زندگی کے اِردگرد بکھرے ہوئے بے شمار موضوع فانیؔ سے اُن کی توجہ کی بھیک مانگ رہے تھے۔ ایک دردمند اور انصاف پسند شاعر سے جو خود قانون داں بھی تھا، یہ توقع کیسے کی جا سکتی تھی کہ وہ انھیں مایوس لوٹا دیتا۔ چنانچہ فانیؔ کے موضوعِ شاعری نے وسعت حاصل کرنا شروع کی۔ اُن کی فکر کی سرحد وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔ حسن و عشق کے ساتھ حیات و موت، دنیا و عقبیٰ اور جبر و قدر کے مسئلے ان کے کلام میں جگہ پانے لگے۔ فانیؔ کی فنکارانہ صلاحیت کا یہ کمال ہے کہ اُنھوں نے

جو غم مِلا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

کے مصداق ہر موضوع کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیا۔

سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے   کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا   بات پہنچی تری جوانی تک

میں اگر خالص لکھنوی تغزّل ملتا ہے تو

اُن کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا   اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا

میں غالبؔ کی روحِ اجتہاد کروٹیں لیتی دکھائی دیتی ہے۔

فصلِ گُل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے   کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنّا ساتھ نہ تھی   تھک تھک کر اس راہ میں آخر اِک اِک ساتھی چھوٹ گیا

میں فکر و فن کے حسین امتزاج نے نہ صرف دل بلکہ دماغ کے دامن کو بھی احساس کی نعمت سے مالا مال کر دیا ہے

اپنے دیوانوں پہ اتمامِ کرم کر یا رب   در و دیوار دے اب انھیں ویرانی دے

"دیوانے" "در و دیوار" "اور" ویرانی" اردو کے ہر شاعر کے یہاں کثرت سے ملیں گے لیکن فانیؔ نے ان روایتی الفاظ کو جو جدید معنی دئے ہیں وہ دوسروں سے ممکن نہ ہو سکا۔

فانیؔ کو زندگی سے بڑی اُمیدیں تھیں۔ اس لئے وہ ہر وقت اس کے شاکی نظر آتے تھے۔ زندگی کے راز جاننے کی کوشش اُن کے دل میں انگڑائیاں لیتی رہتی تھی۔ زندگی کے پیچ و خم سے وہ آشنا تھے۔

اس کے بعض مسائل کا حل انھوں نے اپنے طور پر ڈھونڈ لیا تھا۔ اگر وہ حل ہمیں مطمئن نہ کر سکے تو یہ اور بات ہے۔ لیکن فانیؔ کی کوشش بہرحال سراہی جائے گی۔

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا | زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
زندگی جبر ہے اور صبر کے آثار نہیں | ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں
تعبیر اجل نے دی اس خواب پریشاں کی | ہم مر کے یہ سمجھے اے ہستیٔ انسانی
ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانیؔ | زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

مسئلۂ جبر و قدر فانیؔ کا اپنا موضوع نہیں - اس پر فارسی اور اردو کے بے شمار شاعروں نے خامہ فرسائی کی ہے۔ مگر فانیؔ اس فرسودہ موضوع کے اظہار میں بھی امتیازی شان رکھتے ہیں۔

گناہگار کی حالت ہے رحم کے قابل | غریب کشمکشِ جبر و اختیار میں ہے
دنیا میں حالِ آمد و رفتِ بشر نہ پوچھ | بے اختیار آ کے رہا بے خبر گیا
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم | رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

یقیناً یہ اشعار زندگی کے صحت مند نظریے کے منافی ہیں اور ان سے پست ہمتی اور کم حوصلگی کا درس ملتا ہے۔ لیکن فانیؔ کی فنکاری کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

غرض فانیؔ اردو کے غزل گو شاعروں میں ایک ممتاز و منفرد مقام رکھتے ہیں۔ بعض الفاظ اور مضامین کی تکرار بسا اوقات ان کے کلام میں یکسانیت ضرور پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن اُن کی ندرتِ بیان، ان کی ترکیب تراشی، اُن کے احساس کی شگفتگی، قاری کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ رکھتی ہے۔ فکر کی آمیزش نے ان کے کلام کو اور بھی با وقار بنا دیا ہے۔ یہاں وہ حسرتؔ اور اصغرؔ تک کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ اُن کا رُکا رُکا سا انداز اور اُن کی محتاط بیانی کہیں کبھی اُن کو داغؔ اور میرؔ کی طرح کھل کھیلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ غم سے نڈھال مصیبتوں کی یورش میں گھرے ہوئے زندگی کا بوجھ کاندھے پر اٹھائے یہ مسافر بڑھتا جاتا ہے۔ قدم لڑکھڑاتے بھی ہیں۔ کہیں کہیں تھک کر بیٹھ جانا بھی پڑتا ہے۔ مگر منزل کی آرزو تلوؤں کو پھر گدگداتی ہے۔ اور قدم خود بخود آگے کی طرف اٹھنے لگتے ہیں۔ تاروانِ ادب اُن کی رہبری پر ناز تو نہیں کر سکتا مگر ان کی ہمسفری پر ہمیشہ فخر کرتا رہے گا۔

رونق نعیم

یہ زمیں، یہ نسلِ آدم

زمیں یہ نسلِ آدم کی تماشا گاہِ فطرت ہے
ملائک رشک کرتے ہیں، یہ اتنی خوبصورت ہے
فلک کی مملکت میں اس کے جلووں کی حکومت ہے
یہ وہ پیکر ہے جو دہرِ جمالِ صبحِ عشرت ہے

یہ اتنی مہرباں ہے رات دن سونا اُگاتی ہے
شکم بھرتی ہے غم دیدہ عزائم کو ہنساتی ہے
جو جیتے ہیں انھیں یہ اپنی آنکھوں پر بٹھاتی ہے
جو مرتے ہیں انھیں یہ اپنے سینے میں چھپاتی ہے

حقیقت جب ہوئی اس کی عیاں آہستہ آہستہ
تصدق ہو گیا سارا جہاں آہستہ آہستہ

جفا نا آشنا ہے پیکرِ مہر و مروت ہے
میں اس کی قدر کرتا ہوں مجھے اس سے محبت ہے

نظر آنے لگی ہر سُو خرد کی جلوہ پیرائی
چمن زارِ تجسس میں کھلے غنچے، بہار آئی
رُخِ تحقیق پر چھانے لگی پھولوں کی رعنائی
وُرودِ آدم و حوا سے اس نے کیا ضیا پائی

سُرور آگیں، نشاط انگیز، اس کا ہر نظارا ہے
یہ فردوسِ نظر ہے پُرکشش ہے شبنم آسا ہے
شرافت اس کا زیور ہے، مروت اس کا گہنا ہے
بہت نزدیک سے اے دوستو میں نے اس کو دیکھا ہے

جہانِ علم و فن کا ذرہ ذرہ جگمگا اُٹھا
سبھی تہذیب کی محفل، تمدن مسکرا اُٹھا

سکوں آمیز ہیں کتنی ترنم خیزیاں اس کی
دلوں کو گدگداتی ہیں تبسم ریزیاں اس کی

حسینوں، مہ جبینوں کی مقدس سرزمیں ہے یہ
نزاکت آفریں ہے، ناز پرور، نازنیں ہے یہ
پرستارِ ہنر، پروردۂ عزم و یقیں ہے یہ
مجھے بھائے نہ کیوں میری نگاہوں میں حسیں ہے یہ

مگر اک دن کہ جب کانٹا چبھا تھا اس کے سینے میں
تھی وحشت زہر بن کر اس کے دل کے آبگینے میں
کوئی مصروف کب تھا، بادۂ گل رنگ پینے میں
نہ تھی کچھ قید مرنے کی، نہ تھا کچھ لطف جینے میں

میں شاعر ہوں مجھے اس کا ہر اک انداز پیارا ہے
چھڑک کر خونِ دل خود اس کو انساں نے سنوارا ہے

نہ کوئی دیکھ کر اس کو گریباں چاک کرتا تھا
نہ کوئی جان دیتا تھا نہ کوئی اس پہ مرتا تھا

خموشی کی خزاں سامانیاں تھیں ہُو کا عالم تھا
کوئی مستِ مئے عشرت، نہ کوئی واقفِ غم تھا
سوادِ شامِ تنہائی سے اِس کا ناک میں دم تھا
نہ نغمہ تھا، نہ نالہ تھا، نہ خوشیاں تھیں، نہ ماتم تھا

کسی گوشے میں بھی سانسوں کے غنچے کھِل نہ سکتے تھے
ستاروں کے حسیں سائے میں دو دِل مِل نہ سکتے تھے

بڑی بے رنگ تھی بیگانۂ ذوقِ نمو ہو کر
پھر اُٹھی تھی گویا یہ حریفِ رنگ و بُو ہو کر
خلا میں گھومتی رہتی تھی ہر دم شعلہ زد ہو کر
نمایاں کب تھی یوں وجہِ نشاطِ آرزو ہو کر

بچھڑ کر اپنے سُورج دیوتا سے یہ حسیں ناری
نہ تھی واقف کہ ہے کیا چیز نغموں کی فسوں کاری

پُرانی بات ہے اب اُس کا عالم پُوچھتے کیا ہو
نہ ہو جائے چراغِ شوق مدھم، پُوچھتے کیا ہو
نگارِ فکر و فن کی آنکھ ہے نم، پُوچھتے کیا ہو
مرے دِل میں چھُپا ہے کونسا غم پُوچھتے کیا ہو

اب اِس ناری پہ آخر کیا شباب آیا غضب آیا
جہانِ علم و حکمت میں نیا اِک انقلاب آیا

سکوں آئے تو کیوں آئے، قرار آئے تو کیا آئے
ابھی میں دیکھتا ہوں چار جانب خوف کے سائے
ابھی کچھ لوگ ہیں اپنی ہَوس کی آگ بھڑکائے
یہ دورِ ارتقا ہے لاکھ، لیکن کون سمجھائے

مرے سینے میں پوشیدہ خلش کچھ اور کہتی ہے
زمانے میں زمانے کی روِش کچھ اور کہتی ہے

خزاں سامان سیاست لے رہی ہے آج انگڑائی
بہت مشکل سے ہوگی نکہتِ گُل کی پذیرائی
غلط مصرف میں ہے برباد جوہر کی توانائی
ہر اِک تعمیر میں تخریب کی ہے کارفرمائی

غرورِ آگہی کا زور ہے ہُشیار ہو جاؤ
ادیبو! شاعرو! دانشورو! بیدار ہو جاؤ

جہاں والے، جہاں کی دلکشی کو بھول بیٹھے ہیں
خلوص و مہر کی پاکیزگی کو بھول بیٹھے ہیں
حدیثِ حُسن کی جادوگری کو بھول بیٹھے ہیں
محبّت کی سُریلی بانسری کو بھول بیٹھے ہیں

نہ باقی ہو کہیں بھی نام لیوا حُسنِ فطرت کا
کثافت چاہتی ہے دم نکل جائے لطافت کا

نئے راہی سے

علیم اللہ حالی

رات ڈھلے اس کلبہ میں تم کیا لینے کو آئی ہو؟
اپنی رنگ و نور کی دنیا آخر کیوں کھو آئی ہو؟
اب تک کالے ناگوں نے اس نگری میں کتنوں کو ڈسا
تم بھی آج اپنا ہی جنازہ کاندھوں پہ ڈھو آئی ہو؟
تم کو کیا معلوم نہیں ہے اس نگری کی ریت رواج
کیا اپنی معصوم جوانی پہلے ہی رو آئی ہو؟
پانی بن کر بہہ جائیں گے اپنی آب کو دیں گے
دو تھالوں میں سچے موتی لے کے یہاں جو آئی ہو

منزل کی تم شیدائی اور ان راہوں میں معدوم
تم ہی بتاؤ آخر کیسے بڑھ کر استقبال کروں
کتنے دیئے آشاؤں کے اس کلبہ میں دم توڑ چکے
آنکھ تمہاری کھل جائیگی میں جو تم احوال کروں
گرچہ ابھی کچھ خونِ تمنا ہاتھ پہ میرے تازہ ہے
اک حسرت کو آج بھی ماروں ہاتھ اپنے پھر لال کروں
ساری جوانی ڈھل جائے گی رنگِ رخ اتر جائے گا
کیوں تم کو امید دلا کر میں آج استحصال کروں

تاریکی میں جب نہ کسی کو پاؤ گی گھبراؤ گی
منزل ہی جب مل نہ سکے گی تھک کر لوٹ نہ جاؤ گی

بھرم

ضیا ہزاری باغوی

چاند اور اس زمیں کا رشتہ بھی
کتنا نازک ہے کتنا سندر ہے
چاند جب دور آسمانوں سے
اپنی کرنوں کا آسرا لے کر
کوئی پیغامِ نو سناتا ہے
کتنے مفہوم اس کے بنتے ہیں

اے مسافر ترا یہ عزمِ سفر
خوب ہے خوب تر ہے کیا کہیئے
ہاں مگر اتنی التجا بھی ہے
آدمی کے سنہرے خوابوں کو
راستہ روکنے سے کیا حاصل
چاندنی کا بھرم تو رہنے دے!!

اثر غوری

سراب

اِسی پگڈنڈی پہ اِک بار ملا تھا تجھ سے
یہیں اِک پیار کی ہلکی سی کِرن پھوٹی تھی
دو دلوں نے یہیں پیمانِ وفا باندھا تھا
دِل نے سینے میں دھڑکنے کی ادا سیکھی تھی
ایک پروانے نے جلنے کی ادا سیکھی تھی
شوخ کلیوں کے تبسم سے کھلا تھا اِک راز
سُرخیٔ عارضِ گل کہہ گئی افسانہ کوئی
چاندنی رات کے آنچل میں سمٹ آئی تھی
تری پازیب کی جھنکار، تری بات کی لَے
مسکراتی ہوئی
شرمائی ہوئی آنکھوں کی
ریشمی پلکوں کی چلمن میں کوئی دیپ جلا
گلشنِ فکر سے جیسے کوئی مہتاب بدن
سبزۂ دل پہ دبے پاؤں چلا آیا ہو
دِل خاموش اِک انجان مسافر کی طرح
دل کی آواز سے ڈرنے لگا گھبرانے لگا
اور کبھی خواب کے انجان چمن زاروں میں
ایک بچے کی طرح نیند میں مسکانے لگا
کتنی شامیں تری زلفوں کی طرح مہکی تھیں
صبح چمکی تھی ترے رُوپ کا سورج بن کر
کتنے جھرنوں میں سمایا تھا ترے تبسم کا لوچ
پھول مہکتے تھے ترے رنگ کی سیج دھج بن کر

آج دیکھا ہے تجھے میں نے تو یوں لگتا ہے
جیسے تو میرے کسی خواب کی پرچھائیں ہے
جس کے ہر نقش میں تھا رنگِ بہارِ گلشن
یہ سراپا ترا اُس رنگ کی تصویر نہیں
میری بے خواب نگاہوں نے جسے دیکھا تھا
کیا وہی خواب تھا؟ جس کی کوئی تعبیر نہیں

شاعر بمبئی
نقی احمد ارشاد

آواز

خوشا وہ صوت کہ جو ڈھل گئی ترنم میں
نکل کے دل سے جو گونجی فضائے انجم میں
دکھا کے رنگِ شفق گھل گئی تبسم میں
کبھی بہاریں بھونروں کے ساتھ منڈلائی
کبھی سُروں میں پپیہوں کے باغ پر چھائی

(۲)

کبھی اُمید کی کرنوں کے تار پر بولی
کبھی صداؤں میں پائل کی یاس سے ڈولی
کبھی بسنت میں کوئل کی بن گئی بولی
فضا پہ چھائی کبھی رات بن کے نغموں کی
کبھی برس گئی برسات بن کے نغموں کی

(۳)

کسی نے ساز کے سرگم میں رکھ لیا اِس کو
نوائے غم میں کسی نے چھپا دیا اِس کو
کسی نے کہہ کے انا الحق عیاں کیا اِس کو
سنائی دی یہ کہیں شورِ ہاؤ ہو ہو کر
کہیں یہ گھٹ گئی دل ہی میں آرزو ہو کر

(۴)

نہ گنگنانے کا بھونرا، نہ اب ہنسے گی کلی
وہی جو صوت کی لَو دل کی دھڑکنوں میں پلی
اندھیری راہوں میں قسموں کے دیپ لے کے چلی
دہک نہ جائے کہیں شعلہ بن کے عالم میں
گماں ہے آگ کا طوفاں اب آ چلا دم میں

ندا فاضلی

بوجھ

میرے بکھرے بالوں پر اور بھی تو ہنستے ہیں
میری خستہ حالی پر قہقہے لگاتے ہیں
میری ہر تباہی پر حاشیے چڑھاتے ہیں

اب تو جو بھی ملتے ہیں، اجنبی سے ملتے ہیں
آنکھیں کھوئی رہتی ہیں، صرف ہونٹ ہلتے ہیں

صرف ایک تم! اتنے کیوں خوش رہتے ہو
میری تلخ باتوں کو سن کے ٹال دیتے ہو
میں جہاں نظر آؤں ہاتھوں ہاتھ لیتے ہو

جان بوجھ کر میں نے کپ کو نیچے پھینکا ہے
بے سبب ہی شبنم کو مار کر رلایا ہے
پین کے نئے نب کو میز پر چلایا ہے

کیوں خفا نہیں ہوتے؟ کیوں بگڑ نہیں جاتے
کس لئے بھلا مجھ سے اب جھگڑ نہیں پاتے

ٹیڑھی ٹیڑھی نظروں سے گھور کر جدا ہو جاؤ
دوست! چند لمحوں کو آج پھر خفا ہو جاؤ

اور بھی تو ہنستے ہیں!!!

شاعر بمبئی
عزیز اندوری

ننگِ وجود

میز پر میری ایک سادہ ورق
جانے کب سے پڑا تڑپتا ہے
اور میرے شعور سے اکثر
میری اس بے مروتی کے گلے
کرتا رہتا ہے اور کہتا ہے
"تیرا فن کار مر چکا شاید"

کس لئے میرے جسمِ عریاں کو
"خلعتِ لفظ" یا "لباسِ حروف"
اپنے ہاتھوں سے بخشتا ہی نہیں

کوئی خلعت نہیں تو کم سے کم
جسم کو اک لباسِ بوسیدہ
بخش دے تاکہ لوگ کہہ نہ سکیں
مجھ کو ننگِ وجود، ننگِ وجود

ہاں! غمِ یار کے حسیں قصے
داستانِ غمِ حیات کوئی
مجھ پہ لکھنے میں گر تکلف ہو
کھینچ دے کوئی آڑی ترچھی لکیر
لیلیٰ مجنوں کا قصۂ فرضی
گڈے گڑیا کا اک کہانی ہی
من گھڑت داستانِ لاحاصل
کچھ تو میرے وجود کو بخشے
تاکہ حالات مجھ کو کہہ نہ سکیں
میں ہوں ننگِ وجود، ننگِ وجود

ظفر احمد نظامی

سوال

(سانیٹ)

تمہارے سرخ لبوں کی حسین مسکانیں
تصورات کی دنیا کو جگمگاتی ہیں
وہ حسن و عشق کی آشفتگی، وہ پہچانیں
حسین تاروں کی مانند جھلملاتی ہیں

تمہارے سیمیں بدن پر وہ شوخ رنگ لباس
کہ جیسے چاندنی راتوں میں آگ لگ جائے
وہ جھولتی ہوئی زلفیں رخِ جمیل کے پاس
کہ جیسے صبح درخشاں پہ شام کے سائے

وہ نغمگی، وہ تبسم، وہ سرخ سرخ آنچل
جبینِ عرش پہ رخشندہ تھے مہ و انجم
حسین ہونٹوں پہ رخشاں تھی میری کوئی غزل
ادائے خاص سے یوں مجھ پہ مہرباں تھیں تم

تو کیوں نہ سازِ محبت پہ گیت گاؤں میں
مجھے بتاؤ تمہیں کیسے بھول جاؤں میں

شاعر بمبئی
سید شمیم احمد

عقربِ آگہی

رات کی ہو خاموشی
یا ہولِ دن کے ہنگامے
ان گنت سوالوں کے
رینگتے ہوئے عقرب
ذہن و قلب کو میرے
روز آ کے ڈستے ہیں
اور میری رگ رگ کا
خوں نچوڑ لیتے ہیں
"کیا حقیقتِ ہستی
تیرے دل پہ روشن ہے؟
حسن اور محبت کا
خواب اور حقیقت کا
رنج اور راحت کا
کذب اور صداقت کا
مفلسی کا، عشرت کا
تجھ کو علم تو ہوگا؟"
کیا جواب دوں ان کو!
فلسفی نہ رہبر ہوں
جن کے ذہن روشن سے
یہ سوال اٹھتے ہیں
میں تو ایک شاعر ہوں
رنگ و بو پہ مرتا ہوں
اور یہ سمجھتا ہوں
زیست کے مسائل کو
جس قدر بھی سلجھاؤ
اور بھی الجھتے ہیں
فلسفہ مصیبت ہے
یہ خرد کی لعنت ہے

اختر ملیح آبادی

منحوس دن

پاسپورٹ کلرک مسٹر گپتا کی شخصیت سے میں بُری طرح متاثر ہوا تھا۔ یہ میرا ردِعمل اُس وقت تھا جب میں مُلاقات کے بعد نواب روشن الدولہ کی کچہری کا زینہ طے کر رہا تھا اور نیچے کمپاؤنڈ کی طرف آ رہا تھا۔ میرا ضمیر رہ رہ کر میرے چٹکیاں لے رہا تھا اور بار بار پسینہ پونچھتا جاتا تھا اور اپنی خجالت کو رہ رہ کر دباتا جاتا تھا کہ مسٹر گپتا کے متعلق میں نے جو رائے جلد بازی اور جذبات میں قائم کی تھی اُس کا یقیناً مجھے کسی حیثیت سے جواز حاصل نہ تھا! — بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ بغیر کسی سے ملے جانے پہچانے اور پرکھے کسی کے متعلق یکطرفہ طور پر بہ عجلت کوئی غلط رائے قائم کر لی جائے!؟۔

جب کہ میں نے اس بد اخلاقی اور غیر انسانی جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اسی لئے تو پسینہ مجھے ڈبوئے دیتا تھا!

بات یہ تھی کہ ابھی ایک گھنٹہ قبل میں ایک ضرورت سے روشن الدولہ کچہری پہنچا تھا۔ ضروری کام یہ تھا کہ پاسپورٹ کلرک سے مل کے مجھے وہ فارم چاہئے تھا جس کے بغیر میں ہندوستانی شہریت کے لئے درخواست نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ درخواست سادے کاغذ کے بجائے حکومت کے ایک مقرّرہ اور مطبوعہ فارم ہی کے ذریعہ دی جا سکتی تھی۔ کام انتہائی ضروری اس لئے تھا کیونکہ میں نے پولیس اور سی آئی ڈی کی مشترکہ مخالفت کے باوجود کسی نہ کسی طرح چھ ماہ کی مسلسل رہائش کی کٹھن شرط کو نہ صرف پورا کیا تھا بلکہ ایک ہی وقت میں پولیس، سی آئی ڈی اور حکومت کو ناجائز رہائش کے معاملہ میں نہ صرف چکمہ دیا تھا بلکہ قانونِ وقت کی عدول حکمی بھی ان معنوں میں کی تھی کہ کپتان پولیس سے تین ماہ کے جائز ویزا کے بعد مجھے کل پندرہ یوم کی جائز اجازت ملی تھی جب کہ پورے ڈھائی ماہ کا قیام نہ صرف یہ کہ ناجائز تھا بلکہ دھاندلی پر منحصر تھا۔

میں نے ڈھائی ماہ کس طرح گذارے یا گن گن کر کاٹے یہ بتانے کی اس لئے ضرورت نہیں کیونکہ شرارت کا تھرمامیٹر ہی اس کا جواب دے سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بہ ہجوم جذبات میں کچہری پہنچا ہوں گا لیکن گیارہ بجے جب مجھے پاسپورٹ کلرک کی کرسی خالی نظر آئی ہوگی اُس وقت میری حالت کیا ہونا چاہئے؟ جب کہ صرف کرسی ہی خالی نہ ہو بلکہ میز کی گرد بھی جوں کی توں ہو —!؟ میں نے گھڑی دیکھی گیارہ بجنے والے تھے لیکن پاسپورٹ کلرک کا کہیں پتہ نہ تھا۔ مجھے صدمہ ہی نہیں ہوا بلکہ اس بات پر غصہ بھی آیا کہ صوبے کا نیا چیف منسٹر تو ٹھیک دس بجے اپنے دفتر پہنچے جبکہ پاسپورٹ کلرک گیارہ بجے اپنی کرسی نہ سنبھالے؟

آخر مجھ سے ضبط نہ ہوا اور میں نے قریب کی میز کی طرف دیکھا۔ ایک کلرک آرام سے ایک پیر کرسی پر رکھے پان کھا رہا تھا اور جواہر لعل کی تقریر پڑھ رہا تھا۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ شاید وہ میری مدد کرے گا لیکن میرا

قیاس غلط نکلا تو اور غصہ آیا۔ آخر جھینپ کر میں نے اُس سے پوچھا!
"کیوں خیر سیان جی! یہ صاحب کہاں ہیں؟
اُس نے اخبار ہٹائے بغیر ٹکا سا جواب دیا اور کہا" ابھی آئے نہیں ہیں؟"
"کیا چھٹی پر تو نہیں؟"
"نہیں۔"
"لیکن!" میں نے ضبط نہ کرتے ہوئے پوچھا "گیارہ بج گیا ہے کب آئیں گے؟"
"کہہ تو دیا کہ آتے ہوں گے!" جواب بدلے ہوئے لہجے میں ملا" آپ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں"
"یہ کاغذی نظام بھی خوب ہے!" میری زبان سے نکلا۔ کچہری کا وقت دس بجے کا ہے جبکہ عملہ آتا ہے بارہ بجے۔!"
آواز کے ساتھ اخبار ہٹا۔ دو تیز آنکھوں نے مجھے گھورا" اور تلخ لہجہ میں بولا۔ دس بجے کا وقت آپ لوگوں کے لئے ہے ہمارے لئے نہیں ہے"
میں نے مسکرا کر اور دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے کہا" کیسا زمانے میں اُبھرنے کی یہی باتیں ہیں؟"
"کیا کہا آپ نے؟ کلرک نے ضبط نہ کرتے ہوئے پوچھا۔ اور میں نے حالات کی بالادستی اور اپنی مجبوری کے پیشِ نظر فوراً کہا" آپ سے نہیں کہا"
مجھے فوراً احساس ہوا کہ اُس نے مجھے "بخش" دیا ورنہ وہ "حاکم" تھا سب کچھ کر سکتا تھا جب کہ میں سائل تھا۔
یہ سوچ کر میں چپڑی کے بکس پر بیٹھ گیا اور پاسپورٹ کلرک کا بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔
ساڑھے گیارہ بجے پاسپورٹ کلرک آگیا" دوکان" سجاتے سجاتے اُسے پندرہ منٹ لگ گئے۔ آخر جب وہ "تخت نشین" ہوا تو گھوم کر میری طرف دیکھا اور بڑی بے نیازی سے اُس نے پوچھا" کہئے۔؟"
میں قریب پہنچا اور زبردستی ہنستے ہوئے میں نے پوچھا" گھر میں خیریت تو ہے گپتا صاحب؟"
"کیوں؟" وہ حیران تھا۔
"آپ کو دیر ہو گئی تھی — میں سمجھا خدا نہ کرے کوئی بات ہے"
"آپ اناڑی معلوم ہوتے ہیں شاید!" اُس نے ہنستے ہوئے کہا" کیا پہلی مرتبہ کچہری آئے ہیں؟"
"بات تو کچھ ایسی ہی ہے" میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔
"یہی بات ہے!" وہ کہنے لگا" ورنہ میں تو روز بارہ بجے آتا ہوں — اچھا کام بتائیے"
میں نے اپنی ضرورت کا اظہار کیا تو اُس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں سمجھ گیا اور مختصراً اپنا کیس سمجھاتے ہوئے بتایا کہ یکم جون کو پاکستان سے آیا تھا۔ ۳۰ نومبر کو چھ ماہ پورے ہوئے۔ آج یکم دسمبر ہے۔ میں شہریت کے لئے درخواست دینا چاہتا ہوں، مجھے چھپی ہوئی درخواست کا فارم مطلوب ہے"
ارے آپ کھڑے کیوں ہیں تشریف رکھئے"
میرا دل بڑھ گیا۔ جب میں بیٹھ گیا تو اُس نے جیب سے سگرٹ نکالی۔ گولڈ فلیک سگرٹ۔ سگرٹ پیش کرتے ہوئے اُس نے کہا۔
"سگریٹ پیجئے — اور یہ بتائیے کہ آپ کو یہ کیسے علم ہوا کہ فارم درخواست میرے پاس ہوں گے"
سگریٹ کے لئے میں نے معذرت کر لی اس لئے کہ پیتا نہیں تھا۔ تب اُس نے جیب سے پان کی پڑیا نکالی۔ میں نے

پان کھایا اور کہا کہ درخواست ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو دی جائے گی لہٰذا فارم بھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاسپورٹ کلرک ہی سے مِل سکتے ہیں۔ وہ مُسکرا دیا اور چپ ہوگیا۔ سگریٹ کے کش لگانے کے بعد پھر بولا۔

" فارم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی اجازت کے بغیر اِشو نہیں ہو سکتا "

یہ علم ہوکر مجھے کوفت ہوئی اِس لئے کہ ظاہر ہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی اجازت ہی سے مِل سکے گی جس کی تائید خود مسٹر گپتا نے کی اور میں یہ سوچنے لگا کہ میری محنت ہی رائگاں گئی اگر پالیسی یہی ہے تب قانون میں گنجائشی دفعہ کی کیا ضرورت تھی۔ دکھاوے سے فائدہ ـــ؟

وہ مجھے اکسا تا رہا کہ میں درخواست کا فارم حاصل کرنے کے لئے درخواست دیدوں اور میں یہ سوچتا رہا کہ سی آئی ڈی سے رپوٹ طلب ہوگی اور درخواست خارج ہوجائے گی۔ فارم نہیں ملے گا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ مجھ سے اظہار ہمدردی کرنے لگا۔ اُس کی گفتگو نیز اخلاق نے مجھے جرأت دلائی اور میں نے کہا "

"گپتا جی! کوئی ترکیب نکالئے۔ میرا کام کیجئے ـــ آپ جو کہیں گے میں خرچ کر دوں گا"

اُس میں شاید انسانیت جاگ گئی تھی۔ میرا ہاتھ پکڑا اور بڑے ہمدردانہ انداز سے کہنے لگا: اختر صاحب! رشوت دینے کی کوشش نہ کیجئے۔ کوئی شک نہیں کہ برٹش رجیم میں خوب رشوت لیتا تھا۔ برطانوی حکومت کو بدنام اور ناکارہ بنانے کے لئے۔ لیکن اب ہم غلام نہیں آزاد ہیں۔ ہم خود اپنے آپ پر حکمراں ہیں۔ اگر بُرائیاں دُور نہ کیں تو ہم خود ہی تباہ ہوجائیں گے ملک گر جائے گا۔ قوم تباہ ہو جائے گی یہی وجہ ہے کہ میں اَب رشوت نہیں لیتا لیکن سب کی خدمت کرتا ہوں۔ یہ میرا قومی فرض ہے۔ اختر صاحب!"

میری آنکھیں جھک گئیں کیونکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک میں اُسے راشی، بے ایمان۔ بدکردار، حرام خور، نااہل اور مجھ سمجھ رہا تھا لیکن جو انسان میرے سامنے بیٹھا مُسکرا رہا تھا وہ نہایت ہی بلند و بالا تھا میری نظر میں اور میں اُس کی عظمت کا معترف ہو چکا تھا۔ یقیناً میں نے اسے جانچنے میں غلطی کی تھی۔ میں نے اُسے ذلیل سمجھا تھا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ خدا میری رعونت یقیناً معاف نہیں کرے گا کیونکہ میں نے اس کے بندے کی توہین کی تھی ـــ!

" آپ یہاں کیوں رہنا چاہتے ہیں۔ اختر صاحب!۔

" مختصر یوں سمجھ لیجئے کہ ـــ جی چاہتا ہے"

وہ ہنسنے لگا اور ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگا:" آپ پریشان معلوم ہوتے ہیں.... ایسا کیجئے اختر صاحب کہ آج تو سنیچر ہے آپ پرسوں تشریف لے آئیے میں کسی نہ کسی طرح آپ کا کام کر دوں گا۔ اطمینان رکھیئے "

ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اندھیرے کمرے میں کسی نے اچانک ماچس جلا دی ہو! میں گڑ گڑا کر چاہتا تھا کہ شکر ادا کروں لیکن اُس کو یہ بھی نہ گوارا ہوا۔ اور جب میں نے چائے پینے کی التجا کی تو اس نے اور زیادہ التجائی انداز میں ہنس کر کہا۔ اس کے لئے مجبور نہ کیجئے ـــ ورنہ میں گناہگار بن جاؤں گا اپنی نگاہوں میں ـــ کھڑے ہو کر ہنستے ہوئے ہاتھ ملا کے اس نے مجھے رخصت کیا اور چلتے چلتے پرسوں کام کر دینے کا وعدہ کیا ـــ زینے پر پہنچ کر میرا ضمیر ضربیں لگانے لگا اور میں معترف تھا کہ مسٹر گپتا کے متعلق مجھ سے یہ غیر انسانی حرکت سرزد ہوئی تھی اور مجھ سے بد اخلاقی کا جرم ہو گیا تھا میں سوچتا رہا کہ کاش میں ایسا نہ کرتا ـــ!؟

دورانِ میں میری زبان مسٹر گپتا کے گُن گاتے گاتے تھک گئی۔ مسٹر گپتا کا کردار مجھے مثالی نظر آیا اور میں نے طے کر لیا کہ وقت آنے پر اس کردار کو میں اپنے افسانے کی بُنیاد بناؤں گا۔ یقیناً ایسے کردار پیش کئے جانے چاہیئں تاکہ دوسرے

سبق ملے اور اس "آئینے" میں لوگ اپنی صورت دیکھیں اور چہرے کے دھبّے دھونے کی کوشش کریں۔ میرا احساس یہ تھا کہ مسٹر گپتا مادرِ ہند کے لئے باعثِ فخر ہے ۔۔۔!

پیر کو میں مسٹر گپتا کے پاس پہنچا۔ اُس نے دیکھتے ہی بتادیا کہ وہ درخواست کا فارم لے آیا ہے۔ پھر بیٹھ کر فارم سمجھانے لگا اور آخر میں کہا:

"یہ فارم بھر لیجئے۔ مجھے دکھادیجئے گا پھر کسی مجسٹریٹ سے اس کو انڈورس کرا دیجئے۔ جو آسانی سے ہو جائے گا میں فوراً کتاب پر چڑھا کر سی آئی ڈی کو بھیج دوں گا کہ انکوائری کے بعد فوراً رپوٹ کی جائے ۔۔۔ گھبرایئے نہیں اختر صاحب! بھگوان نے چاہا تو آپ کو نیشنلٹی مِل جائے گی۔

فارم میری جیب میں تھا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مسٹر گپتا کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔ آخر میں نے چائے کی درخواست بڑی انکساری سے کی جس پر وہ ہنسنے لگا اور یہ کہتے ہوئے ساتھ ہو لیا کہ "آپ شرمندہ کرتے ہیں!"۔ راستے میں وہ بتا رہا تھا کہ اس فارم کے لئے لمبی رشوت چلتی ہے۔ اور یہ کہ اُس کی جگہ جو کلرک تھا وہ دونوں ہاتھوں سے لوٹتا تھا۔ اسی میں بن گیا۔ اگر وہ پہلے والا کلرک ہوتا تو سو روپے سے کم رشوت نہ لیتا۔ میں صرف تائید ہی نہیں کر رہا تھا بلکہ قدم قدم پر شرم سے گڑا جا رہا تھا اور مسٹر گپتا کا احسان اور وزنی ہوتا جا رہا تھا۔

چائے کے بعد پان اور سگریٹ کا دور بھی ختم ہو گیا تو مسٹر گپتا اپنے دفتر کی طرف جانے لگا تو فوراً ہی پلٹ کر اس نے بڑے دوستانہ انداز سے مجھے پکارا اور جیب میں اس کی طرف لپکا تو اس نے بلا تمہید کے کہا: "آپ غلط نہ سمجھئے گا اختر صاحب! آپ کو معلوم ہے کہ میں رشوت نہیں لیتا۔ اور ایمان کی کمائی پیٹ نہیں بھرتی۔ بات یہ ہے کہ واپسی میں مجھے بچّے کی دوا لیتے ہوئے گھر جانا ہے۔ پیسے کم ہیں آپ کے پاس دس روپے ہوں تو دیدیجئے ۔۔۔۔!

ایک لمحے کے لئے میری سانس رک گئی۔ میں نے اسے دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا "آپ اپنا سمجھ کر مانگ لیا۔ یہ پیسے تنخواہ پر میں دیدوں گا۔ دس کا نوٹ میں نے مسٹر گپتا کی طرف بڑھادیا۔ اس نے جیب میں رکھتے ہوئے پوچھا! "آپ درخواست کب لا رہے ہیں؟"

"کل" وہ جاتے جاتے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "میں سب ٹھیک کرا دوں گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ قطعی نہ گھبرایئے۔ ! وہ چلا گیا۔ میں وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ حالانکہ شہریت کا فارم جیب میں تھا۔ آج تو مجھے اُداس نہیں ہونا چاہئے تھا۔ آج مجھے شادیٔ مرگ ہو جانا چاہئے تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں اُداس ہی نہیں بلکہ بہت اُداس تھا ۔۔۔ اس لئے کہ آج ایک انسان مر گیا تھا ۔۔ !

کاغذ کے ایک ٹکڑے نے ایک انسان کا بھرم لے لیا تھا۔ اس کا مجھے ملال تھا۔ غم تھا مجھے۔ اگر فارم کے بغیر جی سکتا تو یقیناً فارم نوچ ڈالتا۔ پھاڑ کر پھینک دیتا اسے ۔ جو ایک انسان کی رسوائی کا سبب بنا تھا۔ لیکن میں فارم پھاڑ نہیں سکا۔ خانہ پُری کے بغیر ہی میں نے گھر کی راہ لی اس لئے کہ میرا ذہنی سکون منتشر ہو چکا تھا اور بہتر یہی تھا کہ فارم کی خانہ پُری کا کام ملتوی کر دیا جائے۔

رکشا کیا اور گھر کی طرف ہو لیا۔ رہ رہ کر مسٹر گپتا کی یاد آتی رہی ۔۔ اندازِ طلب کا خیال آتا رہا ۔۔ اور یہ سوچ کر کوفت ہوتی رہی کہ کاش مسٹر گپتا نے رشوت ہی طلب کر لی ہوتی۔ میں رشوت دینے پر تیار تھا لیکن اُس نے یہ "فنکارانہ" انداز کیوں اختیار کیا؟ پرسوں گاندھی جی کی جھلک دکھائی اور آج اس کے برعکس عمل کر ڈالا۔ مجھے چھت پر چڑھا کر نیچے گرانے کی کیا ضرورت تھی۔ کوٹھے پر سے ہی پھینک دیا ہوتا؟ میں سوچنے لگا کہ اگر اس ظرف کا ظہور عام ہے تو پھر

ہندوستان کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکیں گے، اس لئے کہ وہ قوم اور وہ ملک اُٹھتا نہیں گرتا ہے جہاں کوئی اصول آدرش اور اخلاق نہیں ہوتا ۔۔۔!؟

میں ذہنی و قلب کی چوٹ سہتا ہوا گھر جا رہا تھا کہ راستے میں اپنے چچا زاد بھائی کی یاد آئی ۔ پھر یہ احساس ہوا کہ کئی دن سے ملاقات نہیں ہوسکی ہے گھر جانے کے بجائے ان سے مل لیا جائے ۔ کیوں کہ اُن سے ملنے میں مجھے خوشی اس لئے ہوتی تھی کہ آدمی صوم و صلوٰۃ کے تھے ۔ داڑھی کے مخالف تھے لیکن تقسیم کے بعد اس لئے داڑھی رکھ لی تھی تاکہ ایمانی طور پر دیکھتے ہی پہچان لئے جائیں جب کہ ان دنوں لوگ اپنی شخصیت چھپانے کی فکر میں لگے رہتے تھے ۔ شاہد بھائی داڑھی پال رہے تھے ۔ میرے نزدیک چونکہ یہ فعل انفرادیت و اصول کا حامل تھا اس لئے میں ان کا قدرداں تھا ۔ سوچا کہ مسٹر گپتا نے جو زخم لگائے ہیں وہ وہاں مندمل ہوجائیں گے ۔"

شاہد بھائی نماز میں مصروف تھے ۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا ۔ سلام پھیر کر جب اُنھوں نے وظیفہ شروع کیا تو اپنے چھوٹے لڑکے اطہر کو اُنھوں نے آواز دی جسے وہ "بیل" کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ وہ قطعی جاہل تھا اور ساتھ ہی ساتھ "بھوسہ" کھا کر غضب کی محنت کرتا تھا ۔ جب اطہر آیا تو اُنھوں نے وظیفہ روک کر کہا "پان والے سے پوچھو کہ "اسکور" کیا ہے ۔؟

سن ساٹھ میں ہندو پاکستان کے کھلاڑی کرکٹ کے کھیل میں مصروف تھے ۔ شاہد بھائی موجودہ پوزیشن جاننا چاہتے تھے ۔ اطہر گیا اور جب آیا تو پان والے کی دوکان سے جہاں دن بھر کمنٹری سُنی جاتی جواب لایا اور اس نے کہا ۔ "پاکستان ٹیم بڑھ گئی ہے ۔ حنیف سنچری بنانے والا ہے !"

اس جواب نے شاہد بھائی کو خوش کر دیا ۔ وظیفہ روک کر اُنھوں نے عجیب نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کہا "الحمدللہ" ! ہر نماز کے بعد میں پاکستان کی فتح کے لئے دعا مانگتا ہوں ....!" یہ کہا اور پھر "وظیفہ" چالو کر دیا ۔ میرا سارا جسم جھنجھنا گیا ! شاہد بھائی نے زخم کُرید دئے تھے حالانکہ میں اپنے نمازی بھائی کے پاس نفسیاتی و روحانی علاج کے لئے آیا تھا اُنھوں نے مجھے زندہ در گور کر دیا !

وظیفہ ختم کر کے اُنھوں نے مجھے مُسکرا کر دیکھا اور پوچھا ۔ کیا بات ہے بہت خاموش ہو ؟"

"پاکستان میں ایک اللہ اور ایک رسول کے ماننے والوں نے روحانی ، قلبی ، ذہنی اور جسمانی ایذا ایسی پہنچائی تھی وہاں سے بھاگ کر یہاں آیا تھا لیکن میری بیچارگی دیکھئے کہ گاندھی کے دیس میں بھی مجھے سکون ملتا نظر نہیں آتا ...!"

"تم بہت حساس اور زود رنج ہو اختر !" وہ بولے ۔ "بدل جاؤ ورنہ زیادہ تکلیف اُٹھاؤ گے ۔"

میں نے مسٹر گپتا کی بدکرداری کی تفصیل سنائی تو وہ بے حسی کے ساتھ کہنے لگے "اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے ۔ گپتا نے رشوت لی ۔ کچہری میں کون رشوت نہیں لیتا جب کہ تم خود اُسے رشوت دینا چاہتے تھے ؟"

میں نے عرض کیا کہ پہلے دن اگر وہ فارم مہیّا کرنے کی فیس مانگ لیتا تو مجھے کوفت نہ ہوتی لیکن جس روپ میں وہ پہلے دن نظر آیا تھا وہ بڑا اخلاقی و کرداری رُوپ تھا اُس کو مسٹر گپتا نے چونکہ مٹا ڈالا اس لئے مجھے دکھ ہوا ۔ مشکل یہ ہے کہ جس کسی سے تم ملتے ہو اس کو اپنے ناول کا ہیرو سمجھ لیتے ہو ۔ یہی تمہاری غلطی ہے ایسا نہ کیا کرو یہ دنیا ہے ۔

"واقعی آپ ٹھیک کہتے ہیں !" میں نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا ۔ "مجھے آپ کے متعلق بھی خوش فہمی سے کام نہیں لینا چاہئے تھا ....!"

میں جانتا تھا کہ وہ چونک پڑیں گے۔ داڑھی سہلاتے ہوئے انھوں نے" خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ" سُن کر پوچھا "میں نے کیا کیا؟"

"قتل!" وہ حیران رہ گئے۔ تب میں نے خود کو سنبھالا اور کہا "داڑھی والے کے ساتھ ساتھ میں نمازی سے بھی بچنے کی اسلئے کوشش کرتا رہا ہوں کیونکہ عام طور پر نمازی سطحی ہوا کرتے ہیں — آپ نے بھی اسی پستی کا مظاہرہ کیا....!"

"وہ کیسے؟" — میں نے بتایا کہ نپولین نے مصر پر چڑھائی کی تو پوری قوم مساجد میں نپولین کی توپوں میں کیڑے پڑ جانے کی" دعائیں مانگ رہی تھی اور حملہ آور سکندریہ پر قبضہ کر رہا تھا۔ بالکل اسی طرح آپ ہر نماز پر پاکستانی ٹیم کی فتح کے لئے جو لمبی لمبی دعائیں مانگتے ہیں، وہ غلط ہی نہیں بلکہ اس لئے ناجائز ہیں کیونکہ محنت کے اچھے نتائج کو روکنے کے لئے مانگی جاتی ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ برسات کے دنوں میں آپ دعا مانگیں کہ بارش نہ ہو اور گرمیوں میں سورج نہ نکلے۔ کیا ایسی دعائیں ناجائز نہیں؟ کیا ایسی دعائیں قبول ہو سکتی ہیں؟ کھیل کے میدان میں ہندو پاکستان کی تفریق جائز ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی کھلاڑیوں کا کھیل افضل نہ ہو اور آپ کی غلط دعائیں انھیں فتحیاب نہ ہونے دیں بالکل اسی طرح کہ پاکستانی بہترین کھیل کھیلیں تو ہندو کی پوجا سے ان کی محنت اور فن کا انھیں صلہ نہ ملے کیا یہ ممکن ہے۔ شاہد بھائی؟ نماز میرے نزدیک روشنی کے سوا اور کچھ نہیں جس طرح بٹن دبا دینے سے کمرے میں اُجالا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح نماز انسان کے دل و دماغ میں کے غاروں میں اُجالا پھیلا دیتی ہے لیکن میں نے دیکھا کہ روشنی کے باوجود آپ کے دل کے تہہ خانوں اور دماغ کے غاروں میں اندھیرا پھیلا ہے ظاہر ہے کہ ایسے تاریک گوشوں میں چمگادڑ پنجے اوپر اور سر نیچے کر کے لٹک جاتے ہیں۔ میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا اس نے مجھے قتل کر دیا —— خیر یہ تو کھیل ہے اگر میدان جنگ ہوتا تو کیا ہوتا؟ خدا اتنا منصف نہیں کہ محنت اور جانفشانی کوئی کرے اور کھیل کوئی دوسرا کھائے؟ آگ، آگ ہے ہندو کو بھی جلا دیتی ہے اور مسلمان کو بھی۔ خدا کا قانون اٹل ہے زہر مسلمان کھائے تو نقصان ہوگا اسی طرح ہندو کے لئے بھی زہر مضر ہوگا — لیکن آپ جان بوجھ کر زہر کھا رہے ہیں اور خودکشی کر رہے ہیں آپ نے مجھے بہت ناامید کیا اسلئے کہ ہم روزانہ زندگی میں چھوٹی چھوٹی برائیاں غیر محسوس طور پر کرتے ہیں وہ ہمارا قلب جگر مردہ کر دیتی ہیں ہمارے احساسات فنا کر دیتی ہیں اور انسان کو فکری جذباتی اور کرداری طور پر ختم کر دیتی ہیں۔ روح مر جاتی ہے۔ ڈھانچے چلا پھرا کرتے ہیں اور ایسے کروڑوں لاشے میں نے پاکستان میں بھی دیکھے اور یہاں ہندوستان میں بھی! شاہد بھائی چپ ہو گئے۔ مونچھیں بٹنے لگے میں سمجھ گیا کہ انھیں غصہ آگیا تھا جبکہ مجھے قطعی ندامت نہیں تھی اسلئے کہ "تہذیبی خاموشی" میرے نزدیک گناہِ کبیرہ تھی لیکن ساتھ ہی یہ اندازہ بھی لگا لیا تھا کہ آج سے میں شاہد بھائی کے گھر نہیں آؤں گا اور نہ وہ مجھے لفٹ دیں گے۔

ہم دونوں چپ تھے — شاہد بھائی میری "بدتمیزی" پر غور کر رہے تھے اسلئے کہ میں عمر میں بہت چھوٹا تھا جبکہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ آج کا دن کتنا منحوس ہے — آج دو انسان فراز سے پستی میں گر گئے تھے۔ گپتا اور شاہد! — ایک ہندو اور ایک مسلمان! اور میں سوچتا رہا کہ "ایک یہ" اور "ایک وہ" اگر بدلے نہیں اور ان کی اکثریت ہو گئی تو نہ پاکستان اٹھ سکے گا اور نہ ہندوستان عظیم بن سکے گا جبکہ میں دونوں کے عروج کا متمنی ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ میری آرزو کیسے پوری ہو سکے گی؟ — اگر مسٹر گپتا اخلاق، اصول، آدرش اور انسانیت کا سبق زبان سے دہرا کر دس روپے رشوت کے اینٹھ لے گا اور شاہد مصلّے پر بیٹھ کر وظیفہ روک کر غلط دعا مانگے گا اور دل و دماغ میں اندھیرا باقی رہے گا تو ہندوستان و پاکستان کی عظمت کا خواب دیکھنا کیسے ممکن ہو سکے گا؟ جب ہم نہ بدلیں تو ہمیں کون بدل سکے گا؟ — خدا بھی تو ایسا نہیں کر سکتا —؟ شہریت کا فارم جیب ہی میں تھا اور میں دوسرے زخم کھا کر گھر کی طرف کہتا ہوا کہ "وہ جو تھی خواہش، سنجات گئی" — چلا آیا — لیکن وہ منحوس دن مجھے آج بھی یاد ہے اور ہمیشہ یاد رہے گا —"

شفیقہ فرحت

(طنزیہ)

ایک ہنگامہ پہ.....!

"ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق" اور سالہا سال کے ناکام تجربوں اور اربوں کھربوں روپیہ کی کامیاب بربادی کے بعد یہ نتیجہ نکلا ہے کہ اِس دَورِ جدید میں ہنگامے کی بہترین صورت کانفرنس ہے۔ جس میں بیک وقت نغمۂ شادی بھی ہے اور نوحۂ غم بھی ——— ! رُوئے زمین کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں بلکہ ہر محلے اور ہر گلی میں سال کے بارہوں مہینے اور بارہوں مہینوں کے تیسوں اور اکتیسوں دن امن کانفرنس، تعلیمی کانفرنس، اسلامی کانفرنس اور ہندو کانفرنس سے لیکر بھاجی کانفرنس، بانس کانفرنس، چپّل کانفرنس تک ہوتی رہتی ہے (صرف عاشقوں اور رقیبوں کی کانفرنس کی کمی ہے ——— !) اور یہ کانفرنس چاہے تعلیمی ہو یا بھاجی، ہوتی ہمیشہ آل انڈیا ہے۔ بلکہ اگر کبھی قسمت نے ساتھ دے دیا تو عالمی یعنی (INTERNATIONAL) تک بھی بولی چلی جاتی ہے۔

ایسی ہی ایک انٹرنیشنل کانگریس پلٹ خاتون کی وہ معرکۃ تقریر سُنئے جو اُنھوں نے کانفرنس سے واپسی پر اپنی ہمعصر جُہلا کے جلسے میں کی تھی..

"خواتین ...!

میں سمجھتی ہوں کہ یہاں جو آپ لوگوں نے مجھے کانفرنس کی رُوداد سُنانے کے لئے بلایا ہے تو اس میں میری عزت افزائی قطعی نہیں، بلکہ اُلٹا فائدہ آپ ہی لوگوں کا ہے۔ لہٰذا میں اِس سلسلہ میں شکریہ ادا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ ہاں میزبان صاحبہ کی دُور اندیشی یقیناً قابلِ داد ہے کہ اپنے مستقبل کے لئے اُنھوں نے اچھا انتظام کرلیا ——— !!

کانفرنس میں کون مسائل پر بحث ہوئی! کس کس نے تقریریں کیں اور کیا کیا تجویزیں پاس ہوئیں، یہ سب میں آپ کو نہیں بتاؤں گی، کیونکہ اوّل تو رُوداد آپ لوگوں نے اخباروں میں پڑھ ہی لی ہوگی۔ اور اگر نہیں پڑھی تو میرے پاس پمفلٹ رکھے ہیں، خدانخواستہ آپ کو اِس سے بھی دلچسپی ہو تو جاتے وقت ساتھ لیجائیے اور گھر پر اطمینان سے پڑھئے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اِدھر اُدھر کے ہنگاموں میں اتنی اُلجھی رہی کہ خبر ہی نہیں ہوئی کہ وہاں کیا کیا ہوا ——— وہ تو کہئے کہ پمفلٹ ساتھ تھے اور ریل میں اچھی جگہ مل گئی تھی۔ لہٰذا راستہ میں کچھ اِدھر اُدھر سے اُلٹ پلٹ کر دیکھ لیا۔ اور اب اپنوں سے کیا رازداری، خود اپنا پیپر بھی پمفلٹ میں پڑھنے کے بعد سمجھ میں آیا۔

مقصد یہ ہے کہ میں یہاں آپ کو ایسی ایسی دلچسپ باتیں سُناؤں گی جو آپ کو کسی اخبار یا رسالے میں نہیں ملیں گی۔ خیر پہلے تو آپ میری یہ تصویریں دیکھئے جو دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ کھینچی گئی ہیں ——— یہ دیکھئے اِس تصویر میں میں جس سے ہاتھ ملا رہی ہوں وہ نخلستان کے سفیر ہیں۔ اور یہ دوسری تصویر میں جو صاحب میری طرف پُرتحسین نظروں سے دیکھ کر مُسکرا رہے ہیں وہ اِس کانفرنس کے صدر ہیں۔ اور یہ تصویر راشٹرپتی بھون میں ایٹ ہوم کے وقت کی ہے۔ کیا

ماؤں بس لب بام کمند ٹوٹ گئی ۔ یہ کمبخت فوٹوگرافر اگر ایک منٹ پہلے میری میز پہ پہنچ جاتا تو راختر بتی کے ساتھ میری تصویر جاتی ۔ اب تو میں نے تہیہ کرلیا ہے کہ اگلی کانفرنس میں اور کسی سے کروں یا نہ کروں، فوٹوگرافر سے دوستی ضرور کروں گی۔ ہر قدم پہ ہر ہر پوز میں تصویریں لیجائیں ۔ یا اگر ممکن ہُوا تو خود اپنا فوٹوگرافر ہم رکاب ہوگا ۔ اجی ہاں ہمّتِ مرداں مددِ خدا ۔ ! میرا خیال ہے یہ تصویریں بھی آپ لوگ گھر لے جاکر اطمینان سے دیکھئے گا۔ میرے پاس ہر ایک کی بیس بیس پچیس پچیس کاپیاں ہیں ۔ ۔ !! اب حالات و واقعات سُنئے ۔

پہلے روز میں ذرا دیر سے پہنچی ۔ اور پہلے روز کیا دیر تو ہر روز ہی ہوجاتی تھی ۔ حالانکہ اس میں میرے ارادے کو ذرا بھی دخل نہ تھا ۔ جس پلیس میں ہمیں ٹھہرایا گیا تھا، اوّل تو وہ تھا ہی بہت دُور، پھر سردی اِس غضب کی کہ خود اپنے ہی ہاتھ پیروں سے تعارف میں خاصہ وقت صرف ہوجاتا تھا اور اس پہ طرّہ یہ کہ اس انٹرنیشنل قسم کی GATHERING کی شایانِ شان میک اپ بھی کچھ کم صبر آزما نہیں تھا ۔ نتیجہ یہ کہ جب ہم دوڑتے بھاگتے جائے وقوع تک پہنچتے تو ہمیں لوگ لوٹتے ہوئے مل جاتے تھے ۔ کبھی قسمت زور پر ہوئی تو تھوڑا بہت پروگرام بھی حصّے میں آجاتا ۔

بہر حال تو داستان تھی روزِ اوّل کی ۔ بھانت بھانت کے ایڈوکیٹ بکھیر دو گویا لمبے چوڑے ہال میں چھوڑ دئے گئے تھے ۔ مجھے تو یہ بھی نہیں یاد کہ کس کس دیش کے لوگ وہاں موجود تھے ۔ اپنی تو نگاہیں چکاچوند ہو رہی تھیں ۔ اللہ ۔ کیسے کیسے لباس تھے ۔ کیا تراش خراش تھی ۔ بس ۔ جلوؤں کے ازدحام نے حیران بنادیا تھا کہ

" مقدور ہو تو ساتھ رکھوں " ڈیزائنر" کو میں"

نیز ڈیزائنر نہ سہی خود میں نے ان میں سے کئی ڈیزائن اُسی وقت اُتار لئے تھے جس پہ حاضرین اِس خوش فہمی کا شکار ہوگئے کہ میں کارروائی کے باقاعدہ نوٹس لے رہی ہوں ۔ نظریں بھٹکتی بھٹکاتی جب مصر کے ڈیلیگیٹ کے بالوں کے اسٹائل اور لپ اسٹک کے شیڈ تک پہنچیں تو بس وہیں اٹک کر رہ گئیں ۔ گھنٹہ بھر تک اُسے گھورتے رہنے کے باوجود نہ وہ بالوں کا انداز سمجھ میں آیا اور نہ لپ اسٹک کا رنگ ۔ میں مصری حسینہ سے ملنے کے لئے تڑپ رہی تھی اور پروگرام تھا کہ شبِ ہجر یا بیتاجی کا بھاشن بنا جا رہا تھا ۔ جونہی روایتی اور باضابطہ کارروائی ختم ہوئی ۔ میں اُس کے پاس پہنچی اور باتوں باتوں میں دونوں راز اُگلوا لئے ۔ اور پروگرام کو ادھورا چھوڑ بازار کا رُخ کیا ۔ سارا بازار چھان مارا تب کہیں ایک فارن شاپ میں وہ لپ اسٹک ملی ۔ ادھر پھر آئینے کے سامنے بیٹھی بال بناتی اور کھولتی رہی ۔ اور چار گھنٹے کی محنت کے بعد جب شام کو پروگرام میں پہنچی تو وہیں مصری حضرات نے میری ساری محنت کو نظرانداز کرتے ہوئے مجھ سے وہیں بات چیت شروع کردی ۔ ۔ ۔ لیکن مجھ پر تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا جب میں نے دیکھا کہ اُس مصری حسینہ کے بال اب کسی اور انداز سے سجے ہیں اور لپ اسٹک کا رنگ بھی بدلا ہوا ہے ۔

بہنو ۔ ! ایک اہم بات تو میں بتانا ہی بھُول گئی ۔ افتتاحی پروگرام کے بعد مختلف شعبوں کی میٹنگ علیحدہ علیحدہ ہونے لگی تھی ۔ ہمارے شعبے میں تقریباً ایک سو چار ڈیلیگیٹس میں صرف پانچ خواتین تھیں ۔ چار بیرونی ممالک سے آئی ہوئی اور ایک آپ کی یہ ناچیز بندی ۔ ۔ ! بہر حال یہ بھی ہمارے حق میں اچھا ہی تھا ۔ اگر خواتین کی بھیڑ بھاڑ ہوتی تو ہماری قدر و قیمت کم ہوجاتی ۔ اب تو ہم لوگ "رُوحِ رواں" اور "رونقِ بزم" سمجھے جاتے تھے ۔ ہر شخص ہمارے ان کارناموں کی تعریف میں جو ہم نے قطعی انجام نہیں دئے، زمین و آسمان کے قلابے ملاتا تھا ۔ ہمارے نام ہر کمیٹی اور ہر سوسائٹی کے لئے دئے جاتے ۔ حالانکہ نام تجویز کرنے والے اور تائید کرنے والے اُن رازہائے سربستہ سے بھی پُوری طرح واقف تھے کہ بحث و مباحثہ کے درمیان ہم لوگ سوائے ایک دوسرے سے بآوازِ بلند سرگوشیوں کے کوئی اور کارِ نمایاں انجام نہیں دے سکیں گے ۔ ! اور واقعی ہم لوگوں نے نہایت

خلوص اور سعادت مندی سے یہی کیا۔ دنیا بھر کی باتیں کرڈالیں۔ ایک دوسرے کے متعلق سب کچھ پوچھ لیا۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ہم لوگوں کو ایک دوسرے کے تمام رشتہ داروں، اڑوسی پڑوسیوں، نوکروں چاکروں، سب کی آمدنی و خرچ۔ چال ڈھال، رہن سہن، شادی بیاہ بلکہ عشق عاشقی تک کی UPTO DATE معلومات حاصل ہوگئیں ـــ!

عشق و عاشقی پر سے یاد آیا کہ اس کام کے لئے کانفرنسوں کی فضا بڑی سازگار ہوتی ہے۔ کاش کہ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے دَور میں بھی ایسی ہی کانفرنسیں ہوا کرتیں تو یہ اس عبرتناک انجام سے بچ جاتے۔ شبستان کے ڈیلیگیٹ نے پرستان کی ڈیلیگیٹ کو دیکھا۔ وہ مُسکرائیں، اور پھر دونوں نے اُس دن پڑھے جانے والے مقالوں کا ایک لفظ بھی نہیں سُنا، بلکہ حافظ و غالب کا سارا دیوان اِس طرح ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سُنا ڈالا کہ ہندوستانی فلموں پر ایمان لانا پڑا۔ دیوان وہ دونوں پڑھ رہے تھے اور داد نہ صرف ہم بلکہ آس پاس کے بہت سے لوگ دے رہے تھے۔ ویسے میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ خود صدر صاحب بھی اس میں مقالوں سے زیادہ دلچسپی لے رہے تھے ـــ! میٹنگ کے بعد دونوں ایک دوسرے سے ملے۔ مگر "زبانِ یارِ من ترکی" والا معاملہ تھا ـــ (فلمی گانے سے قطع نظر ـــ!) اب ظاہر ہے کہ وہ کانفرنس ہو یا کسی بیٹی کے والدین کا گھر۔ چڑھتی بیل کو تو چڑھانا ہی پڑتا ہے۔ ہم نے بھی "کچھ اصل اور کچھ طرزِ بیاں" کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے ترجمان کی حیثیت سے اس دھوم دھام سے بیل چڑھائی کہ وہ ساری کانفرنس پر چھا گئی۔

معاف کیجئے گا، تقریر کسی قدر طویل ہوگئی ہے۔ مگر اِس سلسلہ میں الزام مجھ کو نہ دیجئے۔ جانے تصور کس کا نکل آئے ـــ! اور ابھی مجھے اُس بین الاقوامی کانفرنس سے لوٹے دن ہی کتنے ہوئے ہیں ـــ! خیر آپ زیادہ سراسیمہ نہ ہوئیے۔ کیونکہ میرے پاس بولنے کے لئے اب کچھ نہیں رہا۔ میں صرف ایک انتہائی دلچسپ واقعہ اور ایک اہم راز بتا کر تقریر ختم کردوں گی۔

مختلف مُلکوں کے سفارت خانوں میں ہماری دعوتیں ہوئیں۔ بڑے عجیب و غریب قسم کے کھانے تھے کہ اگر ان پر لیبل نہ لگایا جاتا تو ہم سب بھوکے ہی رہا کرتے ـــ! ان کھانوں کی اگر فہرست مرتب کی جائے تو اچھی خاصی شاہی دسترخوان کی قسم کی کتاب تیار ہوجائے اور میرے گھر کا چھپّر پھٹ جائے ـــ! مگر چونکہ مجھے اب لوگوں کی صحت اور رجحان کا زیادہ خیال ہے اس لئے میں اپنا نقصان برداشت کرلوں گی ـــ! اور سب چیزیں تو جیسی تھیں وہ تھیں ہی، مگر رُومانی سفارت خانے کے کدّو رول مجھے اِس درجہ پسند آئے کہ ترکیب کے لئے میں ڈھونڈھتی ڈھانڈھتی، کُرسیاں پھلانگتی، میزیں اُلٹتی سیدھی سفیر کے پاس پہنچی۔ وہ اسوقت ہماری کابینہ کے وزیروں سے اِس بات پر مشورہ کر رہے تھے کہ دونوں ملکوں میں اتحاد کیسے قائم کیا جاسکتا ہے۔ اور تب میں نے نعرہ لگایا کہ اتحاد کا نسخہ میرے پاس ہے۔ شکر ہے کہ انھیں اس دعوے پر اعتبار نہ آیا ورنہ خوشی سے یقیناً مر جاتے ـــ! بہرحال وہ اِس طرف رجوع ضرور ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے کدّو رول بنانے کی ترکیب بتادی جائے، کیونکہ اس سے لذیذ سبزی (یا زردی ـــ!) میں نے آج تک نہیں کھائی۔ میں شہر شہر اور گاؤں گاؤں جاکر لوگوں کو کدّو رول بنانا اور کھانا سکھلاؤں گی اور جب وہ کدّو رول کے دامِ اُلفت میں گرفتار ہوجائیں گے تو یقیناً اُنھیں یہی کہنا پڑیگا۔ "جس ملک کے کدّو رول اتنے عمدہ ہوں اُس سے دشمنی کیسی ـــ" اور تب اتحاد، بھائی چارہ اور دوستی کی گرہیں مضبوط ہوجائیں گی۔

حاضرین میرے اِس اچھوتے خیال اور برجستہ تقریر کو سُن کر یوں پھڑکے کہ نتیجے میں کچھ پلیٹیں، پیالے اور گلاس شہید ہوگئے۔ مگر سفیر صاحب نے کھانا پکانے کے سلسلے میں قطعی لاعلمی کا اظہار کیا اور اپنے سکریٹری سے مدد مانگی ـــ سکریٹری نے ڈیڑھ درجن فائلیں دیکھنے کے بعد عرض کیا کہ چونکہ اِس نام کی کوئی چیز فائل کی منزل تک نہیں پہنچی لہٰذا وہ مجبور ہے۔ بہرحال، سکریٹری نے اپنے پی۔اے کو طلب کیا۔ پی۔اے نے اپنے اسسٹنٹ کو اور اسسٹنٹ نے داروغہ کچن کو۔

(بقیہ صفحہ ۵۳ پر دیکھئے)

عالم شاہ خاں

خوابوں کی رِدائیں جلتی ہیں

اُس کی بڑی بڑی لیکن ویران آنکھوں سے بیکسی، معصومیت اور یاس کا ایک ایسا ملا جُلا جذبہ جھلکتا تھا جسے
رکر دوسروں کا دل بھی مایوس ہو جاتا تھا۔ موٹے فریم کے چشمے سے ڈھکی اُس کی گھنی سیاہ پلکیں اکثر
لی رہتی تھیں۔ جیسے اُن پر کوئی بوجھ آ پڑا ہو اور وہ بار سے بھاری ہو گئیں ہوں۔ اُس کے خشک بکھرے
جنگلی گھاس کے مانند ہواؤں میں کانپتے رہتے تھے۔ وہ سدا خاموش خیالوں میں ڈوبا ہوا کھویا کھویا سا رہتا
بھی کبھی اپنے نچلے موٹے ہونٹ کے بائیں کونے کو دانتوں تلے دبا کر ایک اُچٹتی نظر سے اپنے سامنے دیکھتا اور
نگاہ نیچی کر لیتا۔ اُسی وقت اُس کا بایاں ہاتھ مشینی انداز میں اُس کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی پر چلا جاتا اور پھر
باتا۔ وہ ہمیشہ جماعت کی آخری قطار میں کونے والی نشست پر بیٹھا کرتا تھا اور جب اُس کا نام پکارا
ا تو وہ دھیرے سے "یس سر" کہہ کر کھڑا ہو جاتا۔ کلاس میں جب اُس کا پروفیسر اُس سے کوئی سوال
نا تو وہ سیدھا۔ مختصر لیکن معقول جواب دیکر اپنی نشست پر بیٹھ جاتا۔ بحث کرنا اُسے پسند نہ تھا۔ اس کے
م پر موزوں لباس بہت کم دیکھنے میں آتا تھا۔ وہ اکثر ایک گھِسی ہوئی اونچی خاکی پتلون اور ڈھیلی ڈھالی
بند قمیض میں دکھائی دیتا تھا۔ پیروں میں پڑی چپٹ چپٹ کی آواز کرتی ہوئی پھٹی چپلیں اس کے تھکے
ے قدموں کے منزل سے دُور ہونے کی گواہی سی دیتی تھیں۔ جب وہ کالج کی چار دیواری سے گزرتا
من ہال میں چلا جاتا تو لڑکے اکثر فقرے کستے "مجنوں کے سالے آ رہے ہیں" "یا آفلاطون کے چچا.....!!"
یاں اس پر ایک حقارت آمیز نگاہ ڈالتی ہوئی اس کے پاس سے کترا کر نکل جاتیں۔ اپنی لاپرواہنسی کو
رومال میں سمیٹ کر ان سب باتوں کو دیکھ کر اس کے نچلے موٹے ہونٹ کا بایاں کونا سمٹ کر دانتوں تلے
جاتا اور اُس کی پیشانی پر ایک گہری شکن اُبھر آتی جو کچھ ہی لمحوں بعد پھیل کر غائب ہو جاتی۔ کالج
ٹل میں بھی وہ لڑکوں کے اس طرح کے بیہودہ مذاق کا شکار رہتا تھا۔ لیکن اب اس نے کالج ہوسٹل چھوڑ دیا تھا اور
لی ایک تاریک گلی میں ایک مختصر سی کوٹھری میں رہنے لگا تھا۔ وہ بہت کم ہنستا تھا۔ اس کی ہنسی کھوکھلی اور یاس
رہوتی تھی۔ جب کبھی وہ مسکراتا تو ایسا لگتا کہ وہ اس مسکراہٹ کو اداسی کی عمیق گہرائی سے نکال کر لایا ہے۔

ویسے تو وہ اکثر ہی رات کے سناٹے کی سانسوں کو گنتا ہوا کافی دیر تک کچھ نہ کچھ سوچا ہی کرتا تھا اور سوچتے
پتے اُداس ہو جاتا تھا لیکن آج جب سے اس نے اپنے عزیز دوست کمار کا خط پڑھا تھا تب سے اُس کی
ا بہت زیادہ اُلجھ گئی تھی رہ رہکر کمار کی اُمید افزا اور حوصلہ مند باتیں اُس کے دماغ کو کرید رہی تھیں۔ اُس کے
لی آخری سطروں نے تو اُسے جھنجھوڑ ڈالا تھا اسی لئے ان پر غور کرکے اس نے آج کسی نتیجہ پر پہنچنے کا

شاعر بھی

تہیہ کر لیا تھا۔ کمانے لکھا تھا۔ زندگی جینے کے لئے ہے اور جینا کچھ کر کے کچھ بن نے کے لئے..... اور اس کے لئے ہمیں مشکلات کے کانٹوں کو برداشت کرنا پڑے گا۔ خواہشات کو کچلنا ہوگا۔ جذبات کو محسوس نا ہوگا...... تم جذباتی ہو سینل۔ شدید جذباتی اور جذباتیت کا دوسرا نام ہے پاگل پن..... مانتا ہوں کہ خودداری انسانیت کا ایمان اور آدمیت کی مہک اور انسانیت کی شان ہے لیکن تیری خودداری غیر حاجت ... سماج انسان کے لئے ضروری ہے..... اور میری سمجھ میں تو تو انسان ہی ہے۔ لوگوں سے راہ رسم پیدا کر۔ اپنی کہہ اور دوسرں کی سن۔ اپنے عزیز دوست کی اس طرح کی باتوں نے آج اس کے خیالات کی پہنائی کو غیر معمولی طور پر وسیع کر دیا تھا۔ اور وہ بے خبر تھا کہ رات کا نشہ اترنے لگا ہے۔ اور وہ اونگھنے لگی ہے

زندگی جینے کے لئے ہے...." یہ الفاظ بجلی کی طرح اس کے دماغ میں کوند رہے تھے لیکن جب زندگی ہی نہ ہو تو کیسے جیا جائے۔ کس کے سہارے۔ کیونکر جیا جاتے؟..... کچھ کرنے اور کچھ بننے کی دھن میں وقت ہو کر میں نے کیا نہیں کیا اور کیا نہیں کر رہا ہوں؟..... سب ہی کو تو چھوڑ رکھا ہے۔ گھٹتے گھٹتے اور کیچڑ سنے ماحول میں..... ماں باپ.... بہن بھائی سب ہی کو کچھ کمانے کی اُمیدیں۔ گرمیوں کی تعطیلیں تک اپنے خاندان کے پاس رہ کر نہ بتائیں..... آج میں اپنے اُس باپ سے دُور ہوں جس کی ابلتی پلکیں جوان بیٹے کو دیکھ کر اُس بار نوراسکے بوجھ سے جھک جاتی ہیں جس کا پچپن سالہ لاغر جسم محنت کی مار اور خاندان کے بار سے ختم ہو گیا ہے۔ اُس ماں سے جدا ہوں جس کا میلا آنچل اپنے بیٹے کے سامنے کچھ پانے کی اُمید میں پھیلا ہوا ہے۔ اُن بہنوں کو بھولے ہوئے ہوں جن کی جوانی کی دہلیز پر کھڑی ہوئی دوشیزگی پیلے ہاتھوں کی آرزو لئے مجھے دیکھ رہی ہے اور اپنے ننھے بھولے بھائی کو بھولا ہوا ہوں جس کا مستقبل میرے ہاتھوں ڈھلنے کے لئے بے قرار ہے..... آخر یہ سب میں نے کیوں اور کس لئے کیا؟..... کچھ کرنے کے لئے کچھ بننے کے لئے ہی نا؟..... لیکن میں کیا بن پایا؟..... خالص جذباتی..... پاگل.... جذباتیت کا دوسرا نام پاگل پن جو ہے" اس طرح کے منتشر خیالات کی اسکے دماغ میں ایک چکی سی چل رہی تھی اُس نے اپنے سر کو جھٹک کر کوشش بھی کی کہ وہ بیہودہ باتوں کو چھوڑ کر پھر یہ سوچے کہ اب اُسے کیا کرنا ہے؟ لیکن خیالات کا طوفان زور پر تھا اس بے بسی اور مفلسی نے مجھے نہایت ہی بے سہارا ناکارہ اور بے بس بنا ڈالا ہے۔ غریبی کے گڑھے میں گر کر میرا وجود ہی کیا رہ گیا ہے؟ منحوس مردہ صورت لئے پھرتا ہوں، تب ہی تو ٹھیکیدار جیٹھا کی موٹی لڑکی نے میری ٹیوشن چھوڑ دی۔ ڈاکٹر بھٹناگر کی بھوندو لڑکی مجھ سے اس لئے پڑھنا نہیں چاہتی کہ اُسے میری ویران آنکھوں۔ روکھے بالوں اور موٹے ہونٹوں سے گھن آتی ہے... میرے گندے کپڑوں سے اُس کے صوفے کے گدّے میلے ہوتے ہیں..... مجھے اپنا ٹیوٹر کہتے اُسے شرم آتی سوچتے سوچتے اب اس کے دماغ کی نسیں ڈھیلی پڑ گئیں تھیں اور اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا تھا لیکن اُسے اس طرح کا دردِ سر نہ جانے کیوں اچھا لگتا تھا۔ اکثر سوچتے سوچتے جب اُس کے سر میں درد ہونے لگتا تب اسکی سوچنے کی قوت ایک بار پھر بھبک اُٹھتی اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچ کر ہی خاموش ہوتی تھی۔ اس نے بہت چاہا کہ وہ ان بے سود منتشر خیالوں کے ہجوم کو تاریک رات کے جبڑوں میں ڈھکیل دے اور وہ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن اُسے نیند نہ آنی تھی نہ آئی۔

" تمھاری خودداری غرور کے حدود میں سمٹ گئی ہے" اُس کے تھکے دماغ میں ہلچل مچ گئی۔ تو کیا میں سچ مچ ہی گھمنڈی ہوں۔ تکبّر اور غرور کی زنجیروں سے جکڑا ہوا ہوں؟ اُس نے سوچا اور اسے اپنے سوشیلو

پروفیسر چوپڑا صاحب کی وہ تجویز یاد آگئی جسے انھوں نے اُس کے لئے بنایا تھا۔ پروفیسر چوپڑا سماجی اصلاح اور عام کے کاموں میں خاص دلچسپی لیتے تھے اور ساتھ ہی کسی کام کے لئے منصوبہ بنانے میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ پروفیسر ہرا اس کی حالت سے بخوبی واقف تھے اور اُس سے پوری ہمدردی رکھتے تھے، وہ کبھی وقت آنے پر اپنی مشکلات مسائل کو ان کے سامنے رکھتے ہوئے نہیں ہچکچاتا تھا۔ اس لئے جب اس کی دونوں ٹیوشنیں چھوٹ گئیں تو اس لئے فوراً ہی کوئی راستہ نکالنے کے لئے اُن سے کہا تھا اور اُنھوں نے اس کے لئے ایک انوکھا منصوبہ بنا دیا تھا۔

" ایسا انوکھا منصوبہ بنایا ہے کہ کسی ایک پر بار بھی نہ پڑے اور تمھارا کام چل جائے " چوپڑا صاحب نے کہا تھا۔ منصوبے کے مطابق میرے ساتھ اسٹاف کے چند دوسرے ممبر تمھیں ہفتہ میں ایک دن اپنا مہمان رکھیں گے یعنی ہفتہ باری باری سے ایک دن تمھیں اپنے یہاں کھانا کھلائیں گے۔

اس روز جب اُس نے اس تجویز کا خلاصہ سن کر اپنی خودداری کی قیمت پر اسے " پلیٹ پال تجویز " کہکر نامنظور یا تھا۔ تب چوپڑا صاحب نے اسے بہت سمجھایا تھا لیکن اُس نے ایک نہ مانی تھی۔

اس میں تمھاری خودداری کی ہتک کا سوال ہی کونسا ہے ؟ .... اگر تم ہفتہ میں ایک دن میرے یہاں کھانا کھا ے تو میں سو کھ کر سُودخور تو ہو نہیں جاؤں گا ! اور یہ تو انسانی فرض ہے۔ وہ دل کیا جو کسی کا درد نہ سمجھے۔ وہ ظر کیا جو کسی کی ہمدردی میں آنسو نہ بہائے اور وہ انسان کیا جو انسان کے کام نہ آئے " چوپڑا صاحب کی سب ہی ن گراموفون کے نئے ریکارڈ کی آواز کی مانند کانوں میں گونجنے لگیں اور کچھ ہی لمحوں میں اس کی خودداری کی وٹی چور چور ہو گئی۔ اُسی وقت گھنٹہ گھر کا گھنٹہ گونجا اور وقت دنیا کے سینہ پر چار چوٹیں مار کر آگے سرک گیا تھوڑی بعد اس کی تھکی ہوئی نا امیدی نیند کی خاموش گود میں سو گئی۔

دوسرے دن کالج میں خالی پیریڈ میں جب وہ چوپڑا صاحب سے ملا تو انھوں نے سب سے پہلے سوال یہی یا۔ " کیوں کیا سوچا ہے اُس بارے میں ؟ " " جی میں تیار ہوں " اُس نے جواب دیا " اور فائن " مجھے بھروسہ تھا تم مان جاؤ گے اسی لئے میں نے مسٹر شرما ، .... اور مسٹر راجو سے ملکر ساری بات طے کرلی ہے " انھوں نے یا اور وہ " جی " کہکر ان کے ہمراہ اسٹاف روم کی طرف بڑھ گیا۔ اتفاق سے اسوقت اسٹاف روم میں تین چار ہی پھرر اور پروفیسر تھے جب چوپڑا صاحب نے ان کا دھیان سُنیل کی جانب منتقل کرتے ہوئے اُس کی حالت ر اُسے ہفتہ میں ایک دن اپنے یہاں مہمان رکھنے کی تجویز سے روشناس کرایا تو سب ہی نے اسے ایک ساتھ منظور کرلیا۔

مسٹر سنیل کو جب کوئی ٹیوشن یا کسی قسم کا معاشی سہارا مل جائے گا تب وہ باعزت آپ لوگوں کی مہمانداری سے سبکدوش ہو جائیں گے " چوپڑا صاحب کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے کہ ہندی کے جوشی جی بول اٹھے " بھیا سنیل سب چا ہو چلے آنا بس اپنا ہی گھر سمجھو۔ اس میں شرم اور جھجک کی کوئی بات نہیں ہے یہی تو بڑے پن کی شانی ہے "۔ سیاسیات کے پروفیسر گپتا جی کی آواز تھی۔

آپ کو مہمان کی شکل میں پاکر میں اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت مانوں گا اور پھر شریمتی جی کو مہمان رکھنے اور مہمان بنے دونوں ہی کی بڑی خواہش ہے "۔ معاشیات کے پروفیسر ٹھاکر کی یہ بات سُنکر سب ہی ہنس پڑے۔

جب یہ سب باتیں ہو رہی تھیں تب سُنیل شرم کے مارے پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔ آج اُسے محسوس ہو گیا تھا کہ حقیقت میں کسی کی ہمدردی حاصل کرنا کتنا تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت ہوتا ہے جب وہ اسٹاف کے ساتھ

بیروں کے مکانوں کے پتے کا پرچہ لے کر باہر نکلا تو اُسے ایسا لگا کہ اُس نے پیٹ کے لئے اپنی خودداری کو سٹّے پر لگا دیا
ہے "خودداری کتنی ہلکی ہے" وہ اس پرچے کو ہاتھ میں تولتا ہوا نیچی نگاہیں کئے بھاری قدموں سے آگے بڑھ گیا۔
تجویز کے مطابق پہلے دن چوپڑا صاحب کے مہمان بننے کی باری تھی۔ پرانی شناسائی ہونے کی وجہ سے وہ بلا
سی ہچکچاہٹ اور جھجک کے شام کو چھ بجے کے قریب اُن کے مکان پر پہنچ گیا۔ اتفاق سے چوپڑا صاحب مع اہلیہ کے
سامنے ہی مل گئے۔ وہ تیار ہو کر کہیں جا رہے تھے۔ سینیل کو سامنے دیکھ کر ذرا اسٹپٹائے لیکن جلدی ہی سنبھل کر بولے
یری سوری سینیل" میں تو شریمتی جی کو تمہارے بارے میں کہنا تک بھول گیا اور پکچر کا پروگرام بنا ڈالا" کوئی بات
میں سر" اگلے ٹرن پر سہی" یہ کہکر وہ مڑ گیا۔ دوسرے دن جیوں ہی وہ معاشیات کے شری ماتھر کے پرانے قسم کے
ن میں داخل ہوا اُسے ایک غضبناک عورت کی آواز سُنائی دی "گھر کا پورا پڑتا نہیں اور پروفیسر صاحب لوگوں کو دعوت
ے آئے ... کیوں نہ دیں معاشیات میں جو ایم۔ اے پاس ہیں۔ چار ننھے بالوں کا گھر ہے۔ اس کی انھیں کیا پڑی...
موئے کھانے والے کا بھی تو پانی مر گیا ہے.... آٹھ دن تک آٹھ گھر کے ٹکڑے توڑے گا...." وہ زیادہ نہ سُن
سکا اور الٹے پیروں وہاں سے لوٹ آیا۔ اُس نے اپنی جیب میں پڑے اُس کاغذ کو مسل ڈالا جس پر سب ہی
لوں کے پتے لکھے ہوئے تھے اس کا دل چاہا کہ اس کاغذ کے پرزے پرزے کر کے گندے گٹر میں پھینک دے،
پھر اسے پروفیسر چوپڑا کی نیم پلیٹ (NAME PLATE) پر چسپاں کر آئے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا
سامنے اب پانی والوں کا پانی پرکھنے کا ارادہ کیا کیونکہ اس کا پانی تو مر ہی چکا تھا۔ کامل ایک ہفتہ تک وہ باری باری
سب ہی کے یہاں گیا لیکن اُسے بے عزتی، نفس، ملامت اور تلخ تجربات کے علاوہ کچھ نہ ملا۔ شرما جی اپنی شریمتی جی
لینے سسرال چلے گئے تھے گپتا جی اور ان کی بیوی میں اُسی دن کسی بات پر کھٹ پٹ ہو گئی تھی جس کی وجہ سے چائے
نہ بن سکی تھی۔ ٹنڈن جی کی شریمتی زچہ خانہ میں تھیں اور وہ خود کسی ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے مشرا جی کی
رانی نہیں آئی تھی اور ان کی شریمتی جی بیمار ہونے کی وجہ سے کھانا بنانے کے قابل نہیں تھیں اور اتفاق سے
شی جی نے مکان بدل لیا تھا۔
چوپڑا تجویز، شروع ہونے کے ایک ہفتہ کی مدت میں سینیل نے ٹیوشن حاصل کرنے کے لئے جان توڑ کوشش کی جس سے
دو جگہ امید بندھی تھی لیکن ابھی تک کہیں بات پکی نہیں ہو پائی تھی۔ یہ دن بڑی مشکلات کے تھے پھر بھی اُس نے
جنری کر کے آٹھ دن میں پیسے چکاتے کے وعدے پر ایک ہوٹل والے کو اُدھار کھلانے پر راضی کر لیا تھا۔ اُسے ایک
سالہ میں شائع اپنے مقالہ اور کہانی کا معاوضہ مل جانے کی بھی امید تھی لیکن اسے مایوس ہونا پڑا۔ دس دن
ادھار کھانے کے بعد بھی جب وہ ہوٹل والے کو پیسہ نہیں چکا پایا تو ہوٹل والا اُسے بہت تنگ کرنے
اور اُس نے آگے اُدھار دینا بند کر دیا تھا۔ آج ہفتہ کے آخری دن تجویز کے آخری گھر سے بھی جب وہ خالی
یٹ لوٹا تو اُس نے کسی دوسرے ہوٹل میں جانے کا ارادہ کیا۔ اُس نے انعام کی شکل میں حاصل کی ہوئی مہاتما
ندھی کی آپ بیتی، کو فروخت کر کے کچھ پیسے حاصل کر لئے تھے اور ایک دو چھوٹے موٹے قرضے چکانے کے بعد
ہی اُس کی جیب میں کچھ سکے بچ رہے تھے۔ وہ ایک دوسری ہوٹل میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ اس کی نظر سامنے
لی میز پر بیٹھے ہوئے پرانے ہوٹل کے آدمی پر پڑی۔ ہوٹل کے آدمی نے اُس پر ایک کڑی نگاہ ڈالی اور پاس آ کر بولا۔
"... اے بابو چار دن یہاں اور دو دن وہاں ٹکڑے توڑنے سے زندگی نہیں چلنے کی۔ کچھ نہ بنے تو میری ہوٹل پر
چلے آؤ۔ روٹیاں سیکو اور روٹیاں کھاؤ۔ اس سے قبل کہ سینیل اس کی بات کا کوئی جواب دیتا اُس نے جھپٹ کر

آنکھ پر سے چشمہ اُتار لیا اور اکڑ کر بولا۔ میرا حساب صاف کر کے اپنا چشمہ لے جانا۔ چشمہ چھن جانے پر وہ
لفظ کہے چپ چاپ بھوکا ہی ہوٹل سے باہر نکل گیا۔
زندگی کتنی اُلجھن بھری ہے ۔.... زہر ہے ۔ پھر بھی انسان کو پیاری ہے ۔ کیوں ؟ اِن اُلجھنوں کے ساتھ ہی زندگی
ردیا جائے تو کیا بُرا ہے ؟ .... میں اپنی زندگی کے زہر کو زہر سے ختم کر دوں گا یا پھر .... پھر اپنی سب ہی
وُں ۔ تمنّاؤں کو کُچل کر کوی کے بجائے قلی ۔ کلاکار کے بجائے کلال ۔ طالبعلم کے بجائے دلال ..... اور
شا کے بجائے ہیرا بن جاؤں گا .... اس سسکتی بلکتی زندگی سے ایک قلی ۔ کلال ۔ دلال یا ہیرے ، کی
کیا بُری ہے ؟ ..... اسی قسم کے کئی سوالات پتھر بن کر اُس کے دماغ پر برسنے لگے ۔ اپنے آدرش قسم کے
ت سے پاگل ہو کر کچھ بننے ۔ کچھ کرنے کے لئے میں نے کیا نہیں کیا ؟ ..... سب ہی کچھ تو کیا .... روٹی کے
۔ اور بھوک کے بھیڑئے کو پالنے کے لئے اپنی سانسوں کو گرم رکھنے کے لئے پیٹ کی بھٹی کا ایندھن جٹانے
ئے اپنی خودداری تک بھونک ڈالی ..... اور اس سب کے بدلے میں مجھے مِلا کیا ؟ .... میرا چشمہ تک چھین لیا گیا
: اپنی نادار حالت اور سسکتی خودداری کو اچھی طرح دیکھ بھی نہ سکوں ..... زندگی پہلے ہی تاریک تھی ۔
یے لمبے قدم رکھتا ہوا خیالات میں گم ۔ نیچی نظریں کئے بدحواس چلا جا رہا تھا کہ کسی سے ٹکرا گیا ۔ " سوری " کہہ کر
نے آگے قدم بڑھایا ہی تھا کہ کسی نے اُس کا بازو پکڑ لیا اور کہا ۔ " یوں مست سانڈ کی طرح کدھر چلا جا رہا ہے ؟ " اُس نے
کر دیکھا تو سامنے اُس کا ہم جماعت راج کھڑا مسکرا رہا تھا " ارے تیرا چشمہ کہاں گیا " ؟ راج نے تعجب بھرے
ظ سے پوچھا ۔ پیٹ میں ۔ ہوٹل والے نے چھین لیا اُدھار جو کھایا تھا ۔"
آج تو ہم بھی کڑکے ہیں یار ، ورنہ کچھ ..... لیکن کل مالدار ہو جائیں گے " راج نے کہا ۔ تیری قسم چھکا لگایا ہے اور
آیا ہے ، دن بھر چھینکیں ہی چھینکیں آئیں ۔ یہاں چھینک وہاں چھینک ۔ چھینک اور چھکا بول ٹھیک ہے نا ؟
کی ایک بات بھی اُسکی سمجھ میں نہ آئی اور وہ سوالیہ نگاہ سے اُسے دیکھنے لگا ۔
" بس رہے بُدھو " راج نے کہا ۔ ارے بھائی امریکن فیچر کے چھ نمبر پہ پانچ روپے کا سٹّا لگایا ہے ۔
لیہ میں کاٹن کے بھاؤ کھلتے ہیں اور یہاں کڑکوں کے بھاگ ۔ آئی سمجھ میں " اتنا کہہ کر راج چٹکی بجا کر پھر بولا ۔
رے پاس بھی کچھ ہو تو ۔ کل چشمہ نہ آ جائے تو میرا نام راج نہیں " راج طالبعلم ہو کر سٹّا ..... اس سے قبل
یُنیل اپنی بات پوری کرتا راج بول اٹھا " طالبعلم تو کیا خود تیرا خدا تک سٹّا کھیلتا ہے ۔ وہ آنکھ بند کر کے
ان کی زندگی کا پانسہ دنیا کی بساط پر پھینک دیتا ہے ۔ وہ پھر رُک کر بولا " فرق صرف اتنا ہی ہے کہ خدا کھیلتا ہے
۔ انسان ہارتا ہے " راج کی اس بات کو سُن کر سُنیل ایک لمحہ کے لئے خیالات میں ڈوب گیا " میرے پاس کیا
سکتا ہے لیکن آج میں نے راشٹر پتا کی آپ بیتی ، بیچ دی ہے جس کے کچھ پیسے باقی بچے ہیں " اپنی جیب سے
لے نکال کر سُنیل بولا " راج یہ آزاد ہندوستان کے نئے سکّے ہیں ۔ انھیں میں سٹّے پر کیسے لگا دوں ؟ "
" آزادی کے سکّے ۔ زیادہ جذباتی نہ بن ۔ جذبات آج اٹھارویں صدی کی چیز رہ گئے ہیں ۔ آج انسان
باقی بن کر نہیں بھوت بن کر زندہ رہ سکتا ہے " راج بولا " بول تجھے چشمہ پیارا ہے یا آدرش وادی ڈھکوسلہ ؟ "
" کمار کے مجبور کرنے پر آج جب کہ میں اپنی خودداری کا سٹّہ ہار چکا ہوں ۔ راج ! تیرے کہنے پر راشٹر پتا
آپ بیتی ، کی قیمت کی شکل میں حاصل شدہ آزاد ہندوستان کے نئے سکّوں کو بھی سٹّے پر لگانے کو تیار ہوں "
نا کہہ کر اس نے سب سکّے راج کی ہتھیلی پہ رکھ دئے اور بنا کچھ کہے تیزی سے آگے بڑھ گیا ۔ زندگی جینے کے لئے ہے

بقیہ صفحہ ٦٩ پر دیکھئے

ساحر ہی

شہاب دائروی

چڑیلیں، ابلیس اور فرشتہ

میرے اسٹڈی رُوم کی دیواروں پر دو چھپکلیاں ہمیشہ خوراک کی تلاش میں لپکتی، جھپٹتی اور رینگتی رہتی ہیں اور میرے روم کی کھڑکی کے ٹھیک سامنے فلیٹ پر تین جوان شرارے چھوٹتے رہتے ہیں۔ کتابوں کو چاٹتے چاٹتے جب میں اُکتا جاتا ہوں تو کبھی میری نگاہیں چھپکلیوں کے پیچھے بھاگتی ہیں اور کبھی کھڑکی کے اُس پار رہو کے تھرکتے ہوئے شراروں سے چوری چوری رنگ چُراتی ہیں۔ ایک دن میں اِسی طرح اپنی کھڑکی سے لگا کھڑا تھا اور میری نگاہوں کی اُڑان فلیٹ پر تھی۔ ایک شرارہ چھوٹ پڑا۔

"ایڈیٹ ـــــــ"

میں مُڑا تو وہ میرے پیچھے میرے کمرے میں کھڑی تھی۔ حُسن شعلہ بار تھا، جوانی لہرا اُٹھی تھی، میں سپٹا گیا۔

"سِپٹا کیوں گئے؟ روز چوری چوری دیکھتے ہو، آج میں تمہارے سامنے آ گئی ہوں کہ جی بھر کے دیکھ لو، اور پھر تم نے تاک جھانک کا چلن قائم رکھا تو غور سے میرے پاؤں پر بھی ایک نگاہ ڈال لو، پلاسٹک کا یہ جاپانی سینڈل بڑا ہی مضبوط میرا آزمودہ ہے اور اس طرح کے تین جوڑے اُس فلیٹ میں ہیں ـــــ" اور وہ برقِ لرزاں کی طرح پلٹ کے چلی گئی، اور میں دیکھتا گم سُم کھڑا رہا۔ جب ذہن چکر کاٹتے ہوئے رُکا تو میں نے سب سے پہلے کھڑکی بند کر دی اور فیصلہ کر لیا کہ اب پھر کبھی نہیں کھولوں گا۔

صوفے میں دھنس کے ابھی میں اپنے ذہن پر ٹھیک سے قابو بھی نہیں پا سکا تھا کہ ایک دوسری لڑکی جس کو میں اُسی فلیٹ پر اکثر دیکھ چکا تھا میرے کمرے کی دہلیز پر آ کر کھڑی ہو گئی اور بڑی سادگی سے بولی۔

"اجازت دیں تو اندر آ جاؤں ـــــ"

"جی، جی، آ جائیے ـــــ" میں ہکلا گیا۔

"وہ میری چھوٹی بہن تھی، دماغی توازن ٹھیک نہیں، ہر شخص سے اُلجھ پڑتی ہے، پتہ چلا کہ وہ آپ کے ہاں بھی چلی آئی تھی، ضرور اپنی عادت کے مطابق برس گئی ہوگی، معافی چاہتی ہوں ـــــ"

"نہیں، نہیں، اُس نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کہی ـــــ" میں نے حقیقت کو چھپانے کی سعی کی۔

"شکر ہے اللہ کا" وہ کہنے لگی ـــــ "اُسی کی وجہ سے ہم دونوں بہنیں سخت پریشان رہتی ہیں، ہر جگہ وہ کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا کر دیتی ہے اور ہم دونوں خلجان میں پڑ جاتے ہیں ـــــ"

"آپ کے کوئی رشتہ دار، مطلب یہ ہے کہ والدین کہاں ہیں ـــــ"

"سب اللہ کو پیارے ہو گئے ـــــ" وہ بلبلا اُٹھی ـــــ "ہم دو بہنیں دو فرموں میں ملازمت کرتی ہیں اور تیسری کے علاج کا بوجھ ہم دونوں کے کندھوں پر ہے ـــــ"

میں خاموشی سے اُس کو دیکھتا رہا ـــــ

شاعرہیجی

"کبھی موقع نکال کے آپ ہمارے فلیٹ پر آیئے نا، ہم پڑوسی ہیں اور پڑوسی کے ناطے ایک دوسرے کو جاننا چاہیے۔"

"جی آؤں گا ــــ"

"تو کل چلئے آپ ہمارے ساتھ ہی چلیے ــــ"

"بہتر ــــ" میں نے حامی بھرلی اور جب وہ چلی گئی تو میں نے اُٹھ کے بند کھڑکی پھر کھول دی۔ سامنے دیوار پر جب میری نگاہیں جا پڑیں تو ایک چھپکلی نے ایک کیڑے کو پکڑ لیا تھا۔

دوسرے دن حسبِ وعدہ میں اُن کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ سیڑھیاں طے کر کے جب ہال میں داخل ہوا تو چھوٹی سامنے کھڑی مجھے دیکھتے ہی کھلکھلا کے ہنس پڑی پھر یکایک سنجیدہ ہو کے بولی۔

"تمہارے قتل کا ساماں ہو گیا، تم سے پہلے بھی ہزاروں تم جیسے قتل کیے جا چکے ہیں، اگر زندگی چاہتے ہو تو اُلٹے پاؤں بھاگ جاؤ۔"

میں کھڑا ہو کے ہنس پڑا۔

"اچھا ہنستے ہو ــــ" وہ کہنے لگی ــــ "حالانکہ تم ایک دن روؤگے ــــ"

"کیا واہی تباہی بک رہی ہے تو ــــ؟" بڑی نے ہال میں داخل ہو کے چھوٹی کو ڈانٹا۔ اور پھر میں بڑی کا اشارہ پا کے اُس کے ساتھ ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ایک ٹیبل پر ناشتہ چُنا ہوا تھا اور منجھلی ایک سمت کھڑی چپ تھی۔ ناشتہ کے بعد بڑی نے مجھے اپنی کہانی سُنائی، بڑی اُداسیوں بھری کہانی تھی۔ اور اس ملاقات میں تینوں کے ناموں سے بھی میں واقف ہو گیا۔ نسرین اور ریشما اور شیریں کتنے پیارے نام تھے۔ اور اُس دن کے بعد میں اکثر اُس فلیٹ پر جانے آنے لگا نسرین اور ریشما بھی میرے یہاں آجاتی تھیں۔ مگر شیریں پھر کبھی نہیں آئی۔ جب بھی اُس کے فلیٹ میں اُس سے آمنا سامنا ہو جاتا تھا تو وہ کچھ بولے بغیر بچ کے نکلتی نہیں تھی۔

ایک دن کہنے لگی ــــ

"تم مجھے پاگل سمجھتے ہو نا؟ ــــ"

میں مُسکرایا۔

"میں پاگل نہیں ہوں، میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تمہارا دامن گندہ نہ ہو پائے۔"

میں مُسکراتا رہا ــــ

"تم میری بہنوں کو نہیں جانتے ہو، دونوں چڑیل ہیں، پر میں چڑیل نہیں بنوں گی ــــ ہرگز نہیں بنوں گی۔"

میں خاموش رہا ــــ

"بولو، کیوں بنوں؟ عورت تو مریم تھی، سیتا تھی۔"

"کیا بک رہی ہے تو؟ ــــ" نسرین نے ڈانٹا۔

"بک نہیں رہی ہوں، سچ کہہ رہی ہوں کہ میری بہنیں چڑیلیں ہیں ــــ" اور پھر وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ نسرین میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اپنے کمرے میں لے گئی۔ پھر یکایک میرے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

"جی چاہتا ہے کہ تمہیں پہروں اپنے سامنے بیٹھائے رہوں۔"

"کیوں؟ ــــ" میں نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی پوچھا ــــ

"اس لیے کہ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو ــــ" اور وہ میری باہوں میں جھول گئی، جھولتی رہی، اور جب رات گئے میں وہاں سے لوٹ رہا تھا تو شیریں نے میرا شانہ پکڑ کے جھولتے ہوئے کہا ــــ

"انسان ہو یا جانور ـــ؟"
میں جواب دئے بغیر مسکراتا ہوا بڑھنے لگا۔
شیریں میرا راستہ روک کے سامنے کھڑی ہو گئی ـــ
"کیا تم بھی میری طرح اپنا دماغی توازن کھونا چاہتے ہو؟" ـــ اُس نے سوال کیا۔
میں چُپ رہا ـــ
"جواب کیوں نہیں دیتے ـــ" وہ شعلہ بار ہو گئی ـــ
"کیا جواب دوں ـــ" میں جھلا گیا۔ ٹھیک اُسی وقت ریشا اپنے کمرے سے نکلی اور مجھے ہاتھ تھام کر اپنے کمرے تک لے آئی۔ رات بڑی سیاہ تھی، یہ بھیگتی اور پھیلتی گئی۔ اور دوسرے دن جب میں شیریں کے فلیٹ پر ریشا اور اس کے درمیان بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا، شیریں اپنے بازوؤں کو پھیلائے میرے سامنے آئی اور مجھ پر حقارت بھری نگاہیں ڈالتے ہوئے چیخ اُٹھی ـــ
"دو چہرہ ابلیس، ایک ابلیس ہا، ہا، ہا ـــ"
جواب میں ہم تینوں کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور شیریں کا قہقہہ گونج رہا تھا۔
"تم مرد ہو، میں عورت ہوں ـــ" وہ ہنس پڑی ـــ "میں نے اپنی بہنوں کے نقشِ قدم پر چلنے سے انکار کر کے کچھ کھو دیا، کچھ برقرار رکھا پر تم تو سب کچھ گنوا بیٹھے ـــ"
"شیریں ـــ" نسرین چیخ اُٹھی۔
"چیخو مت آپا۔ تمہاری چیخ میری زبان نہیں روک سکتی، تم نے ان گنت نوجوانوں کو بیوقوف بنایا ہے، اس احمق کو بھی اپنا شکار کر لیا لیکن آپا انسان کی بُرائیاں جب بڑھ کے پھیل جاتی ہیں تو انسان خود اپنی بُرائیوں میں آپ ڈوب جاتا ہے۔ تم بھی ڈوب گئیں آپا، کیونکہ تم نے جان بُوجھ کے یہ فراموش کر دیا کہ میں اس بُدّھو کو چاہنے لگی تھی ـــ"
میں نسرین، ریشا اور شیریں کو دیکھ رہا تھا۔
"آپا، پولیس آ رہی ہو گی، تم دونوں بہت جلد اس بیوقوف کی رقم غبن کرنے کے جرم میں دھر لی جاؤ گی، ہا، ہا، ہا ـــ"
وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی ـــــــ
اور نسرین اور ریشا یکایک پریشان سی ہو کے کھڑی ہو گئیں۔ "پاگل کی باتوں کا بُرا نہیں ماننا چاہیے۔" میں نے کہا۔ مگر نسرین اور ریشا بڑی تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں اور پھر سیڑھیاں اُترنے کی آواز بتدریج مدھم ہو کے گم ہو گئی۔ میں گُم سُم کھڑا تھا۔ شیریں ایک سیکنڈ کے لئے دوسرے کمرے میں گئی اور پھر واپس آ کے اُس نے میرا بیگ جو کہ میں نے بکس میں بند کر رکھا تھا، میری طرف اُچھال دیا۔
"اس میں تمہارے پُورے پانچ ہزار ہیں، میں نے اسی وجہ سے تمہیں اپنے فلیٹ کی طرف جھانکنے سے منع کیا تھا۔ پر تم انسان نہیں ہو، کیوں میری بات مانتے ـــ" وہ رو پڑی۔
میں بے اختیار ہو کے اُس کی طرف بڑھا۔
"خبردار، میرے قریب مت آنا، اب تم اس قابل نہیں، بھاگ جاؤ، جلد بھاگو ورنہ میں تمہارا سر زخمی کر دوں گی۔" اُس نے ٹیبل پر سے گلدان اُٹھا لیا۔ اور میں دبے قدموں سے سیڑھیاں طے کر کے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ معاً میری نگاہیں دیوار پر پھیل پڑیں، ایک چھپکلی کے منہ میں چھوٹا سا کیڑا پھڑ پھڑا رہا تھا۔ پھر وہ اُس کے منہ سے چھوٹ کے فرش پر گر پڑا۔ میں بہت دیر تک فرش پر گرے ہوئے کیڑے کو دیکھتا رہا اور میری نگاہیں کھڑکی سے پار ہو کے فلیٹ پر پڑیں تو اس کے سب دروازے بند ہو چکے تھے ـــ

عابد ضمیر

بیس سال کے بعد اچانک وقت نے بے رحم حالات کے اسٹیج پر اُس رُوح فرسا واقعہ کو دُہرا دیا تھا جس کی یاد خان صاحب وزیر احمد کے سینے میں ناسُور بن کر رِس رہی تھی۔

خان صاحب نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے آنکھوں سے عینک اُتاری اور کُرتے کے میلے دامن سے شیشوں کو صاف کر کے پھر آنکھوں پر چڑھا لی۔ اُنھیں ہر چیز صاف دکھائی دینے لگی۔ کھُلے ہوئے دریچے سے ہَوا کا تیز جھونکا اُن کے بہکے ہوئے خیالات کی طرح کمرے کے اندر داخل ہو گیا اور دیوار پر آویزاں کلینڈر کے اوراق زور زور سے پھڑ پھڑانے لگے۔ یکایک اُنھوں نے اپنے آپ کو ماضی کے تپتے ہوئے صحرا میں کھڑا ہوا محسوس کیا جہاں دُور دُور تک نہ کوئی سبزہ تھا نہ کوئی رنگینی۔ ہر طرف مایوسیوں کے سیاہ بادل منڈلا رہے تھے۔

اُن کی والدہ حمیدہ بیگم سخت مزاج کی تھیں۔ اُنھوں نے کچھ اصول بنائے تھے جن پر وہ سختی سے کاربند رہا کرتی تھیں۔ اور جب وہ اُن اصولوں کی خلاف ورزی ہوتے دیکھتی تھیں تو چیخ کر سارے گھر کو سر پر اُٹھا لیتی تھیں۔ ہر طرف افرا تفری سی مچ جاتی تھی اور گھر میں چھوٹا موٹا ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد اُن کے مزاج کی یہ سختی جھنجھلاہٹ اور چڑچڑے پن میں تبدیل ہو گئی تھی۔ بات بات پر ٹوکنا اور چھوٹی سی غلطی پر سخت سُست کہنا اُن کی عادت بن گئی تھی۔ بیٹی جو خوشی کے چار دن گزارنے میکہ آتی تھی اُن کی تنک مزاجی اور سختیوں سے بددل ہو کر وقت سے پہلے ہی سسرال چلی جایا کرتی تھی۔ جب اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا برتاؤ تھا تو بہو تو پھر بہو ٹھہری! ہر وقت اُس کے پیچھے پڑی رہتی تھیں ــــــ

" دال میں نمک کیوں کم ہے؟ سالن میں اتنا تیل کیوں ڈال دیا؟ کیا تیرے باوا کے یہاں سے تیل کا کنستر آتا ہے ــ؟ چاول میں کنکر کیوں ہیں؟ کیا چُنتے وقت دیدے پھُوٹ گئے تھے ــــــ!؟"

والدہ کے یہ جملے سُن سُن کر خود وزیر احمد کا ناک میں دَم آ گیا تھا لیکن وہ خُون کے گھُونٹ پی کر رہ جاتے تھے۔

وہ ضعیف والدہ کو چھوڑ بھی تو نہیں سکتے تھے اور اپنی خاندانی روایت کے مطابق بیوی کو لیکر الگ بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ اُن کے لئے جینا اور مرنا مشکل ہو گیا تھا۔ لیکن اُن کی بیوی کلثوم فطرتاً نیک اور نرم مزاج کی تھی۔ وہ ساس کی سختیوں اور جھڑکیوں کے باوجود ہر وقت اُن کی خدمت میں لگی رہتی اور اُن کے زہر میں بُجھے ہوئے جُملوں کو امرت سمجھ کر پی لیتی تھی۔ لیکن برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

کچھ دنوں سے اُن کا چڑچڑا پن بہت بڑھ گیا تھا۔ بات صرف یہ تھی کہ انور پانچ سال کا ہو گیا تھا اور عمر کے ساتھ ساتھ اُس کی شرارتیں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ وہ کبھی دادی کی عینک چُھپا دیتا اور کبھی وہ سوئی ہوتیں تو اُن کے کانوں میں زور سے سیٹی بجا کر بھاگ جاتا۔ وہ سمجھتیں کہ یہ سب کلثوم کا سکھایا ہوا ہے۔ یہ سوچ کر وہ انور اور کلثوم دونوں کو کوسنے لگتیں۔

اور جب کبھی انور اُن کے ہاتھ آجاتا تو اُسے پیٹنے بھی لگتی تھیں۔ یہ دیکھ کر کلثوم تڑپ اُٹھتی تھی اور انور کو چھین کر اپنے سینے سے لگا لیتی تھی۔ پھر دونوں طرف مورچے سنبھال لئے جاتے تھے۔ اُس دن گھر میں خاصہ ہنگامہ ہو جاتا تھا۔ کھانا پکتا تھا۔ لیکن کوئی کھاتا نہ تھا اور دوسرے دن سارا کھانا ٹب میں ڈال دیا جاتا تھا۔ وزیر احمد ہر ایسے موقع پر بیوی ہی پر بگڑتے اور سمجھایا کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ زیادتی اُن کی والدہ کی ہے۔ لیکن وہ مجبور اور بے بس تھے۔ وہ اپنے اِس خاندانی نظریے کا احترام کرتے تھے کہ "بیویاں تو بہت ملیں گی، ماں نہیں ملے گی!" اِس لئے یہ جانتے ہوئے کہ گھر میں ہونے والے ہنگاموں میں کلثوم کا ہاتھ نہیں، وہ ایسے موقعوں پر اُسی کو سخت و سُست کہہ دیتے تھے۔ کلثوم اِن ساری باتوں کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر خندہ پیشانی سے برداشت کر رہی تھی۔ لیکن آخر ایک دن اُس کے ضبط کی ساری حدیں سمٹ گئیں اور وہ باغیانہ انداز میں چیخ اُٹھی۔

انور کا پُورا چہرہ خُون میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس کی پیشانی پر تازہ زخم تھا جس سے خُون رِس رِس کر اُس کے چہرے اور قمیص کے دامن کو سُرخ کر رہا تھا۔

"دادی نے مالا ـــــ دادی نے مالا ـــــ" وہ بُری طرح رو رہا تھا۔

کلثوم نے جب بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُس نے جلدی سے انور کو گود میں اُٹھا لیا اور ساس کی طرف جھپٹی۔

"اب کیا اِسے مار ہی کر دَم لیجئے گا! گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتیں!!"

"بہو! ذرا سی بات پر اِس طرح واویلا کیوں مچاتی ہو! صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ آج تم نے مجھے گھر سے نکلوا کا فیصلہ کر لیا ہے ـــــ!"

"امّی کچھ تو خدا سے ڈریئے۔ ایک تو معصوم کو لہو لہان کیا اور اُلٹا مجھ ہی پر تہمت بھی لگاتی ہیں!"

"تو کیا تُو بھی مجھے مارے گی۔ لے مار ـــــ نکال لے اپنے دل کے ارمان ـــــ یہی دن دیکھنے کے لئے میں آج تک زندہ رہی ـــــ!"

حمیدہ بیگم چیخ چیخ کر اپنے سر کے بال نوچنے لگیں۔

وزیر احمد دکان بند کر کے گھر کھانا کھانے کے لئے آئے تھے۔ گھر کا یہ نقشہ دیکھ کر اُنہیں اِس ماحول سے نفرت سی ہو گئی۔ کلثوم حیران و پریشان مجسّم حُزن و ملال بنی کھڑی تھی اور انور کے زخم اور چہرے پر خُون جما ہوا تھا۔

"یہ سب کیا ہے ـــــ!؟" وزیر احمد فرطِ غم سے چیخ اُٹھے۔

"آج تیری بیوی مجھے گھر سے نکلوانے پر تُل گئی ہے!" حمیدہ بیگم نے روتے ہوئے کہا۔

"نہیں ـــــ آج میں خود اِس گھر سے ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں۔ اب میں ایک لمحہ بھی اِس ماحول میں سانس نہیں لے

"کلثوم! پاگل نہ بنو ـــــ"!

وزیر احمد کی آواز کانپ کر رہ گئی ـــــ

"اب کسی کی آواز میرے فیصلے کو نہیں بدل سکتی!"

"لیکن تم انور کو نہیں لے جا سکتی ہو!" یکایک وزیر احمد نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں خود اِسے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکوں گی۔ کاش! میری عمر اِسے لگ جائے!" کلثوم سوگوار لہجے میں کہا۔

"کلثوم! میں تمہیں اپنے ساتھ رکھ سکتا ہوں۔ لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ میں تمہیں روک سکتا ہوں

ہ روک رہا ہوں۔ لیکن تم اپنی مرضی سے جا رہی ہو۔ پھر بھی اِس گھر کے دروازے تمہارے لئے ہمیشہ کھُلے رہیں گے۔
ب چاہو آسکتی ہو ۔۔۔ !!"
وزیر احمد نے گلوگیر لہجے میں کہا۔
کلثوم نے انور کو سینے سے لگا کر پیار کیا اور اُس کی پیشانی کو چُوم کر وزیر احمد کے بازوؤں میں دے دیا اور ڈگمگاتے
ئے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔
"بہو رُک جاؤ ورنہ پچھتاؤ گی ۔۔۔ !" حمیدہ بیگم نے تنبیہ کی۔
"کلثوم ! رُک جاؤ۔ پاگل نہ بنو !" وزیر احمد کلثوم کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔
"نہیں۔ اب میں اِس جہنّم میں ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتی۔ میں جا رہی ہوں ۔۔۔ اپنے ماں باپ کے پاس۔ خدا حافظ
کلثوم چلی گئی اور ماں کے بنائے ہوئے اصولوں پر وزیر احمد نے پیار کی جو عمارت کھڑی کی تھی، وہ گر گئی۔ وزیر احمد
دل خون ہو گیا اور نظروں کے سامنے ہر طرف مایوسیوں کے بھیانک سائے پھیل گئے۔
"ماں ۔۔۔ !"
انور کی چیخ سُن کر وزیر احمد یکبارگی چونک اُٹھے۔ اُنہوں نے انور کو اپنے بے تاب سینے سے بھینچ لیا اور ایک پاگل
رح سامنے کھڑی والدہ کی طرف دیکھنے لگے۔ اُنھوں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ وزیر احمد کے سر پر رکھ دیا اور گھُٹے ہوئے
ہ میں بولیں۔
"بیٹا میں نہیں جانتی تھی کہ چھوٹی موٹی باتیں ایک دن ایسا بھیانک رُوپ دھار لیں گی۔ میں جانتی ہوں بہو نے
ری وجہ سے گھر چھوڑا ہے۔ تُو جا اور اُسے منا کر لے آ۔ میرا کیا ہے کسی کے یہاں بھی زندگی کے باقی دن کاٹ لوں گی ۔۔۔ !"
"امّی آپ فکر نہ کیجئے۔ انور ہمارے پاس ہے۔ چند دن میں کلثوم کا غصّہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو وہ خود ہی آجائے گی۔"
زیر احمد نے اُمید افزا لہجے میں کہا۔
لیکن کلثوم کا غصّہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ حمیدہ بیگم "بہو ! بہو" کہتی ہوئی ایک دن مر گئیں۔ لیکن کلثوم نہ آئی۔ اُس کی انا کو
بردست ٹھیس پہنچی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ دو چار دن کے بعد وزیر احمد خود آکر اُسے لے جائیں گے۔ لیکن وزیر احمد ہمیشہ
ہ کہتے رہے کہ کلثوم اپنی مرضی سے گئی ہے، اُسے خود ہی آجانا چاہیئے۔
ماں کے مرنے کے بعد وزیر احمد کو گھر جیسے کاٹنے لگا۔ دوستوں نے اُنہیں دوسری شادی کر لینے کا مشورہ دیا۔ لیکن
یر احمد کو کلثوم سے ابدی محبّت تھی۔ اُنہوں نے ہر بار شادی سے انکار کر دیا۔ ہاں انور کے آرام اور اُس کی دیکھ بھال کے
ایک ملازمہ رکھ لی جو گھر کا سارا کام بھی کرتی تھی اور انور کی دیکھ بھال بھی۔
اِس طرح بیس سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ نہ کلثوم اپنے میکے سے واپس آئی اور نہ وزیر احمد اُسے لینے گئے۔ کلثوم
ایک بڑی سی تصویر وزیر احمد کی خواب گاہ میں لگی ہوئی تھی جسے دیکھ دیکھ کر وزیر احمد نے جدائی کے بیس سال گزار دیئے تھے۔
بیس سال کے اِس طویل عرصہ میں انور بی۔ کام پاس کر کے ایک بڑی پرائیوٹ کمپنی میں ٹریولنگ ایجنٹ ہو گیا
تھا اور اُس نے اپنی ہم جماعت افروز سے سیول میرج کر لی تھی۔ بیٹے کی اِس من مانی سے وزیر احمد کے سینے میں
یک اور زخم ہو گیا۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ کیا کر سکتے تھے۔ بیوی کے بعد وہ بیٹے کو بھی کھونا نہیں چاہتے
تھے۔ دل مسوس کر رہ گئے۔
افروز شہر کے ایک اعلیٰ سرکاری افسر کی لڑکی تھی۔ وہ اپنے ساتھ قیمتی جہیز لائی تھی۔ وہ بے حد حسین تھی لیکن اِن

سب باتوں کے باوجود وزیر احمد اُسے پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ آزاد اور فیشن پرست ماحول کی پروردہ تھی اور پردے کو لعنت سمجھتی تھی۔ وہ آزادی کے ساتھ اپنے دوستوں سے ملتی تھی۔ اُس کے دوستوں میں لڑکیاں بھی تھیں اور لڑکے بھی۔ کبھی کبھی وہ اُنہیں گھر پر بھی بلا لیا کرتی تھی۔ وہ اُن کے ساتھ پکچر دیکھتی تھی، کلب جاتی تھی۔ وزیر احمد کو یہ ساری باتیں ملازمہ کے ذریعہ معلوم ہوتی رہتی تھیں اور وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے پھر بھی موقع ملنے پر وہ افروز کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ لیکن افروز پر اُن کی کسی بات کا اثر نہ ہوتا تھا۔ وہ اُن کی باتوں کو کسی مجذوب کی بڑ سمجھ کر ایک کان سے سُنتی تھی اور دوسرے کان سے اُڑا دیتی تھی۔

انور ٹریولنگ ایجنٹ تھا اور بزنس ٹور کے سلسلے میں اُسے اکثر باہر رہنا پڑتا تھا۔ اُس کی غیر موجودگی میں بھی افروز پکچر اور کلب جایا کرتی تھی۔ وزیر احمد افروز کو یہ سمجھا کر تھک چکے تھے کہ شادی کے بعد شوہر کا گھر اور اُس کا آنگن عورت کی دُنیا ہوتی ہے۔ کلب کی دُنیا ایک سراب ہے! غلط راستے پر اُٹھا ہوا قدم انسان کو تباہی کے غار میں گرا دیتا ہے۔

لیکن اِن سب نصیحتوں کا افروز پر اُلٹا اثر ہو رہا تھا۔ اُس کی بے راہ روی بڑھتی جا رہی تھی اور اُس کے قدم غلط راستوں پر پڑنے لگے تھے۔

وہ رات بہت بھیانک تھی۔ آسمان پر ایک بھی ستارہ نہ تھا۔ ہر طرف خوفناک تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ گلی میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کتے ڈراؤنے انداز میں بول اُٹھتے تھے۔

انور بزنس ٹور پر گیا ہوا تھا۔

رات کے بارہ بج رہے تھے اور افروز ابھی تک کلب سے نہیں لوٹی تھی۔

وزیر احمد اپنی خواب گاہ میں کلثوم کی تصویر کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کی پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے چمک رہے تھے اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں تصویر سے کہہ رہے تھے۔

"کلثوم! تم تو سُکھ کی سانسیں لے رہی ہو۔ لیکن زندگی کی خارزار راہوں پر چلتے چلتے میرے پاؤں لہولہان ہو گئے ہیں۔ اب مجھ میں ایک قدم بھی آگے بڑھنے کی سکت نہیں۔ تم آخر اتنی بے حس کیوں ہو گئی ہو؟ سب کچھ دیکھتی ہو پھر بھی ٹوکتی تک نہیں۔ میں اب اور ضبط نہیں کر سکتا۔ تم آج اپنی بہو کو اچھی طرح سمجھا دو تاکہ وہ صحیح راستے پر آ جائے ورنہ اِس گھر میں یا میں رہوں گا یا وہ!"

وزیر احمد نے تصویر کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو گر گر کر دامن میں جذب ہوتے جا رہے تھے۔ یکایک گلی میں ایک ملا جلا قہقہہ گونج اُٹھا۔ اُس قہقہے میں نسوانی اور مردانی آواز شامل تھی۔ عورت کی آواز کو وزیر احمد نے پہچان لیا تھا۔ وہ افروز تھی۔

وزیر احمد اُٹھ کر آنگن میں آ گئے۔ اُسی وقت افروز نے دروازہ کھولنے کے لئے گھنٹی بجائی۔ ملازمہ سوئی ہوئی تھی۔ وزیر نے خود ہی دروازہ کھول دیا۔

سُسر پر نظر پڑتے ہی افروز کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ نادم سی ہو کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"بہو اتنی رات کو اکیلی کہاں سے آ رہی ہو۔۔۔؟" وزیر احمد نے الفاظ پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

"ایک سہیلی کی سالگرہ کی پارٹی میں گئی تھی۔ اُس کی ملازمہ یہاں تک پہنچا گئی ہے۔"

"میں نے گلی میں قہقہوں کی آواز سُنی تھی۔ ملازمہ کی آواز بہت بھاری تھی۔ جیسے کسی مرد کی آواز ہو!"

"آپ کو میرے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں!" افروز کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

"اور تمہیں یہ حق ہے کہ میری شرافت پر بٹہ لگاؤ ـــ میرے خاندانی وقار کو خاک میں ملاؤ ـــ!"
"آپ اپنی حد سے آگے بڑھ رہے ہیں ـــ!" افروز نے چیختے ہوئے کہا۔
"بہو شور نہ مچاؤ یہ شریفوں کا گھر ہے!"
"تو کیا میں آوارہ ہوں ـــ بدچلن ہوں ـــ!"
افروز زور زور سے رونے لگی۔
"بہو! خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔"
یکایک وزیر احمد نرم پڑ گئے اور افروز پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔
اُسی وقت دروازے پر انور نے آواز دی۔ وہ خلافِ توقع اپنے پروگرام سے کچھ دن پہلے واپس آ گیا تھا۔ ملازمہ جگی تھی اور اس ہنگامہ کے دوران آ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔ اُس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔
انور جیسے ہی اندر داخل ہوا افروز کے کمرے سے شیشہ گر کر ٹوٹنے کی آواز آئی۔
"کیا بات ہے ابّا جان؟ خیریت تو ہے؟" انور نے باپ کے پریشان چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"بہو ابھی تفریح کر کے باہر سے لوٹی ہیں اور ذرا سا ٹوکنے پر برہم ہو اُٹھی ہیں۔"
"اوہ! اچھا آپ آرام کیجئے۔ میں دیکھتا ہوں کیا بات ہے۔"
انور یہ کہتا ہوا افروز کے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اُس کے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔
کمرے کا سارا سامان اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا اور چینی کے بہت سے برتن ٹوٹے پڑے تھے۔
"افروز! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" یکایک انور چیخ اُٹھا۔
"اپنے بڈھے باپ سے جا کر پوچھو کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ جو خود گھر میں رنگ رلیاں مناتے رہتے ہیں اور میرے دیر سے لوٹنے پر مجھے آوارہ اور بدچلن کہتے ہیں ـــ!"
"افروز ـــ!" انور نے افروز کے رخسار پر ایک بھرپور طمانچہ لگاتے ہوئے کہا۔
"میں نہیں جانتا تھا کہ تم اتنی ذلیل، اتنی کمینی ہو گی ـــ یہ تمہارے کردار کی گراوٹ ہے، جس نے تمہیں جنم دیا آج تم اُس کے متعلق اس طرح زبان کھول رہی ہو ـــ!"
افروز کا خوب صورت چہرہ سُرخ ہو گیا اور اُس کے پھول جیسے رخسار پر اُنگلیوں کے نشانات اُبھر آئے۔ وہ سسک اُٹھی اور انور بوکھلا گیا۔ وہ افروز سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔
"افروز مجھے معاف کر دو ـــ!"
انور نے افروز کے دونوں ہاتھ تھام کر خوشامدانہ لہجے میں کہا۔
"انور! پلیز مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم لوگ اتنے قدامت پرست ہو۔ میں صبح کے یہاں چلی جاؤں گی ـــ!"
"افروز! خدارا ایسا نہ کرنا، ورنہ آج سے بیس سال پہلے اس گھر میں جو ڈرامہ کھیلا گیا تھا، تاریخ دُہرا دے گی۔ اس بار صرف اُس کے کردار نئے ہوں گے ـــ!"
"کچھ بھی ہو۔ میرا فیصلہ اٹل ہے۔ میں اب زیادہ دن اس پنجرے میں نہیں رہ سکتی!"
افروز کی سسکیاں پھر اُبھرنے لگیں۔ اور کلثوم کی تصویر کے سامنے کھڑے ہوئے وزیر احمد کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ پہ

تھے کہ بیس سال پہلے کھیلا ہوا ڈرامہ آج پھر اس گھر میں کھیلا جائے، جس نے اُن کے پیار کی دنیا میں آگ لگا دی تھی اور اُن کی ہر خوشی کو خاکستر کر دیا تھا۔
اُنھوں نے ملازمہ کو آواز دی اور جب وہ آئی تو اُس کے ہاتھ میں ایک خط دیتے ہوئے کہا ۔۔
"سُنو! میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ صبح جب انور اُٹھیں تو میرا یہ خط اُنھیں دے دینا ۔۔۔!"
اور ملازمہ کے مزید کچھ دریافت کرنے سے پہلے وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئے ۔۔
افروز کے کمرے میں اُس کی ہلکی ہلکی سسکیاں گونجتی رہیں اور انور تمام رات سخت بے چین رہا ۔۔۔
گلی میں کتّے ڈراؤنی آوازمیں روتے رہے ۔
صبح افروز جیسے ہی اپنے سامان کے ساتھ گھر سے نکلنے والی تھی، ملازمہ نے انور کے ہاتھ میں اُس کے باپ کا خط دیا۔
انور نے خط پڑھ کر افروز کی طرف بڑھا دیا۔
"میں خودکشی کرنے نہیں جا رہا ہوں ۔۔۔ تم دونوں میرے لوٹنے تک میرا انتظار کرو ۔۔۔!!"
نہ جانے اس مختصر سی تحریر میں کیا جادو تھا کہ افروز کے اُٹھے ہوئے قدم رُک گئے۔ شاید یہ خط کا نفسیاتی اثر تھا۔
دوسرے ہی لمحے اُس کی سرکشی پھر لوٹ آئی اور اُس نے باغیانہ انداز میں رکھا ہوا سوٹ کیس پھر اُٹھا لیا۔
"افروز! پاگل نہ بنو! جلدی میں اُٹھایا ہوا قدم غلط ہوتا ہے!"
انور نے بے چین ہو کر افروز کا شانہ تھام لیا۔ لیکن افروز نے تیزی سے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔
"افروز! خدا کے لئے رُک جاؤ۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گا!"
"میں اس گھر کی مالکہ ہوں، ملازمہ نہیں۔ میرے ڈیڈی اعلیٰ سرکاری افسر ہیں اور میں جہیز میں دس ہزار روپے نقد لائی ہوں۔ تمہارے والد نے میری توہین کی ہے۔ وہ جب تک مجھ سے معافی نہیں مانگیں گے، میں اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گی ۔۔!"
"مالکن! مان جایئے ۔۔۔"
بوڑھی ملازمہ نے اُس کا سوٹ کیس تھامتے ہوئے کہا۔ لیکن افروز نے اُسے بھی دھکا دے کر ایک طرف کر دیا اور دروازے سے باہر نکل گئی۔
انور کٹی ہوئی شاخ کی طرح آنگن میں بچھی ہوئی چارپائی پر گر پڑا۔ اُس کا چہرہ بالکل زرد ہو گیا تھا جیسے کسی نے اُسکے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھتا رہا جس سے ہو کر افروز ہمیشہ کے لئے اس گھر سے چلی گئی تھی۔
تھوڑی دیر کے بعد ملازمہ چائے تیار کر کے لے آئی۔ لیکن انور نے چائے پینے سے بھی انکار کر دیا۔
"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ۔۔۔ مجھے تنہا چھوڑ دو ۔۔۔" اُس نے مضطرب لہجے میں کہا اور پھر اپنی ویران نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔
یکایک کھلے ہوئے دروازے سے وزیر احمد داخل ہوئے۔ اُن کے پیچھے اُس کی ماں کلثوم تھی!!
انور یہ دیکھ کر چونک اُٹھا۔ یوں تو وہ ہمیشہ اُن کی تصویر اپنے والد کی خواب گاہ میں دیکھا کرتا تھا لیکن آج جب اُس نے اُنھیں مجسم اپنے سامنے دیکھا تو اُس پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی ۔۔

"امی ——!" وہ اُٹھ کر بے ساختہ اُن سے لپٹ گیا۔

"ابھی تک تیری شرارت نہیں گئی۔ تو جانتا تھا کہ میں آرہی ہوں اس لئے دُلہن کو کہیں چھپا دیا۔ بتا دُلہن کہاں ہے۔ میں اُس کی بلائیں لے لوں۔ اُسے جی بھر کے پیار کرلوں۔ میں اُسے بتادوں کہ تیری ساس آگئی ہے۔ تیرے آنگن میں تیرے دُلاروں کو کھلانے کے لئے۔

کلثوم نے انور کو الگ کرتے ہوئے جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں آخری جُملہ کہا اور اپنی بے چین نظروں سے تمام کمروں کی طرف دیکھنے لگی۔

"ماں! تم نے دیر کردی —— اب تم اُسے نہ دیکھ سکو گی! وہ اس گھر سے چلی گئی —— ہمیشہ کے لئے ——!!"

انور نے گھُٹے ہوئے لہجے میں کہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"نہیں ——!" وزیر احمد اور کلثوم فرطِ غم سے چیخ اُٹھے۔

"افروز نہیں جاسکتی! میں ابھی جاتا ہوں، اُسے منا کرلے آؤں گا" وزیر احمد نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"میں بھی چلتی ہوں" کلثوم نے بے چینی سے کہا۔

"نہیں آپ کو میری قسم آپ نہ جائیے۔ اگر آپ لوگ گئے تو واپس آکر مجھے زندہ نہ دیکھئے گا ——!"

"انور ——!" کلثوم نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

ماحول بے حد غمناک ہوگیا تھا اور وقت کی رفتار رُک سی گئی تھی۔ فضا سوگوار تھی اور سب کے چہرے غم کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ اُسی وقت عابدی صاحب افروز کو لیکر کمرے میں داخل ہوئے۔ اُن کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔ افروز اس طرح اُداس اور مضمحل تھی جیسے کوئی گُلاب شاخ سے الگ ہوکر مُرجھا گیا ہو۔

"افروز ——!" عابدی صاحب نے افروز کا بازو تھام کر بھاری آواز میں کہا ——

"یہی گھر اب تمہارا سب کچھ ہے۔ کس کے یہاں اَن بَن نہیں ہوتی؟ زندگی میں چھوٹی موٹی باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ کہیں کوئی اپنا گھر چھوڑا کرتا ہے۔ اپنے آنگن کی کیاریاں چھوڑتا ہے۔ اپنی مہکاروں سے دُور جاتا ہے ——!"

کلثوم نے بڑھ کر افروز کو اپنے سینہ سے لگا لیا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"بہو ——! میں بیس سال تک اس گھر کے لئے تڑپتی رہی ہوں۔ کاش! میں تمہیں بتا سکتی کہ اپنا گھر کیا ہوتا ہے ——!!"

انور نے شرارت بھری نظروں سے افروز کی طرف دیکھا اور افروز کا حسین چہرہ حیا کی لالی سے دمکنے لگا۔

(بقیہ طنزیہ "ایک ہنگامہ" صفحہ ۳۸)

اور داروغہ انجمن نے ہیڈ باورچی کو۔ تب ہیڈ باورچی نے فوراً باورچیوں کا رجسٹر نکالا اور اُس باورچی کو حاضر کیا جس کے نام کے آگے کدو رول درج تھا ——!

تو بہنو، کدو رول کی ترکیب میں آپ کو بتا رہی ہوں۔ ضرور پکایئے اور مجھے اُس بین الاقوامی یعنی انٹرنیشنل کانفرنس کو دعائیں دیجئے کہ جس کے طفیل میرے اور آپ کے ہاتھ کم از کم ایک کام کی چیز تو لگی ——!!

ساحر بمبئی

سردار جعفری

غزل

حسرتِ دل ہے ساقیِ محفل، ڈھلتی ہے صہبائے خیال
شامِ تمنّا خون سے رنگیں، اشک سے روشن صبحِ جمال

کج ہے کلاہِ ہجر بھی سر پر، اہلِ دل کی شان نہ پُوچھ
روشن اِس آئینے میں ہے جاہ و جلالِ عہدِ وصال

شاخِ نہالِ درد و غم پر، غنچۂ دل پھر خون ہُوا
اتنا شوخ نہیں تھا یارو، رنگِ بہاراں اگلے سال

ساز سے کوئی نغمہ نکلے، دل میں کوئی پھُول کھِلے
ایک بار تو اپنی زباں سے پُوچھ ہمارے درد کا حال

رات بہت تاریک ہے دیکھو دشمن شبخوں ماریں گے
مشعلِ جاں بجھنے مت دینا، روشن رکھنا شمعِ خیال

رُوٹھنے والا کوئی نہیں ہے، کوئی منانے والا نہیں
ایسا تو اے دل نہ پڑا تھا اِس سے پہلے غم کا کال

اعجاز صدیقی

غزل

(ایکحالیہ ایٹمی دھماکے والے دن اس نئی زمین میں صرف وہ شعر ہوا تھا جو آخر میں درج ہے۔ اس کے بعد غزل کی تکمیل ہوئی)

ہاتھ میں لے کر مشعلِ حسرت، پاؤں میں لے کر چھالے چند
منزل منزل آوارہ ہیں، منزل کے متوالے چند

کیوں دامانِ بادہ گساراں چاک نہ بے مستی ہو جائے
اپنی صبوحی سے اے ساقی، جام ہی تو نے ڈھالے چند

اپنے پاس تو لے دے کر ہے ایک متاعِ زیست یہی
سینہ میں کچھ داغ فروزاں، ہونٹوں پر تبخالے چند

طوفانوں کا ساتھ نہ دیں گی ٹوٹی پھوٹی پتواریں
کشتی کو خود ہی نہ ڈبو دیں، کشتی کے رکھوالے چند

زور نہیں ہے، شور نہیں ہے، تال نہیں، سنگیت نہیں
بن برکھا کے بہہ نکلے ہیں شاید یہ پرنالے چند

کیوں تابِ گفتار ہماری، موضوعِ گفتار بنے
ہم نے تو خود اپنے لبوں پر ڈال لئے ہیں تالے چند

یوں وہ اپنی یاد کی اکثر برف دھنکتے رہتے ہیں
جیسے آئیں اُڑ کے ہوا میں نرم رُوئی کے گالے چند

اُجڑی اُجڑی بزمِ بتاں ہے، سونی سونی محفلِ شوق
کوچہ کوچہ ڈھونڈ رہے ہیں دل کا سکوں، دل والے چند

کیا جانے کب قتلِ نظر پہ ہو جائے مجبور کوئی
چشمِ غزالاں کھینچ کے بیٹھے اور ابھی ڈمبالے چند

آج کسی انساں دشمن نے کوئی پٹاخہ داغا ہے
نیل گگن پر پھیل گئے ہیں بادل سے مٹیالے چند

کرتی ہے تاریخ ہمیشہ اُن کا استحصال اعجاز
ہوتے ہیں ہر دور میں پیدا آفت کے پرکالے چند

دنبالہ

طُرفہ بھنڈاروی

بنائے اہتمامِ شش جہات کہتے آئے ہیں
تمہیں ہو، جس کو مقصدِ حیات کہتے آئے ہیں

ہمارے علم میں نہیں ہیں حُسن و عشق الگ الگ
بہ ایں شعورِ ذات کو صفات کہتے آئے ہیں

اُنھیں سے اب بھی روح کی ہے اصلیت جن کو سب
رسولِ حق، رسولِ کائنات کہتے آئے ہیں

بغیرِ جہدِ مستقل اُمیدِ مغفرت نہ رکھ
عمل کی پختگی کو سب نجات کہتے آئے ہیں

وہ آنکھ، دوسروں کی تشنگی پہ جو رہی ہے نم
اُسی کو لوگ چشمۂ فرات کہتے آئے ہیں

قدم پڑیں صحیح اگر تو دُور منزلیں نہیں
نقائصِ عمل کو مشکلات کہتے آئے ہیں

تمہیں سے اکتسابِ نُور مہر و ماہ نے کیا
تمہیں کو مخزنِ تجلّیات کہتے آئے ہیں

ہیں اپنے مسلکِ عمل میں کفر ناامیدیاں
ہم اپنے حوصلوں کو ممکنات کہتے آئے ہیں

یہاں ہر اک وجود اپنے ساتھ ہے عدم لئے
ازل سے اس جہاں کو بے ثبات کہتے آئے ہیں

جنابِ طُرفہ کے کلام میں کسے کلام ہے
ہمیشہ زندگی کے وہ نکات کہتے آئے ہیں

حامدی کاشمیری

رات، دل کے دریچے تک آئے
تیری آواز کے حسین سائے

تیرے چہرے پہ غم کا سایہ ہے
کتنے لمحوں کے چاند گہنائے

تم تھے شعلہ نگاہ، شعلہ جبیں
ہم نے شبنم کے پھول برسائے

اجنبی گیت، نقرئی آواز
چاندنی دشت میں بہک جائے

آؤ دیکھو بہار زخموں کی
ہر کلی ہے نقاب سرکائے

تیرے غم کا ہی آسرا ہوگا
جب ترے غم سے روح گھبرائے

دشتِ شب میں کہیں سحر نہ ملی
ہم اُسے دُور تک پکار آئے

ڈھل گئے جب خیال لفظوں میں
بجلیاں ہم گرفت میں لائے

حامدی فکرِ شعر کرتا ہوں
گھیر لیتے ہیں چاند کے سائے

راہی قریشی

بقدرِ ظرف بہ غمِ عشق بھی تو کم کم ہے
نہ اضطرابِ مسلسل، نہ دردِ پیہم ہے
ترے فراق کا عالم عجیب عالم ہے
شگفتِ گل میں بھی جیسے صدائے ماتم ہے
جو دیکھئے تو زمانے میں پرسشِ غم ہے
جو سوچیے تو کوئی دوست ہے نہ ہمدم ہے
بہار آج بھی اس راز سے نہیں واقف
کہ ہر کلی کے تبسم میں درد بھی ضم ہے
دعا کرو کہ مذاقِ وفا تمام نہ ہو
کہ اب خلوص و محبت کی زندگی کم ہے
سبھی نے زخم دکھائے، مگر مسیحا کو
نہ التفات کی خواہش، نہ فکرِ مرہم ہے
صبا سے پوچھ مآلِ بہار اے راہی
یہی تو سارے تبسم کدے کی محرم ہے

احسن جعفری

یاد کے دشت سے جو قافلۂ دل گزرا
تیرہ راہوں میں ترے پیار کا سورج ابھرا
جب پروائی ترے لطف کی اے دوست چلی
آرزوؤں کا سمن زار ہے نکھرا نکھرا
دلِ ویراں میں مرے روشنیاں پھوٹ پڑیں
تیری یادوں کے دیے جب بھی جلائے گزرا
اور بڑھتی ہی گئی کم نہ ہوئی دید کی پیاس
افقِ ذہن پہ جب بھی کوئی منظر ابھرا
برگِ آوارہ کی صورت لئے پھرتی ہے ہمیں
زندگی جانے کہاں شہر سے صحرا صحرا
اتنی دوری پہ بھی اے دوست بہ نبضِ احساس
یوں لگا جیسے کوئی پاس سے ہو کر گزرا
راہ لو دینے لگی پھر سے یہ دل کی احسن
کارواں درد کا جیسے کوئی آ کر اترا

اصغر مہدی نظمی

عشق جب سلسلہ جنباں نکلا
اک نئے درد کا عنواں نکلا

سو گئے جاگتے لمحے آخر
وقت بے مہر شبستاں نکلا

قافلہ موسمِ گل کا اب کے
شہر سے چاک گریباں نکلا

سر پہ آیا جو ستم کا سورج
اپنا سایہ بھی گریزاں نکلا

نالہ کش تھا جو شبِ غم وہ گل
صبح آئی تو غزل خواں نکلا

ایک اک شخص ملا بچھڑا ہوا
اُس سے ملنے کا نہ امکاں نکلا

دل عجب شہرِ طرب تھا نظمی
جس کا ہر ذرّہ بیاباں نکلا

احمر رفاعی

کچھ کام آ سکیں نہ تری غم گساریاں
بڑھتی ہی جا رہی ہیں مری بیقراریاں

وہ سرخوشئ نازِ تغافل کہ الاماں
یہ شوقِ تازہ تازہ کی بے اختیاریاں

تعزیرِ چشمِ شوق ہی منظور ہے اگر
اے پردہ دار اور ذرا پردہ داریاں

کیا کیا نیازِ عشق کو بخشا ہے رنگِ شوق
اللہ رے نازِ حُسن کی وہ سحر کاریاں

کیوں بے رُخی میں آج ہے یہ رنگِ التفات
ظالم وہ کیا ہوئیں تری غفلت شعاریاں

احمر فراقِ یار کی کیفیتیں نہ پُوچھ
کتنی سُرور بخش ہیں یہ شعلہ کاریاں

نذیر بنارسی

رات بھر اُٹھ اُٹھ کے اُن کا آسرا دیکھا کئے
صبح تک سوتی رہی تقدیر ہم جاگا کئے

ہم نگاہِ حُسن سے لیکر محبت کی کرن
موت پر بھی زندگی کی روشنی ڈالا کئے

غور سے سُن کر مری تنہائیوں کی داستاں
سر جُھکا کر دیر تک کیا جانے کیا سوچا کئے

بزم میں اُن مست مست آنکھوں کا عالم الاماں
جانے کتنے میکدے اُبھرا کئے ڈُوبا کئے

بڑھ کے کب پکڑا کسی نے ڈوبنے والے کا ہاتھ
آشنا دیکھا کئے نا آشنا دیکھا کئے

کتنی آنکھیں رات روتی تھیں تمہاری یاد میں
کتنے پیمانے تمہارے نام پر چھلکا کئے

ایسے اعلیٰ ظرف بھی ہیں میکشوں میں اے نذیرؔ
شام کو لیکر ذرا سی صبح تک بہکا کئے

دل ایوبی ٹونکی

تجھ سا بھی کوئی دیدۂ حیراں نہیں دیکھا
دیکھا بھی اُنھیں اور نمایاں نہیں دیکھا

تھا مصلحت اندیش جنوں اپنا بھی لیکن
اوروں کی طرح ہم نے گریباں نہیں دیکھا

حیراں نظری، جامہ دری، وحشت و مستی
دیوانہ کوئی بے سر و ساماں نہیں دیکھا

مرکز ہے ازل سے جو مرے حُسنِ نظر کا
وہ جلوہ سرِ شہرِ نگاراں نہیں دیکھا

ہر ایک کا عالم تھا جُدا حسبِ تمنّا
اُس بزم میں حالات کو یکساں نہیں دیکھا

گھٹ گھٹ کے سب ارمانِ جنوں رہ گئے دل میں
صحرا کو کبھی شوق کے شایاں نہیں دیکھا

آبادِ غمِ عشق ہے جس روز سے اے دلؔ
عشرت کدۂ قلب کو ویراں نہیں دیکھا

رحمٰن جامی

اے باغِ محبت کی ہوا دیکھ کے چلنا
امکانِ حوادث ہے ذرا دیکھ کے چلنا

ساتھ اہلِ ہوس بھی ہیں محبت کے سفر میں
اے اہلِ وفا، اہلِ وفا دیکھ کے چلنا

کیا جانے کہاں ہوگا محبت کا سویرا
فی الحال اندھیرا ہے ذرا دیکھ کے چلنا

دل بھی ہے مرا ساتھ ترے اب کے سفر میں
اِس بار تو اے ذہنِ رسا دیکھ کے چلنا

گلشن کے لئے آبلہ پائی کا نہیں غم
انگاروں پہ چلنا ہے تو کیا دیکھ کے چلنا

منزل سے جو بھٹکاتے ہیں اس راہ میں جامی
ایسے بھی ہیں نقشِ کفِ پا دیکھ کے چلنا

منشاء الرحمٰن خاں منشا

ہم زیست کے ماروں کو جلا کیوں نہیں دیتے
آپ اپنی مسیحائی دکھا کیوں نہیں دیتے

تزئینِ چمن کا تمہیں دعویٰ ہے تو یارو
خاروں کو بھی گلرنگ بنا کیوں نہیں دیتے

حق موسمِ گل پر ہے اگر سب کا مساوی
تفریق کی لعنت کو مٹا کیوں نہیں دیتے

جن کے نفسِ گرم پہ جیتی ہیں بہاریں
آخر انھیں محنت کا صِلا کیوں نہیں دیتے

انسان کو انسان کا دشمن جو بنا دے
آگ ایسی سیاست کو لگا کیوں نہیں دیتے

کیا چاند کے تاریک خلاؤں میں دھرا ہے
دھرتی ہی کی تقدیر جگا کیوں نہیں دیتے

اِس تیرگیٔ زیست سے بیزار جہاں کو
خوش رنگ اُجالوں کا پتا کیوں نہیں دیتے

آتے ہیں ہمیں کام کڑے وقت پہ منشا
پھر شکوہ ہے ہم دادِ وفا کیوں نہیں دیتے

زوار حسین احمر

خود اندھیرے میں چھپ کر وہ گم ہو گئے اور الزام ہم پر ہی دھرتے رہے

ہم تو کرتے رہے جستجوئے سحر اور وہ رات کی مانگ بھرتے رہے

سعیِ پیہم سے باقی ہیں ہم گر خرد، خود نمائی کی ٹھوکر رہی جستجو

ہم سرِ دار معراج پا بھی چکے، وہ انا الحق کے دعوے ہی کرتے رہے

موت کا جن کو پروا نہیں کوئی غم زندگی چومتی ہے انہیں کے قدم

موت کا تو پرانا وتیرہ ہے یہ جو بھی ڈرتے رہے بس وہ مرتے رہے

وہ مسیحا بھی ہم نے مانا مگر اس مسیحائی کی داد دیں کس طرح

ایک بیمار دم توڑتا ہی رہا اور سرہانے کھڑے وہ سنورتے رہے

جب سے غنچوں نے کھلنے کی کھائی قسم کھل گیا باغبانی کا ان کی بھرم

اب کھلا یہ کہ ہیں پاسبانِ خزاں جو بہاروں پہ الزام دھرتے رہے

ناخدائی پہ ان کی بھروسہ کیا اس بھروسے کا احمر صلہ یہ ملا

خیر گزری کہ کام آ گیا حوصلہ وہ ڈبوتے رہے ہم ابھرتے رہے

شاغل ناگپوری

تم اور فریب، اے سحر و شام ہمیں دو

آواز، نہ گزرے ہوئے ایام ہمیں دو

اب کوئی پسِ پردہ نہ پیغام ہمیں دو

آواز جو دینی ہے سرِ عام ہمیں دو

ہر جادۂ دشوار کو سر ہم نے کیا ہے

ہم لائقِ انعام ہیں انعام ہمیں دو

نا اہلوں سے سنورا ہے کبھی کاکلِ گیتی!

ہم اہل ہیں اس کام کے یہ کام ہمیں دو

اتنا بھی نہ چھیڑو کہ جبیں ہو شکن آلود

الجھا کے نہ اذنِ غلط اقدام ہمیں دو

خود کھینچ لیں ہم اپنی طرف ساغر و مینا

کیوں ہاتھ کو پھیلا کے کہیں جام ہمیں دو

جب درپئے آزار ہیں ہمسائے تو شاغل

کیا اہلِ وطن سے کہیں آرام ہمیں دو

مظہر کوٹی

نہیں کہ فطرتِ برقِ تپاں نہیں معلوم
بنا رہا ہوں میں کیوں آشیاں نہیں معلوم
مری خموشیٔ لب پر نہ مسکرا کہ تجھے
ابھی نتیجۂ ضبطِ فغاں نہیں معلوم
زباں پہ قید، نگاہ و قلم پہ بھی قیدیں
مجھی پہ کیوں ہیں یہ پابندیاں نہیں معلوم
بلاکشانِ محبت کو چھیڑنے والے
تجھے نتیجۂ آہ و فغاں نہیں معلوم
میں سرفروشِ جہانِ وفا ہوں اے مظہر
مجھے سجودِ در و آستاں نہیں معلوم

لطفی کوٹی

دَورِ محرومیٔ منزل سے گزرنے والے
کاش ایسا ہو رہِ سعیٔ مسلسل سے گزر
روشنی کر نہ سکیں گے کہ ہیں محرومِ ضیا
یہ نئے دَور کے خورشید، یہ انجم، یہ قمر
بندشِ نطق ہے پابندیٔ پرواز کے ساتھ
ایسی آزادیٔ گلشن سے تو زنداں بہتر
نہ دیا جام تو محفل سے اُٹھا یا بھی نہیں
یہ بھی ساقی نے اک احسان کیا ہے مجھ پر
عشق کے راستے پُرنُور ہوئے اے لطفی
اِن منازل میں ہے اب روشنیٔ داغِ جگر

مدحت الاختر

سُنائی آنکھوں آنکھوں میں کہانی
ہوئی گویا زبانِ بے زبانی
کسی کا ذکر سُن کر رو اُٹھے ہم
نکل آئی کہانی میں کہانی
محبت تا ابد باقی رہے گی
محبت کے سوا ہر شے ہے فانی
نفس ہر ایک اُن کا جاوداں ہے
سمجھتے ہیں جو ہستی کے معانی
تری رفتار پر یاد آ گئی ہے
کسی سرمست چشمے کی روانی

محبت آنسوؤں میں ڈھل رہی ہے
ہوئی جاتی ہے اب یہ آگ پانی

مکتوبات

حامدی کاشمیری ——————— سری نگر

"شاعر" کا "ڈرامہ نمبر" ایک قیمتی یادگار نمبر ہے۔ آپ نے اُردو کے مشہور لکھنے والوں کے خوبصورت ڈرامے، بڑی خوبصورتی سے ترتیب ہیں میں نے چند کو چھوڑ کر سب پڑھ ڈالے ہیں۔ یہ ڈرامے جدید دَور کے انسان کی نفسیاتی زندگی کی کئی اُلجھنوں کو پیش کرتے ہیں! برس سے جبکہ اُردو ادب میں ڈرامے کی کم ماسائی کا ذکر برابر ہوتا رہا ہے۔ آپ نے "ڈرامہ نمبر" نکال کر اِس صنفِ ادب کی ترقی کے مکانات کو روشن کردیا ہے۔

سید حرمت الاکرام ——————— مرزا پور

"ڈرامہ نمبر" نظر نواز ہوا۔ آپ نے اہلِ اُردو کو بڑا انوکھا اور افادیت بخش تحفہ دیا ہے۔ "شاعر" کا ہر شمارہ خصوصی شعر و ادب فکر و فن کی روایات کو آگے بڑھاتا ہے۔ لیکن "ڈرامہ نمبر" کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اتنے اچھے اور پاکیزہ ڈرامے یکجا کہاں ملتے ہیں۔ آپ نے ے قدر کٹھن اور صبر آزما کام اپنے ذمہ لیا تھا۔ اُسے اتنی ہی خوبصورتی سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ آپ کی عالی حوصلگی قابلِ رشک نیز دو رسائل کے لئے قابلِ تقلید ہے۔

رونق نعیم ——————— رانی گنج (کلکتہ)

جے پور میں خوش قسمتی سے آپ سے ملاقات ہوئی۔ مگر آپ اپنی جگہ مصروف تھے اور میں اپنی جگہ۔ یہی وجہ ہے کہ خواہش رکھتے ہوئے بھی دل کھول کر آپ سے گفتگو نہ ہو سکی۔ اِس کا مجھے افسوس ہے لیکن آپ نے مشاعرہ میں ایک ایسی غزل سُنائی کہ سارا مشاعرہ گ پڑا، میں بھی ذاتی طور پر بیحد متاثر ہوا۔

آپ کی غزل اِس دَور کی نمائندہ غزل ہے۔ اِس میں کوئی کلام نہیں۔ آپ ایسی حسین اور صحت مند غزل کی تخلیق کے لئے شک تہنیت کے مستحق ہیں۔

"ڈرامہ نمبر" موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ اُردو زبان کی بڑی مفید خدمت انجام دے رہے ہیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے (آمین)

"شاعر" کے لئے اپنی ایک نظم بھیج رہا ہوں۔ جس نے ایٹم بم کیا بنایا، ساری زمین خطرے کے قریب آگئی۔

منشاء الرحمٰن خاں منشا ——————— ناگپور

"ڈرامہ نمبر" موصول ہوا۔ ہر لحاظ سے خوب اور بہت خوب ہے۔ اُردو ادب میں ڈرامہ کی پیاری صنف کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اِس لحاظ سے آپ کا "ڈرامہ نمبر" شائع کرنا ایک عظیم ادبی کارنامہ ہے۔

"ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

آپ نے "شاعر" کی دیرینہ ادبی روایت کو قائم رکھا۔ اِس کے لئے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔

شیام کنول ——————— بنگلور

"شاعر" کا "ڈرامہ نمبر" نظر نواز ہوا۔ اِس خوبصورت ادبی دستاویز پر مبارکباد کافی تاخیر سے دے رہا ہوں۔ "ڈرامہ نمبر" بلاشبہ "شاعر" کی اپنی روایات سے بھی بلند تر ہے۔ مجھے خود یہ نہیں کہنا چاہئے کہ یہ اُردو ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت کا حامل ہے، کیونکہ نمبر خود ادبی مورخوں کو یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور کر دیگا۔ ایک ایسے دَور میں جبکہ ہمارے دانشور اور فنکار ڈرامے کی جانب سے غفلت

پورت رہے ہیں۔ ایک ساتھ اتنے ڈرامے فراہم کرنا اور وہ بھی معیاری، صرف آپ ہی کا کام تھا۔ یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ یہ صرف آپکی شخصیت کا اثر ہے کہ "شاعر" کے لئے بہتر سے بہتر ڈرامے مل سکے۔ ورنہ شاید یہ ناممکن ہی ہوتا۔ اِس حقیقت کا اعتراف ناگزیر ہے کہ "ڈرامہ نمبر" اپنا جواب نہیں رکھتا۔

واحد پریمی ———— بھوپال

اکتوبر کا "شاعر" نظر نواز ہوا۔ اِس بار بھی آپ نے "جُرعات" میں بڑی کام کی باتیں کہی ہیں۔ حقیقت مندانہ اور مفید۔ آپ کی نظم "نغمۂ وطن" بہت ہی موثر اور بلند پایہ ہے۔ فن کی پابندی، فکر کی گہرائی، جذبہ کی رنگ آمیزی اور زبان و بیان کی شگفتگی نے اِس نظم کو شاہکار بنا دیا ہے۔ آپ کی نظم کے علاوہ جناب اویس احمد دوراں اور حضرتِ نثار اٹاوی کی نظمیں بھی بیحد پسند آئیں غزلوں میں حضرات سلام مچھلی شہری، الطاف مشہدی، شفیق کوٹی، عتیق احمد عتیق، پیام فتحپوری، سید حرمت الاکرام کی غزلیں خاص طور پر لائقِ ستائش ہیں۔ افسانے اور مضامین سب کے سب منتخب اور معیاری ہیں۔ یہ شمارہ کافی جاذبِ نظر ہے۔

علی حیدر ملک ———— اورنگ آباد (گیا)

"ڈرامہ نمبر" شدید انتظار کے بعد موصول ہوا تھا۔ حسبِ عادت سب سے پہلے "جُرعات" کا مطالعہ کیا۔ اِس بار پھر آپ نے اُردو اور اُردو والوں کے متعلق بڑی تلخ بات کہی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کی یہ آواز بھی صدا بہ صحرا ثابت ہوگی۔ اِس لئے کہ کوئی بات اُنھیں لوگوں پر اثر کرتی ہے جن کا احساس زندہ ہے ورنہ "بے حِس" لوگ تو کسی بات کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیتے۔ اُردو والے ہر طرح کا الزام بڑی آسانی سے دوسروں کے سر تھوپ دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ مجھے غیروں سے نہیں اپنوں سے شکایت ہے اور اُس وقت بھی رہے گی جبکہ اُردو کا جنازہ ہندوستان سے اُٹھ چکے گا۔ اُردو کے طلبہ، اساتذہ اور اِس بدقسمت اور بے سہارا زبان کے دوسرے ہمدرد اب تک نہ جانے کس خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ بعض لوگ اُردو کی موجودہ حالت پر اظہارِ افسوس تو کرتے ہیں مگر عملی طور پر کچھ بھی نہیں کرتے۔ آپ "مُردوں" کو آواز دے دیکر خواہ مخواہ اپنے جی کا زیاں کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اب "جُرعات" میں صرف ایک اپیل اور شائع کر دیجئے کہ اُردو کے نام لیوا اُردو کے جنازے کی نماز میں شریک ہونے کے لئے تیار رہیں۔ (ویسے وقت آنے پر، آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ کوئی جنازے کی نماز میں شریک ہونے والا بھی نہیں) کیا آپ کا اتنا ہی لکھ دینا کافی نہیں ہے کہ ـــ "شاعر کا مستقبل کیا ہے؟ کیوں نہ اسے بند کر دیا جائے؟" یہ ایک جملہ ہیرے کا جگر کاٹ دینے کے لئے بہت کافی ہے لیکن اُردو کا تعلق تو "مردِ ناداں" سے ہے اِس لئے اُن پر یہ کلامِ نرم و نازک کچھ اثر نہیں کرے گا۔

نمبر کے مشتملات واقعی اہم اور معیاری ہیں۔ آپ نے توقع سے زیادہ کامیاب نمبر پیش کیا ہے۔

(۲)

تازہ شاعر بھی باصرہ نواز ہوا۔ اِس بار ٹائٹل کے لئے آپ نے جس رنگ کا انتخاب کیا ہے وہ کافی جاذبِ نظر ہے۔ مشتملات میں مقالات کا حصہ حاصل شمارہ ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ پروفیسر انور سیوانی نے "آگ کا دریا" پر قلم اُٹھایا ہے۔ اُن کا مضمون تشنہ سہی لیکن ان کی تحریر اُن کے سلجھے ہوئے اور صاف ذہن کا پتہ دیتی ہے۔ اُنھیں اپنے مطالعے پر اعتماد ہے اور ادب کے متعلق اُن کے ذہن میں کوئی تشکیک یا CONFUSION موجود نہیں --- اور یہ بڑی بات ہے۔

"نور شاہ اور اُس کا فن" سے قاری کو نور شاہ اور اُس کی افسانہ نگاری کے متعلق تو کم (بلکہ بہت ہی کم یا برائے نام) واقفیت حاصل ہوتی ہے ـــ ہاں! کچھ دوسری باتیں ضرور معلوم ہو جاتی ہیں۔

نظموں میں آپ کی نظم "نغمۂ وطن" پسند آئی۔ "ہم سفرو" (اویس احمد دوراں) "جمہوریت کے اَن داتا" (ظہیر صدیقی) "میں اُردو اور تم" (شتہ زور کاشمیری) اور "نیند کی گولی" (ظفر حمیدی) اچھی اور کامیاب نظمیں ہیں۔

افسانوں میں "مسکراہٹ کی قیمت" (رفعت صدیقی) اچھا افسانہ ہے۔ مسدرشن بالی کی کہانی "زبانِ یارِ من ترکی" اونچی دکان پھیکے پکوان کے مصداق ہے (صاف گوئی معاف!) ——— "ہتھوڑا" نے چونکا دیا۔ یہ سلطان سبحانی کون صاحب ہیں؟!
یہاں ابتدا ہی میں بڑی پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔
غزلوں میں سلام مچھلی شہری، سید حرمت الاکرام اور واحد پریمی وغیرہ کی غزلیں منفرد لانہ خصوصیت کی حامل ہیں۔

رام لعل ——————— لکھنؤ

ادھر آپ "شاعر" کے کئی کئی نمبر نکال رہے ہیں، اتنی تیز رفتاری سے کہ قلمکاروں کو ساتھ دینا مشکل معلوم ہوتا ہوگا۔ پڑھنے والوں کا کیا حال ہوگا۔؟

"ڈرامہ نمبر" کیسا رہا؟ ڈراموں پر تنقیدی مضامین لکھوائیے۔ ایسے مضامین سے لکھنے والوں کو راہ بھی ملے گی اور اپنی خامیوں کا بھی پتہ چلے گا۔ دیویندر اسّر کا مضمون پسند آیا تھا لیکن ضرورت تھی کہ اس نمبر پر بالکل ہی غیر جانبداری سے کڑی تنقید کی جائے کیونکہ میرے خیال میں اس نمبر میں کوئی بھی تخلیق قدرِ اوّل کی نہیں ہے۔ خود میرا ڈرامہ مجھے ادھورا اور معمولی لگا (لیکن اشاعت کے بعد)

جاوید انصاری (بھاؤ نگر جیل) ——————— بھاؤ نگر (گجرات)

"شاعر" کا نیا شمارہ ملا۔ اُردو کانفرنس کے سلسلہ میں "جرعات" میں آپ نے جو اظہارِ خیال کیا ہے اُس سے میں متفق ہوں، مرکزی اور شاخوں سے عبارت ہے یہ درست ہے لیکن مرکز کو زیادہ فعّال رہنا چاہیئے جبھی شاخیں بہتر طریقہ پر کام کر سکتی ہیں۔
جے پور اُردو کانفرنس کی مفصّل رپورٹ اور اُس پر مختلف اخبارات کے تبصرے پڑھے۔ گھر سے اخبارات کا بنڈل بڑی دیر سے ملا اور پھر کچھ دن اربابِ اقتدار نے اُسے یہاں روک لیا اس لئے بڑی ذہنی کوفت ہوئی۔ بھاؤ نگر میں اُردو اخبارات نہیں آتے ہیں اس لئے اُردو دنیا کے تازہ افکار و حوادث سے بے خبر رہنا پڑتا ہے۔
"اُردو ٹائمز" میں آپ کی وہ غزل دیکھی جو آپ نے اُردو کانفرنس (جے پور) کے مشاعرے میں پڑھی تھی، بڑی عمدہ اور منفرد غزل ہے۔ نامہ نگاروں والا شعر ہماری زبان میں بھی چھپا ہے ——— سابرمتی سینٹرل جیل میں "شاعر" کا ایک شمارہ موصول ہوا تھا۔ اسکے تقریباً تین ماہ بعد بھاؤ نگر جیل میں تازہ شمارہ موصول ہوا۔ "ڈرامہ نمبر" نہیں ملا ہے، آج گھر لکھ رہا ہوں کہ آیا ہو تو روانہ کر دیا جائے۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ "ڈرامہ نمبر" کی تیاریوں کی وجہ سے "شاعر" پابندی سے نہیں آرہا ہے۔
گھر کے پتہ سے آنے والے رسائل اور اخبارات میں سے کچھ پرچے (جو غیر سیاسی ہیں) اب ڈاک سے برابر مل رہے ہیں۔ جیلر صاحب بڑے شریف آدمی ہیں، جونا گڑھ میں رہنے کی وجہ سے تھوڑی بہت اُردو فارسی سمجھ لیتے ہیں، کچھ فارسی کے شعر بھی یاد ہیں جو اکثر دہراتے رہتے ہیں ——— شاید اُردو والے مرحوم قاضی اختر کی وجہ سے جونا گڑھ کو کبھی فراموش نہ کریں۔
تازہ شمارے میں پروفیسر انور سیوانی اور شمیم احمد کے مضامین پسند آئے۔ حصّۂ نظم بھی بڑا جاندار ہے، بقیہ مقالے اور افسانے ابھی پڑھے نہیں ہیں۔
یہ پڑھ کر بڑا صدمہ ہوا کہ "ڈرامہ نمبر" میں آپ نے خریداروں کی کمی کی وجہ سے "شاعر" کو بند کرنے کا سوال اُٹھایا تھا۔ اُردو داں طبقہ اس معاملہ میں ذرا بے حس ہے، لیکن مُردہ نہیں ہے، ابھی اس میں زندگی کی تڑپ باقی ہے، اس خاک میں ہنوز چنگاریاں ہیں، بس ذرا ہوا دینے کی ضرورت ہے۔

نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

آپ کا مجموعۂ کلام کب تک چھپ رہا ہے۔؟

اظہر افسر ——— حیدرآباد (دکن)

ابھی ابھی تازہ شاعر ملا۔ دفتر لیتا آیا ہوں۔ اطمینان سے پڑھوں گا۔ "ذرا ما نمبر" کے متعلق آرار پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔ کافی شاندار رسپانس ہے۔

ہاں آپ کی نظم "نغمۂ وطن" خوب ہے۔ ایسی نغمگی کا دوسری قومی نظموں میں فقدان پایا جاتا ہے۔

نثار احمد صدیقی ——— اورنگ آباد (گیا)

تازہ "شاعر" دیکھا۔ زیرِ نظر شمارے کے مشتملات میں مضامین کا حصّہ کافی اہم اور وقیع ہے۔ نظموں میں آپ کی نظم "نغمۂ وطن" ایک نئے موڑ کا پتہ دیتی ہے۔ ویسے اس کی اندرونی لہر وہی ہے جو مجموعی طور پر آپ کی شاعری میں ہر جگہ موجود ہے۔ دوراں۔ ظہیر صدیقی، شہ زور کاشمیری اور ظفر حمیدی کی نظمیں فنّی طور پر کامیاب نظمیں ہیں۔ دوراں اور ظہیر کی نظموں کے موضوعات بھی خاصے اہم اور جدید ہیں۔ کہانیوں میں مُدرّشن بالی کی کہانی توقعات کو پورا نہیں کرتی بقیہ دونوں کہانیاں اچھی ہیں۔ غزلوں کا حصّہ اس شمارے کا سب سے کمزور حصّہ ہے۔ ویسے ایک دو غزلیں اچھی ہیں

شہاب دائروی ——— بہار شریف (پٹنہ)

اکتوبر ۱۹۶۲ء کا شاعر نظر نواز ہوا۔ کافی پسند آیا۔ نظموں میں آپ کی نظم "نغمۂ وطن" اور ظہیر صدیقی کی نظم "جمہوریت کے اَن داتا" مجھے کافی پسند آئی۔ مقالات میں پروفیسر آنور سیوانی، شمیم احمد، صغیرہ نسیم اور وقار راشدی پسند آئے۔ افسانے سبھی پیارے ہیں۔

آپ کا سالِ خریداری ختم ہو رہا ہے

اگر اس سیاہ حلقے میں سُرخ نشان لگا ہوا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس شمارے کے ساتھ آپ کا سالِ خریداری ختم ہو چکا ہے۔ از راہِ کرم سات روپے زرِ سالانہ منی آرڈر سے اپنی اوّلین فرصت میں روانہ فرما دیجئے۔ بصورتِ دیگر آئندہ شمارہ آپ کے نام بذریعہ وی پی بھیجا جائیگا جس کا وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہے۔ اگر تجدیدِ خریداری منظور نہ ہو تو ایک کارڈ کے ذریعے اطلاع دید یجئے۔ — منیجر

نقد و نظر

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

ہندوستان کی نامور ہستیاں

(حصّہ اوّل و دوم)

یہ کتاب پبلیکیشنز ڈویژن حکومتِ ہند کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ اس میں مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے مضامین ہندوستان کی نامور ہستیوں پر ہیں۔ غالباً یہ کتاب کسی دوسری زبان سے اُردو میں ترجمہ کرائی گئی ہے۔ ترجمہ سادہ اور آسان ہندی آمیز اُردو میں ہے۔ کم عمر کے طلبا بھی اسے سمجھ سکتے ہیں۔ اختصار کی غرض سے ہر شخصیت کے ضروری اور اہم واقعات لئے گئے ہیں۔ پہلے حصّہ میں اُنتیس اور دوسرے میں اکیس شخصیتوں پر مضامین ہیں۔ تمہید میں کہا گیا ہے کہ

"ممکن ہے اتنی ہی مشہور و معروف ہستیاں کچھ ایسی بھی ہوں جن کا اِس مجموعے میں نام نہیں ہے۔ اگر ہمیں اِس بارے میں تفصیلی معلومات حاصل ہوجائیں تو اُنھیں اگلے ایڈیشن میں شامل کر لیا جائے گا۔"

مرتب نے "امکان" کی آڑ لیکر ایک طرح کا گریز کیا ہے ورنہ کتنی ہی ایسی شخصیتیں باقی رہ گئی ہیں جن کے ذکر کے بغیر ہندوستان کے دورِ قدیم اور دورِ وسطیٰ کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ ہندوستان کی تمام بڑی قوموں میں بڑے لوگ ہوئے ہیں۔ اُنھیں نظر انداز کر دینا مناسب نہیں تھا۔

حصّہ اوّل ۱۱۹ صفحات قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے حصّہ دوم ۱۰۴ صفحات قیمت دو روپیہ پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن۔ اولڈ سکریٹریٹ۔ دہلی۔

جوالا مکھی

یہ بڑے سائز کے ۴۸ صفحات کا خوبصورت کتابچہ جسے نہایت سلیقہ سے اُردو ٹائپ میں چھاپا گیا ہے اُن منتخب نظموں پر مشتمل ہے جو اُردو شعراء نے چینی جارحانہ حملے کے خلاف لکھی تھیں۔ اِس نوع کے کئی اور مجموعے بھی ہندوستان میں چھپے ہیں۔ اور اِن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو شعراء نے بڑے جوش اور ولولے سے اِس موضوع پر قلم اُٹھایا تھا۔ اُن ہزاروں نظموں میں بعض بڑی معرکہ آرا ہیں اور اُردو خاص طور پر اُنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔ "جوالا مکھی" کو محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ حکومتِ آندھرا پردیش نے شائع کیا ہے اور اِس محکمہ کے ڈائرکٹر شری نرسنگ راؤ سوتر نے اِس کا مختصر مقدمہ لکھا ہے۔ نظموں کا انتخاب اچھا ہے۔ البتہ کئی اہم نظمیں اِس میں نظر نہیں آتیں۔ اگر اِس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جائے تو وہ نظمیں ضرور شامل کر لینی چاہئیں۔ قیمت برائے نام صرف ۲۵ پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔ محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ حکومت آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

غفور میاں

از ——— تخلّص بھوپالی

تخلّص بھوپالی نے طنز و مزاح کی دنیا میں اپنے لئے ایک جگہ بنالی ہے۔ کوئی جگہ بھلا خالی کس طرح رہ سکتی ہے عظیم بیگ — ملّا رموزی (بھوپالی)، شوکت تھانوی اور دوسرے لوگ اُٹھ گئے تو اُن کی جگہ سجاری بھرکم تخلّص نے لے لی۔ "پاندان والی خالہ" اور "پوسٹ مارٹم" کے بعد تخلّص کی یہ تیسری کتاب ہے۔ وہ اپنے اخبار "بھوپال پنچ" میں مدتوں اپنے قلم سے طنز و مزاح کا متفرق سامان فراہم کرتے رہے اور اب دھڑا دھڑ اُن سے کتابیں ڈھالی جارہی ہیں۔ "غفور میاں" بھوپال کے ایک "خان" کا جیتا جاگتا کردار ہیں، چلتے پھرتے — سیاست میں، سماج میں، مذہب میں غرض ہر شعبۂ حیات میں حصّہ گیر بھی اور نہیں بھی — اپنی انتہائی دلچسپ شخصیت کی بنا پر سب کے لئے باعثِ دلچسپی۔ اُنھیں بھوپال اور بھوپالیات سے اندھا دھند عقیدت ہے۔ اُن سے سرگوشیاں ہوتی ہیں

اور دیوان خانے زعفران زار بنے رہے۔
عدالت میں۔ ایک گز کپڑا خریدا۔ بھوپال کا سنیما۔ روزہ رکھا۔ بلت ٹھہرائی۔ بکرا خریدا۔ مہر ٹھہرا۔ دوگانہ کا تصفیہ کسی کے انتظار میں۔ قصہ سنایا۔ دعوتِ ولیمہ۔ الیکشن کی تیاری۔ ووٹروں پر عذاب۔ افطار کا انتظار۔ بھوپال کے بہادر۔ قربانی کا بکرا۔ پتہ بتایا۔ اِن سب الگ الگ مگر ایک ہی سلسلے کے مزاح پاروں میں غفور میاں جلوہ گر نظر آتے ہیں اور اِن کے ساتھ دوسرے کردار بھی قاری کے لئے دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں۔
مخلص کا اندازِ تحریر برجستہ، شگفتہ اور سادہ ہے۔ وہ اپنے کرداروں سے مذاق ہی مذاق میں بڑے پتے کی باتیں کہلوا دیتے ہیں۔ کتاب کافی اچھی چھپی ہے۔ ۱۶۱ صفحات ہیں اور قیمت دو روپیہ پچھتر پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔ پنچ بھون پبلیکیشنز جہانگیر آباد۔ بھوپال۔ ایم۔ پی۔

شعلۂ حیات

(مدھیہ پردیش اُردو نمبر)

"شعلۂ حیات" جناب ایم۔ عرفان کی ادارت میں بہت زمانے سے بھوپال سے شائع ہو رہا ہے۔ حال ہی میں جب نور اُردو کانفرنس کے موقع پر اُس کا "مدھیہ پردیش اُردو نمبر" نکلا تھا۔ مدیرِ "شعلۂ حیات" بڑے عملی اور پُرجوش انسان ہیں۔ اِس نمبر سے اُن کا جوشِ عمل آشکار ہے۔ یہ ایک طرح سے مدھیہ پردیش کی عہد بہ عہد اُردو تاریخ ہے۔ خصوصاً دَورِ موجود میں اِس صوبہ میں انجمن ترقیِ اُردو کے ذریعہ جو کام ہو رہا ہے اُسکی تفصیل بڑی اُمید افزا ہے۔ اور دوسرے صوبوں کے لئے قابلِ تقلید بھی۔
اِس نمبر میں بھوپال کے قدیم و جدید شعراء کے شعری انتخاب کے ساتھ ساتھ شعرا اور ادبا کی تصانیف کی فہرست اور بھوپال سے ہر دَور میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کی تفصیلات بھی درج ہیں۔ اِس میں بے شمار تصویریں ہیں لیکن افسوس کہ یہ تصاویر اچھی نہیں چھپ سکی ہیں کہیں کہیں آرائش و زیبائش کی کوشش نے بھی نمبر کے وقار کو نقصان پہنچایا ہے۔ ایسے نمبر سادہ ہی ہونے چاہئیں۔ کتابت اور طباعت پر بھی مزید توجہ کی ضرورت تھی۔ مجموعی طور پر یہ "اُردو نمبر" قابلِ مطالعہ ہے۔ قیمت صرف پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔ "شعلۂ حیات" جہانگیر آباد۔ بھوپال۔ ایم۔ پی۔

کلموہی

مترجم ——— ڈاکٹر سید عابد حسین

یہ رابندر ناتھ ٹیگور کے مشہور بنگلہ زبان کے ناول "کمریالی" کا اُردو ترجمہ ہے۔ جسے اُردو زبان کے مشہور ادیب ڈاکٹر سید عابد حسین نے پُوری محنت اور توجہ سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ ناول سے قطع نظر بذاتِ خود بہت اچھا ہے۔
یوں تو رابندر ناتھ ٹیگور کے اور بھی کئی مشہور ناول ہیں، لیکن "کلموہی" بعض اعتبارات سے اُن سب میں ممتاز ہے۔ اِس ناول کی ہیروئن کمودنی ایک ایسا زندہ اور اہم کردار ہے جو براہِ راست دل و دماغ کو متاثر کرتا ہے۔ شروع سے آخر تک یہ دلچسپ بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔ سماج کے بہت سے ناسوروں کو اِس میں آشکار کیا گیا ہے۔
یہ کتاب رابندر ناتھ ٹیگور کے صد سالہ جشن کے سلسلے میں ساہتیہ اکیڈمی نے خاص اہتمام سے چھاپی ہے۔
۲۷۲ صفحات۔ قیمت ساڑھے سات روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ ساہتیہ اکیڈمی۔ نئی دہلی۔

آبِ خضر

از ——— کرامت علی کرامت

ہندوستان کا کونسا علاقہ ایسا ہے جہاں اُردو کے ادیب و شاعر نہ ہوئے ہوں یا اِس دَور میں نہ ہوں۔ اُڑیسہ جیسے دُور اُفتادہ صوبے میں بھی ۱۸۶۹ء میں شیخ امین استرجی جیسا خوش بیان شاعر تھا جو اتنا صاف شعر کہتا تھا ؎

عاشق ہو اگر، دل بُتِ عیّار پہ دے دو
جان اپنی تم اک جلوۂ دیدار پہ دے دو

دے دو خرد و ہوش کو اک نازہ پہ اُس کے

اور صبر و سکوں زلف کے ہر تار کو دے دو

" آبِ خضر" میں اُڑیسہ کے تقریباً پچاس قدیم و جدید شعراء کے حالات اور اُن کے کلام کا انتخاب ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔ حصۂ اوّل میں ۱۴ قدیم شعراء کو لیا گیا ہے اور حصۂ دوم میں ۲۵ جدید دَور کے شاعروں کا ذکر ہے۔ اور حصۂ سوم میں سات شاعر شریک کیے گئے ہیں۔ یہ وہ سات شعراء ہیں جو باہر سے آئے لیکن اُڑیسہ کی ادبی سرگرمیوں میں گہری دلچسپی لی۔

اُڑیسہ کی علاقائی زبان اُڑیہ ہے۔ اِس صوبہ میں دوسری زبانیں بھی بولی جاتی ہیں لیکن نہایت کم تعداد میں اُردو والوں نے اُڑیہ زبان کو بھی بیحد متاثر کیا۔

تینوں حصّوں کے شعراء کے حالاتِ زندگی آخر میں دئیے گئے ہیں۔ اگر یہ کلام کے ساتھ ہی ہوتے تو قاری کو اور زیادہ آسانی ہوتی۔ کرامت علی صاحب کرامت نے ایک کام کی کتاب مرتب کی ہے۔ اِس سے اُردو شعر و ادب کی تاریخ مرتب کرنے میں مدد ملے گی۔

مؤلف کے پیشِ لفظ کے بعض حصّے کچھ غیر ضروری ہیں اور طوالت کا احساس دلاتے ہیں۔

کتاب کافی صاف ستھری اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات ۱۷۶۔ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ اُڑیسہ اُردو پبلشرز۔ دیوان بازار کٹک ۱۲

چَوٹے

از ———— فضل دہلوی

یہ جناب فضل دہلوی کے سَو مزاحیہ قطعات کا پاکٹ سائز مجموعہ ہے۔ اِس میں ہنسنے ہنسانے کا کافی سامان قاری کو مل جاتا ہے۔ اِس کے مقدمہ نگار نصر اللہ خاں نے لکھا ہے۔

" فضل صاحب اگلے وقتوں کے لوگ ہیں"

نقد و تبصرہ میں اُن کے لئے ایک ہی پھبتی کی صورت ہے۔ طنز و مزاح اُردو کی ایک مستقل صنف ہے۔ نثر و نظم دونوں میں بعض لکھنے والوں نے اسے انتہائی عروج پر پہنچا دیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں اُس عروج و ارتقا کی بات تو نہیں ملتی۔ لیکن جن کے ذوق و ظرف سے فضل صاحب کے قطعات میل کھا جائیں گے وہ لُطف اندوز ضرور ہوں گے۔ بطورِ نمونہ دو قطعے پیش ہیں:۔

اُس کو جِگر کہ نگاہوں کا اِس کو زخمی کیا اشارے نے
قیس تھا محوِ پردۂ محمل مجھ کو مارا ترے غرارے نے

حُسنِ کامل اُسے عطا کر کے دستِ قدرت نے خود دیا ہے حجاب
گال پر اُس کے خال کا نقطہ جیسے فقرے کے بعد فُل اسٹاپ

حجم ۱۱۲ صفحات۔ سرورق دیدہ زیب و بامعنی کاغذ، لکھائی چھپائی عمدہ۔ قیمت ایک روپیہ سینتیس پیسے۔ ملنے کا پتہ۔ " بارگاہِ ادب " ۵/۱۳۰۲ ڈرگ کالونی۔ کراچی ۲۵

" آجکل" دہلی

(جواہر لال نہرو نمبر)

اُردو کا مشہور ماہنامہ " آجکل " اپنی خصوصی اشاعتوں کی پیشکش میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر چند اس کے نمبر کم حجم ہوتے ہیں لیکن مواد کے اعتبار سے وہ کافی اچھے ہوتے ہیں۔

۴۸ صفحات کے اِس " جواہر لال نہرو نمبر " میں بھی چند مشاہیر اہلِ قلم شریک ہیں۔ لیکن اِس کا اندازِ ترتیب عمومی حیثیت رکھتا ہے۔ چند مضامین، تاثرات اور نظموں سے آگے یہ نمبر نہ بڑھ سکا۔ چونکہ " آجکل " سرکاری ماہنامہ ہے اِس لئے اُسے بہت سی نئی چیزیں مل سکتی تھیں لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ حتیٰ کہ تصاویر میں بھی کچھ نئی تصویریں شامل نہیں ہیں۔ جواہر لال نہرو پر مشاہیر شعراء سے اچھی اور نئی نظمیں لکھوائی جاسکتی تھیں، دنیا کے مُدبّروں، سیاستدانوں اور ادیبوں سے اُن کے تازہ تاثرات حاصل کئے جاسکتے تھے۔ جواہر لال نہرو کی تصانیف کا تنقیدی جائزہ لیا جاسکتا تھا۔ صرف ایک مضمون پروفیسر ہمایوں کبیر کا " نہرو ایک ادیب کی حیثیت سے " شامل ہے۔ فراق گورکھپوری کا مضمون بھی کافی اچھا ہے۔ مجموعی طور پر یہ نمبر " آجکل " کی ادبی روایتوں سے پیچھے ہے۔ اس میں ۱۶ صفحات کی تصاویر ہیں اور نمبر صاف ستھرا چھپا ہے۔

قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ: ماہنامہ " آجکل " پبلیکیشنز ڈویژن۔ پوسٹ بکس ۲۰۱۱۔ دہلی ۔

(بقیہ صفحہ ۱۷ پر دیکھئے)

ادارہ

محفل اپنی ....!

حوالِ واقعی

نومبر کا شمارہ حاضر ہے۔ تاریخ ابھی پیچھے ہی کی طرف جا رہی ہے اور اسے آگے لانے کی امکانی کوشش کی جا رہی ہے۔ دسمبر کا شمارہ بھی کچھ تاخیر ہی سے نکلے گا۔ لیکن ایک آنے تا ایک جس طرح ڈرامہ نمبر کے بعد یہ دو عام شمارے نکلے ہیں۔ دسمبر سالِ نوشتہ ۱۹۶۵ء کا سالنامہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ سالنامہ ۶۵ء کی تیاریاں شروع کر دی گئی ہیں۔ تفصیلی اعلان دسمبر کے شاعر میں دیا جائے گا۔ امید ہے انیس سو پینسٹھ عیسوی کا سالنامہ "شاعر" کی خصوصی اشاعتوں کی روایت کو اور آگے بڑھائے گا۔ فی الوقت اس سے زیادہ کچھ عرض کرنا مناسب نہیں۔

آئندہ شمارۂ دسمبر تک کُل دس شمارے مع سالنامہ اور ڈرامہ نمبر مستقل خریداروں کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ گویا مجموعی طور پر صرف سات روپیہ سالانہ چندہ میں تقریباً نو سو صفحات پر مشتمل بہترین ادبی مواد بہم پہنچایا گیا۔ اس انتہائی گرانی کے دور میں بڑے سائز کے نو سو صفحات اعلیٰ کتابت و طباعت کے ساتھ سات روپیہ میں پیش کرنا ممکن نہیں۔ "شاعر" کا سالانہ چندہ کم از کم نو روپیہ اور فی پرچہ بارہ آنے ہونا چاہیے۔ لیکن ہم نے اب تک اُس کی قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہاں اس کے ساتھ ساتھ یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اُس کے خریداروں میں معتدبہ اضافہ ہو۔ پرانے خریدار اپنی خریداری کا سلسلہ جاری رکھیں اور "شاعر" کی دیرینہ روایات کے معترف حضرات اُس کی توسیع و اشاعت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔ اگر ہر ہمدردِ "شاعر" دو دو چار چار خریدار بھی بنا دے تو بڑی تقویت پہنچ سکتی ہے۔

تازہ شمارہ

یہ تعلّی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ "شاعر" زیادہ سے زیادہ مواد پیش کرتا ہے۔ اس تازہ شمارہ میں بھی مضامین نظم و نثر بڑی تعداد میں ہیں۔ پچھلے شمارے میں چھ مقالے اور صرف تین افسانے تھے لیکن زیرِ نظر شمارۂ نومبر میں اُس کے بالکل برعکس تین مقالے اور پانچ افسانے شائع ہو رہے ہیں۔ اِن ہی میں ایک طنزیہ بھی ہے۔ "شاعر" کے پڑھنے والوں میں افسانہ و ڈرامہ پسند کرنے والے حضرات کی تعداد بھی بہت کافی ہے۔ اسی لئے اس بار افسانوں کی تعداد بڑھا دی گئی ہے۔ حالانکہ کئی معیاری مقالے منتخب شدہ محفوظ ہیں۔ آئندہ شمارۂ دسمبر ۱۹۶۴ء کے مقالوں اور افسانوں میں نہ صرف توازن ہوگا بلکہ وہ بہت اہم ہوں گے۔ "فراق کی غزلیں" اور "منٹو کی کردار نگاری" والے مقالے بہت سوچ سمجھ کر لکھے گئے ہیں۔ "فانی کا جائزہ" بھی، لینے کی طرح لیا گیا ہے۔ ہاں بعض لوگوں کو یہ احساس ضرور ہوگا کہ مقالہ نگار نے میر کو گرایا ہے۔ تو اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ الگ الگ غالب اور میر کے پسند کرنے والوں میں آج تک کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اس پسند اپنی اپنی کو کیا کہا جائے!

"طنزیہ" ایک ہنگامہ بے موقوف سے قارئین کافی متاثر و محظوظ ہوں گے لیکن اس بار جو چار افسانے پیش کئے جا رہے ہیں وہ چاروں کے چاروں بڑے مقصدی ہیں۔ خصوصاً "منحوس دن" اور "خوابوں کی ردائیں جلتی ہیں"۔ اس ڈرامہ پر اجنتان ساہتیہ اکیڈمی نے انعام بھی دیا ہے۔ "اپنا گھر"، "چڑیلیں ابلیس اور فرشتہ" بھی پسند کئے جانے والے افسانے ہیں۔ اِن کے پیچھے بھی اصلاحی مقاصد کارفرما ہیں۔

حصۂ نظم و غزل اور بھی زیادہ وزنی ہے۔ اتنی زیادہ نظمیں اور غزلیں شاید ہی کسی شمارہ میں پیش کی گئی ہوں۔ دوسرے رسائل کے مقابلے میں "شاعر" میں نظمیں اور غزلیں کم ہی شائع ہوتی ہیں۔ یہ آتی تو بڑی تعداد میں ہیں لیکن بدقسمتی سے "شاعر" کے معیار پر کم اترتی ہیں۔ چونکہ منتخب نظمیں اور غزلیں کافی تعداد میں جمع ہو گئی تھیں، اِس لئے منظومات کے لئے کچھ زیادہ صفحات وقف کرنے پڑے۔ مجموعی حیثیت سے اِس شمارہ کو پسند کیا جائے گا۔

شاعر کے برہم ہونے والے ایجنٹوں سے

خاصی بڑی تعداد میں شاعر کے ایسے ایجنٹوں نے برہم ہو کر خطوط لکھے ہیں جنہیں دوبارہ "ڈرامہ نمبر" نہ بھیجا جا سکا۔ ہم اس سلسلے میں پہلے ہی معذرت پیش کر چکے ہیں اور اب مزید یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر ڈرامہ نمبر کی کاپیاں دفتر میں ہوتیں تو انھیں ضرور دوبارہ بھیجی جاتیں۔ کسی بھی خصوصی اشاعت کے نکلنے سے پہلے ہم ایجنٹوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ایک ہی بار بڑا آرڈر دیدیں تاکہ اس تعداد کے مطابق وہ خاص نمبر چھپوایا جائے۔ جو ایجنٹ ٹکڑے ٹکڑے کرکے نمبر منگاتے ہیں، ظاہر ہے اُن کیلئے مزید کاپیاں کس طرح فراہم کی جا سکتی ہیں۔ ملک میں کاغذ کی بیحد کمی ہے۔ اناپ شناپ پرچہ نہیں چھاپا جا سکتا، تاوقتیکہ آرڈر نہ ہوں۔ ویسے "شاعر" کے خاص نمبروں کی ہزار یا پانچسو کاپیاں زیادہ ہی چھپوائی جاتی ہیں اور یہ اُن ایجنٹوں کو پہنچ جاتی ہیں جو شروع ہی میں بڑا آرڈر دے دیتے ہیں۔ "شاعر" کے جتنے بھی ایجنٹ ہیں وہ سالہا سال سے یہ اندازہ رکھتے ہیں کہ کسی بھی ایجنسی پر "شاعر" کا کوئی خاص نمبر بچا نہیں ہے۔

بہر حال، ہم "شاعر" کے اُن تمام معزز اور معتبر ایجنٹوں سے جو دوبارہ اور سہ بارہ ڈرامہ نمبر نہ پہنچنے کی وجہ سے سخت برہم ہوگئے ہیں ایک بار پھر معذرت خواہ ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ۱۹۶۵ء میں شائع ہونے والے سالنامے کے لئے وہ ایک ہی بار بڑا آرڈر دیدیں۔ تھوڑی تھوڑی تعداد میں کئی بار خاص نمبر یا سالنامہ بھیجنے میں دفتر پر وی پی خرچ کا بھی بہت بار پڑ جاتا ہے۔ ویسے ہی "شاعر" کے خاص نمبروں کی قیمت کم ہوتی ہے۔

بقیہ نقد و نظر صفحہ ۶۹

بقیہ نقد و نظر صفحہ ۶۹

قومی زبان ۔ کراچی

(بابائے اُردو نمبر)

انجمنِ ترقیٔ اُردو (پاکستان) کے رسالۂ "قومی زبان" نے بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم کی تیسری برسی کے موقع پر ساڑھے چار سو صفحات کا یہ شاندار نمبر نکالا ہے۔ ادارۂ "قومی زبان" نے بابائے اُردو پر اچھے اچھے مضامین لکھوائے ہیں۔ اس میں کئی نظمیں بھی شامل ہیں۔ اِن مضامین نظم و نثر سے مولوی عبدالحق کی عظمت اور اُن کے کارناموں پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ ان مضامین میں آئے ہوئے کئی واقعات مرحوم کے علم و فضل اور اُن کی ذاتی زندگی کی انفرادیت کو ثابت کرتے ہیں۔ اس بابائے عبدالحق نمبر میں بڑا حصہ غیر مطبوعہ خطوط کا ہے۔ یہ خطوط نہ صرف یادگار ہیں بلکہ اِن میں اَن گنت مسائل ہیں، بہت سے اہم واقعات ہیں اور مرحوم کے کردار کا اِن سے صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے۔ ایک مضمون مولوی صاحب کے بڑے بھائی ضیاء الحق کے متعلق بھی ہے اور غالباً اس سے پہلے اُن پر کسی نے نہیں لکھا تھا۔

"عبدالحق نمبر" کے آخری حصہ میں "فکر و فن" اور "ظن و تخمین" کے دو ابواب قائم کرکے نہایت مختصر مضامین اور تاثرات دئے گئے ہیں اور تقریباً چوالیس اربابِ قلم کے اقتباسات لئے گئے ہیں۔ آئندو سال اگر "تصانیفِ عبدالحق نمبر" نکالا جائے اور اُس میں مرحوم کی تصنیفات و تالیفات کا تاریخی جائزہ لیا جائے تو یہ بہت مفید ہوگا۔

اس ضخیم اور یادگار نمبر کی قیمت صرف چار روپیہ ہے۔ ملنے کا پتہ۔ انجمنِ ترقیٔ اُردو ۔ بابائے اُردو روڈ ۔ کراچی (پاکستان)

ماہنامہ آندھرا پردیش (حیدرآباد)

(سالگرہ نمبر)

ریاست آندھرا پردیش کی آٹھویں سالگرہ پر ماہنامہ آندھرا پردیش نے اپنا یہ خاص نمبر پیش کیا ہے۔ آندھرا پردیش اُردو کا سب سے کم قیمت ماہنامہ ہے لیکن اس کا معیار نہایت اچھا ہوتا ہے اور یہ اپنے قارئین کو بڑے سائز کے کافی صفحات دیتا ہے۔ اس میں تصاویر بھی ہوتی ہیں۔ یہ خاص نمبر ۹۰ صفحات کا ہے۔ اس کے قلم کاروں میں فراق گورکھپوری ۔ ظ۔ انصاری ۔ غلام احمد فرقت ۔ سجاد ظہیر ۔ علی جواد زیدی ۔ وحید اختر ۔ شاذ تمکنت ۔ خاور بانکوٹی ۔ اقبال متین ۔ واجدہ تبسم ۔ مخمور سعیدی ۔ گوپال متل اور کئی دوسرے لکھنے والے شامل ہیں۔

کتابت طباعت اور ترتیب خوبصورت۔ سالانہ چندہ تین روپیہ ۔ فی پرچہ ۲۵ پیسے۔

ملنے کا پتہ :۔ ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش ۔ حیدرآباد (اے ۔ پی)

رفتار

(علمی ۔ ادبی ۔ اور تہذیبی خبریں)

بچوں کی اُردو کتابوں پر انعامات

نئی دہلی ۱۳ر نومبر ۔ اِس سال وزارتِ تعلیم کی طرف سے بچوں کے ادب پر جو انعامات دیے گئے ہیں اُن میں عبدالغفار مدھولی کی کتاب "طالبِ علم کی کہانی" اور مسز کشور زیدی کی کتاب "زمین سے چاند تک" شامل ہیں۔

نظیر اکبرآبادی پر فلم

پروڈیوسر ڈائرکٹر مُراد، آر ایم پروڈکشن کے بینر پر نظیر اکبرآبادی کی زندگی پر فلم بنا رہے ہیں۔ گزشتہ ہفتہ اُنھوں نے مضافاتِ بمبئی میں چند اہم مناظر کی فلم بندی کی۔

اُردو ڈرامے پر انعام

آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی حیدرآباد نے اُردو کے بہترین ڈرامے پر ایک ہزار ایک سو سولہ روپے کے ایک انعام کا اعلان کیا ہے۔ ڈرامہ اصلاحی یا تاریخی ہونا چاہئے اور اتنا طویل ہو کہ تقریباً دو گھنٹے تک اسٹیج کیا جا سکے۔ مقابلے میں ہر ہندوستانی شریک ہو سکتا ہے۔ ڈرامے کی دو کاپیاں ۳۱ر مارچ ۱۹۶۵ء تک ساہتیہ اکیڈمی۔ تلک روڈ حیدرآباد (آندھرا پردیش) کے پتہ پر بھیجی جا سکتی ہیں۔

ہندوستانی آرٹسٹوں کی تخلیقات کی نمائش

ٹیگور انڈیا سینٹر نے انڈیا ہاؤس لندن میں چند ہندوستانی آرٹسٹوں کی تخلیقات کی نمائش منعقد کی ہے اور یہ ماہِ نومبر کے آخر تک جاری رہے گی۔ نمائش کی رسمِ افتتاح ۹ر نومبر کو مرحوم انیورن بیوان کی بیوہ مس جینی لی نے انجام دی۔ موصوفہ تعمیراتِ عامہ کی وزارت کی پارلی منٹری سکریٹری ہیں۔

ہندوستانی ہائی کمشنر ڈاکٹر جیوراج مہتہ نے مس لی کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ موصوفہ ہندوستان کی دیرینہ دوست ہیں۔ مس لی نے اپنی تقریر میں کہا کہ بین الاقوامی زندگی میں کلچرل تعلقات بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں اور یہ کہ آرٹسٹ اور شعرا دنیا کی اقوام کو قریب تر لانے کے لئے قابلِ قدر خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

جن ہندوستانی آرٹسٹوں کی تخلیقات اس نمائش میں رکھی گئی ہیں اُن کے نام یہ ہیں ــــ مجنن ڈی۔ بھگوت۔ بلراج کھنہ۔ یشونت مالی۔ ایس۔ وی راما راؤ۔ لیلاٹ رہبر ہوا اور ابراہیم داگھر۔

لیلیٰ مجنوں کا فارسی مسودہ

ماسکو ۔ سوویت یونین میں امیر خسرو کی نظم "لیلیٰ مجنوں" کا فارسی متن شائع کیا گیا ہے۔ اِسے مختلف مسودات کو پیشِ نظر رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔ امیر خسرو (۱۲۵۳ء - ۱۳۲۵ء) نے لیلیٰ مجنوں کے زیرِ عنوان ایک طویل نظم ۱۲۹۹ء میں مکمل کی تھی۔ اِسے مشرقی ادب کا شاہکار تصوّر کیا جاتا ہے۔

دنیا کی مختلف لائبریریوں میں اِس کے مختلف مسودات پائے جاتے ہیں۔ اصل ابتدائی مسودہ مفقود ہے۔ اِن مسودات میں بعض تضادات اور اغلاط ہیں۔ اِن تمام باتوں کے پیشِ نظر سوویت ماہرین نے اس مسودہ کو پہلی بار مستند طور پر مرتب کیا ہے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے قدیم ترین مسودہ کا جو تاشقند میں محفوظ ہے، کا بھی مطالعہ کیا۔

سلام مچھلی شہری کو صدمۂ عظیم

یہ خبر انتہائی رنج و ملال کے ساتھ سُنی گئی کہ اُردو کے مشہور شاعر سلام مچھلی شہری کے والدِ محترم جناب عبدالرزاق کا ۱۳ر اکتوبر ۱۹۶۴ء کی شب میں اُن کے وطن مچھلی شہر میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم نہایت خلیق، ملنسار اور خدا ترس بزرگ تھے۔

مشہور ہندی کے ادیب ظہور بخش کا انتقال

بھوپال۔۹ نومبر۔ یہاں کل رات کو ہندی زبان کے مشہور ادیب ظہور بخش کا ۸۵ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ اُن پر فالج کا مہلک حملہ ہوا تھا۔ ظہور بخش نے ہندی زبان میں بچوں کے لئے بہترین کتابیں لکھیں۔ شیخ سعدی کی گلستاں اور بوستاں کا ہندی میں ترجمہ کیا۔ مدھیہ پردیش کے سابقہ فسادات میں اُنکا کتب خانہ تباہ ہوگیا تھا۔ اِس کے بعد ہندی کے ادیبوں نے اُن کی مدد کی مہم چلائی تھی۔ مرحوم بھوپال ہی میں مقیم تھے۔

برطانوی اخبارات میں اُردو اشتہارات

لندن۔۱۲ اکتوبر۔ حکومت برطانیہ اور مخالف سیاسی جماعتیں اِس وقت انگلستان میں اُردو کو بڑی اہمیت دے رہی ہیں کیونکہ برطانیہ میں لاکھوں پاکستانی، ہندوستانی اور بریری لوگ آباد ہیں اور روزگار کی تلاش میں آتے رہتے ہیں، جن میں سے اکثریت انگریزی نہیں جانتی۔ حکمراں اور مخالف سیاسی جماعتوں نے آئندہ انتخابات جیتنے کے لئے اپنے پوسٹر اُردو میں چھپوائے ہیں۔ اور برمنگھم، بریڈفورڈ لندن اور راشڈیل سے شائع ہونیوالے اخبارات میں اُردو میں اشتہارات دئے جارہے ہیں۔ لندن کے دفتر روزگار میں ایک اُردو جاننے والے انگریز منیجر کا بھی تقرر کیا گیا ہے۔

اُردو میں پشتو کا حصّہ

امتیاز علی عرشی کی یہ کتاب حال ہی میں پشتو اکیڈمی پشاور نے شائع کی ہے۔ یہ کتاب اُردو کی بناوٹ کے سلسلے میں ایک نیا لسانی نظریہ پیش کرتی ہے۔

نادم سیتاپوری کی نئی کتاب

نادم سیتاپوری کی نئی تحقیقی کاوش "غالب کے کلام میں الحاقی عناصر" جلد ہی ادارۂ فروغِ اُردو کی طرف سے شائع ہوگی۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب "غالبیات" میں بالکل نیا اضافہ ثابت ہوگی۔ کیونکہ اس میں وہ تمام الحاقی کلام جمع کر دیا گیا ہے جو گزشتہ پچاس ساٹھ سال میں غلط طور پر غالب کے نام سے منسوب ہوتا چلا آرہا ہے۔

فی البدیہہ مشاعرہ

۱۴ نومبر کو ہیوی الکٹریکلس (پپلانی) بھوپال میں جواہر لعل نہرو کی یاد میں ہونے والے مشاعرہ کے اختتام پر جب شعراء کی چائے وغیرہ سے خاطر مدارات کی جارہی تھی، وحید پرواز نے "فی البدیہہ مشاعرہ" کی تجویز پیش کی۔ جو بلا تکلف منظور کرلی گئی۔ اُسی وقت جنابِ کوثر چاندپوری نے طبع آزمائی کے لئے ایک مصرعہ پیش کیا۔ "بوئے گل سوگئی، سوزِ فن مرگیا"

جن حضرات نے فوری طور پر اِس مصرع پر طبع آزمائی کی اُن کے نام اور اشعار ذیل میں درج ہیں۔

وحید پرواز:- کیا غضب ہوگیا فکر کی آنچ سے
زندگی چیخ اُٹھی، اہلِ فن مرگیا

مقبول گوالیاری:- یاد اُس کی رُلائے گی اب حشر تک
ہائے کیوں رونقِ انجمن مرگیا

شفق بھوپالی:- رُوٹھ جانے کے بعد اے جواہر ترا
جیسے سارا کا سارا چمن مرگیا

فضل تابش:- دل اگر مرگیا، بانکپن مرگیا
آنچ بھیگی اگر سوزِ فن مرگیا

وفا صدیقی:- جس سے تھی عظمتِ علم و فن
ہائے وہ رونقِ انجمن مرگیا

عشرت قادری:- کچھ خبر بھی ہے تجھ کو وفا ناشناس
شہر میں اک غریب الوطن مرگیا

مسلم سالگری:- نو شگفتہ گلوں پر خزاں چھا گئی
دوستو! آج جانِ چمن مرگیا

درگا پرشاد شاد:- زندگی کا حسیں بانکپن
ساتھ نہرو کے سارا چمن مرگیا

گوہر جلالی:- مرثیہ گو ہیں کیوں آج اہلِ
اے غزل کیا ترا بانکپن مرگیا

رفعت الحسینی:- جس سے تھی تیشۂ کوہ کی آبرو
لوگ کہتے ہیں وہ کوہکن مرگیا

قدم مِلا کے چلیں
مِل کر کام کریں

"ملک کے مختلف حصّوں میں رہنے والے عوام کو خواہ بعض معاملوں میں اُن کے خیالات کتنے ہی مختلف ہوں، یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ وہ اولاً ہندوستانی ہیں اور یہ کہ اُنہیں اپنے تمام اختلافات قوم اور مُلک کے ناقابلِ تبدیل ڈھانچے ہی میں رہتے ہوئے دُور کرنے ہیں۔ آیئے : ہم ایکتا کے اس احساس کو بڑھاوا دینے کی ہر ممکن کوشش کریں اور قومی یکجہتی کے کام کو آگے بڑھائیں۔"

لال بہادر شاستری
وزیرِ اعظم

بھارت کو مضبوط کرنے اور اُس کے سبھی باشندوں کے لئے آزادی و خوشحالی کو یقینی بنانے کا ہمارا راستہ صاف اور سیدھا ہے۔
قدم مِلا کے چلیں، ایک قوم کی طرح مِل کر کام کریں۔ اپنے اندر حوصلہ، عزم، بُردباری اور خیرسگالی کا جذبہ پیدا کریں۔

ایکتا بنائے رکھیئے ۔ آزادی کی حفاظت کیجئے

DA 66/57

پرنٹر، پبلشر اور مالک اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس، ۲۳ نومحمدجی اسٹریٹ بمبئی میں چھپوا کر دہلی سے شائع کیا۔

Regd. No. B.-6032 ISSUE No. 11, 19

The "SHAIR" Bombay 8
(35 Years of Publication)
THE MOST POPULAR OLDEST LITERARY & CULTURAL URDU JOURNAL

Only cover printed at Adabi Printing Press, Bombay-8.

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بانی علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم

اردو کا پینتیس سالہ علمی، ادبی اور تہذیبی ...

جلد ۳۵ —— شمارہ ۱۲

دسمبر ۱۹۶۲ء

ادارہ

اعجاز صدیقی

مہندر ناتھ

زرِ سالانہ	زرِ ششماہی	ممالکِ غیر سے	فی پرچہ
سات روپے	چار روپیہ	۱۶ شلنگ	[illegible]

مکتبہ قصر الادب

پوسٹ بکس ۴۵۲۶ - بمبئی ۳

نکھارا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

شاعر کی چھتیسویں سالگرہ پر نہایت فخر و مسرت کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے

سالنامہ

۱۹۶۵ء

موضوعات

مقالات

(ادب و تنقید)

عنوان	مصنف
شاعری دورِ انقلاب میں (خطبہ)	علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم
اُردو کے صوفی شعراء	ڈاکٹر سید احتشام حسین
گیت کیا ہے؟	ڈاکٹر وزیر آغا
معاصرانہ تنقید	ڈاکٹر سید عابد حسین
ہندی نئی نظم	ندا فاضلی

(تاریخ و تحقیق)

عنوان	مصنف
ہفت وار ہیں پنج بہادر	تمنا مظفرپوری
قومی یکجہتی کا تاریخی پس منظر	رشید قریشی
مہابت جنگ اور خاندان مہابت جنگ کی ادبی صحبتیں	سید نقی احمد ارشاد

(جرائم و سزا)

جرائم کی چند حیرتناک داستانیں
(غیر مطبوعہ سوانح کا ایک دلچسپ حصہ) (مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم)

(طنز و مزاح)

عنوان	مصنف
بے ٹکٹ دو (ایک تعارف)	کنہیا لال کپور
اُف لکھنؤ کی میری نظریں	غلام احمد فرقت کاکوروی
ایک سنن میرپوری	احمد جمال پاشا

افسانے

عنوان	مصنف
بازی گر	کوثر چاندپوری
۲۶ برس دو دیکے بعد دوپہر	کرتار سنگھ دُگل
آدرش اسکول (طنزیہ)	ڈاکٹر رام پرکاش شنکر
رسمِ الفت	ہنسراج ناتھ
سیٹھ جے بی	جوگندر پال
دُھواں	اکرام جاوید
ڈیفنس	آمنہ ابوالحسن
زخمی دریچے	عوض سعید
پرچھائیاں	نجمہ سمیع

ڈرامہ

عنوان	مصنف
تنگ شیروانی	اظہر افسر

انشائیہ — راجندر سنگھ بیدی - کرشن چندر - کشور زیدی - رام لال - کشمیری لال ذاکر - انور عنایت اللہ - گوپال سنگھ وغیرہ

نظمیں، قطعات

جمیل مظہری - شمیم کرہانی - جگن ناتھ آزاد
کنول پرشاد کنول - اویس احمد دوراں - یوسف ناظم
مرتضیٰ الاکرام - محمود سعیدی - حامدی کاشمیری
رونق دکنی - صبا متھراوی - نظیر پرواز
و دیگر

غزلیات

تلوک چند محروم — آنند نرائن مُلّا — میکش اکبرآبادی — ماہر القادری
خلیل الرحمن اعظمی — الطاف مشہدی — شفا گوالیاری — مظہر امام
زیدی جعفر رضا — طرفہ قریشی — قیصر قلندر — علقمہ شبلی

انتظار

جوش ملیح آبادی — فراق گورکھپوری — سردار جعفری — علی جواد زیدی
پرویز شاہدی — احمد ندیم قاسمی — سلام مچھلی شہری — غلام ربانی تاباں
جاں نثار اختر — ساحر لدھیانوی — شفیق کوٹی — عزیز حامد مدنی
رفعت سروش — کیفی شفائی — زبیر رضوی — نازش پرتاب گڑھی

ضخامت تقریباً دو سو صفحات ○ اعلیٰ کتابت و طباعت ○ نظر کش نیا رنگین سرورق

قیمت صرف ایک روپیہ پچھتر پیسے

سالانہ خریداروں کو سالانہ چندہ ہی میں پیش کیا جائیگا

"مینیجر شاعر"

مکتبہ قصر الادب

پوسٹ بکس ۵۲۶ م
بمبئی ۴
بی سی

ایک ہی زمین کے بیٹے

سورج مکھی کا پھول کئی زمینوں پر اگتا ہے اور بہت جلد بڑھتا ہے
ہم ملک کے کسی بھی حصے میں رہیں۔ ایک ہی دھرتی کے بیٹے ہوں گے جس قدر جلد ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں گے اسی قدر جلد ہم ترقی کرینگے۔
ہم مشترکہ دھرتی کے بیٹے ہیں، ہم بھارت ماں کے بچے ہیں آیئے ہم ساتھ بڑھیں تاکہ اس طرح ہم جلد ترقی کرینگے

ڈائریکٹر آف پبلسٹی، حکومت مہاراشٹر۔ بمبئی

سلام اس پہیئے کے نشان والے ترنگے کو جو ہماری جمہوریت کا مظہر ہے
اور اس پہیئے کو جو ہماری ترقی کو تیز رفتار بناتا ہے۔
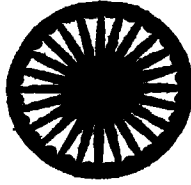
پہیہ انسان کی تہذیبی ترقی کا نشان ہے۔ اسی نشان کے حامل ترنگے نے ہماری جمہو
کے قیام کا اعلان کیا۔ اسی طرح پٹریوں پر دوڑنے والا یہ مہیب فولادی پہیہ قو
کو ترقی کی طرف لیجاتا ہے۔ آج ہندوستانی ریل ملازمین قوم کے ساتھ مل کر اس نشا
کا احترام کرتے ہیں، اپنا سر جھکاتے ہیں اور اپنی وفاداری کے عہد کا اعادہ کرتے ہ

ویسٹرن اور سینٹرل ریلویز نے جاری کیا

ترتیب

شاعر بمبئی

افکار ادارہ

جرعات	۸	ادارہ
نقد و نظر	۵۲	ادارہ
نقل اپنی .... !	۵۵	ادارہ
افکار (ادبی و تہذیبی اطلاعات)	۵۶	ادارہ

مقالات

ی اور پرانی تنقید	۹	مظفر حنفی
اردو غزل کی تحلیل نفسی	۱۴	سید نثار مصطفےٰ
لی اورنگ آبادی اور ان کی شاعری	۲۰	مظفر اقبال

نظمیں

یہ راہیں	۲۶	مفتون کوٹوی
سامنے آؤ	۲۷	اسرار اکبرآبادی
نوڑ	۲۷	صہبا وحید
جاؤ	۲۸	حسن شہیر
دشتِ بلا	۲۸	وقار رومانی
زوال	۲۹	مظہر علوی
زیرِ لب	۳۰	ساحل مونگیری

افسانے

خلوص اک دل کا	۳۱	ضیا محسنی
سنجو باجی	۳۴	علی حیدر ملک
آنسوؤں کا آبشار	۳۶	شعیب ردولوی

ڈرامہ

بربادیٔ عشق (ٹیگور)	۳۹	اے۔ خیام

غزلیں

نصیر پرواز	۴۲	اکرم دھولیوی
اعزاز افضل	۴۳	صابر شاہ آبادی
کرشن موہن	۴۳	شگفتہ رحمن
رحمت امروہوی	۴۵	شاہد کبیر
جمیل کلیمی	۴۶	شارق میرٹھی
خورشید احمد حسنی	۴۸	فخر دھولیوی

ایم اے شمیم

مکتوبات

اظہر افسر قیصر قلندر اکرام جاوید
محمود سعیدی ماہر القادری طرفہ قریشی
ناجی انصاری عابد ضمیر سنجیدہ بانو

پُرانا سال ماضی کے دُھندلکوں میں کھو گیا اور نئے سال کی اُجلی کرنیں اُفقِ زندگی پر پھیل گئیں۔ نیا اور پُرانا، پُرانا اور نیا ــــ ازل سے یہی سلسلہ جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ پہلے نئے سال کی خوشی ہوا کرتی تھی اور اب ماضی کا کرب نئے سال کی آمد کو بھی کربناک بنا دیا کرتا ہے۔ انسان سالہا سال سے ہلاکت و فلاکت اور انتشار و افتراق کے دہانے پر کھڑا لرز رہا ہے۔ قافلے اپنی منزل کی طرف رواں ہیں لیکن ہر قدم اندیشہ بداماں ہے۔ پھر بھی اندیشوں اور خطرات میں گھری ہوئی زندگی میں ایک چمک ہے، ایک جذبہ ہے، ایک حوصلہ ہے، مستقبل کو پُر سکون اور تابناک بنانے کا۔

جھلک

حوصلے ہی زندگی کی اساس ہُوا کرتے ہیں۔ قومیں، سلطنتیں اور زبانیں حوصلوں ہی سے سنورتی ہیں۔ یہ دنیا صِرف ایک کارگاہِ جذب و عمل ہے۔ جذبۂ عمل کو قوتیں عطا کرتا ہے۔ مُلک و ملّت اور قوم و وطن سے خرابیاں دُور کرنے کا ہم میں سے ہر ایک میں بے پناہ جذبہ ہونا چاہیئے اور شر پسند عناصر کو شکست دینے کا عزمِ محکم۔ شکست خوردگی، فرار، بیگانگی اور بے تعلقی سے کام نہیں چل سکتا۔
زندگی پر، قوم پر، وطن پر اور زبان پر اِس سے بھی کڑا وقت آسکتا ہے۔ اِس سے بھی زیادہ مسائل اُلجھ سکتے ہیں، ہمیں پامردی کے ساتھ سب سے گزرنا ہے۔ اپنی اپنی انفرادی اور اجتماعی کاوشوں کو بروئے کار لانا ہے۔ یہ دور جذباتی بننے کا نہیں بلکہ ٹھوس حقائق و مسائل کو فکری انداز میں محسوس کرنے اور سمجھنے کا ہے۔
دیگر مُلکی مسائل کے ساتھ ساتھ اُردو والوں کے لئے سب سے اہم مسئلہ اُردو زبان کی بقا و ترقی اور اُس سے وابستہ تہذیب کو قائم رکھنا ہے۔ اِس کے لئے وسائل پیدا کرنے ہیں اور مقدور بھر کام کرنا ہے۔ اُردو کے اشاعتی اور طباعتی پروگراموں کو اپنے اشتراکِ عمل سے کامیاب بنانا ہے۔ اُردو تعلیم کو عام کرنا ہے۔ تنگیٔ وقت کے باوجود کچھ اور ایثار و قربانی سے کام لینا ہے۔ جہاں ہم اپنی دوسری ضرورتوں پر روپیہ صَرف کرتے ہیں وہیں اُردو کے لئے بھی کچھ خرچ کریں۔ محض چیخنے، چلّانے یا خاموش بیٹھے رہنے سے کام نہیں چل سکتا۔ اُردو ایک عالمی زبان بنتی جا رہی ہے۔ اِسے مزید پھیلانے اور مقبول بنانے کی ہم پر زبردست ذمّہ داری ہے۔ ہمیں کسی احساسِ کمتری میں مُبتلا ہوئے بغیر اِس عظیم زبان اور اِس کے گراں مایہ ادب کو لازوال ترقیاں عطا کرنے کی قسم کھا لینی چاہئیے۔ یہ زبان مشرق کی جگمگاتی ہوئی زبان ہے۔ اِس سے وابستگی پر ہمیں فخر و ناز ہے ــــ اِسے ختم کرنے والوں کی کوششوں کو ناکام بنا دینا ہمارا سب سے اہم اور مقدّس فریضہ ہے۔
سنہ ١٩٧٥ء میں ہم اُردو والے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیں اور اِس طرح اشتراکِ عمل سے کام لیں کہ ہماری پچھلی کوتاہیوں کی ایک حد تک تلافی ہوجائے۔ اُردو زبان ہم سے خون نہیں مانگتی۔ صِرف عمل اور جذبۂ عمل چاہتی ہے ــــ ہماری تحریک کو تنظیم و تبلیغ کی ضرورت ہے۔ آج بھی مُلک میں کم و بیش آٹھ کروڑ اُردو جاننے والے ہیں۔ یہ سب اگر اِس سال متوجہ ہونے کی طرح متوجہ ہوجائیں تو بہت سی دُشواریاں دُور ہوسکتی ہیں۔

ــــــــــ اُردو زندہ باد

مظفر حنفی

نئی اور پُرانی تنقید

اُردو ادب میں ناقدین کی جانبداری کے خلاف اتنا شدید احتجاج غالباً پہلے کبھی نہیں کیا گیا جتنا اِس دَور میں کیا جا رہا ہے۔ قاعدہ ہے کہ اپنا حق وصول کرنے کے لئے اصل سے زیادہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ کچھ یہی جذبہ ان مضامین میں بھی کارفرما ہے جو آجکل مستند ناقدین کے خلاف لکھے جا رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اِس مسئلے پر کھل کر گفتگو کی جائے، ورنہ ممکن ہے یہ دُھند اتنی کثیف ہو جائے کہ حق و باطل میں تمیز نہ کی جا سکے۔

اِس سلسلے میں پہلا قابلِ ذکر مضمون پروفیسر شکیل الرحمٰن کا ہے جو غالباً ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا، اور جس میں سجاد ظہیر کی تنقیدوں کو جانبدارانہ قرار دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ اِس بات سے بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حالی نے نقد و نظر کے جو اصول رائج کئے وہ اپنی بُنیادی اہمیت کے باوجود زیادہ دن تک اُردو ادب کی چہار طرفہ پھیلتی بڑھتی ہوئی اصناف کا پُورا پُورا احاطہ نہیں کر سکے۔ زیادہ تفصیل میں جانے سے بات دُور تک پہنچے گی، لیکن نیاز فتحپوری کی جوش و سیماب و جگر کے کلام پر تنقیدوں سے لیکر مجنوں گورکھپوری کے تنقیدی مضامین تک ہمیں وہ منصفانہ اور کھرا تنقیدی مزاج نظر نہیں آتا جو کسی تخلیق یا فنکار کا صحیح مقام متعیّن کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے قبل قواعد اور عروض کی غلطیاں گِنا دینے اور الفاظ پر گرفت کرنے کے علاوہ اُردو ادب میں تنقید کے نام پر شاذ و نادر ہی کچھ ملتا ہے۔ ہزاروں نظریاتی اختلافات کے باوجود رفتارِ ادب سے واقفیت رکھنے والا کوئی شخص، اِس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ ترقی پسند تحریک نے دیگر اصناف کی طرح اُردو تنقید کو بھی بہت کچھ دیا ہے۔ ساتھ ہی ہمیں اِس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ تحریک کے ابتدائی دَور ہی سے ہمارے ناقدین تین دھڑوں میں بٹ گئے تھے۔ فن میں مقصد کو اولیت دینے والے ناقدین، جن میں احتشام حسین[1]، آلِ احمد سرور، وقار عظیم اعجاز حسین[2]، حنیف فوق اور عبادت بریلوی وغیرہ پیش پیش تھے۔ پھر وہ نقاد جو فن برائے فن کے قائل تھے، انھیں بھی دو قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک رجعت پسند اور روایتی ادب کی لکیر کے فقیر جو جوش ملسیانی، نوح ناروی، ناطق گلاوٹھوی اور اثر احسنی قسم کے اساتذہ کو ہی ناخدائے سخن کہہ کر خوش ہو لیتے تھے، دوسرے وہ، جن کی بیرونی ادب پر گہری نگاہ تھی لیکن اِس کے باوجود وہ فن میں مقصد کے دخل کو گوارہ نہ کرتے تھے۔ حسن عسکری اور ممتاز شیریں وغیرہ موخر الذکر جماعت کے امام ہیں۔ پھر ناقدین کی تیسری جماعت ہے جو بہت کم نفوس پر مشتمل ہے لیکن یہ لوگ انتہا پسند ہیں، انھیں اُردو ادب میں کہیں کوئی جان نظر نہیں آتی۔ ان کے ساتھ المیہ یہ ہے کہ ان کا معیز

---

[1] احتشام صاحب نے دانستہ یا نادانستہ طور پر کئی اہم فنکاروں کو نظرانداز کرنے کے باوجود نئی نسل کا دُور تک ساتھ دیا ہے۔ (م۔ح)

[2] ڈاکٹر اعجاز حسین کی تنقید علاوہ اُردو میں جانبداری کی مثالیں قائم کی ہیں۔ (م۔ح)

ادب کا مطالعہ بعید وسیع ہے اور اُردو جیسی چند سو سالہ کمسن زبان کا موازنہ یہ لوگ اطالوی، رُوسی، انگریزی اور فرانسیسی جیسی ہزارہا سال پرانی زبانوں کے لٹریچر سے کرتے ہیں اور پھر مایوس ہو کر جارحانہ تنقید پر اُتر آتے ہیں۔ کلیم الدین احمد ان لوگوں کے قافلہ سالار ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے عہدِ شباب میں ظ۔ انصاری اس صف میں شامل ہوئے اور آج کل دیویندر اسر قسم کے چند نوجوانوں میں بھی یہی رُجحانات پائے جاتے ہیں۔

سوچنے کی بات ہے جہاں ناقدین اتنے فرقوں میں بٹے ہوئے ہوں وہاں خالص غیر جانبدارانہ تنقید کے لئے کتنی گنجائش رہ جاتی ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ ناقدین نے فرداً فرداً اُن فنکاروں کو، جن کا ان کی ذات یا نظریات سے [illegible] مقام متعین کرنے کی کوشش کی۔ ادب برائے زندگی اور فن برائے [illegible] پسندوں کے نزدیک گردن زدنی ٹھہرا، کبھی میراجی جیسا شاعر [illegible] کی نظر [illegible] عظیم شاعر قرار دیا گیا۔ اس دَور کی تمام تنقیدوں کو رَد تو نہیں کیا جاسکتا، لیکن نظریات [illegible] میں [illegible] تنقید جانبداری کا شکار ضرور ہوئی۔ لہٰذا ایک طرف جہاں پطرس جیسے دس بیندرہ مزاحیہ مضامین کے خالق اور شفیق الرحمٰن جیسے افسانہ نگار تو اپنے حقوق سے بہت زیادہ لے گئے وہاں ایم اسلم، بلونت سنگھ، کوثر چاندپوری، دیویندر ستیارتھی، ش مظفر پوری، قیسی الفاروقی، سدرشن، اور آسی رامنگری جیسے زود نویس افسانہ نگار پالی بے تعلقی کی بنا پر یکسر نظر انداز کر دیئے گئے۔ دوسری طرف قدرت اللہ شہاب صرف ناول "یا خدا" لکھ کر، قرۃ العین[1] حیدر دو ناولوں کے بل بوتے پر اور عزیز احمد تین ناولوں کی تخلیق کر کے عظیم ناول نگار قرار پائے[2] اور رشید اختر ندوی اور علیم عُرَفی جیسیوں اچھے ناولوں کے خالق دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکے گئے۔

کسی ایک پلیٹ فارم سے متعلق نہ ہونے والے آزاد شاعروں کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا گیا۔ بہت سے اہم شاعر جن کے کلام میں بڑی جان ہے، نہ اِدھر کے ناقدوں کی نظر میں آئے نہ اُدھر کے نقادوں نے انھیں قابلِ اعتنا جانا۔ شاد عارفی[3] سکندر علی وجد، روش صدیقی، ساغر نظامی، اعجاز صدیقی، نشور واحدی، شفیق جونپوری، ثاقب کانپوری، سراج لکھنوی، ماہر القادری، ادیب سہارنپوری، نریش کمار شاد، قابل امرتسری، شور علیگ، مصطفیٰ زیدی، آنند نرائن مُلّا، نثار اٹاوی، احسان دانش، سلام مچھلی شہری، الطاف مشہدی، باسط بھوپالی، شکیل بدایونی، نازش پرتاب گڈھی، شاہد صدیقی، رفعت سروش، پرویز شاہدی، جمیل مظہری، شفا گوالیاری، ادیب مالیگانوی، مسعود اختر جمال، صبا اکبرآبادی، منظر صدیقی، رئیس امروہوی، طفیل ہوشیارپوری۔ عبدالکریم ثمر، سراج الدین ظفر وغیرہ۔

پھر ملک کی تقسیم عمل میں آئی، رسالوں اور کتابوں کی اِدھر سے اُدھر آمد و رفت پر پابندیاں عائد ہوئیں، شعوری یا غیر شعوری طور پر ناقدین اپنی اپنی طرف کے لکھنے والوں کی جانب زیادہ متوجہ ہوئے۔ کہیں کہیں منظم سازش کے طور پر ہندوستانی اور پاکستانی ادب کا سوال بھی اُٹھایا گیا اور اس طرح نقاد، جن کی غیر جانبداری پہلے ہی مشتبہ تھی، کھل کر جانبداری پر اُتر آئے۔ اسی اثنا میں ایک نئی نسل بھی اُبھر کر سامنے آئی جو "کا تا اور لے دوڑی" کے مصداق فوراً اپنے نئے تنقید کے مروجہ اصولوں میں کتر بیونت کا مطالبہ کرنے لگی۔ وزیر آغا،

---

[1] قرۃ العین کا "آگ کا دریا" بہت بعد کی تخلیق ہے (م۔ح) [2] بعد میں عزیز احمد کے اور بھی ناول آئے ہیں لیکن ان کا مقام قبل از وقت متعین کر دیا گیا تھا (م۔ح) [3] اوّل اوّل شاد عارفی کو ترقی پسندوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا لیکن اُن کے مذہبی رجحانات میں استحکام دیکھ کر بدظن ہو گئے (م۔ح) [4] "اُردو افسانے کے تین دَور" مطبوعہ مکتبہ لکھنؤ (افسانہ نمبر) م۔ر

راہی معصوم[1] رضا، رئیس امروہوی[2] اور تسلیم احمد[3] جیسے ذہین لوگ اِس نسل کو باقاعدہ بہکانے پر آمادہ ہوئے۔ اوّل الذکر نے رحمٰن مذنب جیسے مبتدی افسانہ نگار کو منٹو سے اونچا اُٹھا دیا، راہی نے شہریار جیسے بالکل نئے شاعر کو جوش اور مخدوم کے ساتھ نتھی کر دیا اور رئیس امروہوی کو طیش آیا تو بشیر فاروق جیسے نو وارد فنکار کو فیض، ندیم اور سردار جعفری وغیرہ سے میلوں آگے بڑھا دیا۔ کچھ لوگ انصاف کرنے اُٹھے تو اُنھوں نے مسئلے کو اور بھی اُلجھا کر رکھ دیا۔ صلاح الدین احمد[4] نے احتشام حسین کی ٹانگ لی کہ افسانہ نگاروں کی صف میں پاکستان کے تمام نوجوان فنکاروں کے نام کیوں نہیں گنوائے گئے۔ دیویندر اسر نے باقاعدہ "تاثرات و تعصبات"[5] کا سلسلہ شروع کرکے نئی نسل کے فنکاروں کو ناکارہ، کند ذہن اور مریض کہہ کر اشتعال دلایا اور اب یہ عالم ہے کہ ہر فنکار[6] اور ناقد اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے کے خلاف شکایات لئے بیٹھا ہے۔

بہتر ہوگا اگر بات کو آگے بڑھانے سے قبل یہ طے کر لیا جائے کہ نئی نسل کہہ کر ہم کن لوگوں کی حمایت کرتے ہیں۔ بقول راہی معصوم[7] رضا — "میں اب نوجوان نہیں ہوں اس لئے اپنا شمار نوجوان ادیبوں میں نہیں کرتا۔ نیا ادب دراصل اُن ادیبوں کی تخلیق ہے جو غلام ہندوستان میں اگر تھے بھی تو اتنے چھوٹے کہ انھیں وہ یاد نہیں رہ گیا۔ مجھے ہندوستان کی غلامی اچھی طرح یاد ہے اس لئے میں بھی آج کے سناٹے اور تنہائی کے احساس کو پوری طرح سمجھ نہیں پا رہا ہوں —" راہی معصوم رضا نے یہ بات نئی نسل کی حمایت میں کہی ہے لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اُنھوں نے بڑی چابکدستی کے ساتھ نئی نسل کو پچکار کر اپنا شمار فراق، سردار، فیض اور مخدوم کی صف میں کر لیا ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ اتنی واضح تعریف بیان کرنے اور اپنے آپ کو اس صف سے نکال لینے کے بعد وہ نئے ادیبوں میں رام لعل جیسے افسانہ نگار کا نام گنواتے ہیں جو غلام ہندوستان میں نہ صرف جوان ہو چکے تھے بلکہ افسانے لکھ گزشتہ ۱۲ ہیں صلاح الدین احمد سے انھیں چھاپنے کی درخواست بھی کرتے تھے یا نئی نسل میں خلیل الرحمٰن اعظمی، بلراج کومل اور مصطفےٰ زیدی کے نام لے کر اُنھوں نے صرف اپنے آپ کو ان شاعروں سے اونچا اُٹھانے کی کوشش کی ہے۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا، میں دراصل کہنا یہ چاہتا ہوں کہ نئی نسل کی یہ تعریف قطعاً غلط ہے اور اس سلسلے میں وہی بات زیادہ مناسب ہے جو بہت دنوں سے ناقدین کہہ رہے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے جو لکھنے والے منظرِ عام پر آئے ہیں اُن کا شمار نئی نسل میں ہونا چاہئے خواہ اُن کی عمر کچھ بھی ہو۔ نئی نسل کے ساتھ عمر کی قید لگا کر ہم اس کے ساتھ انصاف نہ کریں گے البتہ بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ بے انصافی ضرور ہوگی۔ غلام ہندوستان میں جو ادیب اتنا کمسن رہا ہو کہ اب اُسے اس کی یاد بھی نہ رہ گئی ہو، آج زیادہ سے زیادہ بیس بائیس سال کا نوجوان ہوگا، بالفرض وہ آج کا مشہور شاعر یا ادیب ہے تو اس کی ادبی عمر زیادہ سے زیادہ تین چار سال ہوگی۔ اب ایسے لکھنے والوں کے لئے جن کا مشاہدہ محدود، تجربہ بہت کچ

---

[1] "نیا ادب پرانی کسوٹی" مطبوعہ خاص نمبر تلاش دہلی (م۔ح) [2] بشیر فاروق کے مجموعۂ کلام حرف جنوں پر حاکمہ (م۔ح)
[3] "نیا دور" کراچی (م۔ح) [4] احتشام حسین سے ایک انٹرویو" مطبوعہ ادبی دنیا لاہور (م۔ح)
[5] آٹھ قسطوں میں دیویندر اسر کا مضمون مطبوعہ تحریک" دہلی (م۔ح)
[6] فنون لاہور، پگڈنڈی امرتسر وغیرہ میں شائع شدہ مضامین جن میں نئی نسل کے لئے ناقدین سے شکایات کی جا رہی ہیں۔ (م۔ح)
[7] نیا ادب پرانی کسوٹی۔ تلاش دہلی خاص نمبر [8] احتشام حسین سے ایک گفتگو — ادبی دنیا لاہور

محدود اور شعور ناپختہ ہے، ہم یہ مطالبہ کرنے بیٹھیں کہ اُن کے لئے تنقید کے پُرانے سانچے تنگ پڑ رہے ہیں گے۔ غالب کا لبا
انھیں چُست آئے گا۔ کتنی غلط اور مضحکہ خیز بات ہے۔ میرے خیال میں تو غالب ان پر اتنا ڈھیلا ہوگا جیسے بیجا پر ہاتھ
کی جھول۔ اور اگر اسی طرح ہم ہر تین چار سال بعد پیدا ہونے والی نئی نسل کے لئے تنقید کے بنیادی اصول تبدیل کر
رہیں گے تو ہمارا سارا ادبی سرمایہ گڈ مڈ ہو کر رہ جائے گا ـــــ ایسا بھی نہیں ہے کہ نئی نسل کی وہ تعریف راہی رد
روی میں کر گئے ہوں۔ اس بات کے ڈانڈے بڑی دُور جا کر ملتے ہیں۔ دیکھئے، ممکن ہے میری بات آپ کی سمجھ میں آ
ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہی سے فن برائے فن کے حامیوں کی ایک جماعت کچھ سیاسی یا ذاتی اغراض کی بناء
اس کی مخالف رہی۔ حسن عسکری اور ممتاز شیریں وغیرہ اس گروہ کے نمائندے تھے۔ یہ لوگ مسلسل کوشاں ر
اور وقتی طور پر منٹو جیسے عظیم افسانہ نگار کو بہکانے میں کامیاب بھی ہوئے لیکن اس وقت قرۃ العین حید
عزیز احمد اور کرشن کے دوسرے چند فنکاروں کے علاوہ لوگ مستقل طور پر اُن کے ہتھے نہیں چڑھے۔ تحریک
اپنے شباب کو پہونچی، "ادب برائے زندگی"، اور "ادب میں مقصد کی اہمیت" وغیرہ قسم کی باتوں سے مرع
ہو کر لکھنے والے فن اور مقصد میں حسن تناسب کے بنیادی اصول کو چھوڑ بیٹھے، نظریات پر سیاست اور
پروپگنڈا اور نعرے بازی حاوی ہو گئے، نتیجتاً اس تحریک کا زوال شروع ہوا۔ فن برائے فن کے حامیوں کو
خارجیت کے خلاف محاذ بنانے کا بڑا سنہرا موقع ہاتھ آیا اور اُنھوں نے مختلف حربوں سے از خود مائل بہ زوا
تحریک پر چوٹ پہنچانی شروع کی۔ سہل پسند اور سستی شہرت کی متلاشی نئی نسل سامنے تھی، صرف تنہائی
داخلیت، اپنی ذات کی تلاش، سناٹا، زندگی سے فرار، الم پرستی کی عظمت اور اسی قسم کے نفسیاتی گورکھ دھندوں
اُلجھا دینے والے موضوعات کو عام کر کے اس نسل کو بڑی آسانی سے بہکا لیا گیا۔ علامتی شاعری اور افسانہ نگاری
اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا گیا کہ نئی نسل بڑھ چڑھ کر اُلجھی ہوئی اور گنجلک چیزیں لکھنے پر آمادہ ہو گئی۔ اس بہکانے و
سازش میں مخصوص نظریات رکھنے والے ناقدین سے لیکر ناشرین اور مدیران، سبھی شامل تھے۔ راہی، بلراج کومل ا
رام لعل جیسے ترقی پسند فنکار جب توڑ لئے گئے ہوں تو نئی نسل کو بہکا لینے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ اب اسی نئی نسل
اسی دَور کے عظیم فنکاروں کے سامنے کھڑا کر کے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ رحمٰن مذنب کو منٹو سے بڑا افسانہ نگار، شہر
کو جوش سے بڑا نظم گو اور بشیر فاروق کو فیض سے بڑا شاعر تسلیم کیا جائے، تنقید کے اصول تبدیل کئے جائیں ا
ترقی پسندی کے عہد میں جن کو عظمت نصیب ہوئی ہے اُنھیں نچلی سطح پر لائیے اور اس طرح خالی ہونے والی بلند
کرسیوں پر نئی نسل کے اُن فنکاروں کو بٹھائیے جو فن برائے فن کے حامیوں کی اُنگلیوں پر کھیل رہے ہیں ـــ

اپنے حق کے لئے لڑنا بہت اچھی بات ہے لیکن دوسروں کا حق چھیننے کی کوشش کرنا اس سے بھی زیادہ
بات ہے۔ نئی نسل کی غلط تعریف بیان کر کے کیا آپ اس نسل کے ساتھ بے انصافی نہیں کرتے جو ۱۹۴۷ء کے فوراً
اُبھری ہے، جس کی ادبی عمر اس وقت سولہ سترہ سال کی ہے یعنی وہ تقریباً بالغ ہو چکی ہے۔ اس نسل کے ایک ایک
فنکار نے فرداً فرداً نئی نسل کے فنکاروں کی بہ نسبت دس گنا زائد اور زیادہ بہتر اور واضح تخالیق پیش کی ہیں۔ بے
آپ جدید ترین نسل کے لئے انصاف کا مطالبہ کیجئے لیکن اس درمیانی نسل کو نظر انداز نہ کیجئے جس میں اقبال
اعجازی، عمر عادل مارہروی، اقبال مجید، مہندر ناتھ، ابراہیم یوسف، عوض سعید، پشکر ناتھ، مومن یاد
رضیہ سجاد ظہیر، صالحہ عابد حسین، جوگیندر پال، مہندر ناوا، مختار احمد، غیاث احمد گدی، نینا کاش، کیول سو
دیویندر اسّر، راج کنول، ش اختر، سدرشن بالی، ہیرا نند سوز، م۔م۔ راجیندر، جاوید لطیفی، یوسف متا

لہ حاشیہ آرائی از حسن عسکری (ساحاشیے)

ست پرکاش سنگر، رئیس نجمی، زکی انور، عزیز اثری، احمد جمال پاشا، عفت موہانی، مسیح الحسن رضوی، وصی اقبال، برجموہن طوفان، اکرام جاوید، حامدی کاشمیری، عطیہ پروین، گوردیال سنگھ وآلیہ، نیلو فر راجہ، شوکت رانا، نور فاہ، کلام حیدری، قیصر تمکین، جگدیش تبل، رفعت نجمی، محمود واجد، آفاق احمد، مسیح الزماں امروہوی، اور عطا کریونس [1] جیسے بیسیوں اچھے اور اہم افسانہ نگار موجود ہیں۔ جن کے ہاں فن اور مقصد کا اتنا حسین امتزاج ہے کہ آپ انگلی رکھ کر نہیں کہہ سکتے یہاں سے فن اور مقصد علیحدہ ہو رہے ہیں، جنھوں نے بہت لکھا ہے اور بہت سوچ کر لکھا ہے اور بہت صاف لکھا ہے، ایسا کہ پڑھ کر عام لوگ سمجھ سکیں، محسوس کر سکیں۔

اِسی طرح آپ مظہر امام، حرمت الاکرام، خلیل الرحمن اعظمی، وحید اختر، شاذ تمکنت، قاضی سلیم، پریم وار برٹنی، عزیز قیسی، ارشد صدیقی، شفقت کاظمی، عشرت قادری، محمد علی تاج، محمود سعیدی، زبیر رضوی، عمیق حنفی، شبنم رومانی، دلاور فگار، واہی، قمر رئیس، پیام فتحپوری، اویس احمد دوراں، ساحر ہوشیار پوری، الطاف شاہد، مقصود عمرانی، ساحر نجمی، فضل تابش، فضا ابن فیضی، شہاب سرمدی، ظفر گورکھپوری، محسن بھوپالی، کرشن موہن، اختر سعید، مقصود عرفان، ناصی انصاری، عتیق احمد عتیق، کنول پرشاد کنول، کیلاش ماہر، خاور بانکوٹی، سلطان اشرف، وغیرہ کی خدمات کو نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتے کہ اگر انھوں نے اپنے خونِ جگر سے تخلیق کردہ فن پاروں میں زندگی کے ترانے گائے ہیں اور خالص نعرے بازی سے بچتے ہوئے مقصدیت کو برقرار رکھا ہے تو کوئی جرم نہیں کیا۔

نئی نسل کو خواہ وہ ۱۹۶۰ء کے فوراً بعد منظرِ عام پر آئی ہو یا ابھی تین چار سال قبل، بہت سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانے ہیں۔ نعرے بازی اور انتہا پسندی جب ترقی پسند جیسی تحریک کو اِس منزل پر لا سکتی ہے، جہاں وہ اب ہے تو محض داخلیت پسندی اور زندگی سے فرار کا جذبہ اپنی انتہا کو پہنچ کر نا سمجھ کے انجام پر بھی لگا سکتا ہے۔ ہمارا فن واضح، متوازن اور با مقصد ہونا چاہیے۔ زندگی سے فرار ممکن نہیں، ہاں اُسے فن کی آمیزش سے خوش حال ضرور بنایا جا سکتا ہے۔ حقیقتوں سے چشم پوشی کر کے اپنی ذات میں محدود ہو کر رہ جانے کا نام فنکاری نہیں بزدلی ہے۔ ماحول سے شکست کھا کر موت کی خواہش کرنا بھی شاعری یا افسانہ نگاری نہیں۔ یہ سناٹا، یہ تنہائی ہمارے خوفزدہ ہو جانے سے دُور نہ ہوگی اسے دُور کرنے کے لئے محنت کرنی ہوگی۔ با مقصد تحریروں کے ذریعے سب کی سمجھ میں آنے والا ادب ہی سب کو متاثر کر سکتا ہے ورنہ محنت کئے بغیر تو صرف پروپگنڈا کے سہارے ادب میں کوئی خاص مرتبہ حاصل نہیں کیا جا سکتا اور اگر حاصل ہو بھی جائے تو وہ دیرپا نہیں ہوتا، اتنا تو شاید ہم سب ہی جانتے ہیں۔

رہی بات ناقدین کی جانبداری اور غیر جانبداری کی، تو آپ پرانے ناقدین کے منہ کیوں تکتے ہیں۔ نئی نسل کے ناقدین بھی نئے ہونے چاہئیں۔ آج اُردو ادب کی فضا نئے ناقد کے لئے ہمیشہ سے زیادہ سازگار ہے لیکن اس نئے ناقد کے لئے وسیع النظری، انصاف پسندی اور غیر جانبداری پہلی شرط ہوگی ورنہ ابتک تو نئی نسل نے اپنے منصف مزاج اور غیر جانبدار ہونے کا کوئی خاص ثبوت نہیں دیا ہے۔

---

[1] و [2] اپنے طور پر ان فہرستوں میں میں نے وہ تمام نام گنوانے کی کوشش کی ہے جو ناقدین کی بے توجہی کا شکار رہے ہیں لیکن اتنے اہم ہیں کہ ان پر لکھا جانا چاہیے۔ ایسے نام لکھنے سے میں نے دانستہ گریز کیا ہے جو عام طور پر مضامین میں دُہرائے جاتے رہے ہیں، اس کے باوجود بہت سے مستحق لوگوں کے نام شاید میں نہ لے سکا ہوں اسے میری جانبداری سے زیادہ حافظے کی کمزوری پر محمول کیا جائے۔ (مظفر حنفی)

سید نثار مصطفیٰ

اُردو غزل کی تحلیلِ نفسی

ادب نفسِ انسانی، معاشرہ اور عہد کا پرتو اور ترجمان ہوتا ہے۔ یہ عکسی تصویر ہی نہیں ہوتا بلکہ فنکار کے اطراف،
جذبات اور محسوسات کے ردِ عمل، زندہ حقیقت کی مانند ہوتا ہے۔ جس طرح انسان کی بنیادی فطرت نہیں بدلتی اُسی طرح
ادب کی بھی وہ بنیادی فطرت نہیں بدلتی جو اُس کے خمیر میں رچ بس جاتی ہے۔ علاوہ ازیں انسان ایک ایسی حقیقت ہے
جو اپنی بنیادی صفات ہر حال میں برقرار رکھنے کے باوجود حالاتِ زمانہ کے ساتھ ارتقاء پذیر ہے۔ یہی حالت اصناف
ادب کی بھی ہے۔ ادب فکری طور پر بھی اور ہیئتی طور پر بھی زمانے کا ساتھ دے کر پنپتا رہتا ہے۔

بلاشبہ غزل کی بنیاد عشق اور معاملاتِ عشق پر ہے۔ اس لئے یہ بنیادی صفت ہر دَور کے شعراء کے یہاں موجود ہے۔
محبوب سے گفتگو کا نام ہے،، اور یہ گفتگو متاخرین تک ملتی ہے۔ لیکن گفتگو کی نوعیت زمانہ کے اعتبار سے بدلتی رہی ہے۔
محبوب کی بے تابی اور تڑپ، ایثار اور وفا شعاری جو دکنی دَور تک قائم رہی ہے، ولی سے میر تک آتے آتے جور و ستم
بدل گئی ہے۔ اوّل الذکر خصوصیت کی وجہ بھاشا کی شاعری کا اثر ہے جس میں عاشق عورت ہوا کرتی تھی اور معشوق
مرد ہوا کرتا تھا۔ یعنی اگر عاشق رادھا جیسی برہا کی ماری وفا شعار محبوبہ ہوتی تو کنہیا جیسا بے پروا اور جفا شعار محبوب
ہوتا اور آخر الذکر خصوصیت کی وجہ، جو شمالی ہند سے شروع ہوئی، عجمی اثرات تھے، کیونکہ شمالی ہند نے براہِ راست فارسی
روایت کو قبول کیا تھا جبکہ عورتوں کی جگہ ترکی خوبرو سپاہیوں نے لے لی تھی۔ جس کے نتیجے کے طور پر فارسی کو اور فارسی کے
کو اُنہیں کے انداز و ادا کی نوعیت کے مطابق استعارے اور رمزیہ الفاظ ملے مثلاً وفا کی جگہ جفا، ناز و ادا کی جگہ غمزہ
عشوہ، رنگِ گُل کی جگہ خونِ دل و جگر، مدھ بھری آنکھوں کی جگہ نین کٹار، اور بہتیرے الفاظ تیر و تلوار خنجر و شمشیر آئے۔

اُردو غزل کی تحلیلِ نفسی میں غالب کے نئے آہنگ اور نئے اندازِ محبت اور محبت میں خودداری نے اُردو غزل
میں انقلاب برپا کر دیا۔ فارسی کی دوسری خصوصیت ایران کی ابتری اور لغزانفری کی وجہ سے فرار انگیز بھی تھی جس
حافظ، جامی اور رومی وغیرہ کو تصوّف میں پناہ لینے پر مجبور کیا تھا۔ اِس لئے اُردو غزل کے نفس میں نفسِ انسانی
یہ عکس بھی لاشعوری طور پر آ گیا تھا۔ مومن، درد، شاد اور امیر مینائی جس کی واضح مثالیں ہیں۔ مسائلِ تصوّف ا
افراط و تفریط نے باتیں مسلسل کہنے کی جگہ رُک رُک کر اور سنبھل سنبھل کر کہنے کو مجبور کیا تھا جس نے غزل کی ہیئت میں ع
تسلسل کو جگہ دی۔

چنانچہ غزل کی پریشاں ہیئت، قوموں اور ملکوں کی تاریخ کے نشیب و فراز کی آئینہ دار ہے۔ اس کی کبھی اُکھڑی
کبھی سنبھلی آواز، جس میں بے ربطگی بھی ہے اور وارفتگی بھی، قوموں اور ملکوں کے انتشاری حالات اور بحرانی دَو

تعبیر ہے۔ اور جہاں صنفِ غزل افراتفری کی آنچ سے بچ سکی ہے وہاں اُس کی ہیئت پر عدم تسلسل کے وصف یا خامکاری کا فقدان ہے، ادب کی اِس نفسیاتی اُلجھن کی طرف اگر کلیم الدین احمد کا دھیان گیا ہوتا تو شاید موصوف کو "نیم وحشی صنفِ سخن" کہتے ہوئے تامل ہوتا۔ صنف مذکور کن حالات سے گذری ہے اُن پر نظر رکھنی لازمی ہے۔

داخلیت کی تعمیر خارجی اثرات کے مطابق ہوتی ہے۔ فن پر دُور کے خارجی اثرات سے زیادہ اطراف کے اثرات کا اثر ہوتا ہے۔ فارسی اثرات کے در آنے کی وجہ ہندوستانی و عجمی فضا اور حالات کی مماثلت تھی ورنہ فارسی کے اثرات اتنے دیرپا نہ رہتے۔

اُردو غزل کی داغ بیل شمالی ہند میں سب سے پہلے پڑی ہے چنانچہ عہدِ متعلقہ کے اُن حالات کا تجزیہ لازمی ہے جس میں صنفِ غزل کی بنیاد پڑی اور جس نے غزل کے خالق کو متاثر کیا یعنی اُردو غزل امیر خسرو نے متعدد سلطنتوں کو اپنی زندگی میں بنتے اور بگڑتے دیکھا۔ پھر بھی ماحول پر ان کے بننے اور بگڑنے کے اثرات نے شدت اختیار نہیں کی اور نہ ہی دیرپا رہے۔ عام زندگی کے معمول میں بھی کوئی فرق واضح نہ ہو سکا، پھر بھی کچھ نہ کچھ اثر معاشرہ نے ضرور قبول کیا اسی لئے بانیٔ غزل پر عجمی اثرات واضح نہ ہو سکے کیونکہ ملکی حالات آپس میں مطابقت نہ رکھتے تھے۔ اسی حقیقت کا واضح عکس ہم اگر دیکھنا چاہیں تو وہ ہمیں عہدِ مذکور کی اُردو غزل میں ملتا ہے۔ ساتھ ہی فارسی کی روایات کی بھی ہلکی سی جھلک ملتی ہے، بلکہ اِس لئے کہ ہندوستانی فضا جیسا کہ اُوپر ذکر ہوا حاوی رہی ہے۔ اِس روشنی میں اگر ہم امیر خسرو کی غزلوں کا تجزیہ کریں تو ہمیں فطرتِ انسانی کی طرح معاشرہ، ماحول اور مزاج جھلک آتا ہے۔ ع

زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

غزل کے اشعارِ مذکور میں چند باتیں اہم ہیں۔ اوّل اُس کے مزاج میں نظمیت اور ہم آہنگی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لیکن ایسی بھی نہیں کہ اگر ایک شعر بیچ سے نکال لیا جائے تو خلا محسوس ہو۔ یہ اِس بات کی غمازی ہے کہ فنکار کا ماحول سازگار ہے لیکن سازگاری میں محویت کی جگہ ہوشیاری بھی ہے۔

۲۔ وارداتِ دل کا مختلف پہلوؤں سے اظہار ہے جس میں جذباتی تکرار کی جگہ شعری و معنوی تسلسل بھی ہے۔ اِس لئے معنوی ربط کے ساتھ ساتھ پوری غزل ایک مرکزی تصور بھی رکھتی ہے۔ جس کی وجہ سے ارتقا پذیر بھی ہے۔ اس مرکزیت اور ربط کی وجہ وہی سازگاریٔ ماحول ہے۔

۳۔ اشعار مذکور میں مشاہدہ تجربہ سے قریب تر ہے۔ یعنی شاعر نے جیسے خود بھی اپنی زندگی میں ایسے تجربے کئے ہیں۔ اِس تجربے میں شدت ہے اور شدتِ احساس کی وجہ سے فن کی پختگی بھی شامل ہے۔

۴۔ تنظیم میں نظم کے مقابلے میں کمی آجانے کی وجہ سے امیر خسرو پر ہلکا سا سیاسی اور معاشرتی بے اطمینانی کا اثر ہے۔ ہجر و وصال کے ذکر میں حالتِ ناگفتنی کا بھی اظہار ہے جسے فنکار نے فن میں ڈھال کر پُر کیف بنا دیا ہے۔ تخلیق کی اثر انگیزی اس کا غیر واضح المیہ تصور ہے۔ اس کی وارفتگی میں جو غیر واضح بے ربطگی ہے اس کی وجہ اطراف کا ماحول بھی ہے اور عجمی روایت بھی ہے جو غیر محسوس طور پر امیر خسرو کے شعور میں داخل ہو گئی تھی۔

۵۔ جذبات و احساسات خالص ہندوستانی ہیں۔ بھاشا کی شاعری کے زیرِ اثر عورت کی طرف سے اظہارِ تمنا

اس کی واضح مثال ہے۔

اس تحلیل نفسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ صنف کوئی اہم نہیں ہے بلکہ فنکار جس ڈگر پر چلتا ہے اور جس فضا میں سانس لیتا ہے اور جہاں سے اپنے فن کی بانسری پھونکتا ہے وہ زیادہ اہم ہیں۔ ادب انسان کی طرح انسانوں کی دنیا میں سانس لیتا ہے۔ غذا حاصل کرتا ہے۔ اور پروان چڑھتا ہے اس دورِ پرورش میں زندگی کے گوناگوں تجربات اور اثرات کو بلا ارادہ قبول کرتا ہے جس طرح انسان زندگی کی قید میں رہ کر آثارِ زمانہ سے گریز نہیں کرسکتا اسی طرح ادب بھی اپنے ہر دور میں مختلف میلانات اور حادثات سے دوچار اور متاثر ہوتا رہتا ہے۔

اُردو کی پرورش و پرداخت دکن کے اس دَور میں ہوئی جب انتشار کی جگہ یکسوئی تھی۔ جب زندگی کو گراں باری کا احساس کم اور کامرانی اور عشرت کا احساس زیادہ تھا۔ جب شمالی ہند سے معصوم تتلی سی نوزائیدہ زبان، شوخ چنچل بھی دوشیزہ سے ہار کر اور نڈھال ہو کر دکن میں پناہ گزیں ہوئی تھی۔ جب دکن پر مُغلوں کے حملے کے اثرات کم ہوتے جاتے تھے اور ماحول سازگار اور پُرسکون ہوتا جاتا تھا۔ اُردو عادل شاہی دَور اور بہمنی دَور میں خالص ہندی فضا میں بچپن کے دن گذارنے لگی تھی جب پرشاہی آن بان کی جگہ عوامی انکساری اور بھولپن کا سبھاؤ غالب تھا۔

دَورِ فارغ البالی نے غزل کو یکسوئی عطا کی ہے، بے ربطی اور انتشار کی گنذ مشکل ہوگئی غزل کے توتلے بولوں میں بلا کی روانی آگئی۔ بلاشبہ ڈھانچہ فارسی سے مستعار تھا لیکن فارسی کے اثرات تقریباً عنقا تھے۔ کیا مثنویاں، کیا قصیدے کیا غزلیں، سب کی سب مُسلسل اور سُلجھے انداز کی ہونے لگیں۔ فنکار کے خیالات کے تانے بانے میں کوئی خارجی اثر حائل نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دکن کے عہد مذکور میں اُنھیں اصناف کو زیادہ ترقی ہوئی جن میں مُسلسل خیالات ادا کئے جاسکتے تھے۔ غزل کا پیمانہ یقیناً مختصر ہے۔ اس لئے دکنی دَور میں مُسلسل جذبات کی عکاسی کے لئے ناکافی ثابت ہوئی۔ چنانچہ دکن میں غزل کی جگہ مثنوی کو ترقی ہوئی اور اگر غزلیں لکھی بھی گئیں تو سوائے اپنی بنیادی ہیئت کے ہر لحاظ سے نظموں سے مماثل ہیں جس طرح نظموں کے اشعار میں ایک زنجیری ربط ہوتا ہے اسی طرح دکنی غزلیں بھی ربط و ہم آہنگی کی غماز ہیں۔ وجہی کی غزل کے کچھ مُسلسل اشعار بطورِ ثبوت درج ذیل ہیں۔ ؎

طاقت نئیں دُوری کی اب تو بیگ آمل رے پیا
تج بن مُنجے جیونا بہوت ہوتا ہے مشکل رے پیا
کھانا برہ کھیتی ہوں میں پانی انجھو پیتی ہوں میں
تج تے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا
ہر دم توں یاد آتا مُنجے اب عیش نئیں بھاتا مُنجے
برہا یو سنتاتا مُنجے تج باج قل قل رے پیا

جذبات اور واردات عشق وہی ہیں جو امیر خسرو نے اپنی غزل میں پیش کئے ہیں۔ لیکن دونوں کی جذبیت میں واضح فرق ہے۔ وجہی کے جذبات سچّے، فطری اور شدید ہیں۔ امیر خسرو کے جذبات میں وہ آمد نہیں ہے جو یہاں وجہی کے یہاں ہے۔ ایرانی اثر نے فطری احساس کو اُجاگر نہیں ہونے دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے امیر خسرو نے صرف فن کو ملحوظ رکھ کر اپنی جودتِ طبع کی خاطر غزل لکھی ہے اور وجہی نے اپنے داخل میں ڈوب کر محویت کا عالم طاری کر دیا ہے۔ جہاں جذبات میں لگاوٹ نہیں فطرت جھلکتی ہے۔ امیر خسرو کے یہاں نسوانیت نمایاں ہے۔ عشق کی وہ بنیادی کیفیت مفقود ہے جو عشق کا وصف ہے۔ امیر خسرو کی عورت جذبات سے مغلوب اور بے تاب ہے اور "نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں" کی

جنسی صدا لگاتی ہے۔ لیکن وجہی کی عورت ایک برہن ہے، جو حزن و ملال، لگن اور تڑپ میں کنھیا کی رادھا ہے جہاں جنسی جذبہ کی جگہ رُومانیت ہے، سنجیدگی ہے، تڑپ ہے، التجا ہے اور تمنائیں ہیں جن میں بے چارگی کا شدید احساس ہے۔ اس کا تیکھاپن اور اس کی عظمت اس سے ظاہر ہے کہ کیفیت اپنی اس وقت بیان کرتی ہے جب برہ کی رات زیادہ ناقابلِ برداشت ہوجاتی ہے ع

طاقت نیں دُوری کی اب توبیگ آمل رے پیا
اور کھانا برہ کیتی ہوں میں، پانی انجھو پیتی ہوں میں

جذبات کی شدت، جذبات کی یکسانی اور ماحول کی موافقت نے غزل کو بھی نظم کا تسلسل عطا کردیا ہے۔ چنانچہ غزل کی وہ تعریف کہ "غزل ایک گلدستہ ہے جو رنگا رنگ پھولوں سے مرصع ہے" یہاں باقی نہیں رہتی بلکہ یہاں غزل وہ پھول ہے جس کی تمام پتیاں ایک ہی رنگ کی ہیں اس میں جو باتیں بھی کہی گئی ہیں مُسلسل ہیں۔ ایک خیال پیش کرنے کے بعد شاعر کے حواس گم نہیں ہوئے اور نہ ہی کوئی حواس باختہ خیال ہے جس پر موضوع سے الگ کوئی دوسرا خیال یا فلسفہ حاوی ہوسکا ہے۔ چنانچہ ہر شعر زنجیر کی ایک کڑی ہے جس کی جُدائی کے خلا کو پُورا نہیں کیا جاسکتا۔

غزل میں جذبات و اظہارات کی ہم آہنگی اور تسلسل دکنی دَور تک قائم رہتے ہیں۔ اِس دَور کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ غزل ہیئتی طور پر ہی مُسلسل نہیں ہوتی بلکہ جذباتی اور حسیاتی طور پر بھی مُسلسل ہوتی ہے۔ نصرتی کی ایک غزل کے چند اشعار یہ ہیں

بولیا کہ تجہ فراق تے کے عاشقاں خراب
بولی مرے وصل سے کیا تجہ ہے حال بول
بولیا کہ کعبہ دل ہے تو دل توڑنا حرام
بولی بتاں کے بت تھے توٹے تو جلال بول

خسرو کی برہن سَیلِ جذبات میں بہی، وجہی کی برہن حالتِ زار تک پہنچی اور نصرتی تک جب آئی تو وفاشعاری کا صلہ پائی۔ پُرخلوص لگن اور سچی تڑپ۔ نے پیا کو بھی جُھکنے پر مجبور کیا۔ اب نہ خسرو کی برہن کی طرح بہکنے کا وقت رہا اور نہ وجہی کی برہن کی طرح تڑپنے اور رونے کا بلکہ جلد ہی اس عہد میں اُردو کی محبوبہ کو وصال نصیب ہوا۔ شکوے اور شکایتیں ہوئیں۔ محبوب اپنی بے التفاتی پر ابھی پشیماں نہیں ہوا تھا۔ اِس لئے رُوٹھنے اور منانے کی روش چل نکلی۔

بولیا کہ کعبہ دل ہے تو دل توڑنا حرام
بولی بُتاں کے بت تھے توٹے تو جلال بول

ولی تک آتے آتے معشوق کی شخصیت اُبھر کر تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ ایک کہانی جو امیر خسرو اور وجہی سے شروع ہوئی تھی ولی اورنگ آبادی کے عہد تک انجام کو پہنچی۔ لہٰذا معشوق کی دُھندلی تصویر اور غیر واضح شخصیت نمایاں ہوئی۔ شاعری کی اس ارتقا پذیری کی وجہ عہد اور ماحول کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی یکسانی تھی اور اِس یکسانی کا عروج اُس وقت ہوا جب اورنگ آباد کو اورنگ زیب نے پایۂ تخت بنایا۔ امن و امان اور خوش حالی و نشاط کا دَور شروع ہوا۔ اطراف سے شعرا جمع ہوئے اور ذکرِ محبوب بہ احترام شروع ہوا۔

ماحول کا انبساط ہر شئے اور ہر فن کے انجام میں سرخوشی اور کامرانی عطا کرتا ہے وہ داستان جو وجہی سے شروع ہوئی تھی نصرتی تک انجام کو پہنچ چکی تھی اور ہجر و بچھاڑ اور اتصال کے بعد انبساطِ زندگی کے رازِ سربستہ باہم ڈھونڈنے کو ہیں۔ دَورِ جذبات اور بے خودی ختم ہوا۔ زندگی کی رواں دواں ندی اب اپنی فطری رفتار سے بہنے کو ہے چنانچہ

ہلِ مکاں کو مکان والی کا احترام لازمی ہے جو اجنبی نہ رہ کر مالکۂ مکان ہے۔ چنانچہ ولی اورنگ آبادی کو سنیں ؎

اہلِ گلشن پر ترے قد نے جب امداد کیا
اوّلاً سرکوں غلامی سے آزاد کیا

اُس کی تعظیم ہوئی اہلِ چمن پر لازم
بلبلِ باغ نجب مصحفِ گل یاد کیا

روزِ اعجاز تری چشم سوں اے نورِ نظر
حسن کے فرد پر دیوانِ ازل صاد کیا

ابھی ابھی مرد کی وارفتگی کا دور شروع ہوا تھا۔ مالکہ کی تعظیم ابھی ابھی چمن پر صادر ہوئی تھی۔ اُردو غزل کی محبوبہ ابھی رتقا کی طرف قدم اُٹھا رہی تھی کہ اچانک اُسے صدیوں پیچھے کی طرف آجانا پڑا۔ عالمگیر کی وفات کے بعد خانہ جنگی شروع ہوئی۔ شیرازۂ حکومت کا درہم برہم ہو رہا تھا۔ اسی اثنا میں نادر شاہ کے حملے ہوئے۔ دلی لُٹ گئی۔ تباہی کے بادل ہر چہار طرف منڈلانے لگے۔ دکن میں فرانسیسیوں کی اور دلی میں فرنگیوں کی دست درازیاں شروع ہو چکی تھیں۔ ہر طرف زماندگی شروع ہو گئی۔ شمالی ہند سے سیاسی تعلقات نے فارسی کی تقلید کی ہوا کو دکن میں بھی تیز کر دیا اور غزل کے مزاج میں تیزی سے تبدیلی شروع ہو گئی۔ مُلکی اثرات کی جگہ غیر مُلکی اثرات در آئے۔ اس کے علاوہ یکسوئی کی جگہ انتشار نے لے لی۔ وہ محبوبہ جسے عرصہ بعد وصال نصیب ہوا تھا، اپنے محبوب سے زمانۂ انتشار میں بچھڑ گئی۔ جدائی اور فراق کی گھڑیاں آئیں۔ وہ دونوں گھروندے جو بن چکے تھے زمانے کی آندھی نے مسمار کر ڈالے۔ وہ دل انتشار کی آندھی کی لپیٹ میں آ گئے۔ محبوبہ کے چھن جانے کا شعور بیدار ہوا۔ سوز میں ڈوبی ہوئی آوازیں آنے لگیں اور سراج دکنی تک آتے آتے یہ درد انگیز لے تیز تر ہو گئی ؎

خبرِ تحیرِ عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تُو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شہِ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمتِ غیب سیں کیا ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سیں بیاں کروں
کہ شرابِ صد قدحِ آرزو خمِ دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی یونہی دھری رہی

ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سیں عیاں ہوا
کہ نہ آئینہ میں جلا رہی ہے نہ پری کی جلوہ گری رہی

کیا راکھ آتشِ عشق نے دلِ بینوائے سراج کوں
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خبری رہی

خرمنِ سکون و خرد لُٹ چکا تو بات دل گداز ہوئی اور ساتھ ہی اشعار کے باہمی ربط میں بے ربطی کا گذر شروع ہوا۔ سانس اُکھڑی ہوئی تھی اس لئے بات جتنی بھی جلدی ہو سکے، پوری کہہ دینے کا احساس واضح ہوا۔ سوز و گداز انگ انگ میں سمانے لگے۔ اور یہ سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ غزل کی بنیادی صفت بن گیا۔

درماندگی کے اعتبار سے دکن اور دلی ایک ہو گئے۔ محبوبۂ گم گشتہ جسے اب چین اور سکون کہیے، کی تلاش جاری ہوئی۔
دیکھئے میر کو میر کی بے خودی کہاں لے گئی ؟ ؎

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات
اب یہی روزگار ہے اپنا

چنانچہ اب جبکہ سب کچھ لُٹ چکا تو نہ کوئی ہمدم رہا نہ کوئی ساتھی۔ ایک موت تھی جو دامن پھیلائے کھڑی تھی اس۔ انشا کو کہنا پڑا ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں — بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی — تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

اب پایۂ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ ہر بُت میں عکسِ محبوب کے دھندلے نقوش کا گمان ہوتا ہے۔ ہر محبتِ خاص کے سامنے تخیلِ محبوب جاتا ہے۔ اُسے آواز دیتا ہے اور آواز جب نہیں آتی تو محبوب بلبلا اُٹھتا ہے ؎

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جنسی گھٹن کا ایک طویل دور شروع ہوا۔ اس گھٹن کی بے تابی محبوب کو عرشِ معلیٰ تک لے گئی۔ خدا کے جلال و جمال میں محبوب کی ادائیں ڈھونڈی جانے لگیں۔ چنانچہ جنہیں کوئی سبیل نہ ملی تو تصوف میں پناہ گزیں ہوئے۔ کوئی سفلی جذباتیت میں مبتلا ہوا۔ کسی نے تقلید پر اکتفا کیا۔ لیکن وحشت ہر جگہ نمایاں رہی۔

چنانچہ غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن کہتے ہیں تو بات لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کی ظاہری ماہیت اس بات پر دال ہے کہ غزل گو کے یہاں مرکزی خیالات عنقا ہیں جس کی ذمہ داری غزل گو پر عائد نہیں ہوتی بلکہ جورِ فلک پر ہوتی ہے۔ مغلوں کے انحطاط، ہندی تمدن کے زوال، مغربی تمدن کے تسلط اور معاشی بحرانی کے ہم غزل سے اس کا تسلسل نہیں مانگ سکتے۔

غالب رومانی اور فکری طور پر مجتہد ضرور ہیں لیکن ان کی بیشتر غزلیں ایسی ہی ہیں ؎

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

قطعہ مذکور میں ہوش و نیوش کی باتیں ہوتے ہوئے بھی غنودگی کے آثار نمایاں ہیں۔ کہتے کہتے پلکیں شاعر کی جھپک رہی ہیں اور غنودگی اور مدہوشی میں جو باتیں ہو سکتی ہیں، ہو رہی ہیں۔ خیالات انتشاری کیفیت اور غمِ اندروں کے غماز ہیں۔ غمِ داخلی میں محالاتِ انتشار میں بھی کیف اور شعری ربط کو سوز و گداز کی وجہ سے برقرار رکھا ہے۔ اگر خارجی اثرات سازگار ہوتے تو غزل بلاشبہ مسلسل اور باتیں یقینی ہم آہنگ ہو سکتی تھیں۔

غزل کے نفسیاتی تجزیے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے موجودہ ہیئت و اسلوب کے ضامن ادوار کے نشیب و فراز رہے ہیں۔ اس کے تسلسل اور عدمِ تسلسل کا انحصار حالاتِ زمانہ کی نوعیت پر ہے اور معاملاتِ عشق کی عہد بہ عہد تفریق کی وجہ عہدِ متعلقہ کے سیاسی، معاشرتی اور فکری ہیجانی اثرات ہیں۔ چنانچہ یہ فن اور فنکار کی خوبیاں اور خامیاں نہیں ہیں بلکہ زمانہ جو دیتا ہے فن اور فنکار وہی لے لیتا ہے۔

آج غزل کے عدمِ تسلسل کی وجہ سائنسی تجربے اور علامتیں ہیں جو صنعتی دور کی کم مائیگیِ وقت کا ردِ عمل ہیں۔

مظفر اقبال

زکی اورنگ آبادی اور اُنکی شاعری — ایک تعارف

"شاعر" (آگرہ) کے دسمبر ۱۹۴۱ء کے شمارہ میں مولانا آلم مظفر نگری کا ایک مقالہ بعنوان "سلسلۂ سیمابیہ او
اُردو" شائع ہوا تھا۔ مقالہ کی ابتداء میں نثار سیمابی اٹاوی کا مرتب کیا ہوا شجرہ درج ہے جس میں شاہ ظہیر الدین ح
حضرت سیماب اکبرآبادی تک کا سلسلہ پیش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی کے فارغ الا
اور مشہور تلامذہ میں سے صرف "چند" کے نام بھی اس شجرہ میں درج کئے گئے ہیں۔ شجرہ میں جہاں ساغر نظامی، بسمل
دہلوی، آلم مظفر نگری، اعجاز صدیقی، مخمور جالندھری، منیب اشعر، شہ زور کاشمیری وغیرہ معروف و مقبول شع
اسماء گرامی نظر آتے ہیں وہاں زکی اورنگ آبادی کا نام بھی دیکھا جاسکتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جس وقت آلم مظفر نگ
یہ مقالہ شائع ہوا تھا اُس وقت لوگ زکی اور اُن کی شاعری سے واقف تھے لیکن آج ۱۹۶۴ء میں زکی کو لوگوں سے
کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اس لئے کہ وہ تقریباً گمنام ہو چکے ہیں اور اس گمنامی اور عدمِ شہرت کا سبب اُنکی
کم گوئی، اور اپنے کلام کی اشاعت سے بے پرواہی ہے۔ ان کی بیاض کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک زمانہ میں
ہی پُرگو تھے اور ان کا کلام ملک کے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں شائع بھی ہوا کرتا تھا لیکن اب شعر کہنے اور چھپ
سے انھیں تقریباً کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کا نمونہ پیش کرنے سے پہلے اُن کی زندگی کے اہم واقعات و حالات پر ایک نظ
ڈال لی جائے۔

زکی کا نام عبدالقیوم ہے۔ یہ سنہ ۱۹۰۹ء میں صوبۂ بہار کے ایک مردم خیز قصبہ اورنگ آباد ضلع گیا میں پیدا ہوئے۔ ذر
مقامی مدرسہ اسلامیہ میں حاصل کی، سنہ ۱۹۲۱ء میں تعلیم چھوڑ کر تحریکِ ترکِ موالات کے سرگرم حامی و کارکن بن گئے اور ا
گردشِ روزگار نے مزید درسی تعلیم کے حصول کی فرصت نہیں دی لیکن مطالعہ جاری رکھا اور یہ عادت رفتہ رفتہ
آج بھی کتابوں، رسالوں اور اخباروں کا مطالعہ بہت ہی پابندی سے کرتے ہیں۔

شعر کہنے کی صلاحیت فطرت کی طرف سے عطا ہوئی ہے چنانچہ بچپن ہی سے تک بندی شروع کردی تھی، ابت
کسی سے اصلاح نہیں لی لیکن کچھ عرصہ کے بعد احسن مارہروی سے مشورۂ سخن کرنے لگے اور پھر باضابطہ طو
شاگرد ہوگئے۔ ابھی یہ پورے طور پر کسبِ فیض نہیں کر پائے تھے کہ احسن مارہروی کا انتقال ہوگیا، مرگِ اُ
یہ بہت متاثر ہوئے اور پُرزور نوحہ لکھا ؎

حضرتِ احسن مارہروی کی یاد میں

رہبرِ علم و ادب اے ہادیِ اُستادِ عصر — تو جُدا مجھ سے ہوا کس طرح آئے دل کو صبر

چشمِ پُرنم ہر گھڑی رہتی ہے تیری یاد میں | یاد شفقت کی تری بے چین کرتی ہے ہمیں
داغ اپنی موت کا دے کر ہوا ہم سے نہاں | اب کہاں پائیں گے ہم تجھ سا شفیق و مہرباں
ذرّۂ بے قدر کو مہر آشنا تو نے کیا | تیغ زنگ آلود کو صیقل نما تو نے کیا
تو گیا تو ساتھ ہی ذوقِ سخن جاتا رہا | بے ترے اے باغباں لطفِ چمن جاتا رہا

ابھی زکی کا کلام محتاجِ اصلاح تھا اِس لئے اُنہیں کسی دوسرے صاحبِ کمال کی تلاش ہوئی۔ اس وقت ملک کے اندر حضرت سیماب اکبرآبادی کا طوطی بول رہا تھا چنانچہ زکی بھی حضرتِ سیماب کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے اور بہت جلد اُستادِ ثانی کی نوازشوں نے اُستادِ اوّل کی موت کا غم غلط کر دیا، خود کہتے ہیں ؎

حضرتِ سیماب و احسن

احسن نہ رہے تو ہوئے ہم بیتاب | مخفی ہوا وہ نیّرِ عالم تاب
لیکن جو نوازا تو کھُلا رازِ زکی | سیماب ہیں احسن اور احسن سیماب

ایک اور جگہ دیکھیے اُستاذ کی نوازشوں کا اعتراف کتنے والہانہ اور نیازمندانہ انداز میں کرتے ہیں ؎

فطرت نے مجھے شیوہ بیانی بخشی | جذبات کو اک شعلہ فشانی بخشی
تھا ذرّۂ بے قدر زکی میں لیکن | سیماب کی صیقل نے روانی بخشی

اصلاح کا یہ سلسلہ عرصۂ دراز تک چلتا رہا یہاں تک کہ حضرت سیماب نے اُنہیں اپنے فارغ الاصلاح تلامذہ کی فہرست میں جگہ دے دی لیکن اُنھوں نے اُستاذ کی حیات تک کسبِ کمال جاری رکھا اور اتنا کچھ حاصل کر لیا کہ حضرتِ سیماب کے وصال کے بعد اُنھیں اصلاحِ سخن کے لئے کسی اور کا شرمندۂ احسان نہیں ہونا پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت سیماب کی اصلاحوں نے ان پر فن کے تمام اسرار و رموز منکشف کر دئے اور ان کے کلام میں پختگی اور صفائی پیدا کر دی۔

جب عمر ڈھلنے لگی اور قویٰ مضمحل ہونے لگے تو زکی کو فکرِ عقبیٰ نے ستانا شروع کیا اور آخرکار اُن پر طہارتِ نفس اور تزکیۂ رُوح کی دُھن سوار ہو گئی، اِس سلسلہ میں بھی اُنھیں کسی مُرشدِ کامل کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ ان کی نگاہیں خوب سے خوب تر کی جستجو میں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگیں اور آخرکار شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی پر جا کر ٹھہر گئیں یہاں تک کہ مولانا کے دستِ مبارک پر بیعت ہو گئے اور اس کے بعد زیادہ تر ذکر و فکر میں مشغول رہنے لگے۔ ۱۹۵۵ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور اب زیادہ تر تسبیح و تہلیل میں وقت گذارتے ہیں۔ مشاعروں کی شرکت تقریباً ترک کر چکے ہیں اور شعر بھی بہت ہی کم کہتے ہیں لیکن مکمل توبہ نہیں کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر توبہ کرتے بھی تو ٹوٹ ہی جاتی اس لئے کہ شاعری وہ "کافر" ہے جو ایک بار مُنھ سے لگ جانے کے بعد پھر کبھی نہیں چھوٹتی۔

مذکورہ مقالہ میں حضرتِ سیماب اکبرآبادی کے مذاقِ سخن پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا آلِ منظر نگری ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"مولانا (جنابِ سیماب) خود نظم کو غزل پر ترجیح دیتے ہیں اور انہیں اپنی نظم پر فخر ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ انکی نظم دورِ جدید میں ایک زبردست کارنامہ ہے اور اِس صنف میں وہ اپنے معاصرین سے بہت بلند اور تنہا نظر آتے ہیں۔"

مولانا کی طبیعت کے اِس رُجحان کا اثر ان کے شاگردوں پر بھی پڑا اور شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کے تلامذہ نے نثر نگاری کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ زکی کی بیاض میں بھی زیادہ تر نظمیں ملتی ہیں، یوں غزلیں، رباعیاں اور قطعے بھی ہیں، لیکن نظموں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور یہ نظمیں مختلف اور متنوع موضوعات پر ہیں۔ اگر ایک طرف انھوں نے لال قلعہ اور تاج محل پر نظمیں لکھی ہیں تو دوسری طرف پان اور بیڑی کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان نظموں کے

مطالعہ سے ایک بات بہت ہی صاف اور نمایاں نظر آتی ہے، وہ یہ کہ زکی کی شاعری خلاء میں سانس نہیں لیتی حقیقت یہ کہ زکی نے زندگی کے حقائق پر ہمیشہ نظر رکھی ہے اور دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں جو کچھ دیا ہے اُسے اُنھوں نے اپنے اندر جذب کرکے بڑے سلیقے سے اپنے کلام میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس سلسلہ میں کھوکھلی نعرہ بازی اور بے ہنگم چیخ پکار سے اُنھوں نے حتی الامکان پرہیز کیا ہے، اپنے وقت کے مسائل پر ہمیشہ ایک شاعر کے مقام سے باتیں کی ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان کی نظموں میں ضبط و نظم کا فقدان نہیں ہے، ترتیب و تنظیم اور حُسنِ تعمیر کی کمی بھی نظر نہیں آتی۔ مثال کے طور پر اُن کی ایک نظم ملاحظہ ہو:

تجدیدِ محبّت

نہ سُنا مجھ کو تو پیغامِ مسرت اے دوست
کس کو ہے فرصتِ تجدیدِ محبت اے دوست

زندگی سلسلۂ سوزِ جگر ہے اے دوست!
آج آفات سے بے چین بشر ہے اے دوست!
جس کو دیکھو وہی بادیدۂ تر ہے اے دوست!
روز آتی ہے نئی ایک مصیبت اے دوست!
کس کو ہے فرصتِ تجدیدِ محبت اے دوست!

قحط اور جنگ نے انساں کو کیا اپنا شکار
نفسی نفسی ہے پڑی کون ہو کس کا غمخوار
عرصۂ دہر میں ہر آن ہے جینا دشوار
زندگی آج ہے گہوارۂ آفت اے دوست!
کس کو ہے فرصتِ تجدیدِ محبت اے دوست!

اگلے دن وہ نہ رہے اور وہ زمانہ نہ رہا
چار تنکوں کا بھی گلشن میں ٹھکانا نہ رہا
کوئی ساتھی نہ رہا، اپنا یگانہ نہ رہا
اُٹھ سکے گا نہ یہ اب بارِ امانت اے دوست!
کس کو ہے فرصتِ تجدیدِ محبت اے دوست!

بھوک سے دیکھ! وہ بیتاب ہیں سیمیں رخسار
دیکھ! وہ دیکھ! سسکتی ہوئی رُوحوں کی قطار
اس طرف دیکھ! وہ لاشوں کا لگا ہے انبار
قحط کے بھیس میں آئی ہے قیامت اے دوست!
کس کو ہے فرصتِ تجدیدِ محبت اے دوست!

ہے ابھی تیغ کی دھاروں سے گذرنا باقی
اور ناموسِ وطن پر بھی ہے مرنا باقی
وقت تھوڑا ہے بہت کام ہے کرنا باقی

دے نہ مجھ کو تو نویدِ شبِ عشرت اے دوست!
کس کو ہے فرصتِ تجدیدِ محبت اے دوست!

مطمئن ہونے دے اور دل کو سنبھل جانے دے
جو گھڑی آئی ہے سر پہ سے ٹل جانے دے
اور تقدیرِ وطن کو بھی بدل جانے دے

نہ سُنا تو ابھی پیغامِ مسرت اے دوست!
کس کو ہے فرصتِ تجدیدِ محبت اے دوست!

زکی ایسی شاعری کے قائل نہیں جو رُوحِ عصر سے یکسر خالی ہو، وہ ایسے شاعروں پر شدید گرفت کرتے ہیں جو حالات سے نیاز ہو کر محض روایت کی پابندی کرتے ہیں، ملاحظہ ہو اُن کی نظم "شاعرِ ہندوستاں میری نگاہ میں" ؎

شاعرِ ہندوستاں میری نگاہ میں

نہیں جذباتِ دل کی ترجمانی شاعری تیری
ہے فطرت کی مخالف خوش بیانی شاعری تیری
کبھی تلوار بھی اٹھتی نہ جس کے دستِ نازک سے
تعجب ہے کہ وہ کشتوں کے پشتے ہیں لگا دیتے
کبھی تو فرشِ گُل پر بھی نزاکت سے نہیں سوتے
کبھی قصاب بن کر کاٹ دیتے ہیں گلے سب کے
اِدھر شانوں پہ گیسو ہیں اُدھر ہیں سرمگیں آنکھیں
رہیں پردے میں لیکن ہر گھڑی اغیار کو جھانکیں
ہمیشہ نزع کا عالم ہے تجھ پر بیقراری ہے
جگر میں درد ہے لب پر فغاں ہے آہ وزاری ہے
زمینِ ہند کو ایراں بنایا سر بسر تو نے
گل و بلبل کے نظارے کہیں دیکھے مگر تو نے؟
قسم ہے شعرِ رنگیں کی بتا کس جا بہار آئی؟
تری آنکھوں نے کب دیکھی چمن کی جلوہ آرائی
عبث اُلجھا ہوا ہے تو خیالی زلف و کاکل میں
نہ مے ہے تیرے ساغر میں نہ ہے نشہ ترے مُل میں
اگر تو چاہتا تو قوم کی بگڑی بنا دیتا
تخیل کی روانی سے زمانے کو جلا دیتا
کبھی تو برق بن کر آسماں کو جگمگا دیتا
زمانے کو بھی اپنی ٹھوکروں ہی سے جگا دیتا
مجھے بتلا تو آخر کس مرض کی اب دوا تُو ہے
یہ تیری کیسی عادت ہے یہ تیری کیا بُری خُو ہے

غرض علم و ادب کی ہند میں تحقیر ہے تجھ سے
غلامی کی بھی پابستہ یہاں زنجیر ہے تجھ سے

زکی کو زبان و بیان پر پُوری قُدرت حاصل ہے، قدرتِ بیان کا ایک نادر نمونہ ان کی مشہور نظم عورت کی دو رُخی تصویر ہے۔ یہ نظم طویل لیکن دلکش ہے اس لئے یہاں پیش کی جاتی ہے ؎

عورت کی دو رُخی تصویر

(۱)

حُسن کی دیوی ہے تُو اور عشق کا مبدا ہے تو
سازِ ہستی کے لئے مضراب اور نغمہ ہے تُو
خوشنما اک پھُول ہے تُو اور بہارِ زندگی
تُو فضائے شام ہے اور عمرِ عزازِ زندگی
دل وفا پیما ترا آنکھیں خلوص آرا تری
ہو کے تو مجبوس پابندِ رضا ہے ہر گھڑی
مسلئہ تُو، نغمہ بھی تُو اور ربطِ اُلفت بھی تُو
غنچۂ خوشرو بھی تُو، اور پھُول کی نکہت بھی تو

کس قدر دلکش ہے صورت کس قدر رنگیں ادا — گوہرِ نایاب سے بڑھ کر تصور ہے ترا
لاکھ ہوں رنج و غم و اندوہ کے دل پر اثر — بھول جاتا ہوں تمام افکار تجھ کو دیکھ کر
اک ترے دم سے ہے دنیا رشکِ صد باغ و بہار — تو نہ ہو تو خشک ہو جائے یہ سارا لالہ زار
تازگیٔ روح ہے اور راحتِ قلب و جگر — آنکھ کی ٹھنڈک ہے تو دنیا میں اے رشکِ قمر

تو حسیں ہے دلربا ہے اور ترا صانع حسیں
کفر گر سجدہ نہ ہوتا تو جھکاتا میں جبیں

(۲)

کون کہتا ہے کہ تجھ سے زینتِ کاشانہ ہے — تیرے ہی دم سے تو دنیا آج ماتم خانہ ہے
تجھ سے افعالِ قبیحہ کا ہے دنیا میں قیام — تو نے دنیا کو سنایا معصیت ہی کا پیام
تیرے آتے ہی ہوا دنیا میں فتنہ کا ہجوم — خون کا دریا بہا جس جا گیا تیرا قدم
لوگ کہتے ہیں تجھے غارت گرِ صبر و قرار — کب کسے ہے وادیٔ الفت میں تجھ پر اعتبار
موجبِ رسوائیٔ خلقت ہوئی ہستی تری — اہلِ دنیا کے لئے آفت ہوئی ہستی تری
دعوتِ جذبات دیتی ہے سرِ بازار تو — اہلِ دنیا کے لئے ہے باعثِ آزار تو
اک پیامِ معصیت دنیا میں ہے ہستی تری — کس قدر گمراہ خلقت پا کے تجھ کو ہو گئی
حسن کے اس چاہ میں تیرے ہزاروں مر مٹے — سیکڑوں انساں تری برقِ نظر سے جل بجھے
حسن کی دیوی نہیں غولِ حزا بانی ہے تو — رند تو میکش ہی ہیں زاہد کو بہکاتی ہے تو
بن کے شیریں کوہ کن کی تو نے آخر جان لی — قیس کو مجنوں بنا کر زندگی برباد کی
دل جفا پیما ترا آنکھیں ستم آرا تری — بے وفائی، کج ادائی تیری گھٹی میں پڑی
چاہنے والوں کو تیرے جان کے لالے پڑے — تجھ کو پایا بھی نہیں اور پاؤں میں چھالے پڑے
دل لگا کر تجھ سے اپنا کون جھگڑا مول لے — اُڑنے والا بازوؤں کو پہلے اپنے تول لے

وقت بدلا ہے تیرا اپنی فطرت کو بدل
ضامنِ ناموس بن کر نور کے سانچے میں ڈھل

زکی نے غزل گوئی بھی کی ہے اور اُن کی بیشتر غزلیں "شاعر" کی پرانی فائلوں میں محفوظ ہیں، ایک زمانہ میں "شاعر" میں "مشاعرۂ شاعر" کے عنوان سے چند صفحات طرحی غزلوں کے لئے وقف ہوتے تھے، غالباً مدیرِ شاعر کی جانب سے طرح کے مصرع کا اعلان ہوتا تھا اور پورے ملک کے شعراء اس پر طبع آزمائی کرتے اور اپنی غزلیں مدیر کے پاس بھیجتے تھے لیکن صرف منتخب غزلوں کی اشاعت ہوتی تھی، زکی نے اس مشاعرہ میں بڑی پابندی سے شرکت کی ہے اور اُن کی غزلیں شاعر کے صفحات کی زینت بنی ہیں۔ چند اشعار بہ طورِ نمونہ پیش کئے جاتے ہیں :-

وہ لمحے جو رضا جوئی میں تیری کام آجائیں — اُنھیں لمحات کو میں زیست کا حاصل سمجھتا ہوں

ہماری تلخ کامیاں بڑھیں تو کچھ بھی غم نہیں — مگر یہ خوف ہے کہیں تمہیں بھی جھیلنی نہ ہو

شاعر بمبئی

ہم نے ابتک نہ لیا سر پہ کسی کا احساں — تم مگر چاہو تو شرمندۂ احساں کردو
دل ہو بیتاب مرا عشق میں تنہا یہ کیا — لطف جب ہے کہ دل اُن کا مرا دل ہو جائے

اُن کی گلی میں گرچہ ہیں امن و اماں سے ہم — لیکن خطا معاف وہ عزت نہیں رہی

بیاض میں رباعیاں بھی موجود ہیں اور اُن میں بعض توجہ کش ہیں، یہاں صرف دو رباعیاں پیش کی جاتی ہیں۔

سامانِ حرب کام نہ آتا ہے کبھی — پیدل سے بھی شہ مات کھاتا ہے کبھی
کمزور سمجھ کر مجھے مغرور نہ ہو — کنکر سے گھڑا پھوٹ جاتا ہے کبھی

گو جانِ حزیں رنج سہے گی یارب — دنیا بھی تجھے کچھ نہ کہے گی یارب
تو چاہے جزا دے کہ سزا دے لیکن — رحمت تری بے چین رہے گی یارب

قطعہ نگاری کی طرف زکی نے کوئی خاص توجہ نہیں دی ہے، ان کی بیاض میں چند قطعے ملتے ہیں جن میں صرف ایک مجھے پسند ہے، ملاحظہ ہو:۔

اک نافہ جو آہوئے ختن کو نہیں معلوم — اک پھول چمن کا جو چمن کو نہیں معلوم
جھانسی کی یہ رانی ہے کنور سنگھ وہ بہادر — ٹیپو ہے مگر کون وطن کو نہیں معلوم

آخر میں اس امر کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اس مضمون کا مقصد زکی اور اُن کی شاعری کا صرف تعارف ہے، اس لئے میں نے اُن کے کلام پر تبصرہ و تنقید سے حتی الامکان احتراز کیا ہے۔

مفتوں کوٹوی

یہ راہیں

یہ راہیں جو جاتی ہیں کالج کی جانب
بڑی دل کش ہیں
بڑی پُر فضا ہیں
میں برسوں رہا ہوں اِدھر جادہ پیما
لئے ذوقِ تعلیم و شوقِ تجسس
کبھی غرقِ حیرت کبھی وقفِ عبرت
کبھی کوئی تاریخ کا باب — خونیں
کبھی کوئی جغرافیہ کا نظارہ
کبھی شعرِ درسی سے دل شاد و فرحاں
کتابی مضامین سے نظریں فروزاں
تخیل میں کیف و نشاط و مسرت
محبت، محبت
مروّت، مروّت

ترقی و شادابی و دل فروزی
ملی ہیں وطن کو جو آزاد ہو کر
ہر اک گوشہ اِن سے ہے پُر نور رنگیں
منوّر، درخشاں
طرب ناک، تاباں

یہ کالج بھی اوجِ ترقی پہ پہنچا
سنور کر، نکھر کر، ضیا پاش ہو کر
یہ راہیں بھی کچھ اور لہرا گئی ہیں
بہت اِن میں رنگینیاں آ گئی ہیں
نئے اِن کے راہی
نئے اِن کے رہبر
اور اب میں کہ برسوں کا ہوں آشنا سا

بظاہر یہاں اجنبی لگ رہا ہوں
نہ واقف ہیں رہرو، نہ آگاہ رہبر
کہ ماحول سارا بدل سا گیا ہے
مگر یہ جو ذرّے ہیں اِن راستوں کے
فراموش کر دیں مجھے — غیر ممکن
یہاں رہگزاروں میں مدفون ہوں گے
مرے نقشِ پا،
اور وہ قہقہے بھی
جو میں نے لگائے تھے مسرور ہو کر
مرے ساتھیوں، دوستوں، ہمدموں نے
جو گائے تھے نغمے
یہاں کی فضاؤں کے مرہون ہوں گے
کہ میرے وطن کی فضاؤں میں پنہاں
رفاقت ہے، الفت ہے، پاسِ وفا ہے
مرے ملک کی خاک میں نور افشاں
مروّت، محبت ہے، شرم و حیا ہے
یہ راہیں، یہ جادے، انہیں راستوں میں
نہاں میرے ماضی کی شادابیاں ہیں
مری نوجوانی تابانیاں ہیں
وہ رنگیں امنگیں،
وہ دلکش ترنگیں،
تمنّاؤں کی بھی درخشانیاں ہیں

ہیں میرے لئے رشکِ جنّت یہ راہیں
سلامت رہیں تا قیامت یہ راہیں

بہزاد اکبرآبادی

سامنے آؤ

ں بستی کے لوگ کہاں ہیں؟
چھ رہے ہیں سناٹوں سے آوازوں کے سہمے سائے
ات اندھیری دُور ہے منزل.
بی راہیں آڑی ترچھی!
بے ترتیب پریشاں جیسے وقت کے پھندے ڈھیلے ڈھالے
یواروں پر کائی لگی ہے
لیوں میں پُرہول اندھیرے
ل حویلی، ٹوٹی پھوٹی
روں میں مکڑی کے جالے
کی بلی
روتا اُلو
نکے ٹھیکرے اُگرتی کڑیاں
سُوراخوں سے جھانکتے جھینگر!
پچ کے ٹکڑے
و بارے ویران پڑے ہیں
روازوں میں ٹوٹے تالے دیمک لکڑی چاٹ رہی ہے
جُڑے اُجڑے مندر مسجد
ھول میں لپٹی پاک کتابیں
سُوکھے نیم کی سُوکھی شاخیں
وت کا پنجہ
سُونا گھٹ سونی روعیں حدّ نظر تک کالے جال بچھے ہیں
ریکی اور خاموشی ہے
ب کیا ہوگا ؟ — ؟ — ؟
— "امیدوں کے دیپ جلاؤ
نگوں سے ماحول سجاؤ
مغوں سے جذبات جگاؤ —"
یں نے کہا ہے، کون چھپا ہے
سامنے آؤ —!

صہبا وحید

موڑ

ہے یہی موڑ جہاں ہمدمِ دیرینؔ ہم نے
ایک ننھا سا سرِ شام، جلایا تھا چراغ!
چھین کر پنجۂ ظلمات سے اک ساعتِ نور
اجنبی شب کی اُداسی کو ضیا بخشی تھی!

ہے وہی موڑ وہی شام کا پل
ساعتِ نور!،
ہوں مگر آج کھڑا میں یہاں تنہا تنہا!
(اپنے دامن میں چھپائے ہوئے اک پارۂ نور)
شام سے رات گئے تک یہی کرتا ہوں سوال :-
"تم نے دیکھا ہے اُسے جس کی مہکتی ہوئی سانس
اذنِ قُم ہے، تو کبھی واشدِ گُل کا فرمان
محشرِ جذب و دروں، سلسلۂ بُود و نمُود!"

ایک اک کر کے چلے جاتے ہیں شب کے رہرو
کوئی مجنوں کوئی آوارہ سمجھتا ہے مجھے
کوئی کہتا ہے کہ اندھے تو نہیں ہو ہٹ جاؤ!
کوئی بس دیکھ کے چپ چاپ گزر جاتا ہے!
اور میں ہوں کہ سمیٹے ہوئے اک دردِ سوال
اب بھی اِس موڑ پہ حیران سا تنہا تنہا
جیسے صحرا میں بھٹکتی ہوئی آوازِ جرس
جیسے تنہائی کے عنوان پہ لکھی ہوئی نظم!

حسن شبیر

جاؤ

اب کرن در کرن آنکھوں میں اندھیرا کر لو
شب کے پہلو میں ہمیشہ کے لئے سو جاؤ
ٹوٹتے تاروں میں رہ رہ کے ضیا برساؤ
لیکن اشکوں میں مری آگ نہ برساؤ تم
میری آنکھوں میں کھلے ہیں مری آنکھوں کے پھول
میرے اشکوں نے جگائے ہیں مرے دل کے کنول
میں نے خود اپنی ہی آنکھوں میں اُگائے ہیں کنول
تم اُنہیں دیکھ کے شاید گلِ تر کے مانند
آپ ہی آپ چمکتی ہوئی راہوں میں مری
دل کے خورشید کو لاؤ گی تو شرماؤ گی

وقار رومانی

دشتِ بلا

نہ کوئی منزل نہ کوئی جادہ
نہ کوئی رہبر نہ کوئی ساتھی
بس اک سرابِ حیات ہر سُو
بس اک تگ و دو
میں جستجوئے سکون میں گُم
نہ جانے کس دشتِ بیکراں میں بھٹک رہا ہوں
کہ چاروں جانب مُہیب سائے
ڈراؤنے خوفناک چہرے
یہ سُرخ سُرخ شُعلہ بار آنکھیں
یہ دستِ خونی
یہ رُوح فرسا سیاہ پیکر
یوں میری جانب لپک رہے ہیں
کہ جیسے افسونِ سامری پر
طلسمی پُتلے آتیش رقص کر رہے ہیں!!
میں کس کو آواز دوں پیا پر
کیسے پُکاروں
نہ کوئی رہبر نہ کوئی ساتھی
کیسے بُلاؤں

مظہر علوی

زوال

پھر وہی بات کہ پھر کوئی نئی بات نہیں

کوئی آہٹ ہے نہ آواز نہ کروٹ کوئی
صبح آتی ہے کہ غنچہ کوئی بیدار نہ ہو
رات جاتی ہے کہ پیدا نہ ہو آہٹ کوئی

دل کو شائستۂ دستورِ زمانہ کرکے
آخرش سی ہی لیا ہم نے گریباں اپنا
طئے کیں ناز سے اٹھلاتی چلی جاتی ہے
گردشِ وقت بچائے ہوئے داماں اپنا

درد خاموش کہ بیمار کو نیند آجائے
اشک ناپید کہ پیدا نہ ہُوا سوزِ مآل
شوق آسائشِ اوقات کے ہاتھوں نادار
فکر آسودہ کہ باقی نہیں اب کوئی سوال

اب نہ کوئی رُخِ محبوب پہ آنچل ڈھلکائے
کرلیا خود ہی نگاہوں کو نگہباں میں نے
اب کبھی شاخِ تمنّا میں کوئی گُل نہ کھلے
بڑی محنت سے اجاڑا ہے گلستاں میں نے

ہر مسرّت کے عوض لیجے دلِ دیوانہ
ہم تو سمجھے تھے متاعِ دوجہاں پائی ہے
مرحلے لاکھ تھے آغازِ سحر سے پہلے
بجھ گئی شمع تو سمجھے کہ سحر آئی ہے

نہ اُٹھے شورِ جنوں اب نہ سلاسل چمکیں
خود گرفتار ہوں میں جس میں وہ زنداں ہولیں
در کھلے میرا تو مرحوم اِرادوں کے لئے
وقت کے موڑ پہ اک شہرِ خموشاں ہولیں

ساحل ہوگیری

زیرِ لب

(برن پور ہاسپٹل کی ..... کے نام)

کتنی مایوسیوں کی سیہ رات سے
چاند اُبھرا تھا اپنی ملاقات کا
کپکپاتے ہوئے ہونٹ خاموش تھے
سَیل اُمڈا تھا آنکھوں سے جذبات کا

میری باہوں میں ڈھلکا ہوا تیرا جسم
وقت کی مہربانی کا اعجاز تھا
تیری قُربت کا بخشا ہوا ہر سکوں
میرے بے چین لمحوں کا دمساز تھا

زندگی بُن رہی تھی فسانے کئی
آرزو ہم نشینی سے مدہوش تھی
تیری معصومیت چھیڑ کر سازِ دل
میرے ذوقِ نظر سے ہم آغوش تھی

گرمیٔ حُسن سے تپ چُکی تھی حیات
شُعلے اُٹھنے کو تھے آگ جلنے کو تھی
کتنے بے نام جذبوں کی پاکیزگی
اپنی بربادی پر خُون اُگلنے کو تھی

تیری زلفوں میں سمٹی ہوئی رات سے
چاندنی چھن رہی تھی عنایات کی
تیرے عارض کے پَرتو میں فکرِ رسا
رفعتیں چھو رہی تھی مناجات کی

دفعتاً زندگی کے حقائق ۔ لئے!
عشق کے حوصلوں کا سوال آگیا
اپنی بربادیوں کا مجھے غم نہ تھا
تیری عظمت کا دِل کو خیال آگیا

میرے ذوقِ وفا کی نزاکت تو دیکھ
اپنے سینے سے تجھ کو جُدا کردیا
کون مجرم ہے، حالات ہیں، یا کہ تُو
کس نے خوشیوں کو غم آشنا کردیا

ضیا حسنی

خلوص اِک دل کا

برنی ر… ہوٹل سامنے) ریسٹوران کا دلکش منظر
م ہے سے سوسائٹی کے کریم (Cream) کو کھینچ لیتا تھا
دن ڈوبتے ہی بجلی کی تیز رنگین سر سبز و شاداب باغ کی
وشی میں واقع اس ریسٹوران کی رونق کو بڑھا دیتی تھی۔
ویز سے میری پہلی ملاقات اسی ریسٹوران میں ہوئی تھی۔
سامنے بیٹھا ہوا کافی پی رہا تھا۔ میں نے اسے نگاہ بھر کے دیکھا
س کا چہرہ نکالی جاذب نظر اور دل پذیر معلوم ہوا۔ اس نے
ہ دیکھ لیا۔ تو میں انجان ہو کر السٹریٹڈ ویکلی دیکھنے لگا،
ن میرا دل پڑھنے کی طرف رجوع نہیں ہو سکا۔ میں نے ویکلی
میز پر رکھ دیا اب جو میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے
نٹوں پر پھیلی ہوئی ایک دلکش مسکراہٹ میرا سواگت کر رہی
تھی، آخر میں اس سے باتیں کرنے کی خواہش کو دبا نہ سکا اور
پہل کر دی۔

"آج میں آپ کو پہلی بار یہاں دیکھ رہا ہوں"

"میں نووارد ہوں، نوکری مجھے یہاں لے آئی ہے"

"آپ کس محکمے سے متعلق ہیں؟"

"میں ایکسائز اینڈ اسٹیٹکس انسپکٹر ہوں"

"آپ کا نام؟"

"مجھے پرویز کہتے ہیں"

"اور مجھے شوکت"

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد ہم گرینڈ ہوٹل کی طرف چل
پڑے اس لئے کہ پرویز وہیں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ ہوٹل کے پھاٹک
کے قریب جیسے ہی پہنچا تو اس نے مجھ سے کہا۔
"ایک ہفتہ کی مسلسل کوشش کے بعد بھی مجھے کوئی مکان
نہ مل سکا۔ آپ مقامی آدمی ہیں شاید مجھے کوئی ٹھکانہ دلانے میں
کامیاب ہو جائیں شوکت صاحب! میری لامکانی مجھے یکسو ہونے
نہیں دیتی"

"آپ فکر نہ کریں، میں آپ کے لئے مکان ڈھونڈ دوں گا"

دوسرے دن وہ نسیم جمالی کے یہاں پھر مل گیا۔ وہ نسیم
سے آمدنی اور مصارف کی تفصیلات معلوم کرنا چاہتا تھا اور
وہ مصروفیت کا عذر پیش کر کے ابھی تفصیلات بتانے پر
آمادہ نہ تھا۔ میں نے نسیم سے کہا "تم وکیل ہو اور شہر کے ممتاز
فرد بھی، یہ سرکاری ملازم ہیں۔ انہیں کچھ اطلاعیں اکٹھا کرنی
ہیں، فرض ادا کرنے میں ان کی مدد کرنا تمہاری ذمہ داری ہے
اور ملک کی خدمت بھی، پھر تم اپنے کو دیس سیوک بھی کہتے
ہو۔ میں نے یہ سب کچھ اس انداز سے کہہ دیا کہ نسیم کافی بور
ہوتے ہوئے بھی تفصیلات بتانے پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن اس
نے پرویز کو دوسرے دن بلوایا۔ جب پرویز چلا گیا تو نسیم نے
دھیرے سے مجھ سے کہا۔

"تم نہیں سمجھے شوکت! اگر آمدنی زیادہ لکھاتا ہوں تو
انکم ٹیکس والے گھیریں گے اور کم لکھاتا ہوں تو ساکھ گرتی
ہے۔ درمیانی درجے کا وکیل جو ٹھہرا"

"انسپکٹر کو تمہیں ڈیٹا (Data) دینا ہی پڑے گا۔
اگر انکم ٹیکس واجب ہو تو ضرور ادا کرو، جوابات صحیح صحیح لکھاؤ
سرکاری نوکر کا وقت ضائع نہ کرو"

میں نے نسیم کے چہرے پر جھنجھلاہٹ کے آثار دیکھے تو موضوع
بدل دیا۔

نسیم سے ڈیٹا (Data) مل گیا تو پرویز مجھ سے ملنے

میرے مکان آیا۔ وہ کافی حد تک مجھ سے متاثر تھا اس لئے کہ میری ڈیوٹی انجام دینے میں اس کی مدد کی تھی پھر اچانک مجھے پتا چلا کہ پڑوس میں ایک مکان خالی ہے۔ میں پرویز کو لیکر مالک مکان سے ملنے پہنچ گیا۔ ایبنوئیل کہیں گیا ہوا تھا اس کی لڑکی میری ہم دونوں کو ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں آگئی۔ میری جانی پہچانی لڑکی تھی لیکن آج اس کا چہرہ انتہائی دلکش معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے خوبصورت ترشے ہوئے بال پنکھے کی ہوا سے اڑ کر اس کی کشادہ پیشانی کو چوم رہے تھے۔ وہ کبھی سر کی ایک ہلکی سی جنبش سے انہیں واپس کر دیتی اور جب وہ زیادہ سرکشی کرتے تو اپنی نرم و نازک انگلیوں سے انہیں ہٹا دیتی تھی۔ وہ ایک ہی صوفے پر ہم دونوں کے درمیان ملی ہوئی بیٹھی تھی۔ میں نے میری سے پرویز کا تعارف کرایا اور آنے کی غرض بتائی۔ میری نے اپنے ڈیڈی سے سفارش کرنے کا وعدہ بھی کر لیا اور یہ بات بھی بتائی "ڈیڈی ایک تاریک ذہن رکھنے والے کٹر مذہبی آدمی ہیں بہرحال میں آپ کے لئے زور دے کر کہوں گی"

"آپ مجھے جگہ دے دیں، میں پرسکون رہنے کا عادی ہوں"

"آپ مطمئن رہیں، میں ڈیڈی کو آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گی"

دو دن بعد وہ پھر مجھے لبرٹی میں ملا۔ اب اُسے مکان مل گیا تھا اور وہ مطمئن اور خوش نظر آ رہا تھا۔ اس دن وہ دیر تک باتیں کرتا رہا اور مجھے اس کی باتوں سے ایسا لگا جیسے اس کی شعریت سے بھرپور شخصیت اچانک اُبھر آئی ہو۔ اس نے اس نشست میں دو مرصّع غزلیں سنائیں۔ میں کافی محظوظ ہوا اور مجھے ایسا لگا جیسے تغزل سے بھرپور اس کا کلام مجھے کیف و سرور کی دنیا میں لئے جا رہا ہو۔ اب میں فرصت کے لمحات میں اس کے مکان جاتا۔ میں اپنی کہانیاں سناتا اور وہ غزلیں۔ اس کا دلکش ترنم میری کو کھینچ لیتا۔ وہ پرویز سے بے حد قریب ہو چکی تھی۔ جیسے ہی وہ غزل چھیڑتا وہ اس سے بالکل مل کے بیٹھ جاتی اور اس محویت سے اس کا کلام سنتی کہ اپنے آپ کی خبر نہ رہتی۔ میری کی مدہوشی اس وقت قابل دید ہوتی۔ کبھی وہ سرور کے عالم میں اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیتی، شرگشتی رہتی اور اپنی لانبی مخروطی انگلیوں سے بالوں کے چھلّے بناتی رہتی۔ کبھی پرویز کے فن کا درد اُس کی آنکھوں کو آنسوؤں سے لبریز کر دیتا، اُسے اِس عالم میں دیکھ کر وہ چپ ہو جاتا، اُس کے نرم و نازک ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتا اور اس کے لپ اسٹک لگے ہونٹوں کو چوم لیتا۔ پھر اپنے معطر ریشمی رومال میں اس کے سارے آنسو جذب کر لیتا۔ وہ پرویز کے خلوص سے متاثر ہو کر اس کے سینے سے لگ جاتی اور جب وہ اپنے مضبوط بازوؤں میں اُسے جکڑ لیتا تو میری تھوڑی دیر کے لئے دل میں ہلچل مچا دینے والے طوفان میں ٹھہراؤ سا محسوس کرنے لگتی۔ پھر وہ گلاب کے ایک تازہ پھول کی طرح کھِل اُٹھتی۔

مسرتوں سے یہ بھرپور دن جیسے پر لگا کر اُڑ گئے۔ ایک دن سویرے پرویز میرے یہاں آیا اور دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ میں نے اُسے ڈِس موڈ دیکھا تو وجہ پوچھی۔

"آہ! وہ شاخ کاٹ دی گئی جس پر میرا آشیانہ تھا شوکت! تم میری کی وارفتگی کا حال جانتے ہو، کل وہ صبح ہی سو کر اٹھی میرے پاس آگئی۔ اسٹو میں چائے تیار کی، ٹوسٹ سینکے، انڈے فرائی کئے اور ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ پھر اس نے غزل کی فرمائش کی۔ میں اُسے غزل کیوں نہ سناتا اس لئے کہ وہی تو مجھ سے غزل کہلواتی ہے۔ میں شعر پڑھتا، وہ اِس حد تک مسرور ہوئی کہ دیر تک کیف و سرور میں ڈوبی ہوئی ناچتی رہی، اس کا بل کھاتا ہوا جسم ناگاہوں کو کافی بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ آخر تھک کر اس نے میرے بازوؤں میں پناہ لیا۔ میں اُسے سینے سے لگائے دیر تک اس کے لب و رخسار چومتا رہا۔ اسکے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی اور وہ بے سُدھ لیٹی ہوئی لگاتار مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ خوبصورت پیچ کرتے ہوئے بلاؤز اور اسکرٹ کے بیچ چھپا ہوا اس کا گداز اور دلکش جسم کہیں کہیں سے عریاں ہو کر بار بار دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ اچانک قدموں کی چاپ ہوئی۔ نگاہ اٹھائی تو ایبنوئیل کو برہمی کے عالم میں کھڑا پایا۔ میری فوراً الگ ہو گئی اور میں سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ ایبنوئیل نے میری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی بدمعاش کو تو نے ابھی نے ٹھہرایا تھا کہ یہ میری پیڑیاں اچھالے"

"انہیں بدمعاش دیکھئے!
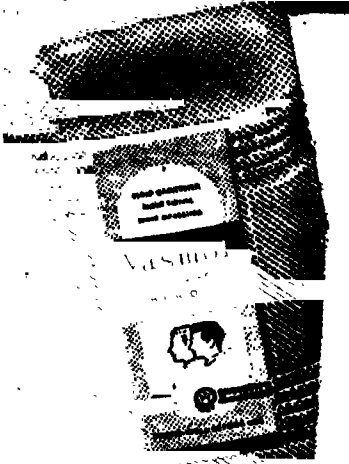
"تو کیا بھگوان کہوں؟"

"مجھے تو ایسے ہی لگتے ہیں یہ"

"کل میں اسے مکان سے نکال دوں گا۔ یہ یہاں سے چلا جائیگا ورنہ تو دیکھتی رہ جائیگی" شام کو ایمنوئیل نے نوکر کو بھیج کر مجھے بلوایا۔ وہ اجنبی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے غصہ بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے میری کو اپنانے کی ناکام کوشش کی تھی لیکن اب وہ تم سے نفرت کرنے لگی ہے، اور وہ نفرت کیوں نہ کرتی اس کا تمہارا کیا ساتھ؟ اب تم مکان خالی کر دو اور کوئی دوسرا ٹھکانا ڈھونڈ لو"

یہ کہتے ہوئے ایمنوئیل نے میری کو آواز دی اور وہ آئی تو اس سے کہا۔

"میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ مکان جلد خالی کر دیں"

"اس لئے کہ آپ جوزف کو زیادہ کرائے پر مکان دے دیں۔ ڈیڈی! آپ کو کچھ زائد روپے تو مل جائیں گے لیکن پردیسی کو آپ جس طرح نکال رہے ہیں وہ اچھا نہیں"

"جوزف میرا دینی بھائی ہے، وہ کرایہ نہ بھی دے تو مجھے اسے مکان دینے میں تامل نہ ہو گا"

"مذہب کی آڑ لیکر یوں اپنی غرض نہ پوری کیجئے"

"فضول باتیں نہ کر، ابھی تو تو کہہ رہی تھی کہ مجھے اس سے نفرت ہو گئی ہے، مجھے یہ خبر نہ تھی کہ تو اس جادوگر کے سامنے آتے ہی پھر بدل جائے گی"

"آپ انہیں نکال دیجئے، میں اسکو برداشت کر لوں گی لیکن ڈیڈی! میں آپ کو اخلاقی طور پر گرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی"

"مسٹر ایمنوئیل میں کل صبح آپ کا مکان چھوڑ دونگا خواہ مجھے پھر ہوٹل میں رہنا پڑے" ——— میں نے میری کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ صبح جب میرا سامان ہوٹل منتقل ہو رہا تھا سامنے بالکونی میں میری کھڑی ہوئی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اور میں اس کے خلوص دل کی حقیقت کو پوری طرح سمجھ رہا تھا۔

غیر مطبوعہ

[illegible]

...؟ " اس لڑکی نے مجھ سے پھر ایک سوال کیا۔

میں نے اپنا نام بتایا۔

...بھی اس کی تشفی نہیں ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب بھی
...سوالات اس لڑکی کے پاس موجود ہیں جن کا وہ مجھ سے جواب
...چاہتی ہے۔ اس کیفیت کا اندازہ لگاتے ہی میں نے اُسے
...اپنے ابّی، امّی، پاپا اور اپنے گاؤں کا نام بتایا۔
...ساتھ ہی کچھ دوسری باتوں کی بھی وضاحت کر دی۔
...کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے ۔ "آؤ میرے بھیا!
...میں ہوں تمہاری سنجو باجی۔" اس کے بعد سنجو باجی مجھے اپنے
...لے گئیں۔ مجھ سے ابّی، امّی اور پاپا کی خیریت
...دریافت کی۔ میں نے انہیں بتایا ــــ "پاپا سروس سے ریٹائر
...ہو چکے ہیں۔ امّی کی صحت اب خراب رہنے لگی ہے۔ بڑے ابّی کے
...بچے یہیں جو کانونٹ میں تعلیم پا رہے ہیں۔ منجھلی ابّی کی بھی
...پاکستان میں ہیں اور ...."
...ایک ہی سانس میں تقریباً سب کچھ کہہ ڈالا۔
...باجی کی آنکھیں آنسوؤں سے جل تھل ہو رہی تھیں ــــ

پھر میں اکثر سنجو باجی کے ہاں جانے لگا۔ وہ بڑی
شخصیت کی مالک تھیں۔ میں اُن کی شخصیت سے بے حد
متاثر ہوا۔

پاپا ریٹائر ہو چکے تھے اس لئے ان کی پنشن کی رقم سے ہی
...اور میرے تعلیمی اخراجات کی کفالت ہوتی تھی۔ ایک
...پاپا کو پنشن وقت سے نہ مل سکی۔ وہ بہت پریشان
...میرا نام فیس داخل نہ کر سکنے کے سبب کالج سے کٹ
تھا۔ ان دنوں میں بہت زیادہ ملول اور بجھا بجھا سا تھا
...پریشانی کے عالم میں ایک دن سنجو باجی کے ہاں گیا
...نے مجھ سے میری پریشانی کی وجہ دریافت کی لیکن میں
...نہیں کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا۔

دوسرے دن جب میں کالج گیا تو معلوم ہوا کہ میرا نام پھر سے
...میں داخل کر دیا گیا ہے۔ کوئی صاحب میری فیس داخل کر گئے
...مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ سنجو باجی کے علاوہ کوئی
[illegible]

میں اُن کے احسان کے بوجھ تلے دب گیا۔

وقت اسی طرح سرکتا رہا۔

ایک دن سنجو باجی کے ہاں مجھے کافی دیر ہو گئی۔ انہوں نے مجھے
اپنے ہاں رُک جانے کے لئے کہا۔ لیکن میں اس کے لئے تیار نہ ہوا
مجھے ہوسٹل پہنچنے کی جلدی تھی لیکن جیسے ہی میں وہاں سے
آنے کے لئے اٹھا زوروں کی بارش ہونے لگی۔ میں اٹھ کر بالکونی
کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ سنجو باجی بھی میرے ساتھ بالکونی کے پاس
آ گئیں۔ ہم لوگ بہت دیر تک مختلف موضوعات اور ان کے اثرات کے
متعلق گفتگو کرتے رہے۔

یکایک میں نے اپنے ہاتھ پر سنجو باجی کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔
بارش اور سردی کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے اُن کے ہاتھ میں حرارت
محسوس ہوئی۔

میں بستر فضا کے دھندلکے میں گھورتا رہا۔ ہم بیٹھے رہے۔

سنجو باجی نے پھر اپنی بات دہرائی "تم آج مت جاؤ۔ نہیں
جاؤ گے نا؟"

میں نے نظر اٹھا کر سنجو باجی کی طرف دیکھا۔ اُن کا چہرہ تمتمایا ہوا
تھا۔ الفاظ بہت رک رک کر اُن کی زبان سے ادا ہو رہے
تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے شہد اُن کے ہونٹوں سے
لپٹ گیا ہو۔ اُن کی آنکھوں کی ایک عجیب کیفیت تھی۔
اس کیفیت کا احساس مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔
سنجو باجی پہلے سے قطعی مختلف نظر آ رہی تھیں۔
لمحے بیت گئے۔
بارش اب تھم چکی تھی۔

میں نے سنجو باجی کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ علیحدہ کیا اور جلدی سے آداب
کر کے سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ نیچے اترتے ہوئے میں نے سنا
سنجو باجی کہہ رہی تھیں ـــ "جاہل ـ گنوار ـ کند ذہن ـ کچھ سمجھتا
ہی نہیں ـ بیوقوف ......!"

سنجو باجی کی یہ آواز بھی پہلے سے قطعی مختلف تھی۔
مجھے سنجو باجی سے ایسی امید نہ تھی۔ وہ تو مجھے بہت عزیز
رکھتی تھیں۔ میری بلند پیشانی اور بڑی بڑی آنکھوں کو دیکھ
کر کہتی تھیں کہ یہ بڑے لوگوں کی نشانیاں ہیں۔ وہ تو
مجھ سے کہتی تھیں کہ تم بڑے ہی ذہین ہو [illegible]
بقیہ

شعیب ردولوی

آنسوؤں کا آبشار

"اور یہ ہیں مس کویتا — آپ کی پی۔ اے"
اُس نے تعارف کراتے ہوئے کہا
"نمستے —————— !!"
دُور کہیں گھنٹیاں سی بج اُٹھیں۔

وہ شکل سے بیس سال کی ہوگی۔ اُس کے تیکھے نقوش بہت جاذبِ نظر تھے اُس نے مجھ پر ایک نگاہ ڈالی کہ فوراً ہی اس کی پلکیں شرم کے بوجھ سے جھک گئیں۔ اس کی آنکھوں میں ٹوٹی راتوں کا نشہ تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھیرنے کی کوشش کی لیکن اوراقِ گل صرف لرز کر رہ گئے۔ اس کے چہرہ پر غم کی باریک سی لہریں اٹھتی ہوئی نظر آئیں۔

"لیکن یہ اتنی اُداس کیوں ہے ؟"
یہ سوال میرے ذہن میں بازگشت کرنے لگا۔

وہ جب میرے پاس Dictation لینے آتی تو میں نے اسے بہت غور سے دیکھتا۔ اس کی مخروطی انگلیاں جب پنسل کا سہارا لے کر کاغذ پہ رقص کرنے لگتیں تو میری نگاہیں اس کے وجود کو ٹٹولنے لگتیں۔ اس کے جسم سے جوانی کے شعلے لپکتے رہتے اور عارض سے گلابی کرنیں پھوٹتی رہتیں۔ اُس کے چہرہ پر حوروں کا سا تقدس تھا اور پریوں کی سی معصومیت — لیکن پھر بھی وہ مضمحل تھی۔ اُداس تھی۔

کبھی کبھی تو لگتا جان پڑتا کہ سارے زمانہ کا کرب اسی کو مل گیا ہے۔ میں جب اس کے نازک خدوخال کو غم کی راکھ تلے چھپے دیکھتا تو جی میں آتا کہ اپنی خوشیوں کی بارش سے اُس آگ کو ہمیشہ کے لئے بجھا دوں۔ اُس کے آغوش میں زمانہ بھر کی رنگینیاں سمودوں۔ میں دل سے چاہتا تھا کہ ایکبار اس کے چمن میں بہار آ جائے۔ ایکبار مُنھ بند کلیاں کھِل اُٹھیں، ہر طرف لہلہاتے ہوئے پھول ہوں، جھومتی ہوں ڈالیاں ہوں

مگر ایسا نہ ہو سکا !
وہ مسکرا نہ سکی — !!

وقت خاموش تماشائی بن کر سب کچھ دیکھتا رہا۔

ایکبار خیال آیا کہ اُس کی اُداسی کا راز اُسی سے معلوم کروں کہ آخر وہ کون سا غم ہے جسے وہ خونِ دل سے سیراب کر کے اپنے سینے سے لگائے رکھنا چاہتی ہے۔ یہ غم کے بادل کب تک منڈلاتے رہیں گے ؟ کیا کبھی ہوئی حسرتوں کو ایک بھی دیکھنے کا موقع نہ ملے گا ؟ اس کا خوبصورت وجود کب تک خزاں رسیدہ رہے گا ؟ لیکن اتنا کچھ سوچتے ہوئے بھی میں اس سے کچھ نہ معلوم کر سکا، اس کے ساتھ ساتھ میں اداس رہنے لگا۔

وہ دیوالی کے دوسرے روز جب آفس آئی تو دکھ درد سے بے چین معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بالکل خشک تھے آنکھوں سے بجائے پھول جیسی دلآویزی کے دُھواں سا اُٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ آج بے انتہا اداس تھی اور میں بے انتہا پریشان !

ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے — !!

میں نے گھنٹی بجائی اور وہ ہاتھ میں کاپی اور پنسل لے کر آ گئی میں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"کویتا — !"
میں نے ٹائل پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

"سَر ــــ !"

اور اُس کے لب لرز گئے

"میں تم سے ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں"

"وہاٹ سَر ؟"

"تم اتنی اُداس کیوں رہتی ہو ؟"

"جی ــــ !!!"

اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے اُسے برخواست کرنے کا آرڈر سنا دیا ہو۔

دوسرے ہی لمحہ آنکھوں سے آنسوؤں کا آبشار اُبل پڑا اور میں کچھ گھبرا سا گیا میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اور وہ آنسو بہاتی جا رہی تھی۔ کافی دیر بعد جب طوفان تھم گیا تو میں اُسے سمجھانے لگا۔

"کویتا ! مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تم کو دکھ ہوا۔ پھر بھی ایک بات بتا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ دنیا میں غم اور خوشی جنم جنم کے ساتھی ہیں، ایک کے بغیر دوسرے کا وجود بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔ ہم سب کی زندگی سے ان دونوں کا گہرا تعلق ہے کبھی ایک اثر انداز ہوتا ہے تو کبھی دوسرا۔ صرف غم کو متاعِ حیات سمجھ لینا بہت بڑی بھول ہے۔ اندازِ فکر کو بدلنے سے حادثات کی نوعیت بھی کچھ حد تک بدل جاتی ہے۔ اگر باوجود کوشش کے حالات اور واقعات نہ بدلے جا سکیں تو اپنے سوچنے اور سمجھنے کے انداز کو بدل دینا چاہیئے۔ خوشی اور مسرت کے حاصل کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے" وہ نظریں جھکائے بہت غور سے سن رہی تھی۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ تم غیر سنجیدہ ہو جاؤ۔ تم لوگوں کیلئے سنجیدگی اور وقار بہت ضروری ہے۔ تمکنت اور رکھ رکھاؤ سے شخصیت اور بھی نکھر جاتی ہے لیکن سنجیدگی کو اُداسی سمجھ بیٹھنا خیالِ خام ہے۔ زندگی میں مسکراہٹ اور اس کی چاشنی بہت ضروری ہے۔ اگر تم اسی طرح خاموش رہو گی تو لوگ دوسرے انداز سے سوچیں گے۔ وہ تمہاری اُداسی کا راز نہ سمجھ سکیں گے۔ اُن کی سطحی نگاہ تمہارے غم کو نہ پرکھ سکے گی۔

وہ بے دھڑک کہہ اٹھیں گے۔

"مغرور ہے ــــ !"

"غلط فہمی میں مبتلا ہے ــــ !"

"اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھتی ہے ــــ !!!"

"ممکن ہے تمہیں اِن خطابات سے نوازا بھی جا چکا ہو، جب کہ مجھے یقین ہے کہ تم بے انتہا ہمدرد ہو اور بہت مخلص۔ اسی لئے تم نے جس کو چاہا ہو گا اپنی تمام تر خلوص سے انتہائی گہرے جذبے سے ــــ" میں نے اس پر بھرپور نفسیاتی وار کر دیا اور وہ کرسی میں شاخِ گل کی طرح لچک گئی ایک بار پھر آنسو بہہ نکلے جن کے دوش پر دیرینہ یادیں چل پڑیں۔ میں نے دیکھا کہ اس کے سینہ میں ایک طوفان بپا ہے۔

"اب تم جا سکتی ہو، میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر غور کرنا اگر میری کسی بات سے تمہیں تکلیف پہونچی ہو تو میں اس کے لئے شرمندہ ہوں"۔ میں نے اُسے تنہائی میں سوچنے کا موقعہ دیا۔

"مسکراہٹ تمہاری زندگی کے لئے بہت ضروری ہے اگر ہو سکے تو مسکرانے اور ہنسنے کی کوشش کرنا، کم از کم گھر والوں کے لئے، اپنی آیندہ زندگی کے لئے" میں نے جاتے جاتے ایک اور حربہ استعمال کیا۔

وہ چلی گئی اور میں کرسی پر لیٹ گیا۔ میرے ذہن پر سے ایک بوجھ سا سرکتا ہوا محسوس ہوا۔

اگلے روز وہ میرے کمرہ میں آئی۔

"گڈ مارننگ سَر !"

آج وہ مسکرا رہی تھی !

اس کی ایک مسکراہٹ سے میرا انگ انگ مسکرا اٹھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرہ پر بلا کی تابانی ہے۔ بالکل اپسراؤں کی سی۔ آنکھوں میں بے پناہ کشش اور مدہوش کر دینے والا نشہ تھا۔ آج پہلی بار اس کے ہونٹ بھیگے بھیگے سے تھے جن پر ملکوتی مسکراہٹ کی لہریں اٹھ رہی تھیں اس کے ساتھ ہی میرے خیالات کے چمن میں ایسی بہار آئی کہ اب تک آئی ہی نہ تھی۔ ہر طرف خوشبو ہی خوشبو، شبنم ہی شبنم مجھے اپنے آپ پر فخر ہونے لگا۔

میری کوشش تھی کہ اب وہ ہمیشہ مسکراتی رہے !

میں نے افسری اور ماتحتی کی دیواریں منہدم کر دیں !!

اب میں ہمیشہ تنہائی کے لئے اس کو ساتھ لے لیتا

مترجم۔ احتشام

بربادیٔ عشق

رابندرناتھ ٹیگور کے ڈرامہ کا ایک منظر

کردار

وکرمادیو۔ جالندھر کا راجہ۔
سمترا۔ جالندھر کی رانی اور کمارسین کی بہن۔
کمارسین۔ کشمیر کا ولی عہد سلطنت۔
چندرسین۔ کمارسین کا چچا ۔۔۔ کشمیر کا راجہ۔
ریباتی۔ چندرسین کی بیوی۔
اِلا۔ تریچور کے راجہ کی بیٹی ۔۔۔ کمارسین کی محبوبہ۔
دیودت۔ جالندھر کا بڑا پجاری۔ وکرم کا دوست۔
شنکر۔ کمارسین کا خادم۔
قاصد۔ شہر کے پجاری وغیرہ۔

(کشمیر کے شاہی محل کا ایک کمرہ: وکرمادیو اور چندرسین)

وکرم۔ "معزز بزرگ! آپ آج اِس قدر خاموش کیوں ہیں؟ ہم نے کمار کو معاف کر دیا ہے۔"

چندرسین۔ آپ نے اُسے معاف کیا ہے، لیکن اِس سے کیا؟ وہ ہماری حکومت کا باغی ہے۔ ہم اُسے سزا دیں گے۔"

وکرم۔ "آپ نے اُس کے لئے کون سی سزا تجویز کی ہے؟"

چندرسین۔ "ہم اُسے تخت و تاج سے محروم کر دیں گے۔"

وکرم۔ "ناممکن! ہم خود اپنے ہاتھوں سے اُسے تخت پر بٹھائیں گے۔"

چندرسین۔ "آپ! آپ کو کشمیر کے تخت کا فیصلہ کرنے کا کیا حق ہے؟"

وکرم۔ "ایک فاتح کا حق ۔۔۔!"

چندرسین۔ "آپ یہاں ایک دوست ۔۔۔ ایک مہمان کی حیثیت سے مقیم ہیں۔ آپ نے کشمیر پر حملہ نہیں کیا تھا۔ آپ نے کشمیر کو فتح نہیں کیا۔"

وکرم۔ "بغیر جنگ و جدال کے کشمیر نے خود کو ہمارے حوالے کر دیا۔ اگر آپ جنگ کے خواہشمند ہیں تو آیئے۔ ہم تیار ہیں ۔۔۔ یہ تخت ہمارا ہے۔ ہم اپنی مرضی کے مطابق جس کے سپرد چاہیں کر سکتے ہیں ۔۔۔"

چندرسین۔ "آپ سپرد کریں گے؟ ۔۔۔ ہم جانتے ہیں کہ کمارسین کتنا خوددار اور مغرور ہے۔ کیا وہ اپنے اجداد کا تخت کسی دوسرے سے لینا پسند کرے گا اور وہ بھی اِس طرح جیسے بھکاری کو خیرات دی جاتی ہے! آپ اُسے خلوص و محبت دیجئے ۔۔۔ وہ جھک کر قبول کرے گا۔ آپ اُسے نفرت دیکر دیکھیں کس خوبی سے وہ انتقام لیتا ہے ۔۔۔ مہاراج! آپ یہ تخت ہی از راہِ کرم اُسے دیکر دیکھیں، وہ نفرت سے ٹھکرا دے گا۔"

وکرم۔ "اگر وہ اتنا ہی مغرور اور خوددار تھا تو بغیر کسی حیل و حجت کے اپنی ہی مرضی سے اُس نے ہار کیوں مان لی ۔۔۔؟"

چندرسین۔ "ہمیں خود حیرت ہے مہاراج! یہ ۔۔۔ وہ کمار تو نہیں معلوم ہوتا جس کی جوانی شیر کے مانند مغرور ہے۔ کیا وہ اپنی مرضی سے آکر اپنی گردن

میں زنجیریں ڈال لیگا۔؟ کیا زندگی کی خواہش اتنی ہی
شدید ہوتی ہے۔ ؟"
(ایک قاصد داخل ہوتا ہے)
قاصد ۔" ولی عہدِ سلطنت ایک بند پالکی میں محل کی
سمت تشریف لارہے ہیں۔"
وکرم ۔" بند پالکی میں ـــــ؟"
چندر سین ۔ جب وہ خود ہی ایک قیدی کی حالت میں حکومت
کے سپرد ہو رہا ہے تو کیا وہ کسی کو اپنی شکل دکھانا
پسند کرسکتا ہے ۔؟ شاہی شاہراہ آدمیوں کے جم غفیر
سے اٹا پڑا ہے، ہزاروں آنکھیں گھور رہی ہیں، کشمیر
کی خواتین اپنے دریچوں پر موجود ہیں ۔ اس تیوہار کا
پُورا چاند تمام مناظر کو روشن کئے دے رہا ہے۔ مکانات
سڑکیں، بازار، جھیلیں، مندر اور جنگلات ـــــ
سب منور ہیں ۔ کیا وہ شرم سے کسی کو بھی اپنا چہرہ
دکھا سکتا ہے ۔؟ مہاراج! میری گذارش پر بھی
ذرا غور فرمایئے ۔ موسیقی بند کرا دیجئے ۔ یہ جشن اُس کی
حالت کا مضحکہ اُڑاتا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔ جب وہ
چاروں طرف بکھری ہوئی روشنیوں کو دیکھے گا تو
اِس کے سوا اور کیا سوچے گا؟ کہ اُس کی شرم، اُسکی
ہتک، اُس کی بدنامی اور اُس کے عیب پر تاریکی کا ایک
دبیز غلاف بھی نہیں ہے۔ سب کچھ عیاں ہے، کچھ بھی
پوشیدہ نہیں ۔ یہ روشنیاں اُس کی شرم و ہتک
پر منھ چڑاتی ہوئی سی معلوم ہوتی ہیں مہاراج!"
(دیودت داخل ہوتا ہے)
دیودت ۔" مہاراج کا اقبال بلند! فتح مبارک ہو۔ میں
نے جنگل جنگل کمار کو تلاش کیا لیکن ناکام رہا۔ آخر ش
آج کمار کے شہر کی طرف خود ہی کوچ کرنے کی خبر
سُن کر واپس چلا آیا۔"
وکرم ۔ ہم ایک راجہ کی حیثیت سے اُن کا استقبال کرینگے
تخت نشینی کی رسم آپ ادا کریں گے ۔ آج، پُورے
چاند کی رات، کمار سین اور ایلا کی شادی ہوگی ـــ"

(شہر کے پجاری داخل ہوتے ہیں)
سب پجاری ۔" فتح مبارک ہو مہاراج! فتح مبارک ہو
مہاراج!!"
ایک پجاری ۔" آپ قابلِ آفرین ہیں مہاراج! بھگوان
کرے آپ سارے کرۂ ارض پر حکومت کریں۔ ہمیشہ
آپ کے محل میں لکشمی دیوی کا گذر ہو! آج آپ نے ساری
دنیا کو جس مسرت اور شادمانی سے رُوشناس کرایا ہے
میں اُسے بیان نہیں کرسکتا۔ عظیم کشمیر کے دل سے نکلی
ہوئی دعائیں اور مبارکبادیاں قبول فرمائیں مہاراج!!"
(آگے بڑھ کر اناج اور متبرک گھاس
مہاراج کے سر پر سے نچھاور کرتا ہے)
وکرم ۔" میں واقعی قابلِ آفرین ہوں! مجھے منزلِ مقصود
مل گئی!! میرے زندہ رہنے کا مقصد پُورا ہو گیا!!"
(پجاری مودبانہ باہر نکل جاتے ہیں)
چندر سین ۔" جالندھر کے دیوتا! یہ آپ کی رحمدلی کی نمایاں
مثال ہے۔ پھر بھی اُس کے لئے سزا ہی رحم سے زیادہ
بہتر ہوتی!"
وکرم ۔" کمار نے جتنی قربانیاں میرے لئے دی ہیں کیا کسی
دوسرے دوست نے بھی دی ہیں ـــ؟"
دیودت ۔" یہ تو حقیقت ہے مہاراج!"
(باہر سے شور و غل اور سنکھ پھونکنے کی آوازیں آتی
ہیں ۔ چندر سین گردن اُونچی کر کے باہر دیکھنے کی
کوشش کرتا ہے ـــ ایک قاصد داخل ہوتا ہے)
قاصد ۔" سواری آگئی ہے ۔"
وکرم ۔" کہاں ہے ساز ۔ موسیقی کی آواز تیز کرو!۔ آؤ،
آؤ میرے دوست! ہم آگے بڑھ کر اُنکا استقبال کرینگے۔"
{ موسیقی کی تیز آواز
پالکی محل میں داخل ہوتی ہے }
وکرم ۔ (آگے بڑھتا ہوا) آؤ، آؤ میرے دوست!"
(سمترا پالکی سے باہر نکلتی ہے۔ اُس کے ہاتھوں میں
ایک سنہری تھالی ہے جس پر کمار سین کا سر رکھا

ہوا ہے ـــــ موسیقی بند ہو جاتی ہے)

کرم ـ "سمترا! سمترا!!"

چندر سین ـ "کیا؟ میری بیٹی ـــ سمترا!"

سمترا ـ (مہاراج کو مخاطب کرتے ہوئے) "وہ ـــ جس کے لئے آپ نے سڑکوں، جنگلوں، پہاڑوں کی خاک چھانی، وہ ـــ جس کے لئے آپ نے اپنی سلطنت، اپنا مذہب، اپنی دھرتی کو خیرباد کہہ دیا، وہ ـــ جس کے لئے آپ نے زمینوں کو اُجاڑ دیا اور بے بس و غریب عوام کی دلخراش چیخیں ظہور میں آئیں، وہ جس کے سر کے لئے آپ نے ایک بڑی قیمت رکھی ـــ اُسی شاہزادے، اُسی ولی عہدِ سلطنت کی طرف سے یہ تحفہ قبول فرمایئے۔ اب آپ کی تڑپتی ہوئی تمناؤں کو قرار آ گیا ہوگا! ـــ اب تو اس سسکتی ہوئی زمین کو پُرسکون ہونے دیجئے، اب تو اِس جہنم کی آگ بجھنے دیجئے!! کاش آپ ہمیشہ خوش رہیں ـــ!!!

(اوپر دیکھتی ہوئی) ہے بھگوان! مجھ پر رحم کر، مجھے اپنے آپ میں سمیٹ لے بھگوان!!"

[گرتی ہے اور مر جاتی ہے
اِلا دوڑتی ہوئی ہال میں داخل ہوتی ہے]

اِلا ـ "یہ کیا ہے مہاراج! میرے کمار!!"

(غش کھا کر گر جاتی ہے)

شنکر ـ (بڑھتا ہوا) میرے آقا! میرے دیوتا! میرے بیٹے! زندگی سے پیارے! اِس بوڑھے کے محافظ! لیکن یہ اچھا ہوا، یہ ٹھیک ہے۔ آپ نے اپنے سر پر تاج رکھ لیا۔ آپ اپنے دارالسلطنت میں پہنچ گئے مہاراج! بھگوان نے آپ کی اِس فتح کی شہادت دینے کے لئے اب تک مجھے بچائے رکھا۔ اب آپ چونکہ اپنے دھارمک سلطنت میں پہنچ گئے ہیں، اِس لئے ہمیشہ کی طرح آج بھی میں آپ کے ساتھ رہوں گا ـــ"

چندر سین ـ (اُس کے سر سے تاج اُتار کر زمین پر پھینکتے ہوئے) "چلے جاؤ، چلے جاؤ، اِس تاج کے ساتھ چلے جاؤ، اِس تخت کے ساتھ چلے جاؤ ـــ

[تخت پر ٹھوکر لگاتا ہے
ریباقی داخل ہوتی ہے]

تم شیطان! مکار! میری نظروں سے دور ہو جاؤ!! خبردار جو اب مجھے اپنی شکل دکھائی! بدمعاش!"

ریباقی ـ "یہ غصہ زیادہ ٹھہرنے والا نہیں۔"

(چلی جاتی ہے)

وکرم ـ (سمترا کے نزدیک گھٹنے کے بل ٹیک کر) "دیوی! میری معبود، میں جانتا ہوں کہ میں تمہارے پیار کے لائق نہیں، یہی وجہ ہے کہ تم نے مجھے معاف نہیں کیا۔ تم نے مجھے، اپنے مجرم کو یونہی چھوڑ دیا۔ میں روزانہ تم سے اپنے آنسوؤں کے درمیان معافی کی بھیک مانگتا، مگر تم نے اِس کے لئے مجھے ایک بھی موقع نہیں دیا۔ تم بھی پرم پرمیشور کی طرح بے رحم، ساکت اور غیر متحرک ہو۔ تمہاری دی ہوئی سزا سے اب میں زندگی بھر رہائی نہیں پا سکتا ـــ!!" (پردہ گرتا ہے)

نصیر پرواز

دیا ہر دل سے جو آگ پھیلی تو جل اُٹھی شمعِ انجمن تک
سُلگ اُٹھا زندگی کا دامن بھیٔ رخشاں چمن چمن تک

نقابِ رُخ سے اُٹھا کہاں ہے نظر اسیرِ غمِ نہاں ہے
سیاہیوں کی کثیف چادر بچھی ہے حدِ نگاہِ فن تک

جمال بھی تیرگی کا پیکر، خیال بھی گمرہی کا خوگر
لبوں کو اظہارِ شوق کیا ہو اسیر ہے جراٗتِ سخن تک

جہاں جہاں زندگی ملی ہے محبتوں کی کلی کھلی ہے
فضائے دشتِ الم سے لیکر مسرتوں کے حسیں چمن تک

سکونِ قلب و نظر کے جادو چھلکتے ساغر مہکتے گیسو
ملے جو فرصت تو آ کسی دن مری تمناؤں کے وطن تک

یہ کونسی آگ ہے کہ جس میں جھلس رہا ہے وجودِ انساں
خیال کا جسم جل رہا ہے سُلگ اُٹھا خواب کا بدن تک

رہِ تمنا کے پیچ و خم میں جو کاروانِ نفس بھٹکا
ٹھہر گئے زندگی کے دھارے، بچھڑ گیا عزمِ راہزن تک

تری وفا سے شکایتیں کیا وہ بھولی بسری حکایتیں کیا
بدل گیا زندگی کا دھارا بدل گئی شکلِ جان و تن تک

مجھے بصد یاس دیکھتی ہیں فضائیں اس شہرِ جستجو کی
یہاں سے پرواز جا رہا ہوں لُٹا کے میں اپنا بانکپن تک

اکرم دھولیوی

رونقِ زیست جو کاشانۂ دوراں میں نہیں
اب وہ تصویرِ وفا پیکرِ انساں میں نہیں

خار و گُل کی وہی روداد کہن آج بھی ہے
ہے جو درکار وہ ماحول گلستاں میں نہیں

آشیانے میں نظر بند ہیں اُڑنا کیسا !
فرق اپنے لئے کچھ گلشن و زنداں میں نہیں

باغباں تنگ نظر اہلِ چمن تنگ خیال
لالہ و گُل کی کمی ورنہ گلستاں میں نہیں

حوصلے دل کے نکل جائیں غنیمت ہے یہی
ناخدا، ناؤ ابھی ہے ابھی طوفاں میں نہیں

ذوقِ دل کے لئے دونوں ہیں ضروری لیکن
غمِ جاناں کی لطافت غمِ دوراں میں نہیں

کھو گئے اہلِ چمن فصلِ بہار آتے ہی
خیر مقدم کے لئے کوئی گلستاں میں نہیں

دورِ مئے تشنۂ تعظیم رہے گا ساقی
مے کشی کے اگر آداب خمستاں میں نہیں

اب ستم سے بھی گریزاں ہیں وہ ناحق اکرم
دل کی تسکین کہاں اس مفت کے احساں میں نہیں

اعزاز افضل

ہیں مصر تو پشیاں بھی آئینہ خانہ ملے
عکس حیراں ہے کہ کس سے بے حجابانہ ملے

ہم سے شوریدہ سری میں بھی نہ چھوٹا بانکپن
کج کلاہانِ خرد سے کج کلاہانہ ملے

انجمن آرائیاں ڈھونڈا کریں لیکر چراغ
خلوتیں ہی بجھ گئیں کیا کوئی پروانہ ملے

چاکِ دامانی تو دیکھی خوش گریبانی بھی دیکھ
کیا خبر کس بھیس میں اب تیرا دیوانہ ملے

کھو گئے یارانِ خود بیں سحر گاہِ عجز میں
ہم تھے نازاں آگاہ تجھ سے بے نیازانہ ملے

ختمِ منزل ہی پہ ہوگا موسمِ گل کا سفر
راہ میں گلشن ملے افضل کہ ویرانہ ملے

صابر شاہ آبادی

قفس تو خیر قفس تھا چمن بھی کیا کم ہے
یہاں تو رات ہی کیا، صبح کا بھی ماتم ہے
بہارِ سبزۂ گلشن کو دیکھتی بھی نہیں
کہ جس کی سایۂ گل میں بھی آنکھ پُرنم ہے
خلوص کیسا کہ جب بزم ہو گئی بازار
وفا کا ذکر تو ہوتا ہے یہ بھی کیا کم ہے
غمِ فراق بھی پہچانتا نہیں جس کو
ترے سلوک کا آخر یہ کیسا عالم ہے!
نگاہِ اہلِ سیاست میں بے مقام سہی
جنونِ عشق مگر آبروئے عالم ہے
یہ خار زار ہے اک رسن، ہر کلی کے لئے
چمن میں رہ کے بھی جو بے نیازِ موسم ہے
گریزِ عام سے محشر کا ہو رہا ہے گماں
جہاں نہ دوست ہے صابر نہ کوئی محرم ہے

کرشن موہن

شباب آیا تھا میری محفل میں زندگی کا سہاگ بن کر
رہا تھا فردوسِ گوش برسوں تری محبت کا راگ بن کر

تعلقاتِ جنوں کو ایک ایسا موڑ دنیا نے دیدیا ہے
جلا رہی ہے تری جدائی دل و جگر کو اِک آگ بن کر

امنگ محبوس ہو چکی ہے، مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے
دل ایک بانبی ہے اور ترا پیار اسمیں بیٹھا ہے ناگ بن کر

اداس ہوں سوچ دل میں دھونی رمائے بیٹھی ہے مدتوں سے
ذرہ گئے ہیں مِلن کے سارے جتن مرے سوئے بھاگ بن کر

یہ دلبری ہے کہ رہزنی ہے، یہ دوستی ہے کہ دشمنی ہے
لگا ڈیترا ستا رہا ہے غمِ جُدائی میں لاگ بن کر

مراکمالِ سخن، وہ دشتِ جنوں کا پالا غزالِ رعنا
بھٹک گیا ہے مری خرد سے غمِ معیشت کی لاگ بن کر

سکندر محسن

کتنا ویراں ہے فلک اُجڑے نگر کی صورت
کوئی تارا ابھی نہیں آج شرر کی صورت

رات، تخلیق کا اک درد لئے جلتا رہا
دل، کسی شمعِ سرِ راہ گذر کی صورت

کچھ صلیبیں ابھی تکتی ہیں ہر اک رہرو کو
منزلِ صبح کی راہوں میں خضر کی صورت

اُن سمن زاروں پہ ٹھہری ہے خیالوں کی دھنک
رات مہکی ہے جہاں اک گلِ تر کی صورت

تیرہ و تار فضاؤں کا جگر چاک ہوا
قافلہ سوچوں کا نکلا جو سحر کی صورت

درد سے آج بہت بڑھ گیا دل کا رشتہ
زندگی ڈھونڈھ نہ لے کوئی مفر کی صورت

کوئی نغمہ، کوئی آہٹ، کوئی آواز نہیں
وقت خاموش ہے بے برگ شجر کی صورت

رحمت امروہوی

ہیں جو دولتِ زادِ سفر تو کیا غم ہے
یہی متاع بہت ہے کہ عزم محکم ہے

قدم قدم پہ حوادث قدم قدم خطرے
بتا رہے ہیں کہ منزل کا فاصلہ کم ہے

یہ میکدے کے ہیں بانی انہیں شراب نہ دو
حضور جرم بڑا ہے سزا بہت کم ہے

ہماری بات ہی کیا تھی رہی رہی نہ رہی
تمہاری بات تو رکھ لی ہے یہ بھی کیا کم ہے

ادب میں جلتے تو ہیں کچھ چراغ نئے
مگر یہ کون بتائے کہ روشنی کم ہے

ہیں اب بھی ساغر و مینا کے تذکرے غالب
کہ اب ہاتھ میں جنبش نہ آنکھ میں دم ہے

یہ کس مقام پہ ہم آ گئے ہیں اے رحمت
نہ زندگی کی خوشی ہے نہ موت کا غم ہے

شاہد کبیر

تمہارے شہر میں بھٹکے ہیں اجنبی کی طرح
کسی نے بات بھی پوچھی نہ آدمی کی طرح

ہمارے زخم کہاں تک سیوگے چارہ گرو!
بہار آتے ہی کھِل جائینگے کلی کی طرح

بہت گراں تھی شبِ تار، وہ تو خیر ہوئی
تم اِس طرف جو نکل آئے چاندنی کی طرح

یہ ماہتاب سا کچھ ہے کہ ماہتاب ہے یہ
ستارے سوچ میں ڈوبے ہیں فلسفی کی طرح

ہمارے دل میں بھی حسرت ہے مسکرانے کی
حضور! ہم بھی تو انساں ہیں آپ ہی کی طرح

زمانہ پھونک چکا تھا ہمیں مگر شاہد
بکھر گئے ہم اندھیروں میں روشنی کی طرح

جمیل کلیمی

وہ سُنتے ہیں کہ آیا ہے مہتاب دوستو
یا دیکھتے ہیں کوئی نیا خواب دوستو

آؤ کہ ہم بھی سات سمندر کھنگال کر
لے آئیں اک نیا اک دُرِ نایاب دوستو

ہم کو تو اُنکی بزم کے برسوں کے بعد بھی
آئے نہ کچھ سلیقے، نہ آداب دوستو

ہاں اُنکے انتظار میں اُنکی تلاش میں
آنکھیں ہیں ایک عمر سے بے خواب دوستو

ہم اور اُن سے عرضِ تمنا بھی کر سکیں؟
اتنی کہاں مجال کہاں تاب دوستو

آنا پڑیگا اُن کو بہاروں کے ساتھ ساتھ
پیدا تو ہو چلے ہیں وہ اسباب دوستو

اُونچا تھا جن کے دم سے خلوص و وفا کا نام
اب ہیں کہاں بتاؤ وہ احباب دوستو

کیا آپ نے سُنی ہے غزل وہ جمیل سے
ہر شعر جس کا ہے گُلِ شاداب دوستو

شارق میرٹھی

کوئی پُوچھے تو ہم کو نہیں خود خبر
ہم غریبوں کی ہوتی ہے کیسے بسر؟

اُن بہاروں کی کیا قدر کوئی کرے
جن سے بدلی نہ گلشن کی شام و سحر

وہ اُجالا نہیں، وہ تجلّی نہیں
یہ سحر وہ نہیں جو تھی پیشِ نظر

میری مجبوریوں کو نہ پُوچھے کوئی
ہو قفس میں کوئی جیسے بے بال و پر

وقت آتا ہے تو دستِ مجبور سے
ٹوٹ جاتے ہیں زنداں کے دیوار و در

جس کے سینے میں ہے دردِ انسانیت
میں ہوں اُس دُکھ بھرے دل کا پیغامبر

آہ! شارق مرے دیکھتے دیکھتے
اور ہی ہو گیا رنگِ شام و سحر

خورشید احمد شمسی

ذکر تری یاد کا حیلا بھی بہت ہے
فان میں تنکے کا سہارا بھی بہت ہے

ہے آج کی تعمیر میں تخریب بھی شامل
دیپک بھی بہت ہیں تو اندھیرا بھی بہت ہے

ابھی ہیں کچھ درد کی ٹیسیں مرے دل میں
شید تیری یاد کا نکلا بھی بہت ہے

تو نے مجھے آنسو بھی دئے ہیں غم جاناں
تو نے مرے گیتوں کو سجایا بھی بہت ہے

نے بخدا اے صنم شہر نگاراں
ہی نہیں ہے تجھے پوجا بھی بہت ہے

سُنتا ہوں مری یاد میں اس چاند نے شمسی
پلکوں پہ ستاروں کو سجایا بھی بہت ہے

فخر دھولیوی

آرزوئے شوق اے دل! سعیٔ لاحاصل سہی
کچھ تو اس ظالم نے سمجھا جور کے قابل سہی

ایک ایک ذرہ بجائے خود ہے اک شمعِ وفا
منتشر خاکسترِ پروانۂ محفل سہی

کھینچ لائیگا سفینہ کی طرف ذوقِ طلب
دُور، اے موجِ بلا! منجدھار سے ساحل سہی

خونِ دل کرتے رہیں گے نذرِ جورِ روزگار
اے عروسِ زندگی تیرا جنوں مشکل سہی

رنگ لاکر ہی رہے گا ایک دن خونِ وفا
کتنا ہی بے داغ یارو! دامنِ قاتل سہی

رات دن بے چینیوں سے دل کو اپنے کام ہے
فخر! بے صرفہ نظامِ بزمِ آب و گِل سہی

ایم، اے، شمیم (سرونجی)

لوگ راہ میں جیسے اجنبی سے ملتے ہیں
دوست اِس طرح اب تو بے رُخی سے ملتے ہیں

جن میں کچھ مروّت ہے، جذبۂ محبت ہے
آج بھی وہ اہلِ دل سادگی سے ملتے ہیں

تم غموں کے سائے سے اسقدر نہ گھبراؤ!
"سلسلے اندھیروں کے روشنی سے ملتے ہیں"

ہم گناہگاروں میں آپ حضرتِ واعظ؟
آپ تو فرشتہ ہیں، کب کسی سے ملتے ہیں!

جو خلوص کا بندہ اور وفا کا پیکر ہو
آپ بھی شمیم ایسے آدمی سے ملتے ہیں!

مکتوبات

اظہر افسر ———— حیدرآباد (اے پی)

تازہ شاعر ملا۔ یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ "ڈراما نمبر" کی تعریف میں اب تک خطوط چلے آرہے ہیں۔ واقعی آپکی محنت اور کاوش قابلِ داد ہے۔ "ڈراما نمبر" کی مقبولیت اور مانگ کا یہ عالم ہے تو میرا خیال ہے کچھ منتخب ڈرامے "مکتبۂ قصرالادب" کی طرف سے کتابی شکل میں شائع فرمادیں تاکہ اہلِ ذوق اور ایجنٹ حضرات کی تشفی ہوسکے۔
یہ سچ ہے کہ اچھے ڈراموں کی بے حد مانگ ہے۔ یہاں کالج کے طلبا اور سماجی اداروں کے کارکن دن رات عمدہ ڈراموں کے لئے تنگ کرتے رہتے ہیں۔ اس بار میں نے تقریباً سب ہی کو "شاعر" کے "ڈراما نمبر" کا حوالہ دیا ہے۔ ہر سال حیدرآباد میں جنوری کے مہینے میں کل ہند صنعتی نمائش منعقد ہوتی ہے۔ اس بار اس نمبر کے چند ڈرامے نمائش تھیٹر اور نیشنل تھیٹر حیدرآباد کے ڈرامائی پروگرام کے ساتھ پیش کیے جائیں گے۔ تیاریاں جاری ہیں۔
اس بار آپ نے ایسی سخت بحر اور ایسے مشکل ردیف قافیوں میں غزل کہی ہے کہ حد نہیں۔ "تلخئے چند۔ تلئے چند رکھو اچند اور دل جلائے چند" والے شعروں کا جواب نہیں۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو عرض کروں کہ مجموعۂ کلام میں آپ یہ غزل شامل فرمائیں تو دوسرا اور ساتواں شعر نکال دیں۔ پوری غزل مرصّع ہے۔

قیصر قلندر ———— اندورہ

"شاعر" کے "ڈراما نمبر" کی اس وقت تک ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکا۔ اس کی شہرت خوشبو کی طرح پھیل گئی ہے۔
آپ کا اداریہ "جے پور کانفرنس یا اردو تحریک کا نقطۂ آغاز" بہت اچھا رہا۔ آپ سے اردو کے مستقبل اور انجمن ترقیِ اردو کے مشاغل پر کئی بار تبادلۂ خیالات کا موقع ملا ہے اور ہر بار میں نے یہی بات دہرائی ہے کہ اگر اردو کی موجودہ نازک حالت قائم و دائم رہی تو اگلے دس برس ہی میں آنے والی نسل اسے عربی، سنسکرت یا لاطینی کی طرح بطورِ خاص مضمون کی طرح پڑھا کرے گی۔ اِن دنوں اردو پر جو وقت آن پڑا ہے اُسے کیسے ٹالا جائے؟ اِس کے مقابلے کی کیا صورت نکالی جائے۔ کاغذ پر تو اردو زندہ ہے اور ایک ریاست کی زبان بھی ہے۔ مگر کیا اس کی زندگی برقرار رکھنے کے لئے کوئی انتظام و انصرام ہو رہا ہے؟ کیا اُس ریاست میں اردو کی ترویج و ترقی کے لئے کوئی ٹھوس کام ہو رہا ہے۔ کیا انجمن نے اِس طرف بھی دھیان دیا۔ کئی سوالات اُبھر رہے ہیں! میں یہ پوچھتا ہوں کہ آپ سب نے یا انجمن نے جے پور میں جو فیصلے کیے اُن پر عمل بھی ہوگا یا نہیں؟ میری صلاح ہے کہ اُن فیصلوں کو ہندوستان کے سارے اردو رسائل اور ہفتہ وار اخبارات شائع کریں اور جب انجمن کو کسی مسئلے میں سرخروئی ہو تو اُسے بھی عام کرنے کا کوئی انتظام ہو۔ ورنہ "نشستند و گفتند و برخاستند" کا سالانہ سلسلہ بدستور جاری رہے گا اور نتیجہ وہی ناکامی و نامرادی جو ہر سالانہ اجلاس کے مندوبین کا خیر مقدم کرتی رہی ہے!
بڑے بڑے رہنماؤں نے ہر بار اردو والوں کو لقمہ دینے کی کوشش کی ہے اور ایک دو بیانات سے ایک زندہ زبان کو موت کی گولی دینے کا انتظام بھی کیا ہے۔ وہ تو اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے۔ مگر اردو بیچاری کس مپرسی کے عالم میں ریاست ریاست پھر رہی ہے! کہیں ٹھور ٹھکانہ نہیں ملتا۔ جب اس کے پاؤں شل ہو جائیں گے۔ قدم جواب دے دیں گے۔ تھکان نڈھال کردے گی تو دم ٹوٹ جائے گا۔ اور پھر ہم جب شاذ و نادر کسی کو میر و امیر، غالب و ذوق، نظیر و اقبال، آتش و مصحفی

فیض و فراق۔ جوش و سیماب۔ اصغر و جگر۔ اختر و ندیم کا کوئی شعر سُنانے پائیں گے تو ایک گونہ دل کو تسلی ہوگی کہ وہ زبان جو ملک کی سیاسی و سماجی زندگی میں انقلاب لائی تھی، اب آثارِ قدیمہ میں شامل ہوگئی اور اس کے چہرے پر وقت نے ایسی مٹی ڈال دی کہ کُھرچ کُھرچ کر اُس کے نقوش دیکھنے کی تمنا جاگ اُٹھی۔ کیا اُردو والوں کے لئے یہ لمحۂ فکر کسی عمل کی ترغیب نہیں دیتا!؟ اور بھی بہت کچھ لکھنے کی آرزو تھی، مگر خط طویل تر ہو رہا ہے۔

اکرام جاوید ——————— حیدر آباد (اے۔پی)

تازہ "شاعر" مواد و معیار کے اعتبار سے کافی اہم اور خوبصورت ہے۔ آپ نے اچھا ہی کیا جو افسانوں کی تعداد بڑھا دی۔ صحت مند مقبولِ عام ادب ہی کے ذریعہ "جاسوسی اور نام نہاد رُومانی ادب" کے غیر صحت مندانہ اثرات کو کم کیا جا سکتا ہے اور پڑھنے والوں کے ذوق کی تہذیب میں مدد مل سکتی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر مقالہ "فراق کی غزلیں" اور اختر ملیح آبادی اور عالم شاہ خاں کے افسانے پسند آئے۔ منظومات میں رونق نعیم۔ حالی۔ نقی احمد ارشاد۔ ندا فاضلی۔ ظفر احمد نظامی اور شمیم احمد کی نظمیں خوب ہیں۔ غزل کے حصے میں تقریباً سب ہی غزلوں میں اچھے اشعار مل جاتے ہیں۔ مجھے بطورِ خاص آپ کی اور سردار جعفری کی غزلیں پسند آئیں۔ جعفری صاحب کی غزل کا مطلع اور یہ شعر بہت دیر تک ذہن پر چھایا رہا۔

شاخِ نہالِ درد و غم پر غنچۂ دل پھر خون ہوا
اتنا شوخ نہیں تھا یارو، رنگِ بہاراں اگلے سال

آپ کی غزل کے ہر شعر میں غزل کا بانکپن بھی ہے اور فکر و فن کی ہم آہنگی بھی۔

ہاتھ میں لیکر مشعلِ حسرت، پاؤں میں لیکر چھالے چند
منزل منزل آوارہ ہیں، منزل کے متوالے چند

طوفانوں کا ساتھ نہ دینگی ٹوٹی پھوٹی پتواریں
کشتی کو خود ہی نہ ڈبو دیں، کشتی کے رکھوالے چند

کیوں تابِ گفتار ہماری موضوعِ گفتار بنے
ہم نے تو خود اپنے لبوں پر ڈال لئے ہیں تالے چند

اُجڑی اُجڑی بزمِ جہاں ہے، سُونی سُونی محفلِ شوق
کوچہ کوچہ ڈھونڈ رہے ہیں دل کا سکوں دل والے چند

غرض ساری ہی غزل مرصع ہے۔ بحیثیتِ مجموعی تازہ شمارہ میں بہت اچھا مواد ہے۔

مخمور سعیدی ——————— دہلی

نئے شمارے میں فراق صاحب پر جو مضمون ہے وہ مجھے بڑی حد تک سرسری اور کسی حد تک رسمی سا معلوم ہوا۔ فراق صاحب کے شاعرانہ اوصاف کا احساس و اعتراف اب سبھی کو ہے اور یہ بات بھی بار بار کہی جا چکی ہے کہ اُنھوں نے اُردو غزل کو بعض نئے امکانات سے آشنا کیا ہے۔ اب ضرورت اِس بات کی ہے کہ اِن امکانات کی واضح نشاندھی کی جائے۔ کیونکہ فراق صاحب کی غزلوں میں رسمی مضامین کی بھی کمی نہیں اور اِس بناء پر ایک عام قاری کے لئے فراق صاحب کی "اصل آواز" کو پُوری طرح پہچاننا قدرے مشکل ہو جاتا ہے۔ اِس سوال پر بھی اُن کی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اِس آواز کی حقیقی قدر و قیمت کیا ہے۔ پروفیسر نظیر صدیقی نے فراق پر اپنے مضمون میں ایک دلچسپ حقیقت کی نشاندہی کی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ فراق کی شاعری پر سب سے زیادہ خود فراق نے اظہارِ خیال کیا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ بیشتر نقادوں نے اپنے بارے میں اُن کے مزعومات کو، ذاتی غور و فکر کی کسوٹی پر کسے بغیر بلا چون و چرا تسلیم کر لیا ہے۔ یہ سب ہی جانتے ہیں کہ ایک شاعر کو تعلّی کا پُورا پُورا حق ہے۔ فراق صاحب نے اپنی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اِس حق سے فائدہ بھی پُورا پُورا اُٹھایا ہے۔ ورنہ یہ قدرے مشکل تھا کہ اُن کے نقائص بھی محاسن میں شمار ہونے لگیں۔

غزلوں کے حصے میں سردار جعفری اور آپ کی غزلیں خصوصیت سے داد طلب ہیں۔ سردار جعفری کی سیاسی نظموں کے الفاظ بالعموم بے جان پتھروں کی طرح لڑھکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں لیکن اس غزل میں اُن کا لہجہ کیسا سُبک اور رچا ہے جیسے کسی آبشار کا گیت۔ جہاں تک آپ کی غزل کا تعلق ہے، آپ نے فکری مسائل کو متغزلانہ رنگ و آہنگ کے ساتھ پیش کرنے کی ایک خاص طرز نکالی ہے اور یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

اس خط کے ساتھ ایک نظم منسلک ہے۔ نظم کے بارے میں دو ایک وضاحتیں مجھے عرض کردوں۔ میں نئی شاعری کا مخالف ہرگز نہیں ہوں لیکن نئی شاعری کے نام پر پاکستان کے کچھ مشہور و ممتاز جرائد میں شاعری کی جو مٹی پلید ہو رہی ہے وہ آپ سے مخفی نہ ہوگی۔ اس قسم کی شاعری کرنے والے، اگر ایسے شاعری کہا جا سکتا ہو، خود کو نئی نسل کا نمائندہ بنا کر سامنے آتے ہیں اور اُن کا تمرد اپنی مثال آپ ہے۔ اس نظم کا رُوئے تخاطب ایسے ہی دوستوں کی طرف ہے۔ اور مقصد افہام و تفہیم کی دعوت ہے، محض طنز و تعریض نہیں ہے۔

ماہر القادری ——————— کراچی

اُمید نہیں یقین ہے کہ آپ خیریت سے بمبئی پہنچ گئے ہوں گے۔ اور مستقر سے ایک ماہ دُور رہنے کے بعد گوناگوں مشاغل اور مصروفیتوں میں غرق ہوں گے۔

ندامت ہے کہ میں آپ کی کوئی خدمت نہ کرسکا، ملاقاتیں بھی سرسری ہی رہیں۔ کراچی میں شعر و ادب کی محفلوں کی بہتات، ارزانی ہے۔ آپ کی تشریف آوری نے اس رنگ کو اور تیز کردیا! جزاک اللہ و بارک اللہ!

رائٹرز گلڈ کے عصرانہ میں آپ نے دانشوروں کے سوالات کے نہایت معقول و سنجیدہ جواب دئے اور تمام محفلوں میں اپنے کلام سے خاص رنگ قائم کیا۔ خلوص و بے تکلفی کی بنا پر ایک بات عرض کرتا ہوں کہ وہ جو آپ کی غزل ہے

"پرنالے چند——۱۰۰ [illegible] نالے چند"

اُس میں وہ شعر جس میں 'یادوں کی برف' [illegible] کر [illegible] غزل سے میرے ذوق پر اعتماد کرتے ہوئے ضرور نکال دیجیے۔

"شاعر" کا سالنامہ جب بھی شائع ہو، اُس کے لیے تازہ غزل بھیج رہا ہوں۔

اپنی صحت کی طرف زیادہ توجہ دیجیے ——

طرفہ قریشی ——————— ناگپور

تازہ "شاعر" نومبر [illegible] نظر نواز ہوا۔ یہ شمارہ گزشتہ شمارے سے بھی وقیع ہے۔ "شاعر" کو شروع ہی سے سرفرازی و نمائندگی حاصل ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسی چیزیں بھی نگاہ سے گزر جاتی ہیں جنہیں دیکھ کر رُوحانی تکلیف ہوتی ہے۔

اس دور میں کسی پر صحیح اعتراض کرنا بھی دُشمنی مول لینے کے برابر ہے۔ حالانکہ اعتراض کرنے والا محسن ہوتا ہے۔ اُس کے اعتراضات سے فنکار کو آگے بڑھنے میں مدد ملتی ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں صفحہ ۵۰ کے دوسرے کالم میں ——گزرا۔ اُبھرا۔ نکھرا۔ صحرا کے قوافی میں ایک غزل دیکھنے میں آئی۔ ان قوافی کے حروفِ اصل کیا ہیں میں ہنوز نہیں سمجھ سکا۔ دوسرے اور پانچویں شعروں کے قافیوں میں حرکتِ اصلی بھی بدل چکی ہے۔

قافیوں میں ردف و روی یا قید و روی کا التزام اور حرکاتِ اصلی کا لحاظ بہت ضروری ہے خواہ اشعار مردف ہوں یا غیر مردف۔

نامی انصاری ——————— کانپور

"شاعر" کا ڈرامہ نمبر ملا۔ اور تازہ شمارہ دسمبر [illegible] بھی موصول ہوا۔ یاد فرمائی کے لیے ممنون ہوں۔ ڈرامہ نمبر کی منظوم تعریف اگر انیسویں صدی کے آخر زمانے کا کوئی شاعر کرتا تو شاید اس شعر سے شروع کرتا

نقد و نظر

شعلۂ سنگ

از ——— کوثر چاند پوری

کوثر چاند پوری اُردو کے بہت مشہور اور صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ اُن کا نہ صرف بحیثیت افسانہ نگار صفِ اوّل کے لکھنے والوں میں شمار ہوتا ہے بلکہ علمی و ادبی موضوعات میں بھی ان کی بصیرت معتبر مانی جاتی ہے۔ کوثر چاند پوری کی افسانہ نگاری کا سفر بہت طویل ہے۔ پریم چند کے بعد اُردو نے جو افسانہ نگار پیدا کئے اُن ہی میں سے ایک کوثر صاحب بھی ہیں۔

کوثر صاحب کے اب تک متعدد مجموعے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں، کچھ ہندوستان میں اور کچھ پاکستان میں۔ "شعلۂ سنگ" بھی پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں اُن کے آخری دَور کی اٹھارہ نمائندہ کہانیاں ہیں اور کئی کہانیاں ایسی ہیں جو بالاتفاق بہترین تسلیم کی جا چکی ہیں، بابے کریم۔ کلثمیا۔ حصار۔ کیلے کا چھلکا۔ پہلی منزل۔ چہرے۔ وراثت وغیرہ۔ بابے کریم اور کلثمیا دونوں "شاعر" میں شائع ہوئے تھے اور جگہ جگہ نقل بھی کئے گئے تھے۔

کوثر چاند پوری ایک حاذق طبیب اور بڑے حساس انسان ہیں، انسانی نفسیات پر اُن کی نظر گہری ہوتی ہے۔ اُنھیں وقت اور سماج کی نبّاضی خوب آتی ہے، وہ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے مسائل کو بہت سوچ سمجھ کر فن کا جامہ پہناتے ہیں۔ ان کے یہاں فن اور زندگی کا امتزاج اُن کی طرزِ نگارش سے بیحد حسین ہو جاتا ہے۔ شعلۂ سنگ کے کئی افسانوں میں وہ بالکل جدید دَور کے لکھنے والے معلوم ہوتے ہیں حالانکہ اُن کا تعلق پُرانے لکھنے والوں سے ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے دَور کے اُلٹتے بدلتے حالات و واقعات کو شدت سے محسوس کیا اور اُن تمام صحت مند قدروں کو اپنی کہانیوں میں سمیٹ لیا جن سے کوئی بھی باشعور فنکار چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ کوثر چاند پوری کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

کوثر صاحب فطری طور پر رُومان پسند ہیں، اس مجموعہ میں اُن کی جتنی بھی مقصدی کہانیاں ہیں اُن میں بھی جنسی احساسات اور رُومان پسندی سے اُن کے کردار رنگے ہوئے ہیں لیکن یہ تصوّرات بڑے محتاط انداز کے ہیں۔ اِن میں ہیجانی کیفیت نہیں، ایک حُسن اور ایک لذت ہے۔ یہی لذت بھی صحت مند جذبات و احساسات میں مبدّل ہو جاتی ہے۔ معاشرے کی ناہمواریوں اور سماج کی ناانصافیوں پر وہ کڑی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اُن کی جزئیات نگاری اُن کے افسانوں کا حُسن ہے اور اُن کے کردار حقیقت پسندی کا جیتا جاگتا نمونہ ہوتے ہیں۔ اُن کے مکالمے کہیں کہیں اتنے شگفتہ ہوتے ہیں کہ وہ نثری شاعری معلوم ہوتے ہیں۔

"وہ گرمی کا موسم تھا، خوب لُو چل رہی تھی بگولے ناچ رہے تھے اور پلیٹ فارم جُھلسے ہوئے تَوے کی مانند تپ رہا تھا۔ وہ ننگے پاؤں اسی گرم تَوے پر چل رہا تھا۔ سانولے چہرے پر پسینے کی ننھی ننھی سفید بوندیں ستاروں کی طرح دمک رہی تھیں اور چھوٹے چھوٹے سفید بال دھان کی تازہ اُگی ہوئی نوکوں کی مانند سر اُبھارے کھڑے تھے۔"

کوثر صاحب کے یہاں تجربات و مشاہدات کی پختگی کے علاوہ زبان، الفاظ اور محاوروں کی صحت بدرجۂ اتم ملتی ہے۔ عام طور پر اچھے اچھے افسانہ نگاروں کے یہاں یہ احتیاط نہیں پائی جاتی۔ ان اٹھارہ کہانیوں میں کوئی کہانی ایسی نہیں ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ نہ کرے۔ ان میں ہماری روزمرّہ زندگی کی تصویریں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ اُمید کہ افسانوی ادب میں "شعلۂ سنگ" غیر معمولی قدر و منزلت حاصل کرے گا اور نقادوں کو کوثر چاند پوری کے فنی ارتقا، اُن کی انفرادیت اور عظمت کا احساس دلائے گا۔

ضخامت ۲۵۶ صفحات۔ نہایت خوبصورت اور بامعنی سرورق۔ قیمت ۵۰ روپے۔ [illegible] کراچی پاکستان

نسیمِ مغرب

از ——— پروفیسر امیر چند بہار

جس طرح کتاب کا نام سبک و لطیف ہے اسی طرح اس کا مواد بھی ہے۔ اس میں انگریزی زبان کے ۱۳ نامور شعرا کی شاہکار منظوم تراجم ہیں۔ شیکسپیر، ملٹن، ورڈز ورتھ۔ بائرن۔ کیٹس۔ ٹینسن جیسے مغرب کے مشاہیر شعرا کے علاوہ ایک مشرق کی شاعرہ سروجنی نائیڈو کی بھی شامل ہے۔

زبانوں کا مزاج اور آہنگ جدا جدا ہوتا ہے۔ صحیح معانی مطلب، جذبے اور حقیقی رُوح کو کسی زبان کے تمام ترحسن سے دوسری زبان میں منتقل کرنا، خصوصاً شعری جامے میں بڑا مشکل کام ہے۔ ترجمہ اگر لفظی ترجمہ ہو کر رہ جائے یا اس سے انحراف کر کے آگے نکل جائے تو وہ قابلِ ستائش نہیں ہو سکتا۔

پروفیسر امیر چند بہار کو ایک طرف اُردو شاعری پر عبور حاصل ہے تو دوسری طرف وہ انگریزی زبان کے بھی ماہر ہیں، اس کے علاوہ جن انگریزی نظموں کے اُنھوں نے اُردو نظم میں ترجمے کئے ہیں اُن میں سے بعض سے اُنھیں ایک جذباتی لگاؤ بھی ہے۔ اسی لئے وہ انگریزی نظموں کے کیف و تاثر کو اپنی ترجمہ شدہ اُردو نظموں میں کامیابی کے ساتھ سمو سکے ہیں۔ تقریباً سب ہی نظمیں ایسی ہیں کہ اگر یہ نہ کہا جائے کہ وہ ترجمہ ہیں تو قطعاً طبعزاد معلوم ہوں۔ اِن میں شاعرانہ حسن ہے، سادگی، لطافت اور دلنشینی ہے۔ ان تمام نظموں میں فنی التزام بھی ہے۔ انگریزی سانیٹ کے اُردو ترجمے میں اُسی تکنیک کو برتا گیا ہے جو اُس کے لئے مخصوص ہے۔ باقی انگریزی نظموں کے اُردو تراجم بھی اُن کی ہیئت کے مطابق ہیں۔ یہ پابند ہیں، ان میں ردیف و قوافی کا التزام ہے۔ اور بھی تمام شاعرانہ آداب کا خیال رکھا گیا ہے۔ شیلے کی مشہور نظم ODE TO THE WEST WIND تشبیہوں اور استعاروں کی ایک دنیا لئے ہوئے ہے لیکن بہار نے اس کا ترجمہ نہایت شستہ و رفتہ کیا ہے۔

ہوتا جو میں درخت کا پتہ گرا ہُوا
اُڑتا مثالِ ابر ترے ساتھ اے ہوا

اے کاش موج بن کے ترے ساتھ رہ سکتا
پرواز کی جستجو میں ترے طاقت و رفتار لیتا

میں بھی تری طرح ہی سرِ پُر غرور ہوں
گو تجھ سے کم ہوں پھر بھی میں نازاں ضرور ہوں

اب ختم ہو چلی ہے جوانی کی داستاں
وہ ولولے وہ زور نہ جانے کہاں گیا!

ہم آشنا کریں گے تری نغمگی کو ہم
نغمے کی چاشنی کو بڑھاتا ہے اور غم

آ مجھ سے ہمکنار ہو اے بادِ تُند خو
اپنا بنا مجھے بھی کہ ہے کار ساز تو

بائرن کی نظم THE WALKS IN BEAUTY میں تو اور بھی تشبیہات و استعارات اور وسعتِ معانی کا ٹھکانا نہیں۔ اس کا اُردو ترجمہ ایک مکمل پُر شکوہ مگر خوبصورت نظم کا درجہ رکھتا ہے۔ اس نظم میں الفاظ و تراکیبِ فارسی کی بہتات کے باوجود شگفتگی اور تاثیر ہے۔ یہی بہار صاحب کے ترجمے کی خوبی ہے۔ پہلا شعر دیکھئے

وہ لطیف پیکرِ خوش ادا ہے کچھ ایسی دلکش و دل رُبا
رُخِ شب پہ نور سا جس طرح کبھی دفعتاً ہو بکھر گیا

نظم کے تیسرے شعر کے پہلے مصرع میں کتابت کی غلطی ہے۔
"وہ ہے سرو قامت و گل بدن، ہر ادا میں ہے اُس کی بانکپن"
"ہر ادا میں اُس کی ہے بانکپن" ہونا چاہئے تھا۔
کہیں کہیں تعقیدِ لفظی کے علاوہ اِن نظموں میں کوئی نمایاں شاعرانہ جھول نہیں ملتا۔ آئندہ ایڈیشن میں اگر تعقیدِ لفظی سے بھی مصرعوں کو پاک کر دیا جائے تو بہت اچھا ہو۔ مثلاً

میں بھی تری طرح ہی سرِ پُر غرور ہوں
"تری ہی طرح" ہونا چاہیے۔

ہر چیز کو جب ہوتا ہے آرام میسر
انسان پریشان ہی کیوں رہتا ہے اکثر

ہر چیز کو ہوتا ہے جب کام بہتر صحیح مصرع ہو سکتا ہے۔ دوسرے مصرع میں بھی "اپنے صحیح محل پر نہیں ہے۔ اسے انسان کے بعد ہونا چاہیئے ؎

انسان ہی پریشان یہ کیوں رہتا ہے اکثر

بعض نظموں کا پس منظر بھی مترجم نے نظم سے پہلے نثر میں واضح کر دیا ہے۔ اور آخر میں شعراء کے مختصر حالاتِ زندگی بھی دئے ہیں۔ اگر اصل انگریزی نظمیں بھی شاملِ کتاب ہوتیں تو تقابلی مطالعہ کے لئے اچھا ہوتا۔

نسیمِ مغرب اُردو ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ پروفیسر ہمایوں کبیر، فراق گورکھپوری، سید احتشام حسین، تلوک چند محروم، جوش ملسیانی اور منور لکھنوی کی مختصر رائیں بھی شاملِ کتاب ہیں۔ عمدہ کتابت و طباعت۔ ۱۲۰ صفحات قیمت دو روپیہ پچاس پیسے

ملنے کا پتہ انجمنِ ترقیِ اُردو ہند علیگڈھ۔

بادہ وُ جام

از ——— شارق میرٹھی

شارق میرٹھی کا نام نیا نہیں ہے۔ اُن کا کلام اُردو کے اچھے رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ وہ ایک سنجیدہ فکر شاعر ہیں اور بہت سنبھل کر شعر کہتے ہیں۔ تمام شاعرانہ رکھ رکھاؤ اُن کے یہاں مل جاتے ہیں۔ اُن کے کلام میں سادگی ہوتی ہے۔ اُن کے اشعار اگرچہ چونکاتے نہیں تو سُلاتے بھی نہیں ہیں۔ وارداتِ حسن و عشق اور کیفیاتِ درد و غم کے ساتھ ساتھ اُن کے بعض اشعار میں ذکرِ دَوراں بھی آجاتا ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شارق روایت سے گریز کرنا بھی جانتے ہیں۔

گل ہوں یا شگوفے ہوں، تازگی نہیں ملتی
دل کشی کا موسم ہے، دل کشی نہیں ملتی
جانے کن اندھیروں میں کھو گئی ہے اب گھر میں
دُور دُور منزل کی روشنی نہیں ملتی

"بادہ وُ جام" میں اُن کے کلام کا انتخاب ہے۔ انہوں نے یہ بہت اچھا کیا کہ اپنا منتخب سرمایۂ سخن پیش کیا ہے۔ اس میں کچھ قطعات، رباعیات اور نظمیں بھی ہیں۔ فطری طور پر شارق غزل ہی کے شاعر ہیں۔ مختصر بحروں میں اُنکے اشعار اور بھی سادہ و دلکش ہوتے ہیں۔

حجم ۹۶ صفحات۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ: مرکزِ ادب۔ روحانیہ کالج۔ رڑکی۔ (ہمیرپور)

اعتذار

ہمیں بیحد افسوس ہے کہ گذشتہ شمارہ میں شائع شدہ افسانے "خوابوں کی وادیاں جلتی ہیں" کا بقیہ مندرج ہونے سے رہ گیا۔ صفحہ ۳۴ "زندگی جینے کے لئے ہے" ——— کے بعد ذیل کا بقیہ اُس میں شامل کر لیا جائے۔ ادارہ

.... اور جینا کچھ بننے کے لئے .... خودداری سودے کے لئے ہے۔ سکے سٹے کے لئے ہیں .... جنگ چھن جانے کے لئے ہے .... اور .... اور زندگی مر جانے کے لئے ہے۔" خیالات کے طوفان سے نجات پانے کے لئے اُس نے اپنا سر پیچھے کی طرف جھٹک دیا۔ اُس کی نگاہ وسیع آسمان کی طرف اُٹھ گئی۔ اُسے چاند ایک جلی ہوئی روٹی اور چمکتے ستارے کھوٹے سکوں کی طرح آسمان کی جھولی میں پڑے ہوئے دکھائی دئے۔ اُس نے اپنی پتلون کی جیبوں میں جو اُس کے پیٹ کی مانند ہی بالکل خالی تھیں، ہاتھ ڈالدئے اور آگے بڑھنے لگا۔ وہ چلا جا رہا تھا۔ کہاں ... کدھر ... ؟

محفل اپنی......!

ادارہ

تازہ شمارہ

"شاعر" کے پچھلے تمام شماروں سے زیادہ تاخیر کے
ساتھ یہ تازہ شمارہ قارئین تک پہنچ رہا ہے اور اس حادثاتی تاخیر
کے لئے ہم شاعر کے پڑھنے والوں سے معذرت خواہ ہیں۔ وجہ
صرف کوئی اشارہ کئے بغیر گذر جانا ہی مناسب ہے۔
یہ ۱۹۶۴ء کا آخری شمارہ ہے۔ ۱۹۶۴ء میں "شاعر" نے جو معیاری
ادب جس حسنِ ترتیب و طباعت کے ساتھ پیش کیا اس کا سب کو اعتراف
ہے۔ ۱۹۶۴ء رخصت ہو گیا، ہم نئے سال میں سانس لے رہے ہیں۔
ہماری کوشش ہوگی کہ اس سال گذشتہ سالوں سے بھی بہتر انداز
میں "شاعر" شائع ہو حالانکہ اس وقت ملک میں بے سکونی پہلے سے
کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے اور دشواریاں اپنی انتہا کو پہنچ چکی
ہیں۔ بہر حال اردو زبان و ادب کو مزید ترقی دینی ہے اور اس زبان
کے رسائل و اخبارات کو اپنی اپنی خدمات انجام دینی ہیں لیکن
اس کے لئے اردو پڑھنے والوں کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہے۔
یہ تازہ شمارہ معمول سے کچھ کم صفحات پر شائع ہو رہا ہے۔
اگر پورے حجم کا پرچہ تیار کرایا جاتا تو اور دیر ہو جاتی۔ اس شمارہ کے
صفحات کی کمی آنے والا سالنامہ ۶۵ء پوری کر دے گا۔
خریداران "شاعر" کسی طرح نقصان میں نہیں رہیں گے۔
حجم کی کمی کے باوجود اس شمارہ میں ۳ مقالے ۳ افسانے
ایک ڈرامہ ۷ نظمیں اور ۱۳ غزلیں شامل ہیں۔ "شاعر" کے مستقل
باب الگ ہیں۔ قارئین کو کوئی کمی محسوس نہ ہوگی۔ اس وقت بھی
بڑی تعداد میں منتخب مقالات۔ افسانے اور نظمیں غزلیں دفتر میں
موجود ہیں۔ ادارہ ان شعرا اور ادبا سے معذرت خواہ ہے
جن کی تخلیقات باوجود وعدہ اب تک شائع نہ ہو سکیں۔
۱۹۶۴ء میں تقریباً ایک ہزار غزلیں اور چھ سو نظمیں موصول ہوئیں۔
موصول شدہ افسانوں کی تعداد بھی بلا مبالغہ کئی سو تھی مسرت
کی بات یہ ہے کہ سالِ گذشتہ مقالات بھی کافی معیاری اور بڑی
تعداد میں آئے۔ "شاعر" کی تنگ دامانی بسا اوقات اچھی تخلیقات
کو چھاپنے سے معذور رکھتی ہے۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ سب ہی
اچھی آئی ہوئی تخلیقات شائع کی جائیں لیکن یہ ممکن کہاں ہے۔
امید کہ فنکار ہماری معذوریوں کے پیشِ نظر کسی خفگی کو روا نہیں
رکھیں گے۔ اور تخلیقات کی واپسی کا برا نہیں مانیں گے۔

سالنامہ ۱۹۶۵ء

"ڈرامہ نمبر" کی بے پناہ مقبولیت کے بعد "شاعر" کی چھتیسویں
سالگرہ پر آئندہ ماہ سالنامہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ادارہ کوشاں
ہے کہ اس میں تمام تخلیقات قدرِ اول کی ہوں اور اس سال بھی
سالہائے گذشتہ کی طرح سالنامہ ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہو۔
سالنامہ ۶۵ء جنوری اور فروری دو ماہ کی اشاعتوں پر مشتمل ہوگا
اور فروری کے اواخر میں قارئین تک پہنچ جائے گا۔ تیزی کے ساتھ
اس کے کام کرائے جا رہے ہیں۔

محبانِ اردو کا تعاون ضروری ہے

محبانِ اردو سے "شاعر" کے سلسلے میں تعاون کی پھر گذارش ہے
کہ وہ نئے سال کی اس خصوصی اشاعت سے دو دو چار چار نئے خریدار
عنایت فرما کر "شاعر" کی زندگی اور پائندگی میں مدد فرمائیں۔
دسمبر کے اس آخری شمارہ کے ساتھ جن خریداروں کا زرِ سالانہ ختم
ہو رہا ہے وہ از راہِ کرم تجدیدِ خریداری فرماتے ہوئے اپنا سالانہ چندہ
منی آرڈر سے روانہ فرما دیں۔ یا وی پی بھیجنے کی اجازت دیں تاکہ
سالنامہ ۶۵ء انہیں وی پی کے ذریعہ بھیج دیا جائے۔ اور اس طرح
وہ محفوظ پہنچ جائے لیکن کوئی وی پی واپس نہ کیا جائے۔
"شاعر" کے سالنامے اور خاص نمبر ڈاک میں بہت زیادہ غائب
ہوتے ہیں۔ جو لوگ حفاظت کے ساتھ سالنامہ منگانا چاہیں وہ
رجسٹری کے لئے ۵۵ پیسے کا ٹکٹ بھیج دیں۔ ہر صورت میں اپنا نمبر
خریداری لکھنا نہ بھولئے۔

"شاعر" کے ایجنٹوں سے

اس اندیشہ کی بنا پر کہ جو صورت "ڈرامہ نمبر" کے سلسلے میں ہوئی تھی
وہی سالنامہ ۶۵ء کے ساتھ نہ ہو، تمام مقتدر ایجنٹ ایک بار
پہلے سے بڑا آرڈر سالنامہ کا دیدیں۔ ہم بہر حال مطلوبہ تعداد
ان کی مانگ پوری کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ اس شمارہ

رفتار

(علمی، ادبی اور تہذیبی اطلاعات)

یوپی میں کھلنے والے اردو اسکولوں کو مرکز امداد دیگا

لکھنؤ، ۵ دسمبر۔ مرکزی وزیر تعلیم شری چھاگلا نے آج یہاں یقین دلایا کہ اگر اُتر پردیش میں اُردو انگریزی تعلیم کیلئے اسکول کھولے جائیں گے تو مرکزی وزارتِ تعلیم اُنکو امداد دیگی

راجستھان ساہتیہ اکیڈیمی کے وظیفے

راجستھان ساہتیہ اکیڈیمی نے اپریل ۶۵ء سے راجستھان کے تین اُردو شاعروں اور ادیبوں صولت ٹونکی، عرشی اجمیری اور سید فضل المتین کو اُن کی ادبی خدمات کے پیشِ نظر پچھتر روپے ماہانہ وظیفہ دینا طے کیا ہے۔ مفتون کوٹوی اور پارساجے پوری کو پہلے سے وظیفہ مل رہا ہے۔

ماسکو میں کرشن چندر کی کتابوں کی نمائش

ماسکو۔ ۳۰ر نومبر۔ یہاں غیر ملکی ادب کی لائبریری میں کرشن چندر کی تخلیقات کی نمائش کا افتتاح کیا گیا۔ نمائش میں کرشن چندر کی تقریباً چالیس تصانیف رکھی گئیں۔ ان میں ہندوستانی عوام کی زندگی، قومی جنگ آزادی اور ہندوستان کا منظر کی حُسن فنکاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

سوویت عوام کرشن چندر کو اُن کے "شکست"، "ایک عورت ہزار دیوانے" اور "جب کھیت جاگے" وغیرہ ناولوں کے ذریعہ بخوبی جانتے ہیں۔

ہند اور پاکستان کے مصنفین کی کانفرنس لاہور میں ہوگی

نئی دہلی ۲۶ر دسمبر۔ مغربی پاکستان کی پنجاب لٹریری لیگ لاہور فروری ۶۵ء میں ہند اور پاکستان کے مصنفین کی مشترکہ کانفرنس لاہور میں کرنے کا ارادہ کر رہی ہے۔ لیگ کا

ایک وفد دہلی آیا تھا اور انہوں نے مختلف ثقافتی تنظیم سے بات چیت کی تھی۔ ہندوستان سے ایک وفد بھیجنے کا انتظام کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنا دی گئی ہے جس کے صدر گیانی گُرمکھ سنگھ مسافر ہیں۔

امتحاناتِ جامعہ اُردو کی منظوری

اُردو دنیا کے لئے یہ خبر مسرت کا باعث ہوگی کہ جامعہ اردو کے امتحان ادیب کامل اور کسی مستند یونیورسٹی سے بی اے پاس شدہ اُمیدوار کو دلی یونیورسٹی نے ۱۴ر دسمبر ۱۹۶۴ء کے خصوصی جلسے میں ایم اے اُردو میں داخل کرنا منظور کرلیا۔ اس طرح وہ اُمیدوار جو اُردو لیکر بی اے نہیں کر سکتے ہیں بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ یا ٹنڈر گریجویٹ پاس شدہ اُمیدوار ادیب کامل کا امتحان پاس کرکے ایم اے (اُردو) میں داخلہ لے سکتا ہے اور اپنی تعلیم مکمل کر سکتا ہے۔

شبلی اکیڈیمی کیلئے حکومت کشمیر کا دس ہزار کا عطیہ

جموں۔ ۲۳ر دسمبر۔ حکومت جموں و کشمیر نے اعظم گڈھ کی شبلی اکیڈمی کے لئے دس ہزار روپیہ کی امداد و اعانت منظور کی ہے۔ اس میں سے پانچ ہزار روپیہ کی رقم جاریہ سال کے لئے اکیڈیمی کو دی گئی ہے اور پانچ ہزار روپیہ اکیڈمی کی گولڈن جوبلی تقریب کے لئے بطور عطیہ ہے۔

ہندوستانی کتابوں کی لائبریری

برطانیہ میں مقیم دو ہندوستانی باشندوں مسٹر چنچل سنگھ اور جے۔ ایس۔ دوسانجھ نے اپنی کوششوں سے ناٹنگھم کے قریب بریجفورڈ کے مقام پر ہندوستانی کتابوں کی ایک لائبریری قائم کی ہے جو ہندوستانی باشندوں کے لئے بہت مفید ثابت ہو رہی

مسٹر چمن سنگھ لائبریرین اور مسٹر دوسانجھ اس کے سکریٹری ہیں۔

کرشن چندر تحریری و تقریری مقابلہ

مالیگاؤں (ناسک) ۲۲ نومبر ۶۴ء کو ترقیاتی مرکز ہال میں کرشن چندر تحریری و تقریری مقابلہ ہوا۔ اس پروگرام کی صدارت ڈاکٹر پیر محمد رحمانی نے فرمائی اور ججوں کے فیصلے کے مطابق ذیل کے انعامات تقسیم کئے۔

۱۔ اردو ہندی نعت .... اختر الہ آبادی

۲۔ (الف) تغلق (تاریخی ناول).... لطیف ادیبی

(ب) دادر پل کے بچے، پھول اور پتھر ... احمد عثمانی

۳۔ رعایتی انعام: ستیارتھ پرکاش (ہندی کتاب) مدن گوپال پیٹلے

ادیبوں اور دانشوروں کا فارم

کانفرنس برائے امن و بین الاقوامی تعاون نے جس کا اجلاس نئی دہلی میں ۱۴ ر [illegible] نومبر تک ہوا تھا، "مفکروں اور ادیبوں کا بین الاقوامی فورم" منعقد کرنے کے متعلق بعض ہندوستانی ارکان کی تجویز کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ ادیبوں اور دانشوروں کی قومی تنظیم کے صلاح و مشورہ سے ایسا فارم منعقد کرنے کے امکانات کا جائزہ لیا جائے۔

موجودہ صورتِ حال اور عالمی کشیدگی میں جو خطرات پوشیدہ ہیں اُن کے تعلق سے دنیا کے ضمیر کو بیدار کرنے کی خصوصی ذمہ داری ادیبوں اور دانشوروں پر عائد ہوتی ہے۔ اور کلچر کے ورثے کے محافظ کی حیثیت سے اِن خطرات کو ختم کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا اِن کا فرض ہے۔

جشن شفا گوالیاری

بھوپال ۱۸ جنوری، ملک کے مشہور شاعر و ادیب ڈاکٹر شفا گوالیاری کی طویل ادبی خدمات کے اعتراف میں ماہنامہ شمع ادب نے "شفا نمبر" شائع کیا ہے۔ اس موقع پر مقامی ادبی اداروں کی جانب سے موصوف کو استقبالیہ دیا جانا طے کیا گیا ہے۔

اپریل [illegible] جشن میں پہلے جلسہ میں مقالات و تقاریر ہوں گی۔ اس کے بعد ایک

"کل ہند مشاعرہ منعقد ہوگا۔ مشاہیر شعراء کی شرکت متوقع ہے۔

وفاتیات

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ

چوٹی کے نقاد، اہم ڈرامہ نویس اور شاعر اعظم ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا ۴ جنوری ۱۹۶۵ء کو ۷۶ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔

بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی کے شروع سے انگریزی ادب پر سب سے گہرا اثر ایلیٹ کا رہا ہے۔ اُس کی شاعری نے جدید انگریزی شاعری کو ایک نئی معنویت سے آشنا کیا۔

میتھلی شرن گپت

۱۲ دسمبر کو صبح جھانسی کے قریب چرگاؤں میں ہندی کے مشہور و مقبول اور بزرگ شاعر میتھلی شرن گپت کا ۷۸ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ گپت جی ٹیگور، گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے گہرے دوست تھے۔ گاندھی جی نے اُنھیں راشٹریہ شاعر کہا تھا۔ وہ راجیہ سبھا کے ممبر بھی تھے اور اُن کا کلام ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں اُنھوں نے اپنی پہلی کتاب "بھارت بھارتی" شائع کی تھی۔

عرشؔ تیموری

برِ صغیر پاکستان و ہند کے ممتاز ادیب، شاعر اور صحافی عرشؔ تیموری کا کراچی میں انتقال ہوگیا۔ وہ گذشتہ اپریل سے سرطان کے مرض میں مبتلا تھے۔ اُنھیں ادارۂ "جنگ" کی طرف سے علاج کے لئے جاپان بھیجا گیا تھا۔

عرشؔ تیموری مرزا نظام شاہ لبیب کے صاحبزادے اور بہادر شاہ ظفر کی آخری یادگار تھے۔

سرور ڈنڈا (حیدرآبادی)

حیدرآباد کے مقبول مزاحیہ اُردو شاعر مسٹر سرور خان کا ۱۹ [illegible] کی شام میں ایک طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ مرحوم دکنی بولی

سا مزاحیہ شاعری کرتے تھے اور سرور ڈنڈا کے نام سے مشہور تھے۔
ن کی عمر چالیس سال تھی۔

شفق سینائی

علامہ سیماب اکبرآبادی کے مایۂ ناز شاگرد مولوی عبدالرشید شفق سینائی کا ۱۱ر دسمبر کو کلنی (بردوان) میں انتقال ہوگیا مرحوم عرصے سے دمہ کے مہلک مرض میں مبتلا تھے۔ کلنی ور اس کے اطراف کے تشنہ گانِ علم و ادب کو انھوں نے ندگی بھر سیراب کیا۔ انہیں دینیات پر بھی خاص عبور حاصل تھا۔

آنند نرائن مُلّا کو ساہتیہ اکیڈمی کا انعام

دہلی۔ ۱۹ر جنوری۔ اردو کے مشہور شاعر آنند نرائن مُلّا کو ان کے شعری مجموعے "میری حدیثِ عمرِ گریزاں" پر ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے حکومت نے پانچ ہزار روپیہ کا انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔

جشنِ ادیب مالیگانوی

(چھپتے چھپتے) اردو کے نہایت پختہ مشق اور صاحبِ فکر شاعر ادیب مالیگانوی کا جشن آئندہ ماہ مالیگاؤں (ناسک) میں منانے کا فیصلہ مالیگاؤں کے تمام ادبی اداروں نے کیا ہے۔ اس جشن کے انتظام اور اسے کامیاب بنانے کے لئے مقامی حضرات کی ایک کمیٹی بنادی گئی ہے۔ چند سال پہلے ادیب مالیگانوی کے کلام کا مجموعہ "تبسم" شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔

دیگلور میں جشنِ اردو

۱۴ر نومبر کو پنڈت نہرو کے یوم پیدائش پر تعلقہ دیگلور ضلع ناندیڑ (مہاراشٹر) میں عظیم الشان پیمانہ پر جشنِ اردو منایا گیا۔ آغاز جلسِ موضوعات سے ہوا جس میں متعدد نمائندوں اور مہمانوں نے حصہ لیا۔ متعدد قراردادیں منظور کی گئیں۔ شب کو ایک بڑا جلسہ اور اس کے بعد نہایت کامیاب مشاعرہ اور کوی سمیلن ہوا۔